زندہ تابندہ سیریز-1

101

عُلمائے پاکستان وہند

برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرنے والے جید علماء کے بارے میں معلومات

تصنیف وتحقیق: غلام حبیب سبحانی
(ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان)

"زندہ تابندہ" سیریز-1

101
علمائے پاکستان و ہند

ایک سو سے زائد بلند پایہ علمائے دین، نامور محدثین اور ممتاز صوفیہ کرام کے ایمان افروز احوال و آثار، اُن کی تاریخ ساز تبلیغی و اصلاحی خدمات اور قابل قدر دینی و علمی کارناموں کے دل کش و روح پرور اور ہوش ربا تذکرے کے علاوہ برصغیر پاکستان و ہند میں اسلامی تہذیب و ثقافت، اسلامی علوم و فنون اور اسلامی افکار و نظریات کے وسعت و فروغ کی اولین مستند ترین اور انقلاب آفرین تاریخ، نیز برصغیر میں مسلمانوں کے غلبہ و اثر اور ان کے عروج و زوال کی ڈیڑھ ہزار سالہ سبق آموز اور ناقابل فراموش داستان۔

تصنیف و تحقیق: **غلام حبیب سبحانی**
ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان

تخلیقات
علی پلازہ، 3- مزنگ روڈ لاہور فون: 7238014
E-mail: takhleeqat@yahoo.com

نام کتاب	101- علمائے پاکستان و ہند
مصنف	غلام حبیب سبحانی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان
ناشر	تخلیقات، لاہور
اہتمام	لیاقت علی
کمپوزنگ	محمد الیاس، ریاض احمد۔ بلھے شاہ کمپوزنگ سنٹر، لاہور
پروف ریڈنگ	ریاض احمد
سرورق	یاسر جواد
سنِ اشاعت	2002ء
پرنٹرز	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
قیمت	400- روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

اپنے فرزند ارجمند قاسم ذیشان

بہو عزیزہ سونیا ذیشان

اور

پوتے محمد سیف اللہ

کے حوالے سے ملت اسلامیہ کے

نوجوانوں اور آنے والی نسلوں کے نام!

اس دُعا کے ساتھ کہ اللہ رب العزت انہیں ہدایت عطا فرمائے اور وہ دینی و دُنیوی علوم سے بہرہ ور ہو کر ملک و ملت اور نوعِ انسانی کی بے لوث خدمت کر سکیں۔

قارئین سے التماس

زیرِ نظر کتاب میں آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی اور بزرگانِ دین کے اقوال و ملفوظات عربی زبان میں پیش کیے گئے ہیں اور کہیں کہیں اُن کے اردو تراجم نیز فارسی کے اشعار و اقتباسات بھی شامل ہیں۔ کتاب کی تصنیف، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور طباعت کے تمام مراحل میں انتہائی احتیاط کی گئی ہے۔ تاہم غلطی کا احتمال بہرحال باقی رہتا ہے۔ متن اور ترجمہ میں کچھ فرق کا امکان بھی ہوسکتا ہے۔ مصنف، ناشر، پروف ریڈر اور طابع ہر قسم کے سہو پر اللہ غفور الرحیم سے عفو و کرم کے خواست گار ہیں۔

کتاب میں جن پاک شخصیات کا ذکر آیا ہے اللہ تعالیٰ اُن سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب میں اگر کوئی غلطی یا خامی نظر آئے تو از راہِ کرم ''تخلیقات،'' علی پلازا، 3۔مزنگ روڈ لاہور کے پتا پر اطلاع ارسال فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں درستگی عمل میں لائی جاسکے۔

ادارہ ''تخلیقات'' کے متعلقین اپنے کرم فرماؤں کے تعاون کے لیے بہت شکر گزار ہیں۔

ناشر

ترتیب

مسٹر جسٹس
ایم محبوب احمد
چیف جسٹس فیڈرل شریعت کورٹ، پاکستان

یکم جنوری ۲۰۰۰ء

پیش لفظ

کسی بھی صاحبِ ذوق انسان کے لیے کسی لائقِ مطالعہ کتاب کا حصول، یا کسی صاحبِ علم شخصیت سے ملاقات قلبی طمانیت کا باعث ہوتی ہے، چہ جائیکہ ایسی کسی شخصیت یا کتاب کے بارے میں کچھ تحریر کرنے کی سعادت کا حاصل ہونا۔ یہ میرے لیے انتہائی فخر و اعزاز کی بات ہے کہ مجھے ''زندہ تابندہ'' جیسے عظیم تحقیقی سلسلے کے خالق جناب حبیب سجانی جیسے اعلیٰ درجہ کے محقق، دانش وَر اور صاحبِ طرز انشا پرداز کی کتاب کے متعلق اظہارِ خیال کا موقع مل رہا ہے۔

ایک مختصر سی تحریر میں حبیب سجانی جیسی ہمہ صفت شخصیت اور ان کی ہمہ پہلو کتاب پر سیر حاصل تبصرہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان سے اپنی سالہا سال کی آشنائی ہی نہیں بلکہ گہرے مراسم کے حوالے سے میں دلی طور پر ان کے فضل و کمال کا ہمیشہ قائل و معترف رہا ہوں اور یہ کہ میں نے انہیں ایک جویائے حق اور ایک متلاشی کمال (perfectionist) بھی پایا۔ کبھی کبھی ان کے ناقدانہ مزاج کا ایک پہلو کچھ عجیب محسوس ہوتا کہ وہ بڑے بڑے نامی گرامی لوگوں کی تحریروں پر بھی بڑی سخت گرفت کرتے ہیں تاہم اس کی وجہ ان کا کوئی احساسِ برتری یا تعصب نہیں بلکہ سچائی سے لگن، تبحرِ علمی، تحقیقی مزاج اور دیانتِ اظہار و بیان ہے کہ وہ حقائق کو بعینہٖ بیان کرنا ہر مصنف و مؤرخ کی فطری ذمہ داری خیال کرتے ہیں۔

میں ہائی کورٹ کا جج بنا ہی تھا کہ مجھے لاہور ریڈیو پر ایک مذاکرے کی صدارت کا موقع ملا جس کے مرکزی مقرر حبیب سجانی تھے۔ انہوں نے ''اسلام کے نظام عدل'' پر

ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا جس پر میں نے صدارتی تقریر کی۔ سجانی صاحب کا مقالہ اُن کی علمیت، وسعتِ مطالعہ اور روشن خیالی کا منہ بولتا ثبوت تھا اور اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسلامی علوم کے علاوہ جدید مغربی قوانین (Anglo Saxon Law) اور مغربی نظام عدل (Western Legal System) پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ریڈیو پر تقاریر و مذاکرات کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۹۱ء میں جس روز میں نے لاہور ہائی کورٹ، لاہور کے چیف جسٹس کی حیثیت سے حلف اٹھایا، اُسی روز میں نے لاہور ریڈیو سے نشر ہونے والے ایک مذاکرے کی صدارت کی۔ اس مذاکرے میں سجانی صاحب نے ''اسلام کا قانون شہادت'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ پڑھا جو اُن کے پہلے مقالات کی طرح میرے اور سامعین کے لیے بہت متاثر کن تھا۔ ریڈیو پر اُن کی دیگر گراں قدر تقریروں کے علاوہ ان کی سلسلہ وار تقاریر کا انتہائی مقبول پروگرام ''زندہ تابندہ'' ایک عرصہ تک سننے کا اتفاق ہوا جس سے مشاہیر اسلام کے بارے میں نہ صرف بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی تھیں بلکہ قلب ونظر کو تازگی بھی ملتی تھی۔

سجانی صاحب کی موجودہ کتاب اُسی سلسلے کی تکمیل پذیر صورت کی ایک کڑی ہے جس میں انہوں نے پہلی صدی ہجری کے امام ابو عمرو اوزاعی سے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی تک، یعنی ۱۲۰۰ھ تک کی اہم ترین ۱۰۱ مسلم شخصیات کا تذکرہ بڑے عالمانہ، تحقیقی اور دِل پذیر انداز میں کیا ہے۔ مصنف نے قرآن وسنت، فقہ، فلسفہ، منطق، علم الکلام، تاریخ، شعروادب اور سائنس کے حوالے سے اہم ترین علماء و مشائخ اور مفکرین کے بارے میں انتہائی عرق ریزی سے بیش قیمت معلومات جمع کر دی ہیں۔ ایسی ہستیوں کے ساتھ جن کے ناموں سے ہر شخص واقف ہے، آپ نے ایسی شخصیات کے کارناموں سے بھی قارئین کو متعارف کرا دیا ہے جن کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

کتاب کی پہلی جلد میں عالم اسلام کی ان عظیم شخصیات کا بیان ہے جو برصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھتی ہیں۔ حبیب سجانی صاحب کا یہ انتہائی قابلِ قدر کارنامہ سنہری حروف میں لکھنے کے لائق ہے اور میرے پاس موزوں الفاظ نہیں ہیں کہ ان کی اس کاوش پر شایانِ شان تبصرہ کر سکوں۔ بہر کیف اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ذہنی وفکری صلاحیتیں اور اظہار و بیان کی جو قوتیں عطا کی ہیں اُن کو مجتمع کر کے اس مشکل مرحلے کو طے اور اس علمی مہم کو سر کرنے کی اپنے تئیں سعی و کوشش کر رہا ہوں۔ چنانچہ سب سے پہلے اُن کے خاندان کے

بارے میں چند اہم اور قابلِ ذکر باتیں!

غلام حبیب سبحانی ایڈووکیٹ کا تعلق مشرقی پنجاب (بھارت) کے ایک معروف دینی و علمی خانوادے سے ہے جس میں کئی اربابِ علم و دانش، اور مخیّر و فیاض شخصیات نے جنم لیا جو اپنے فضل و کمال، دینی و تبلیغی کارناموں، روحانیت اور خدمتِ خلق کے حوالے سے دورونزدیک کے علاقوں میں مشہور ہوئیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت صوفی سیف الرحمٰن قادری سلسلۂ قادریہ فاضلیہ کے معروف و ممتاز اور مرتاض بزرگ تھے۔ ان کے دادا بزرگوار صوفی چراغ دین قادری اپنی بے پناہ دولت و ثروت کے باوجود اپنی سادگی و شرافت، رواداری اور احترام آدمیت کے لیے مشہور تھے۔ سبحانی صاحب کے والد گرامی صوفی غلام محبوب سبحانی بلدیہ لودھیانہ کے باوقار صدر، نیک نام ایگزیکٹو آفیسر اور درویش صفت انسان تھے۔ قیام پاکستان کے لیے ان کی خدمات تاریخ کا حصہ ہیں۔ بحیثیت ڈپٹی کمشنر بحالیات اور ڈپٹی کمشنر کلیمز مہاجرین کی آبادکاری کے لیے اُن کی مساعیٔ جمیلہ کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اُن کی فرض شناسی، دیانت داری اور عدل گستری زبان زدِ عام تھی۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس شان دار خاندانی علمی و عملی پس منظر کے ساتھ محترم حبیب سبحانی صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں اور عہدہ و منصب اور دُنیاوی مفادات سے بے نیاز اپنے اسلاف کی عظیم روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی تحقیق و تصنیف اور اسلامی مقاصد کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ اس معروف دینی و علمی خانوادے کی شان دار روایات کے روشن آثار اُن کے فرزند ارجمند عزیزی قاسم ذی شان کی شخصیت میں بھی نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ قاسم ذی شان کے مثالی اور شان دار تعلیمی ریکارڈ، عمدہ عادات و خصائل اور اُس کی علمی و عملی صلاحیتوں سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔

اپنے تحقیقی مزاج کی بناء پر غلام حبیب سبحانی صاحب بحیثیت قانون دان بھی ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ملکی قوانین، اسلامی فقہ اور مفسرینِ قرآن کے علاوہ ''قرآن کا تصورِ عدل'' اور ''اسلام کا نظامِ عدل'' کے علاوہ ''اسلام کی عسکری تاریخ''، ''تاریخ ساز سپہ سالار'' اور ''عظیم مسلم سائنس دان'' ایسے اہم موضوعات پر تقریروں کی متعدد اہم اور قابلِ قدر سیریز ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کیں جن میں سے بہت سی تقریریں (Series of Talks) پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے ترجمان (Organ)

میگزین ''آہنگ'' کے علاوہ ملک کے دوسرے مقتدر رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوئیں۔ انہوں نے علماء اکیڈیمی محکمہ اوقاف، حکومت پنجاب کے لیے ریسرچ سکالر کی حیثیت سے حضرت شاہ رکن عالم ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و تعلیمات پر ایک ضخیم تحقیقی کتاب بھی لکھی ہے۔

بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے صد سالہ یوم پیدائش پر شائع ہونے والی ان کی یادگار کتاب ''نقوشِ عظمت'' ملک کی اہم ترین دینی و علمی اور سیاسی شخصیات سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے جو فی الحقیقت مستقل اہمیت کی حامل ایک تاریخی دستاویز ہے۔ گزشتہ تیس برسوں سے پاکستان کے قومی رسائل و جرائد سجانی صاحب کے مضامین کو اُن کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر نمایاں طور شائع کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہاں میں صرف اُن کے ایک مضمون ''تحریک پاکستان کا تاریخی پس منظر'' کا حوالہ دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔ میری مراد سجانی صاحب کا وہ طویل مضمون ہے جو دو برس پیشتر گورنمنٹ کالج لاہور کے مشہور میگزین ''راوی'' میں قیامِ پاکستان کی پچاسویں سال گرہ کے مبارک موقع پر شائع ہوا تھا۔ ۱۴ بڑے صفحات پر مشتمل یہ مضمون نہ صرف یہ کہ ''راوی'' کے مشمولات میں سرِفہرست ہے بلکہ ''راوی'' میں چھپنے والے دیگر تمام مضامین میں اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد اور اہم ترین ہونے کے علاوہ طویل ترین مضمون بھی ہے، اس لیے کہ ''راوی'' کے اس خصوصی شمارے میں شائع ہونے والے دوسرے مضامین تین یا چار صفحات سے زیادہ ضخیم نہیں ہیں۔ سجانی صاحب کے تحقیقی کارناموں اور ان کی تخلیقات کے پیشِ نظر انہیں ایک ذمہ دار، محتاط اور صاف گو مؤرخ ہی نہیں بلکہ عالمی سطح کا محقق قرار دیا جا سکتا ہے اور ان کی مفکرانہ نگارشات کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ ثابت ہوں گی۔

حبیب سجانی صاحب کا یہ سلسلۂ کتب، انسانی اقدار، علوم و فنون، سیاست و معیشت، حکمت و حکومت، سائنس، اور تاریخ کے موضوع پر ایک تاریخ ساز تحقیقی کارنامہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے متذکرہ شعبوں کے حوالہ سے آئندہ نسلوں کو بیش قیمت معلومات حاصل ہوں گی اور انہیں عالم اسلام کے تابندہ ماضی کے علاوہ دین اسلام کی ہمہ جہتی امکانی وسعتوں اور عظمتوں کے بارے میں ایمان افروز اور روح پرور حقائق سے آگاہی حاصل ہو گی اور انہیں معلوم ہو گا کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں اکابرینِ اسلام نے

کتنا شان دار اور قابل فخر کردار ادا کیا ہے۔ اس طرح اپنے تابندہ ماضی کو نئی نسل تک منتقل کرنے سے ملت اسلامیہ کو یہ اعتماد حاصل ہو گا کہ ماضی میں اس قدر شان دار اور عہد آفرین کارنامے سرانجام دینے والے مستقبل میں بھی اقوام عالم کی قیادت و سیادت کا فریضہ ادا کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔

مختلف علوم میں انسانی ترقی کا جو سہرا آج مغرب اپنے سر پر باندھ رہا ہے، اس کی بنیاد اسلام نے رکھی اور اس شاہراہ پر انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ شان دار و پُر وقار اور نتیجہ خیز و ناقابل فراموش جدوجہد مسلمان دانش وروں ہی سے منسوب ہے۔ ہماری نوخیز نسلیں تو کیا خود ہماری نسل کے لوگ بھی اپنے بزرگوں کی تاریخی کارکردگی سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ صاحبِ تصنیف نے جس توجہ، محنت، خلوص اور مہارت سے اسلامی دُنیا کی قابل فخر شخصیات کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے، انتہائی مفید، کارآمد اور لائق تحسین ہے۔ میری نظر سے بعض ایسی کتب تاریخ و تذکرہ گزری ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض کاروباری مقاصد کے تحت لکھی گئی ہیں، ان میں تحقیق کا عنصر مفقود ہے۔ سبحانی صاحب کا کام یقیناً منفرد، تحقیقی، قابلِ اعتماد اور بے مثال ہے۔

میں بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ وہ ذاتِ قادر و رحیم و حی لا یموت محبی و محترمی غلام حبیب سبحانی صاحب کی اس علمی خدمت کو شرف قبولیت بخشے اور اُن کی یہ تحقیقی کتاب عوام و خواص کے لیے یکساں طور پر مفید اور نفع بخش ثابت ہو۔ سبحانی صاحب کو خداوندِ رحیم و کریم صحت و عمرِ طویل سے نوازے اور انہیں اسی طرح کی مزید کتب تحریر کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے تاکہ تشنگانِ علم و تحقیق، بالخصوص نوجوان نسل ان کی علمی کاوشوں سے فیض یاب ہو سکے۔

مقدمہ

حمد و ثنا ہے خالق حیات و کائنات کی جس نے انسان کو علم، عقل اور اظہار و بیان کی صلاحیتوں کے علاوہ انواع و اقسام کے بے شمار نعمتوں سے نوازا اور درود و سلام ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر کہ ختمی مرتبت رسالت مآبؐ نے ایمان و ایقان، علم و حکمت، عرفان و آگہی، تعمیر و ترقی اور تسخیر کائنات کے دروازے کھول دیے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اما بعد

ربع صدی سے زیادہ عرصے پر محیط تحقیق و جستجو کے اس نتیجہ خیز مرحلے پر اظہار اطمینان و تشکر چاہتا ہوں کہ آفاق اسلام کے زندہ و تابندہ ستاروں کا ایک جھرمٹ اس کتاب کی صورت میں اہل ذوق و شوق اور قارئین کے سامنے ہے۔

زندگی خداداد صلاحیتوں کی آزمائش گاہ ہے۔ عمل کے امتحان سے پہلے قدرت کاملہ کو انسان کی ذہنی و فکری آزمائش مقصود ہے۔ جس شخص کو جو بھی اہلیت عطا ہوتی ہے اس کا بہترین استعمال اس کا فطری فریضہ ہے۔ علم و حکمت خداتعالیٰ کا بہترین انعام ہے۔ جن ہستیوں نے اس انعام خداوندی سے نوع انسانی کی بے لوث خدمت کی ہے انہی کے نام تاریخ کے صفحات پر جگمگاتے ہیں۔ ایسی عظیم شخصیات کے بارے میں حقائق کو جمع کرنا اور تخلیقی انداز میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا بلاشبہ انتہائی صبر آزما اور محنت و جاں فشانی کا کام ہے۔ بالفاظِ دیگر تاریخ نویسی ہو یا تذکرہ نگاری، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مشکل کام ہیں۔

علم تاریخ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مغربی فاضل ایس ایم جیفر

(S.M.Jaffer) اپنی کتاب ''تاریخ کی تاریخ'' (History of History) میں لکھتا ہے:

''Of all arts & sciences history is the oldest''

یعنی تاریخ کا علم تمام فنی اور سائنسی علوم میں قدیم ترین علم ہے۔

تاریخ کے بارے میں شرمین کینٹ (Sherman Kent) کا نقطۂ نگاہ یہ ہے:

''Impartiality, not neutrality is the key to the correct, proper & just presentation of history.''

یعنی تاریخ کی صحیح، مناسب، سچی اور قطعی پیش کش کا راز غیر جانب داری میں نہیں بلکہ عدم تعصب یا بے تعصبی میں مضمر ہے۔

سی۔ پی۔ اسکاٹ (C.P.Scott) نے اپنی کتاب ''تاریخ کیا ہے'' (What is History) میں ای ایچ کار (E.H.Carr) کا یہ قول نقل کیا ہے۔

''Facts are sacred, opinion is free.''

یعنی آزادیٔ رائے کے باوجود حقائق مقدس ہوتے ہیں۔

ایم مارویلی (M.Marvilli) کہتا ہے:

''Accuracy is a duty not a virtue''

یعنی تاریخ نویسی کے لیے صحت فریضے کی حیثیت رکھتی ہے، پسند کی نہیں۔

یہ درست ہے کہ تاریخ کا علم تمام فنی و سائنسی علوم میں قدیم ترین ہے اور قبل از مسیح کی متعدد کتب تاریخ بھی موجود ہیں لیکن تمام قدیم کتابیں حقائق نگاری اور جرح و تعدیل کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اس لیے کہ ''خبر مع سند'' لکھنے کا طریقہ اور ''جرح و تعدیل'' کا فن مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ بناء بریں تاریخ کو ایک اسلامی علم قرار دیا جاتا ہے اور اسی بناء پر مسلمان تاریخ دان دُنیا کے اوّلین اور عظیم ترین مؤرخ ثابت ہوئے۔ اور یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّمہ ہے کہ جدید علم تاریخ قرآن و حدیث سے گہری وابستگی رکھنے کے علاوہ تصوف و طریقت اور اسلامی ادب سے بھی مربوط ہے۔ امام ابو حنیفہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ''جرح و تعدیل'' سے کام لیا اور ان کے شاگرد رشید یحییٰ بن سعید القطان نے اس فن میں ایسا کمال حاصل کیا کہ ''امام نقد الرجال'' کہلائے۔ علم تاریخ کے اصول اور ارکان کے لیے ملاحظہ ہو ابن طقطقی کی ''الفخری''، ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' کے مقدمہ کے علاوہ مقدمہ ابن خلدون اور علامہ سخاوی کی ''الاعلان بالتوبیخ'' وغیرہ جب کہ ابن قتیبہ کی

کتاب "ادب الکاتب"، مبرد کی "الکامل"، جاحظ کی "البیان التبیین"، ابو علی کی "کتاب النوادر" اور اسی نوع کی دیگر کتب میں ادب کے اصول و ارکان بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن حکیم سرچشمہ رُشد و ہدایت ہونے کے علاوہ منبع علوم و فنون بھی ہے۔ دیگر علوم سے قطع نظر قرآنی آیات کا معتد بہ حصہ انبیائے کرام اور امم سابقہ کے حالات و واقعات یعنی تاریخ پر مشتمل ہے۔ علامہ جاراللہ زمخشری نے قرآنی آیات کی جو تقسیم کی ہے اُس کے مطابق قرآن حکیم کی ایک ہزار آیات مبارکہ میں قصص بیان کیے گئے ہیں۔

جہاں تک مؤرخین کا تعلق ہے تو ابن سعد، ابن جریر طبری، مسعودی، ابن الندیم، البیرونی، ابن اثیر اور ابن خلدون اور ان جیسے بیسیوں دوسرے مسلمان مؤرخین کی عظمت و فضیلت کی دُنیائے علم و ادب آج بھی قائل و معترف ہے۔

تاریخ کی تعریف بیان کرتے ہوئے علامہ ابوالحسن علی المسعودی (متوفی ۳۴۵ھ) لکھتے ہیں:

> "تاریخ کا علم ایسا ہے کہ عالم اور جاہل دونوں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور احمق اور عقل مند دونوں کے لیے اس کا اثر دل پذیر ہوتا ہے۔ اس سے اچھے اخلاق اور بلند اعمال اخذ کیے جاتے ہیں اور بادشاہوں کی سیاست کا پتا چلتا ہے۔ اس میں اول آخر، ناقص کامل، شہری دیہاتی، موجود غائب، سب یک جا ہو جاتے ہیں، بہت سے احکام کا دارومدار اس پر ہوتا ہے۔ ہر مقام اور ہر محفل میں یہ علم باعث زینت ہوتا ہے۔"

علامہ ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) کے نزدیک تاریخ درحقیقت ایک خبر ہے جو اس اجتماع انسانی کی اطلاع دیتی ہے جس کو ہم اقوام عالم کا نام دیتے ہیں اور یہ محض واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ ایک نکتۂ نگاہ کی عکاسی بھی کرتی ہے۔

شہرۂ آفاق مؤرخ اور بانی عمرانیات علامہ ابن خلدون سے پچاس برس پہلے قاضی ضیاء الدین برنی (متوفی ۷۵۱ھ) نے "تاریخ فیروز شاہی" مکمل کی اور اس کے مقدمہ میں تاریخ نویسی کے اصول بھی بیان کر دیے ہیں۔ چنانچہ حق گوئی و بے باکی اور دین داری ایسی پندرہ سے زائد لازمی شرائط کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں:

> "مؤرخ جو کچھ لکھتا ہے لوگ اُس پر اعتماد کرتے ہیں۔ اُس نے

اگر جھوٹی باتیں لکھی ہیں تو وہ نقصان میں رہے گا اور اُس کی یہی
تحریر خدا تعالیٰ اور اُس کے درمیان حجت کے طور پر پیش ہوگی۔
جھوٹی باتیں لکھنے والا مصنف قیامت کے دن انتہائی سخت عذاب و
عتاب میں مبتلا ہوگا۔''

ارشادِ نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کو جو اچھی بات جہاں سے ملی انہوں نے اُسے لینے میں کبھی تامل و تردد سے کام نہیں لیا۔ مسلمانوں نے پہلی اور دوسری صدی ہجری ہی کے دوران میں یونانی، ایرانی، مصری اور ہندی کتابوں سے استفادہ شروع کر دیا تھا، مگر یہ تمام کتابیں کیمیاگری (مہوسی)، طب، ہیئت، نجوم اور جغرافیہ ایسے علوم کے بارے میں تھیں۔ فقہ و تاریخ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تاہم مسلمانوں نے بہت سے دم توڑتے ہوئے قدیم علوم کو نئی زندگی عطا کی۔

امام شمس الدین سخاوی کی کتاب ''الاعلان بالتوبیخ'' کے مترجم ڈاکٹر سید محمد یوسف نے لکھا ہے کہ سخاوی اور اُن کے استاد ابن حجر دونوں کی جولانی کا اصل میدان علوم حدیث ہیں۔ ''الاعلان بالتوبیخ'' میں بھی یہی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ البتہ یہ رنگ اس حقیقت سے پوری طرح میل کھاتا ہے کہ علم تاریخ کا علوم حدیث سے گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ الغرض مسلمانوں نے بڑی ہی ٹھوس بنیادوں پر علمِ تاریخ کی شاندار عمارت قائم کی۔ یہ بنیادیں وہ ہیں جو عقل کے نزدیک پوری طرح قابل اعتماد ہیں اور دیانت و امانت کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر پوری اُترتی ہیں۔ جو جذبہ اس عمارت کی تعمیر میں کارفرما تھا وہ دین کے تحفظ کا جذبہ تھا اسی وجہ سے تاریخ کے سر پر تادیر علوم حدیث کا سایہ رہا۔ مسلمانوں کو حقیقت اور واقعہ سے ایسا شغف رہا کہ اُن کا ادب بھی صدیوں تک قصہ و خرافات کے بجائے تاریخ سے وابستہ رہا۔

تاریخ کی اہمیت و افادیت مسلمانوں کے ہمیشہ پیشِ نظر رہی۔ امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت (متوفی ۱۵۰ھ) نے اسلامی فقہ کی تدوین اور احادیث کی جمع و ترتیب کا مہتم بالشان اور تاریخ ساز کارنامہ انجام دینے کے علاوہ مغازی پر ایک کتاب اپنے تلمیذ خاص امام محمد بن حسن کو املاء کرائی۔ امام محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ) نے مغازی پر کتاب لکھی اور صاحب مغازی کہلوائے۔ امیر المومنین فی الحدیث امام سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) نے جھوٹے راویوں اور وضعی احادیث سے تنگ آ کر کہا، ''جب راویوں

نے جھوٹ سے کام لیا تو ہم نے ان کے مقابلے میں تاریخ کو اختیار کیا۔' امام سفیان ثوری کے قریب العہد بزرگ جلیل القدر محدث، بلند پایہ فقیہ اور ممتاز مفسر قرآن علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری احادیث جمع کرتے کرتے عظیم المرتبت اور شہرۂ آفاق مؤرخ بن گئے۔

قصص القرآن سے قطع نظر ختمی مرتبت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال اور صحابہ کرام کے آثار و احوال کو ایک تقدس کے ساتھ جو مثالی حیثیت اور قانونی اہمیت حاصل ہے، دُنیا کا کوئی جدید یا قدیم مذہب یا مشرق و مغرب کی کوئی قوم اُس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے دورِ اوّل ہی میں سیر و مغازی اور اقوال و آثار کی جانب توجہ کی اور اخبار و اسناد کی جمع و ترتیب کا کام شروع کر دیا۔ مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ خبر مع سند قلم بند کرنے کا طریقہ خالصتاً اسلامی عقلیت کی پیداوار ہے اور اس کام میں امام اعظم اور اُن کے اصحاب و تلامذہ نے مرکزی کردار ادا کیا۔ اسلام سے پہلے نہ تو یہ طریقہ عربوں ہی میں رائج تھا اور نہ اُس دور کی کسی اور متمدن و ترقی یافتہ قوم میں۔ خبر مع سند کے طریقے کو مسلمانوں نے سب سے پہلے حدیث کے لیے استعمال کیا تاکہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا معیار قائم ہو سکے جو شریعت میں بھی قابلِ اعتماد ہو۔ اس معیار کو بروئے کار لانے کے لیے متعدد علوم وجود میں آئے جن میں تاریخ اور اسماء الرجال کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ علوم بالخصوص صرف و نحو، امثال و حکم، فصاحت، منطق، علم الکلام، اخلاق و آداب اور شعر و ادب کے علاوہ اقتصادیات، حیاتیات، عمرانیات، طب و کیمیا، اور ریاضی و فلکیات اور تصوف و طریقت، غرض کہ علوم و معارف یعنی ظاہری و باطنی علوم (Exoteric And Esoteric Sciences) کا قرآن و حدیث سے گہرا تعلق و واسطہ ہے اور اور یہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے کہ ظاہری و باطنی ہر قسم کے علوم میں سے متعدد علوم یا ان علوم کی ذیلی شاخوں کے بانی مبانی اور موجد مسلمان ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب ''جدید سائنس کے امام'' نیز'' چار ہم عصر امام۔''

جہاں تک اسلامی تاریخ اور اسلامی ادب کے باہمی ربط و ضبط کا تعلق ہے تو اس ضمن میں مؤرخین اور علماء نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ہماری تاریخ ہمارے دینی و علمی اور معاشرتی ادب ہی کی ایک شکل ہے اور ہمارا ادب ہماری تاریخ کا مظہر بھی ہے اور ماخذ

بھی۔

اس کی وضاحت امام ابو اسحاق ابراہیم بن عبداللہ الشافعی (متوفی ۶۱۲ھ) کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اسلامی تاریخ بڑی حد تک بچی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص فائدے کی حامل ہے۔ وہ یہ کہ اس میں امت محمدیہؐ کے علماء کا، ان کی خوبیوں کا، ان کے علم اور وعظ وحکمت اور اُن تمام احوال کا ذکر ملتا ہے جن سے ایک باعمل انسان اپنے امور میں رہبری حاصل کرتا ہے اور غور وفکر کر کے ان کے اقوال اور احوال سے ان تمام دینی و دنیوی خوبیوں سے فائدہ اٹھاتا ہے ... تاریخ کا علم گویا سرپوش ہے ان تمام علوم شرعیہ کا جن پر ہمارا مدار ہے اور منقول اور معقول کے تمام اقسام جن کے حصول میں ہم کوشاں رہتے ہیں۔''

امام ابوبکر محمد بن علی (متوفی ۶۳۲ھ) علم تاریخ کی اہمیت وفضیلت اور اس کی افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے ''تاریخ مالقہ'' کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

''کتاب اور سنت کے بعد سب سے زیادہ توجہ کے لائق اور حصول کے قابل اخبار کا علم ہے جو اچھے اوصاف اور اچھے کارناموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس سے اہل علم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جن کے نقش قدم پر چلنا ہے اور جن کے اوصاف اور حالات کو کتابوں میں محفوظ رکھنا تمہارا فرض ہے تاکہ وہ تمہاری نظروں کے سامنے ایسے ہی ہوں جیسے سچ مچ کے انسان، ہر حال میں سرگرم عمل اور تمہارے ساتھ مصروف گفتگو، جن صفات کے حامل تھے ان کے لیے مشہور ہوں تاکہ جو ان کی صورتیں نہ دیکھ سکے وہ ان کی سورتیں یعنی اقوال پڑھے۔ جس کو زندگی میں یہ موقع نہیں ملا کہ اُن سے آنکھیں چار کرے وہ اُن کی خوبیوں کا مشاہدہ کرے اور ان کے مرتبے اور درجے کو پہچانے کہ ان میں سے کون منقول اور معقول کا ماہر ہے اور کون محسوسات اور اشکال کے بارے میں صاحب امتیاز ہے۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم کرے کہ ان میں سے کون زیور علم و

ادب سے آراستہ ہے اور کون قیادت و حکومت کی گود میں پلا ہے۔
اس طرح وہ پوری سرگرمی سے کوشش کرے گا کہ اُن کا دامن جا
پکڑے اور اُن کے زمرے میں شامل ہو جائے۔''

ابوالعباس احمد بن علی بن ابوبکر الیورقی (متوفی ۶۷۸ھ) فرماتے ہیں:

''جو اللہ تعالٰی کی خوش نودی کی خاطر محبت کے ساتھ کسی ولی اللہ کا
ذکر تاریخ میں کرے گا وہ قیامت کے دن اس ولی اللہ کے ساتھ
ہوگا اور جو کسی ولی اللہ کے احوال محبت کے ساتھ تاریخ میں مطالعہ
کرے گا تو گویا اُس نے زیارت کر لی۔ اور جو کسی ولی اللہ کی
زیارت کرے اللہ اُس کے گناہ بخش دیتا ہے۔''

امام شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے ''الاعلان بالتوبیخ'' میں امام ابوالعباس کا مذکورہ بالا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''جو شخص کسی چیز سے محبت رکھتا ہے اور کثرت سے اُس کا ذکر بھی
کرتا ہے تو انسان جس سے محبت کرتا ہے اُسی کا ساتھی ہوتا ہے۔
انسان جن لوگوں سے محبت کرے گا انہی کے ساتھ اُس کا حشر ہو
گا۔''

اور یہ بھی ارشادِ نبویؐ ہے کہ:

''جس نے کسی مومن کا تذکرہ لکھا گویا اُس نے اُسے زندہ کر دیا اور
جس نے کسی کا تذکرہ پڑھا گویا اُس نے اُس کی زیارت کی اور جس
نے تذکروں کو زندہ کیا گویا کہ اُس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔''

ایک قول یہ بھی ہے: ''جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوشنودی نازل ہوتی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہوتا ہے تو محبت نازل ہوتی ہے اور جب نیک بندوں کا ذکر ہوتا ہے تو رحمت نازل ہوتی ہے۔''

یہ کتاب ''زندہ تابندہ'' کے زیرِ عنوان میری ریڈیو تقاریر کے سلسلہ کی اضافہ شدہ اوّلین کڑی ہے۔ قدرت نے مجھے کن مراحل سے گزار کر اظہار و تحریر اور تحقیق و تخلیق کی صلاحیت اور حوصلہ عطا کیا، ریڈیو تک کن حالات میں پہنچا اور اخبارات میں مضامین کا

سلسلہ کیسے شروع ہوا اور کتابی سلسلے کی تحریر و اشاعت کا کیونکر آغاز ہوا، یہ ایک طویل کہانی ہے جس کا ذکر پھر کبھی ہو گا۔

زیرِ مطالعہ کتاب میں ہر عہد، ہر مکتبِ فکر، ہر طبقے اور ہر زبان کے علماء، فقہا اور محدثین کو شامل کیا گیا ہے۔ پہلی کتاب میں ایک سو ایک (۱۰۱) ایسے علماء، فقہا اور صوفیہ کرام کے سوانح کے علاوہ ان کی دینی و علمی خدمات اور کارہائے نمایاں کا تفصیلی تذکرہ ہے جو یا تو برصغیر میں پیدا ہوئے یا پھر وقتاً فوقتاً برصغیر میں وارد ہوئے یا ہندی نژاد تھے۔ گیارہ صدیوں پر محیط درۂ خیبر سے راس کماری اور چاٹگی سے چٹاگانگ تک کی ان قابل قدر شخصیات کے حوالہ سے اسلامی تاریخ، اسلامی عقائد افکار، اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلم اقدار کے علاوہ مسلمانوں کے مختلف النوع فرقوں کی ایک نمایاں جھلک اس میں نظر آئے گی۔ گویا کہ اس کتاب میں فاتح سندھ محمد بن قاسم کے تاریخ ساز عہد، جب قرآن کی انقلاب آفرین تعلیمات اور مسلمانوں کے عادلانہ نظامِ حکم رانی سے متاثر ہو کر مقامی باشندے حلقہ بگوش اسلام ہو رہے تھے اور اس طرح مسلمان برصغیر میں تبلیغ اسلام کے عمل سے بتدریج حق حکم رانی حاصل کر رہے تھے، سے لے کر مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال یعنی جب مسلمان عیش و عشرت، لہو و لعب اور فسق و فجور کا شکار ہو کر اپنا حقِ حکم رانی کھو رہے تھے، تک کے سیاسی و معاشی، علمی و تہذیبی اور اخلاقی و روحانی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب مختلف شعبوں میں نام ور مسلم شخصیات کے فکر و عمل اور عزم و استقامت کی بدولت برصغیر میں ایک نئی تہذیب کی نمود اور نشو و نما اور پھر سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں مسلمانوں کے اخلاقی و روحانی انحطاط کی ایک جامع اور مبسوط حوالہ جاتی تاریخ کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں ضخامت کی حد بندی کے پیش نظر برصغیر سے تعلق رکھنے والے ایک سو ایک علماء، فقہا اور محدثین جن میں اکثر اولیاء اللہ بھی تھے، کا تذکرہ قلم بند کیا جا سکا ہے، جب کہ دیگر اکابر علماء و مشائخ اور ممتاز شخصیات کے احوال و آثار ہماری آنے والی کتب میں ملاحظہ کیے جا سکیں گے۔

جو شخص تاریخ کے دریچوں تک پہنچ کر ان کے ذریعے دُنیا اور اہل دنیا کو دیکھنے سمجھنے اور جاننے کے قابل ہو جاتا ہے، اس کی حالت عام لوگوں سے بہت مختلف ہو جاتی ہے۔ تاریخ کے ان دریچوں سے جو کچھ میں نے دیکھا ہے، سوچا اور سمجھا ہے، ان صفحات میں اس کا بامعنی و بامقصد اور نتیجہ خیز عکس پیش کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کا

فیصلہ ارباب فہم و دانش ہی کر سکیں گے۔ میں نے اپنی تحقیق دیانت داری سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دی ہے جواب تاریخ کا حصہ ہے۔ کتاب میں کیا کچھ ہے اور یہ کن کن مراحل سے گزر کر قارئین تک پہنچی ہے، اس کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ بعض باتیں آپ کو احباب کی آراء سے معلوم ہو جائیں گی اور کچھ چیزوں کا ذکر کتاب کے اندر مختلف مقامات پر ملے گا۔

اس کتاب کو آپ روایتی کتب تذکرہ سے مختلف پائیں گے۔ اس لیے کہ میں سند کے بغیر بات کو آگے بڑھانے کا قائل نہیں ہوں، شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے دوسروں سے زیادہ جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ حقیقت شعاری میرے مدنظر رہی ہے، کسی کی دل آزاری مقصود نہیں، پھر بھی اگر کہیں اس قسم کا کوئی تاثر ملے تو اس پر پیشگی معذرت خواہ ہوں، اس لیے کہ مجھے پورے عجز و انکسار کے ساتھ اپنی کوتاہ دامنی اور کوتاہ بینی کا اعتراف ہے۔ بہر حال، اللہ رب العزت کا شکر گزار ہوں کتاب کی تکمیل پر!

امتِ مسلمہ کو اقوام عالم کی قیادت کے منصب پر فائز دیکھنے کی آرزو میری کاوشوں کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میری تحریروں کے کتابی صورت میں سامنے آنے تک مجھے جس عزم و حوصلہ اور صبر و برداشت کی قوت عطا فرمائی وہ اُس کا فضل خاص ہے۔ پھر توفیقِ خداوندی نے مجھے عمر، صحت مسائلِ روزگار اور مقدمات کی پروا کیے بغیر مجھے اپنے کام میں مصروف رکھا اور میں کتاب کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو سکا، اس کے لیے بارگاہ خداوندی میں سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں۔

میری تربیت آغوش مادر کے بعد بزرگوار دادا قبلہ صوفی چراغ دین قادری کے زیر سایہ ہوئی جو مجھ پر میرے والد گرامی صوفی غلام محبوب سبحانی سے کہیں زیادہ شفقت فرماتے تھے، دینی و دُنیاوی امور و مسائل کا فہم، زندگی کا چلن اور گفتگو کا فن میں نے اُنہی سے سیکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی لحد پر شبنم افشانی کرے، آمین، یا رب العالمین۔ قارئین کرام سے اپنے اور اپنے بزرگوں کے حق میں دعائے مغفرت کا خواست گار ہوں۔

استادِ محترم ضیاء الدین قریشی صاحب ایم اے بی ٹی، ایجوکیشن آفیسر (دہلی) سیکنڈ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول سنت نگر لاہور اور پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی محبت و شفقت، رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے میری تخلیقی صلاحیتوں کو نکھار بخشا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت فرمائے۔ (آمین)۔

احباب میں سے مجھے سب سے پہلے ریڈیو پاکستان لاہور کے نہایت سرگرم و فعال اور فرض شناس عہدے دار جناب الطاف الرحمٰن کا ذکر کرنا ہے جو ایک مؤکل کی حیثیت سے میرے پاس آئے۔ پھر اُن سے دوستی ہو گئی۔ وہ اکثر ریڈیو کے لیے لکھنے کی فرمائش کرتے تھے، مگر میں ٹال جاتا تھا۔ بالآخر ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے آخری دنوں میں انہوں نے بعض ناقابل بیان حالات سے آگاہ کر کے مجھے ریڈیو کے لیے لکھنے پر آمادہ کر لیا اور ''باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم'' کے عنوان سے الطاف مرحوم نے میری پہلی تقریر ریکارڈ کی جو ۱۸ دسمبر کو نشر ہوئی۔ الطاف الرحمٰن ریڈیو پر صوتی اثرات دیتے تھے لیکن وہ بہت بڑے انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے بیٹے عزیزی ریاض الرحمٰن کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

ادارہ ''تخلیقات'' کے روحِ رواں عزیزی لیاقت علی اسم بامسمّٰی ہیں۔ انتہائی ذہین و تجربہ کار ناشر ہیں۔ عمدہ کتابیں شائع کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی کے اصرار پر میں نے ''زندہ تابندہ'' کے عنوان سے اسلامی شخصیات کے بارے میں اپنی نشری تقاریر کو کتابی صورت میں جمع کرنے کا کام شروع کیا۔ زیرِ نظر کتاب کو خوب سے خوب تر صورت دینے میں انہوں نے ہر قدم پر بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا۔

عزیزی ریاض احمد معروف بہ ریاض دانش وَر جو کمپیوٹر کمپوزنگ کرتے ہیں، انہوں نے زیرِ مطالعہ کتاب کی تکمیل اور اشاعت و طباعت کو اپنا مشن قرار دیے رکھا۔ چنانچہ انہوں نے اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنے مفید مشوروں اور فنی تعاون کے علاوہ بعض اوقات میرے سخت رویہ پر بھی انتہائی تحمل و بردباری سے اپنا کام پُرخلوص انداز میں جذبہ و جوش کے ساتھ جاری رکھا اور کتاب کو مکمل کروا کے دم لیا، جس کے لیے وہ خصوصی شاباش بلکہ انعام کے مستحق ہیں۔

عزیزی عمر زمان خان ایک باصلاحیت صحافی، خوش فکر شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ روحانی علوم پر بھی دست رَس رکھتے ہیں قابل اعتماد دوست اور اچھے صلاح کار ہیں۔ انہوں نے زیرِ مطالعہ کتاب کی ترتیب و تکمیل کے آخری مرحلے کے دوران میں مفید مشورے دینے کے علاوہ روزانہ گھنٹوں میرے ساتھ بیٹھ کر ضروری اور متعلقہ حوالے تلاش و نقل کرنے اور کتاب کی نوک پلک سنوارنے میں میرا ساتھ دیا۔

کچھ ایسے احباب ہیں جن کی نیک تمناؤں یا اُن کے بے لوث مشوروں سے مجھے

بہتر انداز میں کام کرنے کا حوصلہ ملا۔ ان میں برادرانِ گرامی قدر ڈاکٹر شہر یار شیخ ماہر امراضِ دل (جو میرے معالج خصوصی ہیں)، حاجی کنور طارق محمود ڈپٹی ڈائریکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن، صلاح الدین مصطفیٰ قریشی ایڈووکیٹ، میجر (ر) سید ناصر علی شاہ، راجا صادق اللہ وائس پریذیڈنٹ حبیب بنک، ظفر اقبال نیازی ایڈووکیٹ، ڈاکٹر عرفان الٰہی صاحب، چوہدری آفتاب اقبال ایڈووکیٹ اور عزیزی انعام الحق جو تاجر کتب ہونے کے ساتھ مطالعۂ کتب کا بھی شوق رکھتے ہیں، کے علاوہ وہ احباب بھی شامل ہیں جنہوں نے میری اس کاوش کے بارے میں تحریری اظہار خیال کیا۔ ان حضرات میں سے عزت مآب جناب میاں محبوب احمد صاحب چیف جسٹس وفاقی شریعت کورٹ آف پاکستان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر ''زندہ تابندہ'' سیریز کے مسودات اور زیرِ نظر کتاب کا بغور مطالعہ کیا اور اس کا پیش لفظ لکھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزائے خیر دے، آمین۔ پروفیسر ڈاکٹر ملک محمد اسلم صاحب وفات پا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اُن کے فرزند ارجمند عزیزی جنید حسن اور ڈاکٹر اسلم ملک مرحوم کی بیوہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ ظہور عالم شہید صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اُن کے لیے بھی دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

میں اُن تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں جو زیرِ نظر کتاب کی جلد از جلد تکمیل کے لیے اصرار کرنے کے ساتھ ساتھ میری صحت کے لیے بھی دعا گو رہے۔

آخر میں مجھے اُن تمام اہلِ علم، مؤرخین، تذکرہ نویسوں اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی فاضلانہ تحریروں سے زیرِ نظر کتاب میں استفادہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں میں ان بزرگانِ دین کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں جن کے احوال و آثار اور اقوال و افکار سے اس کتاب کے اوراق مزین ہیں۔ والحمد للہ رب العلمین و سلام علیٰ خاتم النبیین۔

(صوفی) غلام حبیب سبحانی
23- نیپیل روڈ، لاہور
فون: ۶۳۶۱۵۲۲

امام اوزاعی

امام عبدالرحمٰن اوزاعی ائمہ تبع تابعین میں بلند مقام رکھتے تھے اور عوام و خواص میں مشہور و مقبول تھے۔ رواۃ صحاح ستہ میں سے نامور ثقہ محدث، انتہائی ذہین و زیرک، معاملہ فہم، تیز طبع، حاضر جواب، فصیح اللسان اور اعلیٰ درجہ کے انشاپرداز تھے۔ خدائے بزرگ و برتر نے انہیں غیر معمولی ذہنی وفکری صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ صدق و صفا اور زہد وتقویٰ میں یکتا، عبادت و ریاضت میں فرد، اور عزم و استقامت کا پیکر اور حق گوئی و بے باکی کا مجسمہ تھے۔

امام اوزاعی کا اسم گرامی عبدالرحمٰن اور کنیت ابوعمرو ہے۔ فقیہ شام کے لقب سے بھی یاد کیے جاتے تھے۔ ان کے والد ماجد کا نام عمرو بن محمد تھا۔

امام اوزاعی دمشق کے رہنے والے تھے لیکن دراصل ہندی نژاد تھے، ان کا تعلق موجودہ پاکستان کے صوبہ سندھ سے تھا۔ روایت یہ ہے کہ ان کے والد کو قیدی بنا کر شام میں لایا گیا تھا۔ اوزاعی ۸۸ ھ میں بعلبک میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا قد میانہ، داڑھی چھوٹی اور رنگ گندم گوں تھا۔ وہ مہندی لگاتے تھے۔

اکابر ائمہ، فقہاء اور محدثین امام اوزاعی کے تبحر علمی اور ان کی دینی خدمات کے قائل و معترف تھے۔ چنانچہ امام سفیان بن عیینہ نے ان کو ''اعلم اہلِ زمانہ،'' ابن عجلان نے ''افصح الامت،'' امام نسائی نے فقیہ شام'' اور حافظ عمرو بن علی فلاس، امام اسد بن عمرو عجلی اور سید الحفاظ امام یحییٰ بن معین نے ثقہ، ثبت، صدوق، فاضل، کثیرالحدیث اور کثیرالعلم والفقہ لکھا ہے۔

محدثِ کبیر عبدالرحمٰن بن مہدی (متوفی ۱۹۸ھ) نے امام اوزاعی کے فضل وکمال کا

اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''شام میں امام اوزاعی سے بڑا سنت کا عالم کوئی نہ تھا۔''

اور یہ بھی عبدالرحمٰن بن مہدی ہی کا قول ہے:

''اس وقت حدیث میں چار امام ہیں، امام اوزاعی، امام مالک،
سفیان ثوری اور حماد بن زید۔'' وفات ۱۶۱ھ

امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ) جو خود ایک فقہی مسلک کے بانی ہیں —— اہلِ سنت والجماعت کے چار معروف فقہی مذاہب کے بانی ائمہ اربعہ میں ان کا نام امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کے بعد دوسرے نمبر پر آتا ہے —— امام اوزاعی کے دینی و علمی مرتبہ و مقام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''امام اوزاعی اُن ائمہ میں سے ہیں جن کی اقتداء کی جاسکتی ہے۔''

ائمہ اربعہ میں سے تیسرے امام یعنی امام محمد بن ادریس شافعی (متوفی ۲۰۵ھ) امام اوزاعی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میں نے حدیث میں اُن سے زیادہ سمجھ دار اور فقیہ شخص نہیں دیکھا۔''

اسمٰعیل بن عیاش بیان کرتے ہیں: ''میں نے علماء کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فی زمانہ امام اوزاعی ساری اُمت کے عالم ہیں۔''

امام عبداللہ بن داؤد خریبی کا قول ہے: ''امام اوزاعی اپنے سب اہلِ زمانہ سے افضل ہیں۔''

امام ابو اسحاق فزاری کہتے ہیں: ''اگر مجھے اس اُمت کا خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے تو میں امام اوزاعی کو خلیفہ منتخب کروں گا۔''

بشیر بن منذر فرماتے ہیں کہ ''میں نے امام اوزاعی کو دیکھا ہے کہ کثرتِ گریہ اور فراوانیٔ خشوع سے تقریباً نابینا ہو چکے تھے۔''

امام ابو زرعہ رازی (متوفی ۲۸۱ھ) کا قول ہے: ''امام اوزاعی اپنے علم و فضل اور کثرتِ روایت کی بنا پر اہلِ شام کے مرجع بن گئے تھے اور اہلِ شام ان ہی سے فتاویٰ لیتے تھے۔''

جدید و قدیم مؤرخین اور ہر دور کے چھوٹے بڑے تذکرہ نویسوں نے امام اوزاعی کے احوال و آثار بیان کیے ہیں اور ان کے تبحرِ علمی اور ذاتی خصوصیات کے علاوہ ان کی

دینی خدمات کو بھی سراہا ہے۔

ڈاکٹر صبحی محمصانی کی تحقیق کے مطابق امامُ اوزاعی فقیہ، پرہیزگار، عالی ہمت، عالم حدیث اور اہل شام کے امام تھے۔ وہاں کے لوگ انھیں کے مقلد تھے۔ پھر ان کا مذہب شام سے اندلس منتقل ہو گیا۔ مگر دوسری صدی ہجری کے بعد جب شام میں مذہب شافعی اور اندلس میں مذہب مالکی ظاہر ہوا تو مذہب اوزاعی ختم ہو گیا۔

مؤرخ شمس الدین ابوالعباس احمد بن محمد المشہور ابنِ خلکان (متوفی ۶۸۱ ھ) اپنی ضخیم کتاب ''وفیات الاعیان'' میں امام اوزاعی کے تذکرہ میں رقم طراز ہیں:

''شام میں ان سے بڑا عالم موجود نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے ستر ہزار سوالوں کے جواب دیئے۔ سفیان ثوری کو اوزاعی کی حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے شہر سے باہر آکر ان کا استقبال کیا اور ان کے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے آگے آگے پیدل چل رہے تھے۔ جب لوگوں کے پاس سے گزرتے تو کہتے کہ ''شیخ کے لیے راستہ چھوڑ دو۔''

حافظ ابو عبداللہ شمس الدین محمد ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) نے اپنی تالیف ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھا ہے:

''اوزاعی دمشق کے بلند پایہ حافظِ حدیث ہیں۔ اُن کی زبان سے جو بھی کلمہ فاضلہ نکلتا، سننے والے اس کے حفظ و ضبط کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کھلکھلا کر نہیں ہنستے تھے۔ آخرت کے متعلق وعظ کرتے تو سب زار و زار رونے لگتے۔ خلیفہ منصور ان کا وعظ بڑے شوق سے سنتا اور ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا۔

لیکن علامہ ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ھ) کا بیان ہے:

''اوزاعی کا تعلق ہمدان یا حمیر کے ایک ذیلی قبیلہ ''اوزاع'' سے تھا۔''

عصرِ حاضر کے مؤرخین اور اہلِ قلم میں سے امام اوزاعی کے تذکرہ نویس حافظ مجیب اللہ ندوی نے اپنی تالیف ''تبع تابعین'' میں غالباً ''طبقات ابن سعد'' کے اندراجات کی بناء پر ہی یہ لکھا ہے:

''امام اوزاعی کا نسبی تعلق یمن کے قبیلہ بنو ہمدان یا بنو حمیر سے تھا مگر ان کا خاندان وہاں سے ترکِ وطن کر کے شام چلا آیا اور

یہاں دمشق کے قریب ایک بستی ''اوزاع'' میں بودوباش اختیار کر لی۔ اسی نسبت سے ان کو اوزاعی کہا جاتا ہے۔''

ڈاکٹر صبحی محمصانی نے اپنی کتاب ''فلسفۃ التشریع فی الاسلام'' میں لکھا ہے۔

''اوزاع کی نسبت سے اوزاعی کہلاتے ہیں۔ اوزاع یمن کا ایک قبیلہ ہے اور بعض کے نزدیک وہ دمشق کا ایک گاؤں ہے۔''

حافظ مجیب اللہ نے اوزاعی کے وطن کے بارے میں مؤرخ ذہبی سے اختلاف کیا ہے اور ان کے بیان ''اصلہ من سبی السند'' پر یہ کہہ کر شک کا اظہار کیا ہے کہ ''ذہبی کے اس بیان کی تائید کسی دوسرے بیان سے نہیں ہوتی۔'' حافظ مجیب کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس ضمن میں مطلوبہ تحقیق نہیں کی ہے اس لیے کہ ذہبی سے تقریباً ایک سو سال پہلے ابنِ خلکان (متوفی ۶۸۱ ھ) نے ''وفیات الاعیان'' میں واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ ''بعض کا قول ہے کہ اوزاع، دمشق میں باب الفرادیس کے راستے پر ایک بستی ہے۔ ابو عمرو ان میں سے نہ تھے بلکہ وہ ان میں اترے تھے اس لیے ان کی طرف منسوب ہو گئے جب کہ وہ یمن کے قیدیوں میں سے تھے۔'' وہ یمن کے کون سے قیدیوں میں سے تھے، اس کی وضاحت قریب العہد محدث ابو زرعہ دمشقی نے کر دی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسحٰق نے اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (**Contribution of India & Pakistan to the Hadith Litrature**) میں محدث ابو زرعہ (متوفی ۳۸۱ ھ) کے حوالے سے لکھا ہے:

''اوزاعی کا تعلق ہندی اسیرانِ جنگ کے ایک خاندان سے تھا۔ وہ ترکِ وطن کر کے اوزاع میں سکونت پذیر ہوئے اور اوزاعی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ابو زرعہ کا یہ بیان اس اعتبار سے بہت وزن رکھتا ہے کہ وہ بھی دمشق کے باشندہ تھے اور ایک صدی قبل اوزاعی بھی اسی شہر میں رہتے تھے۔ غالباً اسی بناء پر محدث و مؤرخ ذہبی نے ابو زرعہ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ اوزاعی کے ہندی نژاد ہونے کا ایک ثبوت ان کے دادا کے نام سے بھی ملتا ہے۔ ان کا نام یحمد تھا جو برہمدا یا برہمند کا مماثل معلوم ہوتا ہے۔ عربوں نے جب امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہند پر حملہ کیا تو غالباً

اُس وقت یحمد کو جنگی قیدی بنالیا گیا تھا۔"

حافظ مجیب اللہ کا یہ دعویٰ بھی کہ اوزاعی کی ولادت ۸۵ھ میں ہوئی درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ ابنِ خلکان اور ذہبی نے ان کا سنِ ولادت ۸۸ھ لکھا ہے اور عصرِ حاضر کے دو محققین یعنی ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنے تحقیقی مقالے اور قاضی عبدالصمد صارم نے اپنی تالیف ''تاریخ الحدیث'' اور ڈاکٹر صبحی محمصانی نے اپنی کتاب 'فلسفۃ التشریع فی الاسلام'' میں امام اوزاعی کا سنِ ولادت ۸۸ھ ہی لکھا ہے۔ ہمارے خیال میں امام اوزاعی کا یہی سنِ ولادت درست ہے۔

امام اوزاعی کے بچپن کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ البتہ قرائن کی بناء پر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کا بچپن یتیمی کے عالم میں مصائب و مشکلات میں گزرا۔ ان کی والدہ نے غربت و مفلسی اور پریشان حالی میں اُن کی پرورش کی اور انہوں نے بصد مشکل مگر بڑی محنت و جانفشانی اور لگن کے ساتھ نہ صرف مروّجہ علوم سیکھے بلکہ ان میں قابلِ قدر مہارت بھی حاصل کی۔ انہوں نے ان تمام توہین آمیز رویّوں کو کمال صبر و تحمل سے برداشت کیا جو اس زمانے کے بعض اموی حکمرانوں نے موالی یعنی غلاموں کے بارے میں ملکی مصالح کے نام پر اختیار کر رکھے تھے۔

حافظ ذہبی کی تحقیق کے مطابق اوزاعی نے عطا بن ابی رباح، قاسم بن مخیمرہ، شداد بن عمار، ربیعہ بن یزید، ابن شہاب زہری، محمد بن ابراہیم تیمی، یحییٰ بن ابی کثیر اور دوسرے لوگوں سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ جب فوج میں بھرتی ہو کر یمامہ پہنچے تو ان کے استاد یحییٰ بن ابی کثیر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بصرہ جا کر امام حسن بصری اور امام محمد بن سیرین سے مستفیض ہوں اور ان سے علم حدیث میں سندِ عالی حاصل کریں۔ اوزاعی یمامہ کی مہم سے فارغ ہو کر جب بصرہ پہنچے تو امام حسن بصری کچھ روز پہلے فوت ہو چکے تھے اور ابنِ سیرین بسترِ مرگ پر تھے اس لیے وہ ان اکابر محدثین سے استفادہ نہیں کر سکے۔

امام حسن بصری اور ابنِ سیرین دونوں ممتاز تابعین نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ اس وقت اوزاعی کی عمر ۲۲ سال تھی اور وہ ابھی تحصیلِ علم میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ہی انہوں نے وعظ و درس اور افتاء کا سلسلہ شروع کیا ہوگا۔ اس طرح اُن مؤرخین اور اہلِ قلم کے اس دعویٰ کی نفی ہو جاتی ہے کہ اوزاعی کی ذہنی نشو و نما بہت قبل از وقت ہو گئی تھی اور انہوں نے صرف دس سال کی عمر میں قرآن و حدیث کے علوم سیکھنے کے علاوہ فنِ

خطابت میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا اور تیرہ برس کے ہوئے تو لوگوں نے ان سے فتوے لینے شروع کر دیے تھے۔ اس قسم کے بے سروپا و بے بنیاد دعاوی امام مالک اور امام بخاری کے علاوہ بعض دوسرے ائمہ ومحدثین کے بارے میں بھی کیے جاتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ امام اوزاعی نے بڑے مشکل اور دقت طلب مراحل سے گزر کر تعلیم حاصل کی اور بڑی محنت و جانفشانی اور کافی وقت صرف کر کے وہ غربت و مفلسی اور گم نامی کے پردوں سے نکل کر شہرت وعظمت کی بلندیوں تک ہی نہیں پہنچے بلکہ امام شام کہلائے اور قاضی شام کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔

امام اوزاعی دوسری صدی ہجری کے اکابر ائمہ میں شمار ہوتے ہیں اور دوسری صدی ہجری دینی وعلمی اور حدیثی وفقہی نقطۂ نگاہ سے زبردست اہمیت کی حامل صدی ہے۔ اس صدی کے دوران میں سائنسی وعلمی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا اور بڑے بڑے سیاسی انقلابات رونما ہوئے۔ اس صدی کے دوران اُموی حکومت کے کم و بیش نوے سالہ دور حکومت کا خاتمہ اور بنو عباس کے غلبہ و اقتدار کا آغاز ہوا۔ یہ صدی تاریخ وسیر اور مغازی ایسے اہم موضوعات کے علاوہ تجوید، قرأت، لغت اور شعر وادب ایسے علوم عربیہ پر قابل قدر کتابوں کی تصنیف و تالیف اور اسلامی علوم وفنون کے وسعت و فروغ کی صدی ہے۔ یہ صدی احادیثِ نبویؐ اور آثارِ صحابہ کی جمع و تبویب اور اسلامی فقہ کی ترتیب و تدوین کے علاوہ فقہی مذاہب کی تاسیس و تشکیل کی صدی ہے۔ پھر سب سے اہم توجہ طلب اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ اس صدی کے دوران عظیم المرتبت اور شہرۂ آفاق دینی وعلمی شخصیات منظر عام پر آئیں۔

مشاہیر علماء کا اتنا بڑا اور اس قدر عظیم الشان اجتماع تاریخ اسلام ہی میں نہیں بلکہ تاریخ اقوامِ عالم کے کسی بھی دور میں اور کسی بھی ملک میں کبھی نہیں ہوا جتنا بڑا اور جس قدر عظیم الشان اجتماع دوسری صدی ہجری کے دوران میں مملکت اسلامیہ کے طول و عرض میں ہوا۔ شاید اس کی وجہ اور سبب وہ بے شمار مشکل و پیچیدہ اور نازک مذہبی و سیاسی، معاشی و اقتصادی، فوجی و انتظامی اور عدالتی و سماجی امور و مسائل تھے جن سے امتِ مسلمہ جسے امتِ وسطیٰ بھی کہا گیا ہے، کم و بیش ایک صدی سے دوچار چلی آ رہی تھی اور جو امور و مسائل اُس زمانے میں حل طلب تھے۔

اس طرح یہ صدی امیر المؤمنین سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت کے اواخر

سے لے کر پہلی صدی ہجری کے اختتام تک منظرِ عام پر آنے والے مختلف النوع متعصب ، متشدد، متحارب و متخاصم اور مخالف و متصادم سیاسی گروہوں کی برپا کردہ سازشوں، شورشوں اور بغاوتوں کے علاوہ ان گروہوں کے وضع کردہ مکروہ و مذموم ملحدانہ افکار و نظریات کی سرکوبی و بیخ کنی کی صدی تھی۔ اس لیے کہ یہ خطرناک اور گمراہ کن سیاسی گروہ اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے پیش نظر مذہبی فرقوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ان فرقوں کو دنیا شیعہ باطنیہ (اسمٰعیلیہ)، خوارج، مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ ناموں سے جانتی ہے —— شاید ان اسلام دشمن سیاسی فرقوں اور سازشی ٹولوں اور گمراہ مذہبی جتھوں کے انسداد و سدباب اور ان فرقوں کے ملحدانہ افکار کی یلغار کو روکنے کے لیے قدرتِ کاملہ نے علمائے اسلام کے اس قدر عظیم الشان اجتماع کا اہتمام کیا ہو۔

خدائے ذوالجلال والاکرام رحمٰن و رحیم، سمیع و بصیر، علیم و خبیر اور پروردگارِ عالم ہے اور اس نے اپنے خاص انداز سے اپنے نظامِ عدل کے تحت اپنے مقاصد کے پیشِ نظر یہ کائنات تخلیق کی ہے۔ آفرینشِ آدم بھی اس نظام کائنات کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب اولادِ آدم کے کاروبارِ حیات میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، اور دین و دولت کی بنیادیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور طاغوتی طاقتیں پر پُرزے نکال کر انتظامِ عالم میں خلل انداز ہونے لگتی ہیں، جس کے نتیجے میں بندگانِ الٰہی کی جان و مال، عزت و آبرو، ایمان و ایقان اور ان کے بنیادی اعتقادات خطرات سے دوچار ہو کر درہم برہم ہونے لگتے ہیں اور ہر طرف ظلم وستم اور کفر و باطل کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں تو رحمتِ خداوندی عالمِ جوش میں آ جاتی ہے اور خدائے بزرگ و برتر اپنے فضلِ خاص سے ایسے اربابِ بصیرت پیدا کر دیتا ہے جو اپنے فہم و فراست اور بصیرت کے نور سے اس ظلمت کدۂ دہر کو روشن و منور کر دیتا ہے۔ اس فضلِ ربی سے پیدا ہونے والے اربابِ بصیرت میں سے کچھ ایسے اکابرین بھی ہوتے ہیں جو علم و فضل کے لامتناہی خزانوں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہونے کے حوالے سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا فریضہ ادا کرنے کے بھی اہل ہوتے ہیں اور کبھی کبھی خدائے ذوالجلال والاکرام پیغمبرانہ نیابت کا اہم دینی فریضہ ادا کرنے کے لیے کسی بڑی شخصیت کا انتخاب کر لیتا ہے جسے شخصِ اکبر کہا جا سکتا ہے۔

دوسری صدی ہجری کی حالت اور حیثیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس صدی کے دوران اربابِ فضل و کمال اور اکابرینِ ملت کا جو عظیم الشان اور بے مثال اجتماع ہوا اس

میں ممتاز ائمہ تابعین بھی تھے اور نامور ائمہ تبع تابعین بھی۔ جلیل القدر قاضی بھی تھے اور صاحبانِ عزیمت محدثین بھی، صاحب کمال قاری و نحوی بھی تھے اور پُر وقار و پُرعظمت فقہاء و مجتہدین بھی۔ غرض یہ کہ دوسری صدی ہجری کے دوران میں علمائے اسلام کی ایک ایسی دل کش و خوش نما کہکشاں معرضِ وجود میں آئی جس کی چکا چوند نے ایک زمانے کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور اہلِ زمانہ اس جیسی روشن و تابناک اور خوب صورت و خوش نما کہکشاں کا نظارہ پھر کبھی نہ کر سکے۔

علمائے اسلام کی اس دل کش کہکشاں کے روشن ستاروں میں شیخ الاسلام امام حسن بصری، امام ربانی محمد بن سیرین، علامۃ التابعین امام شعبی، معلم قرآن امام اعرج مدنی، مفتی مکہ عطا ابن ابی رباح، فقیہ عراق امام ابراہیم نخعی، حافظ حدیث وھب بن منبہ، شیخ الحرم ابن ابی ملیکہ احول، حافظ حدیث عبداللہ بن بریدہ، امام مکحول، امام ابن شہاب زہری، امام عمرو بن دینار، حافظ حدیث ابواسحاق سبیعی، امام رجاء بن حیوہ، امام عالی مقام محمد باقر، یحییٰ بن ابی کثیر، امام ایوب سختیانی، فقیہ مدینہ امام ابوزناد، یحییٰ بن سعید انصاری، ہشام بن عروہ، صالح بن کیسان، عاصم بن سلیمان بصری، امام سلیمان بصری، فقیہ عراق امام حماد بن سلیمان کوفی، حمید الطویل، سلمہ بن کہیل، امام ربیعۃ الرائے، شیخ المحدثین سلیمان بن مہران اعمش، پیشوائے محدثین محمد بن عجلان، امام جعفر صادق اور امام اعظم ابو حنیفہ ایسے ممتاز ائمہ شامل ہیں۔

جب کہ ائمہ تبع تابعین میں صاحب مغازی امام محمد بن اسحاق، عالم خراسان امام مقاتل، امام سعید بن عروبہ، صاحب کرامات امام حیوہ بن شریح مصری، امام حجاج بن ارطاۃ کوفی، امام مسعر بن کدام، عالم یمن امام معمر، شیخ الاسلام امام شعبۃ بن حجاج واسطی، شیخ الاسلام امام سفیان ثوری، امام زفر، قاضی ابن ابی لیلیٰ، شیخ ابراہیم بن ادھم، قاضی حفص بن غیاث، شیخ فضیل بن عیاض، امام داؤد طائی، امیر المؤمنین فی الحدیث عبداللہ بن مبارک، امام حماد بن سلمہ، امام حماد بن زید، امام حماد بن دلیل، امام حماد بن امام ابوحنیفہ، امام علی بن مسہر، امام نقد الرجال یحییٰ بن سعید القطان، امام سفیان بن عیینہ، حافظ حدیث عبدالرزاق بن ہمام، قاضی القضاۃ علی بن ظبیان، محدث کبیر فضل بن موسیٰ، امام وکیع بن الجراح، شیخ حبیب عجمی، شیخ معروف کرخی، محدث عباد بن صہیب، شیخ عباد بن عوام، شیخ جریر بن عبدالحمید رازی، قاضی شریک بن عبداللہ، امام ابومعشر سندھی، امام حسن بن زیاد

لولوی، امام عیسیٰ بن عمر نحوی، خلیل بن احمد نحوی، قاری حمزہ بن زیات، امام فراء، امام کسائی، امام محمد بن حسن شیبانی، قاضی القضاۃ امام ابو یوسف، قاضی مصر امام لیث بن سعد، حضرت بشر حافی، شیخ شفیق بلخی، محدث ابو موسیٰ، حافظ حدیث معلیٰ بن منصور، امام ابو داؤد طیالسی، قاضی قیروان اور فاتح سسلی امام اسد بن فرات اور محدث کبیر امام خلف بن کبیر جیسے بے شمار روشن و درخشندہ ستاروں کی مانند قاضی شام شیخ الاسلام امام اوزاعی بھی اسی دل کش و خوش نما کہکشاں کا ایک تابندہ ستارہ ہیں۔

اسلام کی اس خوب صورت و خوش نما کہکشاں کے روشن و تابندہ ستاروں میں وہ ائمہ فقہاء اور محدثین بھی شامل ہیں جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں منظر عام پر آئے ہیں۔ امام محمد ادریس شافعی (ولادت ۱۵۰ھ وفات ۲۴۰ھ)، امام احمد بن حنبل (ولادت ۱۶۴ھ)، امام یحییٰ بن زکریا (متوفی ۱۸۴ھ) امام یوسف خالد سمتی (متوفی ۱۸۹ھ) امام عبداللہ بن ادریس کوفی (متوفی ۱۹۲ھ) امام فضل بن موسیٰ سینانی (متوفی ۱۹۲ھ)، امام ہشام بن یوسف (متوفی ۱۹۷ھ)، امام شعیب بن اسحٰق دمشقی (متوفی ۱۹۸ھ)، امام ابو عمرو حفص بن عبدالرحمٰن بلخی (متوفی ۱۹۹ھ)، امام ابو مطیع حکم بن عبداللہ بلخی (متوفی ۱۹۹ھ)، امام خالد بن سلیمان بلخی (متوفی ۱۹۹ھ)، امام موسیٰ کاظم (متوفی ۱۸۳ھ)، شیخ ولید بن مسلم دمشقی (متوفی ۱۹۵ھ)، امام شیخ یونس بن بکیر کوفی (متوفی ۱۹۹ھ)، حافظ عبداللہ بن نمیر (متوفی ۱۹۹ھ)، امام عمرو بن ہشیم بن قطن (متوفی ۲۰۰ھ)، حافظ موسیٰ بن سلیمان جوز جانی (متوفی ۲۰۰ھ)، اور تیسری صدی کے ربع اول میں وفات پانے والے ائمہ فقہا و محدثین جن میں امام زید بن حباب عکلی کوفی (متوفی ۲۰۳ھ)، محدث مصعب بن مقدام کوفی (متوفی ۲۰۳ھ)، امام ابو داؤد سلیمان (متوفی ۲۰۴ھ)، محدث کبیر خلف بن ایوب (متوفی ۲۰۵ھ)، امام جعفر بن عون (متوفی ۲۰۷ھ)، قاضی ہمدان شیخ قاسم بن الحکم کوفی (متوفی ۲۰۸ھ)، امام ابو یوسف کے شاگرد حافظ معلیٰ بن منصور (متوفی ۲۱۱ھ)، امام ابو عاصم النبیل ضحاک بن مخلد بصری (متوفی ۲۱۲ھ بعمر ۹۰ سال)، امام اعظم کے شاگرد اور امام بخاری کے شیخ امام مکی بن ابراہیم بلخی (متوفی ۲۱۵ھ)، امام ابو یوسف کے شاگرد امام بشر بن ابی الازہر (متوفی ۲۱۳ھ)، حافظ ابو عبدالرحمٰن عبداللہ یزید مقری (متوفی ۲۱۳ھ)، حافظ عبداللہ بن داؤد خریبی (متوفی ۲۱۳ھ)، شیخ ہشام بن اسمٰعیل حنفی الفقیہ (متوفی ۲۱۷ھ)، امام احمد بن حفص ابو حفص کبیر بخاری (متوفی ۲۱۸ھ)، حافظ علی

بن معبد بن شداد الرقی (متوفی ۲۱۸ ھ) ، امام ابونعیم فضل بن وکین کوفی (ولادت ۱۳۰ ھ وفات ۲۱۹ ھ)، حافظ ابوالحسن علی بن جعد بن عبید الجواہری بغدادی (ولادت ۱۳۳ ھ۔ وفات ۲۳۰ ھ)، شیخ فرخ مولی امام ابی یوسف (ولادت ۱۳۶ ھ۔ وفات ۲۳۰ ھ) ،اصحاب وتلامذہ امام اعظم کے شاگرد نامور محدث امام محمد بن سامہ تمیمی (متوفی ۲۳۳ ھ بعمر ۱۰۳ سال)، امام ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد سید الحفاظ امام یحیٰ بن معین ابو زکریا بغدادی (متوفی ۲۳۳ھ) وغیرھم دوسری صدی ہجری کے ائمہ فقہا اور محدثین میں ہیں لیکن حافظ ذہبی نے ان میں سے اکثر کے حالات طبقہ خامسہ کے بعد کے طبقات میں بیان کیے ہیں۔

ممتاز اور منتخب اکابر ائمہ فقہاء اور محدثین کی اس فہرست سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے دوران میں کس کثیر تعداد میں اور کس مرتبہ و مقام کے سربرآوردہ علمائے اسلام موجود تھے اور ذہبی کے بیان کے مطابق ان علمائے اسلام میں امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام اوزاعی نادرۂ روزگار تھے۔ ذہبی کی تالیف ''تذکرۃ الحفاظ'' سے قطع نظر اگر قریب العہد مؤرخین کی کتب، مثلاً ''طبقات ابن سعد'' اور ''تاریخ طبری'' کا مطالعہ کیا جائے تو بھی ہمیں یہی معلوم ہو گا کہ اسلامی علوم وفنون کے اہم اور بڑے مراکز مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، دمشق، بغداد اور مصر کے علاوہ اسلامی مملکت کے طول وعرض میں بلند پایہ ائمہ فقہاء و محدثین سیکڑوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے اور اسلامی علوم کی ترقی وترویج کے علاوہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ پھر یہی وہ قابلِ قدر علمائے اسلام تھے جن پر اس زمانے میں امت اسلامیہ کو درپیش مختلف النوع امور و مسائل کو حل کرنے کے علاوہ اسلامی عقائد کو کفر و الحاد کی آمیزش سے پاک کر کے کتاب وسنت کے مطابق بنانے کی اہم اور بنیادی ذمہ داری عائد تھی تاکہ فرزندان توحید اپنے ایمان وایقان کو قرآنی احکام کی مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم واستوار کر کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرح صراط مستقیم پر چل سکیں اور صدق و صفا، زہد و تقویٰ، صبر وشکر اور تسلیم و رضا کے اصل معانی و مفاہیم سے آشنا ہو کر خوش گوار و متوازن اور سادہ و پاکیزہ زندگی بسر کر سکیں ... اور اس طرح ایک خوب صورت وخوش نما اسلامی معاشرہ تشکیل پا سکے۔

عقائد کی صحت و درستگی کے علاوہ اس زمانے میں امت مسلمہ جن بڑے امور و

مسائل سے دوچار تھی اُن میں مختلف النوع مذہبی فرقوں کے خطرناک و گمراہ کن اور ہلاکت آفرین افکار و نظریات کے پرچار کے علاوہ مطلق العنان اموی و عباسی حکم رانوں کی گمراہیاں، بدعنوانیاں، ستم رانیاں اور شرم ناک عیش و عشرت اور ہوسِ زر بھی شامل تھی جس کے باعث پہلے تو خلافت اسلامیہ کا نظام آمرانہ شخصی حکومت یعنی ملوکیت میں تبدیل ہوا اور پھر اس غیر اسلامی نظامِ حکومت کے اثرات مسلمانوں کی نجی اور خاندانی سطح تک پہنچے جس کے نتیجے میں پورے اسلامی معاشرے کی دینی و اخلاقی اور روحانی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ پہلی صدی ہجری کے دوران میں خلیفہ ثالث سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کے زمانۂ خلافت کے اواخر میں باغیوں نے جو طوفانِ بدتمیزی برپا کیا تھا اور جس کے نتیجے میں خلیفہ ثالثؓ کی شہادت اور پھر اس کے ساتھ ہی بدامنی، بے چینی، افراتفری، فتنہ و فساد، قتل و غارت اور خونریز جنگوں کا جو دل خراش و جگر پاش اور زندگی بیزار سلسلہ شروع ہوا تھا، اُس ناقابل بیان سلسلے کے اثرات ابھی باقی تھے کہ علویوں کی خفیہ سازشوں سے امویوں کو اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑے۔ مگر اقتدار علویوں کو ملنے کی بجائے پکے ہوئے پھل کی طرح عباسیوں کی جھولی میں آن گرا۔ بنو عباس نے دعویٰ تو یہ کیا کہ وہ بنو امیہ سے اُن مظالم کا بدلہ لیں گے جو انہوں نے علویوں پر کیے تھے مگر جب علویوں نے عباسی اقتدار کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو عباسی حکم رانوں نے علویوں اور امویوں دونوں کو بری طرح ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔

بنو عباس کے ہاتھوں بنو امیہ کے قتل و غارت کی روح فرسا اور زہرہ گداز تفصیلات مؤرخین نے بیان کی ہیں چنانچہ حافظ ذہبی نے طبقۂ رابعہ کے اختتام پر سلطنت عباسیہ کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس طبقہ کے عہد میں اموی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور ۱۳۲ھ میں عباسی حکومت قائم ہو گئی۔ اس انقلابِ حکومت میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ خراسان، جزیرہ اور شام میں اتنی دنیا تہ تیغ ہوئی کہ اُن کی پوری تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ خراسان کی سیاہ پوش افواج نے بڑی دھاندلی مچائی اور ہر قسم کی بے حیائی اور قباحت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ **ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔**

اسی زمانے میں عمر بن عبید عابد اور واصل بن عطا بصرہ میں نمودار ہوئے اور لوگوں کو اعتزال اور انکارِ تقدیر کی دعوت دی۔ خراسان میں جہم بن صفوان ظاہر ہوا اور مذہب تعطیل اور خلق قرآن کی دعوت دینے لگا۔ اس کے بالمقابل خراسان ہی میں مقاتل بن سلیمان

مفسر کھڑا ہوا جس نے صفات باری تعالی کے اثبات میں اتنا مبالغہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کو جسم بنا دیا۔ اس طرح مسلمانوں میں تجسیم کا عقیدہ داخل ہوا۔ ادھر ان بدعتی فرقوں کی سرکوبی کے لیے علمائے تابعین اور ائمہ سلف میدان عمل میں نکل آئے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ عوام کو ان کی بدعات اور غیر اسلامی عقائد پر متنبہ کیا بلکہ تدوین حدیث، استنباط فروع اور دیگر علوم عربیہ کی تصنیف کا کام وسیع پیمانے پر شروع کیا جو ہارون رشید کے عہد حکومت میں کمال کو پہنچ گیا۔ چنانچہ ہر علم وفن اور ہنر میں بے شمار تصنیفات منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے لگیں۔ لغت عرب میں بھی بیسیوں کتابیں لکھی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے علم کتابوں میں منتقل ہوتا گیا اور لوگوں کا ان تصنیفات پر اعتماد بڑھتا گیا اُسی تناسب سے علماء کے حافظہ یعنی یادداشت (memory) میں کمی آتی گئی حالانکہ اس سے پہلے صحابہ کرام اور تابعین عظام کا علم ان کے سینوں میں محفوظ ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں علم سے مراد حدیث کا علم تھا۔

پہلی صدی ہجری کے اختتام کے ساتھ ہی اسلامی فتوحات کا شاندار اور بے مثال سلسلہ اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ چکا تھا اور بڑے بڑے بیسیوں ممالک اور وسیع وعریض علاقے مملکت اسلامیہ کا حصہ بن چکے تھے۔ ان مفتوحہ ملکوں سے تعلق رکھنے والی مختلف النوع اقوام وملل اور بے شمار چھوٹے بڑے قبیلوں کے زیادہ تر لوگ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ جب کہ ایسے لوگ بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے جو اپنے قدیم مذاہب پر قائم تھے۔ اس لیے کہ ''لا اکراہ فی الدین'' کے قرآنی اصول کے پیش نظر نہ تو اسلام میں کسی کو جبری طور پر مذہب تبدیل کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے اور نہ مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ بہرحال عرب مسلمانوں کے مقابلے میں مختلف مفتوحہ ملکوں کے باشندوں کا رہن سہن کا انداز اور طور طریقے، ان کا طرزِ معاشرت، تہذیب وتمدن، لباس وخوراک، عادات وعبادات، زبان وادب، تاریخ اور تاریخی روایات، رنگ ونسل اور نسلی مفاخرات نہ صرف یہ کہ الگ الگ اور جداگانہ تھے بلکہ ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور بعض صورتوں میں متضاد اور متصادم بھی تھے۔ ان کے مذہبی رسم ورواج، طریقہ عبادت اور ملکی وقومی تہوار تقریبات بھی ایک دوسرے سے مختلف وجداگانہ تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی آب وہوا اور ان کے جغرافیائی حالات بھی ایک دوسرے سے مختلف ومتضاد تھے۔ اسی لحاظ سے ان کی

پیداوار، اجناس اور مصنوعات بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

اندریں حالات یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ مختلف مفتوحہ ملکوں کے مختلف النسل اور مختلف المذہب اور مختلف العقیدہ باشندوں کو درپیش مختلف النوع معاشرتی امور و مسائل بھی عربوں اور عرب مسلمانوں کے مسائل سے قطعی مختلف و جداگانہ تھے۔ یہ بے شمار ملکی و قومی، مذہبی و معاشرتی اور بین الاقوامی امور و مسائل تھے جو دوسری صدی ہجری کے علمائے اسلام اور ائمہ سلف کو کتاب و سنت کے احکام کی روشنی میں حل کرنے تھے۔ اس کے لیے مناسب مطلوبہ قانون سازی کے علاوہ مؤثر و نتیجہ خیز انتظامی حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت تھی ـــــ دوسری صدی ہجری کے علمائے اسلام اور ائمہ سلف نے ان امور و مسائل کو کس طرح حل کیا؟ اور ان امور و مسائل کے حل تلاش کرنے میں اُس دور کے اکابر ائمہ فقہا، بالخصوص امام اوزاعی نے کیا کردار ادا کیا؟ اور اس ضمن میں کی جانے والی اپنی دینی، حدیثی اور فقہی کوششوں میں امام اوزاعی کس حد تک کامیاب رہے؟ ان سب باتوں کا تفصیلی تذکرہ و تجزیہ ہم نے اپنی کتاب ''چار ہم عصر امام ـــــ ایک تاریخی مطالعہ'' میں پیش کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ اپنی جگہ ایک الگ موضوع ہے۔

حافظ ذہبی نے اپنی تالیف ''تذکرۃ الحفاظ'' کے طبقہ خامسہ میں تابعین اور تبع تابعین میں سے ممتاز ائمہ فقہاء اور محدثین کے مختصر احوال بیان کیے ہیں اور اس کے آخر میں یہ اختتامی کلمات لکھے ہیں:

> ''اس زمانہ میں صلحاء میں سے ابراہیم بن ادھم، داؤد طائی اور سفیان ثوری، نحویوں میں عیسیٰ بن عمر، خلیل بن احمد، حماد بن سلمہ اور دیگر حضرات، قاریوں میں حمزہ بن حبیب، ابو عمر بن علاء، نافع بن ابو نعیم، شبیل بن عباد اور یعقوب کے استاد حمید طویل، شاعروں میں مروان بن ابی حفصہ، بشار بن برد، اور فقہاء میں امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام اوزاعی جیسے نادرۂ روزگار موجود تھے اور ان کے علاوہ بھی بے شمار باکمال تھے مگر اختصار کے پیشِ نظر ان ستر سے زائد ائمہ کرام کے حالات قلم بند کرنے پر اکتفا کی ہے۔''

حافظ ذہبی کے اس بیان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ تابعین اور تبع تابعین کے

زمانے میں جو کہ دوسری صدی ہجری کا زمانہ ہے، ائمہ فقہاء اور محدثین کثیر تعداد میں موجود تھے جن میں سے انہوں نے امام مالک کے سنِ وفات ۱۷۹ھ تک وفات پانے والے ستر سے زائد علمائے اسلام کے حالات تحریر کیے ہیں اور اپنے اختتامی کلمات میں فقہاء میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے بعد تیسرا نام امام اوزاعی کا لکھا ہے جس سے امام اوزاعی کی علم حدیث و فقہ میں حیثیت و اہمیت اور ان کے اسلامی معاشرے میں بلند مرتبہ و مقام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حافظ ذہبی ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھتے ہیں ''کافی عرصے تک اہلِ شام اور ان کے بعد اہلِ اندلس امام اوزاعی کے مذہب پر عمل پیرا رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس پر عمل کرنے والے ختم ہو گئے اور اس مذہب کا ذکر صرف کتبِ خلاف میں باقی رہ گیا۔''

ڈاکٹر صبحی محمصانی اپنی تحقیقی کتاب 'فلسفۃ التشریع فی الاسلام'' کی فصل ششم میں ''اہل سنت کے متروک مذاہب'' کے زیرِ عنوان رقم طراز ہیں:

> ''امام اوزاعی کا مذہب اہلِ حدیث میں شمار ہوتا ہے جو رائے اور قیاس سے احتراز کرتے ہیں۔ یہ مذہب ناپید ہے کیونکہ اس کے بارے میں آج کل ہم صرف اس قدر جانتے ہیں کہ کتب فقہ میں مذاہب کے تذکرے میں مذہب اوزاعی کا ذکر آتا ہے۔''

امام اوزاعی ایک الگ فقہی مکتبِ فکر کے بانی تھے چنانچہ حافظ مجیب اللہ رقم طراز ہیں کہ ''امام اوزاعی کا ذہن کچھ قدرتاً محدثانہ اندازِ فکر سے زیادہ ہی ہم آہنگ تھا اور ان کی تعلیم و تربیت بھی 'حدثنا و اخبرنا' ہی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان سے پیش آمدہ مسائل میں استفسار کیا جاتا تھا تو وہ حدیث نبوی اور آثارِ صحابہ کی روشنی میں سادہ طور پر جواب دیتے تھے۔ زیادہ تدقیق و تفتیش اور فرضی قیاس آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے۔'' انہوں نے مزید لکھا ہے:

> ''امام اوزاعی کے فقہی مذہب کی پوری تفصیل اور اس کے امتیازات کی فہرست تو تیار نہیں کی جا سکتی، اس لیے کہ نہ تو ان کی مرویات ہی جمع ہو سکیں اور نہ ان کے فقہی مجتہدات ہی مرتب کیے جا سکے۔''

اس ضمن میں حافظ ذہبی ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھتے ہیں: ''کافی عرصے تک اہلِ شام اور ان کے بعد اہلِ اندلس امام اوزاعی کے مذہب پر عمل پیرا رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس

پر عمل کرنے والے ختم ہو گئے اور اس مذہب کا ذکر صرف کتبِ خلاف میں باقی رہ گیا۔"

علامہ خضری نے "تاریخ التشریع الاسلامی" میں امام اوزاعی کے فقہی مذہب کا ذکر فنا شدہ مذاہب کے عنوان کے تحت کیا ہے اور لکھا ہے:

"اوزاعی ان محدثین میں سے تھے جو قیاس کو پسند نہیں کرتے تھے اور اہل شام کا عمل ان کے مذہب پر تھا اور وہ شام کے قاضی تھے۔ پھر بنو امیہ کی اولاد میں جو لوگ اندلس گئے اُن کے ساتھ امام اوزاعی کا مذہب بھی اندلس میں گیا۔ پھر تیسری صدی کے نصف حصے میں امام شافعی کے مذہب کے مقابلے میں شام اور امام مالک کے مذہب کے مقابلے میں اندلس میں اس مذہب کا چراغ بجھ گیا۔"

امام اوزاعی کے محدثانہ اندازِ فکر کے حامل مکتبِ فکر "اوزاعیہ" کے خاتمے کے بارے میں حافظ مجیب اللہ تاریخی حوالوں کے ساتھ لکھتے ہیں: "امام اوزاعی کا یہ مسلک شام میں دو صدیوں تک اور اندلس میں تقریباً ایک صدی تک زندہ رہا۔"

دراصل امام اوزاعی جس مکتبِ فکر کے ترجمان اور نمائندہ ہیں اس مکتبہ فکر کے ائمہ محدثین نے اپنے مخصوص عقائد و اعمال کے پیش نظر جتنے بھی مسلک تشکیل دیے وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے اور سچی بات یہ ہے کہ مسالک و مذاہب زیادہ عرصے تک زندہ رہ بھی نہیں سکتے چونکہ اُن میں نہ تو امت مسلمہ کی ہمہ جہت تغیر و ترقی کی گنجائش موجود تھی اور نہ یہ عصری تقاضوں ہی کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ اور امام داؤد ظاہری اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان مسالک و مذاہب کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ مذاہب زمانے کی رفتار اور عصری تقاضوں کو سمجھنے اور نت نئے امور و مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ اس لیے لازمی طور پر خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی فقہی مذہب کو ان کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دینے یا ان کو مٹانے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ان کا معدوم ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔

بہرحال امام اوزاعی خصوصیات اپنی جگہ مسلمہ ہیں۔ وہ اپنی حق پرستی اور جرأت اظہار کی وجہ سے بھی معروف تھے۔ حافظ ذہبی نے بھی اس حوالہ سے ایک واقعہ بیان کیا ہے:

''فریابی کہتے ہیں ایک دفعہ سفیان بن عینیہ، امام اوزاعی اور عباد بن کثیر مکہ مکرمہ میں جمع ہوئے تو سفیان ثوری نے امام اوزاعی سے کہا 'خلیفہ سفاح کے چچا عبداللہ بن علی کے دربار میں آپ کی اس سے جو گفتگو ہوئی تھی اس کی تفصیل ہمیں بتایئے!' فرمایا 'سنیئے! جب وہ شام آیا اور بنو امیہ کے قتل عام سے فارغ ہوا تو اس نے اپنا دربار منعقد کیا۔ سپاہیوں کو چار قطاروں میں اس طرح کھڑا کیا گیا تھا کہ ایک قطار کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں، دوسری کے ہاتھوں میں بیڑیاں اور تیسری کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور چوتھی کے ہاتھوں میں کوڑے تھے۔ پھر مجھے پیادے بھجوا کر بلوایا گیا۔ پیادوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اُن سپاہیوں کی قطاروں کے درمیان ایسی جگہ کھڑا کر دیا جہاں سے عبداللہ بن علی میری بات بہ آسانی سن سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا: ''تم ہی عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی ہو؟'' میں نے کہا، جی ہاں، اللہ تعالیٰ امیر کو نیکی کی توفیق دے... بولا ''تم بنو امیہ کے قتل کے متعلق کیا کہتے ہو؟'' میں نے کہا، آپ نے ان سے امن کا عہد کیا تھا جسے بہرصورت آپ کو پورا کرنا چاہیے تھا۔ کڑک کر بولا ''تم پر ہلاکت ہو، میں اپنے اور ان کے درمیان کسی معاہدہ امن کا ذکر سننا نہیں چاہتا۔''، اس پر میری روح پر قتل کا خوف طاری ہوا لیکن میں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا تصور کر کے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے لیے ان کا خون بہانا حرام تھا۔ اب تو وہ غصہ میں بھر گیا۔ اس کی رگیں پھول گئیں، آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ بولا، ''تم ہلاک ہو جاؤ، کیا یہ ہماری خلافت شرعی نہیں ہے؟'' میں نے کہا، کیسے؟ کہنے لگا: ''کیا آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کے حق خلافت میں وصیت نہیں فرمائی تھی؟'' میں نے عرض کی، اگر آنحضرتؐ نے وصیت فرمائی ہوتی تو حضرت علیؓ خلافت کے فیصلے کے لیے حکم نہ فرماتے۔ یہ سن کر وہ چپ ہو گیا مگر غصہ سے تلملا اٹھا۔ مجھے امید تھی کہ ابھی میرا سر میرے آگے گرتا ہے۔ مگر اس کے برعکس اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اسے باہر نکال دو۔ میں وہاں سے نکلا اور ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ پیچھے سے ایک سوار گھوڑا دوڑاتا آیا۔ میں نے سوچا میرا سر لینے آیا ہے۔ خیال کیا قتل سے پہلے دو نفل ادا کر لوں۔ میں نماز شروع کرنے ہی والا تھا کہ سوار نے قریب پہنچ کر سلام کیا اور بولا: ''امیر نے آپ کی خدمت میں اشرفیوں کی یہ تھیلی پیش کی ہے۔'' میں نے گھر پہنچنے سے پہلے سارا مال غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔''

امام ابو حنیفہ کے ہم عصر ہونے کے حوالے سے امام اوزاعی کا ذکر بعض متقدمین امام

ابوحنیفہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے لیکن اکثر ائمہ سلف، مؤرخین اور تذکرہ نویس امام ابوحنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی کا یک جا ذکر کچھ اس طور اور اس انداز سے کرتے ہیں کہ جس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ ائمہ کرام ہم عصر ہونے کے علاوہ ہم سر و ہم پلہ بھی تھے۔ حالانکہ صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ ان ائمہ میں سے ہر امام اپنا اپنا مرتبہ و مقام رکھتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی اپنی خصوصیات اور دینی خدمات ہیں جن کی مناسبت سے ان کی دینی و علمی حیثیت و اہمیت اور ان کے تاریخی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔

حافظ ذہبی نے امام جعفر صادق، امام ابوحنیفہ، امام شعبہ بن حجاج، امام مسعر، امام مالک، امام سفیان ثوری، امام لیث بن سعد، امام ابومعشر سندھی اور امام اوزاعی سمیت ستر سے زائد علمائے اسلام کے جو حالات "تذکرۃ الحفاظ" کے طبقہ خامسہ میں قلم بند کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب امام اپنے مرتبہ و مقام اور اپنی صفات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے برابر اور ہم رتبہ نہیں ہو سکتے بلکہ ان میں سے ہر محدث اور ہر فقیہ کے مرتبہ و مقام کا تعین اس کے علم و فضل، اس کی ذاتی صفات اور اس کی دینی و علمی اور تبلیغی خدمات کی بناء پر کیا جائے گا۔

موضوع کو آگے بڑھانے سے پہلے یہاں اس امر کی وضاحت کرتے چلیں کہ امام ابوحنیفہ کو طبقۂ خامسہ میں شمار کر کے حافظ ذہبی نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ تابعی ہونے نسبت سے ذہبی نے امام صاحب کے شرفِ تابعیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اُن کا تذکرہ تبع تابعین کے ساتھ کیا ہے۔ امام جعفر صادق، امام مالک، امام سفیان ثوری اور اوزاعی سب ائمہ جن کا ذکر طبقۂ خامسہ میں کیا گیا ہے تبع تابعین میں سے ہیں۔ طبقۂ خامسہ میں ذہبی نے جن ستر سے زائد علمائے اسلام کے حالات بیان کیے ہیں ان میں امام ابوحنیفہ ہی وہ واحد معروف و ممتاز شخصیت ہیں جن کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کو طبقۂ خامسہ میں شمار کرنے کے لیے اخلاقی جواز حافظ ذہبی نے یہ پیدا کیا ہے کہ ایک دو غیر معروف ایسے علماء کو بھی اس طبقہ میں شامل کر لیا ہے جن کا تابعی ہونا پوری طرح سے ثابت نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ یہ حافظ ذہبی کی ایک بے انصافی اور زیادتی ہے۔ حافظ ذہبی کی اس قسم کی زیادتیوں کا بھی بیان ہوگا لیکن یہاں ہم اپنی گفتگو کو امام اوزاعی تک محدود رکھتے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی نے ''سیرت النعمان'' میں اہل الرائے ہونے کے حوالے سے چار اکابر ائمہ کا ذکر یک جا کیا ہے۔ چنانچہ ''کتاب المعارف'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''محدث ابن قتیبہ کی 'کتاب المعارف' میں اہل الرائے کی سرخی سے ایک باب باندھا گیا ہے اور عنوان کے نیچے یہ نام لکھے ہیں: ابن ابی لیلیٰ، ابو حنیفہ، ربیعۃ الرائے، زفر، اوزاعی، سفیان ثوری، مالک بن انس، ابو یوسف قاضی، محمد بن حسن۔ ابن قتیبہ نے ۲۷۶ھ میں وفات پائی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم تیسری صدی تک مذکورہ بالا لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے۔ اگر چہ یہ سب لوگ درحقیقت (زفر کے سوا) محدث ہیں لیکن امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی کی شہرت تو محتاجِ بیان نہیں؟''

ڈاکٹر صبحی محمصانی کی کتاب 'فلسفۃ التشریع فی الاسلام' میں ''اہل سنت کے متروک مذاہب'' کے زیر عنوان امام اوزاعی اور اُن کے مذہب کا بھی ذکر ہی جس کا بیان گزر چکا ہے۔ چنانچہ امام اوزاعی کے تذکرہ میں حاشیہ (foot note) پر لکھا ہے کہ ابن قتیبہ نے امام اوزاعی کو غلطی سے اہل الرائے میں شمار کیا ہے۔

امام اوزاعی جن کا تعلق شام سے تھا... بلکہ جو اموی عہد میں شام کے قاضی تھے... کا عرب وعراق کے ائمہ سے موازنہ کرتے ہوئے مولانا شبلی رقم طراز ہیں:

''امام اوزاعی جو مجتہد اور مجتہدِ مستقل تھے اور بلادِ شام میں اُن کا وہی اعزاز و اعتبار تھا جو عرب وعراق میں امام مالک اور امام شافعی کا، ان کی نسبت کسی نے امام احمد بن حنبل سے رائے پوچھی، فرمایا کہ 'حدیث ضعیف و رائے ضعیف۔' لطف یہ ہے کہ مجتہدین جس چیز پر فخر کر سکتے ہیں وہ دقتِ نظر، قوتِ استنباط، استخراجِ مسائل، تفریع احکام ہے۔ لیکن محدثین کے ایک گروہ کے نزدیک یہی باتیں عیب ونقص میں داخل ہیں۔''

ائمہ اربعہ کے سیرت نگار پروفیسر شیخ محمد ابو زہرہ مصری بھی ان چار اکابر ائمہ کا ذکر بار بار یک جا کرتے ہیں۔ ''حیاتِ مالک'' میں تو شیخ ابو زہرہ نے ان ائمہ کا ذکر یک جا کرنے کے علاوہ امام مالک کا کئی اعتبار سے امام ابو حنیفہ سے موازنہ کیا ہے۔

امام اوزاعی کے تذکرہ نگار حافظ مجیب اللہ نے اپنی تالیف ''تبع تابعین'' میں اوزاعی کے تذکرے کا آغاز ہی اس جملہ سے کیا ہے:

''امام اوزاعی ان ائمہ تبع تابعین میں ہیں جن کا شمار دوسری صدی کے ممتاز مجتہدین مثلاً امام ابوحنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری وغیرہ

کے زمرہ میں ہوتا ہے۔"

حافظ ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں متقدمین میں سے سید الحفاظ امام یحییٰ بن معین (متوفی ۲۳۳ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے:

"علماء چار ہیں: امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام سفیان ثوری اور امام اوزاعی۔"

حافظ یحییٰ بن معین کا یہ قول توجہ طلب ہی نہیں بلکہ تفصیل طلب بھی ہے۔ ہم نے ان چاروں علمائے اسلام کے فضل وکمال، ان کی امتیازی خصوصیات، ان کے زہدوتقویٰ، ان کی جرأت بے باکی، ان کی دینی وعلمی خدمات اور ان کے حلقہ ہائے اثر کو تفصیل سے بیان کرنے کے علاوہ ان کے قائم کردہ مکاتبِ فکر کے اصول ومبادیات کی وضاحت اور ان کا تقابلی موازنہ اپنی کتاب "چار ہم عصر امام —— تاریخی جائزہ" میں کیا ہے۔ یہاں ہم مختصراً یہی بتانے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ان ائمہ، فقہاء اور محدثین میں بعض باتیں مشترک بھی تھیں مگر بعض امور میں یہ امام اپنے اپنے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے منفرد ہیں۔ جہاں تک علم حدیث کا تعلق ہے تو ان چاروں ائمہ نے علم حدیث کی اپنے زمانے کے معروف وممتاز علمائے حدیث سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور یہ چاروں ائمہ حفاظِ حدیث ہیں لیکن علم حدیث میں بھی ان ائمہ کرام میں بحیثیت محدثین واضح اور نمایاں فرق وامتیاز پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان میں امام ابوحنیفہ کی شروطِ روایت سب سے زیادہ سخت ہیں اس لیے وہ ان سے منفرد ہیں۔

امام اوزاعی اور امام مالک نے تو کبھی ابوحنیفہ کی ہم سری کا دعویٰ کیا ہی نہیں۔ سفیان ثوری سے البتہ اس قسم کی بات منسوب ہوئی تھی مگر جلد ہی انہیں بھی احساس ہو گیا اور وہ ابوحنیفہ کے فضل وکمال اور دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے دعوے سے دست بردار ہو کر ان سے اخذ واستفادہ کرنے لگے۔ اس ضمن میں مولانا شبلی نعمانی امام ابوحنیفہ کے مجموعہ قوانین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جس قدر اس کے اجزاء تیار ہوتے جاتے تھے، ساتھ ساتھ ملک میں ان کی اشاعت ہوتی جاتی تھی۔ اس وقت کے آئینِ حکومت کا یہی مجموعۂ قوانین تھا۔ امام صاحب کی درس گاہ قانون کا ایک مدرسہ تھا جس کے طلباء نہایت کثرت سے ملکی عہدوں پر مامور ہوئے۔ تعجب یہ ہے کہ جن لوگوں کو امام صاحب سے ہم سری کا دعویٰ تھا وہ بھی اس کتاب سے بے نیاز نہ تھے۔ امام سفیان ثوری نے بڑی کوشش سے امام ابوحنیفہ کی "کتاب الرہن" کی نقل حاصل کی اور اس کو اکثر

پیش نظر رکھتے تھے۔ (امام) زائدہ کا بیان ہے کہ میں ایک دن سفیان کے سرہانے سے ایک کتاب جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے، اُن سے مانگ کر دیکھنے لگا تو ابوحنیفہ کی ''کتاب الرہن'' نکلی۔ میں نے تعجب سے پوچھا: آپ ابوحنیفہ کی کتابیں دیکھتے ہیں؟ بولے ''کاش! ان کی سب کتابیں میرے پاس ہوتیں۔'' یہ بھی کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ باوجودیکہ اس وقت بڑے بڑے مدعیانِ فن موجود تھے اور ان میں بعض امام ابوحنیفہ سے مخالفت بھی رکھتے تھے تاہم کسی کو اس کتاب کی ردّوقدح کی جرأت نہیں ہوئی۔ امام صاحب کی زندگی ہی میں اس مجموعے نے وہ حسن قبول حاصل کیا کہ اُس وقت کے حالات کے لحاظ سے مشکل سے قیاس میں آ سکتا ہے۔''

امام اوزاعی کے تذکرہ میں امام ابوحنیفہ کے حوالے سے یہ معروضات اس لیے ضروری تھیں کہ امام اوزاعی نہ صرف امام اعظم کے ہم عصر تھے بلکہ ایک ممتاز تبع تابعی، جلیل القدر محدث ہونے کے ساتھ امام جعفر صادق، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام داؤد ظاہری، امام جریر طبری کی طرح ایک مکتب فکر کے بانی مبانی بھی تھے۔ مزید برآں قاضیٔ شام ہونے کے حوالے سے وہ ایک امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ شام اموی حکم رانوں کا مرکز اور اس کا تاریخی شہر دمشق اموی سلطنت کا صدر مقام تھا۔ امام اوزاعی نے گو سفیان ثوری کی طرح امام ابوحنیفہ کی ہم سری کا کبھی دعویٰ تو نہیں کیا تھا لیکن ان کے مخصوص محدثانہ اندازِ فکر کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ایک حد تک امام صاحب سے معاصرانہ چشمک ضرور رہی۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ اکثر حرمین جاتے اور مہینوں قیام کرتے۔ حج کی تقریب میں ممالک اسلامی کے ہر گوشے سے بڑے بڑے اہلِ کمال مکہ میں آ کر جمع ہو جاتے تھے جن کا مقصد حج کے ساتھ افادہ اور استفادہ بھی ہوتا تھا۔ امام اوزاعی اور مکحول شامی، کہ شام کے امام المذہب کہلاتے تھے، امام ابوحنیفہ نے مکہ ہی میں ان لوگوں سے تعارف حاصل کیا اور (بعد میں) حدیث کی سند لی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امام صاحب کی ذہانت اور اجتہاد کی شہرت دور دور پہنچ گئی تھی، یہاں تک کہ ظاہر بینوں نے ان کو 'قیاس' مشہور کر دیا تھا۔ انہی دنوں میں عبداللہ بن مبارک نے جو امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں، بیروت کا سفر کیا تا کہ کوفہ میں امام اوزاعی سے فنِ حدیث کی تکمیل کریں۔ پہلی ہی ملاقات میں اوزاعی نے

ان سے پوچھا کہ ''کوفہ میں ابو حنیفہ کون شخص پیدا ہوا ہے جو دین میں نئی نئی باتیں نکالتا ہے۔'' انہوں نے کچھ جواب نہ دیا اور گھر چلے آئے۔ دو تین دن کے بعد پھر گئے تو کچھ اجزاء ساتھ لیتے گئے۔ اوزاعی نے ان کے ہاتھ سے وہ اجزاء لے لیے۔ سرنامے پر لکھا تھا، ''قال نعمان بن ثابت،'' دیر تک غور سے دیکھا پھر عبداللہ سے پوچھا ''نعمان کون بزرگ ہیں؟'' انہوں نے کہا ''عراق کے ایک شیخ ہیں جن کی صحبت میں رہا ہوں۔'' فرمایا ''بڑے پایہ کا شخص ہے۔''

عبداللہ نے کہا، ''یہ وہ ہی شیخ ابو حنیفہ ہیں جن کو آپ مبتدع بتاتے تھے۔''

اوزاعی کو اپنی غلطی پر افسوس ہوا۔

حج کی تقریب سے اوزاعی مکہ گئے تو (امام) ابو حنیفہ سے ملاقات ہوئی۔ انھیں مسائل کا ذکر آیا۔ اتفاق سے عبداللہ بن مبارک بھی موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اس خوبی سے تقریر کی کہ اوزاعی حیران رہ گئے۔ امام ابو حنیفہ کے جانے کے بعد مجھ سے کہا: اس شخص کے علم نے اس کو لوگوں کا محسود بنا دیا ہے۔ بلاشبہ میری بدگمانی غلط تھی۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام ابو حنیفہ نے فن حدیث میں امام اوزاعی کی شاگردی بھی کی ہے۔ اس کا غالباً یہی زمانہ ہوگا۔''

مولانا شبلی نے امام ابو حنیفہ کی فنِ حدیث میں امام اوزاعی کی شاگردی کا جو ذکر کیا ہے تو اس سے مراد ''سماع حدیث'' ہے۔ جہاں تک استادی اور شاگردی کا تعلق ہے امام ابو حنیفہ باقاعدہ طور پر مسلسل اٹھارہ برس تک ایک ہی استاد یعنی فقیہ عراق امام حماد بن ابی سلیمان کی شاگردی میں رہے۔ اور جہاں تک علم حدیث کی تحصیل و تکمیل کا تعلق ہے تو اس ضمن میں انہوں نے ہزاروں محدثین سے استفادہ کیا۔ مؤرخین روایت کرتے ہیں امام ابو حنیفہ نے چار ہزار علماء سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر مکی نے ''الخیرات الحسان'' میں لکھا ہے کہ امام صاحب نے چار ہزار اساتذہ سے حدیث حاصل کی۔ امام جلال الدین سیوطی کے ''تبیض الصحیفہ'' اور امام موفق مکی اور امام کردری نے ''مناقب امام اعظم'' میں امام صاحب کے بہت سے شیوخ و اساتذہ کے نام لکھے ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوئی کہ امام صاحب کے اساتذہ میں اکثر تابعین اور صحابہ کے شاگرد ہیں جن کی روایتیں کثرت سے صحاح ستہ میں موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک امام اوزاعی اور امام ابو حنیفہ کے درمیان مذاکراتی افادہ و استفادہ کا تعلق تھا نہ کہ استادی و شاگردی کا

—— اس لیے کہ دونوں اکابر کے مابین مباحثے اور مناظرے بھی ہوئے جو استاد اور شاگرد میں نہیں ہوتے۔ یہاں ہم مولانا شبلی ہی کی زبانی ایک مباحثے کا احوال بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ امام اوزاعی اور امام ابوحنیفہ کے مابین ہونے والے رفع یدین کے مسئلہ پر مباحثہ کے سلسلہ میں شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ''امام اوزاعی کہ اقلیم شام کے امام اور فقہ میں مذہب مستقل کے بانی تھے، مکہ معظمہ میں امام ابوحنیفہ سے ملے اور کہا کہ عراق والوں سے نہایت تعجب ہے کہ نماز میں رکوع سے سر اٹھانے کے وقت رفع الیدین نہیں کرتے حالانکہ میں نے زہری سے، انہوں نے سالم بن عبداللہ، انہوں نے عبداللہ بن عمر سے سنا ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان موقعوں پر رفع یدین کرتے تھے۔'' امام ابوحنیفہ نے اس کے مقابلے میں حماد، ابراہیم نخعی، علقمہ، عبداللہ بن مسعود کے سلسلہ سے حدیث روایت کی کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان موقعوں پر رفع یدین نہیں کرتے تھے۔'' امام اوزاعی نے کہا ''سبحان اللہ! میں ظاہری، سالم، عبداللہ کے ذریعے سے حدیث بیان کرتا ہوں، آپ اس کے مقابلے میں حماد، نخعی، علقمہ کا نام لیتے ہیں۔'' امام ابوحنیفہ نے کہا ''میرے رواۃ آپ کے رواۃ سے زیادہ ثقہ ہیں اور عبداللہ بن مسعود کا رتبہ تو معلوم ہی ہے، اس لیے ان کی روایت کو ترجیح ہے۔''

امام فخرالدین رازی نے اس مناظرے کو ''مناقب شافعی'' میں بھی تحریر کیا ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے کہ امام اوزاعی قاضی ہونے کے ساتھ ایک فقہی مذہب کے بانی بھی تھے۔ فقیہ شام امام اوزاعی کا مکتب فکر خالص محدثانہ اندازِ فکر کا حامل مذہب تھا جس کو بعض مصنفین و محققین نے شامی مذہب کا نام محض اس لیے دے دیا ہے کہ اس کے ڈانڈے کسی نہ کسی طرح ''رومی قانون'' سے ملائے جاسکیں جس میں قران و حدیث کی رائے کا کوئی خاص عمل دخل نہیں ہوتا۔ لیکن امام اوزاعی کا مکتب فکر ''اوزاعیہ'' کو کسی بھی لحاظ سے رومن لاء سے نسبت نہیں دی جاسکتی اور نہ ان کے مکتب فکر کو شامی مذہب ہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ امام اوزاعی کو امام شام کہا جاسکتا ہے لیکن ان کے مکتب

فکر کو ''مذہبِ شام'' یا ''شامی مذہب'' نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ امام اوزاعی امام داؤد ظاہری کی طرح قرآن و حدیث کے الفاظ کے ظاہری معنوں کو لائقِ اعتنا اور قابلِ عمل گردانتے تھے اور ان کے نزدیک رائے اور قیاس شغل بے کار تھا۔

برسٹل یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈی اولیری کی کتاب جو پہلے ۱۹۲۲ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی، اس کا ترجمہ ''فلسفۂ اسلام'' کے عنوان سے چھاپا گیا ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر ڈی اولیری نے اموی عہد کے دو فقہی مذاہب یعنی امام اوزاعی اور امام ابو حنیفہ کے فقہی مذہب کو بالترتیب شامی و ایرانی مذاہب کا نام دیا ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ اسلام پر رومی اور ایرانی اثرات کی پیداوار تھے اور امام اوزاعی کا شامی مذہب بھی رومی قوانین کے زیرِ اثر تھا۔ پروفیسر ڈی اولیری کے اکثر بیانات خلافِ واقعہ ہیں اور ان کی تحقیق سے اخذ شدہ نتائج محلِ نظر ہیں جن کی وضاحت کے لیے ایک طویل مضمون درکار ہے تاہم یہاں ہم صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اسلامی فقہ کی بنیاد قرآن و حدیث پر رکھی گئی ہے جس پر کسی علاقائی تہذیب کا غلبہ نہیں ہو سکتا اور پھر امام اوزاعی کے بارے میں خارجی عوامل سے متاثر ہونے والی بات تو بالکل ہی قرینِ قیاس نہیں کیونکہ امام موصوف کے جو افکار و نظریات سامنے آتے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ رائے اور قیاس کے قائل ہی نہیں تھے اور ہر معاملہ میں حدیث کو مقدم جانتے تھے۔ لہٰذا ان کے فقہی مذہب کو محض لفظ شام سے شامی یا رومی قوانین کے زیرِ اثر قرار دینا پروفیسر ڈی اولیری کی خام خیالی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کے فقہی مذہب کو ایرانی مذہب کا نام دینا یا اسے عجمی اور غیر اسلامی عناصر سے متاثر قرار دینا حنفی فقہ اور قرآن و حدیث دونوں سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے جس کے لیے ہماری زیرِ طبع کتاب ''عقائد اسلام اور امام اعظم'' ملاحظہ کریں۔

شیخ ابو زہرہ نے امام اوزاعی اور اُن کے ہم عصر ائمہ محدثین کے بارے میں عبدالرحمٰن بن مہدی کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''جن حدیث کے اماموں کی پیروی کی جاتی ہے وہ چار ہیں۔ سفیان کوفہ میں، مالک حجاز میں، اوزاعی شام میں، حماد بن زید بصرہ میں۔ پھر موازنہ کیا، سفیان ثوری اور اوزاعی میں۔ کہا کہ ''ثوری حدیث میں امام ہیں لیکن سنت میں امام نہیں ہیں اور اوزاعی سنت

میں امام ہیں لیکن حدیث میں امام نہیں ہیں اور مالک دونوں میں امام ہیں۔''

امام ابن مہدی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد ابو زہرہ لکھتے ہیں ''شاید حضرت مالک کی امامت... سنت اور حدیث میں اس لیے ہو سکی کہ وہ فقیہ تھے۔ وہ احادیثِ رسولؐ بھی حفظ کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی صحابہ اور تابعین کے فتووں سے بھی عالم تھے۔''

اس ضمن میں ڈاکٹر صبحی محمصانی لکھتے ہیں کہ اہل سنت کے دو بڑے گروہ ہیں ایک اہل الرائے کی جماعت جو عراق میں امام ابوحنیفہ کی قیادت میں قائم ہوئی اور دوسری اہل حدیث کی جماعت جو حجاز میں امام مالک بن انس کی زیر سرکردگی پیدا ہوئی۔ حافظ ذہبی کا بھی یہی خیال ہے۔ چنانچہ ''تذکرۃ الحفاظ'' میں امام اوزاعی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''آپ فرماتے تھے سلف صالحین کے نقش قدم پر چلو خواہ لوگ تم سے ناراض ہو جائیں اور لوگوں کے رائے و قیاس سے دور رہو۔''

امام اوزاعی کے اسی قول کو ان کے تذکرہ نویس حافظ مجیب اللہ ندوی نے قدرے وضاحت سے یوں بیان کیا ہے:

''سلف صالحین یعنی صحابہ و تابعین کے اقوال و اعمال کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ اگرچہ لوگ اُن میں تمہارا ساتھ نہ دیں۔ اس کے مقابلے میں اور کسی شخص کی رائے کو خواہ وہ کتنے ہی اچھے اور دل فریب پیرائے میں کیوں نہ پیش کی گئی ہو، کوئی اہمیت نہ دو، اور اس کے قبول کرنے سے پرہیز کرو۔ اس سے دین بھی واضح اور روشن رہے گا اور تم بھی راہِ راست پر قائم رہو گے۔''

حافظ مجیب اللہ نے امام اوزاعی کے مسلک ''اوزاعیہ'' کے اصول و مبادی اور اس مسلک کے ملک شام اور اندلس میں معمول بہ رہنے اور پھر اس کے ختم ہو جانے کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''امام اوزاعی کا یہ مسلک شام میں دو صدی تک اور اُندلس میں تقریباً ایک صدی تک زندہ رہا مگر اس کے بعد کچھ داخلی اور خارجی

اسباب ایسے پیدا ہوئے جس کی بناء پر یہ فنا ہو گیا۔ کن اسباب کی بناء پر یہ مسلک زندہ نہ رہ سکا اس کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے:

''امام اوزاعی کا ذہن کچھ قدرۃً بھی محدثانہ طرزِ فکر سے زیادہ ہم آہنگ تھا اور اُن کی تعلیم و تربیت بھی حدثنا و اخبرنا ہی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان سے پیش آمدہ مسائل میں استفسار کیا جاتا تھا تو وہ حدیث نبوی اور آثار صحابہ کی روشنی میں سادہ طور سے ان کا جواب دیتے تھے۔ زیادہ تدقیق اور فرضی قیاس آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ستر ہزار مسائل کا جواب حدیث و آثار کی روشنی میں دیا تھا۔ جب تک مسلمانوں میں سادہ اسلامی زندگی کا رواج رہا اُس وقت تک ان کے مسلک پر تعامل باقی رہا۔ مگر جب فقہاء کی ژرف نگاہی اور باریک بینی کا دور شروع ہوا اور انہوں نے مسائل کی تخریج و تفریع کی بھرمار کر دی تو امام اوزاعی کا سادہ اور ٹھیٹھ مسلک ان کی دِقت پسندی کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ اور اُن کا خالص محدثانہ مکتب فکر فقہی مکتب فکر کے سامنے شکست کھا گیا۔''

حافظ مجیب اللہ ندوی ہی نے امام اوزاعی کے مسلک کے بارے میں علامہ خضری کی کتاب ''تاریخ التشریع الاسلامی'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''اہل شام بہت دنوں تک اُن کے مسلک پر عمل کرتے رہے، پھر ان کا مسلک بنو امیہ کے اُن لوگوں کے ذریعہ اُندلس پہنچا جنہوں نے اُندلس میں جا کر اپنی حکومت قائم کی۔ پھر شام میں امام شافعی کے مسلک کے آگے اور اندلس میں امام مالک کے مسلک کے سامنے یہ کمزور پڑ گیا اور یہ تیسری صدی کے نصف میں ہوا۔''

حافظ مجیب اللہ ہی نے مؤرخ لسان الدین ابن الخطیب کے حوالے سے لکھا ہے:

''اہل اندلس اور اہل شام ابتداء میں امام اوزاعی کے مسلک کے پیرو تھے۔ مگر اُندلس کے تیسرے اُموی حکمران حاکم بن ہشام کے زمانہ میں فقہ و فتاویٰ کی مسند مالکی فقہاء نے سنبھال لی۔ پھر آہستہ

آہستہ مالکی مسلک کا وہاں عام چرچا ہوا اور اُندلس اور قرطبہ دونوں جگہ یہی مسلک رواج پذیر ہو گیا اور اس مسلک کے فروغ کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ حاکم نے خود اس مسلک کو اختیار کر لیا تھا۔ اس تبدیلی کا سبب یہ ہوا کہ بہت سے علمائے اندلس (تحصیل علم اور سماع حدیث کے لیے) مدینہ منورہ گئے۔ وہاں امام مالک کی مجلس درس برپا تھی۔ اس میں شریک ہو کر جب اُندلس واپس ہوئے تو امام مالک کے فضل و کمال اور جلالت علم کا چرچا ہوا۔ چنانچہ اہلِ اندلس اُن کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ (اور اُن کا مسلک اختیار کر لیا۔)

اس موضوع یعنی اہلِ اندلس کی تبدیلیٔ مسلک کے بارے میں حافظ مجیب اللہ مزید لکھتے ہیں:

''دوسری رائے یہ ہے کہ جب علمائے اندلس امام مالک کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے یہاں کے اموی حاکم کے عدل وانصاف اور سیرت و کردار کی تعریف کی ... امام مالک چونکہ عباسی حکومت کو اُس کے ظلم و تشدد کی وجہ سے پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ان کو اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی اور فرمایا کہ:

''ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے حرم (مکہ) کو تمہارے حکم ران (کے عدل و انصاف) سے مزین کر دے ... یہ بات جب اُندلس کے حکم ران تک پہنچی اور ساتھ ہی وہ امام مالک کی جلالت علم اور اُن کے دین وتقویٰ سے واقف ہوا تو اُس نے امام اوزاعی کے مسلک کو ترک کر دیا اور امام مالک کے مسلک کو اختیار کر لینے پر اہلِ اندلس کو آمادہ کیا۔''

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب امام اوزاعی کو وفات پائے پندرہ بیس برس کا عرصہ گزر چکا تھا اور امام مالک کے درسِ حدیث کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ امام اوزاعی نے ۱۵۷ھ میں اور امام مالک نے ۱۷۹ھ میں وفات پائی اور امام اوزاعی جب تک زندہ رہے اُن کے بنو امیہ کے ساتھ خوش گوار تعلقات استوار رہے۔

حکام سے بات چیت میں امام اوزاعی کی حق بیانی کے کئی واقعات تذکرہ نگاروں

نے درج کیے ہیں۔ ایک بار خلیفہ منصور نے بلایا تو اسے نصیحت کرتے ہوئے یہ حدیث بھی سنائی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ''جو حاکم رعیت پر ظلم و زیادتی کر کے چین کی نیند سوتا ہے خدا اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔''

امام اوزاعی نے عباسی خلفاء کا پسندیدہ سیاہ لباس پہننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ خلیفہ کے ندیم خاص ربیع نے ان سے سیاہ لباس پہننے کی بات کی تو فرمایا: ''سیاہ لباس نہ تو احرام میں استعمال ہوتا ہے نہ تجہیز و تکفین اور نہ ہی بیاہ شادی میں، پھر اس کو پہننے کی کیا ضرورت ہے؟''

مختلف کتب کے مطالعہ سے ان کے افکار و نظریات کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کے مطابق امام اوزاعی کا فتویٰ ہے کہ پانی کم ہو یا زیادہ اگر اس میں اتنی نجاست پڑ جائے جس سے کوئی تغیر واقع نہ ہو تو ان کے نزدیک وہ پاک ہے۔ امام ابوحنیفہ کی رائے ان سے مختلف ہے۔

سجدۂ سہو میں ان کا مسلک یہ تھا کہ اگر نماز میں کوئی کمی ہوئی ہو تو سجدۂ سہو سلام سے پہلے کرنا چاہیے اور اگر زیادتی ہوئی ہو تو سلام کے بعد۔ امام مالک کی بھی یہی رائے ہے۔

امام اوزاعی کے مطابق غسل جمعہ فجر سے پہلے بھی کیا جا سکتا ہے جب کہ دوسرے ائمہ کے یہاں اس کا استحباب طلوع سورج کے بعد شروع ہوتا ہے۔

امام اوزاعی کے طریقہ کے مطابق قربانی کے چمڑے کو فروخت کر کے اس سے ضرورت کی اشیاء خریدی جا سکتی ہیں۔ دوسرے ائمہ کا مسلک ہے کہ فروخت کے بعد قیمت کا صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

امام اوزاعی اللہ تعالیٰ کے مقیم عرش ہونے کے قائل ہیں جو حافظ ذہبی کا بھی مسلک ہے، اس لیے انہوں نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں امام اوزاعی کے احوال میں اللہ تعالیٰ کے عرش پر استوا کا دو مرتبہ ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''محمد بن کثیر کہتے ہیں، میں نے امام اوزاعی کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہم علمائے تابعین کے انبوہ میں کہا کرتے تھے، 'اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور ہمارا کتاب و سنت میں وارد ہونے والی اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر ایمان ہے۔''

امام اوزاعی اموی عہد میں قاضی شام کے عہدہ پر فائز تھے لیکن قرائن سے معلوم

ہوتا ہے کہ عباسی خلفاء سے وہ متفق نہ تھے اس لیے عباسی عہد میں انہوں نے ساری زندگی کوئی سرکاری عہدہ قبول نہ کیا۔ بہر حال عباسی خلیفہ نے جب بھی انہیں طلب کیا وہ اسے عمدہ نصیحتیں کر کے چلے آئے۔

خلیفہ منصور نے امام اوزاعی کو خط لکھا اور مشورہ کی درخواست کی۔ امام اوزاعی نے اپنے مختصر جواب میں لکھا: ''امیر المؤمنین! آپ اپنے اوپر تقویٰ لازم کر لیجیے اور تواضع اختیار کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دن بلند کرے گا جس دن زمین پر ناحق بڑا بننے والے متکبرین کو ذلیل کرائے گا۔ آپ خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ رسول اللہؐ سے آپ کی قرابت اللہ کے یہاں آپ کو حق سے زیادہ کچھ نہ دلا سکے گی۔''

امام ابو اسحاق فزاری کہتے ہیں: امام اوزاعی فرماتے تھے، ''پانچ چیزیں صحابۂ کرام اور تابعین عظام کا طغراء امتیاز تھیں، جماعت سے وابستگی، سنت کی اتباع، مساجد کی آبادی، قرآن حکیم کی تلاوت اور راہِ خدا میں جہاد۔''

امام اوزاعی کا قول ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تو اس میں بحث و مباحثہ اور جدال و مناظرہ کا دروازہ کھول دیتا ہے اور علم و عمل کے دروازے ان کے لیے بند کر دیتا ہے۔''

ولید بن مسلم کا قول ہے کہ عبادات میں امام اوزاعی سے زیادہ کوشش و اہتمام کرنے والا میں کسی کو نہیں دیکھا۔ ابو مسہر کا بیان ہے کہ ''اوزاعی رونے میں اور نماز میں قرآن کی تلاوت میں رات ختم کر لیا کرتے تھے۔''

امام محی الدین نووی ''تہذیب الاسماء'' میں لکھتے ہیں:

> ''امام اوزاعی کی امامت، جلالت شان، علو و مرتبت اور فضل و کمال پر سب کا اتفاق ہے۔''

امام اوزاعی شام میں اس قدر مقبول تھے کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ شام کے بعض امراء نے ان کے بارے میں کوئی سخت قدم اٹھانا چاہا تو ان کے ہم نشینوں نے متنبہ کیا کہ ''ان کو نہ چھیڑو۔ خدا کی قسم اگر اہلِ شام کو وہ تمہارے قتل کا حکم دے دیں تو وہ تم کو قتل کر دیں گے۔''

حافظ مجیب اللہ ندوی نے امام اوزاعی کے بعض اہم اقوال نقل کیے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعی کا قول ہے کہ ''جب تمہیں کوئی حدیثِ نبوی صحیح طریقہ سے مل جائے تو

پھر اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ رسولؐ جو کچھ فرماتے تھے وہ اللہ کے مبلغ کی حیثیت سے فرماتے تھے۔'' امام اوزاعی فرماتے تھے: ''حقیقی علم وہ ہے جو صحابہ کرام سے ثابت اور منقول ہے اور جو اُن سے ثابت نہ ہو وہ علم نہیں۔''

یہ بھی امام اوزاعی کا قول ہے: ''حضرت علیؓ اور حضرت عثمان دونوں کی محبت ایک مومن ہی کے قلب میں جمع ہوسکتی ہے۔'' امام اوزاعی فرماتے تھے کہ ''جو واعظ خدا کی رضا کے لیے وعظ نہیں کہتا اُس کی باتیں دل سے اس طرح نکل جاتی ہیں جس طرح پتھر کے اوپر سے پانی۔'' فرمایا، ''مومن بات کم کرتا ہے اور عمل زیادہ اور منافق عمل کم کرتا ہے اور بات زیادہ۔''

امام اوزاعی اور ان کے مکتب فکر ''اوزاعیہ'' کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو امام ابو یوسف کی تالیف ''سیر الاوزاعی'' اور ''محاسن المساعی فی مناقب الامام ابی عمرو الاوزاعی؛ نیز ہماری کتاب ''چار ہم عصر امام —— ایک تاریخی مطالعہ''۔

امام اوزاعی سنت نبویؐ پر بہت زور دیتے تھے۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ ''سنت نبویؐ پر جم جاؤ اور اہلِ سنت کا جو موقف ہے وہی تم اختیار کرو۔ سلف صالح کے راستے پر چلو، ایمان بغیر زبان کی شہادت کے استوار اور درست نہیں ہوتا اور ایمان و قول بغیر عمل کے درست نہیں ہوتے اور یہ تینوں چیزیں حسب سنت نبویؐ نیت کے بغیر درست نہیں ہوتیں۔'' کسی نے پوچھا کہ اس حدیث: اکثر امتی دخولا فی الجنة اھل اللہ میں اھل اللہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ فرمایا ''جو صرف بھلائی ہی جانتے ہیں، برائی اور شر سے وہ واقف ہی نہیں ہیں۔''

حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ان کی وفات کے حوالے سے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کے مطابق امام اوزاعی کی وفات بڑے دردناک انداز میں ہوئی۔ یہ واقعہ صفر یا ربیع الاوّل ۱۵۷ھ میں بیروت میں پیش آیا۔ وہ ایک حمام میں تھے کہ حمام کا مالک غلطی سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ اندر آگ جل رہی تھی اور تازہ ہوا کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دم گھٹ جانے سے وفات پا گئے۔ جب صاحبِ حمام نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ آپ کا داہنا ہاتھ سر کے نیچے اور قبلہ رُو فرش پر بے دم پڑے تھے۔

ایک روایت کے مطابق آپ کی اہلیہ نے لاعلمی میں دروازہ بند کر دیا تھا۔

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ آپ کی قبر بیروت کی ایک مضافاتی بستی میں ہے جو

باب بیروت پر ہے۔ اُسے حنتوس کہا جاتا ہے اور اُس کے باشندے مسلمان ہیں اور امام اوزاعی مسجد کے قبلہ میں دفن ہیں اور اہل بستی یہ نہیں جانتے کہ یہاں کون دفن ہیں بلہ کہتے ہیں کہ یہ ایک صالح شخص کی قبر ہی جس پر نور نازل ہوتا ہے۔

قاضی موسیٰ ثقفی

قاضی موسیٰ بن یعقوب ثقفیؒ کا شمار پہلی اور دوسری صدی ہجری کے اکابر علمائے دین میں ہوتا ہے۔ وہ امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت، امام جعفر صادق، امام اوزاعی اور امام لیث بن سعد اور امام اعمش کے معاصرین میں سے تھے۔ علوم عربیہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے عالم تھے۔ ان کا نام ونسب یوں ہے۔

موسیٰ بن یعقوب بن محمد بن شیبان بن عثمان ثقفی۔ فاتحِ سندھ محمد بن قاسمؒ کے ساتھ سندھ میں آئے تھے اور محمد بن قاسم نے ان کو ارور کا قاضی مقرر کیا تھا۔

پروفیسر مخدوم امیر احمد اپنے مضمون بعنوان سرزمینِ سندھ میں علمِ حدیث مطبوعہ ''الرحیم'' اشاعت ماہ جولائی ۱۹۶۳ء میں لکھتے ہیں:

''موسیٰ بن یعقوب ثقفی اروری سندھی کی پیدائش عرب میں ہوئی، وہاں علمی کمال حاصل کیا اور محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آئے۔ سندھ فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے انہیں ''ارور'' کا قاضی اور سندھ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔''

مولانا سید عبدالحئی حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں لکھتے ہیں:

> ''موسیٰ بن یعقوب بن محمد بن شیبان بن عثمان ثقفی فقیہ کو ۹۳ھ میں وقت کے حکمران محمد بن قاسم ثقفی نے شہر ''ارور'' میں قضاء اور خطابت کے دونوں عہدے سپرد کئے اور یہ دونوں عہدے ان کی اولاد میں کئی سو سال تک رہے۔ یہ لوگ صدر، امام اجل، بدر ملت والدین، سیف السنۃ، نجم الشریعت ایسے القاب سے پکارے جاتے تھے۔''

حجاج بن یوسف ایک عظیم المرتبت سپہ سالار ہونے ساتھ انتہائی ذہین و زیرک تعلیم یافتہ شخص تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ملکوں کو فتح کر کے ان میں اسلام پھیلانا چاہتا تھا۔ جیسا کہ اس کے محمد بن قاسم کے نام لکھے ہوئے خطوط سے ظاہر و ثابت ہے۔ سرزمین سندھ پر اس کی توجہ شروع ہی سے مرکوز تھی اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اسلامی مملکت میں جرائم کر کے بہت سے عرب سرداروں نے راجہ داہر کے پاس آ کر پناہ لے رکھی تھی اور وہ ان مجرموں کو کسی قیمت پر حجاج کے حوالے کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ چنانچہ حجاج نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کو متعدد عرض داشتیں اس مضمون کی بھیجی تھیں کہ اسے سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ عبدالملک سندھ پر حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ان درخواستوں کو نامنظور کر کے حجاج کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ان تمام درخواستوں کو ''زیر تجویز'' (pending) رکھ چھوڑا تھا۔ حتیٰ کہ وہ وفات پا گیا۔

عبدالملک کے بعد جب اس کا بیٹا ولید بن عبدالملک خلیفہ بنا اور اس دوران راجہ داہر کے سپاہیوں نے عربوں کے جہازوں کو لوٹ کر انہیں قیدی بنا لیا تو حجاج نے ایک بار پھر سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ ولید نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ شاہی خزانہ اس حملے کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جس کے جواب میں حجاج نے لکھ بھیجا کہ سندھ کی مہم پر جو اخراجات ہوں گے وہ اس سے دوگنی رقم خزانے میں جمع کرائے گا۔ اب ولید بن عبدالملک کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا، سوائے اس کے حجاج کی بات کو مانے اور اسے سندھ پر حملہ آور ہونے کی اجازت دے۔ چنانچہ اجازت ملتے ہی حجاج بن یوسف نے فتح سندھ کے لئے زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ چھ ہزار بہادر شامی لشکر سے، اور بکثرت جواں مرد دوسرے لشکروں سے انتخاب کئے، چھ ہزار تیز رفتار سانڈنیاں ان مجاہدین کی سواری کے لئے دیں۔ اس کے علاوہ بوجھ لادنے والے کئی ہزار اونٹ ساتھ کئے۔ اس اہتمام سے اس لشکر کا سروسامان کیا کہ اہلِ لشکر کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی تھی مہیا کر دیں۔ یہاں تک کہ سوئی دھاگا تک بھی ان کے ساتھ روانہ کیا۔

پھر جب سندھ اور اس کے ساحلی علاقوں کی آب و ہوا، جس کے عرب مجاہدین عادی نہ تھے، کی وجہ سے وہ بیمار پڑ گئے اور انہیں علاج کے لئے سرکہ کی ضرورت پڑی تو حجاج کی ہدایت کے مطابق روئی سرکہ میں بھگو کر سائے میں خشک کی گئی اور اس روئی کے گٹھے بندھوا کر سندھ روانہ کئے گئے تا کہ اس روئی کو پانی میں بھگو کر اس پانی کو چھان لیا

جائے تو سر کٹ کر الگ ہو جائے گا۔ اس واقعہ سے حجاج کی فہم و فراست اور سندھ کی مہم میں اس کی زبردست دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ عام سامان رسد کے ساتھ تیس ہزار دینار بھی ساتھ گئے تاکہ فوج کو اخراجات کی تکلیف نہ ہو۔ علاوہ ازیں فوجی ضرورتوں کا تمام سامان جہازوں پر لاد کر دیبل بھیجا۔ جس میں کئی منجنیقیں تھیں، جن سے دشمنوں کے قلعے پر پتھر پھینکے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام ''عروس'' یا ''عروسک'' تھا جسے پانچ سو آدمی حرکت میں لاتے تھے۔ اس طرح مختلف النوع پیشوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور ہنرمندوں کے علاوہ علماء و فضلا کو بھی لشکر کے ساتھ کیا جن میں سے موسیٰ بن یعقوب ثقفی بھی تھے۔

حجاج بن یوسف نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خط و کتابت کے ذریعے سندھ میں ہر قدم، ہر مرحلے اور ہر مسئلے میں محمد بن قاسم کی مسلسل رہنمائی کرتا رہا اور محمد بن قاسم نے حجاج کی ہدایات پر سختی سے عمل کیا، اس لئے کہ محمد بن قاسم کو سندھ روانہ ہونے سے پہلے حجاج نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ ہر اقدام کرنے سے پہلے اس کی ہدایات کا انتظار کرے اور پھر ان ہدایات کے مطابق عمل کرے۔ ''چچ نامہ'' اور یحییٰ ابن احمد البلاذری کی ''فتوح البلدان'' میں فتح سندھ کے بارے میں یہ تمام تفصیلات ملتی ہیں جن کو ہم یہاں بیان کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان مؤرخین نے لکھا ہے کہ دیبل کی فتح سے پہلے محمد بن قاسم نے جعونہ نامی نشانہ باز سے گفتگو کرنے کے بعد حجاج بن یوسف کو خط لکھا جس میں اسے ساری صورتِ حال سے مطلع کیا۔ حجاج کو اس جنگ سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اس نے محمد بن قاسم سے سندھ کی لڑائی کے حالات جاننے کے لئے خط و کتابت کا اس قدر عمدہ انتظام کیا تھا کہ سندھ کا ہر خط ساتویں دن بصرہ میں اس کو مل جاتا تھا، اور ایک ہفتے میں اس کا جواب سندھ پہنچ جاتا تھا۔ حجاج کو جب یہ خط ملا تو اس نے جواب میں لکھا کہ جعونہ کی شرائط منظور ہیں۔ جب تم جنگ شروع کرو تو فوج کو اس طرح ترتیب دو کہ سورج تمہاری پشت پر رہے تاکہ تم دشمنوں کی حرکت کو اچھی طرح دیکھ سکو، دن کے ابتدائی حصے میں جنگ شروع کر دو، جنگ شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے نصرت اور مدد طلب کرو، اگر سندھ کا کوئی شخص رحم اور پناہ کے لئے درخواست کرے تو اسے امن دو، لیکن دیبل والوں کو بالکل پناہ نہ دو۔ حجاج نے یہ بھی لکھا ہے کہ عروسک نامی منجنیق کو مشرق کی سمت گاڑ کر اور ایک پایہ کم کر کے مندر کے گنبد کو نشانے پر لے کر سنگ باری کرو، پھر یقیناً فتح

تمہاری ہوگی۔

دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نیرون کی طرف روانہ ہوئے تو سیسم کے مقام پر حجاج کا خط ملا جس کا مکمل متن ''چچ نامہ'' میں درج ہے۔ یہاں اس خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

''حجاج بن یوسف کی طرف سے محمد بن قاسم کی جانب جاننا چاہئے کہ ہمارے دلی ارادوں اور ہمت کا تقاضہ یہ ہے کہ تمہیں ہر حال میں کامیابی حاصل ہو اور انشاء اللہ تم کامیاب اور فتح مند ہوگے اور اللہ عزوجل کے احسان سے دشمن دنیا کی سزا اور عاقبت کے عذاب میں ہمیشہ گرفتار اور مغلوب رہے گا... اپنے رفیقوں کے ساتھ ایک پُرمسرت زندگی بسر کرو اور ہر ایک کے ساتھ احترام اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ... اشیاء کی قیمتیں مقرر کرو تاکہ تمہارے کیمپ میں غلہ سستا ملے... جب تم ملک فتح کر چکو اور قلعوں کو مضبوط کر لو تو اس کی کوشش کرو کہ وہاں کے لوگ مطمئن زندگی بسر کریں، مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کی دلجوئی کرو، تاکہ کسان، پیشہ ور اور تاجر مرفہ الحال اور آسودہ ہوں اور ملک سرسبز و شاداب رہے... ۲۰ رجب ۹۳ھ۔''

حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو حکم دے رکھا تھا کہ جو شہر فتح ہو اس میں مسجد تعمیر کی جائے، چنانچہ ''چچ نامہ'' میں مرقوم ہے کہ نیرون کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے وہاں ایک مسجد تعمیر کروائی اور مسجد کے امام و مؤذن مقرر کر کے حکم دیا کہ پانچوں وقت اذان دی جائے اور باجماعت نماز ادا کی جائے... ہم نے حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم کے مابین ہونے والی خط و کتابت کو مختصراً بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی وضاحت ضروری ہے کہ ہر جانب سے آنے والے خط کا آغاز اللہ کے پاک نام یعنی 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' سے ہوتا تھا۔

''چچ نامہ'' کے مطابق محمد بن قاسم ابھی سیسم ہی میں تھے کہ انہیں حجاج بن یوسف کا خط ملا جس میں لکھا تھا۔ ''اب تم آگے بڑھنے کا خیال چھوڑ کر واپس نیرون آ جاؤ اور دریائے سندھ عبور کر کے داہر سے مقابلہ کرو، ساتھ ساتھ خدا سے ہر وقت دعا کرتے رہو کہ خدائے تعالیٰ تم کو نصرت و کامیابی عطا فرمائے، میرا خیال ہے جب تم داہر کے مقابلہ

میں فتح حاصل کرو گے تو پھر بقیہ ملک فتح کرنے میں کوئی جھگڑا باقی نہ رہے گا۔"

"چچ نامہ" کے مطابق محمد بن قاسم نے اس خط کا جو جواب لکھا اس کا مضمون یہ تھا:

"خادم محمد بن قاسم کی طرف سے بعد سلام عرض ہے کہ خدا کے فضل سے آپ کا یہ مخلص تمام امیروں، خادموں، غلاموں اور مسلمان فوجوں اور لشکر کے ساتھ بخیریت ہے اور ہر بات بہتر طریقے پر انجام پا رہی ہے، سب لوگ خوش ہیں۔

جناب والا کو معلوم ہو کہ ہم جنگلوں اور خطرناک راستوں کو طے کر کے سندھ کے علاقے میں پہنچے، اب ہم دریائے سندھ کے کنارے پر ہیں جس کو مہران کہتے ہیں... نیرون کا قلعہ ہمارے قبضہ میں آ چکا ہے۔ سیسم اور سیوستان کا قلعہ خدا کے فضل سے ہمارے قبضے میں ہے، امید ہے کہ اسی طرح کافروں کے تمام قلعے ہمارے قبضے میں آ جائیں گے، اور ہر جگہ مسجدیں بنا دی گئی ہیں تاکہ پانچوں وقت نماز اور عبادت ہوتی رہے۔ چنانچہ ان مساجد میں اذان، نماز اور خطبے اپنے وقت پر ہوتے ہیں۔

امیر کبیر کو یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ داہر کے گورنروں میں سے ایک ہمارا خیر خواہ ہے، اس نے ہم سے امیدیں وابستہ کر کے التجا کی ہے کہ ہم اس سے عہد نامہ مستحکم کریں۔ اگر خدا کے فضل سے یہ تدبیر کارگر ہو گئی تو ہمیں دریا کے عبور کرنے میں بڑی سہولت ہو گی اور اللہ کے حکم سے سب کچھ درست اور ٹھیک ہو گا"...

محمد بن قاسم کے اس خط کے جواب میں حجاج بن یوسف نے اس مضمون کا خط لکھا:

> "ہمارے فرزند عزیز کریم الدین محمد قاسم! ام اللہ تمکینہ، تمہارا خط جو انواع و اقسام کے تکلفات اور طرح طرح کی تعظیمات سے آراستہ تھا، ملا۔ وہ تمام معاملات جو اس خط میں درج تھے معلوم ہوئے، آخر اے بیٹے! یہ کیا ہے اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنی رائے، تدبیر اور عقل کو استعمال نہیں کرتے، اے کاش تم مشرق کے سارے بادشاہوں کو مغلوب کرو اور کافروں کے شہروں کو برباد کرو، تم اس مہم پر غالب آنے سے کیوں عاجز ہو؟۔ وہ (کفار) لشکر اسلام سے مدافعانہ جنگ کے منصوبے مرتب کر رہے ہیں، تم قوی دل ہو اور جس قدر بھی خرچ کر سکو، کرو اور مخالفوں کے حق میں بخششوں اور انعامات کی بارش کرو، ان کی التجاؤں کو قبول کر کے

اپنے فرامین اور امن ناموں سے ان کو تسلی دو۔ کیونکہ سلطنت حاصل کرنے کے چار طریقے ہیں، اول صلح، ہمدردی، چشم پوشی اور رشتہ داری۔ دوسرے مال کا خرچ کرنا، انعام اور عطیے دینا، تیسرے دشمنوں کی مخالفتوں کے طوفانوں میں صحیح رائے قائم کرنا اور ان کے مزاج کو معلوم کرنا۔ چوتھے رعب، ہیبت، دلیری اور قوت و دبدبہ۔ تمہیں ہر طرح سے ان دشمنوں کے دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے... اگر کسی کو قاصد بنا کر بھیجنا ہو تو وہ شخص ایسا ہونا چاہئے کہ اس کی عقل، مذہب، دور اندیشی، ذہانت اور امانت پر تمہیں اعتماد ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی غلط آدمی کے بھیجنے کی وجہ سے، اس کی گفتگو اور بات چیت سے کوئی نقصان پہنچ جائے... مسلمانوں کا قاصد پاک مذہب ہونا چاہئے کہ بات پُرشکوہ انداز میں بغیر کسی کمی بیشی کے ادا کرے اور ان کو توحید پر ایمان لانے کی دعوت دے اور انہیں بتائے کہ جو اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کر کے اطاعت کرے گا، اسے مال، شہر، زمین اور کھیت عطا کئے جائیں گے، اور جو اسلام کے سامنے سر نہ جھکائے تو اسے دھمکی دو تاکہ وہ فرمانبردار ہو جائے۔ اگر اس کے باوجود اطاعت سے سرکشی کرے تو پھر اس سے صاف صاف کہہ دو کہ تم نے اطاعت سے منہ موڑا ہے۔ اس لئے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، لیکن داہر اور اس کے لشکر کو دریائے مہران (سندھ) عبور کرنے کا اختیار نہ دو... جس جگہ بھی دشمن کا مقابلہ کرو وہ جگہ کشادہ ہونی چاہئے، تاکہ مرد مرد کو اور سوار سوار کو برابر جولاں دیکھ سکے۔ یہ سب کچھ ہونے پر بھی جب جنگ شروع کرو تو اللہ تعالیٰ کے کرم پر توکل کرو، اور اس کی رسی کو مضبوط پکڑو اور دیکھو کہ قضا و قدر پردۂ شب سے کیا ظاہر کرتی ہے اور وہاں سے کس فریق کی بادشاہی ختم ہونے کا حکم جاری ہوتا ہے"...

یہ خط کافی طویل ہے۔ اس خط کے پہنچنے پر محمد بن قاسم جنگ کا پختہ ارادہ کر کے دریا کو عبور کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اور اب اسے حجاج کے حکم کا انتظار تھا۔ چنانچہ حجاج

کا اگلا خط موصول ہونے پر حجاج کی ہدایات کے مطابق محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کو عبور کر کے داہر کی فوج کو شکست دی۔ گویا کہ دنیا کا سب سے کم سن فاتح محمد بن قاسم دنیا کے سب سے بڑے جنگی منصوبہ ساز اور جلیل القدر جرنیل حجاج بن یوسف کی بصرہ سے جاری ہونے والی ہدایات کے مطابق عمل درآمد کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ چنانچہ محمد بن قاسم کی اسی صلاحیت اور استعداد کار کی وجہ سے سرزمین سندھ میں واقع ہر مقام پر فتح و نصرت اور کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومتی رہی اور جب تک حجاج زندہ رہا فتوحات کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ حجاج کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ولید بن عبدالملک بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک خلیفہ بنا اس نے محمد بن قاسم کو واپس بلوا لیا۔ اموی خلیفہ سلیمان نے محمد بن قاسم کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تاریخ اسلام کا ایک سانحہ عظیم ہی نہیں بلکہ تاریخ اقوام عالم کا ایک انتہائی اور دل خراش و جگر پاش باب ہے۔ حجاج بن یوسف اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہتا تو محمد بن قاسم نے ہندوستان کے علاوہ چین اور اس کے ملحقہ ممالک فتح کر لینے تھے اور اس طرح موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیادہ جو اس وقت یورپ میں اندلس کو مکمل طور پر فتح کر چکے تھے وہ اتنی صلاحیت اور قوت کے مالک تھے کہ یورپ کے دوسرے ملکوں کو بھی زیر نگیں بنا سکتے تھے۔ بہر حال حجاج نے اپنی وفات سے پہلے اپنے وعدے کے مطابق مہم سندھ پر اٹھنے والے اخراجات کی دوگنی رقم نہیں بلکہ دس گنا رقم ولید بن عبدالملک کے عہد میں خزانے میں جمع کرا دی اور ظالم و متکبر اور مغرور راجا داہر کا ''سر'' بھی۔

برصغیر میں فقہی امور و مسائل کا آغاز بھی اسی روز ہو گیا تھا جب سندھ فتح ہوا تھا۔ ہندوؤں نے اپنی حیثیت اور اپنی عبادت گاہوں یعنی مندروں کی پوزیشن واضح کرنے کا سوال اٹھایا تو فاتح سندھ نے حجاج بن یوسف کی ہدایات کے مطابق اعلان کیا۔ ہندوؤں کے بت خانے بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور آتش پرستوں کے آتش کدوں کی طرح ہیں اور ہندوؤں کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ سندھ کی اسلامی سلطنت میں اس حیثیت سے رہیں جس حیثیت سے عراق، ایران اور شام کے یہودی، عیسائی اور پارسی رہتے ہیں۔ محمد بن قاسم کے اس اعلان کے ساتھ ہی برصغیر کی فقہی تاریخ کا آغاز ہو گیا۔

اسی طرح سرزمین سندھ میں اسلامی علوم کے وسعت و فروغ کے باقاعدہ آغاز اور

ان کی اشاعت و ترویج کے بارے میں سب سے پہلا تحریری ثبوت بھی محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے وقت سے ملتا ہے۔ چنانچہ کتب تاریخ، بالخصوص ''چچ نامہ'' میں لکھا گیا ہے کہ اسلامی فوج میں بہت سے قاری حضرات تھے جن کے نام حجاج بن یوسف نے یہ تاکیدی ہدایات جاری کی تھیں کہ وہ قرآن مجید کی قرات پابندی کے ساتھ کریں۔ اس زمانے میں قرآن حکیم کے عالموں کو قراء یا قاری کہا جاتا تھا۔

ان قراء میں ایک موسیٰ بن یعقوب ثقفی بھی تھے جن کے بارے میں ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی کتاب ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (The contribution of India to the study of Hadith literature) میں ''چچ نامہ'' اور ایلیٹ کی ہسٹری کے حوالے سے لکھا ہے کہ موسیٰ بن یعقوب ثقفی محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آئے اور محمد بن قاسم نے ان کو ''ارور'' کا قاضی مقرر کیا۔ قاضی ثقفی مستقل طور پر سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ سنت رسول کے بڑے عالم تھے۔ اوچ میں ان کا خاندان مدتِ مدید تک علم و فضل کے لئے مشہور رہا۔ جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ فتح سندھ کے صدیوں بعد ۶۱۳ھ میں اسماعیل بن علی ثقفی جو قاضی موسیٰ ثقفی کی اولاد میں سے تھے ''معدنِ علم اور روح عقل'' تصور کئے جاتے تھے اور علم و تقویٰ اور فصاحت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

قاضی موسیٰ بن یعقوب ثقفی کے سن وفات کے بارے میں کتب تاریخ خاموش ہیں۔

ابوموسیٰ اسرائیل بصری

ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری نزیل ہند دوسری صدی ہجری کے نامور محدث اور ثقہ راوی تھے۔ انہیں تبع وتابعی ہونے کے علاوہ امام حسن بصریؒ کے شاگردِ رشید ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ان کا پورا نام ونسب یوں ہے:

اسرائیل ابن موسیٰ بصری نزیل ہند اور کنیت ابوموسیٰ تھی۔

چونکہ بصرہ سے نقل وطن کر کے سندھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے ''نزیل سندھ'' کہلائے۔ بعض مؤرخین نے ''نزیل ہند'' لکھا ہے۔ اس لئے کہ لفظ سندھ تو سندھ ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور عرب برصغیر کے دیگر تمام علاقوں کے لئے ''ہند'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا صوبہ سندھ طلوع اسلامی کے وقت بہت وسیع وعریض تھا۔ بالخصوص راجا داہر کے زمانے میں جس ملک کو سندھ کے نام سے موسوم کرتے تھے وہ مغرب میں مکران تک، جنوب میں بحر عرب اور گجرات تک، مشرق میں موجودہ مالوہ کے وسط اور راجپوتانہ تک اور شمال میں ملتان سے گزر کر جنوبی پنجاب کے اندرونی علاقوں تک پھیلا ہوا ایک وسیع وعریض ملک تھا اور اس سارے علاقے کو سندھ کہا جاتا تھا۔

مولانا عبدالحئ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کا نام ''اسرائیل بن موسیٰ بن ابو موسیٰ بصری نزیل ہند'' لکھا ہے۔ جبکہ پروفیسر محمد اسحاق نے حافظ ذہبی کی ''میزان'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا لقب نزیل السند تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے

ترک وطن کر کے سندھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بصرہ کے باشندے تھے اور تجارت کی غرض سے سندھ میں آئے تھے۔

فاتحِ سندھ محمد بن قاسم ۹۲ھ میں مجاہدین کے ساتھ سندھ میں وارد ہوئے اور حجاج بن یوسف کی ہدایات کے مطابق بہت جلد دیبل سے لے کر ملتان تک وسیع و عریض علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس طرح عرب و سندھ کے مضبوط سیاسی تعلقات کا آغاز ہوا۔ محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح سندھ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ حجاج بن یوسف کے منصوبہ کے مطابق اسلامی فتوحات کے پہلے مرحلے میں سندھ مسخر ہوا اور برصغیر سے کٹ کر خلافت اسلامیہ کا حصہ بن گیا۔ محمد بن قاسم کی بے مثال جرات و بہادری، عزم و استقامت اور اہل سندھ کے ساتھ اس کے حسنِ سلوک نے یہاں کے عوام و خواص، امیر و غریب اور ادنیٰ و اعلیٰ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ محمد بن قاسم کی رواداری، عوام دوستی، رعایا پروری، محبت و شفقت اور نرم روی اور اس پر مستزاد یہ کہ حجاج بن یوسف ایسے تجربہ کار جرنیل اور دنیا کے عظیم ترین جنگی منصوبہ ساز کی مسلسل و متواتر حکمت آمیز اور جرات آموز ہدایات نے نہ صرف سندھ ایسے دور دراز علاقے کی فتح کو یقینی بنا دیا تھا بلکہ سندھ کے مقامی باشندوں کے دل جیت لئے تھے اور وہ محمد بن قاسم اور مجاہدینِ اسلام کو اپنا ''نجات دہندہ'' سمجھنے لگے تھے۔

محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے پہلے کے حالات بیان کرتے ہوئے فاضل ہند و مؤرخ ڈاکٹر تارا چند اپنی کتاب ''مختصر تاریخ اہلِ ہند'' میں لکھتے ہیں کہ ''چچ ایک متعصب حاکم تھا اس نے اپنی رعایا کے ایک حصے کے لئے سخت جابرانہ قوانین نافذ کر رکھے تھے۔ انہیں ہتھیار رکھنے، ریشمی لباس پہننے اور گھوڑوں پر زین ڈال کر سوار ہونے کی ممانعت کر دی تھی اور اس طرح کے متعدد توہین آمیز احکام جاری کئے تھے۔ مثلاً انہیں حکم دیا کہ وہ ننگے پاؤں اور برہنہ سر اور کتوں کو ساتھ لے کر چلا کریں''۔ لیکن محمد بن قاسم اور اس کے بعد سندھ میں آنے والے عرب حکمرانوں نے جو اندازِ حکومت اختیار کیا وہ نہ صرف چچ کے ظالمانہ طور طریقوں سے قطعی مختلف تھا بلکہ قرآنی تعلیمات اور احکامِ اسلامی کی پابندی کا مظہر بھی تھا۔

برہمن آباد کی فتح کے موقع پر محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کی ہدایات کے مطابق اعلان کیا کہ ''جو لوگ بخوشی مسلمان ہو گئے ہیں ان کے حقوق عرب مسلمانوں کے

مساوی ہوں گے اور وہ غلامی اور جزیہ سے مستثنیٰ ہوں گے، اور جو لوگ اپنے مذہب پر رہیں گے ان پر ان کے مذہب کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں کی جائے گی۔ انہیں صرف چند روپے سالانہ جزیہ دینا ہوگا... برہمنوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو انہیں راجا داہر کی حکومت میں حاصل تھے۔ مندروں کے لئے جو املاک اور جائیدادیں چلی آتی تھیں ان میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔''

سرکاری مال گزاری میں سے برہمنوں کے لئے وظیفے مقرر کئے گئے اور شہر کے تاجروں، کسانوں، ہنرمندوں اور شہریوں میں سے جن کا مال جنگ میں لٹ گیا تھا اور جن کی تعداد کم و بیش دس ہزار تھی، ان میں ایک لاکھ بیس ہزار درہم تقسیم کئے گئے تاکہ وہ اپنی حالت کو درست کر سکیں اور اچھے شہریوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔

محمد بن قاسم کے ان فیاضانہ اقدامات اور اس کے حسنِ سلوک کے مقامی باشندوں پر مثبت اور خوشگوار اور خوش آئند اثرات مرتب ہوئے اور مسلمان فاتحین کا عمدہ روّیہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں ممد و مددگار ثابت ہوا۔ اور مسلمانوں کے اقتدار کو استحکام حاصل ہوا۔
''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کی جلد دوم کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر محمد یوسف نے مختلف تاریخی حوالوں سے لکھا ہے کہ اس دور کی اسلامی فتوحات کی نمایاں خصوصیت سیاسی اقتدار کی حیرت انگیز تیز رفتار، غیر متزلزل توسیع نہیں بلکہ سیاسی اقتدار کے جلو میں دین اسلام، عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم و فنون کی دلربائی اور کارفرمائی ہے۔ عرب پہلے ہی اپنی زبان پر کیا کم نازاں تھے، اسلام نے ''لسان عربی مبین'' کو وہ شرف اور توانائی بخشی کہ اس کی برتری تمام مسلمانوں کے لئے ایک حقیقت بن گئی۔

تاریخ کی کتب معتمدہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم ملتان کی فتح کے بعد راجپوتانے کی فتوحات کی تیاریاں کر رہا تھا اور اُس کا ارادہ جنوبی ہند کی ریاستوں کو زیرنگین بنانے کے بعد پنجاب اور کشمیر کے راستہ سے چین پہنچنے کا تھا۔ ادھر حجاج بن یوسف کے ایک جرنیل قتیبہ بن مسلم نے پورے ترکستان جکو اپنی ترک و تاز کا میدان بنا رکھا تھا۔ قتیبہ حجاج بن یوسف کی ہدایات کے مطابق وسط ایشیا کے تمام ملکوں کو فتح کر کے خاقانِ چین سے ٹکر لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ حجاج کی منصوبہ بندی کے تحت قتیبہ ۹۰ ہجری میں بخارا، ۹۱ ہجری میں نیزک اور ۹۳ ہجری میں سمرقند اور خوارزم اور ۹۴ ہجری میں شاش اور فرغانہ کی شاندار فتوحات حاصل کرنے کے بعد چین پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ خاقان چین

اہل ترکستان کا پشت پناہ تھا اور انہیں مسلمانوں کے خلاف کمک بھیجتا رہتا تھا اور ان کی مالی امداد بھی کرتا تھا۔ چنانچہ حجاج کے سپہ سالار قتیبہ بن مسلم نے ترکستان میں اپنی فتوحات کو مکمل کرنے کے بعد خاقان چین کو ترکوں کی امداد و اعانت کی پاداش میں سزا دینے کا عزم کیا۔ قتیبہ نے خاقان چین کی خواہش پر اپنا ایک وفد اس کے دربار میں بھیجا اور اپنے وفد میں شامل افراد کو ہدایت کی کہ وہ خاقان چین کو یہ باور کرا دیں کہ اُن کے سپہ سالار قتیبہ بن مسلم نے یہ قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک تمہاری زمین کو اپنے پاؤں تلے پامال کر کے خراج وصول نہ کر لے گا واپس نہ جائے گا۔ چنانچہ اس وفد نے خاقان چین کو جب اپنے سپہ سالار کے عزائم سے آگاہ کیا تو اس نے اطاعت قبول کر لی اور جزیہ اور بیش قیمت تحائف قتیبہ کی خدمت میں روانہ کیے۔ چونکہ ابھی تک حجاج بن یوسف نے نہ قتیبہ بن مسلم اور نہ ہی محمد بن قاسم کو چین کی فتوحات کی ہدایات جاری کی تھیں، اس لیے قتیبہ نے چین پر حملہ آور ہونے کی بجائے خاقان چین سے خراج وصول کرنے پر اکتفا کی اور قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم دونوں مشرقی سرحدوں کے گورنر حجاج بن یوسف کی فتح چین کے بارے میں ہدایات کے منتظر تھے کہ سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا جو حجاج بن یوسف سے ذاتی پرخاش رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے نہ صرف حجاج بن یوسف کے اسلامی فتوحات کے عظیم الشان عسکری منصوبوں کو خاک میں ملا دیا بلکہ محمد بن قاسم کے ساتھ جو سلوک کیا وہ پوری دُنیا کے سامنے ہے۔

عام دستور کے مطابق سندھ میں عرب فاتح عربی زبان اور دین اسلام کا سرمایہ لائے۔ یہ یاد رہے کہ تقریباً دوسری صدی ہجری کے وسط تک عربی میں باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا۔ قرآن، احادیث، اخبار اور عربی شعر کا سرمایہ تھا جو حفظ، نقل، روایت اور املاء کے ذریعے باقی اور نمو پذیر تھا۔ کتابت پر بھروسا نہ تھا۔ تحریر مقصود بالذات نہ ہوتی تھی بلکہ اس سے صرف مدد لی جاتی تھی ... علم وفن کا دائرہ برابر پھیلتا گیا اور اس کا محیط بڑھتا گیا لیکن معقول کا یہ سرمایہ مرکزی نقطہ کی حیثیت سے اپنی جگہ رہا۔ اس سرمایہ کے حاملین، قراء، حفاظ و محدثین بڑے اہتمام کے ساتھ فوجی قائدین اور عمال حکومت کے ساتھ نئے مفتوحہ ممالک میں بھیجے جاتے تھے۔ بہت سے لوگ اشاعتِ دین کے جذبہ سے سرشار خود بھی چلے آتے تھے اور کبھی تو علم قرآن وسنت کے حامل علَم وطبل لیے ہوئے غازیوں کی صف میں شامل ہوتے تھے۔ جس کی ایک درخشندہ مثال خواجہ حسن

بصری (متوفی ۱۱۰ھ) کے شاگردِ رشید محدث ابو حفص ربیع ابن صبیح کی ہے جو تبع تابعی ہیں اور روایتِ حدیث میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ صاحبِ کشف الظنون کے قول کے مطابق مسلمانوں میں انہوں نے سب سے پہلے ''تصنیف وتبویب'' کی۔ غزہ میں شریک ہو کر سندھ آئے اور وہیں ۱۶۱ھ میں وفات پائی۔

دوسری مثال محمد بن یعقوب الثقفی کی ہے جو محمد بن قاسم کی معیت میں آئے اور الرور کے قاضی مقرر ہوئے۔ ایک اور مثال محدث ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ البصری ''نزیل الہند'' کی ہے جن کے بارے میں مؤرخین کی رائے ہے کہ وہ بصرہ کے تاجر تھے اور تجارت کی غرض سے سندھ میں آئے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے جیسا کہ ان کے لقب ''نزیل الہند'' سے ظاہر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق نے ''علمِ حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (Contribution of India to the study of Hadith Literature) میں حافظ ذہبی کی ''میزان''، ابنِ حجر عسقلانی کی ''تہذیب التہذیب'' کے علاوہ قاضی عبدالکریم سمعانی کی کتاب ''الانساب'' کے حوالوں سے محدث ابو موسیٰ اسرائیل کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ:

> ''ابو موسیٰ ایک ثقہ راوی تھے اور امام حسن بصری (متوفی ۱۱۰ھ) اور ابو حازم الاشجعی (متوفی ۱۱۵ھ) سے احادیث روایت کی ہیں۔ ایک محدث کی حیثیت سے ان کے مرتبہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) سفیان بن عینیہ (متوفی ۱۹۸ھ) اور یحییٰ بن سعید القطان (متوفی ۱۹۸ھ) جیسے کاملِ فن محدث ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ امام بخاری نے ابو موسیٰ سے مروی احادیث کا حوالہ صحیح بخاری میں چار مختلف مقامات پر دیا ہے اور سنن کی کتابوں میں بھی ان کی احادیث محفوظ کی گئی ہیں''۔

مولانا عبدالحیٔ حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں رقمطراز ہیں کہ اسرائیل بن موسیٰ بن ابو موسیٰ بصری، نزیل ہند، تبع تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے امام حسن بصری، ابو حازم اشجعی، محمد ابن سیرین اور وھب بن منبہ سے روایت کی اور ان سے امام سفیان ثوری، ابن عینیہ، حسین بن جعفی اور یحییٰ بن سعید القطان نے روایت کی... روایتِ حدیث میں ان کے درجہ کے بارے میں صاحبِ نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ ناقدین میں سے ابو حاتم نے ان کی توثیق کی۔ امام بخاری نے ان کی ایک حدیث کو چار ابواب میں بیان کیا ہے۔ وہ طبقہ

سادسہ میں سے ثقہ ہیں۔ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب ''تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہے کہ اسرائیل کو امام یحییٰ بن معین اور ابو حاتم نے ثقہ قرار دیا ہے۔ نیز ابو حاتم نے انہیں ''لاباس بہ'' کہا ہے جس کا علم حدیث میں مطلب یہ ہے کہ یہ ثقہ راوی ہیں۔ امام نسائی نے بھی ان کے بارے میں یہی لکھا ہے۔

ابن حبان نے ابو موسیٰ اسرائیل بصری کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ہندوستان جایا کرتے تھے۔

محدث ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری نزیل ہند نے ۱۵۵ھ میں وفات پائی۔

ربیع بن صبیح

امام ربیع بن صبیح کا شمار دوسری صدی ہجری کے منفرد و ممتاز محدثین میں ہوتا ہے۔
مؤرخین اور اہلِ علم نے اپنی کتبِ تاریخ و تذکرہ اور طبقات میں ربیع بن صبیح کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے اور علمِ حدیث بالخصوص جمع و تدوینِ حدیث کے باب میں اُن کی قابلِ قدر خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ محدث ربیع کے والد کا نام مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔ ابنِ خلدون نے اپنی تاریخ میں اُن کا نام ابراہیم لکھا ہے۔ سید عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں اُن کے احوال طبقہء ثانیہ میں بیان کئے ہیں اور اُن کا تعارف ان شاندار الفاظ میں کرایا ہے: ''الشیخ المحدث ربیع بن صبیح السعدی ابوبکر یا ابوحفص بصری مولٰی بنی سعد بن زید ''مناۃ'' صاحبِ روایت تھے، یعنی جو حدیث روایت کرتے ہیں۔

عربوں کا اہل سندھ کے ساتھ تعلقات و روابط کا سلسلہ ازمنہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے صدیوں نہیں بلکہ ہزارہا سال پہلے سے دیگر ممالک کے علاوہ برصغیر پاکستان و ہند کے مختلف علاقوں میں عرب تاجروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جیسا کہ توریت کے مطالعہ سے ظاہر و ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے دو ہزار سال قبل بھی عرب تاجر مصر کو جاتے تھے۔ ان کے سامانِ تجارت میں آب دار فولاد، تیزپات اور مسالہ جات وغیرہ شامل ہوتے تھے جو برصغیر کے سوا اور کسی ملک سے دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔

فاضل مؤرخ الفنسٹن نے اپنی کتاب ''تاریخ ہند'' میں لکھا ہے:

> ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو ہی نسل بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں ہم عربوں کے ان تجارتی قافلوں کو اسی

راستے سے گزرتا ہوا پاتے ہیں اور یہ وہی کارواں ہے جو حضرت
یوسف علیہ السلام کو مصر پہنچاتا ہے۔ اس راستے کا ذکر یونانی مؤرخین
نے بھی کیا ہے۔ غرض حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے سے
لے کر مارکوپولو اور واسکوڈی گاما کے زمانے تک ہندوستان کی
تجارت کے مالک عرب ہی رہے!''

عرب جہاز رانوں کے راستے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی ''عرب و ہند کے تعلقات'' میں لکھتے ہیں:

''عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ہندوستان کے ساحل تک
آتے تھے اور یہاں بیوپار کرتے اور پیداوار کو مصر اور شام کے
ذریعے یورپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان،
جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے۔''

سید صاحب نے عرب جہاز رانوں کے بحری راستوں کے ساحلی علاقوں اور وہاں واقع بندرگاہوں اور شہروں کا ذکر بھی کیا ہے جن کے ذریعے عرب مقامی باشندوں کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔

برصغیر کی پیداوار کا ذکر کرتے ہوئے ابوزید سیرافی لکھتا ہے کہ:

''ہندوستان کے سمندروں میں موتی اور عنبر ملتا ہے۔ اس کے
پہاڑوں میں جواہرات اور سونے کی کانیں ہیں۔ پھر یہاں ہاتھی
دانت دستیاب ہے۔ مزید برآں یہاں کی پیداوار میں آبنوس، بید،
عود، کافور، لونگ، جائفل، بکم، صندل وغیرہ اور ہر قسم کی خوشبویات
اور خوشبودار اشیاء ہوتی ہیں۔ یہاں کے پرندوں میں طوطے اور مور
ہیں اور یہاں کی زمین کا فضلہ مشک اور زیاد ہے۔ زیاد بھی مشک کی
طرح ایک خوشبو ہے۔''

ابوزید سیرافی کے علاوہ ابن حوقل، ابن خردازبہ، سیاح سلیمان نے اپنے سفرنامے اور ابوالفداء نے ''تقویم البلدان'' میں برصغیر کی پیداوار اور یہاں کی برآمدات و درآمدات کی پوری تفصیل لکھی ہے۔

ظہورِ اسلام کے بعد جو عرب جہازرانی اور تجارت کے سلسلے میں برصغیر میں وارد

ہوئے وہ ظاہر ہے کہ مسلمان تھے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے اعلیٰ جذبات سے سرشار بھی۔ ان کی عادات، اطوار، اخلاق و آداب اور مزاج و کردار پہلے سے زیادہ سلجھ چکے تھے۔ وہ عبادت و ریاضت، شرافت و صداقت اور امانت و دیانت کے پیکر بن چکے تھے۔ انہوں نے برصغیر کے ساحلی علاقوں بالخصوص جنوبی ہند کے اکثر مقامات پر اپنی نوآبادیاں قائم کیں اور تجارت کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں کو حلقہ بگوش اسلام کرنا شروع کر دیا۔

سراندیب کے ایک پہاڑ پر ایک نقشِ قدم زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے اور اسے شروع ہی سے ہر دور اور ہر زمانے میں مذہبی تقدس حاصل رہا ہے۔ ہندو اس کو شیو جی کا نقشِ قدم قرار دیتے ہیں، بدھ مت کے ماننے والے اسے شاکیہ منی یعنی گوتم بدھ سے منسوب کرتے تھے۔ جبکہ سامی اقوام کے عقیدے کے مطابق یہ آدم علیہ السلام کے پاؤں کا نقش قدم ہے۔ چنانچہ ظہور اسلام کے بعد بے شمار مسلمان عرب سیاح اس نقشِ قدم کی زیارت کے لئے بھی سراندیب آنے لگے۔ اس طرح آہستہ آہستہ برصغیر کے ان جنوبی علاقوں میں جابجا مسلمانوں کی آبادیوں میں اضافہ ہونے لگا۔

شہرہ آفاق سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں بے شمار ایسی آبادیوں اور مقامات کا ذکر کیا ہے جن میں مسلمان عرب بہت عزت و وقار بلکہ بعض مقامات پر قوت و اقتدار کے ساتھ آباد تھے۔ ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری میں سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں برصغیر میں وارد ہوا۔ دہلی کا قاضی القضاۃ بھی رہا اور پھر سلطان نے اسے ایک جوابی سفارت پر دارالحکومت چین روانہ کیا۔ وہ ان شہروں، مقامات اور بندرگاہوں سے ہوتا ہوا چین پہنچا اور سلطان الہند کا پیغام خاقان چین تک پہنچایا۔ یہ کم و بیش آٹھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے۔ جب صوفیہ کرام کی بے مثال تبلیغی کاوشوں کے ذریعے برصغیر کے گوشے گوشے میں اسلامی تعلیمات عام ہو چکی تھیں اور حضرت داتا گنج بخش لاہوری، سلطان سخی سرور، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، حضرت خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، حضرت خواجہ جلال الدین تبریزی اور ان کے خلفاء برصغیر کے تمام اہم مقامات پر اپنی خانقاہیں قائم کر کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو حلقہ بگوش اسلام کر چکے تھے۔ ان بزرگان دین کے دست حق پرست پر بیعت کرنے والوں میں برصغیر کے تمام قدیم مذاہب اور مختلف النوع اقوام

اور ذاتوں کے علاوہ یہاں کے تمام صوبوں بالخصوص پنجاب، بنگال، کشمیر، سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد اور برصغیر کے وسطی علاقوں کے لوگ شامل تھے جن کی رسوم و رواج، رہن سہن کے انداز پوشاک اور زبانیں ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور جداگانہ تھیں۔ چنانچہ ان مختلف مذہبی وتہذیبی پس منظر رکھنے والے لوگوں میں اسلام کو پھیلانے کے لئے مختلف اندازِ تبلیغ کے علاوہ ان اقوام کے مزاج و کردار اور ان کی زبانوں کا جاننا بھی ضروری تھا۔ یہ فریضہ صرف صوفیہ کرام ہی ادا کر سکتے تھے۔ جو محدث وفقیہ ہونے کے ساتھ علم الکلام سے بھی کماحقہ واقف تھے۔

مخدوم امیر احمد ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی اپنے مضمون ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' مطبوعہ رسالہ ''الرحیم'' اشاعت جولائی ۱۹۶۳ میں لکھا ہے:

> ''الربیع بن صبیح السعدی بصری ثم سندھی بصرہ کے باشندے تھے، بڑے عابد وزاہد تھے۔ سعد بن مناۃ قبیلہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حدیث روایت کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے ان کو صالح اور صدوق کہا ہے۔ شہر بصرہ میں یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے کتاب تصنیف کی۔''

ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی کتاب (Contribution of India to the Study of Hadith Literature) میں حاجی خلیفہ کی ''کشف الظنون''، ابن حجر عسقلانی کی ''مقدمات الفتح''، الخولی کی ''مفتاح السنۃ''، ابن عماد کی ''شذرات''، تاریخ طبری اور طبقات ابن سعد اور دیگر کتبِ تاریخ وتذکرہ کے حوالوں سے لکھتے ہیں:

> ''ربیع بن صبیح محدث ہونے کے علاوہ احادیث کے قدیم مرتبین میں سے تھے۔ ابن صبیح کی کنیت ابوبکر اور ابن سعد کے بیان کے مطابق ابوحفص تھی۔ وہ ۱۶۰ھ میں بحری فوج کے ساتھ ہند میں آئے تھے جس نے خلیفہ مہدی کے عہدِ خلافت میں عبدالملک بن شہاب کی قیادت میں برید پر حملہ کیا تھا۔ عربوں نے برید فتح کرلیا جو اُس زمانے میں ایک خوش حال بندرگاہ تھا اب یہ مقام بھابھٹ کہلاتا ہے اور برچ کے قریب واقع ہے۔ اس کامیابی کے بعد عربوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ وطن واپس جانے کے لئے

موافق ہواؤں کے انتظار میں اُن کو برید میں رکنا پڑا اور اسی دوران
ساحلی علاقوں میں طاعون پھیل گیا جس سے بہت جانی نقصان ہوا
اور محدث ربیع بن صبیح بھی اس وبا کا شکار ہو گئے۔ لیکن ابن سعد کا
بیان ہے کہ الربیع کا انتقال بحری سفر کے دوران ہوا اور ان کو ایک
جزیرے میں دفن کیا گیا۔ ابن عماد کا بھی یہی بیان ہے اور اس نے
یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ واپسی کے سفر میں الربیع نے وفات
پائی۔''

صاحب نزہۃ الخواطر نے مؤرخ ابو جعفر محمد جریر طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ الربیع عبدالملک بن شہاب کے ہمراہ جو بصرہ کے مطوعین میں سے تھے، سندھ میں غزا کے لئے آئے اور مغنی کی روایت کے مطابق ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔

ربیع بن صبیح امام حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ کے شاگردوں میں سے تھے۔ امام حسن بصری سے انہوں نے حدیث کا باقاعدہ درس لیا تھا۔ الربیع نے امام حسن کے علاوہ حمید الطویل (متوفی ۱۴۲ھ)، ثابت البنانی (متوفی ۱۲۷ھ)، مجاہد بن جبیر (متوفی ۱۰۳ھ) ایسے نامور اور ثقہ محدثین سے بھی علمِ حدیث حاصل کیا تھا اور اس میں انہوں نے بہت محنت، جانفشانی سے کام لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے ہم عصر راویانِ حدیث میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ رئیس المحدثین امام عبداللہ بن مبارک، امام سفیان ثوری، امام ابو داؤد طیالسی، امام عبدالرحمٰن بن مہدی، امام وکیع بن الجراح، امام عاصم بن علی اور امام آدم بن ایاس ایسے جلیل القدر اور نامور محدثین ربیع بن صبیح کے شاگردوں میں شامل ہیں جس سے امام ربیع کی محدثانہ جلالت وعظمت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ امام الربیع کے مذکورہ بالا شاگردوں کا شمار اُن حضرات میں ہوتا ہے جو اُن سے روایتِ حدیث کرتے ہیں۔

محدث ربیع بن صبیح کے تین علمی اعزازات خاص طور پر توجہ طلب اور قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ تابعین میں سے ہیں، دوئم یہ کہ امام حسن بصری کے شاگردِ رشید تھے، تیسرے یہ کہ وہ علمِ حدیث کے اُن اوّلین علم برداروں میں سے تھے جنہوں نے دوسری صدی ہجری میں جمع و تدوینِ حدیث کا اہم کام کیا۔ پھر وہ بغرضِ جہاد سندھ میں آئے اور یہاں کی ایک اہم بندرگاہ فتح کرنے میں حصہ لیا۔ یہ وہ اعزازات ہیں جن سے محدث

ربیع بن صبیح کا تاریخ میں صحیح مرتبہ و مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔

مزی مہزی نے اپنی کتاب ''الفاصل در اصول حدیث'' میں ربیع بن صبیح کو بصرہ میں اسلام کا پہلا مصنف تسلیم کیا ہے اور ''کشف الظنون'' میں بھی مزی مہزی کی ہم نوائی کرتے ہوئے انہیں بصرہ کا پہلا مصنف قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق کی تحقیق کے مطابق بھی ربیع احادیث کے قدیم ترین مرتبین میں سے ہیں۔ لیکن صاحب نزہۃ الخواطر کے مطابق بعض محدثین نے امام عبدالمالک بن عبدالعزیز کو مسلمانوں کا پہلا مصنف قرار دیا ہے۔ جب کہ بعض دوسروں کے نزدیک یہ اعزاز سعید بن عروبہ کو حاصل ہے۔ خطیب بغدادی نے سفیان بن عینیہ کو دوسرا مصنف لکھا ہے۔ اس طرح امام مالک موطا تبیض کرنے کے بعد تیسرے مصنف قرار پاتے ہیں۔ پھر ان کے بعد مصر میں عبداللہ بن وہب نے اپنا موطا مرتب کیا تو وہ چوتھے مصنف شمار ہوئے۔ اُن کے بعد یمن میں معمر بن راشد اور عبدالرزاق نے اپنی اپنی روایت سے موطا مدوّن کیا۔ کوفہ میں سفیان ثوری اور محمد بن فضیل بن غزوان نے بھی اپنی اپنی روایت کے مطابق موطا جمع کیا۔ بصرہ میں حماد بن سلمہ اور روح بن عباد نے یہ مہم سر کی۔ واسط میں ہشیم اور عبداللہ بن مبارک نے خراسان میں موطا کی تسوید کی... اس طرح یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں حدیث کی جمع و تدوین اور کتابتِ حدیث میں اولیت کا سہرا امام حسن بصری کے شاگرد رشید محدث ربیع بن صبیح کے سر بندھتا ہے۔ الربیع سے مروی احادیث التعلیقات البخاری، سنن ابو داؤد اور ابنِ ماجہ میں درج ہیں۔

شیخ محمد اکرام نے قاضی عبدالکریم سمعانی کی مشہور کتاب ''الانساب'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''سب سے پہلے جس اہلِ تصنیف بزرگ کے سندھ میں آنے کا باوضاحت نام ملتا ہے وہ ربیع بن صبیح السعدی البصری تھے جو ۱۵۹ھ میں فوج کے ہمراہ یہاں تشریف لائے... صاحب کشف الظنون کے مطابق ربیع بن صبیح نے تدوینِ حدیث میں حصہ لیا اور بعض کا خیال ہے کہ آپ ہی اسلام میں پہلے مصنف و مرتب تھے۔ آپ تابعی تھے۔''

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنی تحقیقی کتاب ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' (The Contribution of India & Pakistan to the Arbic Literature) میں لکھا ہے کہ ابو حفص ربیع بن صبیح کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے اور ایک محقق کی رائے کے مطابق وہ ایک کتاب لکھنے والے پہلے مسلمان تھے۔ نیز وہ ایک

معتبر راوی حدیث بھی تھے۔ وہ عمر کے آخری حصے میں ہجرت کر کے ۱۶۰ھ میں سندھ آ گئے تھے۔ غلام علی آزاد، رحمان علی اور نواب صدیق حسن نے لکھا ہے کہ وہ پاک وہند کے پہلے مسلمان عالم تھے۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے ''کتاب الضعفا'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ربیع بن صبیح سادات المسلمین میں سے ایک فرد تھے۔ عجلی نے اُن کیلئے ''لاباس بہ'' بھی کہا مگر فلاس نے انہیں ''لیس بالقوی'' سے یاد کیا ہے۔ اسی طرح حاکم نے ''لیس بالمتین'' سے اُن کو یاد کیا ہے۔ مگر ان اقوال کے برعکس بشر بن محمد نے شعبہ کی زبان سے روایت میں اُن کی عظمت بیان کی ہے۔ ابن حیان نے فرمایا کہ ربیع بڑے عبادت گزار اور زاہدِ شب بیدار تھے۔ رات کے وقت ان کا شب باشی کا مکان کثیرۃ التہجد کی وجہ سے شہد کی مکھیوں کی سی گونج سے معمور ہوتا تھا۔ ابن عدی کے نزدیک وہ مردِ صالح اور بے عیب ہیں۔ میں نے اُن کی کوئی حدیث منکر نہیں دیکھی۔ امید ہے کہ اُن کی روایات میں کوئی خدشہ نہ ہوگا۔

حافظ ابن حجر کے حوالے سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ربیع مرد صالح اور صدوق تھے۔

ربیع بن صبیح کے احوال آزاد بلگرامی کی ''سبحۃ المرجان''، الدمشقی کی ''توجیہ النظر''، صفی الدین کی ''خلاصہ''، طاہر پٹنی کی ''المغنی فی ضبط الرجال'' جو عسقلانی کے حاشیہ پر ہے، کے علاوہ ابن خلدون اور ابن اثیر کی تواریخ نیز ڈاکٹر تاراچند کی کتاب (**Influence of Islam on Indian Culture**) میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

سید عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ''مغنی'' کے حوالے سے محدث ربیع بن صبیح کا سن وفات ۱۲۰ھ تحریر کیا ہے لیکن مقامِ وفات اور جائے مدفن کا ذکر نہیں کیا۔ طبقات ابن سعد نے بھی اُن کا سنِ وفات ۱۲۰ھ ہی لکھا ہے لیکن ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ربیع سندھ کے قریب ایک جزیرہ میں مدفون ہوئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کی 'تہذیب التہذیب' کے مطابق محدث ربیع بن صبیح نے ۱۶۰ھ میں سندھ میں وفات پائی۔

ابو عطاء مولیٰ بنو اسد

ابو عطا سندھی دوسری صدی ہجری کے مشہور علماء اور ممتاز ترین شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ علوم عربیہ کے ماہر اور عربی زبان کے فاضل اجل تھے۔ انہوں نے عربی شعر و ادب میں شاندار اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ انہیں عربی زبان و ادب پر اس قدر عبور اور فن شعر گوئی میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ جس کی بدولت انہیں عربی ادب میں مستقل مقام حاصل ہو گیا اور ان کا شمار عربی کے عظیم ترین شاعروں میں ہونے لگا۔ مؤرخین نے ابو عطا کا شمار اکابر علماء میں کیا ہے۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ''تاریخ سندھ'' میں ابو عطا کا تذکرہ ابو معشر سندھی، ان کے صاحبزادے ابو عبد الملک محمد بن ابی معشر، امام اوزاعی اور حافظ حدیث ابو محمد خلف بن سالم ایسے جلیل القدر محدثین کے ساتھ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ وہ مشہور اکابر ہیں جنھوں نے اپنے وطن سے باہر جا کر سندھ کے نام کو روشن کیا۔

سید ابوظفر ندوی نے ''تاریخ سندھ'' میں ابو عطاء کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ابو العطاء سندھی کا نام افلح بن یسار تھا، باپ بیٹے دونوں سندھ سے بنو اسد کے ذریعے غلاموں کے زمرہ میں کوفہ پہنچے۔ ابو العطا کو ادب اور شعر و شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ اس نے اس میں کمال پیدا کیا۔''

لیکن بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابو عطاء کی ولادت کوفہ میں ہوئی۔

جیسا کہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ''ابو عطاء عراق کے علاقہ کوفہ میں پیدا ہوئے اور وہیں

پرورش پائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عطاء کا باپ یسار سندھ سے ایک غلام کی حیثیت سے آیا تھا اور اموی دربار کا قصیدہ گو شاعر تھا۔ اور اس خاندان کے لئے قلم اور تلوار دونوں سے لڑا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے امویوں کے زوال اور عباسیوں کے عروج کو دیکھا تھا۔ عباسیوں نے کبھی بھی اس کے علم کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ وہ بنو اسد کا غلام تھا جس سے اس نے چار ہزار درہم کے بدلے اپنی آزادی خرید لی تھی۔ یہ چار ہزار درہم اس کے ایک مربی دوست حر بن عبداللہ قرشی نے دیئے تھے۔ جس کے لئے اس نے مندرجہ ذیل اشعار لکھے:

اتیتک لا من قربۃٍ ھی بیننا
ولا نعمۃ قدمتھا استیھا!
و لکن مع الراجین ان کنت موردا
الیہ بغدۃ الدین تصفدو قلوبھا
اغثنی بسجل من نداک یکفنی
وقال الردی مرد الرجا و ثیبھا
تسمی ابن عبداللہ حرا کوصفہ
و تلک العلیٰ یعیٰ بھا من یعیبھا

ترجمہ:

۱۔ میں آپ کے پاس قرابت داری کی وجہ سے حاضر نہیں ہوا اور نہ کسی احسان کا بدلہ پانے آیا ہوں۔

۲۔ بلکہ امید وارانِ کرم کے ساتھ آیا ہوں جن کا یہ خیال ہے کہ آپ کے پاس دین کے باغی آتے ہیں جن کے دل خوف سے لرزاں رہتے ہیں۔

۳۔ مجھے اپنی بخشش سے بہرہ ور فرمائیے۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے میں آپ کے افضال کے طفیل جوانوں اور بوڑھوں کے طعنوں سے محفوظ رہوں گا۔

۴۔ آپ کا نام حر بن عبداللہ ہے، آپ کی صفت جواں مردی اور حریت پسندی ہے۔ یہ وہ بلند صفات ہیں جن کی تلاش عیب نکالنے والوں کو بھی رہتی ہے۔

صحیفہ انقلاب قرآن حکیم، کتاب مبین ہے جسے ''بیان للناس'' بھی کہا گیا ہے اور جس کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ ''تبیان لکل شئی'' ہے۔ اسے العلم، الھدیٰ،

الکمت اور الرحمت بھی کہا گیا ہے۔ یہ دین اسلام کا سرچشمہ بلکہ خود دین اسلام ہے جو پیغمبر انقلاب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نوع انسانی کو عطا کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی پر غور وفکر کریں۔ چنانچہ قرآن حکیم کے فہم و تدبر کے لئے عربی زبان پر مکمل عبور کا ہونا امر لازم ہے۔ پھر قرات، سبعہ، تجوید، آداب تلاوت اور فکر قرآن کے قواعد میں نحو اور معانی ایسے اہم فنون ہیں جن پر باقاعدہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔

مسلمانوں نے لسانی علوم کی طرف بطورِ خاص توجہ کی اور کوفہ و بصرہ کے ابتدائی دور کے اہل علم نے ادب کی لسانی بنیادیں قائم کیں جن کا مقصد فہم قرآن تھا۔

اور زیرین عراق کے یہی دو نئے شہر اور بعدازاں بغداد علوم کی ترقی و ترویج کے اہم اور بڑے مرکز کہلائے۔ امام عبدالملک اصمعی کا تعلق بصرہ سے تھا۔ استاد احمد حسن زیات کے ''تاریخ ادب عربی'' میں لکھا ہے کہ بصرہ و کوفہ کے علماء علم نحو پر خوب شرح و بسط سے کلام کر رہے تھے۔ علم نحو کا موجد ابوالسود بصرہ کا باشندہ تھا۔ ابن اسحاق حضرمی نحوی قوانین بیان کرنے والا اور ہارون بن موسیٰ ضابط نحو تھا۔ انہی میں علم نحو پر سب سے پہلی تصنیف کرنے والا عیسیٰ بن عمر ہے اور نحوی مسائل کو ابواب کے تحت مرتب مہذب بنانے والا 'الکتاب' کا مولف سیبویہ ہے۔ علم نحو کے یہ سب استاد اور امام بصرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ امام حمزہ زیات، امام کسائی اور فراء کوفہ کے باشندے تھے اور علم نحو کے امام تھے۔ چنانچہ تمام مفسرین قرآن اور ائمہ فقہا کے لئے ضروری ہے کہ وہ فقہ و تفسیر پر قلم اٹھانے سے پہلے عربی علوم میں مہارتِ تامہ حاصل کریں اور عربی علوم میں صرف و نحو اور قرأت و تجوید کے علاوہ شعر و ادب بھی شامل ہے۔ جیسا کہ آٹھویں صدی ہجری کے مفسر قرآن ابو حیان اندلسی نے لکھا ''میں نے بچپن ہی میں علم لغت میں کتاب الفصیح اور دوسری کتابوں کو ازبر کر لیا تھا اور عربی دیوانوں میں سے چھ مشہور شعراء یعنی امراء القیس، نابغہ، علقمہ، زہیر، طرفہ اور عنترہ کے دیوان بھی حفظ کر لئے تھے۔'' امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے صرف فقہ سے مدد حاصل کرنے کے لئے بیس سال تک عربی لغت و ادب کا علم حاصل کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ جب تم کلام اللہ کی تلاوت کرو اور اس کی عبارت تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو عربوں کی شاعری کے ذریعے اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

ابوعطاء کا شمار بلاشبہ عربی زبان کے عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے، جیسا کہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کے مقالہ نگار نے لکھا ہے:

''ایک بسیار گو شاعر کی حیثیت سے ابو عطاء کا شمار عربی ادب کی سربرآوردہ شخصیات میں ہوتا ہے۔ نصر بن سیار اور حماد الراویہ جیسے اشخاص نے اس کی شعری صلاحیتوں کی تعریف کی ہے۔ مؤخرالذکر ماقبل اسلام کی عربی شاعری پر سند مانا جاتا ہے۔

جب عباسی برسر اقتدار آئے تو ابو عطاء نے ان کا ایک قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

ان الخیار من البریتہ هاشم

و بنو امیة ارذل الا شرار

و بنو امیه عودهم من خروع

ولهاشم فی المجد عود لضار

اما الدعاة الی الجنان فهاشم

و بنو امیة من دعاة النار

ترجمہ:

۱۔ بنو ہاشم انسانوں میں بہترین ہیں اور بنو امیہ بدترین اشرار ہیں

۲۔ بنو امیہ ایک کمزور لکڑی کے مانند ہیں اور بنو ہاشم ایک سرسبز درخت کی لکڑی کی طرح ہیں۔

۳۔ بنو ہاشم تمہیں جنت کی طرف بلاتے ہیں اور بنو امیہ کے مبلغین آگ (دوزخ) کی طرف بلاتے ہیں۔

ابو العطاء کی قادرالکلامی کا کمال ہے کہ جب عباسیوں کی طرف سے اس کی کوئی پذیرائی نہ ہوئی تو اس نے ان کی ہجو ان الفاظ میں کہی:

بنی هاشم عودو الی نخلاتکم

فقد قامه سعر الشمر صاعا بدرهم

و ان قلتم رهط النبی و قومه

فان انصاری رهط عیسی بن مریم

ترجمہ:

۱۔ ''بنو ہاشم! تم واپس اپنے نخلستان کی طرف لوٹ جاؤ، کھجور کی قیمتیں بہت چڑھی ہوئی ہیں۔

۲۔ تمہارے اور عیسائیوں کے درمیان فرق نہیں ہے، تم اپنے آپ کو بالکل اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلے سے منسوب کرتے ہو جیسے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں۔''

علامہ ابوالفرج اصفہانی کی کتاب ''الاغانی'' کے صفحات اس عظیم شاعر کی توصیف سے بھرے پڑے ہیں۔ جو برجستگی اور حسنِ بیان کی وجہ سے مشہور ہے۔ مندرجہ ذیل نظم نے جو ''الحماسہ'' کی پانچویں نظم ہے، ابو عطا کو غیر فانی بنا دیا ہے اور عربی ادب میں اس نے بہت اونچا مقام حاصل کرلیا ہے۔

ذکرتک والخطی بخطر بیننا
و قد نھلک منا المتقفه السمر
فواللہ! ما ادری و انی لصادق
اداء عرانی من حبابک ام سحر
فان کان سحرا فاعذرینی علی الھویٰ
و ان کان داءٌ غیره فلک العذر

ترجمہ:

۱۔ میں نے تجھے جنگ کے عروج میں بھی یاد کیا، جبکہ خطی نیزے ہمارے درمیان چل رہے تھے۔ سیدھے کئے ہوئے نیزے ہمارا خون بہا رہے تھے۔

۲۔ خدا کی قسم! میں سچ کہتا ہوں، میں نہیں جانتا کہ مجھ پر تیری محبت کی بیماری غالب آ گئی ہے یا کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔

۳۔ اگر یہ جادو ہے تو میں اس محبت کے لئے معافی کا مستحق ہوں لیکن اگر یہ بیماری ہے تو سارا قصور تمہارے اوپر ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ شعر و لغت کا اعتبار و استدلال اوامر و نواہی میں نہیں ہو گا، اس لئے کہ اوامر و نواہی جو شریعت کے دو پہلو ہیں جن کی تشریح خود صاحبِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی ہے۔ اس ضمن میں امام سیوطی لکھتے

ہیں کہ ہم نے شعر کو فہم القرآن کے لئے اصل نہیں بنایا۔ بلکہ کسی غریب نادر لفظ کا معنی متعین کرنے کے لئے عربی اشعار کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ تاکہ کوئی نادان یہ اعتراض نہ کر سکے کہ جب قرآن عربی زبان میں ہے تو اس کا جو معنی متعین کیا گیا ہے اس کی شہادت عربی زبان سے پیش کی جائے۔

ابو العطاء السندھی کا سنِ وفات معلوم نہیں ہے۔ لیکن قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (متوفی ۱۵۸ھ) کے عہدِ خلافت کے بعد کسی سن میں وفات پائی۔ حماد الراویہ (متوفی ۱۵۶ھ)، خلیل بن احمد (متوفی ۱۷۴ھ) اور سیبویہ (متوفی ۱۷۷ھ) جو سب کے سب امام لغت ہیں، ان کے معاصرین میں سے تھے۔

ابو معشر سندھی

امام ابو معشر کا پورا نام ابو معشر نجیع بن عبدالرحمٰن السندھی المدنی ہے۔ ابو معشر اپنے زمانے کے نامور علماء میں شمار ہوتے تھے۔ مورخین اور تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے سرزمین سندھ کے علاوہ مدینہ منورہ اور دارالخلافہ بغداد میں قابلِ قدر دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ چنانچہ علامہ سمعانی اپنی کتاب ''الانساب'' میں ان کے احوال بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''نجیع فقیہ، عالم اور مغازی کی ایک کتاب کے مولف ہیں'' خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ ابو معشر فن مغازی کے ماہرین میں سے تھے اور حدیث کے بڑے بڑے امام ان کے شاگرد تھے۔''

مخدوم امیر احمد سابق پرنسپل اورینٹل کالج نے اپنے مضمون بعنوان ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' مطبوعہ ماہنامہ ''الرحیم'' حیدرآباد سندھ اشاعت جولائی ۱۹۶۳ میں امام ابو معشر کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

''ابو معشر حدیث کے مشہور راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے والد سندھ سے گرفتار ہو کر عرب پہنچے اور بنو ہاشم کے گھرانے کے غلام رہے۔ ابو معشر عرب میں پیدا ہوئے۔ غلامی کی حالت میں تحصیل علم کی اور ممتاز علماء میں شمار ہونے لگے۔ آپ کی روائتیں حدیث کی مشہور کتابوں ''صحاح ستہ'' میں سے ترمذی شریف میں موجود ہیں۔ آخر عمر میں آپ کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا جس کی وجہ سے علمائے جرح و تعدیل نے آپ پر جرح کی ہے۔ تاہم آپ آئمہ حدیث و مغازی میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی کا قول ہے کہ ابو معشر حافظہ کی کمزوری کے باوجود علم کا مخزن ہیں۔''

علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ ''نجیح اہلِ مدینہ کی ام سلمیٰ اور ام موسیٰ کے مولیٰ تھے۔'' مولیٰ اور ولاء کی اصطلاحات غلام اور کنیز سے مختص ہیں اور قرآنی احکام کے مطابق مکاتبت کے ذریعے غلام اور کنیزیں آزادی حاصل کر سکتی تھیں۔ مکاتبت سے مراد وہ معاہدہ ہے جو غلام اپنے آقا سے کرتا ہے کہ ایک مقررہ مدت میں مقررہ رقم ادا کر دے گا۔ چنانچہ جب وہ یہ رقم ادا کر دیتا تھا تو اسے آزادی مل جاتی تھی۔

تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان کی دوسری جلد (عربی ادب) میں مرقوم ہے کہ ''ابومعشر نجیح بن عبدالرحمن سندھ کے غلام یا کسی غلام کے بیٹے تھے جو بنومخزوم کے موالی بن گئے تھے۔ بعد میں ابوجعفر منصور عباسی کی بیٹی ام موسیٰ نے ان کو خرید لیا اور بالآخر اس نے ان کو آزاد کر دیا۔ وہ محمد بن عمرو کے شاگرد تھے اور انہوں نے ایک بڑے محدث اور مغازی پر سند ہونے کا شرف پایا۔ ان کے علم کا اعتراف امام احمد بن حنبلؒ نے بھی کیا ہے جو مسلمانوں کے چار فقہی مسالک میں سے ایک کے بانی ہیں۔ انہوں نے کتاب المغازی تصنیف کی جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور ان کے غزوات کا ذکر ہے۔''

ابن الندیم نے ''الفہرست'' میں لکھا ہے کہ ابومعشر کا نام نجیح مدنی ہے۔ انہیں زمرۂ محدثین میں شمار کیا جاتا ہے۔ بنی مخزوم کی ایک عورت کے غلام تھے جس سے آزادی کا مکاتبہ کر لیا تھا۔ یہ زیادہ تر حوادث وسیر سے آگاہی رکھتے تھے۔

حافظ ذہبی اپنی مشہور تالیف ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کا نام نجیح بن عبدالرحمن ہے۔ صاحب المغازی اور بلند پایہ فقیہ ہیں۔ بنوخزیم کی ایک عورت کے مکاتب تھے۔ رقم ادا کرنے کے بعد آزاد ہو گئے۔ کہتے ہیں ام موسیٰ بنت منصور نے ان کا ولاء خرید لیا تھا۔ علم کا خزانہ تھے مگر حافظہ کچھ کمزور تھا۔ انہیں امامہ بن سہیلؒ کو دیکھنے کا شرف حاصل ہے۔ محمد بن کعب قرظی، موسیٰ بن یسار، نافع، ابن منکدر، محمد بن قیس اور محدثین کی ایک جماعت سے علمِ حدیث حاصل کیا البتہ سعید بن مسیب سے لقاء حاصل نہیں۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی کی کتاب میں یوں ہی لکھا ہے۔''

یہ بیان کرنے کے بعد حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ امام ترمذی کی اس رائے سے متفق

نہیں ہیں کہ امام ابو معشر کی امام سعید بن مسیب سے ملاقات نہیں ہوئی اور وہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ سعید بن مسیب کی بجائے سعید مقبری ہوں گے جن سے ابو معشر کی ملاقات نہیں ہوئی ہو گی۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ابو معشر سعید بن مسیب ہی سے زیادہ روائتیں بیان کرتے ہیں۔

حافظ ذہبی نے جو لکھا ہے کہ ام موسیٰ نے ابو معشر کا ولاء خرید لیا تھا تو اس سے مراد ہے غلام کی ذاتی ملکیت جو مکاتبت کی تکمیل کے بعد بھی اس کے پہلے آقا ہی کی ہو گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو معشر کی مکاتبت پر ام موسیٰ ہی نے انہیں خریدنا ہو گا اور ولاء خریدنے کا یہی مطلب ہوا۔ اس ضمن میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ معشر نے جلد ہی اپنی قیمت ادا کر کے آزادی حاصل کر لی اور مدینہ منورہ میں اپنا ایک علمی حلقہ قائم کر لیا۔

سید عبدالحئی حسنی نزہتہ الخواطر میں لکھتے ہیں کہ نجیح صاحبِ روایت ہیں اور انہوں نے جن حضرات سے روایت کی ہے ان میں محمد بن عمرو، نافع، ہشام بن عروہ اور موسیٰ بن قیس کے علاوہ عراق کے بہت سے محدثین شامل ہیں۔

''تذکرۃ الحفاظ'' کے مطابق حافظِ حدیث امام ابو معشر نجیح سندھی سے روایت کرنے والوں میں ان کے بیٹے ابو عبدالملک محمد بن ابو معشر، عبدالرزاق، محمد بن بکار، منصور بن مزاحم کے علاوہ محدثین کی ایک جماعت شامل ہے۔ خطیب بغدادی کے مطابق امام ابو نعیم، سفیان ثوری اور امام لیث بن سعد نے بھی امام ابو معشر سے روایتِ حدیث کی ہے۔

امام ابو معشر کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

''ابو معشر فن مغازی میں صاحبِ بصیرت اور صادق تھے لیکن سلسلۂ اسناد یاد نہ رکھ سکتے تھے۔''

سلسلہ اسناد یاد نہ رکھنے کی وجہ بیان کی جا چکی ہے کہ ان کی عمر کے آخری حصہ میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔

امام ابو نعیم کا بیان ہے کہ ابو معشر سندھی تھے اور ان کی زبان میں لکنت بھی تھی۔ چنانچہ کہا کرتے تھے ''حدثنا محمد بن قعب'' یعنی کعب کی بجائے قعب کی آواز نکالتے تھے۔

امام ابو زرعہ نے ان کی تعریف کی ہے اور انہیں صدوق میں شمار کیا ہے۔

امام نسائی نے کہا ہے کہ امام ابو معشر ''لیس بالقوی'' ہیں جب کہ حافظ ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں ابو معشر کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام نسائی نے ان سے حجت پکڑی ہے اور اپنی کتاب میں ان کی روایات نقل کی ہیں لیکن بخاری اور مسلم نے ان کی کوئی حدیث ذکر نہیں کی۔ ابن حجر عسقلانی کے بیان کے مطابق ابو معشر کی سند سے روایت کی ہوئی احادیث چاروں سنن میں موجود ہیں۔

حافظ ذہبی نے امام ابو معشر کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ گورے چٹے، گربہ چشم اور بھاری بھرکم تھے۔ عباسی خلیفہ مہدی انہیں اپنے ساتھ عراق لے گئے اور انہیں ایک ہزار دینار دیئے اور کہا کہ ہمارے پاس رہو اور اہلِ عراق کو فقہ و حدیث کا درس دو۔ جس سے امام ابو معشر کے علمی مرتبہ و مقام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زبان میں لکنت اور غلام ہونے کے باوجود اسلامی معاشرے میں انہیں کیا حیثیت حاصل تھی اور ان کا کس درجہ ادب و احترام کیا جاتا ہے۔ مہدی ایسا جلیل القدر عباسی خلیفہ ان کا قدردان تھا اور ان سے محبت و شفقت سے پیش آتا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ عباسی خلفاء کے دربار میں جو علماء تھے ان میں ابو معشر کو ممتاز مقام حاصل تھا۔

حافظ حدیث اور فقیہ زماں امام ابو معشر نجیح سندھی نے عباسی خلیفہ کی فرمائش پر دارالخلافہ بغداد میں مسندِ درس قائم کی اور اہلِ بغداد کو فقہ و حدیث کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ لیکن خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ خلیفہ مہدی نے ابو معشر کو ایک ہزار دینار پیش کر کے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا اور ان کو دعوت دی کہ وہ بغداد میں سکونت اختیار کر کے شہزادوں کو تعلیم دیں چنانچہ ابو معشر ۱۶۱ھ میں بغداد منتقل ہو گئے۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی مولف ''تاریخ سندھ'' نے امام ابو معشر سندھی کا شمار ان اکابرین میں کیا ہے جنہوں نے اپنے وطن سے باہر جا کر دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ''وہ اکابر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے اپنے وطن سے باہر جا کر سندھ کے نام کو روشن کیا۔ ان میں ابو معشر سندھی، ان کے صاحبزادے ابو عبدالملک محمد بن ابی معشر، امام اوزاعی، حافظ ابو محمد خلف بن سالم، ابو العطاء سندھی مشہور ہیں۔''

ابن الندیم، خطیب بغدادی، حافظ ذہبی اور علامہ سمعانی نے امام ابو معشر کا عمدہ الفاظ میں تعارف کرایا ہے اور لکھا ہے کہ ''کتاب المغازی'' ان کی تصنیف ہے۔ قاضی عبدالصمد صارم نے اپنی تالیف ''تاریخ الحدیث'' میں لکھا ہے کہ ابو معشر نجیح بن عبدالرحمن

مشہور محدث و فقیہ و مصنف تھے اور سندھ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مغازی پر کتاب لکھی۔ ابومعشر کی کتاب المغازی کے اب صرف دو متفرق حصے باقی رہ گئے ہیں جنہیں واقدی اور ابن سعد نے اپنی تصانیف میں محفوظ کر دیا ہے۔ مورخ طبری نے توریت اور انجیل سے متعلق تاریخ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور تاریخی وقائع کے بارے میں معلومات میں ابومعشر سندھی سے استفادہ کیا ہے۔

علامہ ابن الندیم اور حافظ ذہبی کے بیانات کے مطابق امام ابومعشر نے ماہ رمضان ۱۷۰ھ میں دارالخلافہ بغداد میں وفات پائی۔ ابونعیم کی کتاب ''حلیۃ الاولیاء'' کے مطابق صاحب المغازی حافظِ حدیث ابومعشر نجیع بن عبدالرحمٰن سندھی کی نمازِ جنازہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے پڑھائی اور انہیں دارالخلافہ بغداد کے مقبرہ کبیرہ میں دفن کیا گیا۔

امام رجاء سندھی اسفرائینی

امام رجاء کا شمار تیسری صدی ہجری کے مشہور محدثین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے علم حدیث کے وسعت و فروغ میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ امام رجاء اپنے علم و فضل اور پسندیدہ اخلاق و کردار کی وجہ سے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور طالبانِ علم کا اُن کے مکان پر جم گھٹا رہتا تھا۔

قاضی عبدالکریم سمعانی اپنی کتاب ''الانساب'' میں لکھتے ہیں کہ:

''رجاء بنو حنظلہ کے ایک ہندی مولیٰ کے بیٹے تھے اور اُسی نسبت سے حنظلی کہلائے''۔

امام ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب ''تہذیب التہذیب'' میں رقمطراز ہیں:

''رجاء نے نیشا پور کے ایک شمالی ضلع اسفرائین میں سکونت اختیار کر لی تھی، اسی لئے اسفرائینی کے نام سے شہرت پائی۔

رجاء اسفرائنی نے علمِ حدیث کے حصول کی خاطر دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کیا اور اس کی خاطر مختلف شہروں میں قیام کیا۔

رجاء اسفرائینی نے اپنے زمانے کے معروف و ممتاز محدثین سے علمِ حدیث کی تحصیل کی اور اس میں مہارت پیدا کی۔ انہوں نے خراسان میں امام المحدثین شیخ عبداللہ بن مبارک مروی (متوفی ۱۸۱ھ) سے حدیث کا درس لیا۔

رجاء نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ شہر کوفہ میں بسر کیا جہاں انہوں نے امام ابوبکر بن عیاش (متوفی ۱۹۳ھ)، امام ابن ادریس متوفی (۱۹۲ھ) اور قاضی حفص بن غیاث (متوفی ۱۹۴ھ) اور امام سفیان بن عینیہ (متوفی ۱۹۸ھ) اور اس طبقہ کے دوسرے

محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور درسِ حدیث لیا۔

رجاء اسلامی علوم وفنون کے اہم مراکز سے علم حدیث میں مہارت پیدا کرنے کے بعد اپنے وطن اسفرائین میں واپس آ گئے اور یہاں پر اپنا حلقہ درس قائم کیا۔ رجاء کے علم وفضل اور صدق وصفا کا چرچا جلد ہی عام ہونے لگا اور طالبانِ علم جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور ان کا مکان علم حدیث کا ذوق وشوق رکھنے والے لوگوں کا مرجع بن گیا۔

رجاء کے تبحر علمی کے پیشِ نظر انہیں جو شہرت وعظمت حاصل ہوئی اُسے دیکھ کر اربابِ علم وفضل دنگ رہ گئے کہ ایک ہندی مولیٰ کا بیٹا اس قدر بلند مقام پر فائز ہو گیا۔

ابن حجر عسقلانی روایت کرتے ہیں کہ رجاء کو ''رکن من ارکان الحدیث'' کہا جاتا تھا۔ یعنی رجاء علمِ حدیث کے ایک رکن تھے۔ یہ ایک ایسا معزز لقب ہے جو اکابر محدثین میں بہت کم لوگوں کو ملا۔

رجاء کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کو علمِ حدیث سکھانے کے علاوہ اپنے خاندان کے افراد کو حدیث کی تعلیم دینے پر خاص توجہ کی۔ جس کے نتیجے میں خاندانِ رجاء میں تیسری صدی ہجری کے دو اور نامور محدث پیدا ہو گئے۔ یعنی رجاء کا اپنا بیٹا محمد بن رجاء اور ان کا پوتا محمد بن محمد جس نے علمِ حدیث کی تحصیل وتکمیل میں اس قدر محنت وجانفشانی اور ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا کہ وہ حافظِ حدیث کے بلند مرتبہ پر فائز ہوئے۔ اُن کا ذکر حافظ ذہبی نے ''تذکرہ الحفاظ'' میں کیا ہے۔

رجاء اسفرائینی کے علمِ حدیث میں مرتبہ ومقام کا اندازہ اس اَمر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے ہم عصر محدثین میں سے نامور محدث اور ایک فقہی مذہب کے بانی امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، محدث بکر بن خلف (متوفی ۲۴۱ھ) اور محدث ابراہیم بن موسیٰ رازی (متوفی ۲۳۱ھ) نے اُن سے احادیث سماعت کیں اور محدث رجاء کے پوتے محمد بن محمد بن رجاء (متوفی ۲۸۶ھ) اور جعفر بن محمد بن شاکر الصائغ (متوفی ۲۸۹ھ) نے ان سے درسِ حدیث لیا۔

ڈاکٹر محمد اسحاق اپنی کتاب علمِ حدیث میں پاکستان و ہند کا حصہ (**Contribution of India to the Study of Hadith Literature**) میں ابنِ حجر عسقلانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''رجاء علمِ حدیث کے ایک رکن تھے۔ انہوں نے حدیث کی زبانی اشاعت کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ ایک معتبر اور ثقہ راوی حدیث ہونے کے علاوہ رجاء کو عربی الفاظ کے صحیح انتخاب اور استعمال پر بھی بڑی قدرت حاصل تھی''۔

محدث بکر بن خلف کا ان کے بارے میں بیان ہے کہ:''میں نے ان سے زیادہ فصیح اور خوش بیان مقرر نہیں دیکھا''۔

محدث رجاء سندھی کے بیٹے محمد بن رجاء نے اسفرائین میں اپنے والد کے قائم کردہ حلقہ درس کی شہرت کو برقرار رکھا۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے لائق باپ کے لائق بیٹے یعنی عالم ابن عالم ثابت ہوئے۔ پھر محدث محمد بن رجاء کے بعد ان کے بیٹے حافظِ حدیث امام محمد بن محمد نے درسِ حدیث کے اس شاندار سلسلے کو پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رکھا۔ اس طرح سرزمینِ سندھ کے ایک ہی خاندان کی تین نسلوں یعنی باپ، بیٹا اور پوتے نے اپنے وطن سے سینکڑوں ہزاروں میل دور عرب و عراق اور مصر و شام کے طویل سفر کی صعوبتوں کو برداشت کر کے علمِ حدیث میں مہارت پیدا کی اور پھر وہاں کے لوگوں میں علمِ حدیث کو وسعت و فروغ دینے میں شاندار اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔ رجاء السندھی کے خاندان کے نامور اور ممتاز محدثین کے شاگردوں میں دنیائے اسلام کے بڑے بڑے محدثین کے نام ملتے ہیں۔ جو بلاشبہ خانوادہ رجاء ہی کے لئے نہیں بلکہ سرزمینِ سندھ جو اَب اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک بڑا صوبہ ہے، کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

محدث رجاء سندھی اسفرائینی نے شوال ۲۲۱ھ میں وفات پائی۔

خلف بن سالم سندھی

امام خلف بن سالم سندھی کا شمار دوسری اور تیسری صدی ہجری کے اکابر محدثین میں ہوتا ہے۔ علمِ حدیث کے اجل عالم ہونے کے علاوہ علم تجوید کے بھی ماہر تھے۔ ان کا نام خلف بن سالم اور کنیت ابو محمد ہے۔ آل مہاب سے نسبت ولاء رکھتے تھے۔ حافظ ذہبی نے امام محمد بن خلف بن سالم کے حالات اور ان کی دینی وعلمی خدمات کو ''تذکرۃ الحفاظ'' کے آٹھویں طبقے میں رقم کیا ہے۔

مخدوم امیر احمد ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد نے اپنے مضمون بعنوان ''سرزمین سندھ میں علمِ حدیث'' مطبوعہ ماہ نامہ ''الرحیم'' کی اشاعت جولائی ۱۹۶۳ء میں امام خلف بن سالم کے مختصر احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ حافظ حدیث خلف بن سالم، سندھ سے عرب لائے گئے، آل مہاب کے غلام رہے۔ علمِ حدیث میں مہارت حاصل کر کے نام پیدا کیا۔ ذہبی اور ابن حجر عسقلانی نے خلف بن سالم کو ''حافظ حدیث'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ''تاریخ بغداد'' میں خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ خلف بن سالم مخرمی مہالبہ کے مولیٰ اور ہندی نژاد تھے۔ وہ بغداد کے ایک مشہور محلے مخرم میں رہتے تھے اس لئے مخرمی کہلائے۔

امام خلف بن سالم نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے ائمہ فقہا اور محدثین سے علم حدیث حاصل کیا جن میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں: امام ھشیم بن بشیر، امام یحییٰ بن سعید القطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، سعد بن ابراہیم بن سعد، یعقوب بن ابراہیم بن سعد، معن بن عیسیٰ القزاز، ابو نعیم، یزید بن ہارون، محمد بن جعفر، وھب بن جریر، عبدالرزاق بن ہمام، ابن نمیر اور اس طبقہ کے دوسرے محدثین۔ جبکہ امام ابو محمد خلف بن

سالم سندھی کے شاگردوں میں اسماعیل بن ابی حارث، حاتم بن لیث، یعقوب بن شیبہ، احمد بن ابی خثیمہ، جعفر طیالسی، عباس دوری یعقوب بن یوسف مطوعی، حسن بن علی معمری، احمد بن حسن بن عبدالجبار صوفی، ابوالقاسم بغوی، احمد بن علی ابار، عثمان دارمی، یحییٰ بن معین، حمزہ کتانی، ابن شیبہ اور احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر علمائے حدیث اور ائمہ فقہاء شامل ہیں۔ جس سے علم حدیث میں اس ہندی نژاد عالمِ دین کے مرتبہ و مقام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حافظ ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں امام خلف بن سالم کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ خلف بن سالم، علمِ تجوید کے ماہر اور بغداد کے مایۂ ناز حفاظِ حدیث میں سے ہیں۔ امام ھشیم، ابوبکر بن عیاش، عبدالرزاق ابن ہمام اور ان کے طبقے سے روایت کرتے ہیں اور ان سے احمد بن ابی خثیمہ، حسن بن علی معمری، ابوالقاسم بغوی اور دوسرے لوگوں نے روایت کی ہے۔ امام نسائی نے سنن میں ان سے ایک آدمی کے واسطے سے روایتِ حدیث کی ہے۔ امام نسائی کا ان کے بارے میں یہ قول ہے کہ ابومحمد خلف مخرمی ثقہ ہیں۔

امام ابو محمد خلف بن سالم کا شمار سندھ کے ان اکابر علمائے حدیث میں ہوتا ہے جنہوں نے سندھ سے باہر جا کر اپنے وطن جو اب اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک حصہ ہے کے نام کو روشن کیا اور علمِ حدیث کے علاوہ علوم عربیہ میں مہارت حاصل کر کے اہلِ عرب کی تعلیم و تربیت میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ چنانچہ مولانا اعجاز الحق قدوسی اپنی کتاب ''تاریخ سندھ'' میں لکھتے ہیں کہ وہ اکابر بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے وطن سے باہر جا کر سندھ کے نام کو روشن کیا۔ ان میں ابو معشر سندھی، ان کے صاحبزادے ابوعبدالملک محمد بن ابی معشر، امام اوزاعی، حافظ ابومحمد خلف بن سالم، ابوالعطا سندھی مشہور ہیں۔

امام ابومعشر نجیح سندھی نے سرزمین عرب میں جا کر علمِ حدیث کی تعلیم دینے کے علاوہ کتاب المغازی لکھی اور حافظِ حدیث امام ابومحمد خلف بن سالم نے اہل عرب و عجم کو علم حدیث اور فنِ تجوید کی تعلیم دینے کے علاوہ ایک مُسند بھی تصنیف کی جو اپنی جگہ ایک علمی کارنامہ ہے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ خلف بن سالم کو غریب احادیث جمع کرنے بہت شوق تھا۔ مروزی بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ سے خلف کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے

کہا کہ وہ صادق ہیں۔ میں اُن کا کوئی جھوٹ نہیں جانتا البتہ غرائب کے اشتیاق کی وجہ سے محدثین اُن سے ناراض ہیں۔ امام یحییٰ بن معین جو خلف بن سالم کے تلامذہ میں سے ہیں اُن کی راست گوئی کی شہادت دیتے ہیں۔ یعقوب بن شعبہ کہتے ہیں کہ خلف ثقہ اور ثبت ہیں اور مسدد اور حمیدی سے زیادہ پختہ کار ہیں۔ امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ اُن کی صحت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ابن حبان کا خلف کے بارے میں یہ قول ہے کہ حذاق المتقین یعنی نہایت قابل یقین۔ حمزہ کنعانی ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "خلف البتہ محدثین میں نہایت ثقہ ہیں۔"

حافظ ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجھے اپنی سند سے اُن کے ذریعے یحییٰ بن سعید کا یہ قول ملا ہے۔ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ جس روز حضرت عمار بن یاسر شہید ہوئے، ایک قد آور اور جسیم آدمی صفوں کو چیرتا ہوا نکلا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور دردناک آواز سے منادی کر رہا تھا کہ:

> "اللہ کے بندو! جنت کی طرف چلو۔ اس نے تین دفعہ یہ کہا اور پھر فرمایا کہ جنت تلواروں کے سائے کے نیچے ہے۔"

یہ سن کر لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا اور وہ جم کر لڑنے لگے۔ یہ بزرگ حضرت عمار بن یاسر تھے جو لڑتے لڑتے جلد ہی جام شہادت نوش کر گئے۔

امام ابو محمد خلف بن سالم کے احوال طبقات ابن سعد اور حافظ ذہبی کے "تذکرۃ الحفاظ" کے علاوہ ان کی کتاب "میزان"، علامہ خطیب کی "تاریخ بغداد" صفی الدین کی "خلاصہ" اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب "تہذیب التہذیب" میں ملتے ہیں۔ خلف اعیان حفاظ بغداد میں شمار کیے جاتے تھے۔ اُن کا حلقہ علماء و محدثین کا مرجع تھا جو اُن کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ اُن سے سنی ہوئی احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔ "طبقات ابن سعد" میں ہے کہ خلف نے صحابہ کرام کی برابری کے متعلق کچھ احادیث جمع کی تھیں مگر انہوں نے یہ احادیث روایت نہیں کیں۔

حافظ حدیث امام ابو محمد خلف بن سالم سندھی نے ۲۲ رمضان بروز پیر ۲۳۱ھ کو اُنسٹھ (۶۹) سال کی عمر میں وفات پائی۔

محمد بن ابومعشر سندھی

محمد بن ابومعشر سندھی اپنے زمانے کے بلند مرتبت علماء اور محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا پورا نام محمد بن عبدالرحمٰن ابومعشر سندھی اور کنیت ابوعبدالملک ہے۔ مشہور محدث اور صاحب المغازی امام ابومعشر نجیح عبدالرحمٰن سندھی کے بیٹے ہیں۔ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں ان کی ولادت ہوئی اور اسی مبارک شہر میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مگر وہ زیادہ عرصے تک مدینہ منورہ میں قیام نہ کر سکے۔

مخدوم امیر احمد ڈائریکٹر 'شاہ ولی اللہ اکیڈمی' حیدر آباد اور سابق پرنسپل سندھ اورینٹل کالج حیدر آباد اپنے مضمون بعنوان ''سرزمین سندھ میں علمِ حدیث'' مطبوعہ الرحیم'' اشاعت جولائی ۱۹۶۳ء میں محمد بن ابومعشر کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابو عبدالملک محمد، ابومعشر عبدالرحمٰن کے فرزند اور شاگرد تھے، اپنے زمانے کے بلند پایہ علماء میں شمار ہوتے تھے، باپ کی طرح حدیث اور مغازی کے فن میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ بڑے بڑے علمائے حدیث ان کے شاگرد ہیں۔ مثلاً ان کے صاحبزادے داؤد بن محمد بن (ابی معشر)، ابو حاتم محمد بن ادریس رازی، محمد بن لیث جوہری، ابو یعلی موصلی، وغیرہ۔

ڈاکٹر محمد اسحاق اپنی تحقیقی کتاب ''علمِ حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' میں رقمطراز ہیں کہ ابومعشر کے فرزند محمد ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن میں مشہور عالم دین ابن ابی زیب متوفی ۱۵۰ھ سے تعلیم حاصل کی۔ محمد زیادہ عرصہ تک مدینہ منورہ میں نہ رہ سکے کیونکہ انہیں اپنی نوجوانی ہی میں اپنے والد کے ساتھ دارالخلافہ بغداد جانا پڑا۔ اس کی تفصیل حافظ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں دی ہے اور لکھا ہے کہ ۱۶۰ھ میں عباسی

خلیفہ مہدی جب مکہ معظمہ آیا تو ابومعشر کو ایک ہزار دینار پیش کئے۔ ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا اور انہیں دعوت دی کہ وہ بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لیں اور شہزادوں کو تعلیم دیں جبکہ حافظ ذہبی نے ''تذکرہ الحفاظ'' میں یہ لکھا ہے کہ خلیفہ مہدی ان کو اپنے ساتھ عراق لے گئے۔ انہیں ایک ہزار دینار دیئے اور کہا کہ ہمارے پاس رہ کر اہل عراق کو فقہ اور حدیث سکھاؤ۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کے مطابق ابوعبدالملک کے والد ابومعشر کو عباسی خلفاء کے دربار سے متعلق علماء میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ قاضی سمعانی کے بیان کے مطابق ابومعشر نے رمضان ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔ حافظ ذہبی نے بھی ان کا یہی سن وفات لکھا ہے۔ لیکن حافظ ذہبی نے یہ نہیں لکھا کہ ان کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی۔ قاضی عبدالکریم سمعانی نے اپنی کتاب ''الانساب'' میں یہ لکھا ہے کہ ابومعشر کی نماز جنازہ خلیفہ ہارون الرشید نے خود پڑھائی۔ ان کی زبان میں کچھ لکنت تھی جس کے باعث وہ بعض الفاظ کا صحیح تلفظ ادا نہ کر سکتے تھے مثلاً کعب کو قعب ہی کہتے تھے۔

۱۶۰ھ میں عباسی خلیفہ مہدی نے ابوعبدالملک محمد کے والد ابومعشر کو دارالخلافہ بغداد آنے کی دعوت دی تھی جو انہوں نے منظور کر لی تھی۔ چنانچہ اگلے برس یعنی ۱۶۱ھ میں محدث ابومعشر مدینہ منورہ سے دارالخلافہ بغداد منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ کے علاوہ کوفہ و بصرہ اسلامی علوم وفنون کے بڑے بڑے مراکز تھے۔ دارالخلافہ بغداد میں ابھی علما کی آمد آمد تھی۔ ابوعبدالملک محمد اپنے والد ابومعشر کے ساتھ نقل مکانی کر کے بغداد میں آ گئے اس طرح انہیں امام مالک جو جلیل القدر محدث ہونے کے علاوہ ایک فقہی مسلک کے بانی بھی ہیں، سے اکتساب فیض کا موقع نہیں ملا اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ علما فقہا اور محدثین کی ابھی بغداد میں آمد آمد تھی عباسی خلفاء اہل علم وفضل کو ہر ممکن طریقے سے ترغیب دے کر بغداد میں مستقل سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ محدث ابومعشر کو بغداد آنے کی دعوت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ امام مالکؒ کو بھی پہلے خلیفہ ابوجعفر منصور نے اور پھر خلیفہ ہارون الرشید نے مدینہ منورہ جا کر بغداد آنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ ٹال گئے تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ ۱۶۱ھ میں جب ابوعبدالملک بن ابومعشر اپنے والد بزرگوار کے ساتھ مدینہ منورہ سے دارالخلافہ بغداد میں منتقل ہوئے تو وہاں علماء، فضلا، ائمہ فقہا اور محدثین کی وہ ریل پیل نہیں تھی جو مدینہ منورہ اور کوفہ و بصرہ

میں تھی۔ چنانچہ اس صورت حال کے پیش نظر محدث ابو معشر نے خود اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ کی۔ ان کے بیٹے میں بھی جوہر قابل موجود تھا۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد اپنے والد کی زیر نگرانی کم از کم ان علوم میں کامل دسترس حاصل کر لی جن میں ان کے والد کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی تحقیقی کتاب ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' میں لکھا ہے کہ ''محمد نے علم حدیث اور مغازی پر جو ابو معشر کے پسندیدہ علوم تھے بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔''

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ محدث ابو عبدالملک محمد بن ابو معشر کے شاگردوں کی فہرست میں بڑے بڑے علمائے حدیث کے نام شامل ہیں۔ لیکن خود محمد بن ابو معشر کے اپنے اساتذہ میں ان کے والد کے سوا کسی قابل ذکر عالم دین کا نام نہیں ملتا۔ بہرکیف ان کے والد نے اپنی ذاتی توجہ اور خصوصی محنت سے اس کمی کو پورا کر دیا اور اپنے بیٹے کو اپنے جیسا عالم فاضل بنا دیا اور آگے محمد ابو معشر نے اپنے دو بیٹوں یعنی حسین بن محمد اور داؤد بن محمد کی تعلیم و تربیت پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر کے انہیں بھی اپنی طرح صاحب علم و فضل بنا دیا۔ محمد بن ابو معشر کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے اور ان میں کئی معروف و ممتاز شخصیات بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسحاق لکھتے ہیں کہ محمد ایک عالم باپ کے عالم بیٹے تھے اور اپنے باپ کے علم و فضل کے امین بن گئے اور ان سے علم حاصل کرنے کے لئے طلباء اور مستقبل کے محدث اور مورخ بغداد آنے لگے۔ ابو عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، ابو حاتم رازی متوفی ۲۷۷ھ، ابن ابی الدنیا متوفی ۲۸۸ھ اور طبری متوفی ۳۱۰ھ ان کے اتنے مشہور شاگرد ہیں کہ تاریخ اسلام اور علم حدیث کے طلباء کے لئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ محمد کے دو بیٹوں حسین اور داؤد اور ان کے علاوہ ابو یعلی موصلی، یعقوب بن موسیٰ بلخی متوفی ۲۴۰ھ اور محمد بن لیث جوہری متوفی ۲۴۲ھ نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی۔ طبری نے اپنی مشہور یادگار تاریخ عالم کے لئے اپنے استاد کے توسط سے ہی قیمتی مواد ابو معشر کی تصانیف سے حاصل کیا تھا۔

خطیب بغدادی کی ''تاریخ بغداد'' سمعانی کی کتاب ''الانساب'' ابن حجر عسقلانی کی ''تہذیب التہذیب'' اور ''تقریب'' اور صفی الدین کے ''خلاصہ'' کے حوالوں سے ڈاکٹر محمد اسحاق لکھتے ہیں کہ محمد مستند راوی حدیث ہیں اور ابن حبان نے کتاب ''الثقاۃ'' میں ان کا

ذکر کیا ہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے والد سے جو احادیث سنیں وہ کئی کتابوں میں جمع کرتے رہے، جن سے ان کے زمانے میں علمائے حدیث نے فائدہ اٹھایا۔ ابو معشر سے مروی احادیث جامع ترمذی میں محفوظ ہیں۔

محمد کے والد اور استاد ابو معشر ہندی الاصل تھے۔ غلام بھی رہ چکے تھے لیکن محنت مشقت کر کے انہوں نے نہ صرف مکاتبت کی طے شدہ رقم ادا کر کے آزادی حاصل کی بلکہ انہوں نے بڑی محنت لگن اور توجہ کے ساتھ مروجہ علوم بالخصوص علم حدیث اور مغازی میں مہارت حاصل کی۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اسحاق، محمد اور ان کے والد اور استاد کی علمی خدمات اور کامیابیوں کا تذکرہ ان شاندار الفاظ میں کرتے ہیں کہ ابو معشر نے زندگی میں بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں وہ اسلام کے قدیم ترین علماء میں سے تھے۔ عربی فن تاریخ اور زبانی روایت حدیث کی ترقی میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ انہوں نے خود بلند مرتبہ حاصل کر کے اپنے خاندان کا مرتبہ بلند کر دیا اور آئندہ ایک صدی تک ان کے بیٹے یعنی محمد بن ابو معشر اور پوتے یعنی حسین بن محمد اور داؤد بن محمد علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔

امام ابو عبدالملک محمد بن ابو معشر نے تعلیم و تعلم سے بھرپور زندگی بسر کی اور ۹۹ سال کی عمر میں ۲۴۷ھ میں وفات پائی۔

فتح بن عبداللہ سندھی

محدث فتح بن عبداللہ سندھی تیسری صدی ہجری کے مشاہیر اسلام میں سے ہیں۔ وہ سرزمینِ سندھ سے تعلق رکھنے والے ان قابل قدر علماء، وفضلا اور نامور ائمہ ومحدثین میں منفرد وممتاز مقام کے حامل ہیں جنہوں نے اپنے بلند اخلاق وکردار اور اپنی دینی وتبلیغی خدمات اور حدیثی وفقہی کارناموں کی بدولت غیر معمولی شہرت وعظمت حاصل کی اور اپنے وطن کا نام پوری دنیائے اسلام میں روشن کیا۔

مخدوم امیر احمد اپنے مضمون ''سرزمین سندھ میں علم حدیث'' مطبوعہ رسالہ ''الرحیم'' حیدرآباد اشاعت جولائی ۱۹۶۳ء میں کتب تاریخ وتذکرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''ابونصر فتح بن عبداللہ سندھی آل حکم کے غلاموں میں سے تھے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد حدیث فقہ اور علم الکلام کی تعلیم کی تحصیل میں مصروف ہوئے اور ان علوم میں مہارت پیدا کی۔ حدیث میں اس زمانے کے مشہور محدث حسین بن سفیان کے شاگرد تھے۔ فقیہ اور متکلم کے نام سے مشہور ہوئے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق اپنی کتاب ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (Contribution of India to the Study of Hadith Libterature) میں قاضی عبدالکریم سمعانی کی کتاب ''الانساب'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''فتح بن عبداللہ سندھی کا لقب ابونصر تھا۔ وہ فقیہ، عالم دین اور محدث تھے۔ فقہ اور کلام میں وہ ابوعلی ثقفی کے شاگرد تھے اور حدیث کا درس حسین بن سفیان (متوفی ۳۳۰ھ) اور اس طبقہ کے دوسرے محدثین سے لیا تھا۔ وہ خاندان آل حکم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ عربوں میں دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح غلامی صدیوں سے چلی آرہی تھی اور

دوسرے ملکوں اور قدیم مذاہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح عربوں میں بھی غلاموں سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔

قرآن حکیم نے جہاں عورتوں کو معاشرے میں باعزت مقام دیا اور احکام الٰہی کے مطابق انہیں جائیداد میں باقاعدہ حصہ دار قرار دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق کا تعین کر دیا اُسی طرح قرآن حکیم میں غلاموں کے ساتھ عمدہ سلوک کرنے کا حکم دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ یا تو اپنے غلاموں کو آزاد کر دو یا پھر معاہدے کے ذریعے ان کی آزادی کی کوئی رقم طے کر لو۔ اس معاہدے کو قرآن میں مکاتبت کا نام دیا گیا ہے۔ پھر قرآن ہی میں ان سے بہتر اور عمدہ سلوک کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کو وہی کھانا کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اس طرح اسلامی معاشرے میں غلامی کی حیثیت گھریلو ملازمین (Domestic Servents) کی تھی نہ کہ ویسی جیسی روم، ایتھنز کے قدیم زمانوں جیسی یا جدید امریکہ میں گزشتہ ایک دو صدیوں جیسی۔

عربوں میں غلاموں کو موالی کہا جاتا تھا جو مولیٰ کی جمع ہے۔ مفتوحہ علاقوں کے نو مسلم موالی کہلاتے تھے۔ ان موالیوں میں اکثریت آزاد کردہ غلاموں کی تھی۔ جب کوئی غیر مسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتا یا کسی قبیلے کا کوئی غلام آزاد کر دیا جاتا تو وہ عربی معاشرے کا جزو بننے کے لئے کسی عرب قبیلے کے ساتھ منسلک ہو جاتا۔ اس طرح اسے قبیلے کے دوسرے افراد کے برابر حقوق حاصل ہو جاتے تھے۔ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں قرآنی احکام کے مطابق غلاموں سے سلوک ہوتا رہا اور غلام کے لئے مذہب، معاشرے، تعلیم اور سیاست غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی تمام راہیں کھول دی گئیں۔ غلام ہونا ان کے لئے کسی بھی لحاظ سے باعث ننگ یا ان کے حصولِ عہدہ و منصب یا ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث نہ رہا۔ قرآنی احکام اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شاندار حکمت عملی اور صحابہ کرامؓ کے فیاضانہ سلوک کے نتیجے میں ہزاروں غلام آزاد کر دیئے گئے۔ اور ان آزاد کردہ غلاموں اور ان کی اولادوں میں جہاں بڑے بڑے محدث، عالمِ دین اور فقیہ نظر آتے ہیں، وہاں غلاموں کی حکومتیں بھی قائم ہوئیں۔

خلفائے راشدین کے زمانے کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کے عہدِ حکومت میں

ملوکیت کے باعث جہاں اور بہت سی برائیاں اور قباحتیں دَر آئیں اور معاشرے میں عدم مساوات کا دور دورہ شروع ہوا وہاں غلاموں کے حقوق کا متاثر ہونا بھی قدرتی اَمر تھا۔ چنانچہ اُموی عہد کی بڑی بڑی فتوحات اور وسیع پیانے پر اشاعتِ اسلام کے باعث عجمیوں کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ کسی عرب قبیلے کے موالی بنیں، چنانچہ وہ موالیِ اسلام کہلانے لگے۔ چونکہ ان نومسلم عجمیوں کو کسی عرب قبیلے کی پشت پناہی حاصل نہ تھی اس لئے اُموی حکومت ان کو مسلمانوں کے مساوی مراعات نہ دیتی تھی بلکہ اسلام لانے کے باوجود ان سے جزیہ اور خراج وصول کیا جاتا تھا۔ معاشرتی اعتبار سے بھی انہیں عام عربوں کے برابر حقوق حاصل نہیں تھے۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی ان سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ جبکہ موالی علم و فضل، ہنرمندی، صلاحیت کار اور صنعت و حرفت میں عربوں سے آگے بڑھے ہوئے تھے اور اس زمانے کے عرب معاشرے میں ایک طاقت شمار ہونے لگے تھے۔ چنانچہ اُموی حکمرانوں کی معاشرتی ناانصافیوں اور استبدادی رویوں اور قبائلی تعصب و تفاخر ایسے غیر اسلامی اور غیر اخلاقی رجحانات کے باعث موالی اُمویوں سے بدظن ہو گئے اور بالآخر اُن کی یہ بے اطمینانی اُموی حکومت کے زوال کا باعث بنی۔

اُموی عہد حکومت میں بڑی بڑی فتوحات کے نتیجے میں بہت سے جنگی قیدی غلام بنا کر لائے گئے۔ ان میں سے بیشتر کو تو آزاد کر دیا گیا اور بقیہ کو امراء کی خدمت گزاری پر مامور کر دیا گیا۔ ان کی عورتیں بھی خادماؤں کی حیثیت سے امراء کے گھروں میں کام کرتی تھیں۔ ان غلاموں کو خریدا اور بیچا جاتا تھا یعنی ان کے حقِ ولاء کی خرید و فروخت ہو سکتی تھی لیکن ان کی باقاعدہ تجارت کا آغاز عباسی خلفاء کے عہد میں ہوا۔ ابو نصر فتح بن عبداللہ سندھی کا تعلق اُسی عباسیہ دَور سے ہے۔

موالیوں کے بارے میں اِن تاریخی حقائق و شواہد سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ فتح بن عبداللہ کو اسلامی علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل میں کن مشکل حالات سے گزرنا پڑا ہو گا۔ بہر حال ابو نصر فتح بن عبداللہ نے ہر رکاوٹ کو دور کر کے انتہائی نامساعد و ناموافق حالات میں بے پناہ عزم و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے انتہا محنت و مشقت اور لگن کے ساتھ نہ صرف علوم عربیہ میں عبور حاصل کیا بلکہ علمِ حدیث، علم الکلام اور علم الفقہ میں کامل دسترس پیدا کی اور معاشرے میں ایک باعزت و باوقار مقام حاصل کیا۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں لکھا ہے کہ ابو نصر فقیہ نے آزادی حاصل کرنے کے

بعد کلام وفقہ ابو علی محمد بن عبدالوہاب ثقفی سے پڑھے اور حسین بن سفیان اور ان کے طبقے کے محدثین سے حدیث روایت کی۔

ابو نصر فتح بن عبداللہ سندھی اپنے علمی کمالات کے پیش نظر فقیہ اور متکلم کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان کے حلقہ درس میں دور ونزدیک سے طالبان علم آ کر شریک ہوتے تھے اور اکتساب فیض کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا مجمع ہر وقت ان کے اردگرد رہتا تھا جس سے ان کی علمی قدر ومنزلت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قاضی عبدالکریم سمعانی نے اپنی کتاب ''الانساب'' میں محدث ابو نصر فتح بن عبداللہ سندھی کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ لوگ ابو نصر سندھی کا کس قدر احترام کرتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ پیدل چلتے تو ان کے مداحوں کا ایک ہجوم ان کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ راستہ میں ایک بدمست عرب پڑا تھا۔ اُس عرب نے محدث ابو نصر سندھی کو دیکھ کر کہا:

''اے غلام! میں تو زمین پر پڑا ہوں اور تم اس شان کے ساتھ جا رہے ہو؟''

محدث ابو نصر نے نہایت عاجزی سے لیکن برجستہ جواب دیا۔ ''اس کا سبب یہ ہے کہ میں نے تمہارے بزرگوں کا وطیرہ اختیار کیا اور تم میرے باپ دادا کے طریقے پر چل رہے ہو''۔

محدث ابو نصر فتح بن عبداللہ سندھی نے ۵۷۲ھ میں وفات پائی۔

امام محمد بن محمد

امام محمد بن محمد رجاء سندھی تیسری صدی ہجری کے ممتاز محدث تھے، ان کی کنیت ابوبکر تھی۔ چونکہ ان کے باپ دادا نے اسفرائن میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اس لیے اسفرائنی بھی کہلاتے تھے۔ ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ علم حدیث میں ان کی مہارت، ان کی صداقت پسندی اور تنقیدی نقطۂ نظر کے علاوہ ان کے تحقیق و تجسس کے جذبہ نے انہیں ایک بلند مرتبہ محدث بنا دیا۔

امام محمد بن محمد کے آباء و اجداد کا تعلق سندھ سے تھا، جو آج کل اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک اہم صوبہ ہے۔ اس نسبت سے امام محمد بن محمد سندھی نژاد بلکہ پاکستانی نژاد ہوئی۔ سندھ کو اس نام سے کب پکارا جانے لگا، اس کے بارے میں اب تک کی جانے والی تحقیقات کے مطابق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال فاتح سندھ محمد بن قاسم کی برصغیر میں آمد کے وقت مکران سے لے کر راجپوتانہ، مالوہ، گجرات اور ملتان تک کے علاقے کو سندھ کہا جاتا تھا اور یہ ایک مردم خیز ملک تھا۔

امام محمد بن محمد بن رجاء سندھی کا تذکرہ حافظ ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں اور قاضی عبدالکریم سمعانی نے اپنی کتاب ''الانساب'' میں کیا ہے۔ سمعانی (متوفی ۵۶۲ھ) نے محدثین کے احوال و آثار بیان کیے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''الانساب'' میں اپنے معاصرین اور متقدمین کا شہروں اور علاقوں کے انتساب سے ذکر کیا ہے۔ اس میں دیگر اسلامی ممالک کے علاوہ برصغیر کے بالخصوص سندھ دیبل، منصورہ اور لاہور کے علماء محدثین کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً ابو معشر نجیح سندھی جو نومسلم تھے اور مدینہ منورہ میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے تھے اس وجہ سے مدنی کہے جاتے تھے۔ دوسرے نومسلم محدث رجاء السندھی کا

بھی تذکرہ کیا ہے جو امام محمد بن سندھی کے دادا تھے اور نقل وطن کر کے اسفرائین میں مستقل رہائش رکھنے کی بناء پر اسفرائنی کہلانے لگے۔ رجاء السندھی نے ۳۲۱ھ میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے امام محمد بن رجاء بھی ایک نامور محدث تھے جو دارالخلافہ بغداد میں درس حدیث دیا کرتے تھے۔ یہ امام محمد بن رجاء السندھی امام محمد کے والد تھے۔

امام محمد بن محمد بن رجاء السندھی حافظ حدیث تھے اس لیے مناسب ہوگا کہ محدثین کے القاب کی وضاحت کر دی جائے۔ اس فن میں لبنانی فاضل ڈاکٹر صبحی صالح اپنی کتاب ''علوم الحدیث'' میں لکھتے ہیں کہ جس طرح طلب حدیث میں سفر کرنے والوں پر علما سفر و سیاحت میں ان کی دلچسپی اور مستعدی کے مطابق مختلف القاب کا اطلاق کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے شہر یا قریبی علاقے میں علم حدیث کی تحصیل کرنے والوں پر بھی چند رسمی القاب کا اطلاق کیا جاتا ہے تا کہ ان کا تعارف کراتے وقت ان کا درجہ و طبقہ اور طریق تحصیل و تدریس واضح ہو جائے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صبحی ''تدریب الراوی'' اور'' الجامع الاخلاق الراوی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

تین القاب زیادہ مشہور ہیں جن میں محدثین فرق و امتیاز قائم کرتے ہیں:

۱۔ مسند ۲۔ محدث ۳۔ حافظ

مسند: وہ شخص ہے جو اپنی سند سے روایت کرتا ہو۔ خواہ اسے حدیث کا پورا علم ہو یا نہ ہو بلکہ وہ صرف روایت ہی کر رہا ہو۔

محدث: محدث اس سے بلند ہوتا ہے۔ چنانچہ محدث وہ ہے جو اسانید و علل، اسماء الرجال اور سند عالی و نازل سے آگاہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سی احادیث بھی اس کو یاد ہوں۔ کتب صحاحِ ستہ، مسند احمد بن حنبل، سنن بیہقی اور معجم طبرانی کا سماع کر چکا ہو اور اجزاء حدیث میں سے ہزار جزء پر اس کا علم حاوی ہو۔

حافظ: حافظ کا مقام و مرتبہ ان دونوں یعنی مسند اور محدث سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ حافظ ان اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔

۱۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے متن و سند سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔

۲۔ جن احادیث کی صحت پر اتفاق کیا گیا ہے اسے وہ یاد ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں جن کی صحت مختلف فیہا ہوتی ہے وہ انہیں بھی جانتا ہے۔

۳۔ وہ محدثین کے ان اقوال کے مابین پائے جانے والے فرق و امتیاز کو جانتا ہے۔

جیسا کہ محدثین کہتے ہیں:(۱) فلان حجه (۲)فلان ثقة (۳)فلان مقبول وو سط (۵)ولا باس به (۶)صدوق (۷)صالح (۸)شیخ (۹) لین (۱۰) ضعیف (۱۱) متروک (۱۲) ذاهب الحدیث

۴۔ مختلف الفاظ میں جو روایت کی جاتی ہے وہ ان کے فرق سے آگاہ ہوتا ہے۔ مثلاً عن فلان یا ان فلاناً وغیرہ۔

۵۔ وہ قولِ صحابی و تابعی کے فرق سے آشنا ہوتا ہے۔

۶۔ وہ جانتا ہے کہ قال فلان اور عن فلان میں کیا فرق ہے۔

۷۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ مدلس راویوں میں سے فلاں شخص غیر یقینی سماع کے باوجود قابلِ قبول ہے۔

۸۔ صحیح حدیث میں جو لفظ وہم پر مبنی ہو وہ اس سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔

۹۔ حدیث میں جو لفظ داخل کر دیا گیا ہو اور درحقیقت وہ حدیث کے الفاظ میں شامل نہ ہو (مدرج) وہ اس سے بھی غافل نہیں ہوتا۔

۱۰۔ علم حدیث میں خوب محنت کر کے اس نے رواۃ حدیث سے پوری پوری آگاہی حاصل کر لی ہو۔ اس لئے علم حدیث میں وہی شخص مہارت حاصل کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دے اور دوسرے علوم کی جانب متوجہ نہ ہو۔

۱۱۔ علماء کے اقوال سے مستفاد ہوتا ہے کہ حافظ اسماء الرجال کے فن میں اس قدر ماہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے شیوخ اور پھر ان کے شیوخ کے طبقات سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے۔ وہ ہر طبقہ کی اکثر باتوں کو جانتا اور بہت کم باتوں سے ناآشنا ہوتا ہے۔

۱۲۔ اکثر نقادانِ حدیث کے نزدیک حفاظِ حدیث ہر زمان و مکان میں قلیل الوجود ہوتے ہیں بلکہ اکثر اوقات وہ بالکل موجود ہی نہیں ہوتے (اس کی تفصیل ''الجامع الاخلاق الراوی میں ملتی ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ حفاظ میں صفاتِ نادرہ اور وسعتِ علمی کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ جب حافظ کا لفظ علی الاطلاق بولا جاتا ہے یعنی کسی قید یا شرط کے بغیر جب صرف حافظ کہا جائے تو اس سے ''حافظِ حدیث'' ہی مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ ''الجامع الاخلاق الراوی'' میں مرقوم ہے کہ قرآن مجید کا قاری یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے فلاں حافظ سے قرات

سیکھی بلکہ وہ یوں کہے گا کہ میں فلاں حافظ قرآن سے قرات سیکھی۔ اسی طرح علم نحو کا عالم یہ نہیں کہہ سکتا ہے مجھے فلاں حافظ نے تعلیم دی۔ بلکہ وہ یہاں حافظِ نحو اضافت کے ساتھ استعمال کرے گا جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے نحو کے عالم سے تعلیم حاصل کی۔

حافظ حدیث کے بارے میں بیان کی گئی صفات اور خصوصیات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حافظِ حدیث کس مرتبہ و مقام کا شخص ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اس مرتبہ و مقام تک پہنچنے کے لیے کس قدر محنت و جانفشانی، عرق ریزی اور عزم و استقامت کی ضرورت ہے جس کے بغیر یہ ایک لفظ کا سابقہ ایک عالمِ دین کے نام کے ساتھ نہیں لگ سکتا۔ بالفاظِ دیگر حافظِ حدیث بننے کے لیے کتنے علماء اور ائمہ محدثین کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑتا ہے اور پھر برسوں کی محنت و ریاضت کے بعد کہیں جا کر یہ مقام نصیب ہوتا ہے۔

تابعین میں امام محمد باقر، ان کے فرزند امام جعفر صادق اور امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت حافظِ حدیث تھے۔ امام اعظم کے علاوہ ائمہ اربعہ میں سے دیگر تینوں ائمہ کرام یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل بھی حافظِ حدیث تھے۔ امام اعظم کے اصحاب اور تلامذہ میں درجن بھر ائمہ، فقہاء حفاظِ حدیث تھے، جن میں سرفہرست ان کے شاگردِ رشید حافظِ حدیث امام ابو یوسف ہیں جو اسلامی سلطنت کے اولین قاضی القضاۃ ہونے کے علاوہ امام احمد بن حنبل کے استاد بھی تھے۔ علاوہ ازیں امام عبداللہ بن مبارک، فضیل بن عباس، سفیان بن عینیہ، قاضی حفص بن غیاث، امام یحیٰ بن سعید القطان وغیرھم ایسے ثقہ اور جلیل القدر حفاظِ حدیث امام اعظم کے اصحاب و تلامذہ میں شامل ہیں۔

عربوں کے دورِ حکومت میں سرزمینِ سندھ میں جہاں بہت سے محدثین منظرِ عام پر آئے وہاں بعض محدثین حافظِ حدیث کے بلند مقام پر بھی فائز ہوئے، جن میں امام اوزاعی (متوفی ۱۵۳ھ) امام ابومعشر السندھی المدنی (متوفی ۱۷۲ھ) امام خلف بن سالم سندھی (متوفی ۲۳۱ھ) اور امام محمد بن محمد بن رجاء سندھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات علم حدیث حاصل کرنے کی طلب صادق اور عزم راسخ رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے علمِ حدیث کی تلاش و جستجو میں طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور دنیائے اسلام کے اہم علمی مراکز میں قیام کر کے علمِ حدیث میں مہارت پیدا کی۔

حافظ ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں امام محمد بن محمد کو دسویں طبقے میں شمار کیا ہے۔ اور ان کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی کنیت ابوبکر اسفرائینی ہے، ایک صحیح کے مصنف ہیں جو امام مسلم کی کتاب پر تخریج ہے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی تحقیقی کتاب علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ (Contribution of India to the Study of Hadith Litrature) میں ان کا شاندار الفاظ میں تعارف کرانے کے بعد لکھا ہے کہ ''ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں ان کا جو مختصر تذکرہ کیا ہے وہ نقل کیے جانے کے قابل ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں کہ محمد بن محمد بن رجاء السندھی حافظ اور امام تھے ان کا لقب ابو بکر اسفرائینی تھا وہ صحیح بخاری کی ایک مستخرج کے مصنف تھے، انہوں نے علم حدیث کی تعلیم اسحاق بن راہویہ (متوفی ۲۳۸ھ)، احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ)، علی المدنی (متوفی ۲۳۱ھ)، عبداللہ بن نمیر (متوفی ۱۹۹ھ) اور ابوبکر بن شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے علم حدیث کی جستجو میں طویل سفر کیے۔''

امام ابوبکر محمد بن محمد بن رجاء سندھی کی سند سے جن نامور محدثین نے احادیث روایت کی ہیں ان میں ابوعوانہ (متوفی ۳۱۰ھ) ابو حامد الشرقی، محمد بن صالح بن حانی، ابن الاخرم، ابونصر محمد بن محمد کے علاوہ بعض دوسرے محدثین بھی شامل ہیں۔ ان کے بارے میں امام حاکم کا قول ہے کہ ابوبکر اپنے عہد کے محدثین میں نہایت صادق و ثابت قدم تھے۔

امام ابوبکر محمد بن محمد نے علم حدیث کے وسعت و فروغ میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی دینی، حدیثی اور علمی سرگرمیاں صرف اسفرائین تک محدود نہیں تھیں بلکہ انہوں نے مکہ معظمہ میں بھی حدیث کا درس دیا جس سے ان کی شہرت و عظمت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مکہ معظمہ میں علمِ حدیث کے شائقین کا ہجوم انہیں گھیرے رہتا تھا۔ ان سے سماعِ حدیث کرنے والوں میں ایک نمایاں نام ابو حاتم (متوفی ۲۷۷ھ) کا ہے۔

حافظ حدیث امام ابوبکر محمد بن محمد رجاء سندھی اسفرائینی نے اسی برس کی عمر میں ۲۸۶ھ میں وفات پائی۔

محمد بن ابی جعفر دیبلی

محمد بن ابی جعفر چوتھی ہجری کے معروف محدث اور نامور عالم دین تھے، سندھ کے مشہور شہر دیبل میں پیدا ہوئے، اس نسبت سے محمد بن ابی جعفر دیبلی کہلائے۔ ان کا پورا نام محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلی مکی ہے اور ابو جعفر ان کی کنیت تھی۔ محمد بن ابی جعفر دیبلی نے علمِ حدیث کی تحصیل و تکمیل میں غیر معمولی ذوق و شوق اور محنت و جانفشانی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے علمِ حدیث میں درجۂ کمال حاصل کرنے کے لیے دور دراز علاقوں کے سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور دنیائے اسلام کے بڑے اور اہم دینی و علمی مراکز میں قیام کر کے معروف و ممتاز علماء اور محدثین کی صحبت اختیار کی اور ان سے حدیث کا درس لینے کے علاوہ دیگر علوم بھی سیکھے۔

محمد ابی جعفر نے ابتدائی تعلیم دیبل ہی میں حاصل کی پھر وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے بیرونی ممالک کے سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ محمد بن ابی جعفر دیبل کے پہلے عالم تھے جو حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ممالک گئے۔

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد دوم (عربی) کے مقالہ نگار ممتاز احمد پٹھان لکھتے ہیں: ''محمد بن ابی جعفر دیبلی کے نام سے معروف ہیں مشہور محدث تھے، اس کے علاوہ وہ اپنے زمانے میں علمِ حدیث کے عظیم استاد مانے جاتے تھے۔ دیبل میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ علم کی تلاش میں مکہ مدینہ اور دوسرے مراکز میں تشریف لے گئے۔''

کننگھم (Cunningham) کی کتاب ''ہندوستان کا قدیم جغرافیہ'' (Ancient Geography of India) اور ایلیٹ (Elliot) کی کتاب ''تاریخِ

ہند'' (The History of India) کے اندراجات کے مطابق عربوں کے عہد حکومت میں دیبل ایک مشہور بندرگاہ تھا جو موجودہ ٹھٹھہ اور کراچی کے درمیان واقع تھا۔ جب کہ بعض دوسری روایات کے مطابق دیبل کا شہر اسی جگہ آباد تھا جہاں اب کراچی ہے۔ بہر حال یہی وہ شہر ہے جس کے قید خانے میں راجا داہر نے مسلمانوں کو قید کر رکھا تھا اور فاتح سندھ محمد بن قاسم نے سب سے پہلے اسی شہر کا محاصرہ کیا تھا۔ مجاہدین ابھی دیبل فتح کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے کہ برہمن نے شہر پناہ سے نکل کر محمد بن قاسم کو بتلایا کہ ''ہماری نجوم کی کتابوں میں لکھا ہے کہ سندھ کا ملک مسلمان فتح کر لیں گے۔ لیکن جب تک یہ بت خانہ مسمار نہیں ہوتا اور اس پر جو بڑا جھنڈا لہرا رہا ہے وہ پارہ پارہ نہیں ہو جاتا یہ شہر فتح نہیں ہوگا۔ اس جھنڈے میں دیبل کی فتح کا راز ہے۔''

چچ نامہ کی اس روایت کے مطابق محمد بن قاسم کو جب اہلِ دیبل کے اس عقیدے کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے فوجی مشیروں بالخصوص عروسک نامی منجنیق کے نشانہ باز جعونہ سے مشورہ کیا اور ساتھ ہی حجاج بن یوسف کو خط لکھا، جس میں حسبِ ہدایات ساری صورت سے مطلع کیا۔ حجاج کو اس جنگ سے جو گہری دلچسپی تھی اسے مؤرخین نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ دراصل ایک زبردست جرنیل اور دنیا کے بہت بڑے جنگی منصوبہ ساز کی حیثیت سے وہ اسلامی سلطنت کی حدود جنوب مشرق میں برصغیر کے آخری علاقوں اور پھر کشمیر کے ذریعے چین تک اور مغرب میں فتح اندلس کے بعد فرانس، جرمنی اور پولینڈ تک وسیع کرنا چاہتا تھا۔ سندھ کی فتح اس کے جنگی منصوبے کا پہلا اور ابتدائی مرحلہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے سپہ سالار محمد بن قاسم سے سندھ کی لڑائیوں کے حالات جاننے کے لیے خط وکتابت کا اس قدر عمدہ انتظام کر رکھا تھا کہ سندھ کا ہر خط ساتویں دن اس کے پاس بصرے پہنچ جاتا تھا اور ایک ہی ہفتے میں اس کا جواب سندھ میں محمد بن قاسم کو مل جاتا تھا۔

حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کے خط کے جواب میں جنگ کے بارے میں مزید ہدایات دیتے ہوئے لکھا کہ تم اپنی فوج کی صفوں کی اس طرح ترتیب دو کہ سورج تمہاری پشت پر رہے تاکہ تم دشمن کی نقل وحرکت کو اچھی طرح دیکھ سکو۔ صبح ہوتے ہی اللہ تعالیٰ سے فتح ونصرت اور مدد طلب کرو اور جنگ شروع کر دو۔ اگر سندھ کا کوئی شخص رحم اور پناہ کی درخواست کرے تو اسے امن دو۔ لیکن دیبل والوں کو بالکل پناہ نہ دو۔ حجاج نے یہ بھی ہدایت کی کہ عروسک نامی منجنیق کو مشرق کی سمت گاڑ کر اور ایک پایہ چھوٹا کر کے

یعنی اس کا درجہ گھٹا کر مندر کے گنبد کو نشانے پر لے کر سنگباری کی جائے، پھر یقیناً فتح تمہاری ہوگی۔ حجاج کی ہدایات کے مطابق محمد بن قاسم نے دیبل پہنچنے کے نویں روز جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا عروسک کو نصب کرا کے سنگباری کا حکم دیا سب سے پہلا پتھر جعونہ نے پھینکا پھر پتھروں کی بارش شروع کر دی جس سے قلعہ دیبل کا گنبد ٹوٹ گیا اور جھنڈا گر پڑا۔ اہل دیبل میں مایوسی اور سراسیمگی کی کیفیت پیدا ہوگئی اور ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ بہر حال سندھی افواج نے شہر سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ کیا۔ مسلمان بھی یہی چاہتے تھے کہ دوبدو جنگ ہو۔ مسلمانوں نے شدید حملے شروع کیے۔ ان حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے سندھی افواج پھر شہر میں گھسنے لگی۔ اسی دوران مسلمانوں نے شہر پناہ کی فصیل پر چڑھنا شروع کر دیا۔ پہلا شخص جو فصیل پر چڑھا وہ کوفے کا ایک مجاہد صعدی بن خزیمہ تھا۔ دوسرا شخص عجل بن الملک جو بصرہ کا رہنے والا تھا۔ اہل دیبل نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان شہر پناہ کی فصیل پر چڑھ گئے تو انہوں نے فوراً شہر کے دروازے کھول دیئے اور امن کے خواہاں ہوئے۔ لیکن محمد بن قاسم نے حجاج کی ہدایات کے مطابق تین روز تک فتنہ پرداز اور ہتھیار بند لوگوں کو قتل کیا۔ دیبل کے گورنر نے راہِ فرار اختیار کی۔

دیبل کے جیل خانہ میں سراندیپ کے وہ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے قید تھے جن کی آزادی کے لیے حجاج نے راجا داہر کو خط لکھا تھا مگر راجا داہر نے کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ جواب دیا تھا کہ یہ کام بحری قزاقوں کا ہے جو ہمارے احاطہ اختیار سے باہر ہیں۔ دیبل کی فتح پر راجا داہر کے اس دجل و فریب کا پردہ اس طرح چاک ہوا کہ محمد بن قاسم نے داروغہ جیل کو طلب کیا تاکہ اسے قتل کیا جائے۔ قبلہ نامی داروغہ جیل ایک ذہین و زیرک اور عمدہ اخلاق و کردار کا مالک ہونے کے علاوہ برصغیر کا مشہور ادیب، ماہر انشاء پرداز اور صاحبِ علم انسان تھا۔ اس نے ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے محمد بن قاسم کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے بارے میں کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے جیل میں قید مسلمانوں کو بلوا کر ان سے دریافت کر لیا جائے کہ ان سے میرا سلوک کیسا رہا؟ چنانچہ جب مسلمان قیدیوں سے پوچھا گیا تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ "ہم سب داروغہ جیل کے شکرگزار ہیں انہوں نے ہمارے ساتھ بہت عمدہ سلوک کیا اور ہماری تسلی و تشفی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یہ ہمارا حوصلہ بڑھاتے رہے اور ہمیں بتاتے رہے کہ اسلامی لشکر جلد آ کر تمہیں اس مصیبت سے نجات دلائے گا۔"

محمد بن قاسم کو جب اس صورت حال کا علم ہوا تو اس نے داروغہ جیل کی پذیرائی کی اور اسے اسلام کی دعوت دی جسے داروغہ جیل "قبلہ" نے قبول کر لیا جس پر محمد بن قاسم نے حمید بن وداع بحری کو دیبل کا حاکم اور قبلہ داروغہ جیل کو اس کا مشیر اور نائب مقرر کر دیا اور شہر میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔ یہ سندھ میں تعمیر ہونے والی پہلی مسجد تھی۔ دیبل ہی میں محمد بن قاسم نے چار ہزار عرب خاندانوں کی ایک بڑی بستی آباد کی جو سرزمین سندھ میں فاتح عربوں کی اوّلین آبادی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیبل کی آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ تیسری صدی ہجری کے اواخر میں اس کی آبادی کا اندازہ مؤرخین نے دو اور تین لاکھ نفوس کے درمیان لگایا ہے اس لیے کہ اس زمانے میں ایک زلزلہ میں دیبل میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کا تخمینہ ڈیڑھ لاکھ لگایا گیا ہے۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد چوتھی صدی ہجری میں دیبل ریاست منصورہ کا بندرگاہ تھا اور ایک سو گاؤں اس سے ملحق تھے۔

۲۷۹ھ میں مؤرخ یحییٰ بن احمد البلاذری، محدث احمد بن ابی خثیمہ اور امام ابوعیسیٰ ترمذی صاحب السنن نے وفات پائی۔ اسی سال معتمد عباسی فوت ہوا اور اس کی جگہ معتضد باللہ خلیفہ بنا۔ اس سے ایک سال قبل ۲۷۸ھ میں ملحدانہ نظریات کے علمبردار قرامطہ کا ظہور ہوا جب کہ ۲۸۰ھ میں دیبل میں زبردست ہلاکت آفریں زلزلہ آیا۔ ۲۸۴ھ میں مصر میں سرخ آندھی آئی جس سے اہلِ مصر خوف زدہ ہو گئے۔ اسی دوران قرامطہ نے اپنی اسلام دشمن اور مسلم کش سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ابوسعید قرمطی منظرِ عام پر آیا اور ۲۸۷ھ میں قرمطیوں نے حاجیوں کا قتل عام کیا۔ ۲۹۰ھ میں یمن اور بحرین کے قرامطہ نے مصر کے فاطمی خلفاء کی مدد سے مسلمانوں پر شدید مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ ان ملاحدہ نے ۲۹۳ھ میں عراق اور پھر ۲۹۴ھ میں شام میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی پھر قتل وغارت اور لوٹ مار کا سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ ۳۰۱ھ میں منصور حلاج نے انا الحق کا نعرۂ مستانہ لگا کر الوہیت کا دعویٰ کیا اور اگلے برس ۳۰۲ھ میں عبید اللہ مہدی مصر پر حملہ آور ہوا۔ ۳۰۳ھ میں مسعودی سندھ میں وارد ہوا اور قرامطہ کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ وہ ہر سال حاجیوں کو فریضہ حج ادا کرنے سے روکتے رہے اور کم و بیش ہر سال حاجیوں کا قتل عام کرتے رہے حتیٰ کہ ۳۱۷ھ میں قرامطہ نے مکہ مکرمہ میں قتلِ عام کیا۔ حاجیوں کی لاشوں کو چاہِ زمزم میں پھینکا اور حجرِ اسود کو خانہ کعبہ سے اکھاڑ کر لے گئے۔

یہ وہ دور پُر آشوب اور انتہائی تلخ اور تکلیف دہ حالات و واقعات ہیں جس دور اور جن حالات میں محدث ابو جعفر دیبلی پیدا ہوئے، پرورش پائی، ہوش سنبھالا اور زندگی گزاری۔ ان کی تاریخ پیدائش تو معلوم نہیں ہے لیکن اندازے سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیبل میں آنے والے زلزلے سے پہلے پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کب نقل وطن کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی کتاب ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ (Contribution of India to the Study of Headith Literature) میں لکھا ہے کہ محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلی نے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور وہاں کے چند مشہور محدثین سے درس لیا۔ ان کے مکہ پہنچنے کی تاریخ کا ہمیں علم نہیں لیکن ان کے شیوخ کی وفات کی تاریخوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، تیسری صدی کی چوتھی دہائی تک ان کے تمام شیوخ وفات پا چکے تھے اس سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے پہلے ہی مکہ چلے گئے تھے۔ اگر ڈاکٹر محمد اسحاق کے اس قیاس کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر دیبل میں آنے والے خوفناک زلزلے کے وقت یہاں موجود نہیں تھے۔ مگر قرامطہ نے حاجیوں کا جو بار بار قتل عام کیا اور پھر ۳۱۷ھ میں ان کی وفات سے پانچ سال پہلے حجرِ اسود کو اکھاڑ کر لے گئے تو اس وقت محدث ابو جعفر دیبلی مکہ مکرمہ میں موجود تھے۔

کہا جاتا ہے کہ محدث ابو جعفر دیبلی نے دو مشہور کتابوں یعنی امام سفیان بن عینیہ کی کتاب التفسیر اور امام عبداللہ بن مبارک کی کتاب البر والصلة پر حاشیے بھی لکھے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق نے ابن الندیم کی ''الفہرست'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابو جعفر دیبلی نے کتاب التفسیر کا درس ابن عینیہ کے شاگرد عبدالرحمن مخزومی (متوفی ۲۴۹ھ) اور کتاب البر والصلة کا درس ابن مبارک کے شاگرد حسین مروزی (متوفی ۲۴۲ھ) سے لیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے مکہ مکرمہ کے محدث محمد بن زنبور، عبدالرحمن بن صبیح اور بعض دوسرے محدثین سے بھی احادیث روایت کی ہیں جب کہ ابوالحسن احمد بن ابراہیم بن فراس مکی، ابوالحسین محمد بن محمد الحجاج (متوفی ۳۶۸ھ) اور محمد بن ابراہیم المقری (متوفی ۳۸۱ھ) نے ابو جعفر دیبلی سے احادیث روایت کی ہیں۔

محدث ابو جعفر محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلی نے مکہ مکرمہ میں ماہ جمادی الاول ۳۲۲ھ میں وفات پائی۔

محمد بن محمد دیبلی

امام محمد بن محمد دیبلی چوتھی صدی ہجری کے ممتاز محدث، نامور عالم دین اور عارف باللہ تھے۔ وہ سرزمین سندھ کے مردم خیز خطے اور بندرگاہ دیبل، موجودہ کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام ونسب یوں ہے:

محمد بن محمد ابن عبداللہ ورّاق دیبلی۔

امام محمد بن محمد دیبلی محدث احمد بن عبداللہ دیبلی کے ہم عصر اور ہم مکتب بھی تھے (محدث احمد بن عبداللہ ایک عارف باللہ تھے، انہوں نے ۳۴۳ھ میں وفات پائی)۔ امام محمد بن محمد کو بچپن ہی سے تحصیل علم کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر دیبل ہی میں حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے تحصیلِ علم کے لئے دور دراز علاقوں اور مختلف ملکوں کا سفر اختیار کیا اور اسلامی علوم وفنون کے اہم مراکز یعنی دارالخلافہ بغداد، بصرہ، عسکر مکرم اور فاریاب میں قیام کر کے وہاں کے معروف وممتاز علما اور محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مؤخرالذکر مقام یعنی فاریاب ''قرونِ وسطیٰ میں خراسان کے ضلع جرجان میں ایک بستی کا نام تھا: لے اسٹرینج (Le Strange) نے اپنی کتاب 'مشرقی خلافت کے خطے' (Lands of the Eastern Caliphate) میں فاریاب کے کوائف بیان کئے ہیں۔ فاریاب علوم و فنون کا مرکز ہونے کے علاوہ ایک مردم خیز قصبہ تھا جہاں متعدد بڑی بڑی دینی اور علمی و ادبی شخصیات نے جنم لیا، جن میں نامور شاعر ظہیر فاریابی بھی شامل ہے۔ محدث محمد بن محمد دیبلی نے فاریاب میں قیام کر کے وہاں کے معروف محدثین سے علمِ حدیث کا درس لیا جن میں جعفر بن محمد فاریابی اور محمد بن الحسن فاریابی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسحاق مصنف ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (Contribution of India to the Study of Hadith Literature) کی تحقیق کے مطابق محمد بن محمد دیبلی نے محدث جعفر بن محمد فاریابی (متوفی ۳۰۱ھ) سے علم حدیث بغداد میں سیکھا تھا جب کہ عسکر مکرم کے محدث عبدان بن احمد (۲۱۰ تا ۳۰۶ھ) اور فاریاب کے محمد بن الحسن اور وہاں کے دوسرے محدثین سے علم حدیث کا درس لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد اسحاق کی تحقیق بھی ''سمعانی'' کی کتاب ''الانساب'' تک ہی محدود ہے۔

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں لکھا ہے:

''محمد بن محمد دیبلی نے جن اساتذہ سے حدیث کی سماعت کی ان میں محدث ابو خلیفہ فضل بن الحباب الجمحی، جعفر بن محمد بن حسن فاریابی، عبدان بن احمد بن موسیٰ عسکری اور محمد بن عثمان ابوسعید بصری کے علاوہ ان کے طبقے کے دوسرے محدثین بھی شامل ہیں۔'' کتب تاریخ و تذکرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن محمد دیبلی نے اپنے ان اساتذہ سے سماعتِ حدیث کے علاوہ روایت حدیث بھی کی۔

''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند'' کے فاضل مقالہ نگار، ممتاز احمد پٹھان نے اپنے مقالے بعنوان ''سندھ میں عربوں کا عہد حکومت'' میں عربی ادب کی نشو ونما اور ارتقاء کا جائزہ لیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے سمعانی کی کتاب ''الانساب'' کے حوالہ سے سندھ کے علماء، فقہا اور محدثین کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد بن محمد دیبلی کے احوال بھی مختصراً بیان کئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے محمد بن محمد دیبلی کے اساتذہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ علمِ حدیث کی تحصیل و تکمیل کے بعد وہ علم حدیث کے وزاق بن گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حاکم نیشاپوری جیسے فضلاء نے اُن سے علم حدیث اور فن وزاقی سیکھا۔''

محدث محمد بن محمد دیبلی صاحبِ علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے صدق و صفا اور زہد و ورع کے لئے بھی مشہور تھے۔ وہ ایک درویش منش انسان ہی نہیں بلکہ عارف باللہ بھی تھے۔ قاضی عبدالکریم سمعانی نے ''الانساب'' میں ان کے نام کے ساتھ ''زاہد'' کا لاحقہ استعمال کیا ہے۔ اس زمانے میں لفظ زاہد صوفی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ دیبل کے دو نامور محدثین یعنی احمد بن عبداللہ اور محمد بن محمد زاہد میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں دیبل کے باشندے تھے۔ دونوں ہم مکتب تھے، دونوں حصولِ علم کی خاطر

بیرون ملک گئے۔ دونوں نے اپنے زمانے کے معروف محدثین سے اکتسابِ علم کیا۔ دونوں نے بغداد میں جعفر بن محمد فاریابی، بصرہ میں ابو خلیفہ قاضی اور عسکر مکرم کے عبدان بن احمد سے علمِ حدیث کا درس لیا۔ اور دونوں نے حصولِ علم کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کیا اور دونوں بڑے متقی، پرہیزگار اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ دونوں صوفیوں، زاہدوں اور درویشوں کی صحبت میں رہنا پسند کرتے تھے اور دونوں زاہد و عابد اور نیک و صالح تھے۔ احمد بن عبداللہ دیبلی نے تو صوفی حسن بن یعقوب الحداد (متوفی ۳۳۶ھ) کی خانقاہ میں خلوت گزینی اختیار کر لی تھی۔ یہ خانقاہ نیشا پور میں تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آخری حصہ اس خانقاہ میں عبادت و ریاضت میں گزارا اور وہیں ۳۴۳ھ میں وفات پائی۔ اس زمانے میں محدث محمد بن محمد زاہد دیبلی دوسرے اہلِ اللہ اور عارف باللہ ہیں جن کا تذکرہ کتبِ تاریخ میں ملتا ہے، وگرنہ سندھ میں عربوں کے عہدِ حکومت میں صوفیہ کرام کا ذکر خال خال ملتا ہے۔

سرزمین سندھ کے ایک نامور صوفی بزرگ شیخ ابو علی سندھی تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے اُستاد تھے۔ ''نفحات الانس'' میں مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے شرح شطحیات شیخ روز بہان بقلی کے حوالے سے لکھا ہے ''بایزید گوید من از ابو علی علم فنا و توحید آموختم و ابو علی از من الحمد و قل ھو اللہ احد'' یعنی حضرت بایزید نے فرمایا کہ میں نے ابو علی سے توحید اور فنا کے نکات سیکھے اور ابو علی نے مجھ سے ''الحمد'' اور ''قل ھو اللہ احد'' کی تشریح و توضیح سیکھی۔ گویا کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے استاد بھی تھے اور شاگرد بھی۔

سرزمین سندھ میں وارد ہونے والے پہلے محدث اور صوفی بزرگ امام ربیع بن صبیح سعدی بصری تھے جو ۱۵۹ھ میں فوج کے ساتھ یہاں تشریف لائے۔ امام ربیع، امام حسن بصری کے شاگرد تھے، جن کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ وہ اسلام میں اوّلین مصنف و مرتب تھے۔ حاجی خلیفہ نے ''کشف الظنون'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے تدوینِ حدیث میں حصہ لیا جبکہ بعض مورخین کے نزدیک وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے احادیث کو مرتب و مدون کیا۔ اسی زمانے میں امام اعظم (متوفی ۱۵۰) کا مجموعۂ احادیث ''کتاب الآثار'' کے نام سے مرتب ہو کر منظرِ عام پر آ چکا تھا۔ بعد ازاں امام محمد امام ابو یوسف کے مرتب کردہ مجموعہ ہائے احادیث منظرِ عام پر آئے اور بعد ازاں موطا امام مالک مرتب

ہوا۔ امام ربیع بن صبیح زیادہ عرصہ تک سندھ میں قیام نہ کر سکے۔ طبقات ابن سعد کے مطابق انہوں نے ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ اس زمانے میں سندھ کے مسلمان باشندوں کی زیادہ تر توجہ علمِ حدیث پر مرکوز رہی اور سندھ میں وارد ہونے والے عرب و عراق اور مصر و یمن کے علماء کی اکثریت بھی محدثین پر ہی مشتمل تھی جس کے باعث سندھ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کی رفتار بہت سست رہی۔

سندھ میں تبلیغ اسلام کی سست روی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ''آب کوثر'' میں لکھتے ہیں:

> ''سندھ میں عربوں کی حکومت دیر تک برقرار رہی اور بعض شہروں میں ان کی نو آبادیاں قائم ہو گئیں جن میں عالم فاضل لوگ بھی تھے۔ لیکن قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے عوام میں اشاعتِ اسلام کی کوئی منظم کوشش نہ کی اور سندھ کی بیشتر آبادی کا تبدیلِ مذہب آہستہ آہستہ اور کئی تدریجی منزلوں سے گزرنے کے بعد ہوا۔''

لیکن اس افسوس ناک صورت حال کا سب سے تلخ اور تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے دوران ملاحدہ یعنی قرامطہ اور اسماعیلی داعی اپنے اسلام دشمن اور انسانیت سوز افکار و نظریات پوشیدہ طور پر پھیلاتے رہے اور اس طرح کفر و الحاد کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت اور اقتدار پر قابض ہونے کی سازشیں کرتے رہے۔ قرامطہ اور اسماعیلیوں کے ملحدانہ نظریات اور سندھ کی حکومت پر قبضہ جمانے کی سازشوں کی روک تھام اور ان کے سد باب کے لئے نہ تو حکومت کی جانب سے کوئی تادیبی و تعزیری اقدامات کا سراغ ملتا ہے اور نہ اس زمانے میں صوفیہ کرام اور بزرگانِ دین کی کوئی ایسی جماعت دکھائی دیتی ہے جو ان ملاحدہ کا قلع قمع کر کے ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا سکتی۔ اس لئے ملاحدہ روز بروز قوت حاصل کرتے رہے اور بالآخر انہوں نے چوتھی صدی ہجری کے وسط میں ملتان پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔

قرامطہ کے ملتان پر قبضہ کرنے کے بارے میں ابو ریحان البیرونی نے اپنی معرکہ آرا تصنیف ''کتاب الہند'' میں ۴۲۴ھ کے احوال کے تحت لکھا ہے:

> ''جب قرامطہ (اسماعیلیہ) ملتان پر قابض ہوئے تو جلم بن شیبان نے جس نے یہاں تسلط حاصل کر لیا تھا، محمد بن قاسم کی تعمیر کردہ جامع مسجد

کو بند کر دیا اور بت خانے کو مسمار کر کے وہاں اپنی مسجد بنالی۔"

البیرونی کے بیان کے مطابق قرامطہ کا ملتان پر قبضہ کا زمانہ ۳۲۴ھ قرار پاتا ہے۔ جبکہ دیگر مورخین اور جغرافیہ دانوں یعنی مسعودی، اصطخری، مقدسی وغیرہ کے بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۳۴۰ھ تک یہاں خاندان بنو سامہ کی حکومت تھی جو سنی تھا۔ بہر حال قرامطہ نے سندھ کے مسمانوں کو گمراہ کرنے اور ان کے عقائد کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ بالآخر پہلے سلطان محمود غزنوی اور پھر شہاب الدین غوری نے قرامطہ کی سیاسی قوت کو توڑا اور پھر ملتان کے مشائخ سہروردیعنی شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور ان کے خلفاء یعنی شیخ صدرالدین عارف اور شاہ رکن عالم ملتانی نے اپنے خلفاء مجاز کی معیت میں سندھ کے دورے کر کے یہاں کے گمراہ مسلم باشندوں کو از سرِ نو راسخ العقیدہ مسلمان بنانے میں شاندار کردار ادا کیا۔ لیکن سلاطین میں محمود غزنوی اور صوفیہ کرام میں ملتان کے مشائخ سہرورد سے پہلے ہمیں کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ قرامطہ اور اسماعیلیہ کے ملحدانہ نظریات کے سدّ باب اور ان کے اقتدار پر قابض ہونے کی خفیہ اور برملا کوششوں کی کسی بھی سطح پر اور کسی بھی حکومتی یا مذہبی حلقے کی جانب سے مزاحمت کی گئی ہو۔

قرامطہ اور اسماعیلیہ جس زمانے میں سندھ میں کفر و الحاد کا پرچار کر رہے تھے اس زمانے میں وہاں کے حکمران سنی تھے اور وہاں علماء اور محدثین کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جن میں بعض قابلِ قدر شہرت کے مالک تھے۔ محدث احمد بن عبداللہ دیبلی اور محدث محمد بن محمد دیبلی بھی اُسی زمانے کی شخصیات ہیں۔ لیکن یہ حضرات سندھ میں موجود نہیں تھے۔ محدث احمد بن عبداللہ نے نیشاپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے نیشاپور ہی میں ۳۴۳ھ میں وفات پائی۔

محدث احمد بن عبداللہ کے ہم مکتب وہم مسلک وہم مشرب محدث محمد بن محمد زاہد دیبلی ماہ رمضان ۳۵۴ھ میں فوت ہوئے اور ابو عمرو بن نجیدہ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

احمد بن عبداللہ دیبلی

شیخ احمد بن عبداللہ دیبلی چوتھی صدی ہجری کے نامور محدث، جلیل القدر صوفی اور مشہورِ زمانہ سیاح تھے۔ ان کا نام و نسب یوں ہے: شیخ احمد بن عبداللہ بن سعید دیبلی سندھی۔ آپ کی کنیت ابو العباس ہے۔ شیخ احمد بن عبداللہ نے علم حدیث کی تحصیل میں غیر معمولی جذبہ و جوش کا مظاہرہ کیا اور اپنے عہد کے معروف و ممتاز محدثین سے اکتساب علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیخ احمد نے علم حدیث کی وسعت و فروغ میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں جس کا اعتراف کم و بیش تمام اہل علم اور مؤرخین نے کیا ہے۔

محدث شیخ احمد بن عبداللہ صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ بڑے نیک و پارسا اور زاہد و عابد بزرگ تھے۔ ان کے بارے میں قاضی عبدالکریم سمعانی متوفی ۵۶۲ھ اپنی مشہور اور حوالہ جاتی کتاب ''الانساب'' میں رقمطراز ہیں:

"من الغرباء الرجالة المتقد مین فی طلب العلم و من الزهاد و الفقراء العباد"

عبدالحیٔ حسنی ''نزہتہ الخواطر'' میں ''احمد بن عبداللہ دیبلی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''شیخ احمد بن عبداللہ بن سعید ابو العباس دیبلی از غریب الوطنان و سیاحین سابقین در طلب علم فقرائے زہاد میں سے تھے۔''

گویا کہ مولانا عبدالحیٔ حسنی نے حوالہ دیئے بغیر قاضی سمعانی کی مذکورہ بالا تحریر کا عربی سے فارسی اور اردو میں ترجمہ کر دیا۔ شیخ احمد سے لے کر فقرائے زہاد تک ترجمہ فارسی میں ہے اور آخری تین الفاظ ''میں سے تھے'' اردو ترجمہ ہے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق اپنی کتاب ("Contribution of India to the study of Hadith Literature")میں قاضی سمعانی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''احمد بن عبداللہ، ابوجعفر کے شاگردِ رشید تھے، وہ چوتھی صدی ہجری کے ایک محدث تھے۔ دور دور تک سفر کئے، ماوراء النہر سے لے کر وادیٔ نیل تک پورے مشرقِ وسطیٰ کا تنہا سفر کر کے انہوں نے ممتاز محدثین سے احادیث کی سماعت کی۔''

ڈاکٹر محمد اسحاق کی مذکورہ بالا کتاب یعنی ''کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی اسٹڈی آف حدیث لٹریچر'' جو ''علمِ حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' کے نام سے اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے، (ترجمہ شاہد حسین رزّاقی نے کیا ہے)، اور اِس کتاب پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی ہے، علمِ حدیث کے فروغ اور اس کی ترقی و اشاعت میں علمائے پاکستان و ہند نے جو شاندار کردار ادا کیا اس ضمن میں ڈاکٹر محمد اسحاق کی یہ کتاب انتہائی مفید اور قابلِ قدر ہے، جیسا کہ اس کتاب کے مترجم شاہد حسین رزاقی نے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر صاحب نے برِّعظیم پاک و ہند میں علمِ حدیث کی ترقی و اشاعت اور علمائے ہند کی خدماتِ حدیث پر تحقیقات کی اور بڑی محنت و کاوش اور تحقیق سے اس موضوع پر ایک ایسی عمدہ کتاب قلمبند کرنے میں کامیاب ہوئے جسے علمِ حدیث سے متعلق کتب میں ایک قابلِ قدر اضافہ کہنا غلط نہ ہوگا... عربوں کے ساتھ علمِ حدیث بھی سندھ میں آیا اور اس کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں دیبل، منصورہ اور قصدار علمِ حدیث کے مرکز بن گئے تھے۔ عرب ممالک میں امام اوزاعی، ابومعشر نجیح سندھی اور رجاء سندھی جیسے نامور ہندی نژاد محدثین نے بھی اس علم کی ترقی میں حصہ لیا۔ غزنوی سلاطین کے عہد میں لاہور علمِ حدیث کا بہت اہم مرکز بنا... سلاطینِ دہلی کے عہد میں نامور صوفیہ نے علمِ حدیث کو فروغ دینے پر خاص توجہ کی اور شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ شرف الدین منیری، سید علی ہمدانی اور شیخ زکریا ملتانی نیز شیخ علی متقی برہان پوری کے مکاتبِ حدیث نے اور عہدِ مغلیہ میں شیخ احمد سرہندی، شیخ عبدالحق دہلوی اور شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے نامور محدثین اور ان کے تلامذہ نے برِّعظیم پاک و ہند میں اس علم کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔''

ڈاکٹر اسحاق کی کتاب "علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ" کے مطالعہ سے بلکہ اس کی فہرست مضامین ہی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علم حدیث سندھ میں کب آیا اور سندھی علماء نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک علم حدیث کی وسعت و فروغ میں کیا خدمات انجام دیں۔ نیز یہ کہ برصغیر میں علمِ حدیث کی ترقی و اشاعت کے باب میں سب سے زیادہ سرگرمی عمل اور جذبہ و جوش کا مظاہرہ صوفیہ کرام نے کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں سرزمین سندھ کے مختلف مقامات کے محدثین کے لئے ڈاکٹر محمد اسحاق نے الگ باب قائم کئے ہیں۔ وہاں "شیخ نظام الدین اولیاء اور ان کا مکتب محدثین" اور "شیخ زکریا ملتانی اور ان کا مکتب محدثین" اور "شیخ احمد سرہندی اور ان کا مکتب محدثین" اور شیخ عبدالحق دہلوی اور ان کا مکتب محدثین"، نیز "محدثین خانوادۂ عبدالحق" اور "خانوادۂ عبدالحق کے تلامذہ" اور "شاہ ولی اللہ اور ان کا مکتب محدثین" ڈاکٹر محمد اسحاق کی کتاب کے ایسے مستقل عنوانات ہیں جن سے علمِ حدیث کی ترقی و اشاعت کے ضمن میں صوفیہ کرام کا شاندار اور ناقابلِ فراموش کردار نمایاں ہو کر قارئین کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی ظاہر و ثابت ہو جاتی ہے کہ علم حدیث اور تصوف کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

شیخ احمد بن عبداللہ بھی ایک محدث اور صوفی بزرگ تھے۔ جہاں علم حدیث میں ممتاز مرتبہ و مقام کے حامل تھے وہاں تصوف میں بھی صاحب صدق و صفا تھے اور اپنی شانِ فقر و غنا رکھتے تھے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق نے شیخ احمد بن عبداللہ کی ان دونوں امتیازی خصوصیات پر تحقیق کی ہے۔ چنانچہ علمِ حدیث کی تحصیل و تکمیل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: "یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اتنے قدیم زمانے میں بھی ایک ہندی عالم نے علمِ حدیث کی تحصیل کے لئے نیشاپور، بغداد، دمشق، بیروت اور مصر جیسے دور دراز مقامات کا سفر کر کے وہاں کے خزانوں سے اپنا دامن بھر لیا... غالباً تیسری صدی ہجری کے اول نصف میں علم حدیث کی تحصیل کے لئے سفر پر نکلے اور مکہ مکرمہ میں اپنے ہم وطن محدث ابو جعفر دیبلی (متوفی ۳۲۲ھ) کے ساتھ مطالعہ حدیث کیا۔ اور مفضل بن محمد جندی (متوفی ۳۰۸ھ) کے ساتھ بھی مطالعہ حدیث کیا۔ مصر میں انہوں نے علی بن عبدالرحمٰن اور محمد بن ریان سے، دمشق میں حافظ احمد بن عمیر بن جوسا (متوفی ۳۲۰ھ) سے، بیروت میں ابو عبدالرحمٰن مکحولہ سے، حران میں حافظ حسین بن ابی معشر (متوفی ۳۱۸ھ) سے، تستر میں احمد بن زہیر تستری (متوفی ۳۱۲ھ) سے اور نیشاپور میں محمد بن اسحاق بن خزیمہ (متوفی ۳۱۱ھ)

سے احادیث سماعت کیں اور ان کے علاوہ بھی انہوں نے دوسرے کئی ہم عصر محدثین سے حدیثیں سنیں۔''

شیخ احمد بن عبداللہ دیبلی کے تحصیلِ علم کے بارے میں یہ حالات ڈاکٹر محمد اسحاق نے قاضی عبدالکریم سمعانی (متوفی ۵۶۲ھ) کی مشہور و مستند کتاب ''الانساب'' سے نقل کئے ہیں اور شیخ احمد بن عبداللہ کے زہد و ورع، صدق و صفا اور صوفیانہ اندازِ زیست کے بارے میں ڈاکٹر محمد اسحاق نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی کتاب ''الانساب'' ہی سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''۳۱۱ھ میں خزیمہ کی وفات سے قبل احمد بن عبداللہ نیشاپور پہنچ گئے تھے، جہاں کی ثقافتی اور مذہبی زندگی بالخصوص حسن بن یعقوب حداد (متوفی ۳۳۲ھ) کی خانقاہ جس میں صوفیوں اور زاہدوں کا ہجوم رہتا تھا انہیں بہت پسند آئی۔ چنانچہ نیشاپور پہنچ کر انہوں نے جہاں گردی ترک کر کے خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے اور روکھی سوکھی غذا کھاتے۔ تاہم انہوں نے علمِ حدیث کی اشاعت جاری رکھی۔ حاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھ) نے کم عمری میں ان سے درس حدیث لیا تھا۔ سید عبدالحئی حسنی نے حاکم کا پورا نام حاکم ابو عبداللہ الحافظ لکھا ہے۔ مخدوم امیر احمد نے بھی اپنے مضمون ''سرزمین سندھ میں علمِ حدیث'' میں کم و بیش یہی حالات و واقعات بیان کئے ہیں۔ صرف اس قدر اضافہ کیا ہے کہ حاکم ان سے حدیث روایت کرتے تھے۔ البتہ مخدوم صاحب شیخ احمد کا سنِ وفات لکھنے میں غلطی کر گئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسحاق کی طرح سید عبدالحئی حسنی نے بھی نزہۃ الخواطر میں احمد بن عبداللہ دیبلی کے احوال قاضی عبدالکریم سمعانی کی کتاب ''الانساب'' ہی سے لئے ہیں، مگر قدرے اضافے کے ساتھ۔ چنانچہ سید عبدالحئی لکھتے ہیں کہ: ''شیخ احمد بن عبداللہ دیبلی ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ کے عہد میں حسن بن یعقوب حدادی کی خانقاہ میں وارد ہوئے اور اندرون شہر نیشاپور میں ایک خاتون سے نکاح کر لیا۔ پھر بیوی کو بھی خانقاہ ہی کے ایک حجرہ میں لے آئے۔ مگر نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے باقاعدہ جامع مسجد میں جاتے تھے اور نماز پڑھ کر خانقاہ میں واپس آ جاتے تھے۔''

مولانا عبدالحئی حسنی نے شیخ احمد بن عبداللہ کے علمِ حدیث میں اساتذہ اور جن شہروں سے ان کا تعلق تھا، کم و بیش وہی نام لکھے ہیں جو ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی کتاب ''علم

حدیث میں پاک و ہند کا حصہ" میں لکھے ہیں۔ اس لئے کہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ دونوں فاضل علماء نے ایک ہی حوالہ جاتی کتاب یعنی "الانساب" پر انحصار کیا ہے، اور اسی کتاب کے حوالے سے دونوں فاضل اہل قلم نے الفاظ کے ردّ و بدل کے ساتھ لکھا ہے:

"شیخ احمد بن عبداللہ دیبلی صوف کا لباس پہنتے تھے اور اکثر و بیشتر برہنہ پا رہتے تھے۔"

شیخ احمد بن عبداللہ کے بارے میں مخدوم امیر احمد نے لکھا ہے کہ "ان کی وفات نیشاپور میں رجب ۳۳۴ھ میں ہوئی۔ مخدوم صاحب نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس لئے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ کتاب "الانساب" کے مطابق محدث شیخ ابو العباس احمد بن عبداللہ بن سعید دیبلی سندھی ماہ رجب ۳۴۳ھ میں نیشاپور ہی میں فوت ہوئے اور مقبرۃ الحیرہ میں آسودۂ لحد ہوئے۔

ابوالعباس منصوری

احمد بن محمد منصوری چوتھی صدی ہجری کے مشہور و معروف علمائے دین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن کے علاوہ ایران، عراق اور وسطی ایشیا کے بڑے بڑے اسلامی علوم کے مراکز میں جا کر حدیث و فقہ کا علم حاصل کیا اور اپنے علم و فضل، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے شہرت و مقبولیت حاصل کر کے اپنے وطن کا نام روشن کیا۔ ان کا نام و نسب یوں ہے۔

''احمد بن محمد بن صالح منصوری سندھی۔ ابو العباس ان کی کنیت ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اُن کی ولادت سرزمینِ سندھ کے مشہور شہر منصورہ میں ہوئی۔ کتبِ تاریخ و تذکرہ میں ان کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

نامور فاضل ابن الندیم نے اپنی کتاب ''الفہرست'' میں اُن کا ذکر مقالہ ششم میں امام داوٗد بن علی ظاہری کے متبعین کے حوالے سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''ابو العباس احمد بن محمد بن صالح مذہب داوٗد ظاہری کے پیرو تھے۔ اُن کا شمار فضلائے داوٗدیین میں ہوتا ہے۔ جلیل القدر اور عمدہ کتابوں کے مصنف ہیں۔''

سید عبدالحیٔ حسنی ''نزہتہ الخواطر'' کی جلد اوّل میں روایت کرتے ہیں۔

> ''ابو العباس احمد بن محمد بن صالح المنصوری السندھی منصورہ شہر کے قاضی تھے۔ وہ امام داوٗد اصفہانی ظاہری کے مسلک پر تھے۔''

ڈاکٹر محمد اسحاق ''علمِ حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (**Contribution of India to the Study of Hadith Literature**) میں محدثینِ منصورہ کے

عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ احمد بن محمد معروف بہ ابو العباس منصوری نے فارس میں ابو العباس بن الاثرم (متوفی ۳۳۶ھ) سے اور بصرہ میں احمد الخزانی (متوفی ۳۳۲ھ) سے جو ابو ورق کے نام سے معروف ہیں، حدیث کی تعلیم حاصل کی۔''

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کے فاضل مقالہ نگار ممتاز احمد پٹھان اپنے مقالے بہ عنوان ''سندھ میں عربوں کا عہدِ حکومت'' میں سرزمینِ سندھ میں عربی ادب کی نشوونما اور ارتقاء کا جائزہ لینے کے بعد سندھ کے علماء اور محدّثین کے احوال و آثار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احمد بن محمد منصوری جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، سندھ میں منصورہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ انہوں نے فارس میں ابو العباس الاثرم اور بصرہ میں احمد الخزانی سے جو عرف عام میں ابو ذوق کے نام سے مشہور تھے، سے تعلیم حاصل کی۔ احمد، فارس کے صوبہ ارجان کے قاضی تھے اور امام داؤد بن علی الاصفہانی کے مسلک پر سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ احمد نے عربی زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں۔''

''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' کے دوسرے فاضل مقالہ نگار پروفیسر محمد منوّر نے قاضی احمد منصوری کا تذکرہ ''غزنوی عہد'' میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''ابو العباس احمد بن محمد بن صالح المنصوری السندھی منصورہ میں قاضی تھے۔ انہوں نے داؤد الاصفہانی کے مذہب و مسلک کے ضمن میں کئی کتابیں مرتب کیں جیسا کہ یاقوت نے ''معجم الادبا'' میں ذکر کیا ہے۔'' المقدسی نے اپنی کتاب ''احسن التقاسیم'' میں لکھا ہے کہ وہ قاضی ابو العباس منصوری داؤدی سے ملا تھا اور انہیں اپنے مذہب کا امام پایا وہ پڑھاتے بھی رہے اور لکھتے بھی رہے۔ کئی خوب صورت کتابیں تصنیف کیں۔''

ابن الندیم کی کتاب ''الفہرست'' کے مطابق قاضی ابو العباس منصوری نے یہ کتابیں لکھیں۔

کتاب المصباح الکبیر ... کتاب الہادی ... کتاب النیر ... سمعانی نے بھی منصوری کی صرف ان کتابوں کے نام لکھے ہیں۔

ابن الندیم کے بیان کے مطابق قاضی ابو العباس منصوری نے ان کتابوں کے علاوہ بعض دوسری کتب بھی تصنیف کیں جن کے نام ابن الندیم نے اپنی ''الفہرست'' میں نہیں لکھے ہیں۔

سید عبدالحیٔ حسنی اپنی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' کی جلد دوم میں یاقوت حموی کی ''معجم الادباء'' کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ قاضی احمد بن محمد ابوالعباس نے اثرم اور اس کے طبقے کے ارباب روایات سے حدیث بیان کی اور ان سے حاکم ابو عبداللہ الحافظ صاحب مستدرک نے حدیث روایت کی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی کتاب ''علمِ حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' میں ابنِ حجر عسقلانی کے حوالے سے احمد بن محمد کے حالات بیان کرتے لکھا ہے کہ احمد منصوری مغربی ارجان کے قاضی بنائے گئے جو فارس کے مغربی علاقے میں ہے۔ ۳۰۶ھ میں جب احمد بن محمد بخارا گئے تو حاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھ) نے ان سے حدیث کا درس لیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ ایک محدث کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ حاکم کا ان کے بارے میں یہ بیان ہے کہ وہ جن علماء حدیث سے مل چکے ہیں ان میں منصوری سب سے زیادہ ذہین تھے۔

نامور سیاح اور جغرافیہ دان المقدسی چوتھی صدی ہجری کی آٹھویں دہائی میں سندھ میں وارد ہوا تو اُس نے منصورہ کا بھی دورہ کیا۔ چنانچہ المقدسی نے لکھا ہے کہ اس نے منصورہ شہر میں منصوری کو اپنے قائم کردہ حلقۂ درس میں حدیث کا درس دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

ڈاکٹر محمد اسحاق مستند کتاب تاریخ و تذکرہ کے حوالوں سے لکھتے ہیں کہ:

''ابو العباس منصوری ظاہری فرقہ کے ایک ممتاز عالم اور مصنف تھے۔ انہوں نے کئی ضخیم علمی کتابیں مرتب کیں۔ ان کو ظاہری فرقہ کے امام کا مرتبہ حاصل تھا۔ تاہم ان پر حدیثیں وضع کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے جو غالباً انہوں نے اپنے عقائد کو تقویت دینے کے لئے گھڑ لی تھیں۔''

''منصوری کی روایت کردہ گھڑی ہوئی حدیث کی ایک مثال یہ ہے "اول من قاس ابلیس فلا تقیسوا" منصوری نے اس کی سند میں اپنے شیخ ایک مالکی فقیہ ابوسوق کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن وہ ثقہ راوی تھے۔ اور حدیث گھڑنے والے خود منصوری ہیں، ان کے شیخ نہیں ۔ ملاحظہ ہو ابنِ حجر عسقلانی، لسان المیزان ج ۱، ص ۲۲۷، ۲۵۶۔''

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کے مقالہ نگار ممتاز احمد پٹھان نے بھی

علامہ سمعانی کی کتاب ''الانساب'' کے حوالے سے قاضی ابوالعباس منصوری پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے حدیث وضع کر کے اپنا الگ حلقہ قائم کر لیا۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے قاضی ابوالعباس کے بارے میں وضع حدیث کی روایات کا ذکر نہیں کیا بلکہ انہوں نے سیاح مقدسی کا یہ حوالہ دے کر احمد بن محمد منصوری کے تذکرے کو ختم کر دیا ہے۔

''مقدسی نے منصورہ شہر میں انہیں دیکھا اور اپنی کتاب احسن التقاسیم میں ان کے لئے یا اماما فی مدینہ کے لقب سے ان کا ذکر کیا۔''

قاضی احمد بن محمد منصوری کے سنِ وفات کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ جن فاضل علماء اور اہل قلم کے حوالے سے ہم نے ان کے احوال و آثار بیان کئے ہیں ان میں سے کسی نے اُن کے سنِ وفات یا جائے تدفین کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اپنے ہم نام نامور محدث وصوفی شیخ احمد بن عبداللہ دیبلی متوفی ۳۴۳ھ کے ہم عصر تھے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے چوتھی صدی ہجری کے وسط کے لگ بھگ وفات پائی۔

عبداللہ بن جعفر منصوری

عبداللہ بن جعفر منصوری چوتھی صدی ہجری کے قابلِ ذکر سندھی محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے محدث حسن بن مکرم اور ان کے طبقے کے دوسرے محدثین سے علمِ حدیث کا درس لیا۔ لیکن وہ حاکم صاحبِ مستدرک کے استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ قاضی عبدالکریم سمعانی نے اپنی کتاب ''الانساب'' میں عبداللہ بن جعفر منصوری کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ ان کا پورا نام ونسب یوں ہے:

''عبداللہ بن جعفر بن مرۃ منصوری مقری ان کی کنیت ابو محمد ہے''۔

پروفیسر مخدوم امیر احمد نے اپنے مضمون ''سرزمینِ سندھ میں علمِ حدیث'' میں سمعانی کی کتاب ''الانساب'' کے حوالے سے محدث عبداللہ بن جعفر کا نام ''ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن مرہ منصوری سندھی'' تحریر کیا ہے۔

ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن مرۃ سندھ کے مردم خیز شہر منصورہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے منصوری کہلائے۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کے احوال ''ابو محمد عبداللہ المنصوری'' کے عنوان کے تحت سمعانی کی کتاب ''الانساب'' سے روایت کئے ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن جعفر کا تعلق منصورہ سے تھا جو سندھ کے شہر حیدر آباد کے شمال مشرق میں ۴۷ میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے قدیم راستے کے قریب ایک بڑے ٹیلے پر واقعہ تھا جو بمبھر کا تھل کہلاتا ہے لیکن اب یہ ٹیلہ سندھ کے قدیم مشہور شہر منصورہ کے کھنڈروں کی نشاندہی کرتا ہے۔

فاتح سندھ محمد بن قاسم کا بیٹا عمرو بن محمد ۱۱۰ھ سے لے کر ۱۲۰ھ تک سندھ کا گورنر رہا۔ چنانچہ اس نے جنگی کامیابیاں حاصل کرنے کے علاوہ سندھ میں محفوظہ اور منصورہ کے

نام سے دو شہر بھی بسائے۔ ۲۷۰ھ میں جب زیریں سندھ میں ایک خود مختار عرب ریاست قائم ہو گئی تو منصورہ کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔ چنانچہ ۳۴۰ھ میں جب نامور سیاح اور جغرافہ دان اصطخری سندھ میں وارد ہوا تو منصورہ ایک بڑا اور خوشحال شہر بن چکا تھا۔ مسعودی کے بیان کے مطابق ملتان سے منصورہ کا فاصلہ چھ سو میل ہے۔ یہ دریا کے وسط میں ایک جزیرے پر واقع تھا۔ شہر خوب صورت تھا اور اس میں اونچی دیواروں کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔

المقدسی ۳۷۵ھ میں منصورہ پہنچا۔ اس نے لکھا ہے کہ سندھ کا یہ شہر منصورہ رقبہ میں شام کے دمشق کے برابر ہے۔ عمارتیں شیشم کی لکڑی اور مٹی سے تعمیر کی گئی ہیں۔ بڑے بازار میں جامع مسجد ہے جو اینٹ اور پتھر سے بنائی گئی ہے اور اس کے ستون عمان کی مسجد کی طرح ساگوان کے ہیں۔ منصورہ کے چار بڑے دروازے تھے جن کے نام باب البحر، باب سندان، باب ملتان اور باب توران تھے۔ یہ دروازے ان چار راستوں کی نمائندگی کرتے تھے جن کے ذریعے منصورہ دنیا کے دوسرے شہروں اور ملکوں کے ساتھ روابط رکھتا تھا۔ باشندے خوش سلیقہ اور بامروّت ہیں، علم کا خوب چرچا ہے۔ تجارت اور کاروبار نفع بخش ہے۔ لوگ دریائے سندھ کا پانی پیتے ہیں۔ عمدہ کپڑا اور کمبائتی وضع کے جوتے بنائے جاتے ہیں۔ رسم و رواج عراق سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن گرمی سخت پڑتی ہے۔ باشندے سہل انگار اور لاابالی ہیں اور ہندو چھائے ہوئے ہیں۔ اور شرفاء کی بھی کمی ہے۔ المقدسی نے سندھ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ملتان کے باشندے شیعہ ہیں اور ملتان کے حکمران اسماعیلی عقائد کے حامل ہیں اور مصر کے فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتے ہیں اور مصر کے اسماعیلی خلیفہ کی رائے ہی سے یہاں والی مقرر کیا جاتا ہے۔

اصطخری منصورہ کے حالات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ خطبہ عباسی خلیفہ کے نام پر پڑھا جاتا ہے۔ باشندے وہی لباس پہنتے ہیں جو عراق میں رائج ہے لیکن حاکموں کی وضع قطع لمبے لمبے بال رکھنے اور کرتہ پوشی کی حد تک ہندو راجاؤں سے ملتی جلتی ہے۔

مسلمان سیاحوں نے سندھ کے جو چشم دید حالات و واقعات بیان کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سندھ میں ایک ملی جلی یعنی مخلوط تہذیب جنم لے رہی تھی جسے عرب معاشرے اور سندھی تمدن کا امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ اصطخری کے بیان کے مطابق منصورہ اور ملتان کے حاکموں کو مسلم رعایا امیر کہہ کر پکارتی تھی لیکن غیر مسلم رعایا

کے لوگ ان کو مہاراج کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اصطخری کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عرب حکمرانوں پر غیر مسلم ثقافت کا اثر تھا اور اس خطے میں آباد ہونے اور قومیت اختیار کر لینے کی وجہ سے انہوں نے مفتوحین کے بہت سے رسم و رواج کو اپنا لیا تھا۔

ڈاکٹر محمد اسحاق 'علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (**Contribution of India to the Study of Hadith Literature**) میں مختلف اوقات میں سندھ میں وارد ہونے والے سیاحوں اور جغرافیوں دانوں کے حوالوں سے لکھتے ہیں کہ منصورہ کے لوگ عموماً ذہین اور پرہیزگار ہیں۔ اسلام کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ لوگ اسلامی احکام پر سختی سے عمل کرتے ہیں اور ملاؤں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ذمی آزادی کے ساتھ اپنے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت اصحابِ حدیث پر مشتمل ہے جو ظاہری امام داؤد الاصبہانی (متوفی ۲۷۰ھ) کے پیرو ہیں۔ مقامی بستیوں میں حنفی فقہا بھی ہیں لیکن مالکی، حنبلی یا معتزلی نظر نہیں آتے۔ یہ عبارت المقدسی نے سندھ کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھی ہے بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ملتان کے حالات کے ضمن میں المقدسی نے لکھا ہے کہ ملتان کے اکثر باشندے اہلِ حدیث ہیں، قاضی ابو محمد منصوری کو میں نے داؤدی اور اپنے مسلک کا امام پایا۔ ملتان کے باشندے شیعہ ہیں، تاہم کوئی بڑا شہر ایسا نہیں جہاں حنفی فقیہ موجود نہ ہوں۔ مملکت میں مالکی اور معتزلی بالکل نہیں اور نہ کہیں حنبلی مسلک پر عمل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق قاضی سمعانی اور سید سلیمان ندوی ایسے علماء و فضلا کے حوالوں سے لکھ رہے ہیں کہ ''یہاں (یعنی منصورہ میں) اسلام اپنی اصل شان اور فطری سادگی میں موجود ہے اور ہر جگہ نیکی اور پرہیزگاری کا دور دورہ ہے''۔

ڈاکٹر محمد اسحاق مزید لکھتے ہیں کہ منصورہ میں علم اور عالم کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ چونکہ آبادی کی اکثریت اصحابِ حدیث کی تھی اس لئے قدرتی طور پر علمِ حدیث کو بہت فروغ ہوا۔ یہاں کے محدث اپنے علم کی اشاعت میں منہمک رہتے تھے۔ شہر کی مختلف مسجدوں میں حدیث کا درس دیا جاتا تھا۔ علماء، علمِ حدیث سے متعلق کتابیں مرتب کرتے۔ بطورِ مثال قاضی ابوالعباس منصوری کا نام محدث، مرتب کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ وہی قاضی ابوالعباس منصوری ہیں جو امام داؤد ظاہری کے پیرو اور ظاہری مسلک

کے افاضل میں سے تھے، جن کے بارے میں خود ڈاکٹر محمد اسحاق نے ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' میں اپنی تحقیقات کی بنا پر یہ جملے رقم کئے ہیں۔ ''ان کو ظاہری فرقہ کے امام کا مرتبہ حاصل تھا۔ تاہم ان پر حدیثیں وضع کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے جو غالبا انہوں نے اپنے عقائد کو تقویت دینے کے لئے گھڑ لی تھیں''۔

ڈاکٹر محمد اسحاق نے منصورہ ہی کے ایک دوسرے محدث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''احمد بن محمد منصورہ کے محدث تھے جنہوں نے فارس اور بصرہ میں ابو العباس بن الاثرم (متوفی ۳۳۶ھ) اور دوسرے محدثین سے حدیث کا درس لیا تھا۔ یہ بھی ظاہری فرقہ کے ایک امام اور حاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھ) کے استاد تھے''۔

عبداللہ بن جعفر بن مرہ منصوری وہ تیسرے اور آخری محدث ہیں جن کا تذکرہ ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی تحقیقی کتاب ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' میں ان تین سطروں میں کیا ہے۔ دراصل امر واقعہ یہ ہے کہ محدث عبداللہ بن جعفر کے حالات کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اسحاق لکھتے ہیں۔

''منصورہ کے دوسرے دو محدثوں کی طرح عبداللہ بن جعفر بھی حسن بن المکرم کے شاگرد تھے۔ وہ حاکم نیشاپوری کے استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ یقیناً چوتھی صدی ہجری کے ایک محدث تھے۔ یہ سیاہ فام تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی نژاد تھے''۔

پروفیسر مخدوم امیر احمد ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد نے بھی اپنے مضمون ''سرزمین سندھ میں علمِ حدیث'' مطبوعہ ''الرحیم'' حیدر آباد اشاعت جولائی ۱۹۶۳ میں محدث عبداللہ بن جعفر کے بارے میں صرف یہ ایک جملہ لکھا ہے۔

''ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن مرہ منصوری سندھی حسن بن مکرم اور ان کے طبقے کے لوگوں سے حدیث روایت کرتے تھے۔ حاکم نے ان سے بھی روایت کی ہے''۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی ان کے بارے میں کتاب ''الانساب'' کے حوالے سے صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ ''ابو محمد کنیت، نام عبداللہ بن جعفر بن مرہ منصوری المقری، سیاہ فام اور صاحب روایت تھے۔ انہوں نے حسن بن مکرم اور ان کے معاصرین سے احادیث سنیں اور ان سے حاکم صاحب مستدرک نے روایت کی''۔

محدث ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن مرۃ منصوری نے ۳۹۰ھ میں وفات پائی۔

حسن بن حامد دیبلی

حسن بن حامد دیبلی کا شمار سرزمینِ سندھ کے ان علماء اور محدثین میں ہوتا ہے جو نسلاً سندھی تھے۔ سندھ میں پیدا ہوئے اور سندھ ہی میں تعلیم و تربیت پائی اور پھر دیار عرب و عراق و مصر میں جا کر دینی علوم و فنون کے وسعت و فروغ میں قابل قدر اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کا پورا نام و نسب یوں ہے: حسن بن حامد بن حسن بن حامد الحسن بن حامد اور ابو محمد ان کی کنیت تھی۔ حسن بن حامد دیبلی پیشہ کے لحاظ سے تاجر تھے۔ حافظ خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' میں انہیں ادیب کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے حالانکہ وہ ایک محدث ہونے کے علاوہ ایک معروف شاعر بھی تھے۔ مگر شاعر اور ادیب سے کہیں بڑھ کر وہ ایک نامور خطیب تھے۔

حسن بن حامد دیبلی خود صاحبِ علم و فضل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی علم دوست اور علماء کے قدردان تھے۔ وہ اپنی فیاضی و سخاوت، دوست نوازی اور رفاہِ عامہ کے کاموں کے باعث دور دور تک مشہور تھے۔ انہیں عوام و خواص کی ہر سطح کے حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ معاصر علماء سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ انہوں نے دیبل سے نقل وطن کر کے دارالخلافہ بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لئے انہیں حسن بن حامد دیبلی بغدادی بھی کہا جاتا ہے۔

محدث حسن بن حامد کا تعلق ایک تاجر پیشہ خاندان سے تھا وہ تجارت کی غرض سے عرب، عراق اور مصر و شام تک جاتے تھے اور دیبل ہی وہ سب سے اہم بندرگاہ تھی جہاں سے براہِ راست مغرب کے ان ممالک کے ساتھ تجارتی، تہذیبی اور ثقافتی تعلقات قائم تھے۔ محمد بن قاسم شیراز سے ایک خاصی بڑی فوج کے ساتھ چلا اور مکران کے مقام پر اسے

تازہ دم فوج کی کمک ملی۔ منجنیقیں وغیرہ سمندر کے راستے روانہ کی گئیں جو کہ بری فوج کے دیبل پہنچنے کے روز ہی وہاں پہنچ گئیں۔ چنانچہ اسی روز دیبل کا محاصرہ کرلیا گیا۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' دوسری جلد (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار مختار احمد پٹھان نے سرزمین سندھ میں عربی ادب کی نشوونما اور ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ دراصل سندھ اور عرب دنیا کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات عربوں کی فتوحات سے بہت پہلے قائم تھے۔ عرب جہاز دیبل، موجودہ کراچی، تھانہ، کھمبے اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کی ساحلی بندرگاہوں میں آتے تھے۔ عربوں کی تجارتی سرگرمیاں انہیں اس سے بھی آگے لنکا، کارومنڈل اور جزائر بحر ہند تک لے گئیں۔ عرب پاکستان، ہند کے ساحلی علاقے اور انڈونیشیا کے مجموعۃ الجزائر اور چین کے ساحلی سمندر سے آشنا تھے۔ عربوں کا مستعد بحری بیڑہ منڈیوں میں ہر طرح کی اجناس تجارت لاتا تھا۔ خاص طور پر یمن میں جو اسلام کے عروج سے قبل عرب دنیا میں تجارتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ عرب، مصر، مشرقی افریقہ، سندھ، ہندوستانی ساحل، لنکا اور جزائر شرق الہند کی ساری سمندری تجارت پر قابض تھے۔ عربوں نے مشرق کے علاقوں کی بحری تجارت فینیقیوں سے ورثے میں پائی تھی جن کی تجارتی سرگرمیاں ان کے عراق اور بحیرۂ روم پر سیاسی غلبے کے خاتمہ کے بعد ختم ہوگئیں اور ان کی جگہ یونانیوں اور رومیوں نے لے لی جنہوں نے قدیم زمانوں میں وسیع سلطنتیں قائم کیں۔ اس زمانے میں عرب بحیرۂ ہند پر چھائے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی تجارت کو برقرار رکھنے کے لئے مالا بار کے ساحل اور لنکا کے جزیرے میں اپنی نوآبادیاں اور تجارتی کوٹھیاں قائم کر رکھی تھیں۔

بعض مورخین کے نزدیک سندھ کے عرب دنیا سے تعلقات خصوصاً عراق، یمن اور عمان سے، تاریخ کی ابتداء ہی سے چلے آرہے ہیں۔ ان کا تحقیقی موقف یہ ہے کہ سمیری قوم کے لوگ جنہوں نے بعد میں بابل کی سامی تہذیب کی بنیاد رکھی فی الحقیقت سندھ کے باشندے تھے جو سندھ سے ہجرت کر کے عراق میں چلے گئے تھے۔ جیسا کہ ایچ۔آر۔ ہال **H.R.Hall** نے اپنی کتاب ''مشرق قریب کی قدیم تاریخ'' (**Ancient History of the Near East**) میں لکھا ہے کہ سندھ، بلوچستان، فارس اور خوزستان کے بعض علاقوں کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ سے لے کر فرات تک سمیریوں کی بہت بڑی سلطنت تھی۔ انہوں نے مغربی ایشیاء کو تہذیب سکھائی

اور دوسری چیزوں کے علاوہ لکھنے کے فن اور خطِ کوفی سے متعارف کرایا۔ ہل اور پہیہ جو انسانی تہذیب اور ثقافت کی بنیاد قرار پاتے ہیں، سب سے پہلے ان لوگوں کے توسط سے ان دو دریاؤں کی سرزمین میں متعارف ہوئے۔ بابل کے کتبوں میں اے اوانس یعنی نصف مچھلی اور نصف آدمی کی صورت میں دکھایا گیا جس سے مراد یہ ہے کہ ایک عجیب الخلقت انسانی قوم خشکی اور سمندر کے راستے آئی اور اس نے اہل عراق کو زندگی کے طور طریقے سکھائے۔ سمیریوں کے ورود سے قبل دجلہ فرات کی وادی پر سامی اقوام قابض تھیں جو شکار اور اسی طرح کی دوسری خام غذا پر گزارا کرتے تھے۔ ہل اور پہیہ کے عراق میں پہنچ جانے سے لوگوں نے کاشتکاری اور دستکاری کے پیشے بھی اختیار کئے۔ اس طرح شہر اور قصبے وجود میں آئے۔ سمیری، عراق کے پہلے لوگ ہیں جنہوں نے شہری ریاستوں کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں بادشاہتیں بن گئیں اور بالآخر حضرت عیسیٰ سے پہلے تیسرے ہزار سالہ دور میں پورا مشرقِ وسطیٰ ایک واحد سلطنت بن گیا جس میں عراق کے علاوہ مغربی ایران، آرمینیا، ایشائے کوچک کے کچھ حصے اور شام کا علاقہ شامل تھا۔

ماہرین آثار قدیمہ نے جو گزشتہ سو ڈیڑھ برس کے دوران تحقیقات کی ہیں جن کے نتیجے میں عراق اور وادی سندھ کے تباہ شدہ مقامات اور کھنڈرات جہاں سے پختہ اینٹیں، مٹی کے برتن، زیورات اور مہریں اور اوزار وغیرہ برآمد ہوئے ہیں، اس بات کی ناقابلِ تردید شہادت دیتے ہیں کہ ان دو وادیوں کے درمیان گہرے تجارتی اور ثقافتی تعلقات قائم تھے۔ عراق کی تباہ شدہ بستیوں میں سے سمیری عہد کی جو مہریں برآمد ہوئی ہیں وہ سندھ میں موہن جو ڈارو سے برآمد ہونے والی مہروں سے حیرت انگیز حد تک مشابہت رکھتی ہیں۔ مزید برآں مکران اور خلیج فارس کے ساحلی علاقوں میں متعدد جگہوں کی موجودگی سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ سندھ اور فرات کی وادیوں کے مابین ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم تھے۔ نیز یہ کہ وادیِ سندھ کے ہنرمند اور کاریگر اور ماہرین وادیِ فرات کے لئے ہر قسم کا سازو سامان اور اشیاء فراہم کرتے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب وادیِ سندھ کی تہذیب کو زوال آیا یا کسی دنیاوی یا سماوی آفت سے وادیِ سندھ کا خاتمہ ہوا تو اس کے ساتھ ہی وادیِ فرات کی تہذیب بھی ختم ہو گئی۔ گویا کہ وادیِ فرات کی تہذیب کو زندگی اور حرارت پہنچانے والا خون وادیِ سندھ کے کاریگروں اور ہنرمندوں کا خونِ جگر تھا۔

ازمنہ قدیم کی تاریخ کی ان تفصیلات کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ سندھ کے لوگوں نے عراق اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں آباد وحشی لوگوں کو تہذیب سکھائی اور وہاں جا کر شہر اور بستیاں آباد کی تھیں اور اب بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عرب اور عراق کے لوگ اسلامی تعلیمات سے سرشار ہو کر اہل سندھ کو کتاب وسنت کی تعلیم دے رہے تھے اور انہیں تہذیب سکھا رہے تھے اور سرزمین سندھ میں محفوظہ اور منصورہ ایسے اہم اور بڑے شہر آباد کر رہے تھے۔ ان تفصیلات سے یہ حقیقت بھی آشکار ہو جاتی ہے کہ اہل سندھ قدیم زمانوں میں عرب، عراق، مصر، یمن اور عمان جا کر تجارت کیا کرتے تھے۔ وہ سندھ کی مصنوعات اور پیداوار کو ان ملکوں میں جا کر فروخت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سندھی تاجروں کا عرب ملکوں کے ساتھ تجارت وثقافت کا یہ سلسلہ محدود پیمانے پر ہی سہی بعد کے زمانوں میں بھی ضرور قائم رہا ہو گا۔

حسن بن حامد دیبلی کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہ ایک تاجر کی حیثیت سے بیرون ملک گئے۔ جیسا کہ خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد'' میں لکھا ہے کہ حسن بن حامد پیشے کے اعتبار سے دیبل کے ایک تاجر تھے۔ تجارت کے سلسلے میں بغداد گئے۔ وہ صاحب ثروت اور دولت مند ہونے کے علاوہ بڑے صاحبِ اخلاص وایثار تھے۔ انہوں نے بغداد میں زعفرانی محلے میں اپنے والد ''خان ابن حامد'' کے نام سے ایک بڑی سرائے تعمیر کرائی۔ یہ سرائے غریبوں اور محتاجوں کے لئے پناہ گاہ بن گئی، جہاں ان کو مفت کھانا اور لباس مہیا کیا جاتا تھا۔

حسن بن حامد کی دینِ اسلام میں غیر معمولی دلچسپی اور ان کی دینداری اور علمی ذوق وشوق کے باعث ''سرائے خان ابن حامد'' ایک محتاج خانے کے ساتھ ساتھ دینی علوم اور ان کے متعلق امور ومسائل پر غور وفکر کرنے کے لئے بحث ومباحثہ کا مرکز بھی بن گئی۔ حامد بن حسن علمِ حدیث سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے حدیث کا علم بغداد کے نامور محدثین یعنی محدث علی بن محمد موصلی متوفی ۳۵۹ھ، محدث محمد ابوبکر بن حسن النقاش (متوفی ۳۵۱ھ) اور محدث ابوعلی التمری سے حاصل کیا تھا۔ حدیث سے دلبستگی کا یہ عالم تھا کہ روایتِ حدیث کرتے وقت ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔

حسن بن حامد علمِ حدیث کے بہت بڑے فاضل تھے۔ حدیث میں ان کی غیر معمولی قابلیت اور فضیلت وثقاہت کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہ حدیث کا

درس دینے کے لئے دمشق اور مصر تک گئے۔

محدث حسن بن حامد نے علمِ حدیث میں مہارت پیدا کی۔ علاوہ ازیں وہ شعر و سخن اور علم و ادب میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ وہ ایک عمدہ شاعر اور نثر نگار بھی تھے۔ حافظ خطیب بغدادی نے تو ان کا تعارف ایک ادیب اور متمول و فیاض تاجر کی حیثیت سے ہی کرایا ہے۔

حسن بن حامد دیبلی کے معاصر علما و فضلا سے دوستانہ مراسم تھے اور انہیں بغداد کے ممتاز شہریوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ مشہور شاعر متنبی (متوفی ۳۵۴ھ) جب بغداد آیا تو حسن بن حامد ہی کے مکان پر اس نے قیام کیا۔ وہ حسن کے اخلاق و آداب اور مہمان نوازی سے اس قدر متاثر ہوا کہ کہنے لگا اگر میں نے کسی بھی تاجر کی مدح کی ہوتی تو آپ کی مدح میں ضرور شعر کہتا۔

محدث حسن بن حامد دیبلی بغدادی نے ۴۰۷ھ میں وفات پائی۔ اس وقت وہ مصر گئے ہوئے تھے۔ محدث حسن بن حامد کے احوال حافظ خطیب بغدادی، جوہری اور التنوخی نے بیان کئے ہیں۔ رجال السند والہند کے علاوہ ابن عساکر نے بھی اپنی ''تاریخ الکبیر'' میں محدث حسن بن حامد دیبلی بغدادی کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی تحقیقی کتاب ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' میں متذکرہ بالا حوالوں کے ساتھ سندھی محدثین کے باب میں حسن بن حامد دیبلی کے حالات لکھے ہیں۔

صوفی جعفر قصداری

صوفی جعفر قصداری اپنے زمانے کے نامور محدث، معروف عالم، بلند پایہ فقیہ اور عارف باللہ تھے۔ ان کا پورا نام و نسب صوفی جعفر بن الخطاب قصداری اور کنیت ابو محمد ہے۔ وہ اپنی کنیت ابو محمد سے مشہور ہوئے۔ ان کے ادب و احترام کے پیش نظر لوگ انہیں ان کے نام سے نہیں پکارتے تھے۔ بلکہ ان کے نام کی بجائے ان کی کنیت سے انہیں یاد کرتے تھے۔ عربوں میں شروع ہی سے یہ رواج چلا آرہا تھا کہ جس شخص کی توقیر و تعظیم مقصود ہوتی اسے اس کی کنیت سے پکارتے تھے جیسے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عام طور پر ان کے بڑے بیٹے امام حسنؓ کے حوالے سے ابوالحسنؓ کہا جاتا تھا۔

صوفی ابو محمد جعفر بن الخطاب اسلامی دور حکومت کے اہم اور مشہور تجارتی شہر قصدار کے باشندے تھے۔ قصدار کو قزدار بھی کہا جاتا تھا مگر اب اس کا نام خضدر یا خضدار ہے جو پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں واقع ہے۔ بلوچستان، بلوچ قبائل کا مرکزی وطن ہے اور براعظم ایشیاء کے جنوب اور پاکستان کے انتہائی جنوب مغربی گوشے میں واقع ہے۔ آج ہمیں دو بلوچستان ملتے ہیں۔ مغرب میں ایرانی بلوچستان اور مشرق میں پاکستانی بلوچستان۔ پاکستانی بلوچستان کے شمال میں یاغستان اور افغانستان اور شمال مشرق میں پاکستان کا صوبہ سرحد، مغرب میں ایران، جنوب میں بحیرۂ عرب اور مشرق میں پاکستان کے دوسرے دو صوبے سندھ اور پنجاب ہیں۔ قدیم کتب تاریخ میں بلوچستان کا لفظ نہیں ملتا۔ یہ ایک جدید نام ہے جو گزشتہ دو صدیوں سے استعمال ہونے لگا ہے۔ مغربی مورخین کی تحقیق کے مطابق یہ نام اٹھارھویں صدی کی ایجاد ہے اور نادر شاہ نے ملکی انتظام کی سہولت کے لئے تجویز کیا تھا۔ فرنگی فاضل سی۔ ای۔ بڈلوف نے اپنی کتاب ''ہماری مغربی سرحدیں''

(Our Western Frontier) میں لکھا ہے کہ ''بلوچستان'' کا لفظ انگریزوں کی ایجاد ہے۔

کوئٹہ، ژوب، لورالائی، پشین، چاغی، فاران، سراوان، جھالاواں، لسبیلہ اور کیچ مکران وغیرہ بلوچستان کے اضلاع ہیں۔ کیچ کو یونانی اور عرب دونوں ''کیز'' لکھتے ہیں۔ کچھی کو سنسکرت والے اور عرب دونوں ''بدھا'' لکھتے ہیں جبکہ ''گنداوہ'' کو قندبیل اور ''خضدار'' کو ''قصدار'' کہتے ہیں۔ ''تاریخ سندھ'' کے مولف ابوظفر ندوی کی تحقیق کے مطابق ۶۱ھ میں ابوالاشعث منذر بن جارود نے قصدار کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کیا۔

موجودہ بلوچستان سے جو آثار قدیمہ ملے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان میں بھی وہی تہذیب رائج تھی جو وادی سندھ کی قدیم تہذیب کہلاتی ہے۔ بلکہ بلوچستان دراصل سندھ کا ایک صوبہ تھا جب برصغیر دو حصوں یعنی سندھ اور ہند میں منقسم تھا۔ چنانچہ مولانا اعجاز الحق قدوسی ''تاریخ سندھ'' میں لکھتے ہیں۔

''عربوں کے یہاں آنے کے بعد تجارت کو بھی غیر معمولی فروغ حاصل ہوا اور تجارتی مال کی درآمد و برآمد کو بہت ترقی ہوئی۔ سندھ کے شہر دیبل، نیرون کوٹ، سیوستان، قصدار، اروڑ، منصورہ اور ملتان عربوں کے زمانے میں تجارتی مرکز بنے۔ گجرات، مالابار، مدراس، بنگال وغیرہ میں عربوں کی جو تجارت تھی وہ اس قدر کامیاب نہ تھی جس قدر سندھ میں اس کو عروج حاصل تھا''۔

الاصطخری اپنی کتاب ''مسالک الممالک'' میں لکھتا ہے کہ قصدار طوران (قلات پلیٹو) کا پایہ تخت ہے۔ اس کے ماتحت شہر اور مزروعہ دیہات ہیں، قصدار پر مغیر بن احمد نامی ایک شخص قابض ہے جو عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے، اس کا قیام قلات (کیزکان) میں ہے۔ طوران وسیع اور زرخیز علاقہ ہے''۔

المقدسی اپنی کتاب ''احسن التقاسیم'' میں قصدار کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''طوران کا یہ صدر مقام ہے۔ ایک کھلے میدان (پلیٹو) میں واقع ہے۔ شہر کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں سلطان طوران کا محل اور قلعہ ہے۔ دوسرے میں جس کا نام بودیں ہے، تاجروں کے ہاسٹل اور گودام ہیں۔ یہاں خراسان، فارس، کرمان اور ہندوستان سے بیوپاری آتے ہیں، سلطان عادل اور متواضع ہے''۔

فاضل محقق ڈاکٹر محمد اسحاق نے بھی اپنی کتاب "علمِ حدیث میں پاک و ہند کا حصہ"
(Contribution of India and Pakistan to the Study of Hadith Literature) میں مختلف تاریخی حوالوں سے یہی لکھا ہے کہ قصدار ایک تجارتی شہر تھا اور کرمان، فارس اور خراسان سے بری راستہ سے ہند کی جو تجارت ہوتی تھی اس کے لئے یہ بڑا اہم مرکز تھا۔ چنانچہ قصدار میں ان ملکوں کے تاجر اور ہندی تاجر سب ہی آباد تھے۔ یہاں مسلمانوں کے لئے ایک مسجد بھی موجود تھی۔ یہ حوالہ دینے کے بعد ڈاکٹر محمد اسحاق نے لکھا ہے کہ:

> "اس امر کی براہِ راست کوئی شہادت موجود نہیں کہ قصدار میں عربوں نے ثقافتی ترقی کے کام کئے تھے اور دینی علوم یعنی قرآن و حدیث کی اشاعت کی تھی.... اس صورت حال کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ پانچویں صدی ہجری تک ہمیں قصدار کے صرف دو محدثوں کا حال معلوم ہوا ہے"۔

ڈاکٹر محمد اسحاق نے قصدار کے جن دو محدثین کا ذکر کیا ہے ان میں صوفی ابو محمد جعفر بن الخطاب ہیں۔ اور دوسرے سیبویہ بن اسماعیل بن داؤد قصداری (متوفی ۴۶۳ھ) ہیں۔ انہوں نے محدث صوفی ابو محمد قصداری کا سنِ وفات ۴۵۰ھ تحقیق کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ دونوں محدث ہم عصر شخصیات قرار پاتی ہیں۔ نیز یہ کہ ان دونوں محدثوں کے حالات اس قدر اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ جن سے نہ تو یہ کہ ان کے باہمی تعلقات و روابط کی نشاندہی ہوتی ہے اور نہ کسی ایسے محدث، فقیہ یا عالمِ دین کا نام سامنے آتا ہے جس سے ان دو محدثوں نے کسی ایک مکتب میں تعلیم پائی ہو یا کسی استاد کے پاس اکٹھے درس لیا ہو اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ قصدار کے ان دو محدثوں نے کس شہر میں تعلیم حاصل کی؟ بلکہ ڈاکٹر محمد اسحاق کے بیان سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ قصدار کے ان محدثوں نے اپنے آبائی شہر میں اپنا حلقۂ درس بھی قائم کیا تھا یا نہیں، اِس لئے کہ ان دونوں محدثین کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا بیان یہ ہے کہ وہ قصدار سے نقل مکانی کر کے چلے گئے۔ جیسا کہ انہوں نے سیبویہ بن اسماعیل قصداری کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ابوالقاسم علی بن محمد حسینی، یحیٰ بن ابراہیم الخول اور رجاء بن عبدالواحد اصفہانی کے شاگرد تھے۔ وہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور وہاں حدیث کا درس دیتے تھے۔ حافظ ابوالفتیان عمرو بن ابو الحسن فرواسی (متوفی ۵۰۳ھ) نے سیبویہ

سے احادیث روایت کی ہیں۔

صوفی ابو محمد جعفر بن الخطابؒ کے احوال بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی تحقیقی کتاب "علمِ حدیث میں پاک و ہند کا حصہ" میں یہ لکھا ہے کہ جعفر معروف بہ ابو محمد، قھدار کے باشندہ تھے اور بلخ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ فقیہ بھی تھے اور صوفی بھی۔ انہوں نے عبدالصمد بن محمد العاصی سے حدیث کا درس لیا تھا۔

صوفی ابو محمد جعفر کے استاد محدث عبدالصمد بن محمد العاصی کے احوال قاضی عبدالکریم سمعانی نے اپنی کتاب "الانساب" میں بیان کئے ہیں۔

صوفی ابو محمد جعفر بن الخطاب ثقہ راوی حدیث تھے۔ علمِ حدیث میں ان کے مرتبہ و مقام کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ حافظِ حدیث ابو الفتوح عبدالغافر کاشغری (متوفی ۴۷۴ھ) نے صوفی ابو محمد جعفر سے احادیث روایت کی ہیں، جن کے بارے میں سمعانی نے اپنی کتاب "الانساب" میں یہ لکھا ہے:

"ابو الفتوع عبدالغافر بن الحسن الکاشغری کان حافظا مکثرا صدوقا"

صوفی ابو محمد جعفر بن الخطاب قھداری کے حالات کے بارے میں کتب تاریخ و تذکرہ میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں۔ ان کے بچپن، جوانی اور کہولت کے احوال پردۂ اخفاء میں ہیں۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی کتاب لکھی یا نہیں؟ ڈاکٹر محمد اسحاق اپنی تحقیق کے ذریعے ان کے اساتذہ میں سے صرف ایک استاد یعنی عبدالصمد بن محمد العاصی اور ان کے تلامذہ میں سے صرف ایک شاگرد یعنی ابو الفتوح عبدالغافر کاشغری کا پتہ چلانے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ نیز یہ کہ ابو محمد جعفر ثقہ راوی ہونے کے علاوہ فقیہ اور صوفی بھی تھے۔

محدث صوفی ابو محمد جعفر بن الخطاب قھداری نے ۴۵۰ھ میں وفات پائی۔

حضرت داتا گنج بخشؒ

حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ کا شمار مشاہیر اسلام میں ہوتا ہے۔ انہوں نے برعظیم پاکستان و ہند میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں شاندار اور ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ آپ کی شہرۂ آفاق اور راہنما کتاب ''کشف المحجوب'' فی الحقیقت ایک ایمان افروز، دل گداز اور تاریخ ساز کتاب ثابت ہوئی۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے ''حدیقۃ الاولیاء'' میں حضرت داتا گنج بخش کو متقدمین اولیاء میں شمار کیا ہے اور ان کا شان دار الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''شیخ علی مخدوم جیلانی ہجویری المخاطب بہ داتا گنج بخش امامِ وقت، رہبرِ حقیقت، مطلعِ انوارِ عرفانی، واقفِ اسرارِ رحمانی، عالمِ علومِ ظاہر و باطن، مرشدِ اکمل، عابد و زاہد و متقی، مظہرِ خوارق وکرامت، صاحبِ ولایت مشہور ہیں۔ شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی سے حضرت کی بیعت تھی۔ اپنے مرشدِ طریقت کے احوال و آثار میں بیان فرماتے ہیں کہ 'وہ صوفیوں کی ظاہری رسوم و اشکال کو ناپسند فرماتے تھے۔' پیر و مرشد کی طرح آپ حضرت داتا گنج بخش بھی ظاہری رسوم کو ناپسند کرتے تھے اور ان ظاہری رسوم کو معصیت و ریا قرار دیتے تھے۔''

شیخ علی ہجویری کو ان کے مرشد طریقت نے ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ کر کے ہندوستان کی طرف روانہ کیا تا کہ وہ یہاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور لوگوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت کا اہم اور بنیادی فریضہ ادا کر سکیں۔ چنانچہ شیخ علی ہجویری نے

لاہور کو اپنا مرکز تبلیغ و تدریس بنایا اور یہاں ہنگامۂ فضیلت و مشیخت گرم کیا۔ دن کو تشنگانِ علم کی درس و تدریس اور رات کو طالبانِ حق کے لئے وعظ تلقین کی مجالس منعقد کرتے تھے۔ ہزاروں بے علم آپ کی تعلیم سے صاحبِ علم و فضل اور ہزاروں کافر آپ کی صحبتِ کیمیاء اثر سے مشرف بہ اسلام ہوئے، ہزار ہا فاسق، نیکو کار اور لاکھوں ناقص درجۂ کمال کو پہنچے۔

حضرت مخدوم کا اسم گرامی علی بن عثمان، کنیت ابوالحسن اور لقب داتا گنج بخش ہے۔ ہجویر اور جلاب... غزنی کے دو محلے تھے جہاں ان کی رہائش رہی، اس نسبت سے ہجویری اور جلابی اور وطن کی نسبت سے غزنوی بھی کہلاتے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب امام حسن بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں، جب کہ دنیائے اسلام کے دیگر ممالک بالخصوص ایران، عراق، شام، مصر، ترکی، حجاز اور وسط ایشیا کے ملکوں میں شیخ علی لاہوری کے نام نامی سے جانے جاتے ہیں۔

شیخ علی بن عثمان ہجویری المعروف حضرت داتا گنج بخشؒ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ۴۰۰ھ کے لگ بھگ غزنی کے ایک معروف علمی خانوادے میں پیدا ہوئے جو علم و تقویٰ میں ممتاز تھا۔ آپ کے ماموں کا لقب تاج الاولیاء تھا۔ داراشکوہ نے غزنی میں داتا گنج بخش کے والدین اور ان کے ماموں کے مقابر پر حاضری دی تھی۔

شیخ علی ہجویری کے بچپن، تعلیم و تربیت اور زندگی کے حالات اردو اور فارسی کی کتبِ تاریخ و تذکرہ میں مفقود ہیں۔ گزشتہ دس طویل صدیوں میں ان کے لاکھوں عقیدت مندوں میں سے کسی اہل قلم دانشور نے بھی اس جانب توجہ نہیں کی۔ جن اہل علم نے ان کے احوال و آثار بیان کئے ہیں وہ صرف ان کا نام و نسب بتا کر ان کے زہد و تقویٰ، عرفان و آگہی اور اُن کے کشف و کرامات اور پھر اُن کی کتاب ''کشف المحجوب'' کی طرف آ جاتے ہیں یا پھر ان کے اقوال و حکایات بیان کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، اور اُن کے حالات زندگی کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نہ تو ان کی تعلیم کے بارے میں کچھ بتاتے ہیں اور نہ ان کے اساتذہ و مشائخ کا ذکر کرتے ہیں جن سے انہوں نے مختلف علوم و فنون سیکھے تھے۔ بلکہ صرف ان کے مرشد طریقت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی کے تذکرہ پر اُن کی تعلیم و تربیت کے باب کو ختم کر دیتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش کے جو تذکرہ نگار ذرا زیادہ محنت و تردّد کرتے ہیں وہ اُن صوفیہ کرام کا ذکر کرتے ہیں جن سے شیخ علی ہجویری کی

ملاقاتیں رہیں اور جن کے احوال حضرت شیخ نے بیان کئے ہیں۔ لیکن شیخ علی ہجویری کے بارے میں یہ نہیں بتایا جاتا کہ وہ ایک محدث، فقیہ، مفسر، متکلم، مناظر اور معقولات کے بھی ماہر تھے۔ نیز یہ کہ علوم شرعیہ کی تعلیم انہوں نے کن علماء، فقہاء اور عرفاء سے حاصل کی؟

''کشف المحجوب'' کے بنظر غائر مطالعہ سے یہ امر ظاہر و ثابت ہوجاتا ہے کہ شیخ علی ہجویری نہ صرف یہ کہ مروجہ علوم وفنون سے آشنا تھے بلکہ یہ کہ وہ علوم شرعیہ میں ید طولی رکھتے تھے۔ ''کشف المحجوب'' سے صرف صاحبِ کتاب کے فضل و کمال اور علم و عرفان کے مرتبہ و مقام ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ ان کے مسلک و مشرب، ان کے سلسلۂ طریقت، اور ان کے مشائخ طریقت کے علاوہ علوم شرعیہ میں ان کی مہارت تامہ اور ان علوم میں ان کے اساتذہ کی بھی واضح طور پر نشاندہی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ شیخ ابوالفضل محمد بن حسنؒ ختلی کے احوال میں لکھتے ہیں:

''طریقت میں میری پیروی و اقتداء اُن کے ساتھ ہے، علم تفسیر و روایات کے زبردست عالم تھے۔ مسلک جنیدی رکھتے تھے۔''

اپنے مرشد طریقت شیخ ابوالفضل ختلیؒ کے احوال بیان کرنے کے فوراً بعد شیخ علی ہجویری جس صوفی بزرگ کے احوال بیان کرتے ہیں وہ باطنی علوم کے علاوہ علوم شرعیہ میں بھی ان کے استاد، حافظِ حدیث شیخ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری ہیں جو محض صرف ونحو، لغت و ادب، اور ریاضیات کے ماہر کامل ہی نہ تھے بلکہ حدیث، فقہ، اصول فقہ، منطق، علم الکلام اور تفسیر کے بھی عالم بے بدل تھے۔ چنانچہ شیخ علی ہجویری نے ان کے احوال کے آغاز ہی میں اُن کے لئے اپنے استاد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی تحریر: ''انھیں متاخرین صوفیہ میں استاد امام زین الاسلام ابوالقاسم حضرت عبدالکریم بن ہوازن قشیریؒ ہیں۔ اپنے زمانے کے بدیع المثال اصحاب میں تھے اور عزت وحرمت میں رفیع المثال اور منزلوں میں علوم الحال۔''

امام قشیری کے احوال بیان کرنے کے ساتھ ہی شیخ علی ہجویری نے علوم شرعیہ میں اپنے دوسرے استاد شیخ ابوالعباس احمد بن شقانی کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے:

''انھیں متاخرین صوفیہ میں امام ابوالعباس احمد بن محمد شقانیؒ ہیں۔ اصول و فروع میں بڑے ماہر اور امام وقت تھے... میں نے ایک

جماعت جاہلوں کی پائی جو آپ کی عبادت کے اظہار پر کورانہ تقلید
کرتی ہے... میرے دل میں ان کی زبردست محبت ہے اور مجھ پر
ان کی بحد غائت محبت و شفقت ہے اور بعض علوم میں وہ میرے
استاد بھی ہیں۔''

شیخ علی ہجویری کے احوال بیان کرتے ہوئے مولوی فقیر محمد ''حدائق الحنفیہ'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت داتا گنج بخش لاہوری کا شجرۂ نسب امام حسن بن حضرت علی مرتضیٰ تک پہنچتا ہے۔ آپ اولیاء متقدمین میں سے ظاہری و باطنی علوم کے جامع تھے عابد، زاہد، متقی، مظہر خوارق و کرامات حنفی المذہب تھے۔ آپ نے اپنے مرشد شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی جنیدی کے علاوہ بڑے بڑے مشائخ مثل شیخ ابوالقاسم گورگانی، ابوسعید ابوالخیر اور ابوالقاسم قشیری محدث کی صحبت میں رہ کر فوائد کثیرہ حاصل کئے۔ بالآخر اپنے مرشد کے اشارے سے لاہور میں اپنی مسند ارشاد قائم کی۔ دن کو تعلیم و تدریس اور رات کو وعظ و تلقین کے ذریعے بے شمار جہلاء کو عالم فاضل اور لاتعداد گم کردگان راہ حق کو جادۂ مستقیم پر گامزن کردیا۔ حضرت داتا گنج بخش صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سب سے زیادہ قلبی وابستگی افضل امت خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ائمہ فقہاء میں امام اعظم ابوحنیفہ سے سب سے زیادہ اور والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ''کشف المحجوب'' میں لفظ ''صوفی'' کی تعریف بیان کرنے کے بعد تصوف کے بارے میں فرماتے ہیں:

'التصوف الیوم اسم، ولا حقیقۃ وقد کان حقیقۃ ولا اسم' یعنی تصوف آج کل ایک بے حقیقت نام ہے اس سے پہلے ایک حقیقت تھا، نام کے بغیر۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ 'اگر تو واقعی صوفی کا متلاشی ہے تو یاد رہے کہ صوفی ہونے کی شانِ صفا تو صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں تھی، اس لئے کہ صفتِ حقیقی کے لئے ایک اصل اور ایک فرع ہے۔ اصل تو دل کا ماسوا اللہ سے منقطع ہونا ہے اور فرع اس غدار دنیا کی محبت کو دل سے نکال دینا ہے اور یہ دونوں صفات حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تھیں اور صدیق اکبر کی ہی وہ ہستی ہے جسے امام اہل طریقت اور مقتدائے اہل تصوف کہا جائے اور یہی وہ پاک باطن تھے کہ جن کا دل اغیار سے اس قدر صاف تھا کہ صحابہ کرام میں بھی آپ کا ہم سرکوئی

نہ تھا۔ تاریخ اسلام کے صدر اول کے واقعات کے گہرے مطالعہ سے یہ بات ظاہر و ثابت ہے کہ مزاج و کردار اور اعمال و اشغال کے اعتبار سے بھی صوفی یا صاحب طریقت کا اطلاق حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ پر ہوتا ہے۔"

''امام اعظم کا تعارف ان شاندار الفاظ اور بے مثال القاب سے کراتے ہیں:

'امام اماماں، مقتدائے سنیاں، شرف فقہاء، عز علماء، حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت الخزار رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجاہدات و عبادات میں نہایت ثابت قدم اور اصول طریقت کے جلیل القدر عالم تسلیم کئے گئے ہیں۔ ابتداء میں خلوت نشینی کا ارادہ کیا تو ایک شب خواب میں دیکھا کہ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لحد مبارک سے استخوانہائے مبارک جمع کر کے ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دے کر پسند کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ خواب سے بیدار ہو کر حضرت محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر خواب بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ''خواب مبارک ہے۔ تم سید الانبیاءؐ کے علم کو حاصل کر کے سنت نبویؐ کی محافظت میں اعلیٰ مقام حاصل کرو گے بلکہ روایات سنت میں نقد و تنقیح کے ذریعے تصرف کے اہل اور مجاز بنو گے۔ صحیح کو سقیم سے علیحدہ کرو گے۔''

''امام اعظم کا مذکورہ بالا خواب اور علم تعبیر رؤیا کے بے مثل و بے نظیر عالم و ماہر امام ابن سیرین کی زبانی اس کی تعبیر بیان کرنے کے علاوہ حضرت داتا گنج بخش نے اپنے ایک خواب کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ 'میں شام میں صحابی رسولؐ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے مزار کے سرہانے سو رہا تھا کہ اپنے کو مکہ معظمہ میں دیکھا اور اسی خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے تشریف لا رہے ہیں اور آپؐ نے ایک معمر شخص کو اپنی آغوش مبارک میں لے رکھا ہے جیسے بچوں سے شفقت کرتے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ حضورؐ میرے تعجب کو نور نبوت سے سمجھ گئے اور ارشاد فرمایا کہ یہ امام ابوحنیفہ ہیں جو تمہارے اور تمام مسلمانان اہل سنت کے امام ہیں۔'

''یہ خواب بیان کر کے حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں کہ 'اس خواب کے بعد میرا یہ نظریہ بھی صحیح ثابت ہو گیا کہ حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ان پاک ہستیوں میں سے تھے جو اپنے اوصاف طبع سے فانی اور احکام شرع کے ساتھ باقی و قائم ہیں: اس لئے کہ ان کے چلانے والے حضور سید یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر آپ خود چلتے تو باقی الصفت

ہوتے اور باقی الصفت یا مخطی ہوتا ہے (یعنی ارادہ صواب کرے مگر بلا ارادہ خطا ظاہر ہو جائے) یا مصیب ہوتا ہے (یعنی حقیقت معاملہ کو اچھی طرح پہنچنے والا) اور جب ان کے قائد و راہنما خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے اور نبی کی صفت بقا سے قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی سے صدورِ خطا ناممکن ہے اور جو نبی کی ذات کے ساتھ قائم ہے اس سے بھی خطا نہیں ہوسکتی۔ یہ درحقیقت ایک نہایت لطیف رمز ہے۔''

حضرت داتا گنج بخشؒ نے امام اعظم کے بارے میں مشہور و معروف عارف باللہ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا ''میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کی 'یا رسول اللہ این اطلبک، قال عند علم ابی حنیفۃ' یعنی حضور میں آپ کو کہاں تلاش کروں، فرمایا ابوحنیفہ کے علم کے نزدیک۔''

حضرت داتا گنج بخش نے ''کشف المحجوب'' میں امام اعظم کے بہت سے فضائل و مناقب بیان کرنے کے بعد لکھا ہے ''حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے ورع و تقویٰ میں اس قدر مناقب ہیں کہ یہ کتاب اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔''

شیخ فریدالدین عطار نے ''تذکرۃ الاولیاء'' میں سیدنا امام اعظمؒ (متوفی ۱۵۰ھ) اور شیخ ابن عطا (متوفی ۳۰۹ھ) کے حوالے سے حضرت داتا گنج بخش کے اقوال نقل کیے ہیں جب کہ شیخ شرف الدین یحییٰ نے اپنے مکاتیب میں کشف المحجوب کی عبارات بطور سند نقل کرتے ہوئے حضرت داتا صاحب کی روحانی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے: ''صاحب کشف المحجوب کہ مقتدائی عصر خود بودہ است''۔

حضرت داتا گنج بخش مختلف اسلامی ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے سلطان مسعود غزنوی کے عہد حکومت میں اپنے دو ساتھیوں سمیت لاہور تشریف لائے۔ یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جس کے بارے میں شہزادہ دارا شکوہ نے ''سفینۃ الاولیاء'' میں لکھا ہے کہ اس وقت محراب مسجد بہ نسبت دیگر مساجد کے قدرے مائل بہ سمت جنوب معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ علمائے وقت نے اعتراض کیا۔ جب مسجد مکمل ہوگئی تو آپ نے علماء و فضلاء کو دعوت دی اور اپنی امامت میں نماز پڑھائی، بعد از نماز سب کو قبلہ رُو کھڑا کر کے فرمایا، دیکھو قبلہ کس طرف ہے؟ اُسی وقت حکم الٰہی سے تمام حجاب اُٹھ گئے اور سامنے سے قبلہ نمودار ہوا اور سب نے دیکھا اور اپنے اعتراض پر نادم و شرم سار ہوئے۔

شیخ علی ہجویری نے ''کشف المحجوب'' کا کچھ حصہ سیر و سیاحت کے دوران میں لکھا لیکن اس کا تین چوتھائی حصہ شہر لاہور میں قیام کے دوران میں پانچویں صدی ہجری کے نصف آخر میں لکھا گیا۔ چنانچہ جب وہ یہ کتاب لکھ رہے تھے اس وقت ان کے پاس کوئی کتاب بالخصوص حدیث کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی اور نہ اُس زمانے میں لاہور میں کوئی کتاب خانہ ہی تھا۔ ان کی وفات کے ڈھائی تین سو سال بعد تک صحاح ستہ سمیت احادیث کے کسی مجموعے کی برعظیم میں موجودگی کا قطعی سراغ نہیں ملتا۔ ''کشف المحجوب'' کے ضبط تحریر میں لانے کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''اس وقت اس سے زیادہ ممکن نہیں اس لئے کہ میری کتابیں غزنی میں رہ گئی ہیں اور میں ہند کے اس شہر لاہور میں ناجنسوں میں پھنسا ہوا ہوں۔''

ظاہر ہے کہ ''کشف المحجوب'' ایسی شریعت وطریقت کی عظیم اور ضخیم کتاب جو علماء و عرفاء کے سینکڑوں احوال اور سینکڑوں آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے حوالوں سے معمور ہے، انہوں نے محض اپنی قوت حافظہ اور علم وعرفان کی بناء پر تحریر کی جو شیخ علی بن عثمان ہجویری کے بلند پایہ محدث، جلیل القدر فقیہ، عالم کامل اور فاضل اجل ہونے کے علاوہ اُن کے عارف باللہ ہونے کا واضح اور بین ثبوت ہے۔

''کشف المحجوب'' جسے پروفیسر نکلسن نے انگریزی میں منتقل کیا، آپ کا شاہکار ہے۔ فارسی میں تصوف پر اولین کتاب ہونے کے حوالے سے اس کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس میں تصوف کے طریقے کی تحقیق، اہل تصوف کے مقامات کی کیفیت، ان کے اقوال اور صوفیانہ فرقوں کا بیان، معاصر صوفیہ کرام کے رموز و اشارات اور متعلقہ مباحث بیان کیے گئے ہیں۔ اہل طریقت میں اس کتاب کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔

شہزادہ داراشکوہ نے اس یادگار کتاب کی اہمیت و افادیت کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے:

''کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچ کس را براں سخن نیست و مرشدے است کامل۔ در کتب تصوف بہ خوبی آں در زبانِ فارسی تصنیف نہ شدہ''

پروفیسر ژوکوفسکی نے لکھا ہے:

''در تالیف و تدوین سفینۃ الاولیاء، خزینۃ الاصفیاء، نامہ دانشوراں و

طرائق الحقائق نیز از کشف المحجوب استفادہ ہائے بسیار و اقتباسات مکرر و متعدی شدہ است"

پروفیسر ژوکوفسکی نے جن کتب کے حوالے دیے ہیں اُن میں سے "نامہ دانشوراں" عصر حاضر کی مشہور تصنیف ہے جو ایران کے فضلاء کی مشترکہ کاوش ہے، جب کہ "طرائق الحقائق" نائب الصدر حاج میرزا معصوم بن رحمت علی شاہ قزوینی (متوفی ۱۳۴۴ ق) کی تالیف ہے۔

"کشف المحجوب" کی عبارات سے شیخ علی ہجویری کے متکلم، مناظر، شاعر، واعظ، خطیب، مدرس، معلم، مبلغ اور سیاح ہونے کے بھی شواہد ملتے ہیں۔ اہل لاہور کو انہوں نے تبلیغ و تلقین اور وعظ و ارشاد ہی کے ذریعے حلقہ بگوش اسلام کیا اور تعلیم و تدریس ہی کے ذریعے ان کی رہنمائی اور ہدایت و تربیت کی۔ "کشف المحجوب" ہی میں انہوں نے اپنے بعض علمی اور عقلی مناظروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ غزنی میں علم و امامت کے ایک مدعی نے کپڑوں میں پیوند لگانے کو بدعت قرار دیا۔ شیخ علی ہجویری نے جواباً ارشاد فرمایا: "ریشم اور زری کے ملبوسات جو تم جابر بادشاہوں سے آہ و زاری کر کے مانگ کر لاتے ہو انہیں تو تم جائز سمجھتے ہو اور جامۂ حلال، جو لباس زرِ حلال سے حاصل کیا گیا ہے اسے پہننا بدعت بتاتے ہو۔" اسی طرح انہوں نے ایک جگہ مسائل فقہ خود پڑھانے کا بھی ذکر کیا ہے۔

ایک روایت کے مطابق شیخ علی ہجویری اپنی مسجد کے ساتھ ملحقہ مدرسہ میں چالیس طلبہ کو روزانہ درس دیتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کا ایک حلقۂ درس بھی تھا۔

شیخ علی ہجویری کے اقوال حکمت و دانش، علم و فضل اور عرفان و آگہی سے معمور ہونے کی بناء پر زبان زد عام ہیں اور ان کی یادگار کتاب "کشف المحجوب" اسرار و رموز اور معرفت الٰہی کا بہت بڑا خزانہ ہونے کے علاوہ "رکن اول از شریعت کتاب است چنانکہ گفت عزش او مال فیہ آیات محکمات ھن ام الکتاب" و دیر سنت است چنانکہ گفت "و ما اتکم الرسول فخذوہ و ما نھکم عنہ فانتھوا" وبیوم اجماع امت جندکہ رسول گفت علیہ السلام "لا تجمع امتی الضلالۃ علیکم بالسواد الاعظم" یعنی پہلا رکن شریعت میں کتاب اللہ ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قرآن مجید میں آیات محکمات ہیں کہ وہ اصل کتاب ہیں اور دوسرا رکن سنت ہے جیسا کہ فرمایا جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس پر

عمل کرو اور جس بات کو منع فرمایا ہے اس سے بچو اور تیسرا رکن اجماع امت ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوتی ہے، اختیار کرو سواد اعظم کو۔''

شیخ علی ہجویری نے ۲۰ برس کی عمر میں ۴۲۱ھ میں دارالسلطنت غزنی میں سلطان محمود غزنوی جو خود بھی حافظ قرآن ہونے علاوہ محدث فقیہ اور عالم دین بھی تھے، کی موجودگی میں ایک ہندوستانی فلسفی سے مناظرہ کیا تھا اور اسے شکست دی تھی۔ حضرت داتا گنج بخش نے متعدد اسلامی ملکوں کی طرح برصغیر پاک و ہند کے اکثر شہروں کی سیاحت کی تھی اور وہاں تبلیغ اسلام کے علاوہ تفوق دین کو ظاہر و ثابت کیا۔ وہ یہاں کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور ہندوؤں کے عقائد سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ فنا و بقاء کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ پر ہندوستان میں میرا ایک عالم سے مناظرہ ہوا تھا:

> ''ہندوستان کے اندر میں نے ایک شخص دیکھا جو تفسیر و تذکیر کا مدعی تھا، اُس نے مجھ سے فنا و بقاء کے مسئلہ پر مناظرہ کیا، جب میں نے اس کی تقریر سنی تو معلوم ہوا کہ یہ خود فنا و بقاء کو بالکل نہیں سمجھتا اور قدیم مبحث کے فرق کو بھی نہیں جانتا۔''

حلولیہ کے باطل عقاید کے بیان میں روح کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں: ''...اور جملہ اہل ہند و تبت و چین و ماچین یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ قرامطیوں اور باطنیوں کا بھی اسی پر اجماع ہے...''

محبت کی شہرت و تعریف کی بحث کے دوران میں سلطان محمود غزنویؒ سے ہنود کی قلبی ناراضی اور ان کی بے بسی کا ذکر نہایت لطیف پیرائے میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''ہندوؤں کے نزدیک محبت کی قید، محمود کی قید سے بھی زیادہ مشہور ہے ــــ اور محبت کا زخم اور داغ ہندوؤں کے نزدیک اُس زخم سے بھی زیادہ شدت رکھتا ہے جو محمود نے انہیں لگایا تھا۔''

باب ''سماع الاصوات والالحان'' میں رقم طراز ہیں:

> ''مشہور ہے کہ ہندوستان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جنگل میں جا کر

گاتے اور سریلی آوازیں نکالتے ہیں۔ ہرن جب اُن کے غنا اور
لحن کو سنتے ہیں وہ اُن کی طرف آ جاتے ہیں اور (شکاری) اُن
کے گرد گھوم کر گاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ہرن گانے کی لذت سے
مست ہو کر سو جاتے ہیں اور وہ انہیں پکڑ لیتے ہیں۔''

''مقامات سماع'' کے زیرِ عنوان سماع پر سیر حاصل گفتگو کر کے فرماتے ہیں کہ ''یہ بھی کہتے ہیں کہ اہل سماع کے دو گروہ ہیں۔ ایک لاہی اور دوسرا الٰہی۔ لاہی تو عین فساد میں ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہے اور الٰہی مجاہدات و ریاضات کے انہماک میں مخلوقات سے دل قطع کیے ہوئے اور موجودات سے روگرداں اور فتنوں کو اپنی ذات سے دور رکھے ہوئے ہے۔''

خود اپنے بارے میں حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں:

''میں عثمان جلابی کا بیٹا علی اُس کو دوست رکھتا ہوں جو سماع میں نہ
پڑے اور طبیعت کو پریشان نہ کرے کیونکہ اس میں بڑے خطرے
ہیں۔ اور بڑی آفت یہ ہے کہ عورتیں کسی اونچے مقام سے سماع
کے حال میں درویشوں کو دیکھتی ہیں اور نوجوان اور نوخاستہ ان
مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔''

عورتوں کے پھیلائے ہوئے فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بہشت میں سب سے پہلا فتنہ جو آدمؑ پر مقدر ہوا ہے۔ اس کا
اصل یہی عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا یعنی ہابیل
اور قابیل کی لڑائی، اُس کا سبب بھی یہی ذاتِ شریف تھی اور جب
خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت۔ ماروت) کو سزا دے تو اس کا
سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا اور آج کے دن (یعنی ۴۶۵ھ) کے
قریب تک دینی و دنیاوی فتنوں کے تمام اسباب کا ذریعہ یہی
عورتیں تھیں۔''

شیخ علی ہجویری نے اپنا تمام تر وقت اور توجہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور لوگوں کی اصلاح و تربیت پر مرکوز رکھی۔ انہیں مرید بنانے میں زیادہ دلچسپی نہ تھی، ان کے مرشد کا قول ہے کہ جن پیروں کو مرید جمع کرنے کی حرص ہوتی ہے ان کے مرید دنیا جمع کرنے

کی حرص میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ ایک حرص دوسری حرص سے بہتر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وعظ و تلقین اور تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہے۔ مولوی محمد شفیع لاہوری کی تحقیق کے مطابق انہوں نے اپنے دیوان سمیت نو کتابیں تصنیف کیں۔ دیوان کوئی صاحب پڑھنے کے لئے لے گئے اور اپنے نام سے شائع کرا دیا۔ دوسری آٹھ کتابیں ناپید ہیں۔ لیکن ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''کشف المحجوب'' ایک مرشد طریقت اور استاد شریعت کی طرح ایک ہزار برس سے مسلمانوں کی بیک وقت دینی وعلمی اور روحانی راہنمائی کا کام کر رہی ہے۔ جیسا کہ خواجہ نظام الدین اولیاء نے فرمایا ہے:

''میں نے کشف المحجوب کا تمام و کمال مطالعہ کیا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ اگر کسی کو مرشد نہ ملے تو اسے پڑھنے سے مل جائے گا۔''

حضرت داتا گنج بخش کو اکابر صوفیہ کرام اور علمائے عظام نے قطب الاقطاب قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی لاہور کو قطبِ ارشاد کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''فقیر کے نزدیک یہ شہر لاہور ہندوستان کے تمام شہروں میں قطبِ ارشاد کی طرح ہے۔ اس شہر کی خیر و برکت تمام بلادِ ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔''

اکابر علماء و مشائخ نے حضرت داتا گنج بخش کے مزار پُر انوار پر حاضری دی اور فیض و برکات حاصل کیے۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے دست بستہ پائنتی کی طرف کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا:

گنج بخش ہر دو عالم مظہرِ نورِ خدا　　ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

حضرت داتا گنج بخشؒ نے لکھا ہے:

''خداوند بزرگ و بلند نے ہمیں اس زمانے میں پیدا کیا ہے جب لوگوں نے حرص اور لالچ کا نام شریعت اور تکبر و جاہ و اقتدار کی طلب کا نام عزت اور علم، ریاکاری کا نام خوفِ خدا اور کینہ پروری کا نام حلم، لڑائی جھگڑے کا نام بحث مباحثہ، ہذیان طبع کا نام معرفت، نفس پرستی کا نام محبت، راہ راست سے انحراف اور بے

دین ہونے کا نام فقر، حق تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام
فنا فی اللہ اور ترکِ شریعت کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔"

حضرت داتا گنج بخش سے تین سو سال پیشتر امام حسن بصری (متوفی ۱۱۰ھ) فرمایا کرتے تھے "مسلمانی در کتاب و مسلمان در گور۔" اور حضرت داتا گنج بخش کے تین سو سال بعد آنے والے بزرگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ اعظم حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلی اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

مسلماناں مسلماناں، مسلمانی مسلمانی
ازیں آئین بے دیناں پشیمانی پشیمانی

حضرت شیخ ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ نے ۴۶۹ھ میں وفات پائی۔ ہمارے نزدیک یہی سنِ وفات درست ہے، تاہم حضرت داتا گنج بخشؒ کے سنِ وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

پروفیسر رینالڈ اے نکلسن نے حضرت داتا گنج بخشؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ کتب تاریخ و تذکرہ میں ۴۶۵ھ ہی آپ کا سن وصال ہے لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے شیخ ابوالقاسم قشیری کی وفات کے بعد، جو ۴۶۵ میں فوت ہوئے، وفات پائی ہو۔ صاحبِ "نزہۃ الخواطر" کی تحقیق کے مطابق حضرت داتا گنج بخش نے ماہ ربیع الاول ۴۶۵ھ میں وفات پائی۔ حدائق الحنفیہ میں بھی آپ کا سنِ وصال ۴۶۵ھ ہی درج ہے۔ سنِ وصال کا مادہ "جلوہ نور الصمد" ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ حضرت داتا گنج بخش لاہوری کا مزار پُر انوار لاہور میں مرجع خلائق و زیارت گاہ عام و خاص ہے۔

قاضی منہاج الدین عثمان

قاضی منہاج سراج کے مورث اعلیٰ مولانا منہاج الدین عثمانؒ کا شمار چھٹی صدی ہجری کے معروف و ممتاز علماء میں ہوتا تھا۔ ان کے والد مولانا ابراہیم صاحب علم و فضل ہونے کے علاوہ سلطان ابراہیم غزنوی (۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء_ ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء) کے نواسے تھے۔ ان کا نام سلطان ابراہیم کے نام پر رکھا گیا۔

مولانا ابراہیم کے والد مولانا عبدالخالق جوز جانی اپنے عہد کے نامور عالم دین اور روحانیت میں اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ ان کو تین مرتبہ خواب میں اشارہ ہوا کہ غزنی جاؤ اور وہاں شادی کرو۔ چنانچہ وہ اپنے وطن جوزجان سے نقل مکانی کر کے غزنی چلے گئے جہاں ان کی شادی سلطان ابراہیم غزنوی کی ایک بیٹی سے ہوگئی۔ سلطان ابراہیم کی چالیس بیٹیاں تھیں جو معروف صاحبانِ علم سادات اور علماء سے بیاہی گئیں۔ مولانا عبدالخالق نسلاً تاجک تھے۔ اگر علم و تقوی میں ان کا مرتبہ بلند نہ ہوتا تو سلطانِ وقت کی دختر کے ساتھ ان کی شادی ممکن نہ تھی۔ اس رشتہ کے بعد مولانا عبدالخالق جوز جانی نے غزنی ہی میں سکونت اختیار کر لی لیکن اپنے وطن جوز جان سے نسبت قائم رکھی۔ مولانا عبدالخالق جوز جانی نے غزنی ہی میں وفات پائی۔ آقائے حبیبی نے لکھا ہے کہ طاہر آباد میں ان کا مزار ہے جو موجودہ شہر غزنی سے پچیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔

سلطان ابراہیم غزنوی کی ۴۹۲ھ/۱۰۹۲ء میں وفات کے بعد سلطنت غزنی کے حالات خراب ہوگئے۔ اسی خرابی میں سلطان کے نواسے مولانا ابراہیم بھی انتقال کر گئے اور اپنے والد مولانا عبدالخالق جوز جانی کے مزار کے ساتھ طاہر آباد میں مدفون ہوئے۔

مولانا ابراہیم کے فرزند منہاج الدین عثمان ہیں جو سراج الدین محمد کے والد اور

نامور مؤرخ منہاج سراج کے دادا ہیں۔ منہاج سراج اپنے مورث اعلیٰ مولانا عبدالخالق جوزجانی اور اپنے دادا مولانا منہاج الدین عثمان کے مختصر احوال اپنی قابل قدر تصنیف ''طبقات ناصری'' میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے دادا مولانا منہاج الدین عثمان نے حج و زیارت کی غرض سے سفر اختیار کیا اور عروس البلاد بغداد میں ٹھہرے۔ تو عباسی خلیفہ المستضی بامراللہ نے اُن کی مناسب پذیرائی کی اور انہیں خلعت عطا کی جس سے مولانا منہاج الدین کے علمی رتبہ و مقام اور ان کی شہرت وعظمت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جب وہ فریضۂ حج ادا کر کے وطن واپس آرہے تھے تو سیستان کے فرمانروا تاج الدین ابو طاہر نے ان کا استقبال کیا اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مولانا منہاج الدین نے کچھ عرصے تک سیستان میں قیام کیا اور وہاں کے حکمران تاج الدین ابوطاہر کی فرمائش پر اس کے دربار میں تقریر بھی کی۔ سیستان سے لاہور پہنچے جہاں اس وقت خسرو ملک، جوغزنوی خاندان کا آخری حکمران ثابت ہوا، کی حکومت تھی۔ چنانچہ اُس سے ملنے کے لئے لاہور میں وارد ہوئے اور پھر یہاں سے غزنی پہنچے۔

جن دنوں میں منہاج الدین سیستان سے وطن واپس آرہے تھے سلطنت غزنویہ آخری دموں پر تھی۔ ۵۶۹ھ / ۱۱۷۳ء میں غوریوں نے غزنی پر اپنا قبضہ وتسلط قائم کرلیا تھا۔ مولانا منہاج الدین عثمان کا سفر حرمین ۱۱۷۱ء اور ۱۱۸۰ء کے درمیان ہوا۔ یہی غزنویوں اور غوریوں میں زبردست معرکہ آرائی کا دور ہے۔ لیکن مولانا منہاج الدین ایسے عالم فاضل اور متقی و پرہیزگار انسان تھے جن کو عوام وخواص دونوں ہی ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک بلند مرتبت عالم دین ہونے کی حیثیت سے ان کے لئے غزنوی اور غوری دونوں برابر تھے۔ غزنویوں سے اگر ان کی قرابت اور رشتہ داری تھی تو غوری بھی ان کے تبحر علمی کے دل سے قائل تھے۔

مولانا لاہور ہوتے ہوئے غزنی اور پھر فیروز کوہ، جوغوریوں کا مرکز تھا، چلے گئے۔ اس وقت لاہور اور غزنی دونوں شہروں پر غوریوں کا قبضہ تھا۔

ملک الکلام اور فصیح العجم سراج الدین محمد منہاج الدین عثمان کے صاحب زادے تھے جن کو سلطان معزالدین غوری نے اپنی لشکر کا قاضی مقرر کیا تھا اور قاضی منہاج سراج جنہیں برصغیر کا پاکستان و ہند کا اوّلین قاضی القضاۃ بننے کا منفرد شرف و اعزاز حاصل ہے

وہ مولانا سراج الدین محمد کے فرزند ارجمند تھے۔ یہی قاضی منہاج سراج ہیں جنہوں نے ''طبقاتِ ناصری'' ایسی قابلِ قدر کتاب لکھی جو برصغیر پاکستان و ہند میں مسلم دور اقتدار کی تاریخ میں اوّلین کتاب ہے۔ کتب تاریخ کے اس زمانے کے روایتی طرز تحریر اور اسلوب کے مطابق ''طبقاتِ ناصری'' کو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کیا گیا ہے اور پھر تمام معلوم انبیاء کرام علیہم السلام کے مشہور احوال و آثار بیان کرنے کے بعد اس کتاب میں چھٹی صدی ہجری تک کے مختلف مسلمان شاہی خاندانوں اور ان کے بادشاہوں کے حالات و واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ قاضی منہاج سراج مؤلف ''طبقاتِ ناصری'' کا نام ان کے دادا مولانا منہاج الدین عثمان کے نام پر منہاج الدین رکھا گیا۔

منہاج الدین عثمانؒ نے غوری سلاطین کے عہد میں وفات پائی۔ اُنؒ کے سن وفات تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔

قاضی سراج الدین محمد

مولانا سراج الدین محمدؒ ممتاز عالمؒ دین، بلند پایہ انشا پرداز اور نامور فقیہ تھے۔ مولانا سراج الدین کے علمی مرتبہ و مقام اور ان کی شہرت و عظمت کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ مورخین نے انہیں ''ملک الکلام'' اور ''فصیح العجم'' اور ''اعجوبۃ الزمان'' ایسے القاب دیے ہیں۔ مولانا سراج الدین کے مورثِ اعلیٰ مولانا عبدالخالق جوزجانی سلطان ابراہیم غزنوی کے داماد تھے اور ان کے والد مولانا منہاج الدین عثمان کا شمار بھی نامور علمائے دین میں ہوتا تھا۔

مولانا غلام رسول مہر نے قاضی منہاج سراج کی اہم اور یادگار کتاب ''طبقات ناصری'' کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اُردو ترجمہ کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''مولانا سراج الدین محمد وقت کے بہت بڑے عالم ادیب اور فقیہ تھے''

مولانا سراج الدین محمد کا لقب اعجوبۃ الزماں تھا کیوں کہ اُن جیسا فاضل اُن کے زمانی میں کوئی نہ تھا۔

مولانا سراج الدین محمد نے غزنی، لاہور، بغداد اور بامیان و طخارستان میں اہم عدالتی، انتظامی، تعلیمی اور سفارتی خدمات انجام دیں۔ یعنی وہ منصب قضاۃ پر بھی فائز رہے۔ سلطنت کے خطیب کے فرائض بھی انجام دیے، محکمہ احتساب کے نگران کی حیثیت سے بھی کام کیا اور مختلف تعلیمی درسگاہوں کے منتظم بھی مقرر ہوئے اور انہوں نے سلطان غیاث الدین محمد کی طرف سے بحیثیت سفیر خلیفہ بغداد کے دربار میں نمائندگی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ علاوہ ازیں مولانا سراج الدین کو سلطان معزالدین محمد غوری فاتح ہند نے اپنے لشکر کا قاضی مقرر کیا۔

۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں سلطان معزالدین محمد غوری نے لاہور فتح کیا تو اس وقت مولانا سراج الدین سلطانی لشکر کے ساتھ تھے۔ چنانچہ فتح لاہور کے بعد غوری سلطان نے اپنے سپہ سالار علی کرماخ کو لاہور کی حکومت پر اور مولانا سراج الدین محمد کو اپنے لشکر کی قضاۃ پر مامور کیا۔ جن دنوں مولانا قاضیٔ لشکر تھے ان دنوں خدام اور اہل کاروں کے علاوہ بارہ اونٹ ان کا ذاتی اور سرکاری سامان اٹھانے کے لئے مامور تھے۔ قاضی منہاج سراج جو مولانا سراج کے فرزند ارجمند ہونے کے علاوہ ''طبقات ناصری'' کے مؤلف اور برصغیر پاکستان و ہند کے اوّلین قاضی القضاۃ (Chief Justice) بھی تھے، نے اس واقعے کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

> ''لاہور پر سلطان غازی کا قبضہ ہوگیا۔ سپہ سالار علی کرماخ کو جو ملتان کا حاکم تھا، لاہور کا حاکم بنایا گیا۔ راقم الحروف یعنی قاضی منہاج سراج کا باپ اعجوبتہ الزمان، افصح العجم، سراج الدین منہاج لشکر ہندوستان کا قاضی مقرر ہوا۔ اس نے سلطان معزالدین کا عطا کردہ خلعت پہنا، لشکر گاہ کے ایوانِ دربار میں قاضی نے اپنی عدالت قائم کی۔ بارہ اونٹ اس غرض سے مقرر ہوئے کہ لشکر کوچ کرے تو قاضی کا سرو سامانِ عدل ان پر لادا جائے۔''

مولانا سراج الدین کچھ عرصہ قاضیٔ لشکر کے فرائض کامیابی و خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دینے کے بعد غوریوں کے مرکز فیروز کوہ چلے گئے۔ وہاں سے انہیں سلطان شمس الدین محمد فرمانروائے بامیان و طخارستان کے بیٹے بہاء الدین سام نے بلروں یا پروں بلالیا۔ کچھ مدت مولانا سراج الدین، بہاء الدین سام کے ساتھ بلروں میں رہے اور پھر واپس فیروز کوہ آ گئے۔

۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء میں شمس الدین محمد نے وفات پائی تو بہاء الدین سام بامیان و طخارستان کا فرمانروا بنا۔ وہ شمس الدین محمد کا بڑا بیٹا نہ تھا لیکن سلطان غیاث الدین محمد اور سلطان معزالدین محمد کا حقیقی بھانجا تھا، اس لئے اس کو تخت نشین کیا گیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد بہاء الدین سام نے مولانا سراج الدین کو اپنے پاس آنے کی دعوت بھیجی۔ اس دعوت نامے کے ساتھ ایک بیش قیمت انگشتری بھی تھی جس کے فیروزے پر لفظ ''سام'' کندہ تھا۔ اس طرح بہاء الدین سام کے پُرزور اصرار پر مولانا اس کے پاس بامیان چلے

گئے، جہاں انہیں متعدد عالی عہدوں پر مامور کیا گیا۔ انہیں بامیان کا منصب قضاۃ دیا گیا۔ ساتھ ہی لشکر کا بھی قاضی بنادیا گیا۔ انہیں سلطنت کے خطیب اور محکمہ احتساب کا نگران بنایا گیا اور درس گاہوں کا منتظم مقرر کیا گیا۔ فرائضِ منصبی کی کامیاب بجا آوری اور اعلیٰ کارکردگی کے پیشِ نظر بہاء الدین سام نے انہیں جاگیر بھی دی اور انعام و اکرام سے بھی نوازا۔

''طبقات ناصری'' کے مترجم مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ ''معلوم نہیں مولانا سراج الدین نے کتنی مدت بامیان میں گزاری۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ جب ۱۱۹۳ء سے ۱۱۹۵ء کے دوران میں سلطان تکش خوارزم شاہ نے عباسی خلیفہ کے خلاف فوجی اقدامات کیے تو خلیفہ نے دیگر سلاطین کے علاوہ دو بار اپنے سفیر سلطان غیاث الدین محمد کے پاس بھی فیروز کوہ بھیجے تھے۔ دوسری مرتبہ ابن الربیع اور ابن الخطیب فیروز کوہ آئے تھے اور انہوں نے عباسی خلیفہ کے لئے سلطان تکش کے خلاف غیاث الدین محمد سے امداد طلب کی تھی۔ یہ غالباً ۱۱۹۷ء کا واقعہ ہے۔ اس سفارت کے جواب میں سلطان غیاث الدین نے اپنی طرف سے دو نمائندے خلیفہ کے سفیروں کے ساتھ بغداد روانہ کیے۔ اول امام شمس الدین ترک اور دوم مولانا سراج الدین محمد تاجک۔ یہ دونوں حضرات سفارت کے فرائض انجام دینے کے بعد لوٹے تو مولانا سراج الدین محمد نے اثنائے سفرِ مراجعت میں مکران کے کسی مقام پر وفات پائی۔

قاضی منہاج سراج نے ''طبقات ناصری'' میں چونتیسویں عباسی خلیفہ الناصر لدین اللہ کے احوال بیان کرتے ہوئے اپنے والد مولانا سراج الدین محمد کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ قاضی منہاج سراج لکھتے ہیں:

''الناصر لدین اللہ کے زمانے میں خلافت کے کاروبار کو قوت حاصل ہوئی۔ اس عہد میں غور و خراسان اور غزنہ و ہندوستان کی سلطنتیں سلطان غیاث الدین محمد سام اور سلطان معزالدین محمد سام سے تعلق رکھتی تھیں۔ خوارزم نیز خراسان کے بعض علاقوں کی حکم رانی سلطان تکش بن خوارزم شاہ بن الپ ارسلان بن اتسز نے سنبھال لی۔ ابن الفضل دارالخلافت میں وزیر تھا۔ تکش بن خوارزم شاہ نے دارالخلافت کی اطاعت سے سرکشی اختیار کی اور خوارزم سے عراق پہنچا۔ ابن الفضل وزیر اس کے دفعیہ کے لیے بغداد سے آیا۔ دونوں میں جنگ ہوئی۔ خلیفہ کے لشکر نے شکست کھائی۔ بغداد سے سفیر غور غزنہ پہنچے اور

امداد طلب کی۔ چنانچہ امام شمس الدین ترک، ابن الربیع، ابن الخطیب اور راقم الحروف کے والد ماجد مولانا سراج منہاج (ان سب پر اللہ کی رحمت ہو) سلطان غیاث الدین محمد کی جانب سے بہ طریق سفارت مقرر ہوئے۔ اس اثنا میں تکش خوارزم شاہ نے سرکشی کی نحوست سے وفات پائی اور جلد ہی اس کا بیٹا سلطان علاء الدین محمد خوارزم کے تخت پر بیٹھ گیا۔ غور کے سلطان انتقال کر گئے۔ محمد خوارزم شاہ نے قوت حاصل کر لی اور امام ناصر کی مخالفت شروع کر دی۔ اس نحوست کا وبال اُس پر بھی نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے چنگیز خان ملعون کو بھیجا، خوارزم کی سلطنت کا تختہ الٹ گیا۔ حضرت ناصر لدین اللہ نے بغاوت کے ننگ سے نجات پائی۔ اُس کی خلافت ۶۳۲ھ تک رہی۔ یعنی یہ خلیفہ اڑتالیس سال تخت نشین رہا۔ کسی دوسرے خلیفہ نے اس سے زیادہ دیر تک حکومت نہیں کی۔

قاضی منہاج سراج نے اپنے والد مولانا سراج الدین محمد کا اپنی تالیف ''طبقات ناصری'' میں متعدد بار بڑے ادب و احترام سے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اپنے والد کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ابن الخطیب دوسری مرتبہ فیروز کوہ آیا۔ جمعہ کے دن اُس نے خطبہ پڑھا۔ خطبے میں یہ الفاظ سلطان غیاث الدین محمد سام کی موجودگی میں کہے: ''یا ایھاالغیاث! المستغاث، المستغاث من الکش الطاغی الباغی'' جب ابن الخطیب واپس گیا تو راقم الحروف کے والد مولانا سراج منہاج نے علاقہ مکران میں ایک ہنگامہ میں وفات پائی۔''

اعجوبۃ الزمان مولانا سراج الدین محمد نے ۵۹۱ھ یا ۵۹۲ھ میں وفات پائی۔

منہاج سراج جوزجانی

مولانا منہاج الدین سراج جوز جانی المعروف بہ قاضی منہاج سراج کا شمار ساتویں صدی ہجری کے معروف وممتاز ارباب علم و دانش اور اسلامی ہند کے اولین مؤرخین میں ہوتا ہے۔ ان کا نام عثمان، لقب منہاج الدین اور کنیت ابوعمرو تھی۔نسب یوں ہے ابوعمرو منہاج الدین عثمان بن میں مولانا سراج الدین محمد بن مولانا منہاج الدین عثمان بن مولانا ابراہیم بن مولانا عبدالخالق جوز جانیؒ ان کے مورث اعلیٰ مولانا عبدالخالق جوز جانیؒ سلطان ابراہیم غزنوی (متوفی ۴۲۹ھ) کے داماد تھے۔ مولانا عبدالخالق کے ہاں شہزادی کے بطن سے ابراہیم پیدا ہوئے۔ جو مولانا منہاج الدین سراج کے دادا مولانا منہاج الدین عثمان کے والد تھے۔ مولانا منہاج الدین عثمان کے بیٹے مولانا سراج الدین محمد تھے اور ان کے بیٹے مولانا منہاج سراج تھے جن کا نام ان کے دادا منہاج الدین عثمان کے نام پر رکھا گیا تھا لیکن وہ تاریخ میں قاضی منہاج سراج کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد مولانا سراج الدین محمد اور دادا مولانا منہاج الدین عثمان دونوں نامور عالم دین تھے اور عوام و خواص میں ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جبکہ ان کے مورث اعلیٰ مولانا عبدالخالقؒ کی شادی سلطان ابراہیم غزنوی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یہ شادی مولانا موصوف کے علم و تقوی میں درجہ امتیاز کے باعث ہی ہوئی۔ اس طرح مولانا منہاج سراج عالم ابن عالم، ابن عالم اور رئیس ابن رئیس ابن رئیس تھے۔

مولانا منہاج سراج کی والدہ سلطان غیاث الدین محمد کی بیٹی شہزادی ماہ ملک کی دودھ شریک بہن تھیں اور ان کے ماموں قاضی جلال الدین مجد الملک احمد بن عثمان تھے جو تاتاریوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ گویا کہ قاضی منہاج سراج کے دادا کی طرح

ان کے دادا کا نام بھی عثمان ہی تھا اور خود ان کا اپنا نام بھی عثمان تھا۔ منہاج سراج کی خوش بختی تھی کہ دودھیال اور ننھیال دنوں جانب سے ان کا تعلق ممتاز اور صاحب ثروت علمی خاندانوں سے تھا۔ ان کی پرورش غوریوں کے مرکزی مقام فیروز کوہ کے شاہی محل میں ہوئی وہیں ان کی تعلیم و تربیت کا بھی خاص انتظام کیا گیا ان کے اساتذہ میں ان کے والد مولانا سراج الدین محمد کے علاوہ فیروز کوہ کے نامور علماء بھی شامل تھے۔ ان کے ایک استاد امام علی غزنوی بھی تھے۔ منہاج سراج کا سلسلہ تعلیم جاری تھا کہ خوارزم شاہیوں نے غوریوں کے اقتدار کا خاتمہ کردیا۔ پھر خوارزم شاہیوں پر تاتاری غارت گر عذاب الٰہی بن کر نازل ہوئے۔ نتیجتاً ترکستان، خراسان، ایران اور عراق سمیت پوری دنیائے اسلام تباہ و برباد ہوکر رہ گئی۔ تاتاری حملوں کے دوران مولانا منہاج الدین سراج نے سفارت کے فرائض انجام دیئے اور ۶۱۷ھ (۱۲۲۰ء) میں تولک میں توطن اختیار کرلیا۔ اسی زمانے میں تاتاریوں نے تولک کا محاصرہ کرلیا جو آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ اہل تولک نے تاتاریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ منہاج سراج نے بھی اپنی جوانمردی کے خوب جوہر دکھائے۔

۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) میں قاضی منہاج سراج کی شادی ہوئی۔ یہ افراتفری کا دور تھا۔ تاتاری حملوں کے باعث تجارتی قافلوں کی آمد و رفت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ منہاج سراج کو تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بحالی کے لئے مختلف شہروں اور مختلف حکمرانوں کے پاس بھیجا گیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے متعدد سفر کئے۔ اس نوعیت کا پہلا سفر منہاج سراج نے ملک تاج الدین حسن خرپوست کی ہدایت پر کیا اور وہ تولک سے اسفزار ہوتے ہوئے قہستان کے شہر قائن پہنچے۔ قہستان اسی علاقے کا نام ہے جہاں قلعہ الموت واقع تھا اور جہاں حسن بن صباح نے اپنی باطنی سلطنت قائم کی تھی۔ منہاج سراج دوسری بار خیسار کے حاکم ملک رکن الدین محمد عثمان مرغنی کے ایماء پر قہستان گئے اور وہاں کے باطنی حاکم محتشم شہاب الدین منصور ابوالفتح سے دوسری بار ملاقات کی۔ منہاج سراج ایسا انتظام کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ تجارتی قافلے معمول کے مطابق آنے جانے لگے۔ سیاسی نوعیت کے اس سفر کے دوران بھی منہاج سراج نے متعدد اہم شہروں میں قیام کیا اور ملک رکن الدین عثمان کی نمائندگی کرتے ہوئے ملک تاج الدین نیالتگین حاکم سیستان کے درمیان ایک معاہدہ بھی طے کیا۔

تاتاری لشکروں کی یلغار برابر جاری تھی جس کے باعث دنیائے اسلام بالخصوص خراسان کے حالات بہت ابتر ہو چکے تھے اور عوام و خواص اپنی عزت اور جان بچانے کے لئے ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ منہاج سراج نے بھی ۶۲۳ھ (۱۲۲۶ء) میں اہل و عیال سمیت ہندوستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ مصارف سفر کے لئے وہ ابریشم خرید نے کے لئے سیستان گئے۔ ان دنوں میں حاکم سیستان نیالتگین نے قہستان کے باطنی حاکم محتشم شمس الدین کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ منہاج سراج سیستان آئے ہوئے ہیں تو اس نے انہیں قہستان کی سفارت پر بھیج دیا۔ منہاج سراج نیالتگین اور باطنیوں کے مابین صلح کا معاہدہ طے کر کے واپس آئے تو نیالتگین نے کہا کہ ہمیں یہ صلح منظور نہیں ہے۔ اس نے منہاج سراج سے کہا کہ وہ دوبارہ قہستان جائیں۔ ادھر حالات مقتضی تھے کہ جلد از جلد وطن کو خیر باد کہہ کر ہندوستان پہنچا جائے ادھر نیالتگین کا اصرار تھا کہ دوبارہ قہستان جاؤ۔ منہاج سراج نے نیالتگین کو انکار کردیا جس پر انہیں صفہد کے قلعہ میں قید کردیا گیا۔ قید کا یہ زمانہ بہت تلخ و تکلیف دہ تھا۔ منہاج سراج نے قید خانہ میں ایک دردناک قصیدہ لکھا۔ قصہ مختصر ملک رکن الدین حاکم رخسار کی سفارش پر منہاج سراج کو رہائی نصیب ہوئی اور وہ اپنے خاندان سمیت ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) کے اوائل میں غزنی سے ہوتے ہوئے براستہ درہ گومل سرزمین ھند میں داخل ہوئے اور دریائے سندھ میں بذریعہ کشتی سفر کرتے ہوئے پہلے مٹھن کوٹ اور پھر پنجند نہ ہوتے ہوئے ۲۶ جمادی الاول ۶۲۴ھ (۱۴ مئی ۱۲۲۷ء) کو بروز سہ شنبہ اوچ کے مقام پر پہنچ گئے۔ اس زمانے میں ناصر الدین قباچہ اوچ کا حاکم تھا اور اس نے سلطان التمش کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا تھا۔ بہرحال قباچہ نے منہاج سراج کو ان کے علمی مرتبہ و مقام کے پیش نظر مدرسہ فیروزی کا منتظم اور اپنے بیٹے اور سپہ سالار علاء الدین بہرام شاہ کے لشکر کا قاضی مقرر کردیا۔ اگلے برس ۶۲۵ھ میں شمس الدین التمش شاہی لشکر کے ساتھ اوچ پہنچا تو قباچہ نے راہ فرار اختیار کی۔ اوچ سے واپسی پر سلطان التمش منہاج سراج کو اپنے ساتھ دہلی لے آیا۔

سلطان التمش نے ۶۲۹ھ میں قلعہ گوالیار کا محاصرہ کیا جو کم و بیش ایک سال تک جاری رہا اس دوران منہاج سراج لشکر میں شاہی قیام گاہ کے سامنے وعظ دیتے رہے۔ انہوں نے بڑی عید کے موقع پر عید کا خطبہ بھی دیا اور نماز عید کی امامت بھی کی۔ بالآخر

۲۹ صفر ۶۳۰ھ (۱۲ دسمبر ۱۲۳۲ء) کو قلعہ فتح ہو گیا تو منہاج سراج کو قضا، خطابت، امامت اور احتساب کے مناصب ملے جن پر وہ چھ سال تک گوالیار میں فائز رہے۔ بعد ازاں رضیہ سلطان نے انہیں درسگاہ ناصریہ کا ناظم اعلیٰ بنادیا۔ یہ عالی شان درسگاہ التمش نے اپنے بڑے بیٹے ناصر الدین محمود کی یاد میں تعمیر کرائی تھی۔ گوالیار کا منصب قضاء بھی مولانا کے پاس رہا۔ رضیہ سلطان کی معزولی کے بعد معزالدین بہرام شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے ۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) میں مولانا منہاج سراج کو سلطنت ہند کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ قاضی منہاج سراج کا یہ عروج و کمال حاسدوں پر گراں گزرا اور انہوں نے غنڈوں سے ہندوستان کے قاضی القضاۃ پر حملہ کرادیا۔ خوش قسمتی سے وہ زندہ سلامت بچ گئے لیکن حالات کو مخدوش دیکھ کر منصب قضا سے نہ صرف مستعفی ہو گئے بلکہ ۶۴۰ھ (۱۲۴۲ء) میں دارالسلطنت دہلی سے لکھنوتی منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے دو برس تک قیام کیا۔ اس دوران بدایوں کے حاکم تاج الدین قتلق اور اودھ کے حاکم قمر الدین قیران نے ان کے شایاں شان ان کی خاطر مدارات اور خدمت کی۔

قاضی منہاج سراج علاء الدین مسعود شاہ کے عہد میں ۱۴ صفر ۶۴۳ھ (۱۱ جولائی ۱۲۴۵ء) کو دہلی واپس آئے تو انہیں دوبارہ درس گاہ ناصریہ کا ناظم اعلیٰ بنانے کے علاوہ اوقاف کی تولیت اور گوالیار کا منصب قضاء سونپا گیا۔ جامع مسجد میں وعظ دینے کا اہم شرعی منصب بھی ان کے حصے میں آیا۔ قاضی منہاج سراج کو ان مناصب پر فائز ہوئے پانچ ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ تاتاریوں نے اوچ پر حملہ کردیا اور سلطان علاؤ الدین ان کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ تاتاریوں کو شاہی لشکر کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ محاصرہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس مہم میں قاضی منہاج سراج بھی شاہی لشکر میں موجود تھے۔ چند برس بعد ۶۴۹ھ (۱۲۵۱ء) میں خان اعظم الغ بیگ بلبن کے ایماء پر منہاج سراج دوسری مرتبہ سلطنت ہند کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے لیکن دو برس بعد بلبن کو معزول کر کے اس کی جاگیر پر بھی قبضہ کرلیا گیا تو قاضی منہاج سراج کو بھی اپنا منصب چھوڑنا پڑا۔ چھ ماہ بعد حالات نے پلٹا کھایا اور بلبن کی قسمت کا ستارہ چمکا تو قاضی منہاج سراج کو صدر جہاں کا خطاب ملا اور انہیں تیسری مرتبہ قاضی القضاۃ کے منصب جلیلہ پر متمکن کردیا گیا اس دور میں قاضی منہاج سراج کو بے پناہ اثر و رسوخ حاصل ہوا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی یادگار تصنیف "طبقات ناصری" لکھی جو تاج المآثر اور چچ نامہ سے قطع نظر ہندوستان

کے حالات پر تاریخ کی پہلی کتاب ہے۔ ''طبقات ناصری'' تیس طبقات یا تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک جزو کا عنوان علیحدہ ہے۔ مثلاً پہلے طبقہ یا پہلی جلد کا عنوان ''انبیاء کرام علیہم السلام''، دوسرا طبقہ ''خلفائے راشدینؓ اور عشرہ مبشرہؓ''، تیسرا طبقہ ''بنی امیہ''، چوتھا طبقہ ''بنی عباس''، پانچواں طبقہ ''شاہانِ عجم ظہور اسلام سے پیشتر'' وغیرہ وغیرہ۔ یہ کتاب معلومات کا خزانہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کو اسے مکمل کرنے اور اس پر نظر ثانی کرنے کی مہلت نہیں ملی اور انہوں نے اسے یکا یک شوال ۶۸۵ھ (ستمبر ۱۲۶۰ء) میں ختم کر دیا اور اس کے بعد وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے۔

آقائے حبیبی قندھاری نے طبقات ناصری کو پہلی بار شائع کیا اور اس کی ترتیب و تحشیہ میں نہایت محنت اور عرق ریزی سے کام لیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کو اردو میں منتقل کیا اور سید حسام الدین راشدی نے اردو ترجمہ پر نظر ثانی کی۔ مولانا مہر نے اس کتاب پر نقد و جرح کے بعد لکھا ہے کہ ''طبقات ناصری کے بعض حصے بہت بیش بہا ہیں۔ تاریخ مبارک شاہی کے مترجم اور مقدمہ نگار ڈاکٹر آفتاب اصغر نے طبقات ناصری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ہیئت کے اعتبار سے عمومی تاریخ ہے۔ اسلامی ہند کی تاریخ کے نقطہ نظر سے اس کے خاندان غزنوی (۳۵۱-۵۸۲ھ) خاندان غوری (۵۴۳-۶۱۲ھ) اور خاندان غلاماں (۶۰۲-۶۸۹ھ) سے متعلق حصے نہایت اہم ہیں۔ یہ تاریخ سلطان ناصر الدین محمود دوم (۶۴۴-۶۶۴ھ) کے پندرھویں سال سلطنت (۶۵۸ھ) کے حالات و واقعات پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا اسلوب نگارش اپنی ہم عصر تاریخ، جہانکشائے جوینی (۵۸-۶۵۷ھ) اور بعض دوسری قریب العصر تواریخ مثلاً تاریخ یمینی (۳-۶۰۶) اور راحت الصدور (۵۹۹ھ) کے برعکس سادہ و سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا پختہ اور استوار ہے اور اس اعتبار سے وہ (یعنی منہاج سراج ابوالفضل) محمد بیہقی مؤلف تاریخ مسعودی یا تاریخ آل سبکتگین (۴۵۱ھ) اور ابو سعید عبدالحئی مؤلف ''زین الاخبار'' یا تاریخ گردیزی (۴۴۰ھ) کا پیروکار ہے۔''

مولانا سید عبدالحئی ''نزہۃ الخواطر'' میں لکھتے ہیں کہ شیخ منہاج ابن سراج قاضی عثمان نے متعدد کتابیں لکھیں۔ تاریخ میں ان کی کتاب ''طبقات ناصری'' ہے۔ ناصری نامہ منظوم در جنگ ہائے ناصر الدین محمود ابن التمش ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء) میں لکھا۔ ناصری نامہ کے بارے میں قاضی منہاج سراج ''طبقات ناصری'' میں رقمطراز ہیں'' قنوج کے

علاقے میں ایک مستحکم مقام تھا جس کا قلعہ بہت مضبوط تھا۔ اسے تلندہ کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی حیثیت سد سکندری کی سی ہے۔ ہندوؤں کا ایک گروہ اس مقام پر قلعہ بند ہوکر بیٹھ گیا اور ان تمام لوگوں نے جان سے ہاتھ دھولئے۔ اسی روز لشکر اسلام نے بادشاہ کے ہم رکاب ہوکر وہاں جنگ کی، یہاں تک کہ تمام سرکش جہنم رسید ہوئے اور وہ مقام فتح ہوگیا اور اس جہاد کے حالات کو دعا گوئے دولت (یعنی منہاج سراج) نے نظم کر دیا تھا۔ اس سفر میں جو حالات پیش آئے، سنت کے مطابق اور قاعدے کی پابندی میں لوٹ مار، سرکش کافروں سے جنگ، قلعہ پر قبضہ، الغ خان معظم کی شاندار فتح دلکی وملکی کا قتل اور اسیری، غرض سب کچھ اس نظم میں بیان کردیا گیا۔ سلطان کے نام پر اس کا نام ''ناصری نامہ'' رکھا گیا۔ اس کے صلے میں سلطان معظم نے میرے لئے مستقل سالانہ عطیہ منظور فرمایا۔ خان معظم الغ خان اعظم نے ہانسی کے علاقے میں ایک گاؤں میرے لئے مقرر کردیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو بادشاہی کے تخت اور جہانبانی کی مسند پر قائم و استوار رکھے۔ آمین'' ناصری نامہ اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے قاضی منہاج سراج کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے کہ آپ فقہ واصول، سیرت و تاریخ اور شعر گوئی میں باکمال، اخلاق و آداب میں مستودہ، متواضع، فیاض اور پیش کردہ مقدمات میں دقیق النظر تھے۔''

مولانا منہاج سراج اپنے عزیز و اقارب کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کی ایک ہمشیرہ خراسان میں تھی جس کے حالات انتہائی ابتر تھے۔ مولانا نے الغ خان بلبن کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے اپنے بااعتماد آدمیوں کے ذریعے بہت سا ساز و سامان اور غلہ خراسان بھیجنے کا انتظام کیا۔ سامان کے اس کاروان کے ساتھ مولانا ملتان تک خود تشریف لے گئے۔ اس واقعہ سے ان کے قلبی احساسات و جذبات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے فوائد الفواد ملفوظات خواجہ نظام الدین بدایونی کے حوالے سے لکھا ہے کہ دہلی کے زمانہ ورود میں حضرت سلطان الاولیاء نے ملاقات کی۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مولانا منہاج سراج سماع سے گہرا شغف رکھتے تھے اور دوران سماع وجد میں آجاتے تھے ان کی یہ کیفیت دہلی کے زمانہ قیام میں اس وقت بھی تھی جب وہ منصب قضاء پر فائز تھے۔

حضرت سلطان المشائخ نے مولانا منہاج سراج کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ ان کے مواعظ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے، سلطان المشائخ نے اپنے بارے میں فرمایا کہ میں ان کی مجلس میں شریک ہوا کرتا تھا اور وہ یہ شعر اکثر اپنی زبان سے ادا کرتے تھے۔

لب بر لب لعل دلبراں خوش کردن
و آهنگ سر زلف مشوش کردن
امروز خوش است لیک فرد است زباں
خود را چوں نے طعمہ آتش کردن

سلطان المشائخ نے فرمایا کہ جب میں نے مولانا منہاج سراج کی زبان سے پہلی مرتبہ یہ شعر سنا تو مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔

جلال الدین تبریزی

شیخ جلال الدین تبریزی کا شمار ساتویں صدی ہجری کے اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ وہ ظاہری و باطنی علوم کے فاضل اجل اور ماہر کامل تھے۔ مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے اُن کے فضل وکمال اور اُن کی دینی و تبلیغی خدمات کا شان دار الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ قریب العہد تذکرہ نگار مولانا جمالی نے اپنی یادگار تالیف ''سیر العارفین'' میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

''ابوالقاسم شیخ جلال الدین تبریزی عظیم القدر شیخ طریقت اور مشیخت ومعرفت کے آسمان تھے۔ حضرت شیخ المشائخ بدرالدین ابو سعید تبریزی کے مرید تھے ــــ شیخ جلال الدین ظاہری و باطنی علوم میں لہریں مارتے ہوئے دریا تھے۔ تمام عالی مرتبت مشائخ مشیخت ومعرفت میں اُن کے قائل تھے۔ کشف وکرامات میں ان کو بے مثل سمجھا جاتا تھا۔ ترک وتجرید میں اُن کی کوئی حد نہیں تھی اور توحید وتفرید میں کوئی انتہا نہ تھی۔ جذب خواطر میں وہ مستثنیٰ اور ممتاز تھے۔ حضرت سلطان المشائخ بدرالدین ابو سعید تبریزی کی وفات کے بعد کہ جو اُن کے مرشد تھے وہ تبریز سے بغداد پہنچے۔ سات سال تک حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کی صحبت میں رہے۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں لکھا ہے:

''شیخ جلال الدین تبریزی کا شمار کامل شیوخ میں سے تھا۔ حسینی

امیر حسن سجزی نے ''فوائد الفواد'' میں حضرت سلطان المشائخ کی زبانی لکھا ہے کہ جب شیخ جلال الدین تبریزی بدایوں میں تھے اور ایک گھر کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص چھاچھ کا منکا سر پر لیے پاس سے گزرا۔ اُس شخص کا تعلق قریبی گاؤں کے ڈاکوؤں سے تھا لیکن شیخ کی نورانی صورت دیکھ کر وہ بڑا متاثر ہوا۔ دل میں کہنے لگا کہ ''ہیں، مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں'' (نیز در رُوے شیخ دید بگفت کہ در دین محمدؐ ایں چنیں مرداں ہم مے باشند) چنانچہ وہ شیخ کے ہاتھ پر ایمان لایا اور علی اُس کا اسلامی نام رکھا گیا۔ جب شیخ بدایوں سے لکھنوتی جانے لگے تو وہ بھی پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ لیکن شیخ نے اسے فرمایا کہ ''اس شہر کی ہدایت تمہارے ذمہ ہے، تم یہیں رہو۔''

''فوائد الفواد'' ہی میں ہے کہ بدایوں ہی میں شیخ جلاالدین نے مولانا علاء الدین اصولی کو جو بعد میں سلطان المشائخ کے استاد ہوئے اور اُس وقت خود ایک طفلِ مکتب تھے اپنا لباس عطا فرمایا۔

مولانا جمالی نے ''سیر العارفین'' میں لکھا ہے:

> ''جب شیخ جلال الدین بنگالہ پہنچے تو وہاں مخلوقِ خدا جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مرید ہوئی۔ حضرت نے اس جگہ ایک خانقاہ تعمیر کی اور کئی باغ اور بہت سی زمین خرید کر لنگر کے لیے وقف کی۔ اس جگہ کو بندر دیوہ محل کہتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا تالاب تھا جس کے قریب ایک ہندو راجے نے بے حد روپیہ خرچ کر کے ایک بت خانہ تعمیر کیا تھا۔ حضرت نے اس جگہ بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا اور بت خانے کو اپنی جائے قیام بنایا۔ اب آپ کا مزار اسی جگہ ہے اور اس مندر کی نصف آمدنی آپ کے لنگر کے لیے وقف ہے۔''

شیخ جلال الدین تبریزی سے بہت سی کشف و کرامات منسوب ہیں۔ حضرت خواجہ گیسودراز کے حوالے سے ''جوامع الکلم'' میں ہمیں یہ روایت ملتی ہے کہ حضرت شیخ پر بھوت پریت کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب دیوہ محل آئے تو ایک کمہار یا ایک مالن کے ہاں قیام کیا۔ دیکھا کہ اس کے گھر میں آہ و شیون کا طوفان برپا ہے۔ پوچھا تو پتا چلا کہ اُن کے شہر میں ایک رسم یہ تھی کہ راجا کے حکم کے مطابق ہر روز ایک نوجوان دیو کے

خاندان کے مشائخ کی کتابوں میں آپ کے حالات و مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ شیخ جلال الدین، شیخ ابو سعید تبریزی کے مریدوں میں سے تھے۔ آپ اپنے شیخ کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں چلے گئے۔''

شیخ جلال الدین تبریزی کا ذکر آتے ہی تاریخ کے طالب علم کا ذہن بنگال میں اشاعت اسلام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ''بنگال میں اشاعت اسلام'' کے عنوان کے تحت شیخ محمد اکرام اپنی یادگار تالیف ''آب کوثر'' میں لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے جو بزرگ شمالی ہندوستان کے راستے بنگال تشریف لے گئے۔ شیخ جلال الدین تبریزی تھے۔ آپ ایرانی النسل تھے۔ پہلے شیخ ابو سعید تبریزی کے مرید ہوئے اور ان کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردی سے فیض حاصل کیا۔ آپ نے اپنے مرشد کی اس طرح خدمت کی کہ شاید ہی کسی مرید نے اپنے پیر کی کی ہو۔ شیخ شہاب الدین ہر سال حج کے لیے جاتے تھے اور چونکہ اب وہ بہت بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ اس لیے گرم اور زود ہضم غذا کے سوا کچھ کھا نہ سکتے تھے۔ شیخ جلال الدین اپنے سر پر ایک انگیٹھی اور دیگچی اٹھائے رکھتے تھے تا کہ جس وقت مرشد طلب کرے، اسے گرم کھانا دے سکیں۔''

شیخ الشیوخ شہاب الدین سہرودی کے مرید خاص اور خلیفہ بہاء الدین زکریا نے ۱۸ روز میں خرقۂ خلافت حاصل کر کے برصغیر میں واپسی کا قصد کیا تو اُن کے پیر بھائی شیخ جلال الدین تبریزی بھی اُن کے ساتھ ہو لیے، (اس کا بیان بھی ہوگا)۔ شیخ جلال الدین دہلی تشریف لائے تو یہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے اُن کی دوستانہ ملاقاتیں رہیں لیکن دہلی کا شیخ الاسلام نجم الدین صغرا آپ کا سخت مخالف ہو گیا اور آپ کے خلاف الزام تراشیوں پر اُتر آیا۔ اس ضمن میں ایک مجلس کا انعقاد ہوا جس نے شیخ نجم الدین کو معزول کر کے ان کی جگہ شیخ بہاء الدین زکریا کو شیخ الاسلام مقرر کیا۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ مولانا جمالی کی ''سیر العارفین''۔) دہلی کو خیر باد کہہ کر شیخ جلال الدین بدایوں ہوتے ہوئے بنگال پہنچے جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ سے بڑے کام لیے۔

سامنے بھیجا جاتا اور وہ اسے کھالیتا ـــــ اُس روز شیخ کے میزبان کے بیٹے کی باری تھی۔ شیخ نے کہا کہ اپنے بیٹے کو نہ بھیجو، مجھے بھیجو۔ لیکن وہ نہ مانا کہ اگر دیو نے تمھیں قبول نہ کیا تو راجا مجھے قتل کرا دے گا ـــــ چنانچہ اُس نے اپنے بیٹے کو نہلایا دھلایا، نئے کپڑے پہنائے اور اسے بت خانے میں لے گیا۔ شیخ بھی ساتھ تھے۔ بت خانے میں پہنچ کر شیخ نے نوجوان کو تو رخصت کر دیا اور خود دیو کا انتظار کرنے لگے۔ جب دیو اپنے معمول کے مطابق ظاہر ہوا تو شیخ نے اسے اپنے عصا کی ضرب سے ہلاک کر دیا۔ صبح کو راجا اپنے لشکریوں کے ساتھ بت کی پرستش کو آیا۔ دیکھا کہ اُس بت خانے میں ایک آدمی سیاہ کپڑے اور سیاہ ٹوپی پہنے کھڑا ہے اور لوگوں کو بلا رہا ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران تھے، راجا خود آگے بڑھا۔ شیخ نے کہا کہ تم بغیر کسی ہراس کے آگے آؤ، دیو کو میں نے ہلاک کر دیا ہے۔ لوگوں نے دیکھا واقعی ایسا ہی تھا۔ چنانچہ شیخ کی یہ کرامت دیکھ کر سب لوگ ایمان لائے اور مسلمان ہو گئے۔

''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' کے مؤلف مولانا عبدالمجید سالک نے شیخ جلال الدین تبریزی کے احوال بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

> ''بنگال میں جو بزرگ تبلیغ اسلام کی غرض سے پہنچے وہ شیخ جلال الدین تبریزی ہیں۔ آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے خواجہ تاش تھے۔ شیخ جلال الدین اپنے پیر بھائی سے ملنے کے لیے ملتان آئے۔ کچھ مدت یہاں رہنے کے بعد دہلی پہنچے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ پھر بدایوں ہوتے ہوئے بنگال میں پہنچ گئے۔ یہاں آپ نے تبلیغ و اشاعت کا کام نہایت کامیابی سے انجام دیا اور بے شمار ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔''

بنگال میں تبلیغ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ہنٹر اور بعض دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ بنگال میں شہروں کی بجائے دیہات میں اسلام کو بڑی کامیابی ہوئی کیونکہ غریب ماہی گیروں، شکاریوں اور ادنیٰ کاشت کاروں کے لیے اسلام کی روحانیت اور مساوات بہت بڑی رحمت تھی۔ وہ اسلام میں داخل ہوتے ہی چھوت چھات اور ذات پات کی ذلت وخواری سے نجات پا گئے اور اخوت اسلامی کی برکتوں سے بہرہ وَر ہونے

لگے۔

مبلغ اسلام شیخ الشیوخ حضرت جلال الدین تبریزی کے سن وفات میں اختلاف رائے ہے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبارالاخیار'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے ۶۲۳ھ میں وفات پائی۔ جب کہ مولانا جمالی کی ''سیر العارفین'' کے مطابق انہوں نے ۶۴۲ھ میں وفات پائی، شیخ جلال الدین تبریزی کا یہی سنِ وفات ''آئین اکبری'' اور ''خزینۃ الاصفیاء'' میں بھی ہے۔

جلال الدین کاشانی (اوّل)

قاضی جلال الدین کاشانی شمسی سلاطین کے عہد کے جید علماء اور نامور امراء میں سے تھے۔ شروع میں اودھ کے قاضی تھے۔ درویش منش اور عدل گستر سلطان شمس الدین التمش کے دو بیٹوں یعنی سلطان معزالدین بہرام شاہ اور سلطان ناصرالدین محمود کے دورِ حکومت میں سلطنت دہلی میں قاضیِ ممالک کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ منصب قضاء کے علاوہ انہوں نے بحیثیت سفیر اور صدر جہاں کے بھی فرائض انجام دیئے۔ قاضی جلال الدین کاشانی کے مرتبہ و مقام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سلطان ناصرالدین محمود ایسے متدین و متقی اور پرہیزگار بادشاہ نے مولانا منہاج سراج کے علاوہ جن دوسرے علماء سے تعلقات رکھے ان میں قاضی جلال الدین کاشانی بھی شامل تھے۔ سلطان التمش کی وفات کے بعد محلاّتی سازشیں عام تھیں اور امرائے چہل گانی کے اقتدار و اختیار کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ جلال الدین کاشانی پر بھی سازشوں میں ملوث ہونے کے الزامات عائد ہوئے اور انہیں قاضی ممالک کے عہدے سے معزول بھی کیا گیا۔ لیکن پھر بعض دوسری اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں اور بالآخر دوبارہ قاضیِ ممالک مقرر کر دیا گیا۔ اس لئے معاصر مؤرخین کی کتب تاریخ سے یہ امر واضح نہیں ہوتا کہ وہ بادشاہوں کے خلاف سازشوں میں کس حد تک ملوث تھے؟ یا یہ کہ ملوث تھے بھی یا نہیں؟ پھر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ قاضی جلال الدین کاشانی نام کی دو شخصیات ہیں جس سے صورتِ حال اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

معاصر مؤرّخ قاضی منہاج سراج نے ''طبقاتِ ناصری'' میں قاضی جلال الدین کاشانی کا ذکر سلطان معزالدین بہرام شمسی (۶۳۷ تا ۶۳۹ھ) اور سلطان علاء الدین مسعود شمسی ۶۳۹ تا ۶۴۴ھ) کے احوال بیان کرتے ہوئے کیا ہے جبکہ مؤرخ ضیاء الدین

برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' میں اسی نام کے ایک قاضی کا تذکرہ سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۶۸۹ تا ۶۹۵ھ) کے احوال کے تحت ایک بزرگ سیدی مولہ کے قتل کے حوالے سے کیا ہے۔ ہر دو مؤرخین نے ان قاضیوں کے حالات اس طرح سے بیان کئے ہیں جن سے نہ تو ان کے حسب نسب اور خاندان کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کاشانی ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کے ساتھ اور کیا رشتہ یا تعلق تھا؟ البتہ قریب العہد تذکرہ نگار سید امیر خورد کرمانی نے اپنی تالیف ''سیر الاولیاء'' میں ایک بزرگ قاضی محی الدین کاشانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''عالمِ ربانی، قاضی محی الدین کاشانی، جو علم و حلم، زہد و تقویٰ کے لحاظ سے سلطان المشائخ کے اعلیٰ مریدوں میں مشہور تھے، یہ بزرگ ایک صاحبِ علم و فضل خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قاضی قطب الدین کاشانی کے نواسے تھے اور شہر بھر کے استاد تھے۔ ان فضائل کے باجود انہوں نے سلطان المشائخ کی مریدی کی سعادت کو بھی حاصل کیا تھا... سلطان علاء الدین نے حکم دیا کہ اودھ کی قضاءت جو قاضی محی الدین کی موروثی ہے، انعامات اور بہت سے دیہات کے ساتھ ان کے سپرد کی جائے... قاضی محی الدین کاشانی نے سلطان المشائخ کی زندگی ہی میں وفات پائی۔''

''سیر الاولیاء'' کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی محی الدین کاشانی کا کوئی نہ کوئی رشتہ قاضی جلال الدین کاشانی سے ضرور ہو گا۔ اس لئے ہر دو حضرات کے اسماء کے ساتھ قاضی کا سابقہ اور کاشانی کا لاحقہ لگا ہوا ہے اور ان دونوں کا تعلق اودھ سے ہے۔ قاضی منہاج سراج نے جن قاضی جلال الدین کاشانی کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق اودھ سے تھا۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے بھی ''بزمِ صوفیہ'' میں طبقاتِ ناصری کے حوالے سے یہی لکھا ہے کہ ''... قاضی جلال الدین کاشانی کا ذکر خاص طور پر کئے جانے کے لائق ہے، وہ دہلی کے قاضی تھے۔ لیکن بہرام شاہ نے ۶۳۹ھ میں انہیں معزول کر دیا۔ اس کے بعد وہ اودھ چلے گئے جہاں عہدۂ قضاۃ کی خدمت انجام دیتے رہے۔ بہرام شاہ کے بعد علاء الدین مسعود تخت پر بیٹھا تو اس نے قاضی جلال الدین کاشانی کو اودھ سے بلا کر لکھنوتی سفارت پر بھیجا۔ وہ سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں صدر جہاں تھے اور اپنی

وفات ۶۴۸ھ تک یہی خدمت انجام دیتے رہے۔ جیسا کہ ''طبقاتِ ناصری'' میں مرقوم ہے:

''سلطان رضیہ کو تبرہندہ (بھٹنڈہ) میں قید کر کے امراء اور ملوک نے ۲۷ رمضان ۶۳۷ھ کو معز الدین کو تخت پر بٹھا دیا اور اس کے لئے بیعت لی گئی۔ ملک اختیار الدین کو نائب یعنی وزیر اعظم بنایا گیا جس نے ملک مہذب الدین نظام الملک سے ساز باز کر کے تمام امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سلطان معز الدین کی بہن جس نے قاضی نصیر الدین کے بیٹے سے طلاق لے لی تھی، نکاح کر لیا۔ ساتھ ہی اپنے ہاں تین مرتبہ نوبت بجانے کا حکم دے دیا اور ایک ہاتھی اپنے مکان کے دروازے پر مقرر کر دیا اور امراء کے نام احکام جاری کرنے لگا۔ ملک اختیار الدین کے اس اقتدار کو سلطان کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ اس کے دو ترک سپاہیوں نے فدائین کی صورت میں خنجر سے وار کر کے ملک اختیار کا کام تمام کر دیا۔ نظام الملک مہذب الدین گو زخمی ہوا مگر اس کی جان بچ گئی اور وہ حسب دستور وزارتی امور انجام دینے لگا۔ اسی دوران سلطان رضیہ نے التونیہ کے ساتھ دہلی کا رخ کیا مگر شکست کھائی اور دونوں ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اب بدر الدین صنقر نے پر پرزے نکالے اور سلطان کی اجازت کے بغیر احکام جاری کرنے شروع کئے۔ وہ وزیر نظام الملک مہذب الدین سے زیادہ اختیارات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وزیر نظام الملک نے ایسی تدابیر کیں کہ سلطان کو بدر الدین صنقر سے متنفر کر دیا جس پر سلطان معز الدین کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ۱۷ صفر ۶۳۹ھ کو صنقر نے تمام صدروں اور امراء کی مجلس کا صدر الملک کی قیام گاہ پر اہتمام کیا جس میں قاضی ممالک جلال الدین کاشانی، قاضی کبیر الدین، شیخ محمد شامی وغیرہ موجود تھے۔ صدر الملک کو وزیر نظام الملک کو بلوانے کے لئے بھیجا گیا تاکہ معاملہ بالاتفاق طے پا جائے لیکن نظام الملک نے کسی نہ کسی طرح سلطان کو اس منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ سلطان معز الدین اسی وقت وہاں پہنچ گیا جہاں یہ مجلس منعقد ہو رہی تھی۔ بدر الدین صنقر پینترا بدل کر سلطان کے ساتھ ہو گیا۔ سلطان نے اسے بدایوں کی جاگیر دے کر وہاں بھیج دیا۔ قاضی جلال الدین کاشانی کو منصبِ قضاء سے الگ کر دیا۔ قاضی کبیر الدین اور شیخ محمد شامی وغیرہ خوفزدہ ہو کر شہر سے چلے گئے۔ چار ماہ بعد بدر الدین صنقر دہلی واپس آ گیا لیکن سلطان کے حکم سے قید کر دیا گیا۔ تاج الدین مولوی کو بھی قید کیا گیا۔ بعد ازاں

دونوں کو ہلاک کر ڈالا گیا جس سے سب امراء سلطان سے خوفزدہ ہو گئے۔''

یہ بیان تو معاصر مؤرخ منہاج سراج کا ہے۔ لیکن مؤرخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ چند مہینوں کے بعد جب بدرالدین بدایوں سے واپس آیا تو معزالدین نے اسے اور تاج الدین موسیٰ کو قتل کر دیا اور قاضی جلال الدین کاشانی اور قاضی مارہرہ کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلوا دیا۔ جس کی وجہ سے عوام میں سخت ہراس پھیل گیا اور سارا لشکر بادشاہ سے ناراض ہو گیا۔ قاضی منہاج سراج نے سلطان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

''سلطان معزالدین بہرام شاہ بڑا زبردست، بے باک، بہادر اور خونریز سلطان تھا۔ ساتھ ہی چند پسندیدہ اوصاف اور عمدہ اخلاق سے بھی آراستہ تھا۔ حد درجہ سادگی پسند اور ہر قسم کے تکلفات سے بالکل پاک تھا۔ جواہرات یا زیب و زینت کی کوئی چیز نہیں پہنتا تھا۔ حتیٰ کہ کمر بند، یا ریشمی رومال یا علَم یا آرائش و نمائش کی کوئی چیز استعمال نہیں کرتا تھا۔ لیکن یہ سادگی پسند اور بہادر سلطان بھی زیادہ دیر تک حکومت نہ کر سکا۔ ۸ ذیقعدہ ۶۳۹ھ کو وزیر نظام الملک اور قطب الملک نے پایہ تخت دہلی پر قبضہ کر لیا اور سلطان کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ بعد ازاں اُسے قتل کر دیا... سلطان التمش کے دوسرے تین بیٹوں یعنی ناصرالدین محمود، ملک جلال اور علاء الدین کو قصرِ سفید جہاں وہ مقید تھے، سے نکال کر قصر فیروز میں منتقل کیا گیا جو بادشاہ کے رہنے کا محل تھا۔ سب امراء اور ملوک نے متفقہ طور پر علاء الدین کو تخت پر بٹھایا۔ ملک قطب الدین حسنی سلطان کا نائب مقرر ہوا اور وزارت حسب سابق خواجہ نظام الملک ہی کے پاس رہی۔ یہ اور اس قسم کی دیگر تبدیلیوں کا ذکر کرنے کے بعد قاضی منہاج نے لکھا ہے کہ اس تبدیلی کے چوتھے روز وہ (یعنی قاضی منہاج) قضاء سے مستعفی ہو گئے اور چھبیس روز بعد عماد الدین محمد کو قاضی بنایا گیا۔ خواجہ نظام الملک کو سلطنت کے امور پر مکمل غلبہ حاصل ہو گیا اور ترک امراء کے اختیارات ختم ہو گئے، جس کے نتیجے میں ترک امراء نے حوض رانی کے میدان میں خواجہ نظام الملک مہذب الدین کو قتل کر دیا۔ اگلے برس عزالدین طغان جب کڑہ سے لکھنوتی کے لئے روانہ ہوا تو اس نے شرف الدین اشعری کو سلطان علاء الدین کی خدمت میں دہلی بھیج دیا تو سلطان نے دہلی سے قاضی جلال الدین کاشانی قاضیِ اودھ کو خلعت اور سرخ چتر کے ساتھ لکھنوتی بھیجا۔ ''سیر الاولیاء'' کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے کہ قاضی محی الدین کاشانی کا تعلق اودھ سے تھا۔ ''سیر الاولیاء'' ہی کے حاشیہ پر ''خزینۃ الاصفیاء'' کے حوالے

سے قاضی صاحب کا نام ونسب اور تعارف یوں درج کیا گیا ہے۔

''قاضی محی الدین کاشانی بن جلال الدین بن قطب الدین اکابر علماء میں سے تھے۔ انہوں نے شیخ شمس الدین قوشجی اور دہلی کے دوسرے علماء سے تعلیم پائی۔ قاضی صاحب نے ۷۱۹ھ میں وفات پائی۔''

مولانا سید عبدالحئی حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ''طبقات ناصری'' کے حوالے سے قاضی جلال الدین کاشانی کے بارے میں وہی حالات واقعات اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں جن کو ہم نے قدرے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالحئی لکھتے ہیں: ''قاضی جلال الدین کاشانی دارالسلطنت دہلی میں قاضیِ ممالک کے منصب پر فائز تھے۔ ۶۳۹ھ۔ ۱۲۳۹ء میں سلطان معزالدین بہرام شاہ نے انہیں اس تہمت میں ملوث کیا کہ وہ سلطان کو تخت سے اتارنے کے درپے ہیں۔ یہ سن کر قاضیِ ممالک دہلی سے اودھ چلے گئے۔ یہاں جب علاء الدین مسعود شاہ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو انہوں نے ۶۴۱ھ۔ ۱۲۴۳ء میں امیر طغان کی طرف سے سفیر مقرر کر کے بھجوایا۔ امیر ممدوح اس وقفہ میں لکھنوتی کے نواحی مواضع میں علاء الدین کے نائب تھے اور دوبارہ ۶۴۷ھ۔ ۱۲۴۹ء در عہد سلطان ناصرالدین التمش قاضیِ ممالک مقرر کر دیئے گئے۔ مرحلت ان کی جمعہ کے روز ماہ ذی قعدہ ۶۴۸ھ۔ ۱۲۵۰ء میں ہوئی۔ قاضی جلال الدین کاشانی (اول) مولانا منہاج سراج شیخ عماد الدین شقورقانی، قاضی شمس الدین بہرائچی، مولانا قطب الدین اور شیخ الاسلام حضرت جمال الدین بسطامی کے ہم عصر، ہم سرو ہم چشم تھے۔

سلطان علاء الدین کی حکومت کو ابھی چار سال بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ کھیل تماشے اور عیش وعشرت کی طرف مائل اور اپنے ہی امراء اور عہدے داروں کو ہلاک کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں امراء اور ملوک نے اسے ۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو قید کر لیا اور اس نے اپنے بھائی سلطان معزالدین کی طرح قید ہی میں انتقال کیا۔ سلطان التمش کا انتقال ۲۰ شعبان ۶۳۳۔ ۲۹ اپریل ۱۲۳۳ء کو ہوا تھا اور ۲۳ محرم ۶۴۴ھ۔ ۱۰ جون ۱۲۴۵ء کو علاء الدین مسعود کی حکومت ختم ہوئی۔ گویا دس سال اور پانچ مہینے میں سلطان کے خاندان کا بڑا حصہ حصولِ اقتدار کی کشمکش ہی میں موت کے گھاٹ اتر گیا اور کسی کو طبعی موت نصیب نہ ہوئی۔ البتہ شمسی (شمس الدین التمش) خاندان کے آخری حکمران یعنی ناصرالدین محمود نے ۶۴۴ سے لے کر ۶۶۴ھ تک بیس سال کی حکمرانی کے بعد عام حالات میں وفات

پائی۔ اور اس کا بڑا سبب یقینی طور پر یہ تھا کہ اس کا نائب السلطنت الغ خان بلبن تمام اختیارات کا کلی مالک تھا اور اس نے نہ کسی سازش کو کامیاب ہونے دیا اور نہ کسی فتنے کو ابھرنے دیا۔ ۲۰ جمادی الآخر ۶۴۷ھ کو الغ خان اعظم بلبن کی بیٹی ملکہ جہاں کا نکاح سلطان معظم ناصر الدنیا والدین سے ہوا۔ اسی سال ۱۰ رجب کو قاضی جلال الدین کاشانی اودھ سے آئے اور انہیں قاضی ممالک بنا دیا گیا۔

سلطان ناصر الدین محمود ایسے نیک و پارسا زاہد و متقی اور رعایا پرور عدل گستر حکمران کے تحت قاضی ممالک بننا بہت بڑا اعزاز تھا۔ الغ خان بلبن رعب داب اور دبدبہ رکھنے والے نائب السلطنت کی موجودگی میں اور اس پُر آشوب دور میں امارت اور قضاۃ یقیناً جان جوکھوں کا کام تھا۔ بہرحال قاضی جلال الدین کاشانی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں قاضی ممالک کے منصبِ اعلیٰ پر فائز ہوئے اور انہوں نے الغ خان بلبن کی نیابت کے زمانے میں فرائضِ قضاۃ انجام دیئے۔

قاضی جلال الدین کاشانی کے یہ سب حالات معاصر مؤرخ اور ہم عصر امیر اور قاضی منہاج سراج کی تالیف ''طبقاتِ ناصری'' سے لئے گئے ہیں۔ قاضی منہاج سراج نے قاضی جلال الدین کاشانی کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا ہے اور ان کی وفات پر لکھا ہے کہ اللہ ان پر رحم کرے۔

قاضی جلال الدین کاشانی نے اپنے ہم عصر مؤرّخ قاضی منہاج سراج کے بیان کے مطابق ۱۷ ذی قعدہ ۶۴۸ھ بمطابق ۱۶ جنوری ۱۲۵۴ء کو وفات پائی۔

بہاء الدین زکریا ملتانی

شیخ الاسلام ابو محمد بہاء الدین زکریا ملتانی قرشی اسدی کا شمار چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کی اہم ترین اسلامی شخصیات میں ہوتا ہے۔ جامع العلوم بہاؤالدین زکریا نامور محدث، عالی مرتبت فقیہ، جلیل القدر مجتہد، بے مثال مصلح اور عظیم مبلغ اسلام تھے۔ ان کی شخصی وجاہت اور علمی جلالت وعظمت کا اندازہ اس تاریخی حقیقت سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف قرونِ وسطیٰ کی سیاسیات پر اثر انداز ہوئے بلکہ انہوں نے جنوبی ایشیا کے مستقبل کی صورت گری میں اہم کردار ادا کیا۔

شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی کا ایک شان دار اور تاریخ ساز دینی وتبلیغی کارنامہ یہ ہے کہ وہ تصوف کی اُس انقلابی روایت کو اپنے ساتھ برصغیر میں لائے جس کے بانی مبانی سیدالاولیاء حضرت غوث الاعظمؒ تھے۔ جو شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین عمر سہروردی بانی سلسلہ سہروردیہ کے استاد اور روحانی راہنما بھی تھے۔ شیخ بہاء الدین زکریا نے تصوف کی اس انقلابی روایت کو برصغیر میں وسعت وفروغ دینے میں اہم اور بنیادی کردار ادا کیا۔

مفتی غلام سرور لاہوری کی تالیف ''حدیقۃ الاولیاء'' کے مطابق سلسلہ سہروردیہ کا آغاز سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی سے ہوا۔ ان سے حضرت ممشاد علو دینوری نے فیض پایا، اُن سے شیخ علی رودباری نے، اُن سے شیخ احمد اسود دینوری نے، ان سے شیخ ابوعبداللہ خفیف نے، ان سے شیخ ابوالقاسم گورگانی نے، ان سے شیخ ابوبکر نساخ نے، ان سے شیخ احمد غزالی (برادر حجۃ الاسلام امام محمد غزالی) نے، اُن سے شیخ ضیاء الدین ابونجیب سہروردی نے، اُن سے شیخ وجیہ الدین سہروردی نے، ان سے شیخ شہاب الدین عمر

سہروردی نے فیض پایا، اور ان سے شیخ بہاء الدین زکریا فیض یاب ہوئے۔

ابونجیب ضیاء الدین سہروردی اپنے مریدان باصفا کو ساتھ لے کر سیدنا غوث الاعظمؒ کی مجلس وعظ میں باقاعدگی کے ساتھ باوضو شامل ہوا کرتے تھے اور اپنے ساتھ اپنے بھتیجے حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کو بھی لے جایا کرتے تھے۔ شیخ شہاب الدین نے بچپن ہی میں علم الکلام پر بہت ساری کتب پر عبور حاصل کر لیا تھا اور اُن کا ذہنی رجحان فلسفہ و منطق کی طرف ہو گیا تھا۔ چنانچہ شیخ ضیاء الدین ابونجیب سہروردی نے انہیں سیدنا غوث الاعظم کے حضور پیش کیا اور عرض کی کہ ''میرا بھتیجا علم الکلام کا ماہر ہو گیا ہے۔ اس کی جانب توجہ فرمائیں۔'' آپ نے شہاب الدین عمر سہروردی سے دریافت کیا کہ ''تم نے علم الکلام کی کون کون سی کتب پڑھی ہیں؟'' اُنہوں نے چند کتابوں کے نام لیے۔ جس پر حضرت غوث الاعظم نے ان کے سینے پر اپنا دستِ مبارک پھیرا اور پوچھا کہ ''اب بتاؤ کہ کون کون سی کتاب پڑھی ہے؟'' اُنہوں نے عرض کیا کہ ''سب کچھ بھول گیا ہوں۔'' چنانچہ فلسفہ و منطق کی بجائے فیض غوثیہ کی دولتِ بے پناہ سے مالا مال ہوئے جو آپ کے توسط سے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے قلب میں کچھ اس طرح منتقل ہوا کہ صنم کدۂ ہندوستان کو منور و فروزاں کرنے کا باعث بن گیا۔

بہاء الدین زکریا ۲۷ رمضان المبارک ۵۶۶ھ کو کوٹ کروڑ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کوٹ کروڑ میں اپنے والد شیخ وجیہ الدین محمد غوث سے حاصل کی اور مولانا نصیر الدین بلخی کے سامنے بھی زانوئے تلمذتہ کیا۔ اور ساتوں قرأتوں کے ساتھ قرآن حکیم حفظ کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے اسلامی علوم وفنون کے مراکز کا رخ کیا اور پندرہ سال تک مسلسل بخارا اور خراسان کے مختلف شہروں میں انتہائی ذوق و شوق اور محنت کے ساتھ مصروف تعلیم رہے۔

شیخ بہاء الدین زکریا نے بلخ، بخارا، مدینہ منورہ، اور مکہ مکرمہ کے معروف و ممتاز محدثین اور ائمہ وفقہاء سے حدیث اور فقہ سمیت مروجہ علوم وفنون کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران فریضۂ حج ادا کیا اور پانچ برس تک روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مجاوری کی۔ مدینہ منورہ میں اس زمانے کے مشہور محدث شیخ کمال الدین محمد یمنی سے علم حدیث کی سند لی۔ غرض یہ کہ علوم وفنون کی تحصیل و تکمیل، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے مجاہدات اور مراحل سے گزر کر بیت المقدس پہنچے۔ وہاں انبیائے کرام کے مزارات پر حاضری دی

اور فلسطین کے علماء اور شیوخ سے استفادہ کیا۔ وہاں سے عروس البلاد بغداد میں وارد ہوئے تو اس وقت تک ظاہری علوم میں مہارت تامہ حاصل کر کے درجۂ اجتہاد پر فائز ہو چکے تھے لیکن ابھی باطنی علوم کی تکمیل کا آخری مرحلہ باقی تھا جو انہوں نے شیخ بغداد حضرت شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردی کی خدمت میں صرف سترہ روز حاضر رہ کر طے کر لیا جس سے ان کے روحانی مرتبہ و مقام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شیخ الاسلام بہاء الدین ابو محمد زکریا ملتانی قرشی اسدی کا تعارف کراتے ہوئے مولانا عبدالحق محدث دہلوی ''اخبارالاخیار'' میں لکھتے ہیں کہ ''آپ شیخ المشائخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے۔ آپ کا شمار برصغیر کے اکابر اولیاء میں ہوتا ہے۔ ظاہری کمالات، بلند مراتب اور اعلیٰ برکات و فیوض سے آراستہ تھے۔ امیر حسینی سادات اور شیخ عراقی آپ کی خدمت میں رہے اور آپ کی تربیت سے فیض پایا۔''

شیخ شہاب الدین سہروردی نے بہاء الدین زکریا کو خرقۂ خلافت پہناتے وقت ہدایت فرمائی تھی کہ ملتان جا کر مسند ارشاد قائم کریں، دینی علوم و فنون کو فروغ دیں، لوگوں کی اصلاح و تربیت اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ منظم اور موثر طریقے سے ادا کریں۔ چنانچہ انہوں نے وطن واپس آکر اپنے مرشد طریقت کے حکم کے مطابق ملتان میں مسند وعظ و ارشاد قائم کرنے کے لئے ایک عظیم الشان خانقاہ اور مدرسہ عربیہ بہائیہ کے نام سے ایک بہت بڑی درس گاہ تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے متعدد رفاہی ادارے جن میں ایک بڑا لنگر خانہ، اپاہج گھر، شفاخانے ہسپتال اور ہوسٹل تعمیر کرائے۔

حضرت شیخ بہاء الدین جب صاحب کمالات و برکات ہو کر ملتان تشریف لائے تو اکابرین ملتان میں کچھ حسد ظاہر ہوا اور بطور کنایہ آپ کی خدمت میں دودھ سے لبالب بھرا ہوا ایک پیالہ بھیجا۔ مطلب یہ تھا کہ اس شہر میں مزید کسی کی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت شیخ نے اس اشارے کا مطلب سمجھ کر دودھ کے پیالے پر ایک پھول رکھ کر واپس فرما دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہمارا مقام اس شہر میں اس طرح رہے گا جس طرح دودھ پر یہ پھول رکھا ہوا ہے۔ اکابرین ملتان اس حسنِ ادا پر حیران رہ گئے اور آپ کی کرامات کے مطیع و معترف ہو گئے۔

سید سلیمان ندوی نے اپنے تحقیقی مضمون ''ہندوستان میں علم حدیث'' کے آخری

حصہ میں ''استدراک و اضافہ'' کے زیر عنوان شیخ معین الدین بیجاپوری کے ''تذکرۃ الاولیاء''، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ''اخبار الاخیار'' اور ''تاریخ فرشتہ'' کے حوالوں سے لکھا ہے

''مضمون کے پہلے حصے میں ایک نہایت اہم شخصیت نظر انداز ہوگئی اور وہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں جن سے ہندوستان میں سلسلہ سہروردیہ کا آغاز ہوا ہے۔ ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے۔ بارہ برس کے ہوئے تو علم کی تحصیل کے لئے خراسان اور بخارا کا سفر کیا۔ پندرہ برس کے سن میں علوم ظاہری کی تکمیل کی اور درس و افادہ کی مجلس گرم کی، پھر جذبہ شوق نے حرمین کی طرف کھینچا اور عراق ہوکر مکہ معظمہ گئے، حج ادا کیا۔ پھر مدینہ منورہ جاکر شیخ کمال الدین محمد محدث یمنی سے حدیث کا درس لیا اور مدت مدید تک مدینہ منورہ میں حدیث کا درس و شغل جاری رکھا۔ یہاں سے بیت المقدس ہوکر بغداد پہنچے۔ اس وقت بغداد میں مدرسہ نظامیہ زندہ تھا اور شیخ شہاب الدین سہروردی جو اسی مدرسہ کے فاضل تھے اور ان کے عم محترم شیخ ابو نجیب عبدالقادر سہروردی دو برس تک ۵۴۵ھ سے ۵۴۷ھ تک اس کے مدرس اعلیٰ رہ چکے تھے اور شیخ شہاب الدین نے اپنے چچا سے کسب کمال کیا تھا۔ شیخ بہاء الدین زکریا جب بغداد پہنچے ہیں تو شیخ ابو نجیب سہرورد یؒ کا ۵۶۳ھ میں وصال ہو چکا تھا۔ اُن کی جگہ پر شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت کی اور ان کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوئے اور ظاہر و باطن سے آراستہ ہوکر ہندوستان واپس آئے اور ملتان میں سکونت اختیار کی۔ یہ وہ وقت تھا جب سلطان قطب الدین ایبک کی حکومت تھی۔ سلطان قطب الدین نے ملتان اور اوچ ناصرالدین قباچہ کو اور دہلی کا تخت شمس الدین التمش کو سپرد کیا تھا۔ قطب الدین کی وفات کے بعد ناصرالدین قباچہ نے شریعت کی ترویج اور احکام دین کے احیاء میں نہایت سستی اور بے پروائی برتی تو شیخ الاسلام نے بے محابا سلطان التمش کو اس کی اطلاع دی اور جب ناصرالدین قباچہ نے باز پرس کی تو

فرمایا 'میں نے جو کچھ کیا خدا کے حکم سے کیا، تم سے جو کچھ ہو سکے
وہ کر گزرو؛ یہ کلمہ حق سن کر ناصر الدین کانپ گیا۔"

سید سلیمان ندوی پر کیا موقوف، تمام علمائے ندوہ کی یہ عادت ہے کہ وہ صوفیہ کرام کی دینی و علمی بالخصوص حدیثی و فقہی خدمات اور اُن کے تبلیغی و اصلاحی کارناموں کو چھپانے کی ہر ممکن سعی و کوشش کرتے ہیں اور جب صوفیہ کرام کے احوال و آثار کو پیش اور بیان کرتے ہیں تو اُن کا قلم رک رک جاتا ہے۔ اسی ایک مثال کو لے لیجیے کہ سید صاحب نے "ہندوستان میں علم حدیث" کے موضوع پر جو تحقیقی مضمون لکھا اُس میں انہوں نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اور اُن جیسے عظیم المرتبت محدثین کو محض اس لیے نظر انداز کر دیا کہ اُن کا تعلق تصوف سے ہے، نیز یہ کہ وہ عارف باللہ ہیں، حالانکہ اربابِ تصوف کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے محدث اور فقیہ ہوں، پھر صوفی۔ لیکن معترضین کے جواب میں سید سلیمان ندوی نے شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ایسی جلیل القدر شخصیت کے بارے میں محض دو تین کتب تاریخ و تذکرہ کے مختصر حوالے دینے پر اکتفا کیا ہے اور اپنی جانب سے کچھ کہنے سے حسبِ معمول دانستہ گریز کیا ہے۔

مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا سے ایک زیادتی یہ کی ہے کہ انہوں نے حضرت شیخ کو نہ صرف ایک ماہر موسیقی قرار دیا ہے بلکہ اُن کے بارے میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ انہوں نے بعض راگ ایجاد کیے۔ چنانچہ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد سوم (فارسی ادب: اوّل) کے مقالہ نگار عبد المجید یزدانی اور اسی تاریخ کی جلد اوّل (مقدمہ) کے مقالہ نگار ڈاکٹر جمیل جالبی نے "راگ و دین" مولفہ فقیر اللہ سیف خان بحوالہ "تمدنی جلوے" مرتبہ صباح الدین عبد الرحمٰن، لکھا ہے کہ "حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے دھناسری، ٹوری اور مالسری کو مخلوط کر کے ملتانی دھناسری ایجاد کی۔" جو ظاہر ہے کہ ایک لغو اور بے بنیاد دعویٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملتانی دھناسری کے موجد ماہرِ موسیقی بہاء الدین ملتانی ایک دیگر شخص ہیں۔

شیخ بہاء الدین زکریا کے قائم کردہ مدرسہ عربیہ بہائیہ کی حیثیت اقامتی یونیورسٹی کی تھی جہاں طلباء کی رہائش اور خوراک کا معقول انتظام تھا۔ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مدرسہ عربیہ بہائیہ ملتان میں قائم ہونے والی پہلی دینی درس گاہ تھی۔ اس درس گاہ میں حدیث، فقہ، تفسیر، تجوید، ترتیل، قرأت، علم الکلام ایسے اسلامی علوم وفنون کی باقاعدہ

تعلیم دی جاتی تھی اور ان علوم کی تعلیم و تدریس کے لئے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی بانی مدرسہ عربیہ بہائیہ نے اپنے زمانے کے معروف و ممتاز اساتذہ و مشائخ کو منتخب کیا تھا۔ جن میں شیخ جلال الدین سرخ بخاری، شیخ امیر حسینی سادات، شیخ محمد ابراہیم فخر الدین عراقی، مولانا نورالدین ایسے یگانۂ روزگار علماء و فضلاء اور اکابر مشائخ شامل تھے۔ علاوہ ازیں بانی مدرسہ اور برعظیم میں سلسلۂ عالیہ سہروردیہ کے موسس اعلیٰ شیخ بہاء الدین زکریا جو بذات خود جامع العلوم تھے اور ان کے بڑے بیٹے شیخ صدر الدین عارف جو ایک تبحر عالم دین، محدث، فقیہ و مفسر قرآن تھے، مدرسہ کے انتظامی فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ طلباء کو درس بھی دیا کرتے تھے۔

مدرسہ عربیہ بہائیہ میں طلباء کو اسلامی علوم و فنون کی تعلیم دینے کے علاوہ مختلف پیشوں کی تربیت دے کر انہیں ہنرمند اور کاریگر بنایا جاتا تھا تاکہ وہ فارغ التحصیل ہو کر صرف عالم، فاضل، محدث، فقیہ، قاری اور حافظ ہی نہ بنیں بلکہ جس پیشے کی مدرسہ سے تربیت حاصل کی ہے اس کو اختیار کر کے رزقِ حلال کما سکیں اور باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ اس اعتبار سے مدرسہ عربیہ بہائیہ ایک دینی اور علمی درس گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ تربیتی ادارہ بھی تھا۔ شیخ بہاء الدین زکریا چونکہ صاحب ثروت بزرگ تھے اس لئے وہ طلباء اور اپنے مریدوں کی خاطر خواہ مالی امداد بھی کیا کرتے تھے تاکہ وہ کوئی کاروبار کر کے اپنی گزر اوقات کر سکیں۔

شیخ بہاء الدین زکریا طلباء کو مدرسہ میں تعلیم دیتے تھے اور اپنے مریدوں کی تعلیم و تربیت خانقاہ معلٰی میں کرتے تھے۔ لیکن طلبا اور مریدین کو تعلیم دیتے وقت اس امر کو بطور خاص ملحوظ خاطر رکھتے تھے کہ ان میں سے کون ایسی صلاحیتوں کا حامل ہے پر خاص توجہ دے کر مبلغ اسلام بنایا جائے۔ چنانچہ اس طرح ہر سال مبلغین اسلام کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو جاتی تھی۔ مبلغین کی اس جماعت کو شیخ بہاء الدین زکریا تجارتی مال دے کر مختلف اطراف واکناف کی طرف روانہ کر دیتے تھے تاکہ وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام کر سکیں۔

''سلسلۃ الذہب'' میں شیخ نور بخش کا یہ قول مرقوم ہے کہ بہاء الدین زکریا ملتانی بلاد ہند میں رئیس الاولیاء تھے۔ علوم ظاہری کے ماہر تھے اور باطن کے کشف و مشاہدہ میں صاحب مقام۔ یہ ایک ایسے عظیم مرشد تھے جن سے اولیاء کے کئی سلسلے چلے۔ کفر سے

. ایمان کی طرف ، گناہ سے اطاعت کی طرف اور نفسانیت سے روحانیت کی جانب! شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی انتہائی پرکشش شخصیت کے مالک تھے اور چونکہ عارف باللہ تھے اس لئے اپنی فہم و فراست، تبحر علمی اور وجدانی قوت کی مدد سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیتے تھے۔ چنانچہ دینی علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھنے اور اپنے روحانی کمالات کی بدولت وہ نہ صرف برعظیم پاکستان و ہند میں مشہور و مقبول تھے بلکہ ان کے علم و فضل اور دینی و تبلیغی خدمات کا چرچا وسط ایشیا کے ممالک سمیت دنیائے اسلام کے متعدد ملکوں شہروں اور علاقوں میں عام تھا۔ پھر قابل ذکر امر یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے اسلامی ممالک کا نہ صرف سفر کیا تھا بلکہ اسلامی علوم کے مراکز میں برسوں ان کا قیام بھی رہا تھا۔ مدینہ منورہ میں وہ پانچ سال تک رہ چکے تھے۔ اسی طرح بخارا میں بھی وہ پانچ برس تک مقیم رہے تھے۔ اور اہل بخارا انہیں ''بہاء الدین فرشتہ'' کہا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور عالم اسلام کے دینی اور علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بنابریں ان کی خانقاہ معلٰی تعلیمی اور رفاہی اداروں بالخصوص مدرسہ عربیہ بہائیہ کی شہرت بھی بہت جلد عام ہوگئی اور تشنگانِ علم اور طالبانِ حق دور و نزدیک کے ملکوں سے جوق در جوق ملتان آنے لگے۔ تشنگان علم مدرسہ عربیہ بہائیہ سے سیراب ہوئے اور طالبان حق کو خانقاہ معلٰی سے گوہر مقصود ملا۔ ان کے فیض یافتہ مریدین اور علماء کا سلسلہ وسط ایشیا تک پھیلا ہوا تھا۔

شیخ بہاء الدین سہروردی فیاضی و سخاوت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ناصر الدین قباچہ کی گورنری کے دور میں ملتان میں قحط پڑ گیا تو قباچہ نے شیخ سے غلہ اور اجناس بطور قرض طلب کیں۔ شیخ نے سینکڑوں بوریاں گندم اور اجناس کی بھجوا دیں۔ ان میں تین بوریاں اشرفیوں کی بھی چلی گئیں جو قباچہ نے یہ کہہ کر واپس کردیں کہ یہ غلطی سے آ گئی ہیں۔ لیکن شیخ نے ان بوریوں کو اس پیغام کے ساتھ دوبارہ قباچہ کو بھجوادیا کہ ''ہمیں معلوم تھا کہ ان بوریوں میں کیا ہے۔ یہ بوریاں اور غلے کی سب بوریاں قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لئے ہماری طرف سے ہدیہ ہے۔''

۶۴۴ھ بمطابق ۱۲۴۶ء میں منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کرلیا اور ہرات کا حکمران بھی ان کے ساتھ مل گیا تو شیخ بہاء الدین سہروردی نے حملہ آوروں کو اپنے پاس سے ایک لاکھ دینار دے کر محاصرہ اٹھانے پر آمادہ کرلیا اور اہل ملتان کی جان مال بچایا۔

شیخ بہاء الدین سہروردی کو اللہ تعالیٰ نے جہاں علم و فضل اور فیاضی و سخاوت میں بے مثل پیدا کیا تھا وہاں جرات و بہادری کے جوہر بھی عطا کئے تھے۔ ناصر الدین قباچہ نے جب سلطان شمس الدین التمش کے خلاف بغاوت کی تو وہ قباچہ سے بے خوف و خطر ٹکرا گئے۔ قاضی شہر نے بھی قباچہ کی مخالفت کی تھی جسے اس جرم کی پاداش میں قتل کر دیا گیا لیکن قباچہ حضرتِ شیخ کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

شیخ بہاء الدین سہروردی احکام شریعت کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور بدعات کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ کسی کو اپنے سامنے جھکنے نہیں دیتے تھے۔ سماع کے بھی قائل نہ تھے۔

شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی علوم و فنون کی وسعت و فروغ اور مسلمانوں کی فوز و فلاح کے باب میں شان دار اور ناقابل فراموش کردار ادا کیا ان کے دینی تبلیغی اور علمی کارنامے سنہری حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کی تصانیف میں سے صرف ایک کتاب ''الاوراد'' دستیاب ہے جو عربی زبان میں ہے۔ یہ کتاب صدیوں تک صلحاء و فقراء کے معمولات میں شامل رہی ہے۔ آپ کے بعض اقوال و افکار اور وصایا مختلف کتابوں میں مذکور ہیں۔ حضرت شیخ نے اپنے مریدوں کے لیے جو وصایا اور خطوط لکھے تھے اُن میں سے بعض کو مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں محفوظ کر لیا ہے۔

سید محمد اولاد علی گیلانی لکھتے ہیں کہ انہیں شیخ زکریا کے تیرہ صفحات پر مشتمل ایک فارسی مخطوطہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں معنی طریقت بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مختصر رسالہ کسی مرید کی التماس پر استخارہ کرنے کے بعد لکھا گیا ہے۔ ایک اقتباس کا یہ ترجمہ ہے:

> ''نماز نیاز سے ہے اور نیاز خشیت سے اور خشیت علم سے اور علم سے مراد ہے جاننا، پس جو شخص کرے اور کہے لیکن جانتا نہ ہو وہ جاہل ہے اور جہل مانع قرب ہے۔''

''مجمع الاخیار'' میں شیخ بہاء الدین زکریا کی نصیحتوں کے باب میں تحریر ہے:

> ''ہر بندہ پر لازم ہے کہ صدق و اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور یہ کیفیت اُس وقت حاصل ہو گی جب عبادت و ذکر میں غیر اللہ کی نفی اور دوسروں کا مٹا دینا ہو۔ اور یہ حالت احوال

کی درستی اور اقوال و افعال میں محاسبہ نفس پر موقوف ہے۔ لہٰذا بغیر ضرورت کے نہ کوئی بات ہو نہ کام، اور ہر قول و فعل سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف التجا و تضرع اور اُسی سے استعانت ہو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اُسے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے۔"

ایک خط میں اپنے مرید کو تحریر فرماتے ہیں:

"کم کھانے سے جسم تندرست رہتا ہے۔ گناہوں کے ترک کر دینے سے روح کو سلامتی ملتی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے دین سلامت رہتا ہے۔"

وفات کے روز اپنے حجرہ میں مشغول عبادت تھے کہ حجرہ کے باہر ایک نورانی چہرہ کے مقدس بزرگ نمودار ہوئے اور حضرت شیخ صدرالدین محمد عارف کے ہاتھ میں ایک سربمہر لفافہ دیا۔ حضرت شیخ صدرالدین خط کا عنوان پڑھ کر متحیر ہوئے، والد بزرگوار کی خدمت میں پیش کر کے باہر آئے تو قاصد کو نہ پایا۔ خط پڑھنے کے ساتھ ہی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور آواز بلند ہوئی:

"دوست بدوست رسید۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ۲۱ دسمبر ۱۲۶۲ء کو واصل بحق ہوئے۔ مزار پُر انوار ملتان میں مرجع خلائق ہے۔

نورالدین محمد عوفی

مولانا نورالدین محمد عوفی ساتویں صدی ہجری کی ہمہ پہلو شخصیات میں سے ہیں۔ وہ مروجہ علوم وفنون کے فاضل تھے۔ علم حدیث اور فقہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی لیکن علم وادب اور تاریخ وتذکرہ کے میدانوں میں اپنی جولانئ طبع دکھائی اور ایک ممتاز ادیب اور قابل قدر مؤرخ کی حیثیت سے شہرتِ دوام پائی۔

مولانا عوفی کا نام محمد اور لقب نورالدین اور دوسرا لقب سدیدالدین ہے۔ عظیم المرتبت صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی اولاد میں ہونے کی نسبت سے عوفی کہلائے حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔ انہیں الامام ابن الامام ابن الامام حجۃ الاسلام اور ظہیر الاسلام والمسلمین، واعظ الملوک والسلاطین، منشی النظم و النثر اور ملک الکلام ایسے شاندار القاب وخطابات سے یاد کیا جاتا تھا۔

مولانا عوفی کے مفصل حالات کتب تاریخ وتذکرہ میں نہیں ملتے البتہ اتنی معلومات ضرور ملتی ہیں کہ عوفی بخارا میں پیدا ہوئے اور اپنی ابتدائی تعلیم وتربیت بھی اپنے آبائی شہر میں حاصل کی اور اس حقیقت سے تو ایک دنیا آگاہ ہے کہ عوفی شعر وادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اُن کی تالیف ''جوامع الحکایات ولوامع الروایات'' فارسی زبان وادب کی نادر اور اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ مزید برآں عوفی کو فارسی شعراء کے اولین تذکرہ نگار ہونے کا شرف واعزاز بھی حاصل ہے۔

مولانا عبدالحئی حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں عوفی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محمد ابن محمد ابن یحییٰ ابن عثمان عوفی، حنفی، بخاری از دودمان حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مہاجر مکی مدنی یکے از عشرہ مبشرہ، مولود و

مسکن شہر بخارا۔"

عوفی کا تذکرہ سب سے پہلے حمد اللہ مستوفی نے اپنی تالیف "تاریخ گزیدہ" میں کیا ہے۔ حمد اللہ مولانا عوفی کے تقریباً ایک سو سال بعد گزرا ہے اور اُس نے اپنی متذکرہ کتاب یعنی "تاریخ گزیدہ" ۷۳۰ھ میں مکمل کی تھی۔

مولانا عوفی کے اساتذہ میں شیخ تاج الدین عمر بخاری، مولانا قطب الدین سرخسی اور مولانا رکن الدین مسعود "امام زادہ" (متوفی ۶۱۷ھ) جیسے معروف علماء شامل ہیں۔ بخارا کے اساتذہ و علماء سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد عوفی مزید تعلیم کے حصول کی خاطر گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے سمرقند، خوارزم، مرو، نیشاپور، ہرات، اسفراز، اسفرائن، شہرِ نور، غزنہ ایسے شہروں میں تعلیم حاصل کی جو اُس زمانے میں علوم و فنون کے اہم مراکز تھے۔ عوفی نے برصغیر پاکستان و ہند میں شہر ملتان، لاہور، گجرات، دکن، نہروالہ اور دہلی کے ممتاز علماء و مشائخ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا جن میں شیخ مجد الدین شرف بن المؤید بغدادی، شیخ شرف الدین محمد بن ابوبکر نسفی، شیخ الاسلام الحارثی اور شیخ الاسلام زکی الدین احمد لاہوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" کی دوسری جلد (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر محمد یوسف کی جو تحریر ہم پیش کرنے جا رہے ہیں، اُس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عوفی نے حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "منقول کی بابت یہ ہے کہ کتاب و سنت اور آثارِ صحابہؓ کے تحقیقی مطالعہ اور اُن سے استنباطِ احکام کا عمل بالآخر فقہ کی تدوین اور مذاہب اربعہ کے استقراء پر ختم ہوا۔ یہ فطری ارتقاء کی ایک شکل تھی جو کم و بیش سارے عالم اسلام میں عام ہوئی۔ اس کے بعد قضاۃ کی صورتوں کے پیش نظر فقہ پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ گو تفسیر و حدیث اور فقہ کے ماخذ کی حیثیت سے کسی نہ کسی حد تک بدستور نصاب کا جزو رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محمد عوفی بھی ثقافت عامہ کے لازمہ کے طور پر حدیث کی سند حاصل کرتے ہیں۔"

"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" کی تیسری جلد (فارسی ادب) کے مقالہ نگار خواجہ عبدالحمید یزدانی نے مولانا عوفی کے سوانح اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جوامع الحکایات کے مصنف سدیدالدین عوفی ہیں جنہوں نے

شعرائے فارسی کا اولین تذکرہ ''لباب الالباب'' کے نام سے تصنیف کیا... کئی سالوں تک مختلف ممالک میں گھومنے پھرنے کے بعد سندھ پہنچے اور ناصرالدین قباچہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ بعد ازاں التمش کے دربار میں بھی رہے۔ عوفی نے ''جوامع الحکایات'' ناصرالدین قباچہ کی فرمائش پر لکھنی شروع کی تھی لیکن قباچہ کی موت کے بعد نظام الملک قوام الدین محمد بن ابی سعید جنیدی کے ایماء پر مکمل ہوئی اس لیے عوفی نے اپنی اس کتاب کو نظام الملک کے نام پر معنون کیا۔ مولانا عوفی نے ''جوامع الحکایات'' کو ۶۳۰ھ کے لگ بھگ مکمل کیا۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد میں پچیس ابواب ہیں۔ پہلی جلد سب سے زیادہ طویل ہے اور کتاب تقریباً نصف حصے پر پھیلی ہوئی ہے ----- عوفی کی ''جوامع الحکایات'' تاریخ کی دیگر کتابوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کی حیثیت ادبی ہے اور اس میں مصنف نے مؤرخانہ اسلوب سے ہٹ کر معلمانہ اور ناصحانہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت حکایات جمع کی گئی ہیں اور تاریخی حالات و واقعات اور سوانح سے متعلق معلومات ضمنی طور پر حکایات بیان کرتے ہوئے شامل ہو گئی ہیں۔''

اردو کے نام وَر شاعر اختر شیرانی نے ''جوامع الحکایات'' کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محمد عوفی کی تالیف ''جوامع الحکایات و لوامع الروایات'' فارسی ادب کی اُن نادر اور اہم کتابوں میں سے ہے جو اپنی افادی حیثیت اور موضوعی خصوصیت کی بناء پر لازوال شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کی حق دار ہے ----- اس کتاب کی تین خصوصیتیں اسے اس قسم کی دوسری ادبی مساعی سے متمیز کرتی ہیں۔ اول یہ کہ حکایتوں کا بیشتر حصہ تاریخی رنگ کا حامل ہے۔ دوسرے یہ کہ موضوعوں کی کثرت اور رنگا رنگی نظر آتی ہے۔ تیسری یہ کہ دوسری

ہم رنگ کتابوں کے مقابلے میں اس کی حکایتوں کی تعداد بہت
زیادہ ہے۔ چنانچہ اس کی چار جلدیں ایک سو ابواب پر منقسم اور
۲۱۱۳ حکایتوں پر مشتمل ہیں۔''

مولانا عوفی کو دیگر مؤرخین پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ پہلے حاکم ملتان ناصر الدین قباچہ کے دربار میں رہے اور پھر اُس پر فتح پانے والے نظام الملک جنیدی اور سلطان شمس الدین التمش کے دربار سے منسلک رہے۔ اس طرح انہیں ان تین اہم تاریخی شخصیات کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ چنانچہ ان سے متعلق جو واقعات ''جوامع الحکایات'' میں بیان کیے گئے ہیں وہ مولانا عوفی کے چشم دید ہیں، جس سے اس کتاب کی تاریخی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر قابل ذکر امر یہ ہے کہ مولانا عوفی برصغیر پاکستان و ہند میں ایک طویل عرصے تک مقیم رہے۔ وہ یہاں کے حالات و واقعات سے بخوبی واقف تھے۔ مزید برآں انہوں نے جو حکایات بھی بیان کی ہیں اُن کے بارے میں اچھی طرح تحقیق اور جانچ پڑتال کی ہے۔

مولانا عوفی کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''جوامع الحکایات'' کو مرتب کرنے سے پہلے ''تاریخ یمینی،'' ''تاریخ ناصری،'' ''تاریخ ملوک عجم،'' ''تاریخ العباس،'' ''مجمع الامثال،'' ''آئین الاخبار،'' ''شرف النبی،'' ''خلق الانسان،'' ''فوائد قطبی،'' اور ''مفتاح الحج'' ایسی متعدد کتب تاریخ و تذکرہ کا بغور مطالعہ کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان اہم کتابوں کے تقابلی مطالعہ سے مولانا عوفی کے اندازِ فکر میں وسعت پیدا ہوئی ہو گی اور انہوں نے ان کتابوں سے بھرپور استفادہ بھی کیا ہوگا۔ چنانچہ عوفی ایسے ایسے واقعات رقم کرتے ہیں جو دلچسپ ہونے کے علاوہ اس زمانے کی عظیم شخصیات اور مشاہیر کے خصائل اور عادات و اطوار پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ ''جوامع الحکایات'' کے مطالعہ سے عوفی کے اپنے دور کے علاوہ قرون وسطیٰ کے اسلامی دور کی شخصیات کے مرتبہ و مقام، ان کے مزاج و کردار، عادات و خصائل کے علاوہ ان کے فضل و کمال حتیٰ کہ ان کی نفسیات تک سے آگاہ ہونے میں بڑی مدد ملتی ہے، جو اپنی جگہ پر مولانا عوفی کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔

مولانا عوفی نے اپنی کتاب ''جوامع الحکایات ولوامع الروایات'' میں اپنے عہد کے امراء و سلاطین کے علاوہ غزنوی اور غوری سلاطین کے متعلق بعض ایسی حکایتیں بیان کی

ہیں جن سے اُن کی انصاف پسندی اور عدل گستری کا ثبوت ملتا ہے۔ محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے بارے میں عوفی نے جو واقعات قلم بند کیے ہیں ان کے آئینہ میں اُس دور کے پورے سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو دیکھا جا سکتا ہے اور اس دور کے عوام و خواص کی اخلاقی و روحانی اقدار و روایات اور ان کے رسم و رواج اور عادات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''جوامع الحکایات'' کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں پہلی اور دوسری صدی ہجری کے وزراء و امراء اور خلفاء کے علاوہ اس عہد کے علماء و فقہاء کے واقعات بھی کثرت سے ملتے ہیں جو تاریخ کی عام کتابوں میں درج نہیں ہیں۔ اس میں عباسی خلفاء ابوجعفر منصور، ہاروں رشید اور مامون رشید کے بارے میں بھی واقعات ملیں گے اور امام ابوحنیفہ، ابراہیم بن ادھم اور ابوبکر شبلی ایسے فقہاء اور صلحاء کے بارے میں بھی بڑے دلچسپ اور نصیحت آموز نکات ملیں گے۔ علاوہ ازیں عوفی نے حجاج بن یوسف کے بعض واقعات تحریر کیے ہیں جس سے حجاج کے مزاج و کردار پر روشنی پڑتی ہیں۔ غرض یہ کہ عوفی کی ''جوامع الحکایات'' کئی اعتبار سے انتہائی اہم اور مفید، دلچسپ اور حکمت آمیز و سبق آموز کتاب ہے۔ فن تاریخ کے ماہرین اور علم و ادب کے ناقدین نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ ''جوامع الحکایات'' برصغیر پاکستان و ہند کی تاریخ کا ایک اہم اور مفید ماخذ ہے اور ہر دور کے مؤرخین اس کتاب سے استفادہ کرتے چلے آئے ہیں۔

مولانا عوفی کا دوسرا بڑا علمی کارنامہ اُن کی مایۂ ناز تالیف ''لباب الالباب'' ہے جو فارسی زبان کے شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے گویا کہ عوفی کو فارسی شعراء کے اولین تذکرہ نگار ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس طرح عوفی کو فارسی ادب کی دونوں اصناف یعنی نثر اور نظم دونوں میں منفرد و ممتاز مقام حاصل ہے۔ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کے ایک اور مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے کتب تاریخ کے اہم حوالوں سے ناصرالدین قباچہ کے حالات میں مولانا عوفی کے احوال بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ سلطان التمش (۶۰۷ تا ۶۳۳ھ) کے دور میں ناصرالدین قباچہ اُچہ میں خود مختار حکمران تھا۔ اُس کا دربار علماء و شعراء کا مامن تھا۔ اس کا وزیر عین الملک بھی مربی علم و ادب تھا۔ محمد عوفی نے ''لباب الالباب'' نامی تذکرہ شعراء اسی سے منسوب کیا۔ اسی تذکرہ میں چار ایسے شعراء کا ذکر ہے جو ناصرالدین قباچہ کے دربار سے وابستہ تھے اور اس کی مدح میں

قصائد کہتے تھے جن میں سید الندماء تاج الفضلاء، فخر القدما محمد الکاتب بلخی، فخر الشعراء ضیاء الدین سجزی اور فضلی بخارائی شامل ہیں۔ چوتھے شاعر کا نام ڈاکٹر ظہور احمد نے کسی وضاحت کے بغیر صرف ''مشبہ'' لکھا ہے۔

گویا کہ عوفی کے ''لباب الالباب'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس تذکرہ میں اُن شاعروں کے حالات بھی درج ہیں جو حاکم ملتان ناصرالدین قباچہ کے دربار سے منسلک رہے۔ عوفی نے اپنے اس تذکرۃ الشعراء کو قباچہ کے وزیر عین الملک سے منسوب کیا جو مربی علم و ادب اور علماء کا قدردان تھا۔ مولانا عوفی نے عربی ادب کی ایک شاہکار تصنیف ''الفرج بعد الشدۃ'' کو فارسی میں منتقل کیا۔ یہ کتاب قاضی علی حسن التنوخی (متوفی ۳۸۴ھ) کی تصنیف ہے۔ اس کا ذکر عوفی نے ''لباب الالباب'' میں کیا ہے۔

مولانا محمد عوفی کا ذکر سید امیر خورد کرمانی کی ''سیر الاولیاء'' اور امیر حسن سجزی کی ''فوائد الفواد'' میں بھی ملتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ ''سیر الاولیاء'' میں چشتی بزرگان دین کے حالات بھی درج ہیں۔ چنانچہ ''فوائد الفواد'' میں لکھا ہے کہ ''قرآن کریم کا ایک نسخہ ایک تنکے میں بھی مل جاتا تھا بلکہ وراق گاہکوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ ایک بار شیخ الشیوخ فریدالدین مسعود گنج شکر کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کو عوفی کی ''جوامع الحکایات'' کے نسخے کی ضرورت پڑی مگر تنگ دستی کی بناء پر اس کتاب کی نقل کا انتظام نہ کر سکے۔ حمید نامی ایک ناقل شیخ نجیب کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے ''جوامع الحکایات'' کی نقل کی فرمائش کی اور اپنی عسرت کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ حمید نے کہا ''حالے چہ موجود داری؟'' شیخ نے کہا ''یک درم۔'' حمید نے اس دام کو غنیمت جانا اور کاغذ خرید کر کتابت میں مشغول ہو گیا۔''

''نورالدین'' یا ''سدیدالدین،'' ان میں سے عوفی کا لقب کیا تھا؟ یا یہ دونوں ہی اُن کے لقب تھے؟ گزشتہ سات آٹھ صدیوں سے نہ صرف یہ کہ علمی حلقوں کا موضوع بحث چلا آ رہا ہے بلکہ اس کی وجہ سے کتابوں کی دنیا میں وقتاً فوقتاً کئی غلط فہمیاں اور مغالطے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں اور کبھی کبھی اس کے مضحکہ خیز نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں اور علمی و تحقیقی کام بھی متاثر ہوا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ بعض مؤرخین کے مطابق عوفی کا لقب ''نورالدین'' ہے اور بعض دوسرے مؤرخین اُن کا لقب

''سدیدالدین'' بیان کرتے چلے آئے ہیں۔

عوفی کے لقب کے بارے میں مؤرخین کا یہ اختلاف کچھ اتنی گھمبیرتا اور پیچیدگی کا سبب نہ بنتا اگر بعد میں آنے والے مؤرخین لقب، خطاب، عرف اور نام کے لکھنے اور ان کے استعمال میں حزم و احتیاط سے کام لیتے۔ یا پھر ایک دفعہ تحقیق کر کے ان کا ایک لقب طے کر لیتے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اگر اُن کے بیک وقت دو لقب تھے تو اُن کو برقرار رکھا جاتا لیکن ہر دو صورتوں میں اُن کا نام علیحدہ رہتا جس پر آج تک کوئی اختلاف نہیں ہوا مگر بعض مؤرخین اور تذکرہ نویسوں کی غفلت و کوتاہی اور بے احتیاطی کی وجہ سے افسوس ناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ افراد و شخصیات کے اسماء و القاب میں فرق و امتیاز نہیں کیا جاتا اور نام کی جگہ لقب اور لقب کی جگہ نام استعمال کر لیتے ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح بیان یہ ہوگا کہ ہمارے اکثر بیشتر مؤرخین اس قدر سستی، غفلت اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ اسماء و القاب کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور نام کی جگہ لقب ہی کو استعمال کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ جب کہ بعض مؤرخین اور تذکرہ نویس ایسے بھی ہیں جو سرے سے یہ جانتے ہی نہیں کہ ہماری زیر تذکرہ شخصیات ہی کے نہیں بلکہ عوام و خواص کے نام کس قسم کے ہوا کرتے تھے اور اُن کے القاب کو نوعیت اور تاریخ کیا ہے۔

مولانا عوفی کے ساتھ شروع ہی سے کچھ ایسا ہی معاملہ رہا کہ اُن کا نام، لقب حتیٰ کہ اُن کی کتاب ''جوامع الحکایات'' کا نام تک بھی اکثر درست نہیں لکھا گیا۔ ضیاء الدین برنی مولف ''تاریخ فیروز شاہی'' مولانا عوفی کی قریب العہد دینی و علمی شخصیت ہیں اور اُن کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسماء و القاب کے فرق اور امتیاز سے پوری طرح واقف تھے اور انہوں نے اپنی قابل قدر تالیف ''تاریخ فیروز شاہی'' کے علاوہ اپنی دوسری کتابوں میں اسماء و القاب کے فرق و امتیاز کو ملحوظ خاطر رکھا ہے لیکن پھر بھی ہم یہی لکھیں گے کہ مولانا عوفی کے بارے میں غالباً پہلا تساہل مؤرخ برنی ہی کے قلم سے سرزد ہوا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا عوفی کو ''صدرالدین عوفی'' مؤلف ''جامع الحکایات'' لکھا ہے۔ یعنی مؤرخ برنی سے ایک غلطی تو یہ سرزد ہوئی کہ انہوں نے ''نورالدین کی جگہ ''صدرالدین'' لکھا جو ان کا نام بھی نہیں اور لقب بھی نہیں۔ دوسرے انہوں نے اُن کی کتاب ''جوامع الحکایات'' کا نام ''جامع الحکایات'' لکھ دیا ہے۔

مؤرخ ضیاء الدین برنی کی تالیف ''تاریخ فیروز شاہی'' جیسا کہ بیان کیا گیا ہے برصغیر پاکستان و ہند کی ایک قابل قدر اور مستند و معتبر تاریخ ہے اور مؤرخ برنی نے اس کو بہت محنت و جانفشانی سے لکھا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں بڑی صاف گوئی اور جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے اور حالات و واقعات قلم بند کرتے وقت مؤرخانہ مہارت و دیانت کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد آنے والے تمام مؤرخین، تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں نے ''تاریخ فیروز شاہی'' کے اندراجات کو قابل اعتماد سمجھا ہے اور ان سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ لیکن برنی بھی ایک انسان تھے اور انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے! اور وہ بھی اُس وقت جب ایک مؤرخ سینکڑوں ہزاروں واقعات کو قلم بند کرنے بیٹھا ہو تو اس سے ایک آدھ غلطی بلکہ اس سے زیادہ اغلاط کا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔ چنانچہ مولانا برنی سے بھی کچھ سہو اور بعض غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے عوفی کے لیے ''نورالدین'' کی جگہ ''صدرالدین اور دوسری غلطی یہ کہ ''جوامع الحکایات'' کی جگہ ''جامع الحکایات'' تحریر کر دیا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مؤرخ برنی نے مولانا عوفی کا تذکرہ ''تاریخ فیروز شاہی'' کے متن میں کہیں نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہ ذکر ''تاریخ فیروز شاہی'' کے دیباچہ میں کیا ہے جس سے کم از کم ایک بات کا تو حتمی طور پر فیصلہ ہو جاتا ہے کہ مولانا عوفی سلطان غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی سے پہلے یا تو وفات پا چکے تھے یا پھر یہ کہ وہ اس دور میں برصغیر پاکستان و ہند میں موجود نہیں تھے۔ اس لیے کہ نامور مؤرخ قاضی منہاج سراج نے ''طبقات ناصری'' جو مسلم انڈیا کی اولین تاریخ ہے، میں سلطان ناصرالدین محمود تک کے حالات قلم بند کیے ہیں اور اپنی اس کتاب کو ناصرالدین کے نام سے منسوب کر کے اس کا نام ''طبقات ناصری'' رکھا ہے۔ مؤرخ برنی کا ایک مؤرخانہ کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے مسلم انڈیا کے حالات و واقعات بیان کرنے کے لیے اپنی کتاب ''تاریخ فیروز شاہی'' کا آغاز ٹھیک اُس دور اور مرحلے سے کیا جس دور اور مرحلے پر قاضی منہاج سراج نے اپنی کتاب ''طبقات ناصری'' کو مکمل کیا تھا۔ اس طرح مؤرخ برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' کو سلطان ناصرالدین محمود کے جانشین سلطان بلبن کے عہد کے حالات و واقعات سے شروع کیا اور اس میں سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد کے

ابتدائی پانچ چھ سالوں کے حالات و واقعات کو رقم کر کے اسے فیروز شاہ تغلق سے منسوب کیا اور اس کا نام ''تاریخ فیروز شاہی'' رکھا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ مؤرخ برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' میں عوفی کا ذکر نہیں کیا جو ایک بڑی ضخیم کتاب ہے اور اس سے یہ امر ظاہر و ثابت ہے کہ عوفی بلبن سے عہد سے پہلے وفات پا چکے تھے یا یہ کہ برصغیر میں موجود نہیں تھے۔ اس طرح مؤرخ برنی نے مولانا عوفی کا ''تاریخ فیروز شاہی'' میں ذکر نہ کر کے اپنے بعد آنے والے مؤرخین کی راہنمائی کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مؤرخ جب کسی کے بارے میں لکھتا ہے تو مفید، اہم اور نادر معلومات فراہم کرتا ہے اور جب کسی کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا اور خاموشی اختیار کرتا ہے تو اس کے سکوت اور خاموشی میں بھی اہم معلومات اور اشارے مضمر ہوتے ہیں۔

مولانا عوفی کے بارے میں مؤرخین اور محققین کا نچوڑ ''جوامع الحکایات'' کے مترجم اختر شیرانی نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ اُن کے مفصل حالات کسی کتاب اور تذکرے میں نہیں ملتے۔ یہاں تک کہ ہم اُن کی ولادت اور وفات کی تاریخ سے قطعی طور پر ناواقف ہیں۔ قدیم تذکروں میں اُن کے حالات کے متعلق ایک دو سطروں سے زیادہ نہیں لکھا گیا۔ البتہ خود مولانا عوفی نے اپنی تالیف میں جگہ جگہ ایسے اشارے ضرور کیے ہیں جن سے اُن کے سوانح پر دھندلی سی روشنی پڑتی ہے۔ ان حالات میں ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' میں عوفی کا ذکر نہ ہونے کی بناء پر اس اشارے کا مل جانا کہ وہ بلبن کے عہد میں یہاں موجود نہیں تھے، تاریخی نقطۂ نگاہ سے بڑی بات ہے۔

مؤرخ ضیاء الدین برنی کا ایک معمول ہے کہ وہ جس سلطان کے احوال اور اُس کے عہد کے حالات و واقعات بیان کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس سلطان کے عہد کے اکابرین یعنی تمام امراء، وزراء وغیرہ کی ایک فہرست قلم بند کرتے ہیں، پھر ان کے تاریخ نویسی کے اصولوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ ہر عہد کے معروف علماء، وفضلاء اور اساتذہ کی ایک فہرست بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بلبنی عہد کے جن ممتاز علماء اور نوادر اساتذہ کے نام گنوائے ہیں ان میں عوفی شامل نہیں ہے۔ البتہ اُن علماء و اساتذہ میں ایک نام ''قاضی سدیدالدین'' کا ملتا ہے۔ عوفی مختلف دینی عہدوں پر فائز ہونے کے علاوہ منصب قضاء پر بھی مامور ہوئے جیسا کہ ان کی کتاب ''لباب الالباب'' کے

اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصرالدین قباچہ نے انہیں اوچ کا شاہی امام، واعظ اور خطیب مقرر کیا تھا۔ بعد ازاں انہیں کنبھایت کا قاضی بنا دیا گیا اور یہیں عوفی نے قاضی ابوعلی حسن بن علی (متوفی ۳۸۴ ھ) کی کتاب ''الفرج بعد الشدۃ'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اب مؤرخ برنی کے اس حوالے کی طرف آتے ہیں جو ہمیں اُن کی کتاب ''تاریخ فیروز شاہی'' کے دیباچے میں ملتا ہے جس میں برنی نے عوفی کو ''صدرالدین مؤلف جامع الحکایات'' لکھا ہے اور تاریخ فیروز شاہی'' کے متن میں برنی نے بلبنی عہد کے حالات و واقعات بیان کرنے کے علاوہ اُس عہد کی اہم دینی علمی اور انتظامی شخصیات کے احوال و آثارقلم بند کیے ہیں۔ لیکن ''قاضی سدیدالدین'' کا مؤرخ برنی دوبارہ کہیں ذکر تک نہیں کرتے ہیں۔ معاصر کتب تاریخ و تذکرہ میں بھی قاضی سدیدالدین کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔

مؤرخ برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' کے حوالے سے مولانا عوفی کے بارے میں یہ گفتگو اس لیے ضروری تھی کہ ماضی میں متعدد مؤرخین نے مولانا عوفی کے ساتھ ''سدیدالدین'' کا سابقہ لگایا ہے اور اب تک لگاتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک فاضل ڈاکٹر نظام الدین ہیں جنھوں نے انگریزی زبان میں ''جوامع الحکایات'' پر ایک طویل تعارف لکھا ہے جو ''مقدمہ جوامع الحکایات و لوامع الروایات''
(Introduction To the Jawami'U'L-Hikayat Wa Lawami'U'R-Riwayat of Sadidu-Din Mohammad al-Awafi)
کے نام سے لندن سے شائع ہو چکا ہے۔ گویا کہ ڈاکٹر نظام الدین نے کتاب کے نام ہی میں ''سدیدالدین'' کو مولانا عوفی کے نام کے سابقے کے طور پر استعمال کرلیا ہے۔

''جوامع الحکایات'' کے اردو مترجم اور اردو کے نامور غزل گو ہیں جو ایک زمانے میں پورے برصغیر میں شاعر رومان کے خطاب سے مشہور تھے اور لاہور سے اپنی ادارت میں ایک رسالہ ''رومان'' بھی شائع کرتے تھے۔ چنانچہ اختر شیرانی نے ''جوامع الحکایات'' کے اردو ترجمہ میں اپنی جانب سے ایک جامع اور مبسوط تعارف بھی لکھا ہے۔ چنانچہ وہ ڈاکٹر نظام الدین کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ حیدرآباد کے ڈاکٹر نظام الدین قدیم و جدید بیانات کے برخلاف عوفی کو سدیدالدین کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور اُن کے اس دعوے کے دلائل یوں ہیں:

اول یہ کہ محمد عوفی کا معاصر محمد بن عمر بن محمد سمرقندی جو عوفی کی تیسری کتاب یعنی ''الفرج بعد الشدۃ'' کے فارسی ترجمے کا کاتب ہے، اپنی کتابت کردہ اسی کتاب میں مولانا عوفی کے حالات بیان کرتے ہوئے اُن کا نام یوں لیتا ہے: ''قاضی امام اعز اخص امجد اشرف سدید الملک والدین، ظہیر الاسلام و المسلمین، واعظ الملوک والسلاطین، منشی النظم و النثر ملک الکلام افضل العالم محمد العوفی۔'' مولانا عوفی کے کاتب محمد سمرقندی نے یہاں انہیں ''سدید الملک والدین'' لکھا ہے۔

دوسری دلیل یا ثبوت کے طور پر ڈاکٹر نظام الدین مولانا عوفی کے ایک اور ہم عصر مہذب الدین منصور بن علی الاسفرازی کا ایک بیت پیش کرتے ہیں جس میں ''سدید العوفی'' استعمال کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تیسری دلیل یہ دی ہے کہ ''جوامع الحکایات'' کے دوسرے قدیم ترین نسخے جو ۷۱۷ھ میں لکھا گیا... اس کے خاتمے پر متن میں مؤلف نے اپنے آپ کو ''سدید عوفی'' لکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے چوتھی شہادت یہ دی ہے کہ ''تجارب السلف'' جو کتاب الفخری کا فارسی ترجمہ ہے اور ۷۲۴ھ سے تعلق رکھتا ہے، میں ہندوشاہ بن سنجر القیرانی الصاحبی ''جوامع الحکایات'' کے حوالے دیتا ہوا لکھتا ہے ''و امام سدید الدین محمد بن محمد عوفیؒ در کتاب جا (جوا) مع الحکایات گفتہ است''۔

''چناں کہ در جوامع الحکایات مرحوم سدید الدین محمد عوفی بخاری رحمۃ اللہ علیہ آوردہ است۔''

ان چار شہادتوں پر اختر شیرانی نے اپنی تحقیق سے ایک شہادت کا اور اضافہ کر دیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نظام الدین کی ان شہادتوں پر ایک شہادت کا ہم اضافہ کرتے ہیں۔ مولانا فخر الدین مبارک شاہ غزنوی عرف کمانگر جو

عہد علاء الدین محمد شاہ خلجی کے مشہور شاعر ہیں، اپنے فرہنگ نامے
میں عوفی کا شعر نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں
''مولانا سدید عوفی گوید۔''

یہ تاریخی حوالے پیش کرنے کے بعد اختر شیرانی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:
''ان بیانات کی روشنی میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عوفی کا صحیح لقب سدیدالدین ہے۔''

یہ ایک عالمانہ تحقیق تھی جو گزشتہ صدی کے ایک بہت بڑے محقق اور ممتاز عالم دین حافظ محمود شیرانی کے فرزندِ ارجمند اور ماہنامہ ''رومان'' لاہور کے مدیر اعلیٰ اختر شیرانی نے کی اور عوفی کا لقب ''سدیدالدین'' متحقق کر دیا۔ چنانچہ اختر شیرانی کے بعد آنے والے کم از کم ان مؤرخین، تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں، جنھوں نے مولانا عوفی پر کسی نہ کسی انداز سے قلم اٹھایا کے لیے یہ گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ وہ اس ضمن میں کسی قسم کے مخمصے یا مغالطے کا شکار ہوں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اختر شیرانی نے ڈاکٹر نظام الدین کے حوالے سے جو دلائل پیش کیے ہیں اُن کے مقابلے میں ان سے زیادہ مضبوط دلائل تلاش کر کے لائیں اور ''سدیدالدین'' کی جگہ ان کا لقب ''نورالدین'' ثابت کریں تاکہ قارئین کے ذہن ہر قسم کے ابہام اور الجھاؤ سے محفوظ رہیں۔

لیکن یہاں معاملہ لقب یا نام کی تحقیق کا نہیں ہے بلکہ نام اور لقب کی آمیزش یعنی نام اور لقب میں تمیز روا نہ رکھنے کا ہے، جس کی ایک نمایاں مثال ہم نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی ایک تحریر کے حوالے سے حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی کے احوال و آثار کے تحت بیان کی ہے ---- مولانا عبدالماجد دریابادی برصغیر کے نامور صحافی اور معروف ادیب ہونے کے علاوہ ایک ممتاز عالم دین بھی ہیں اور ہم اُن کا حد درجہ ادب و احترام کرتے ہیں ----- لیکن جیسا کہ مؤرخ ضیاء الدین برنی کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے کہ غلطی کسی شخص سے بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک منجھا ہوا ادیب، پختہ کار صحافی اور ایک ممتاز عالم دین بھی غلطی کر سکتا ہے۔ منزہ عن الخطا تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ ہم نے ''زندہ تابندہ'' مشاہیر عالم سیریز میں دو سو سے زائد اسلامی شخصیات کے سوانح اور اُن کے کارناموں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں حضرت مولانا جامی بھی شامل ہیں۔ چنانچہ یہ حوالہ مولانا جامی کے تذکرہ سے لیا جا رہا ہے کہ مولانا عبدالماجد نے ایک کتاب ''تصوف اسلام'' بھی لکھی ہے جس میں انہوں نے تصوف ایسے اہم

موضوع کا تعارف اور اس کی تشریح و توضیح کرنے کے لیے تصوف کی ایک سو سے زائد کتابوں میں سے جو نو کتابیں منتخب کی ہیں ان میں شیخ ابونصر سراج طوسی کی ''کتاب اللمع'' شیخ علی بن عثمان ہجویری کی ''کشف المحجوب'' امام ابوالقاسم قشیری کا ''رسالہ قشیریہ'' شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی ''فتوح الغیب'' شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی ''عوارف المعارف'' خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مبنی میر حسن سجزی کی ''فوائد الفواد'' شیخ احمد واسطی کی ''فقر محمدی'' شیخ فرید الدین عطار کی ''منطق الطیر'' اور مولانا عبدالرحمن جامی کی ''لوائح'' جو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی شرح ہے، شامل ہیں۔

تصوف اسلام پر مولانا عبدالماجد کی ''تصوف اسلام'' ہی کے نام سے لکھی جانے والی کتاب میں شیخ عطار کی شاعری کی کتاب ''منطق الطیر'' کا انتخاب محل نظر ہے جو ایک خاص مقصد کے تحت کیا گیا ہے۔ جب کہ دیگر ضخیم کتابوں میں سے ہر ایک کتاب سے اقتباسات کو لے کر اس وسیع موضوع کو صرف ڈیڑھ سو صفحات کی مختصر کتاب بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ''رسالے'' میں بیان کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن کام ہے اور وہ بھی اُس صورت میں جب کہ ان ڈیڑھ سو صفحات میں ان نو کتابوں کے عظیم المرتبت اور جلیل القدر مصنفین کے احوال و آثار کو بھی قلم بند کیا گیا ہو۔

اسلامی تصوف کی تعریف و تعارف کرنے کرانے اور تصوف و طریقت کی دینی اہمیت، معاشرتی حیثیت اور عملی افادیت کو سمجھنے سمجھانے میں مولانا عبدالماجد صاحب کس حد کامیاب ہوئے ہیں یہ ایک الگ موضوع ہے، یہاں ہم اپنی گفتگو کو مولانا موصوف کے صرف اس ایک جملے تک محدود رکھتے ہیں جو انہوں نے مولانا جامی کے تذکرہ کے آغاز میں لکھا ہے:

> ''اسم گرامی قولِ مشہور کے مطابق نورالدین عبدالرحمٰن تھا
> ''سفینۃ الاولیاء'' کی روایت ہے کہ اصل نام ''عمادالدین'' تھا۔
> مشہور نورالدین ہو گیا۔''

مولانا عبدالماجد کے اس مختصر جملے سے متعدد مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے مولانا جامی کا نام ''نورالدین عبدالرحمٰن'' لکھا ہے جب کہ ''نورالدین'' اُن کا لقب ہے اور یہ لقب صاحبِ لقب کی خصوصیات کی مناسبت سے ''شرف الدین'' ''عزالدین'' یا

''فخر الدین،'' کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اور ایک شخص کے ایک سے زائد القاب بھی ہو سکتے ہیں اور فی الحقیقت بعض اسلامی شخصیات کے ایک سے زائد القاب ہیں... لیکن ''اسم'' یا ''نام'' ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مولانا جامی کا نام عبدالرحمٰن ہے۔

قرآنی تعلیمات اور مسلمانوں کی تاریخی و تہذیبی اقدار و روایات نے حیاتِ انسانی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کو متاثر کیا ہے۔ مسلمانوں کا اپنا ایک خاص تہذیب و تمدن ہے جو ہر اعتبار سے قرآنی تعلیمات کے خوبصورت و خوشنما رنگوں میں رنگا ہوا ہے اور یہ سارے رنگ ایک ہی رنگ کا پرتو ہیں ------ یہ رنگ... اللہ تعالیٰ کا رنگ ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: صبغة الله و من احسن من الله صبغة ۔ چنانچہ یہی رنگ دنیا بھر کے مسلمانوں کے اسماء و القاب میں بھی دکھائی دے گا۔

اب ہم مولانا عبدالماجد صاحب کے متذکرہ مختصر جملے کی طرف آتے ہیں جس میں اُن سے تین غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ مولانا صاحب سے پہلی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی کے تذکرہ میں اپنی تحریر کے تعارفی حصے میں نام اور لقب کو ملا کر اکٹھا لکھ دیا کہ ''قولِ مشہور کے مطابق اسم گرامی نورالدین عبدالرحمٰن تھا'' اس میں غلطی یہ ہے کہ ''نورالدین'' مولانا جامی کا لقب ہے اور ''عبدالرحمٰن'' ان کا نام ہے۔

مولانا موصوف سے اس مختصر جملے میں دوسری غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے یہ لکھ کر کہ اصل نام ''عمادالدین'' تھا، مشہور ''نورالدین'' ہو گیا۔ القاب کو اسماء میں بدل دیا۔ اس لیے کہ یہ دونوں القاب ہیں نہ کہ اسماء۔

مولانا عبدالماجد صاحب کی تیسری غلطی جو انہوں نے اپنے اس مختصر جملے میں کی ہے وہ تاریخی حوالے کی غلطی ہے جو اُن کی دوسری غلطی سے پیوستہ ہے۔ اگر وہ اسماء و القاب میں فرق و امتیاز کرتے تو اُن سے دوسری اور تیسری غلطی سرزد نہ ہوتی۔ چنانچہ مولانا موصوف فرماتے ہیں: 'سفینۃ الاولیاء' کی روایت کے مطابق اصل نام تو عمادالدین تھا لیکن مشہور 'نورالدین' ہو گیا۔''

اس ضمن میں گزارش یہ ہے کہ شہزادہ داراشکوہ جو ''سفینۃ الاولیاء'' سمیت متعدد اہم اور قابل قدر کتابوں کا مصنف ہے انتہائی تعلیم یافتہ شخص اور فاضل دانش ور تھا۔ اُس نے اپنے دور کے ممتاز علماء و مشائخ سے اکتسابِ علم کیا تھا۔ داراشکوہ کی تحریریں اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ وہ ایک متبحر عالم تھا۔ چنانچہ داراشکوہ جیسا صاحب سیف و قلم شخص اگر

قسم کی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا کہ لقب کو نام قرار دے دیتا ...... چنانچہ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی جب اپنا زیر بحث مختصر جملہ لکھ رہے تھا تو اُس وقت ''سفینۃ الاولیاء'' کا نسخہ اُن کے پیش نظر ہی نہیں تھا۔ ورنہ وہ کبھی یہ نہ لکھتے کہ ''سفینۃ الاولیاء' کی روایت کے مطابق اصل نام عمادالدین تھا مشہور نورالدین ہو گیا۔''

امر واقعہ یہ ہے کہ دارا شکوہ نے اپنی یادگار تالیف ''سفینۃ الاولیاء'' میں مولانا عبدالرحمن جامی کے تذکرہ میں پہلا جملہ ہی یہ لکھا ہے:

''عمادالدین اصل لقب ہے لیکن نورالدین کے لقب سے مشہور ہیں۔''

دینی عقائد اور مذہبی افکار و نظریات تو ایک طرف تاریخی حالات و واقعات کو رقم کرنا اور دینی و علمی شخصیات پر قلم اٹھانا بہت بڑی ذمہ داری کی بات اور نہایت مشکل کام ہے۔ اس میں بہت محنت و جانفشانی اور وسعتِ مطالعہ کے علاوہ انتہائی حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اہل ایمان کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنی تحریر و تقریر اور عام گفتگو میں بھی جو کچھ کہیں یا لکھیں اس کی اچھی طرح سے چھان بین اور جانچ پڑتال کر لیا کریں۔

تحریر و تقریر میں معمولی لغزشوں اور ادنیٰ غفلتوں سے بڑی بڑی غلطیاں جنم لیتی ہیں۔ تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری میں تساہل و بے احتیاطی، غیر ذمہ داری، غفلت و کوتاہی اور تعصب و تنگ نظری کے جو خطرناک اثرات و نتائج برآمد ہوتے ہیں اُن سے کچھ اہل علم اور اربابِ حکمت و دانش ہی آگاہ ہیں۔ صرف اس اسماء اور القاب میں فرق و امتیاز نہ کرنے کے نتائج ہی کی مثال کو لیجیے تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اس سے ہماری تاریخ کس طرح مسخ ہوئی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی طرح مولانا اعجاز الحق قدوسی کا شمار بھی برصغیر کے ممتاز علماء و فضلاء اور بلند پایہ اہل قلم میں ہوتا ہے۔ مولانا اعجاز الحق متعدد اہم کتابوں کے مصنف ہیں اور انہیں مولانا عبدالماجد دریابادی کی طرح دینی و علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور بلاشبہ ایک قابل احترام علمی شخصیت ہیں ...... لیکن اسماء و القاب کے مخمصے میں ایسے گرفتار ہوئے کہ مولانا عبدالماجد سے بھی آگے نکل گئے اور انہوں نے مولانا محمد عوفی کو اُن کے مشہور و غیر مشہور القاب کے پیشِ نظر دو

مختلف اشخاص سمجھ لیا اور ان کے احوال کو علیحدہ علیحدہ قلم بند کر دیا۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ایک ضخیم کتاب ''تاریخ سندھ'' لکھی ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اپنی اس کتاب کی جلد اول میں ''سندھ میں خاندانِ غلاماں کی حکومت'' کے باب میں اس عہد کی نامور شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا موصوف نے ''سید بدرالدین عوفی'' اور ''نورالدین عوفی'' کے عنوانات قائم کر کے لکھا ہے:

> ''سید بدرالدین عوفی:- سید بدرالدین عوفی جو بخارا کا رہنے والا تھا اُوچ پہنچا۔ اُس نے سندھ اور گجرات کا سفر کیا۔ اُس کی تصانیف میں ''لب الالباب'' جو غزنوی دور کے فارسی شعراء کا تذکرہ ہے، مشہور ہے۔''

سید بدرالدین عوفی کے عنوان سے مولانا عوفی کا ذکر کرنے کے فوراً بعد مولانا اعجاز الحق قدوسی مولانا محمد عوفی کا ذکر ایک دوسرے نام ''نورالدین محمد عوفی'' کے زیر عنوان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

> ''نورالدین محمد عوفی:- ''جامع الحکایات کا مصنف نورالدین محمد عوفی بھی قباچہ ہی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اُس نے اپنی کتاب ''جامع الحکایات'' کو ۱۱۱۲ء میں قباچہ ہی کے زمانے میں تصنیف کیا اور قباچہ کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔''

محض اسماء و القاب کے بارے میں مؤرخین اور اہل قلم سے جو تساہل اور غفلت و کوتاہی ہوئی اُس کے نتیجے میں ایک شخص کے دو شخص بن گئے۔ جس سے انسان کا ذہن اُس شعبدے باز (juggler) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اپنی پٹاری یا ہیٹ (hat) میں ایک کبوتر ڈالتا ہے اور دو کبوتر نکال کر لوگوں کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ یہ تو صرف اسماء و القاب میں تمیز روا نہ رکھنے کا نتیجہ تھا۔ اعتقادی موضوعات، فقہ و حدیث اور مذہبی افکار و نظریات میں غفلت و کوتاہی اور غیر ذمہ داری بلکہ بعض صورتوں میں تعصب و تنگ نظری پر مبنی تحریریں جو رنگ لاتی ہیں بلکہ حشر برپا کرتی ہیں وہ اپنی جگہ اہل قلم اور جہانِ کتب کا ایک بہت بڑا، اہم اور سنگین مسئلہ ہے اور اربابِ حکمت و دانش کے لیے لمحۂ فکریہ بھی۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے محمد عوفی کے دو عوفی بنانے کے علاوہ اُن کی دونوں

کتابوں کے نام بھی غلط لکھے ہیں۔انہوں نے ''لباب الالباب'' کو ''لب الالباب'' اور ''جوامع الحکایات'' کو ''جامع الحکایات'' لکھ کر ایک دوسری قسم کی مؤرخانہ غفلت و کوتاہی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کچھ اسی قسم کی غفلتیں اور کوتاہیاں اور غلطیاں نورالدین محمد عوفی ہی کے حوالے سے دوسرے مؤرخین اور تذکرہ نویسوں سے بھی سرزد ہوئی ہیں۔

امام عوفی کے نام کو غلط طور پر لکھنے کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں!

منشی عبدالرحمن خان نے ''آئینہ ملتان'' میں ناصرالدین قباچہ کے بارے میں لکھتے ہوئے امام عوفی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ناصرالدین قباچہ کے زمانہ میں ...... جو بھی علماء و فضلاء اور صوفیا اُس زمانے میں ہندوستان آتے انہیں اوچ اور ملتان سے گزرنا پڑتا۔ وہ یہاں کی علمی فضا سے متاثر ہو کر اکثر یہیں رہ جاتے اور قباچہ کا دربار ان سے معمور رہتا، ان میں سے قاضی منہاج الدین سراج، مصنف ''طبقات ناصری،'' سید بدرالدین عوفی مصنف ''لب الالباب'' (تذکرہ فارسی شعراء)، نورالدین محمد عوفی مصنف ''جامع الحکایات۔''

یہاں بھی بلا تحقیق لکھنے کی مثال سامنے آتی ہے کہ ایک شخص کو دو مختلف شخصیات میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور تصنیفات کے نام بھی غلط درج کیے گئے ہیں۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند،'' (عربی ادب) کے مقالہ نگار ڈاکٹر احسان الٰہی رانا نے ''لباب الالباب'' کے حوالے سے مولانا عوفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''سدیدالدین عوفی ۶۱۶ھ، ۱۲۱۹ء میں چالیس سال کی عمر میں قباچہ کے دربار سے منسلک ہوا اور ۹ سال کی خدمت کے بعد التمش کے دربار کی رونق بنا۔''

مصنفین کی طرف سے القاب اور نام کے الجھاؤ کا خصوصی شکار ہونے والی یہ شخصیت... مولانا عوفی برصغیر میں مختلف اہم دینی عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ منصب قضاۃ پر بھی مامور ہوئے جیسا کہ ''لباب الالباب'' کے اندراجات سے ظاہر ہوتا ہے۔

تاریخ کی یہ ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ بعض شخصیات بغیر کسی بڑے کارنامے کے

شہرت و ناموری کے سنگھاسن پر بٹھا دی جاتی ہیں اور بعض دوسری شخصیات کی شان دار کارکردگی کے باوجود ان کے بارے میں معقول معلومات حاصل نہیں ہو پاتیں۔ فارسی شعراء کے پہلے تذکرہ کی تصنیف جیسے اہم کام اور ''جوامع الحکایات'' جیسی پُرتاثیر کتاب کے مصنف اور صاحبِ علم و فضل شخصیت کا نام تک سلیقے سے نہیں لکھا جاتا اور اس بات کے کوئی آثار نہیں ملتے کہ امام عوفی کے آخری ایام کہاں اور کن حالات میں گزرے اور ان کی وفات کب، کیسے اور کہاں ہوئی۔

شمس الدین خوارزمی

مولانا شمس الدین خوارزمی کا شمار برصغیر کی ممتاز دینی و علمی شخصیات میں ہوتا ہے۔
وہ ساتویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں فتنۂ مغول کے باعث اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ علماء فقہا اور اساتذہ میں سربرآوردہ روزگار اور اپنے عہد کے ممتاز صوفی بزرگ تھے۔ ۶۰۶ھ میں جب سلطان قطب الدین ایبک (۶۰۲۔۶۰۷ھ) سلطنت دہلی کو مضبوط و مستحکم کرنے میں مصروف تھا مولانا شمس الدین پیدا ہوئے۔ ان کے بچپن، تعلیم و تربیت اور ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

کتب تاریخ و تذکرہ کے اندراجات سے یہ امر ظاہر و ثابت ہے کہ برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہونے کے بعد مولانا شمس الدین نے دارالسلطنت دہلی کو اپنا مسکن بنایا اور وہیں وعظ و ارشاد اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ اپنے مکان میں درس دیا کرتے تھے اور انہوں نے اپنی ساری زندگی اشاعت علوم اور تبلیغِ اسلام میں گزار دی۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ دہلی کا شائد ہی کوئی عالم ایسا ہوگا جس نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو۔

مولانا شمس الدین خوارزمی کو سلطان بلبن کے عہد میں عروج حاصل ہوا۔ سلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۴۔۶۸۶ھ) سلاطین دہلی میں سے ایک انتہائی زاہد و عابد، رعایا پرور، عدل گستر اور روادار حکمران تھا۔ ذہین و زیرک اور بہادر و شجاع ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کا منتظم اور مدبر سیاست دان تھا۔ اپنی علم دوستی اور علماء و فضلا کی قدردانی کے لئے مشہور تھا اور صوفیہ کرام کے ساتھ دِلی عقیدت رکھتا تھا اور ان کا حد درجہ ادب و احترام کرتا

تھا۔ شہرۂ آفاق سیاح اور مؤرخ قاضی ابن بطوطہ مالکی سمیت تمام قریب العہد مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے سلطان بلبن کی عدل پروری، علم دوستی، بردباری اور نیک چلنی کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ فاضل شخص تھا۔ مشائخ کی بہت تعظیم وتکریم کرتا تھا اور علماء کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ کچھ سلطان بلبن کے عمدہ اوصاف اور پسندیدہ عادات کی شہرت سن کر اور کچھ ''فتنۂ مغول'' یعنی مغلوں کی مسلسل ومتواتر تخریب و تباہی اور قتل و غارت سے تنگ آ کر ارباب علم وفضل اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر سلطان بلبن کے پُروقار وپُر جلال دربار سے وابستہ ہو گئے۔ بہت سے مشائخ، سادات اور اہل حرفہ بھی اپنی جان اور عزت وآبرو بچانے کے لئے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے اور ان میں سے بہت سوں نے دارالسلطنت دہلی کو مستقلاً طور پر اپنی جائے سکونت بنا لیا۔ اور باقی ملک کے دوسرے شہروں میں آباد ہو گئے۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کے جن مشائخ اور علماء وفضلاء کا تذکرہ مؤرخ ضیاء الدین برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' میں کیا ہے۔ ان علماء وفضلاء میں مولانا برہان الدین محمود بلخی، مولانا نجم الدین عبدالعزیز، قاضی رکن الدین سامانوی، شیخ سراج الدین ابوبکر، شیخ شرف الدین ولوالجی، شیخ برہان الدین بزاز، مولانا کمال الدین زاہد اور مولانا شمس الدین خوارزمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ عہدِ بلبنی کی کوہ پیکر دینی وعلمی اور روحانی شخصیات ہیں جن میں سے ہر بزرگ اپنی جگہ ایک ادارہ، ایک انجمن، ایک درسگاہ اور ایک دبستان تھا۔ مولانا شمس الدین خوارزمی اپنے علم وتقویٰ اور فضل وکمال کے لحاظ سے یگانہ عصر تھے۔ بلبنی عہد کے آغاز ہی سے دہلی میں تعلیم وتدریس میں مشغول رہے۔ حتیٰ کہ دہلی کے تمام اساتذہ آپ ہی کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے۔ حسنِ اخلاق اور لطافتِ طبع میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا شمس الدین خوارزمی کے شاگردوں میں بے شمار شاگرد نامور علمائے دین اور صاحبِ مقام صوفیہ کرام ہوئے جس سے مولانا کی علمی وروحانی فضیلت وعظمت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بھی ان کے تلامذہ میں سے تھے، چنانچہ مولانا جمالی نے اپنی تالیف ''سیر العارفین'' میں لکھا ہے۔

''حضرت سلطان المشائخ پچیس سال کی عمر میں بدایوں سے دہلی آئے۔ اپنی والدہ کو بھی ساتھ لائے۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں ان کا دہلی

میں آنا ہوا۔ یہاں بھی تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں شہر دہلی میں بہت سے درویش اور بے شمار عالم تھے لیکن علمائے کبار میں ممتاز مولانا شمس الدین خوارزمی تھے۔ شہر کے تمام علماء ان سے رجوع کرتے تھے۔ وہ فروع واصول کے جامع تھے اور علم معقول ومنقول میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔''

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اپنے آبائی قصبہ بدایوں سے فارغ التحصیل ہو کر دہلی تشریف لائے تو مولانا جمالی کے بیان کے مطابق وہ مولانا شمس الدین خوارزمی کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور مولانا خوارزمی نے ان کی تعلیم کی طرف غیر معمولی توجہ کی۔ مولانا خوارزمی اپنے لائق اور عزیز تلامذہ کو اپنے حجرے میں بلا کر درس دیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ شرف صرف ان کے تین تلامذہ یعنی مولانا قطب الدین ناقلہ، مولانا برہان الدین عبدالباقی اور خواجہ نظام الدین اولیاء کو حاصل تھا۔ مولانا خوارزمی کے شاگردوں میں سے اگر کوئی شاگرد درس سے غیر حاضر ہو جاتا تو مولانا کی عادت تھی کہ بطور خوش طبعی مذاقاً اس سے فرماتے کہ بھئی میرا کیا قصور تھا کہ تم درس سے غیر حاضر ہو گئے۔ مجھے بتا دو تاکہ کہیں میں پھر وہی قصور کروں اور تم آئندہ بھی درس سے غیر حاضر رہو۔ لیکن اگر کبھی خواجہ نظام الدین اولیاء کسی وجہ سے غیر حاضر ہو جاتے تو مولانا یہ شعر پڑھتے۔

آخر کم از آن کہ گاہ گاہے
آئی و بمانکنی نگاہے

ترجمہ: کبھی کبھی ہمارے ہاں آ کر ہمارے حال پر نظر کر لیا کرو

سید صباح الدین عبدالرحمن نے ''بزم صوفیہ'' میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے احوال بیان کرتے ہوئے مولانا جمالی کے ''سیر العارفین'' کے حوالے سے ان کی تعلیم کے بارے میں لکھا ہے ''مزید تعلیم کے لئے اپنی والدہ کے ساتھ دہلی گئے جو اس وقت علماء وفضلا کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ ان میں فضل وکمال کے اعتبار سے مولانا شمس الدین دامغانی بہت ممتاز تھے۔ بلبن ان کا بے حد قدردان تھا۔ چنانچہ اپنی بادشاہت کے زمانے میں اس نے ان کو شمس الملک کا خطاب دیا اور ''مستوفی ممالک'' کے عہدہ پر مامور کیا۔ اس زمانے کے مشہور شاعر تاج الدین سنگ ریزہ نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی کہا ہے...... اس عہدے سے پہلے درس وتدریس کے لئے مشہور تھے۔ اس لئے حضرت شیخ

نظام الدین نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مولانا شمس الدین دامغانی نے بھی ان کی طرف غیر معمولی توجہ کی۔'' مولانا شمس الدین دامغانی کا کوئی شاگرد جب درس سے غائب ہوتا تو اس سے مذاقاً پوچھتے...... غرض سید صاحب نے سب واقعات من وعن مولانا جمالی کی ''سیر العارفین'' سے نقل کئے ہیں مگر ''بزمِ صوفیہ'' کے مؤلف سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے تین غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ اوّل انہوں نے مولانا شمس الدین کا لاحقہ خوارزمی کی بجائے دامغانی لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔ مولانا شمس الدین دامغانی سیر الاولیاء کے مؤلف سید امیر خورد کرمانی کے نانا اور حضرت سلطان المشائخ کے احباب میں سے تھے۔ دوسرے یہ کہ مولانا شمس الدین خوارزمی نے مستوفی ممالک بننے کے بعد بھی درس و تدریس کے مشغلہ کو جاری رکھا جب کہ سید صباح الدین کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مستوفی ممالک بننے کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔ اُن سے تیسری غلطی یہ سرزد ہوئی ہے کہ مولانا جمالی نے ''سیر العارفین'' میں متعلقہ عبارت میں مولانا شمس الدین خوارزمی لکھا ہے اور سید صباح الدین نے شمس الدین دامغانی۔

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے استاد الاساتذہ مولانا شمس الدین خوارزمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ''مقاماتِ حریری'' بھی ان ہی سے پڑھی۔ اس تلمذ کی وجہ سے سلطان المشائخ مولانا خوارزمی کا بحیثیت استاد ہمیشہ ادب و احترام کرتے رہے اور اپنی مجلس میں ان کا ذکر بھی عمدہ الفاظ میں فرمایا کرتے تھے۔ اور مولانا خوارزمی نے بھی حضرت خواجہ کی شاگردی کے زمانے میں ان کی بڑی عزت وتوقیر کی اور ان کی صغرسنی میں بھی مولانا دیگر تمام علماء سے زیادہ ان کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ اس کا سبب حضرت سلطان المشائخ کی روحانی شخصیت کے علاوہ مولانا خوارزمی کا مثالی حسنِ سلوک اور غیر معمولی عجز و انکسار تھا۔

مولانا شمس الدین خوارزمی کے علم وتقویٰ اور فضل و کمال کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن بھی مولانا خوارزمی کے علم و فضل کا قائل اور ان کی روحانی شخصیت کا بہت مداح تھا۔ چنانچہ سلطان نے مولانا کے علمی کمالات اور شخصی خصوصیات کے پیشِ نظر انہیں شمس الدین کا خطاب عطا کر کے اپنی سلطنت کا مستوفی ممالک یعنی محتسب اعلیٰ بنا دیا۔ مولانا شمس الدین خوارزمی کو جب یہ اعزاز اور عہدہ ملا تو اس زمانے کے ممتاز ترین شاعر تاج الدین سنگریزہ نے ان کی مدح میں قصیدہ لکھا جس کا

ایک شعر یہ ہے:

شما کنوں بکال دل دوستان شدی
مستوفی ممالک ہندوستان شدی

ترجمہ:

اے شمس! اب آپ دوستوں کی دلی خواہش کے مطابق بلادِ ہند کے سربراہ مقرر ہو گئے ہیں۔

مولانا شمس الدین خوارزمی اعلیٰ علمی ذوق رکھتے تھے اور اپنی خوش مذاقی اور لطافت طبع کے لئے بھی مشہور تھے۔ ایک مرتبہ ان کے کسی دوست نے بہت ہی شکستہ حروف میں ان کو خط لکھا جو مولانا سے پڑھا نہ گیا۔ چنانچہ انہوں نے اس خط کی پشت پر عربی میں یہ جملہ جواباً لکھ بھیجا

"اسما فیکم خط کخط لابط فی الشط فلا تکتب لنا"

ترجمہ:

تمہارا خط ایسا ہے جیسے کہ بط کا خط دریا کے کنارے پر (یعنی تمہارے خط کی عبارت پڑھی نہیں جاتی) لہٰذا ہمیں خط نہ لکھا کرو۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں مولانا شمس الدین خوارزمی کے احوال "شمس الملک" کے عنوان کے تحت بیان کئے ہیں اور لکھا ہے۔

"آپ اپنے زمانے کے بڑے فاضل بلکہ صدر الافاضل تھے اور اپنے زمانے میں علم و فضل کی وجہ سے مشہور تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے اساتذہ میں سے تھے اور خواجہ نظام الدین نے مقاماتِ حریری انہیں سے پڑھی تھی۔"

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے احوال بیان کرتے ہوئے ان کے اساتذہ اور تعلیم و تدریس کے بارے میں لکھا ہے:

"خواجہ نظام الدین اولیاء بدایوں سے بغرض حصولِ تعلیم دہلی تشریف لائے اور صدر ولایت شمس الملک کے تلامذہ اور شاگردوں کے زمرے میں داخل ہو کر مقاماتِ حریری پڑھی۔ علمِ حدیث بھی آپ ہی سے حاصل کیا۔ دوسرے طالب علم حضرت خواجہ کو "نظام الدین منطقی" اور "نظام الدین بحاث" کہا کرتے تھے۔"

مولانا عبدالحئ حسنی نے "نزہتہ الخواطر" کے حصہ دوم میں مولانا شمس الدین خوارزمی کے حالات بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

> "اپنے عہد کے ممتاز عالم اور صوفی تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے انہیں دہلی کی سربراہی تفویض کی تو انہیں شمس الملک سے ملقب فرمایا۔ تدریس بھی مشغلہ تھا۔ حضرت سلطان الاولیا نے مقاماتِ حریری کے چالیس مقامے آپ سے سبقاً پڑھے۔ حضرت ان کا ذکر خیر فرمایا کرتے تھے۔"

عارف باللہ، استاذ الاساتذہ، صدر الافاضل، یگانۂ عصر، شمس الملک مستوفی ممالک مولانا شمس الدین خوارزمی نے ۶۷۹ھ میں وفات پائی۔

کمال الدین زاہد

مولانا کمال الدین زاہد ساتویں صدی ہجری کے معروف و ممتاز علماء اور بلند پایہ محدثین میں سے تھے۔ ان کی شخصیت متعدد دینی وعلمی اور تاریخی حوالوں سے قابلِ قدر اہمیت کی حامل ہے۔ زہد و ورع میں یکتا، صدق و صفا میں فرد اور جرات و بے باکی میں اپنی مثال آپ تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن ان کا عقیدت مند اور شہنشاہِ دین خواجہ نظام الدین اولیاء ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ سلطان بلبن ان کی امامت میں نماز پڑھنے کا خواہشمند تھا اور حضرت سلطان المشائخ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے علمِ حدیث کی سند و اجازۃ حاصل کی، جس سے ان کی علمی جلالت وعظمت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا زاہد کا نام ونسب یوں ہے: ''محمد بن احمد بن محمد الماریکلی اور لقب کمال الدین۔ ممکن ہے کہ مولانا شعر بھی کہتے ہوں اور زاہد اُن کا تخلص ہو۔ یا پھر زھد و اتقاء میں اس قدر آگے بڑھے ہوئے ہوں کہ لوگوں میں زاہد کے عرف سے مشہور ہو گئے ہوں۔ مولانا کمال الدین نے علمِ حدیث کا جو اجازت نامہ خواجہ نظام الدین اولیاء کو لکھ کر دیا تھا اس میں انہوں نے اپنا لقب کمال زاہد تحریر فرمایا ہے۔

کتبِ تاریخ و تذکرہ مولانا کمال الدین زاہد کے ابتدائی حالات، تعلیم اور اساتذہ و مشائخ کے بارے میں خاموش ہیں۔ البتہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں ان کا سن ولادت ۶۵۹ھ لکھا ہے۔ اور مولانا کمال الدین زاہد نے خواجہ نظام الدین اولیاء کو علمِ حدیث کا جو اجازت نامہ دیا تھا اس پر ۲۲ ربیع الاول ۶۷۹ھ۔۱۲۸۰ء کا سن اور

تاریخ درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کمال الدین نے ۲۰ سال کی عمر سے پہلے ہی مروجہ علوم وفنون بالخصوص حدیث وفقہ میں کمال پیدا کر کے دارالسلطنت دہلی میں اپنا حلقہء درس قائم کر لیا تھا اور درس و تدریس میں اس قدر شہرت ومقبولیت حاصل کر لی تھی کہ خواجہ نظام الدین اولیاء ایسی عظیم المرتبت دینی اور روحانی شخصیت نے علم حدیث کی تحصیل کے لئے عروس البلاد اور علوم وفنون کے مرکز دہلی کے بے شمار علماء اور لاتعداد اساتذہ میں سے مولانا کمال الدین زاہد کا انتخاب کیا۔ اس ضمن میں ''علم الحدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' کے فاضل مؤلف اور محقق ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنے تحقیقی مقالے میں ایک علیحدہ باب ''نظام الدین اولیاء اور ان کا مکتب محدثین'' کے عنوان سے باندھا ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ کی ولادت، بچپن کے احوال، تعلیم اور پھر اپنے مرشدِ طریقت حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کی پاک پتن میں حاضری اور ان کی بیعت وخلافت کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ شیخ نظام الدین نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں حدیث کی تعلیم نہیں حاصل کی بلکہ انہوں نے علم حدیث کا مطالعہ اس وقت شروع کیا جب وہ ایک ممتاز ولی کی حیثیت سے بہت مشہور ہو چکے تھے لیکن اس کا سبب معلوم کرنا دشوار نہیں۔ اس زمانے میں قاضی کا منصب حاصل کرنے کے لئے جن علوم کا حاصل کرنا ضروری تھا ان سے فراغت کے بعد شیخ نظام الدین کو اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ علمِ حدیث کی تحصیل پر توجہ کر سکیں اور واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ قاضی مقرر کر دیئے جاتے، جیسا کہ وہ (عمر کے ابتدائی حصے میں) چاہتے تھے تو حدیث کا مطالعہ کرنے کی انہیں ضرورت ہی نہ ہوتی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اللہ نے انہیں ولایت بخشی اور وہ جیسے جیسے روحانیت کی منزلیں طے کرتے گئے ان کو مطالعہء حدیث کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوتی گئی۔ چنانچہ ایک عالم اور ولی کے اوصاف سے پوری طرح متصف ہونے کے باوجود انہوں نے مولانا کمال الدین زاہد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور ان سے ''مشارق الانوار'' کا درس لینے لگے۔ شیخ نظام الدین نے اس کتاب کا بہت غائر اور تنقیدی مطالعہ کیا اور ۶۷۹ھ۔۱۲۸۰ء میں اس کی تکمیل کے بعد مولانا کمال

الدین سے سند حاصل کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نظام الدین نے جب مطالعہ حدیث کا آغاز کیا تو وہ ایک ولی کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے''۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ایسی جلیل القدر دینی و روحانی شخصیت اگر مرتبہ ولایت پر فائز ہونے اور بحیثیت ایک ممتاز ولی کے مشہور ہونے کے بعد علم حدیث کو باقاعدہ طور پر سیکھنے کے لئے جس عالم اور محدث کو منتخب کرے گی وہ یقینی طور پر فخر زمانہ اور یگانہ عصر ہوگا۔ چنانچہ سید امیر خورد کرمانی نے ''سیر الاولیاء'' میں لکھا ہے:

> ''مولانا کمال الدین زاہد اپنے عہد کے بڑے عالم و زاہد اور علم حدیث و روایات میں بے نظر اور یگانہ عصر تھے۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں مولانا کمال الدین زاہد کے بارے میں لکھا ہے:

> ''آپ زہد و تقویٰ، دیانت اور کمال علم کی بدولت مشہور تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے آپ ہی سے مشارق کے حصوں کی سند حاصل کی۔ سلطان غیاث الدین بلبن کی آرزو تھی کہ مولانا کمال الدین زاہد کو امام مقرر کر کے ان کے پیچھے نماز پڑھا کرے۔ چنانچہ اسی غرض سے مولانا موصوف کو اپنے ہاں بلایا اور کہا کہ مجھے آپ کے علمی کمالات، دیانت اور زہد و تقویٰ پر پختہ اعتقاد ہے۔ مہربانی فرما کر اگر آپ امامت کا عہدہ قبول فرمالیں تو میں آپ کا رہینِ منت ہوں گا اور مجھے اپنی نماز کے قبول ہونے پر پورا یقین ہو جائے گا۔ مولانا نے جواب دیا کہ میرے پاس تو پہلے نماز ہی باقی رہ گئی ہے، اس کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں رہا۔ اب آپ کی مرضی یہ ہے کہ میرے پاس یہ بھی نہ رہے۔ مولانا نے یہ جواب کچھ اس بارعب اور پُر جلال لہجے میں دیا کہ بادشاہ خاموش رہ گیا اور عذر خواہی کرتے ہوئے مولانا کو باعزت طریقے سے رخصت کیا۔''

مولانا عبدالحئی حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں شیخ محمد بن احمد ماریکلی دہلوی کے نام سے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کا لقب کمال الدین زاہد تھا۔ انہیں حدیث و فقہ

دونوں میں کمال حاصل تھا۔ فقہ و حدیث کی تعلیم برہان الدین محمود بلخی سے پائی۔ کتاب آثار النیرین فی اخبار الصحیحین کے مؤلف سے بسلسلہ امام حسن صاغانی لاہوری اجازۃ حدیث حاصل کیا۔ فقہ و حدیث میں آپ بڑے عالم محقق ہونے کے علاوہ انتہائی زاہد و پارسا اور متبحر تھے“۔

سید امیر خورد کرمانی نے ”سیر الاولیاء“ میں سلطان المشائخ کی دہلی میں آمد اور تحصیل علم کے علاوہ ان کے تبحر علمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ جب میں شہر دہلی میں آیا تو تین چار سال تک علم حاصل کرنے کی جدوجہد میں مشغول رہا۔ جس زمانے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اگرچہ میں لائق اور باصلاحیت طالب علموں کی صحبت میں رہتا تھا لیکن میں ان سے بار بار کہتا تھا کہ اگرچہ چند روز تمہارے ساتھ ہوں لیکن میں تمہارے ساتھ نہ رہوں گا۔ یہاں اجمالاً اس واقعہ کے تحریر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی محبت سلطان المشائخ کا مقدر کی تھی۔ ابتداء ہی سے آپ کا قلبی رجحان یہ تھا کہ سب سے قطع کر کے دوست سے اپنے رشتے کو جوڑا جائے۔

’کہ دریک دل نمی گنجد غم جان وغم جاناں‘

”سلطان المشائخ کا جذبہ حصول علم اور علم اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ تیز طبع طالب علموں اور کامل دانشوروں میں مشہور ہو گئے اور لوگ ”مولانا نظام الدین بحاث و محفل شکن“ کے خطاب سے آپ کو مخاطب کرنے لگے اور ہر علم میں حظِ کامل اور دست گاہِ کلی حاصل کی۔ جب علم فقہ اور اصولِ فقہ میں پورا عبور حاصل کر لیا، علم اور فضیلت کے علم کو شروع کیا۔ اور اس میں کمال حاصل کرنے کے بعد علمِ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع کیا۔ مشارق الانوار کو حفظ کیا اور مولانا کمال الدین زاہد سے جو اپنے عہد کے بڑے عالم و زاہد تھے اور علم حدیث و روایات میں بے نظیر اور یگانۂ عصر تھے ”مشارق الانوار“ پر بحث کر کے اس علم کے غوامض کو حاصل کیا اور صحتِ سند، واقعات و روایات کی انتہائی تحقیق کی“۔

مولانا کمال الدین زاہد نے علم حدیث پڑھانے کا اجازت نامہ ان الفاظ میں لکھ کر دیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لمن له الاهتداء والاعطاء والصباح والرواح ولمدح لمن له لآ لاء والنعماء والصباح والمداح والصلوٰة الفصاح علی ذی الفضائل السماء والکلمة والکلام المفتاح والمناقب العلیاء والاحادیث الصحاح صلوٰة تروم دوام الصباح والرواح

وبعد فان الله تعالیٰ وفق الشیخ الامام العالم الناسک السالک نظام الدین محمد بن احمد بن علی مع وفور فضله فی العلم وبلوغ قدرة ذروة الحلم مقبول المشائخ الکبار، منظور العلماء الاخیار والابرار بان هذا الاصل المستخرج من الصحیحین علیٰ ساطر (۱۰۵) هٰذه السطور فی زمن الزمن الحار و درود الا مطار من اوله الیٰ آخره قراةِ ببحث واتفان و تنقیح معانیه و تنقیر مبانیه و کاتب السطور هروه قرائة و سماعاً عن الشیخین الامامین العالمین الکاملین احد الشیخین مؤلف شرح آثار النیّرین فی اخبار الصّحیحین. والآخر صاحب الدرسین المنیرین الامام الاجل الکامل مالک رکاب النظم والنثر برهان الملة والدین محمود بن ابی الحسن اسعد البلخی رحمة الله علیهما رحمة واسعة کتابة وشفاعة وهما بروبانه عن مؤلفه واجزت له ان یروی عنیٰ کما هو المشروط فی هٰذه الباب، والله اعلم بالصواب. و اوصیته ان لا یسانی واولادی فی دعواته فی خلوته وصح له القراء والسماع فی المسجد المنسوب الیٰ نجم الدین ابی بکرن النوالسی رحمة الله علیه فی بلدة صانها الله عن الآفات والعاهات و هذا خط اضعف العباد و احقر خلقه محمد بن احمد بن حجر الماریکلی الملقب بکمال الزاهد والفراغ من القرلة والسماع و کتب هٰذه السطور فی الثانی والعشرین من ربیع الاول سنه تسع و سبعین و ستمائة حامداً لله تعالیٰ و مصلیاً علیٰ رسوله صلی الله علیه و سلم.

ترجمہ:

تمام حمد وثنا خاص اس ذات کے لئے ہے کہ جس کی صفت رہنمائی اور بخشش ہے۔ اور صبح وشام اسی کے حکم سے ہے۔ ستائش وتعریف خاص اس کے لئے ہے۔ اس کے

قبضہ قدرت میں تمام نعمتیں ہیں اور صبح و شام ہے۔ بے انتہا تحسین اور رحمت ان پر ہو جو صاحبِ فضائل اور صاحبِ نکات ہیں اور ان کا کلمہ و کلام بمنزل کنجی کے ہے اور اس کے مناقب بڑے ہیں، جن کی حدیثیں صحیح ہیں اور ان پر دائمی سلام ہو جو صبح و شام کی طرح پائیدار ہو۔

اس کے بعد واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بزرگ امام دانا، خدا کی عبادت کرنے والے اور حق کی راہ پر چلنے والے نظام الدین محمد بن احمد بن علی بخاری کو یہ توفیق دی کہ باوجود علم و فضل کی کثرت اور بلاغت و قدرت کے کمال اور حلم کے مرتبے اور مشائخ کبار کے مقبول اور علمائے نیکوکار کے منظور ہونے کے اس نے یہ اصل کتاب (مشارق الانوار) جو ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' کا نچوڑ ہے، ان سطور کے لکھنے والے (مولانا کمال الدین زاہد) سے شروع سے آخر تک انتہائی محنت و توجہ سے پڑھی اور اس پر بحث کر کے تنقیح کی اور اس کے معانی اور بنیاد کی اچھی طرح چھان بین کی۔ ان سطور کے لکھنے والے نے یہ کتاب دو شیوخ پیشوا زیرک اور کاملین سے پڑھی اور سنی۔

ان میں سے ایک ''آثار النیرین'' کی شرح کا جامع ہے۔ دوسرا صاحبِ دو درس یعنی صاحبِ علم ظاہر و باطن اور صاحب دو منبر یعنی علم شریعت و علم طریقت کا واعظ ہے، جو عظیم پیشوا، نہایت کامل اور نظم و نثر پر عبور رکھنے والا ہے اور ملت و دین کی دلیل ہے یعنی محمود ابی الحسن اسعد بلخی رحمتہ اللہ علیہ۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں شیوخ پر بہت سی رحمتیں نازل فرمائے۔ یہ دونوں اس کتاب کے لکھنے والے اور جمع کرنے والے سے روایت کرتے ہیں۔

میں ان (سلطان المشائخ) سے اس بات کی وصیت کرتا ہوں کہ مجھے اور میری اولاد کو اپنی دعاؤں کے وقت اپنی تنہائیوں سے فراموش نہ کرے۔ اس نے یہ کتاب مجھ سے اس مسجد میں پڑھی جو نجم الدین ابی بکر النوالسی سے منسوب ہے۔ یہ مسجد شہر دہلی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شہر کو آفات اور گزند سے محفوظ رکھے۔

یہ تحریر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے حقیر تر اور اس کے بندوں میں سے ضعیف تر محمد بن احمد بن محمد الماریکلی الملقب بہ کمال زاہد کی ہے۔ ان سطور کا ترجمہ، لکھنا، پڑھنا اور سننا ۲۲ ربیع الاول ۶۷۹ھ (۱۲۸۰ء) کو اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتے ہوئے ختم ہوا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء کو عطا کردہ علم حدیث کی اس سند کا ایک ایک لفظ آبِ

زریں سے لکھنے کے لائق ہے۔ نیز یہ کہ حضرت خواجہ کے استاد مکرم مولانا کمال الدین زاہد کے عالمانہ عجز و انکسار اور ان کے فضل و کمال کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے اور اس امر کی واضح طور پر نشاندہی کر رہا ہے کہ مولانا کمال الدین حنفی المذہب اور صوفی المشرب درویش تھے۔ اس لئے کہ ''مشارق الانوار'' کے مؤلف امام محمد بن حسن صاغانی اور ان کے شاگرد مولانا برہان الدین محمود بلخی دونوں حنفی المذہب تھے۔ مولانا بلخی اس حد تک صوفی المشرب تھے کہ سماع کو کسی قیمت پر چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔

فاضل اجل، یگانۂ عصر مولانا کمال الدین زاہد نے ۶۸۴ھ۔ ۱۲۸۵ء میں وفات پائی۔

برہان الدین بلخی

مولانا برہان الدین بلخی اپنے عہد کے بلند پایہ محدث اور جلیل القدر فقیہ تھے۔ انہوں نے شہرۂ آفاق ائمہ فقہا اور نامور محدثین سے اکتساب علم کیا۔ ان کے اساتذہ میں فقہ کے امام علامہ برہان الدین مرغینانی "صاحب ہدایہ" اور علمِ حدیث کے زبردست ماہر امام حسن صنعانی لاہوری ایسے اجل عالم و فاضل شامل ہیں: ان کا پورا نام مولانا برہان الدین محمود بلخی ہے۔ ان کے والدِ ماجد کا اسم گرامی شیخ ابو الخیر اسعد بلخی ہے۔ مولانا برہان الدین بلخ میں پیدا ہوئے اس لئے بلخی کہلائے۔ وہ حنفی المذہب اور صوفی المشرب بزرگ تھے۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی "اخبار الاخیار" میں لکھتے ہیں:

"شیخ برہان الدین محمود غیاث الدین بلبن کے زمانے کے بہت بڑے عالم اور صاحب فہم و ذکاء تھے۔"

شعر و شاعری اور وجد و سماع سے شغف رکھتے تھے۔ علوم شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ مولوی فقیر محمد "حدائق الحنفیہ" میں لکھتے ہیں کہ برہان الدین محمود بلخی اکابر علما و فضلا میں سے فقیہ محدث، جامع علوم عقلیہ و نقلیہ، واقفِ فنونِ رسمیہ و عرفیہ، صاحب شریعت و طریقت تھے اور شعر عارفانہ کہتے تھے۔ سید عبدالحئی حسنی نے "نزہۃ الخواطر" میں ان کا تعارف ان شاندار الفاظ میں کرایا ہے:

"امام العالم المحدث محمود بن ابو الخیر اسعد بلخی دہلوی ذکاوت و فہم کی رسائی میں مشہور تھے۔ اس زمانے میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ نحو، لغت، فقہ اور حدیث میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ اور علوم حکمیہ میں بھی فائقِ اقران

تھے۔"

شیخ محمد اکرام "آب کوثر" میں مولانا برہان الدین کے حالات اور ان کے علمی کمالات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"قاضی منہاج سراج اور قاضی صدر الدین عارف قضاء کی بلند ترین مسند پر بیٹھے۔ اُن کی پالیسی اور طریق کار نے فقہی روایات پر اثر ڈالا۔ لیکن علم فقہ کی تعلیم و تدریس کی بنیاد اور اس سرزمین کو قانونِ اسلامی کی سب سے زیادہ رائج کتاب "ہدایہ" کو فروغ دینے کا شرف اُس زمانے کے ایک عالم کو حاصل ہوا جن کا نام مولانا برہان الدین تھا۔"

شیخ محمد اکرام مزید لکھتے ہیں

"مولانا برہان الدین محمود بن ابو الخیر اسعد بلخی جو خالص مذہبی علوم میں قاضی منہاج سراج سے بہت بڑھے ہوئے تھے، بلخ میں پیدا ہوئے، فقہ "ہدایہ" کے مصنف شیخ برہان الدین مرغینانی سے پڑھی۔ آپ ہی کا اثر تھا کہ "ہدایہ" اسلامی ہندوستان میں فقہ کی سب سے اہم اور اساسی کتاب ہو گئی۔"

مولانا برہان الدین بلخی کی تعلیم اور درس و تدریس کے بارے میں شیخ محمد اکرام کی تحقیق یہ ہے کہ:

"حدیث میں آپ کا استاد ایک امام فن تھا، یعنی امام حسن صنعانی لاہوری۔ آپ نے ان سے مشارق الانوار کی سند حاصل کی۔ پھر ہندوستان میں تشریف لائے اور دہلی میں مشارق الانوار کا درس شروع کیا۔ جس سے اس کتاب کو درسِ حدیث میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔"

مشارق الانوار کو ہندوستان میں لانے کے بارے میں ڈاکٹر محمد اسحاق اپنی کتاب "علمِ حدیث میں پاک و ہند کا حصہ" (Contribution of India to the study of Hadith Literature) میں لکھتے ہیں کہ ہند میں حدیث کی جو کتاب سب سے پہلے دستیاب ہوئی وہ الصنعانی کی مشارق الانوار تھی اور اُسے الصنعانی کے ایک شاگرد برہان الدین محمود ساتویں صدی ہجری کے وسط میں دہلی لائے تھے۔

مولوی فقیر محمد جہلمی نے بھی یہ لکھا ہے کہ "شیخ برہان الدین محمود بلخی نے مشارق

الانوار کو اس کے مصنف سے سند کیا۔" صاحب "نزہتہ الخواطر" نے "خزینتہ الاصفیا" کے حوالے سے امام برہان الدین محمود کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"فقہ میں صاحب "ہدایہ" علامہ برہان الدین مرغینانی اور حدیث میں امام حسن صاغانی مصنف "مشارق الانوار" اُن کے اساتذہ ہیں۔ جب ہندوستان میں طرحِ اقامت ڈالی تو امراء و بادشاہ ان کو گھیرے رہتے۔ سلطان غیاث الدین بلبن ہر جمعہ کی نماز کے بعد حاضر ہو کر آپ کی صحبت سے مستفیض ہوتا۔ شعر و سخن میں بھی ملکہ تھا۔ سماع کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے روز بھی میں ہر صبح کو سماع کی درخواست کروں گا۔"

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اپنی مجلس میں اکثر مولانا برہان الدین بلخی کی بزرگی و عظمت کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ "فوائد الفواد" ملفوظات خواجہ نظام الدین مرتبہ امیر حسن سنجری اور "سیر الاولیاء" مولفہ سید امیر خورد کرمانی میں حضرت خواجہ کی زبانی مولانا برہان الدین بلخی کے متعلق متعدد روایات ملتی ہیں۔ چنانچہ سید امیر خورد کرمانی "سیر الاولیاء" میں لکھتے ہیں:

"سلطان المشائخ نے فرمایا کہ مولانا برہان الدین بلخی علم و کمال سے آراستہ ہونے کے علاوہ نہایت باصلاحیت انسان تھے۔ چنانچہ اکثر کہا کرتے تھے کہ خدائے عز و جل مجھ سے کسی گناہِ کبیرہ کے متعلق نہیں پوچھے گا۔ اس کے بعد سلطان المشائخ نے مسکرا کر فرمایا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ مجھ سے ایک کبیرہ کے متعلق پوچھا جائے گا۔ لوگوں نے ان سے دریافت کیا، وہ کونسا ہے؟ فرمایا سماع چنگ کے ساتھ، جو میں نے بہت سنا ہے اور اب بھی سنتا ہوں...

یہ بیان کرنے کے بعد سید امیر خورد کرمانی نے لکھا ہے کہ:

"اس کے بعد مولانا برہان الدین بلخی کی بزرگی کا ذکر چل پڑا۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ شیخ برہان الدین نے بیان کیا کہ میں ابھی بچہ ہی تھا، اندازاً میری عمر پانچ چھ سال کی ہوگی۔ میں اپنے والد کے ساتھ جا رہا تھا کہ اچانک راستے میں مولانا برہان الدین مرغینانی، صاحب "ہدایہ" سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے... جب مولانا برہان الدین مرغینانی کی سواری

میرے قریب آئی تو میں ان کے پاس چلا گیا اور سلام کیا۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھ کر فرمایا کہ میں اس لڑکے میں علم کا نور دیکھ رہا ہوں۔ میں نے یہ بات سنی اور آپ کی سواری کے ہم کاب چلنے لگا۔ پھر مولانا برہان الدین مرغینانی نے فرمایا، مجھ سے اللہ تعالیٰ یہ کہلواتا ہے کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر علامہ عصر بنے گا۔ مولانا برہان الدین محمود کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات بھی سنی اور آپ کی سواری کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر مولانا برہان الدین مرغینانی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کہلواتا ہے کہ لڑکا ایسا بزرگ ہوگا کہ شاہانِ وقت اس کے دروازے پر آئیں گے لیکن باریاب نہ ہوسکیں گے۔''

مورخ ضیاء الدین برنی نے اپنی بیش قیمت کتاب ''تاریخ فیروز شاہی'' میں لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے تخت نشین ہونے کے بعد شراب سے توبہ کر لی۔ بلکہ وہ اپنا زیادہ وقت عبادت، نفل، روزے رکھنے اور شب بیداری میں گزارنے لگا۔ یکایک اس کے دل میں نماز باجماعت، نماز جمعہ، اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد کا شوق پیدا ہو گیا۔ وہ مواسم میں ساری رات قیام کرتا۔ سفر و حضر دونوں میں وظائف و اوراد میں مشغول رہتا۔ کبھی بے وضو نہ رہتا اور علماء کی موجودگی کے بغیر کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتا۔ کھانے کے دوران علماء سے دین کے مسائل دریافت کرتا۔ علماء و مشائخ کا بے حد احترام کرتا۔ بزرگانِ دین سے ملنے ان کے مکانوں پر جاتا۔ نماز جمعہ کے بعد بڑی شان و شوکت کے ساتھ مولانا برہان الدین بلخی کے مکان پر جاتا اور اس عالم ربانی کی تعظیم و احترام کا پورا پورا لحاظ رکھتا۔''

دہلی میں مولانا برہان الدین بلخی کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ ان کے سب سے مشہور شاگرد علامہ کمال الدین زاہد تھے۔ جنہوں نے مولانا برہان الدین بلخی سے مشارق الانوار پڑھی۔ یہ وہی مولانا کمال الدین زاہد ہیں جن سے سلطان غیاث الدین بلبن نے درخواست کی تھی کہ وہ سلطان کی نماز کی امامت کرا دیا کریں۔ لیکن مولانا کمال الدین زاہد نے انکار کر دیا تھا۔ دہلی میں ان کا اپنا حلقۂ درس تھا۔ اُن کے فخر اُستاد شاگرد خواجہ نظام الدین اولیاء تھے جنہوں نے آپ سے مشارق الانوار کی تحصیل کی۔

مولانا برہان الدین بلخی نے برصغیر پاکستان و ھند کے دارالسلطنت دہلی میں اسلامی علوم وفنون بالخصوص حدیث و فقہ کے وسعت و فروغ میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ انہوں

نے فقہ و حدیث کی دو اہم اور بڑی کتابوں یعنی ''کتاب الہدایہ'' اور ''مشارق الانوار'' کو علمی حلقوں اور تعلیمی اداروں میں متعارف کرایا جو اپنی جگہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ علامہ برہان الدین مرغینانی اور امام حسن صنعانی ایسے جلیل القدر اساتذہ کے شاگرد اور مولانا کمال الدین زاہد ایسی صاحب کمال شخصیت کے استاد ہیں، جو ایک دو طرفہ اعزاز ہے۔

مولانا برہان الدین بلخی کی شہرت سلطنت دہلی کے ابتدائی دور کے سب سے بڑے عالم کی حیثیت سے ایک عرصہ تک قائم رہی۔ ڈاکٹر محمد اسحاق نے مولانا برہان الدین محمود کا سن وفات ۶۷۶ھ تحقیق کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے ۶۸۷ھ میں وفات پائی۔ ''محدث فہیم'' تاریخ وفات ہے۔ دہلی میں ان کا مزار حوض شمسی کے کنارے ایک پر فضا مقام پر واقع ہے۔ جس کو ''تختہ نور'' کہتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلی جو مولانا برہان الدین بلخی کے تین سو سال بعد کی شخصیت ہیں لکھتے ہیں کہ لوگ ان کے مزار کی خاک لڑکوں کو اس لئے کھلاتے ہیں کہ ان پر علم و فضل کے دروازے کھل جائیں۔

فخر الدین ناقلہ

قاضی فخر الدین ناقلہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے جید عالم اور ممتاز صوفی تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور عربی ادب میں کامل دسترس رکھتے تھے اور بزرگانِ دین کے بچپن ہی سے عقیدت مند تھے۔ درس و تدریس مشغلہ تھا اور ان کے علم و فضل کا دور دور تک چرچا تھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن بھی ان کا بہت مداح تھا۔ چنانچہ سلطان بلبن نے ان کے فضل و کمال کے پیش نظر انہیں اپنی مملکت کا قاضی بنا کر صدرِ جہاں کے عہدے پر مامور کر دیا۔ اور وہ ایک عرصے تک یہ فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

مولانا جمالی ''سیر العارفین'' میں شیخ حمید الدین ناگوری کے احوال بیان کرتے ہوئے سلطان المشائخ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ حمید الدین ناگوری ایسے صاحب حال اور صاحبِ کمال تھے کہ ہر شخص کو بیعت نہ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر میں صرف تین مرید کئے اور وہ تینوں مرید صاحبِ کشف اور کشف و کرامات میں مشہور ہوئے۔ ان میں سے ایک شیخ احمد نہروالی بدایونی، دوسرے شیخ شاہی رس تاب بدایونی اور تیسرے شیخ عین الدین قصاب تھے۔ شیخ احمد نہروالی حضرت خواجہ قطب الدین اوشی اور شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے منظورِ نظر تھے اور یہ دونوں اکابر مشائخ شیخ احمد نہروالی کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ شیخ احمد نہروالی کپڑا بننے کا کام کرتے تھے۔

شیخ حمید الدین ناگوری کے دوسرے مرید شیخ شاہی رسن تاب بدایوں میں رہتے تھے اور رسیاں بٹا کرتے تھے۔ بڑے صاحبِ کشف اور اہلِ حال تھے۔ لوگ ان کو ''شیخ شاہی روشن ضمیر'' کہتے تھے۔

شیخ حمید الدین ناگوری کے تیسرے مرید شیخ عین الدین قصاب تھے۔ جو شہر دہلی کے نوہنہ بازار میں قناوہ کھڑا کرتے اور اس پر گوشت فروخت کیا کرتے تھے۔ اہلِ کشف اور صاحب کرامت تھے۔ جس کے حق میں جو بات کہتے وہی ہو جاتی۔ شیخ نظام الدین بدایونی فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان قصاب کو دیکھا تھا اور ان کی صحبت میں بھی رہا ہوں۔ مخلوق ان سے فیوض و برکات حاصل کرتی تھی۔ قاضی فخر الدین ناقلہ ابتدائی زمانے میں ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دن شیخ عین الدین قصاب نے کہا کہ فخر الدین تمہارا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ میں کسی جگہ کا قاضی ہو جاؤں۔ ان کو جواب دیا کہ تم شہر کے قاضی ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔''

مؤرخ ضیاء الدین برنی نے، جو خود بھی خواجہ نظام الدین اولیاء کے مریدوں میں سے تھے اپنی قابل قدر تالیف ''تاریخ فیروز شاہی'' میں مولانا فخر الدین ناقلہ کا تذکرہ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے علماء، فقہاء اور صلحاء میں کیا ہے۔ مورخ برنی نے علائی عہد کے چھیالیس (۴۶) ممتاز علماء اور سربرآوردہ اساتذہ کے نام گنوائے ہیں جن میں قاضی فخر الدین ناقلہ سرفہرست ہیں جس سے مولانا فخر الدین ناقلہ کے علمی مرتبہ و مقام اور ان کی شخصیت کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ''علائی عہد کے علماء'' کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی مؤید الملک ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

''سلطان علاء الدین کے سارے عہد میں دارالحکومت دہلی میں ایسے علماء اور استاد موجود تھے جن میں ہر ایک علامۂ وقت سمجھا جاتا تھا اور ان جیسے علماء صرف بخارا، سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، اصفہان، رے اور روم میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں کہیں بھی نہ تھے۔ جس علم کو بھی لو خواہ منقولات میں خواہ معقولات میں، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ، معقولات، اصولِ دین، نحو، لفظ، لغت، معانی، بدیع، بیان، کلام، منطق، ہر ایک میں یہ لوگ باریک بینی سے کام لیتے اور موشگافیاں کرتے تھے۔ ہر سال بہت سے طالب علم ان لوگوں سے تعلیم حاصل کر کے خود درس دینے اور فتویٰ کے جواب دینے کے اہل اور مستحق ہو جاتے تھے اور ان میں سے بعض تو علوم وفنون میں کمال حاصل کر کے غزالی اور رازی کے مرتبے پر پہنچ گئے تھے۔ مثلاً قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی شرف الدین سرباہی، مولانا نصیر الدین غنی، مولانا تاج الدین مقدم، مولانا ظہیر الدین لنگ، قاضی مغیث الدین بیانہ، مولانا رکن الدین سنامی، مولانا تاج الدین کلاہی، مولانا ظہیر الدین بھکری،

قاضی محی الدین کاشانی، مولانا کمال الدین کولی، مولانا وجیہہ الدین پائلی، مولانا منہاج الدین قانی، مولانا نظام الدین کلاہی، مولانا نصیر الدین کڑہ، مولانا نصیر الدین صابونی، مولانا علاء الدین تاجر، مولانا کریم الدین جوہری، مولانا حجت ملتانی قدیم، مولانا حمید الدین مخلص، مولانا برہان الدین بھکری، مولانا افتخار الدین برنی، مولانا حسام الدین سرخ، مولانا وحید الدین ملہو، مولانا علاؤ الدین کرگ، مولانا حسام الدین ابن شادی، مولانا حمید الدین بنیانی، مولانا شہاب الدین ملتانی، مولانا فخر الدین ہانسوی، مولانا فخر الدین سقاقل، مولانا صلاح الدین ستر کی، قاضی زین الدین ناقلہ، مولانا وجیہہ الدین رازی، مولانا علاء الدین صدر الشریعۃ، مولانا میراں ماریکلہ، مولانا نجیب الدین ساوی، مولانا شمس الدین قمر، مولانا صدر الدین گندھک، مولانا علاء الدین لاہوری، مولانا شمس الدین یحییٰ، قاضی شمس الدین گاذرونی، مولانا صدر الدین قاری، مولانا معین الدین لونی، مولانا افتخار الدین رازی، مولانا معز الدین اندپنی، مولانا نجم الدین انتشار، یہ چھیالیس اساتذہ جن کے نام اور القاب میں (برنی) نے لکھے ہیں وہ ہیں۔ جن میں سے بعض کی میں (برنی) نے شاگردی کی ہے۔ بعض کی خدمت میں میں حاضر ہوا ہوں اور اکثر وہ جن کو میں نے مسندِ درس پر یا محفلوں اور مجلسوں میں دیکھا ہے۔ علاوہ ازیں مولانائی شرف الدین بویحیٰ اور دوسرے اساتذہ جن کے نام اور القاب میں نے یہاں نہیں لکھے ہیں، ان کے بہت سے شاگرد، عہد علائی میں زندہ تھے اور درس دیتے تھے۔ اگر میں تمام اساتذہ اور ان طالب علموں کا ذکر کروں جو مرتبہ معلمی پر پہنچ گئے تھے تو یہ بیان بہت طویل ہو جائے گا۔"

مورخ برنی نے علائی عہد کے منتخب علماء و اساتذہ، جو اس زمانے میں دارالسلطنت دہلی میں موجود تھے کے اسماء اور ان کے علمی مرتبہ و مقام کا ذکر کرنے کے بعد انتہائی دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ان علماء اور اساتذہ کے فضل و کمال کی نہ تو سلطان علاء الدین نے پذیرائی کی اور نہ اُس عہد کے لوگوں نے ان کی قدر کی حالانکہ یہ ایسے اربابِ علم و فضل تھے جن کے قدموں کی خاک کو آنکھوں میں لگانا چاہئے۔ اس زمانے میں، مجھے (برنی) بھی ان حضرات کے جلال و کمال کا صحیح اندازہ لگانے کی فہم نہ تھی۔ ان کے بعد نہ اُن جیسا اور نہ اُن کے علم کا ہزارواں حصہ رکھنے والا میری یا کسی دوسرے کی نظر سے گزرا ہے۔ میں ان علماء میں سے صرف چند ایک کی قدر و قیمت کو پہچان سکا ہوں۔ لیکن اس

کے باوجود اگر اب بھی ان میں سے ہر ایک کے علمی کمالات پر علیحدہ علیحدہ کتابیں بھی لکھوں تو وہ بھی کافی نہ ہوں گی۔ اس لئے کہ ان اساتذہ اور علماء میں سے ہر ایک اپنے زمانے کا امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن شیبانی تھا اور بڑے سے بڑے قاضی کے ہم سر و ہم پلہ تھا۔ اگر کوئی قاضی یا مفتی اپنے علم و فضل کی شان دکھاتا ہوا خراسان، ماوراء النہر، خوارزم یا کسی اور شہر سے دہلی میں آتا اور یہاں کے اساتذہ کے کمالات دیکھتا تو ان کی شاگردی میں زانوے ادب تہ کرتا اور اپنے علم کی کمی کو پورا کر لیتا۔ سمرقند، خوارزم یا عراق سے کسی بھی علم یا موضوع پر کوئی بھی کتاب شہر دہلی میں لائی جاتی اور دہلی کے اساتذہ اس کی تعریف کر دیتے تو وہ کتاب مستند و معتبر سمجھی جانے لگتی۔ ورنہ اپنی وقعت و اعتبار کھو بیٹھتی۔''

مؤرخ برنی کا یہ بیان صرف دہلی کے ان علماء کے بارے میں ہے جن کا تعلق درس و تدریس سے تھا۔ یعنی جو اساتذہ تھے۔ برنی نے علائی عہد کے قاضیوں، واعظوں، خطیبوں، قاریوں اور ذاکروں، مؤرخوں، شعراء، ادباء، ندماء، اطباء اور ماہرین فنون کا تذکرہ الگ سے اساتذہ کے ساتھ ہی کیا جو بیس سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور اس موضوع کو برنی نے ان الفاظ میں سمیٹا ہے:

> ''علاء الدین خلجی کے عہد کی تاریخ میں ان لوگوں کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ عہد اور زمانہ کیا عہد اور زمانہ تھا کہ جب ان نفیس علوم میں مہارت رکھنے والے اس تعداد میں موجود تھے تو پھر کیوں یہ زمانہ ایک مستثنیٰ عہد نہ ہوتا اور یہ شہر دنیا کے شہروں میں مستثنیٰ نہ ہوتا۔''

مؤرخ برنی کے ہم عصر امیر خسرو جو خود بھی بہت بڑے عالم تھے دہلی پر بہت فخر کرتے تھے اور اس کو قبہ اسلام کہا کرتے تھے۔

کتب تاریخ و تذکرہ میں مولانا فخر الدین ناقلہ کا ذکر سب سے پہلے صاحب کشف و کرامات بزرگ شیخ مین الدین قصاب کے حوالے سے آیا ہے۔ جنہوں نے ان کے حق میں قاضی بننے کی دعا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور سلطان بلبن (۶۶۴۔۶۸۵ھ) نے انہیں اپنی مملکت کا قاضی اور صدر جہاں مقرر کیا۔ مؤرخ برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' کا آغاز سلطان بلبن کے احوال و آثار سے کیا ہے۔ جبکہ قاضی

منہاج سراج نے اپنی تالیف ''طبقاتِ ناصری'' میں سلطان ناصر الدین محمود (۶۴۴ ـ ۶۶۴ھ) کے عہد تک کے حالات بیان کئے ہیں۔ گویا کہ تاریخ نگاری کے عمل کو قاضی منہاج نے جس عہد پر ختم کیا، اُس عہد سے ضیاء الدین برنی نے تاریخ نویسی کے عمل کا آغاز کیا ہے۔ اس طرح ''تاریخ فیروز شاہی'' کو بجا طور پر ''طبقات ناصری'' کے بعد کا حصہ یا دوسری جلد قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ طبقات ناصری بھی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور اس کی پہلی جلد تو بہت ضخیم ہے جس میں مسلمانوں کے مختلف شاہی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے بادشاہوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ مگر جہاں تک برصغیر کے سلاطین کی تاریخ کا تعلق ہے اس میں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سلطان ناصر الدین محمود بن سلطان التمش تک کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں اور اسے سلطان ناصر الدین سے منسوب کر کے پوری کتاب کا نام ''طبقاتِ ناصری'' نام رکھا گیا ہے۔

برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' میں سب سے پہلے تاریخ نویسی کے انتہائی مفید اور قابلِ قدر اصول بیان کئے۔ جنہیں ہر مؤرخ کو تاریخ لکھتے وقت پیش نظر رکھنا چاہئے اور خود برنی کی تاریخ نگاری کا ایک اصول جو انہوں نے بیان تو نہیں کیا لیکن انہوں نے ہر سلطان کے احوال بیان کرتے وقت ملحوظ خاطر رکھا ہے یعنی کہ وہ ہر سلطان کے عہد کے حالات قلمبند کرنے سے پہلے ایک پورے صفحے پر اس سلطان کے عہد کے امرائے سلطنت اور عہدیداروں کے نام لکھتے ہیں۔ چنانچہ بلبن کے احوال ضبط تحریر میں لانے سے پہلے انہوں نے اس کے امرائے سلطنت کی جو فہرست دی ہے اس میں پہلا نام ''قاضی صدر جہاں، فخر الدین ناقلہ'' کا ہے۔ گویا کہ مؤرخ برنی نے اپنی تالیف ''تاریخ فیروز شاہی'' کا آغاز ہی فخر الدین ناقلہ کے مبارک نام سے کیا ہے۔

مولانا فخر الدین ناقلہ سلطان جلال الدین خلجی (۶۸۹ـ۶۹۵ھ) کے عہد میں بھی دہلی کے صدر جہاں اور قاضی تھے اور سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے اپنے قضاۃ اور صدور کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہا تھا کہ اس کے نام کے ساتھ ''المجاہد فی سبیل اللہ'' کا لقب بھی استعمال کیا جائے۔ چنانچہ برنی نے لکھا ہے کہ سلطان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ مغلوں کے خلاف برسوں جہاد کرتا رہا ہے، اس لئے جمعہ کے خطبہ میں اسے ''المجاہد فی سبیل اللہ'' کہا جائے۔ سلطان نے اپنی بیوی ملکہ جہاں سے کہا کہ جب کسی تقریب کے موقع پر قاضی اور صدر مبارک باد دینے کے لئے حرم میں آئیں

تو تم ان کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ وہ دربار میں مجھ سے درخواست کریں کہ خطبے میں مجھے ''المجاہد فی سبیل اللہ'' کہا جائے۔ چنانچہ سلطان کے کہنے کے مطابق ملکہ جہاں نے اس کا یہ پیغام شہر دہلی کے صدور تک پہنچا دیا۔ انہوں نے اس پیغام کو پسند کیا اور کہا کہ بہ ہمہ وجوہ یہ لازمی وضروری معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا جس نے برسوں مغلوں کے خلاف جنگ کی ہے، خطبوں میں ''المجاہد فی سبیل اللہ'' کے لقب کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ چنانچہ جب شہر کے صدور و اکابر مہینے کی پہلی تاریخ سلطان کو مبارک باد پیش کرنے آئے اور شرف دست بوسی حاصل کیا تو قاضی فخر الدین ناقلہ نے جو اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے، ایک درخواست جو سلطان کے مقصد و مطالب پر مشتمل تھی، ان کے اکابر اور صدور کی طرف سے مفصل پڑھ کر سنائی، جو وہاں موجود تھے اور حاضرین کی طرف سے التماس کی کہ جمعہ کے دن خطبوں میں سلطان کے نام کے ساتھ ''المجاہد فی سبیل اللہ'' کہا جائے۔ سلطان سمجھ گیا کہ ملکہ جہاں نے ان لوگوں تک یہ پیغام پہنچا دیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے صدور سے مخاطب ہو کر تمام کیفیت بیان کی اور کہا کہ میں پچھلے کچھ روز سے سوچتا رہا ہوں کہ میں نے زندگی میں کبھی جہاد کیا بھی ہے یا نہیں؟ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میں نے اپنی ساری عمر میں شہرت، دولت اور طمع کے بغیر کبھی بھی تلوار نہیں چلائی۔ اور نہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی صرف خدا کے لئے جہاد کیا ہے۔ اس لئے میں اپنی اس آرزو پر جو ملکہ جہاں کے پیغام کے ذریعے تم لوگوں تک پہنچی ہے انتہائی ندامت و پشیمانی کا اظہار کرتا ہوں اور اس حقیقت کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے جو لڑائی بھی مغلوں سے لڑی وہ محض شہرت اور خودنمائی کے لئے لڑی۔ میں نے تمام جنگیں اپنی حکومت اور شہرت کے واسطے لڑی تھیں۔ علاء کلمہ حق کے لئے اور شہادت کی آرزو میں اور جہاد کی خاطر میں نے کوئی جنگ نہیں لڑی۔

صدور شہر اور امرائے سلطنت نے اس سلسلے میں بہت اصرار کیا مگر سلطان نے اس کو روا نہیں رکھا کہ خطبوں میں اس کو ''المجاہد فی سبیل اللہ'' کہا جائے۔ اس واقعے سے جہاں خلجی سلطان کے صدقِ معاملات کا ظاہر اور باطن روشن ہو جاتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی آشکار ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمان خواص ہوں یا عوام ہمیشہ ہی سے دہلی کے تمام سلاطین کو بلا استثناء اسلام کے نمائندے، مبلغ اور علمبردار سمجھتے چلے آئے ہیں جو ایک بہت بڑی خوش فہمی ہی نہیں بلکہ انتہائی سنگین تاریخی غلطی ہے۔ اس غلطی کے مرتکب

اکثر و بیشتر مؤرخین بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی کتب تاریخ میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی حکومت کو اسلامی حکومت ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کی ہیں۔ جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ سلاطین دہلی میں کسی ایک سلطان نے بھی اسلامی نظام حکومت نافذ کرنا تو درکنار، اسلام کی تبلیغ و اشاعت تک کے لیے سعی و کوشش نہیں کی۔ اس حقیقت کو غیر جانب دار غیر مسلم مؤرخین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مثلاً چیٹر جی اینڈ مورلینڈ نے اپنی کتاب ''**A Short History of India**'' (مختصر تاریخ ہند) میں لکھا ہے کہ سلاطین دہلی میں سے سکندر لودھی وہ واحد سلطان ہے جس نے اسلام کو سرکاری سطح پر پھیلانے کے لیے کچھ اقدامات کیے تھے —— جب کہ فتاویٰ تاتار خانیہ اور فتاویٰ عالمگیری اسلامی احکام و قوانین کو مرتب و مدون کرنے کی علمی و فقہی کاوشیں تھیں۔ حنفی فقہ پہلے سے مرتب و مدوّن موجود تھی۔ چونکہ ملکی نظم و نسق کو چلانے اور ملک میں امن و امان قائم و برقرار رکھنے کے لے کسی نہ کسی انتظامی ڈھانچے، انتظامی و معاشرتی قوانین اور عدالتی نظام کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے سلاطین دہلی کو کسی نہ کسی مجموعۂ قوانین کو اختیار کرنا اور کسی نہ کسی عدالتی نظام کا اپنانا تھا، چنانچہ ان کی نظر فقہ حنفی پر پڑی۔

حنفی فقہ کی صورت میں اسلامی احکام و قوانین مرتب و مدوّن موجود تھے۔ اور اس زمانے میں ایران، عراق، ترکستان، افغانستان اور مصر کے علاوہ برصغیر میں علماء کی ایک کثیر تعداد حنفی علماء و فقہاء پر مشتمل تھی۔ دنیائے اسلام میں حنفی فقہ پر متعدد قابلِ قدر کتب، فتاویٰ بھی منظر عام پر آ چکے تھے۔ اس طرح حنفی فقہ میں اس قدر وسعت و گہرائی اور آفاقیت تھی جس کی بدولت بڑی سے بڑی مملکت کے نظم و نسق کو چلایا جا سکتا تھا اور ہر قسم کے درپیش امور و مسائل کے مناسب حل تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ حنفی فقہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احکام کا اثبات قیاس اور دلائل عقلیہ سے کیا گیا ہے اور حنفی علماء نے ایسی کتب فقہ لکھی ہیں جن میں ہر ایک قولِ حنفی پر حدیثِ صحیح کو وارد کر کے اس کا اثبات کیا گیا ہے بلکہ بعض حنفی علماء نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ہر ایک مطلب پر آیت اور حدیث کو معالاتے ہیں۔ اس لئے سلاطینِ دہلی نے حنفی فقہ کو اختیار کیا۔ لیکن یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ سلاطینِ دہلی نے فقہ حنفی یعنی شریعت اسلامی کو مکمل طور پر نافذ کرنے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی بلکہ انہوں نے اس کو اسی حد تک نافذ العمل کیا جس حد تک انہوں نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ برصغیر کے کسی سلطان نے نہ

تو احکام شریعت کو مکمل طور پر نافذ کرنے کی کوشش کی اور نہ اسلام کو اپنی مملکت کا مذہب قرار دیا۔

سید صباح الدین عبدالرحمن اپنی تالیف ''ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں کہ ''سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں علماء زیادہ تر نیشا پور، صفان، غزنی، کاشان، بلخ، سجستان، خوارزم اور تبریز سے آئے اور اپنے ساتھ حنفی فقہ لائے۔ حجاز سے آنے والے علماء کی تعداد کم رہی۔ اس لئے ہندوستانی فقہ میں عراقی اور ترکستانی اثرات زیادہ غالب رہے اور یہی فقہ ہندوستان میں رائج رہی۔ جس کی باضابطہ تدوین فتاویٰ تاتار خانی اور فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں ہوئی۔'' آگے چل کر سید صاحب پھر لکھتے ہیں کہ ''حنفی فقہ کی ترویج اور اس کی باضابطہ تدوین فتاویٰ عالمگیری کی شکل میں ہوئی۔ جس کو عالمگیر کا ایک عظیم الشان علمی و فقہی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حنفی فقہ سے شافعی، مالکی، حنبلی اور شیعی فقہ کا تصادم ضرور ہوا لیکن اکثریت حنفی فقہ کے ماننے والوں ہی کی رہی۔ اور یہ مغلوں کی بادشاہت کا دلچسپ پہلو ہے کہ وزارت کے عہدہ پر زیادہ تر شیعہ امراء مامور رہے، محل ایک عرصہ دراز تک راجپوت شہزادیوں کے زیر نگیں رہا۔ لیکن سلطنت پر حنفی فقہ کا غلبہ رہا جو مغل فرمانرواؤں کی غیر معمولی رواداری کا ثبوت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ حنفی علماء کے اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی سراہنے کے لائق ہے۔''

ان تاریخی حقائق و شواہد کے پیش نظر مغل حکم رانوں سمیت سلاطین دہلی کا روادار و رعایا پرور، منصف و عدل گستر اور علم دوست اور علماء کا قدردان ہونے کے علاوہ بڑی حد تک ہر قسم کے مذہبی و قومی اور قبائلی و علاقائی تعصبات سے مبرا اور ہر نوع کے نسلی و وطنی مفاخرات اور اقتصادی و طبقاتی تقسیم سے بلند و بالا ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ برصغیر کے مسلم سلاطین کی ان خصوصیات کی متشکل ہونے میں اسلامی تعلیمات کے علاوہ برصغیر کے علماء و مشائخ کے دینی جذبہ و جوش، روحانی قوت و عظمت اور عوام و خواص میں اُن کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کا بہت بڑا حصہ تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ برصغیر کے بعض مسلمان حکمران طبعاً روادار، رعایا پرور، علم دوست، علماء کے قدردان اور منصف و عدل گستر واقع ہوئے تھے۔

سید صباح الدین نے جو حنفی فقہ کی تعریف کرنے کے علاوہ حنفی علماء کی اثر آفرینی کی صلاحیت کو سراہا ہے تو اس پر حنفی فقہ کے غالب رہنے اور حنفی علماء کی کامیابی میں ایک

بہت بڑا عنصر تصوف کا رہا ہے۔ اس لئے کہ حنفی علماء کی واضح اور غالب اکثریت مشائخ، صوفیہ کرام پر مشتمل تھی۔

مبلغ اسلام شیخ اسماعیل لاہوری (متوفی ۴۴۸ھ - ۱۰۵۶ء) اور ان کے ہم عصر حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ (متوفی ۴۵۶ھ - ۱۰۷۳ء) سے حضرت مجدد الف ثانی (متوفی ۱۰۳۴ھ - ۱۶۲۴ء) اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۲ھ - ۱۷۱۲ء) تک اور خواجہ معین الدین اجمیری (۶۳۳ھ - ۱۲۳۶ء) اور ان کے خلیفہ اعظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۶۳۲ھ - ۱۲۳۴ء) سے لے کر مولانا عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ - ۱۶۴۲ء) اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی (متوفی ۱۰۶۶ھ - ۱۶۵۶ء) تک اور خواجہ نظام الدین اولیاء (متوفی ۷۲۵ھ - ۱۳۲۵ء) اور ان کے دو درجن اکابر خلفاء و اجلہ علماء سے لے کر قاضی ثنا اللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ - ۱۸۱۰ء) اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۲۹ھ - ۱۸۱۴ء) تک اور مولانا برہان محمود بلخی (متوفی ۶۸۷ھ - ۱۲۸۸ء) اور ان کے قریب العہد قاضی محی الدین کاشانی (متوفی ۷۱۹ھ - ۱۳۱۸ء) سے لے کر مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ - ۱۷۸۶ء) اور ان کے قریب العہد بزرگ بحر العلوم ملا عبدالعلی محمد بن نظام الدین لکھنوی (متوفی ۱۲۲۵ھ - ۱۸۱۰ء) تک کے بے شمار علماء، فضلاء، فقہاء، محدثین اور مفسرین قرآن، منقولات و معقولات کے ماہرینِ بے بدل اور شریعت و طریقت کے جامع حنفی المذہب ہونے کے علاوہ یا تو اکابر مشائخ تھے یا پھر حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔ جبکہ سلسلہ عالیہ سہروردیہ سے متعلق اکثر بزرگانِ دین شافعی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔

قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور اویسیہ سلاسلِ روحانی کے اکابر مشائخ دینی، علمی اور روحانی، ہر لحاظ سے آج بھی زندہ و تابندہ شخصیات میں سے ہیں۔ ان اکابر علماء و مشائخ نے برصغیر میں جہاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت میں انقلاب آفریں اور تاریخ ساز کردار ادا کیا وہاں وہ سلاطین کے مزاج و کردار، ان کے مذہبی رویوں اور حکومتی پالیسیوں پر اثر انداز بھی ہوتے رہے۔ قطب الدین ایبک سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک برصغیر کے تمام سلاطین کسی نہ کسی انداز میں مشائخ سے متاثر تھے۔ یا تو وہ قطب الدین ایبک، التمش، بلبن، ناصر الدین محمد، فیروز شاہ تغلق، سکندر لودھی، اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی طرح دلی طور پر ان

کے عقیدت مند تھے یا پھر ناصر الدین قباچہ، جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، اور قطب الدین مبارک شاہ کی طرح ان کے روحانی اثر و رسوخ سے دلی طور پر خوف زدہ اور ہراساں تھے۔ مگر بظاہر عقیدت مند تھے۔

مورخ برنی نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے عہد کے قابل صد احترام علماء کی قدر نہیں کی۔ علاء الدین خلجی صوفیہ کرام کا عقیدت مند تھا۔ فتوحات کے لئے ان سے دعا کی درخواستیں کرتا تھا۔ ان کی زیارت کرنا اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ اس نے دو مرتبہ شاہ رکن عالم ملتانی سہروردی کو دہلی آنے کی دعوت دی اور ہر بار اپنے امراء و وزراء سمیت ان کے استقبال کے لئے دہلی سے باہر آیا اور ان کو انتہائی عزت و توقیر کے ساتھ محل لے گیا۔ ہر مرتبہ خلجی سلطان نے شاہ رکن عالم کی آمد پر دو لاکھ اور اُن کی واپسی پر پانچ لاکھ تنکے بطور نذر پیش کئے۔ یہ سب رقوم شاہ رکن عالم نے دہلی کے فقراء میں تقسیم کر دیں۔ علاء الدین اپنی حکومت کے ابتدائی عہد میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے عوام و خواص میں اثر و رسوخ سے خوف زدہ تھا اور انہیں اپنی حکومت کے لئے خطرہ تصور کرتا تھا۔ اس لئے کہ سلطان کے امراء و متوسلین میں سے ایک بڑی تعداد حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھی۔ خود اس کا محبوب بیٹا خضر خان بھی ان کا مرید تھا۔ لیکن بعد ازاں خلجی سلطان خود بھی حضرت خواجہ کا معتقد ہو گیا تھا اور اس نے متعدد بار حضرت خواجہ سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن حضرت خواجہ اس سے ملاقات کرنے کے لئے کسی طور تیار نہ ہوئے اور صاف منع کر دیا۔ اس کا ذکر مورخ برنی نے بھی کیا۔ سلطان نے امیر خسرو سے کہا کہ وہ کسی دن بغیر اطلاع کے حضرت خواجہ کی خانقاہ میں چلا جائے گا اور ان کی خدمت میں حاضری دے گا۔ امیر خسرو نے سلطان کے منع کرنے کے باوجود حضرت خواجہ کو سلطان کے اس ارادے سے آگاہ کر دیا تو حضرت خواجہ نے فرمایا کہ سلطان سے کہہ دینا کہ میری خانقاہ کے دو دروازے ہیں۔ سلطان ایک دروازے سے داخل ہو گیا تو میں دوسرے دروازے سے باہر چلا جاؤں گا۔

بہر حال علاء الدین خلجی نے حضرت خواجہ کے ساتھ غائبانہ عقیدت و ارادت کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کی دعاؤں کا طالب رہا۔ قلعہ ورنگل کی فتح پر سلطان بہت پریشان تھا، چنانچہ مورخ برنی ہی کے بیان کے مطابق ''سلطان نے ملک قرا بیگ اور قاضی مغیث الدین بیانہ کو شیخ نظام کے پاس بھیجا کہ ان سے جا کر عرض کریں کہ لشکر اسلام کی

خبر نہ آنے کے باعث میرا دل فکر مند ہے۔ آپ کو اسلام کا غم مجھ سے زیادہ ہے، اگر نور باطن کے ذریعے لشکر اسلام کا کچھ حال آپ پر ظاہر ہوا ہو تو کوئی اچھی خبر میرے پاس بھی بھیجیں۔ یہ پیغام لے جانے والوں سے سلطان نے کہا کہ 'یہ پیغام سنانے کے بعد جو حکایت یا واقعہ شیخ کی زبان سے سنو وہ اسی طرح بے کم و کاست آکر بیان کرو۔ ان دونوں نے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلطان کا پیغام ان کو پہنچایا، جس پر شیخ نے فرمایا 'یہ فتح کیا، ہم کو اور فتوحات کی بھی امید ہے'۔ ملک قرابیگ اور قاضی مغیث بیانہ نے جو کچھ شیخ کی زبان سے سنا تھا واپس آکر سلطان کی خدمت میں عرض کر دیا۔ سلطان بہت خوش ہوا اور اس کو یقین ہو گیا کہ قلعہ ورنگل یقیناً فتح ہو گیا ہے۔ خدا کے حکم سے اسی روز نماز عصر کے وقت ملک نائب کی ڈاک آئی تو اس میں ورنگل کا فتح نامہ بھی تھا۔'' قلعہ ورنگل کی فتح کے بعد علاء الدین خلجی کو خواجہ نظام الدین کی دعاؤں سے اور بہت سی جنگی کامیابیاں حاصل ہوئیں جن کی تفصیلات ''تاریخ فیروز شاہی'' میں برنی نے بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ ورنگل کی فتح کے بعد سلطان علاء الدین کا اعتقاد شیخ کی کرامت اور بزرگی میں اور زیادہ پختہ ہو گیا۔ اگرچہ سلطان کی شیخ نظام الدین سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن اس کے پورے عہد میں اس کی زبان سے شیخ سے متعلق کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس سے شیخ کو آزردگی ہوتی، باوجودیکہ حاسدین شیخ کے خلاف بہت باتیں کر کے سلطان کے کان بھرتے رہتے تھے۔

مورخ برنی نے علاء الدین کے عہد کی عجائب روزگار دس باتیں شمار کی ہیں جن میں دسویں اور آخری عجیب بات بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے:

> ''دسویں عجیب چیز جو عجائب میں عجیب ترین تھی کہ سلطان کے ارادہ و اہتمام کے بغیر دہلی رشک بغداد، غیرتِ مصر، ہمسرِ قسطنطنیہ اور بیت المقدس کا ہم پلہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ علائی عہد کے مشائخ میں سے شیخی کا سجادہ، جو پیغمبری کی نیابت ہے، شیخ الاسلام نظام الدین، شیخ الاسلام علاء الدین (اجودھنی) اور شیخ الاسلام رکن الدین (ملتانی) سے آراستہ تھا اور ان کے انفاسِ متبرکہ سے ایک عالم منور تھا۔ ساری دنیا ان حضرات کے ہاتھ پر بیعت کرتی تھی اور ہزاروں فاسق و فاجر توبہ کر کے راہِ راست پر آ جاتے تھے۔ ان کی توبہ مستقل شکل اختیار کر گئی اور لازمی و متعدی عبادات ان کا معمول بن گئی تھیں۔

لوگوں کے دلوں میں ایمانداری آ گئی تھی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان پر برستی تھی اور آسمانی مصائب کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ برصغیر کے لوگ مغلوں کے حملوں کی بہت بڑی مصیبت سے بھی محفوظ ہو گئے تھے...

ان تین مبارک ہستیوں کے معاصرین نے جب ان بزرگوں کے یہ معاملات دیکھے تو ان میں بھی شعار اسلام راسخ ہو گئے اور شریعت و طریقت کے احکامات کو نئی رونق حاصل ہو گئی۔"

مؤرخ برنی کی ان تحریروں اور دیگر کتب تاریخ کے مطالعہ سے یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کو وسعت و فروغ دے کر اسلامی شعار کو عام کرنا اور احکام شریعت کی رونق کو بڑھانا مشائخ اور صوفیہ کا فریضہ تھا اور سلاطین کے طاغوت اور اس کی شیطانی قوتوں کو قابو میں لا کر ان سے عوام کی فلاح و بہبود کے نیک کام کرانا بھی ان بزرگان دین کی کارگزاری تھی۔ جسے ان کی کرامت پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ یہ علماء و مشائخ اور سلاطین و امراء کے مابین ایک قسم کی رسہ کشی تھی، بالفاظِ دیگر روحانی اور طاغوتی طاقتوں کے درمیان ایک تاریخی کشمکش —— اگر علماء و مشائخ کا حلقۂ اثر وسیع اور مضبوط ہوتا اور اپنے فضل و کمال اور روحانیت کے لحاظ سے وہ طاقتور ہوتے تو سلاطین و امراء ان کی خانقاہوں میں حاضر ہو کر ان کی آستان بوسی کو اپنی سعادت سمجھتے۔ اس طرح علماء و مشائخ اپنے نور باطن اور اپنے حلقۂ اثر سے سلاطین و امراء کو متاثر و مسحور کر کے انہیں عوام دوستی، علم پروری، رواداری و راستبازی اور نیک چلنی پر مجبور کر دیتے اور اگر علماء و مشائخ میں مطلوبہ روحانی طاقت و توانائی نہ ہوتی یا ان کے افکار و کردار اور ان کے پیغام اور اعمال میں کوئی تضاد ہوتا تو عیار و شاطر سلاطین و امراء ان کی کمزوریوں، خامیوں اور ان کے قول و فعل اور گفتار و کردار کے تضاد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر نہ صرف غالب آ جاتے بلکہ اپنے شیطانی مقاصد کی تحصیل و تکمیل کی خاطر انہیں بھی اپنا آلۂ کار بنا لیتے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ بادشاہ کے امیر، وزیر اور مشیر اگر لائق، فائق، صاحب امانت و دیانت اور نیک و پرہیزگار اور بزرگانِ دین کے عقیدت مند ہوتے تو بادشاہ کا راہِ راست سے بھٹک کر غلط روش اختیار کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا تھا۔ اور اگر بادشاہ کے امیر، وزیر اور مشیر ہی جاہ طلب، مفاد پرست بدعنوان اور خائن ہوتے تو وہ ایک

نیک چلن، عوام دوست اور رعایا پرور بادشاہ کو بھی بہ آسانی فسق و فجور، لہو ولعب، عیش و عشرت کا دلدادہ بنا کر ظلم و ستم اور جبر و تشدد پر آمادہ کر دیتے تھے۔

اس تحلیل و تجزیہ کے بعد یہ حقیقت آشکار ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ برصغیر کی ہزار سالہ تاریخ میں علماء و مشائخ کے مزاج و کردار، ان کے علم و فضل اور عزم و استقامت کو بنیادی اور مرکزی اہمیت وحیثیت حاصل رہی ہے اور یہاں کے مسلمان حکمرانوں میں معدودے چند حکمرانوں سے قطع نظر سلاطین ہند ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے شاہانہ مزاج و کردار اور اپنے شاہی دربار کے آداب اور حکمت عملی کا تعین کرنے والے اور ملکی حالات و واقعات کی مختلف النوع سمتوں اور جہتوں کا اندازہ کر کے چلنے والے اور قوت ایمانی کی بجائے تلوار کے بل بوتے پر حکومت کرنے والے تھے۔ ہندوستان کے مسلم سلاطین کا سب سے بڑا مسئلہ یہاں کی غیر مسلم اکثریتی آبادی یعنی ہندوؤں کی تائید وحمایت حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سلاطین ملکی مصالح کے تابع رہ کر اپنی حکومت کی حکمتِ عملی وضع کرتے تھے اور اپنی غیر مسلم رعایا کے حقوق و مراعات کا بطور خاص خیال رکھتے تھے۔

بہر حال مولانا فخر الدین ناقلہ کا شمار پسندیدہ اوصاف سے متصف فاضل و کامل علماء میں ہوتا ہے۔ وہ مولانا شمس الدین خوارزمی، قاضی رفیع الدین گازرونی، قاضی جلال الدین کاشانی بن قاضی قطب الدین کاشانی، قاضی رکن الدین سامانوی اور قاضی ظہیر الدین ایسے بلند مرتبہ علماء کے ہم عصر تھے۔

مولانا فخر الدین ناقلہ کا سنِ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔

جلال الدین کاشانی (ثانی)

قاضی جلال الدین کاشانی ثانی کا تذکرہ جلال الدین فیروشاہ خلجی کے عہد کے ممتاز علماء میں ملتا ہے جب کہ قاضی جلال الدین کاشانی اوّل کا تعلق شمسی سلاطین کے ساتھ تھا۔ قاضی جلال الدین کاشانی اوّل سلطان معزالدین بہرام شاہ اور سلطان ناصرالدین محمود کے قاضیِ ممالک تھے۔ ان کے احوال ان کے ہم عصر مؤرخ اور ہم چشم امیر قاضی منہاج سراج نے ''طبقاتِ ناصری'' میں قلم بند کیے ہیں اور ان کا انتقال ۶۴۸ھ میں ناصرالدین محمود کے عہد (۶۴۴ تا ۶۶۴ھ) میں ہوا۔ جبکہ قاضی جلال الدین کاشانی ثانی کے احوال ان کے معاصر مؤرخ ضیاء الدین برنی نے اپنی تالیف ''تاریخ فیروز شاہی'' میں رقم کیے ہیں اور سلطان معزالدین کیقباد (۶۸۶ تا ۶۸۹ھ) کے امرائے سلطنت کی فہرست میں پہلا نام ''قاضی، صدر جہاں، جلال الدین کاشانی'' کا دیا ہے۔ علاوہ ازیں مؤرخ برنی نے اپنی کتاب کے آغاز ہی میں قاضی جلال الدین کاشانی کے والد کا نام قاضی قطب الدین کاشانی قاضیِ لشکر لکھ دیا ہے۔

عہد بلبنی (۶۶۴ تا ۶۸۶ھ) کے علماء و مشائخ کا تذکرہ کرتے ہوئے مؤرخ برنی نے لکھا ہے۔

''بلبن کے زمانے میں کچھ لوگ عہد شمسی کے بزرگوں میں سے زندہ تھے اور خود اس کے اعوان و انصار میں بھی چند ملوک ایسے پیدا ہو گئے تھے جنہیں ''نوادر ملوک'' کہا جا سکتا ہے۔ ان بزرگوں اور ملوک کی بدولت بلبن کا عہد ہر لحاظ سے قابلِ اعتبار ہو گیا تھا۔ مثلاً سادات میں جو اس امت کے بزرگوں میں سب سے زیادہ بزرگ ہیں، بدایوں کے

قاضیوں کے جدِ اعلیٰ قطب الدین شیخ الاسلام شہر، سید مبارک کے بیٹے سید منتخب الدین اور سید جلال الدین اور سید معین الدین سامانہ، سادات گردیز، سادات عظام کیتھل، سادات بیانہ، سادات بدایوں اور اسی طرح کے دوسرے سادات کے خاندان جو چنگیز خان ملعون کے حملوں کے باعث یہاں آ گئے تھے، ان میں سے ہر ایک صحیح النسب اور ذاتی کمالات کے لحاظ سے بے مثل، انتہائی دیندار اور متقی تھا اور وہ عہد جس میں ایسے بزرگ سادات موجود ہوں خیرالآثار کیوں نہ ہوگا؟ عہد بلبنی میں بہت سے نامور علماء جن کو نوادر اساتذہ کہا جا سکتا ہے، موجود تھے اور تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔ مثلاً مولانا برہان الدین بلخی، مولانا برہان الدین بزاز، مولانا فخرالدین رازی کے تلمیذ مولانا نجم الدین دمشقی، مولانا سراج الدین، مولانا اشرف الدین ولواجی، صدر جہاں منہاج الدین جرجانی، قاضی رفیع الدین گازرونی، قاضی شمس الدین سراجی، قاضی رکن الدین سامانہ، قاضی جلال الدین کاشانی پسر قطب الدین کاشانی قاضیِ لشکر، قاضی سدید الدین، قاضی ظہیر الدین، قاضی جلال الدین اور بہت سے اور اساتذہ، مفتی اور سربرآوردہ علماء جو عہد شمسی کے علماء کے شاگرد تھے، یا ان کی اولاد میں تھے، درس دینے اور فتاویٰ کے جواب لکھنے میں معتبر سمجھے جاتے تھے۔ یہ سب اساتذہ جن میں سے ہر ایک اس پایہ کا تھا کہ اس سے پوری اقلیم زینت حاصل کر سکتی تھی، عہد بلبنی کو مزیّن کئے ہوئے تھے۔"

اس طرح مؤرخ برنی نے ان قاضی جلال الدین کاشانی پسر قاضی قطب الدین کاشانی قاضیِ لشکر کے احوال بیان کئے ہیں جو بلبن کے پوتے سلطان معزالدین کیقباد کے عہد میں قاضی اور صدر جہاں کے عہدے پر مامور تھے اور جن کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۶۸۹ تا ۷۲۰ھ) کے عہد میں سیدی مولہ کی شہادت کے سلسلے میں آیا ہے۔ جبکہ قاضیِ اودھ اور قاضیِ ممالک، قاضی جلال الدین کاشانی (متوفی ۶۴۸ھ) عہد شمسی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے حالات قاضی منہاج سراج نے "طبقاتِ ناصری" میں بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ انہوں نے سلطان ناصرالدین محمود (۶۴۴-۶۶۴ھ) کے عہد میں ۱۷ ذی قعدہ ۶۴۸ھ - ۱۶ جنوری ۱۲۵۴ء کو وفات پائی۔ اس لئے ہم نے عہد شمسی کے قاضی جلال الدین کاشانی کو "اوّل" اور بلبنی اور خلجی عہد کے قاضی جلال الدین کاشانی کو "ثانی" قرار دیا ہے تاکہ دونوں حضرات میں فرق و امتیاز اور تخصیص ہو سکے۔

مولانا عبدالحئی حسنی نے بھی ''نزہۃ الخواطر'' میں ان دو حضرات کے حالات بالترتیب حصہ اوّل اور حصہ دوم میں رقم کیے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحئی نے زیر بحث قاضی جلال الدین کاشانی کے بارے میں ''تاریخ فیروز شاہی'' کے حوالے سے عنوان کے علاوہ صرف یہ ایک جملہ لکھا ہے: ''قاضی جلال الدین کاشانی (بہ عہد سلطان معزالدین کیقباد) ''عالم دین تھے، سلطان معزالدین نے انہیں عہدۃ قضاۃ عطا فرمایا اور جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے ان کا دہلی سے بدایوں کی قضاۃ پر تبادلہ کر دیا''۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالحئی نے ''نزہۃ الخواطر'' کی جلد دوم میں شیخ محی الدین کاشانی کے حالات بیان کیے ہیں اور ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے ''الشیخ الفاضل کاشانی ابن جلال الدین بن قطب الدین حنفی، صوفی کاشانی فقہ و اصول وطریقت میں فخر روزگار تھے۔ شیخ شمس الدین خونجی اور دہلی کے دیگر نام ور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر حضرت شیخ نظام الشیخ سے شرف بیعت حاصل کیا۔''

سید عبدالحئی حسنی کے اس تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محی الدین کاشانی جلال الدین ابن شیخ قطب الدین کے بیٹے تھے اور مؤرخ برنی نے اس کا سیدی مولہ کی شہادت کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ برنی نے ان کا نام قاضی جلال الدین پسر قاضی قطب الدین کاشانی قاضی لشکر لکھا ہے۔ اس طرح قاضی جلال الدین اول اور قاضی جلال الدین ثانی کا تعین ہو جاتا ہے۔

کتب تاریخ میں قاضی جلال الدین کاشانی کے بارے میں تذکرہ سیدی مولہ کی دردناک ہلاکت کے حوالے سے ملتا ہے۔ اس لرزہ خیز اور روح فرسا واقعہ کو تمام مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ معاصر مؤرخ برنی نے لکھا ہے۔ ''سلطان جلال الدین کے اوصاف حمیدہ اور کثرتِ حلم و کرم کے باوجود یہ حادثہ واقع ہوا کہ سیدی مولہ کو ہاتھی کے پاؤں تلے کچلا گیا۔ اس کے مارے جانے کے بعد خلجی خاندان ابتر اور پریشان ہو گیا، یہ لکھنے کے بعد مؤرخ برنی نے اس افسوس ناک واقعہ کی دلخراش تفصیلات رقم کی ہیں۔ صدر جہاں گجراتی اور مؤرخ فرشتہ کے علاوہ دیگر قریب العہد مؤرخین نے بھی اس واقعہ کو تفصیلاً بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ سیدی مولہ ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ وہ جرجان سے مغرب میں آئے اور وہاں کے درویشوں اور صوفیوں سے فیض حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن جرجان ہوتے ہوئے برصغیر میں وارد ہوئے اور حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر

کی خانقاہ میں ٹھہرے اور ان سے دہلی میں قیام کرنے کی اجازت چاہی۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ ''تمہاری خواہش ہے کہ دہلی جا کر خلق خدا بالخصوص فقیروں اور درویشوں کی حاجت روائی کرو۔ میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں کہ دہلی پہنچ کر امیروں اور حاکموں سے زیادہ میل جول پیدا نہ کرنا کیونکہ امیروں کے ساتھ تعلقات سے درویشوں کو ہمیشہ نقصان ہی پہنچتا ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی دوستی موت کا سبب بن جاتی ہے۔''

سیدی مولہ نے دہلی میں آ کر ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی اور ضرورت مندوں، فقیروں، مسافروں اور غریبوں کی ہر طرح سے مدد کرنے لگے۔ ملک الامراء فخر الدین کوتوال کا انتقال ہوا تو غیاث الدین بلبن کے عہد کے وہ تمام امیر جو تباہ حال ہو کر فخر الدین کوتوال کی عنایات کے سہارے زندگی بسر کر رہے تھے اور بارہ ہزار حفاظ جو روزانہ ایک ہزار قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے اور ملک فخر الدین کے دوسرے ہزاروں پروردہ و پرداختہ ملازمین، ان تمام افراد نے سیدی مولہ کی خانقاہ میں پناہ لے رکھی تھی اور سیدی مولہ ہی اُن کی تمام ضروریات کی کفالت کرتے تھے۔

غیاث الدین بلبن کے بعد جب کیقباد تخت نشین ہوا تو سیدی مولہ کے اخراجات میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا اور سیدی مولہ نے حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کی نصیحت کو بھی فراموش کر دیا اور بڑے بڑے لوگوں اور امراء کی خانقاہ میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اس زمانے میں ان کی بخشش اور جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ شرفاء اور مشاہیر کو ایک ایک ملاقات میں دو دو تین تین ہزار اشرفیاں انعام میں دے دیتے تھے۔ دستر خوان کی وسعت بھی اپنی مثال آپ تھی۔ ہمہ وقت اعلیٰ اعلیٰ کھانے اور نفیس مشروبات موجود رہتے۔ ان کے دستر خوان کے سامنے بادشاہی دستر خوان بے حیثیت ہو کر رہ گیا۔ غرض یہ کہ عوام و خواص سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اس خانقاہ میں کھانا کھانے اور دوسری ضروریات کے لئے آتے اور کوئی بھی محروم نہ جاتا۔ چونکہ سیدی مولہ کی آمدنی کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا اس لئے لوگ کہتے کہ وہ کیمیا کا علم جانتے ہیں۔

جب عنانِ حکومت خلجیوں کے ہاتھ میں آئی تو سیدی مولہ کی خانقاہ میں عوام کا ہجوم پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا۔ جلال الدین خلجی کا بڑا بیٹا خان خاناں ان کا بے حد معتقد تھا۔ یہاں تک کہ اس نے سیدی مولہ کو اپنا منہ بولا باپ بنا لیا تھا اور ہر روز ان کی خدمت میں باقاعدہ حاضری دیتا تھا۔ دوسرے امرائے سلطنت اور معززین شہر بھی ان کی خدمت میں

حاضر ہوتے اور ان کے دسترخوان سے ایسی ایسی نعمتیں کھاتے جو ان کو اور کہیں نصیب نہ ہوتی تھیں۔

معاصر مؤرخ برنی نے یہ قصہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری قاضی جلال الدین کاشانی پر عائد کی ہے کہ انہوں نے سیدی مولہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حکومت کو جو اللہ تعالیٰ کی نیابت ہے، ظالموں کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے قبضے میں لیں اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیں۔ مؤرخ برنی اور مؤرخ فرشتہ نے قاضی جلال الدین کاشانی کے لئے بڑے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں اور لکھا ہے کہ سیدی مولہ قاضی کاشانی کی باتوں میں آ گئے۔ سید صاحب نے پوشیدہ طور پر اپنے ہر مرید کو خطاب اور منصب سے نوازنا شروع کیا۔ ان کے دو ہندو معتقدین نے یہ ذمہ داری لی کہ جمعہ کے روز جب سلطان سوار ہو کر نکلے گا تو وہ فدائین کے طریقے پر حملہ آور ہو کر اس کا خاتمہ کر دیں گے۔ یہ ہندو معتقدین کوتوال برناتھن اور ہتیا پائک تھے۔ ان پر سید صاحب کے بہت احسانات تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سید صاحب کو خلیفہ بنائیں اور سلطان ناصر الدین کی بیٹی سے ان کا نکاح کر دیں۔ قاضی جلال کو قاضی خان کا خطاب دے کر ملتان بطور اقطاع ان کے سپرد کر دیا جائے اور دربار سے متعلق مختلف عہدے سلطان بلبن کے خاندان کے افراد میں ان کی حیثیت کے مطابق تقسیم کر دیئے جائیں۔

مؤرخ برنی کے مطابق اس منصوبے میں شریک ایک شخص نے اس سازش کا ذکر سلطان سے کر دیا۔ مؤلف ''تاریخ مبارک شاہی'' نے اس شخص کا نام ملک الغو لکھا ہے۔ سلطان نے جب معاملے کی تفتیش کی تو سب نے یک زبان ہو کر انکار کیا۔ اس زمانے میں یہ رواج نہ تھا کہ ملزموں پر جسمانی تشدد کر کے یعنی مار مار کر ان سے اقرار جرم کرایا جائے۔ چنانچہ انہیں زیرِ نگرانی رکھا گیا۔ چونکہ سب ملزمان اپنی بے گناہی کا اظہار کر رہے تھے اور سلطان کے پاس ان کا جرم ثابت کرنے کا کوئی ثبوت بھی نہیں تھا، لہٰذا اس نے حکم دیا کہ بہادر پور کے جنگل میں ایک بہت بڑی آگ روشن کی جائے اور سیدی مولہ، قاضی کاشانی، کوتوال برناتھن اور ہتیا پائک ننگے پاؤں اس پر سے گزریں تاکہ جھوٹ اور سچ کا فرق ظاہر ہو جائے۔ مگر علماء نے یک زبان ہو کر کہا کہ ''دب'' کا یہ طریقہ شرع کے خلاف ہے۔ آگ جلانے والی چیز ہے اور جس چیز کی خاصیت جلانا ہو وہ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ

نہیں کر سکتی۔ پھر اس سازش کی اطلاع دینے والا فردِ واحد ہے جبکہ شرع میں ایسے جرم کے ثبوت کے لئے ایک شخص کی شہادت کافی نہیں۔ آخر کار سلطان نے دب کا حکم ختم کر دیا اور اس فتنے کے بانی مبانی قاضی جلال کو بدایوں کا قاضی مقرر کر کے وہاں روانہ کر دیا۔ بلبنی خانزادوں اور ملک زادوں کو شہر بدر کر دیا اور انکی املاک ضبط کر لیں۔ برناتھن اور ہتیا پائک کو سزائے موت دی گئی۔

سیدی مولہ کو باندھ کر محل کے سامنے لایا گیا اور سلطان نے خود ان سے گفتگو کی۔ اس وقت شیخ ابو بکر طوسی حیدری مع حیدری قلندروں کے وہاں موجود تھا۔ سلطان نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''اے درویشو! اس سیدی مولہ سے میرے ساتھ انصاف کرو۔'' بحری نامی ایک حیدری قلندر بڑی بے باکی سے سید صاحب پر چھری اور سُوا لے کر حملہ آور ہوا اور انہیں زخمی کر دیا۔ سلطان کے چھوٹے بیٹے ارکلی خان نے فیل بان کو اشارہ کیا تو اس نے ہاتھی دوڑا کر سید صاحب کو مار ڈالا۔ یہ لکھنے کے بعد مؤرخ برنی سیدی مولہ کی ہلاکت پر انتہائی افسوس کا اظہار کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ''ایسا حلیم الطبع بادشاہ ان لوگوں کے مشوروں کی خبر سننے کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے ایک درویش کے قتل کا حکم دے دیا۔'' مؤرخ برنی نے اپنی ذاتی شہادت کی بناء پر لکھا ہے کہ سیدی کے قتل کے روز ایسی کالی آندھی آئی کہ آسمان سیاہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں سیدی مولہ کے قتل کے بعد جلال الدین خلجی کی حکومت میں فتور آنا شروع ہو گیا۔ بزرگوں نے کہا کہ درویش کا قتل کبھی کسی بادشاہ کے لئے اچھا ثابت نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ اس سال خشک سالی کے باعث دہلی میں قحط پڑا۔''

مؤرخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ ''سیدی مولہ نے زخمی ہونے کے بعد سلطان سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

> ''مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں لیکن تم یاد رکھو کہ میرا لہو ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہے گا اور اس کا وبال تم پر اور تمہاری اولاد پر ضرور پڑے گا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ درویشوں کو تنگ کرنا کسی طرح اچھا نہیں ہے''۔

سیدی مولہ کی شہادت کے اسباب و واقعات لکھتے وقت مؤرخ برنی اور فرشتہ دونوں کے قلم کی روانی رک رک جاتی ہے اور تاریخ نویسی کی میزانِ عدل کے پلڑے ڈول جاتے

ہیں ۔ وہ بیک وقت قاتل اور مقتول کا ساتھ دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے بیانات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سیدی مولہ اور ان کے ساتھی بادشاہ کو قتل کر کے برسر اقتدار آنا چاہتے تھے عباسی خلافت یا پھر خلافت راشدہ کے طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں مؤرخ سیدی مولہ کی روحانی بزرگی و عظمت اور کمالات کا بھی کھلے الفاظ اور کشادہ دلی سے اعتراف کرتے ہیں۔ دوسرے قریب العہد اور مستند مؤرخین نے بھی واضح طور پر لکھا ہے کہ سیدی مولہ نہایت نیک و پارسا بزرگ تھے اور ان کا قتل سراسر زیادتی تھی۔ خود برنی اور مؤرخ فرشتہ دونوں نے ان کی نیکی و پارسائی، سادگی اور عبادات و مجاہدات کے واقعات کی تائید و تصدیق کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں حکومت و اقتدار پر قبضہ کرنے کے الزام کا متہم بھی کیا ہے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان دونوں مؤرخین نے قاضی جلال الدین کاشانی کو اس سازشی منصوبے کا بانی مبانی قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ نے انہیں کوئی سزا نہیں دی، بلکہ بدایوں کا قاضی بنا دیا۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی ''اخبار الاخیار'' میں رقم طراز ہیں کہ ''سلطان جلال الدین سیدی مولہ کی شہادت کے بعد کے واقعات دیکھ کر ان کی عظمت و بزرگی کا قائل ہو گیا تھا۔''

قاضی جلال الدین کاشانی کا سنِ وفات معلوم نہیں ہے۔

امیر علاء الدین برنی

امیر علاء الدین علاء الملک ابن بار بیگ براس برنی کا شمار سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے ممتاز امرائے سلطنت اور معروف ارباب علم و فضل میں ہوتا تھا۔ وہ ایک قابل منتظم اور مدبر سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب عزیمت انسان تھے۔ ان کی حق گوئی و حق پرستی اور راست بازی زبان زد عام تھی۔ نامور مورخ قاضی ضیاء الدین برنی کے چچا تھے۔ ضیاء الدین برنی نے اپنی مشہور کتاب تاریخ فیروز شاہی میں ان کے احوال و آثار بیان کئے ہیں اور لکھا ہے:

> ''علاء الدین خلجی اپنی دولت اور طاقت کے نشہ میں سرشار ہو کر دنیا کو فتح کرنے کے علاوہ نبوت کا دعویٰ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔''

معاصر مؤرخ برنی کے بیان کے مطابق سلطان اپنی مجلس میں اکثر کہا کرتا تھا کہ ''خدائے تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو چار یار عطا فرمائے تھے جن کی قوت و شوکت سے انہوں نے (رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے دین اور شریعت کو رائج کیا... مجھے بھی خدائے تعالیٰ نے چار یار دیئے ہیں۔ یعنی الغ خان، ظفر خاں، نصرت خان اور الپ خان... مجھے بھی ایک نیا دین اور مذہب جاری کرنا چاہئے تاکہ میرا نام قیامت تک زندہ رہے۔'' مؤرخ برنی نے لکھا ہے کہ وہ جہالت و مستی اور حماقت و نادانی کے باعث اس قسم کی باتیں اپنی مجلس میں کیا کرتا تھا۔ اس ضمن میں سلطان اور کوتوال دہلی امیر علاء الدین کے مابین ایک تاریخی مکالمہ ہوا جسے مورخین اور تذکرہ نگاروں نے قلم بند کیا ہے۔ مولانا سید عبدالحئی حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' اور شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب ''آب کوثر'' میں اس تاریخی مکالمہ کو نقل کیا ہے۔

مولانا عبدالحئی حسنی امیر علاء الدین کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''الامیر الکبیر علاء الدین علاء الملک ابن بار بیگ برلاس، عزیمت میں معروف لوگوں میں سے تھے اور سیاست و فضائل اور دانش میں پختہ، وہ قاضی ضیاء الدین برنی مؤلف تاریخ فیروز شاہی کے عمِ بزرگوار تھے... ان کا لقب علاء الملک تھا اور یہ علم و فراست اور دبدبہ و سخاوت اور تدین میں مشہور تھے''۔

شیخ محمد اکرام نے علاء الملک کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مرد راست گو اور علوم سے باخبر تھے۔

مؤرخ ضیاء الدین برنی سلطان علاء الدین خلجی اور علاء الملک کے مابین ہونے والے مکالمے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے چچا علاء الملک دہلی کے کوتوال تھے۔ موٹاپے کی وجہ سے مہینے میں ایک بار دربار میں حاضری دیتے تھے۔ چنانچہ اپنے معمول کے مطابق ایک روز دربار میں حاضر تھے کہ سلطان نے ناممکن العمل اپنی دونوں مہموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ان سے دریافت کیا۔ علاء الملک پہلے ہی لوگوں سے اس کے بارے میں سن چکے تھے کہ سلطان اس قسم کی باتیں کرتا ہے اور اب انہوں نے یہ باتیں خود سلطان کی زبان سے سنیں اور سلطان نے ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ خداوند عالم اس مجلس سے شراب ہٹوا دیں اور ان چار امراء کے علاوہ جو اس مجلس میں موجود ہیں کسی اور شخص کو اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے تو ان مہمات کے بارے میں میں اپنی رائے اور تدبیر پیش کروں گا۔ سلطان کے حکم سے مجلس سے شراب ہٹا دی گئی اور الغ خان، ظفر خان، نصرت خان اور الپ خان کے علاوہ کوئی اور امیر وہاں باقی نہ رہا۔ تو علاء الملک نے تمہیدی کلمات کے بعد عرض کیا کہ خداوند عالم کو دین و مذہب اور شریعت کی باتیں بالکل اور قطعاً نہیں کرنی چاہئیں، اس لئے کہ یہ بادشاہوں کا نہیں بلکہ انبیاء کا کام ہے۔ دین و شریعت کا تعلق وحی آسمانی سے ہے۔ انسانی تدبیر اور رائے سے دین و شریعت کا قیام ممکن نہیں۔ دین و شریعت کی تشکیل کا کام انبیاء اور رسول ہی انجام دیتے رہے ہیں، ہاں بعض انبیاء نے بادشاہی ضرور کی ہے۔ اس غلام کی گزارش ہے کہ کسی نئے دین اور شریعت کو قائم کرنے کا ذکر جو پیغمبروں کی خصوصیت ہے اور ہمارے پیغمبر پر جس کی مہر ثبت ہو چکی ہے، بادشاہ کی زبان پر نہیں آنا چاہئے۔

بادشاہ کے نئے دین، مذہب ایجاد کرنے کی کوئی بات اگر خواص و عوام کے کانوں تک پہنچے گی تو تمام مخلوق بادشاہ کے خلاف ہو جائے گی اور ایک مسلمان بھی بادشاہ کے نزدیک نہیں آئے گا اور ہر طرف وسیع پیمانے پر فتنے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ایسے کلمات سے ملک میں خلل واقع ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے تو سنا ہے کہ چنگیز خان نے مسلمانوں کے شہروں میں خون کی ندیاں بہادیں مگر وہ مغلوں کا مذہب و آئین اور احکامات لوگوں پر مسلط نہیں کر سکا۔

سلطان علاء الدین خلجی کے چاروں امراء جو اس مجلس میں موجود تھے، امیر علاء الملک کے اس مشورے سے بہت خوش ہوئے۔ اور سلطان خود بڑی دیر تک اس مشورے پر غور و فکر کرتا رہا۔ پھر اس نے علاء الملک سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہ تم نے جو کچھ کہا وہ درست ہے اور حقیقت کے مطابق ہے۔ خدا تمہارے ماں باپ پر رحمت کرے کہ تم نے نمک حلالی سے ایسا عمدہ مشورہ دیا۔ آئندہ کوئی شخص میری زبان سے اس مسئلے کے بارے میں کوئی بات نہیں سنے گا۔

خلجی سلطان اور امیر علاء الملک کے مابین ہونے والے اس معرکہ آراء تاریخی مکالمے کی یہ عبارت ''تاریخ فیروز شاہی'' کی متعلقہ تفصیلی عبارت کی تلخیص ہے۔

خلجی سلطان کے دوسرے منصوبے یعنی سکندرِ اعظم کی طرح دنیا کو فتح کرنے کے بارے میں امیر علاء الملک نے مورخ برنی کے بیان کے مطابق سلطان کو یہ جواب دیا کہ وہ اپنی خام خیالی سے باز آئے اور صرف سلطنتِ دہلی ہی پر قناعت کرے مگر سلطنتِ دہلی کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے سلطان کو چاہئے کہ وہ یہاں کے صوبوں میں مفسد و فتنہ پرداز لوگوں کا قلع قمع کر کے ملک میں امن و امان کو قائم کرے اور ملک کو مغلوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے سرحدی علاقوں میں واقع قلعوں کا اس طرح استحکام و انتظام کیا جائے کہ وہاں معتبر کوتوالوں کا تقرر کیا جائے اور ان کی مرمت وغیرہ کرائی جائے اور ان کے چاروں اطراف میں خندقیں کھودی جائیں اور وہاں مناسب تعداد میں مستعد اور چاق و چوبند سپاہ رکھی جائے اور ان کی کمان کے لئے تجربہ کار اور وفادار سرداروں کو مقرر کیا جائے اور نامور بزرگ امراء کو ان راستوں پر متعین کیا جائے۔ جن راستوں سے مغل حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس طرح سلطنت دہلی اندرونی دشمنوں یعنی سرکش ہندوؤں کی آئے دن کی سازشوں اور بیرونی دشمن یعنی مغل حملہ آوروں کی یلغار سے محفوظ

ہو جائے گی۔

سب سے آخر میں امیر علا الملک نے بڑے ادب و احترام سے سلطان سے یہ التجا کی کہ یہ سب کچھ اس وقت تک ممکن نہیں ہو گا جب تک سلطان شراب نوشی اور سیر و شکار اور عیش و عشرت سے دستکش نہیں ہوتا۔

مکالمے کی یہ عبارت بھی ''تاریخ فیروز شاہی'' کا ملخص ہے۔

شیخ محمد اکرم نے ''آب کوثر'' میں اور سید عبدالحئی نے ''نزہتہ الخواطر'' میں ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' سے جو اقتباسات پیش کئے ہیں اس میں ہر دو فاضل اہل قلم اور دانشوروں سے کئی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالحئی سب سے پہلے علاء الملک کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے درباریوں پر دو مسئلے پیش کئے حالانکہ مؤرخ برنی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے ہم جلیسوں سے بھی مشورے کرتا تھا۔

پھر سید عبدالحئی حسنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''بادشاہ نے علاء الملک سے برسرِ دربار مشورہ طلب کیا''۔

اس سے اگلے پیراگراف میں مولانا موصوف نے پھر اسی واقعہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''دربار خالی ہونے کے وقت علاء الملک نے ادب کے طور پر زمین کو بوسہ دے کر عرض کیا''۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ مورخ برنی نے جہاں بھی خلجی سلطان کی ان لغویات کا ذکر کیا ہے وہاں یہی لکھا ہے کہ '' سلطان اپنی مجلس میں کہا کرتا تھا کہ مجھے دو مہمیں درپیش ہیں''۔ یا پھر یہ کہ ''نیا دین اور مذہب ایجاد کرنے کے سلسلے میں وہ اپنے ملوک کی مجلس مشاورت کرتا اور جو لوگ موجود ہوتے ان سے دریافت کرتا کہ مجھے کیا نئی چیزیں ایجاد کرنی چاہئیں کہ میرا نام قیامت تک زندہ رہے''۔ غرض یہ کہ مؤرخ برنی نے اپنی تاریخ میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ خلجی سلطان ایسی لغو اور فضول باتیں اپنے دربار میں کھلے بندوں کیا کرتا تھا۔ البتہ مؤرخ برنی نے یہ ضرور لکھا ہے کہ ''وہ تمام فضولیات جو مجلسِ شراب میں اس کی زبان سے نکلتیں، شہر میں پھیل جاتیں۔ شہر کے بعض بزرگ تو ان باتوں پر ہنستے اور اس کی جہالت و حماقت پر مخول کرتے لیکن بعض سمجھ دار لوگ ڈرتے اور کہتے کہ یہ فرعون صفت شخص جو علم سے بے بہرہ ہے اور ہر چیز سے بے خبر ہے''۔ لوگ علاء الدین سے اس لیے بھی خوف زدہ اور ہراساں تھے کہ وہ نہ صرف اپنے مشفق و مہربان چچا جلال الدین فیروز شاہ خلجی کو قتل کر کے تخت نشین ہوا جو اُس کا سسر بھی تھا بلکہ وہ ایک انتہائی سنگ دل

اور سخت گیر حکم ران بھی تھا۔

دوسری بڑی غلطی مولانا عبدالحئی حسنی سے یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے ''تاریخ فیروز شاہی'' سے بلاسوچے سمجھے یہ عبارت نقل کر دی کہ ''ایسا کون نائب ہے جو ارسطاطالیس کی مانند اسکندر کی بتیس ۳۲ سال تک دارالسلطنت میں نیابت کر سکے''۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ سکندر اپنی فتوحات کے سلسلے میں ۱۳ سال تک ملک سے باہر رہا، جس دوران ارسطو نے اس کی نیابت کے فرائض دیئے۔ ۳۲ برس کی عمر کے لگ بھگ تو وہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

شیخ محمد اکرام سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے ''آبِ کوثر'' میں یہ لکھ دیا کہ ''سکندر کے پاس ارسطو جیسا وزیر باتدبیر تھا جس نے سکندر کی عدم موجودگی میں سب کو مطیع اور تابعدار رکھا۔ جب سکندر لوٹ کر گیا تو سلطنت کو محفوظ اور درست پایا'' جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ سکندر اپنی فتوحات کے بعد یونان واپس جا ہی نہیں سکا بلکہ وہ وطن واپسی میں بابل کے مقام پر زخمی ہوا اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔

علاء الملک امیر علاء الدین کا یہ کارنامہ بلا شبہ قابل صد ستائش ہے کہ انہوں نے کمال جرأت و بے باکی سے کام لے کر علاء الدین خلجی ایسے سخت گیر اور ظالم سلطان کے سامنے اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کیا اور انتہائی دیانت و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئی نہایت مؤثر انداز اور عمدہ الفاظ میں اُسے نیا مذہب جاری کرنے سے باز اور ممنوع رکھا۔

امیر کبیر علاء الدین علاء الملک کے سنِ وفات کے بارے میں مؤرخین خاموش ہیں۔ البتہ قرائن سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوتوالِ دہلی اور شاہی حرم اور شاہی خزانے کے نگہبان امیر علاء الملک نے آٹھویں صدی ہجری کی پہلی دہائی کے کسی سال میں وفات پائی۔

خواجہ شمس دبیر

خواجہ شمس الدین ساتویں صدی ہجری کے نامور علماء فضلاء میں سے تھے اور سلطان ناصر الدین محمود کے عہد (۶۴۴۔۶۶۴ھ) میں دیوانِ انشاء کے متولی تھے۔ وہ ایک ممتاز شاعر تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۴۔۶۸۶ھ) کے عہد میں منظرِ عام پر آئے اور شہرت و ناموری حاصل کی۔ تصوّف سے شغف رکھتے تھے اور شیخ الشیوخ حضرت فرید الدین گنج شکر کے خادم خاص، شاگرد اور مرید تھے۔ شروع میں بہت مفلس اور تنگ دست تھے پھر شیخ الشیوخ کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کے علاوہ عہدہ و منصب بھی عطا کیا اور صاحبِ ثروت و مرفہ الحال ہو گئے۔

سلطان بلبن نے پہلے انہیں اپنا دبیر اور پھر اپنے بڑے بیٹے بغرا خان کا معلم اور اتالیق مقرر کر دیا۔

مؤرّخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ شمس الدین دبیر شاعر تھے اور سنان کے رہنے والے تھے۔ کتبِ تاریخ و تذکرہ کے علاوہ خواجگانِ چشت کے ملفوظات میں ان کا عام طور پر ذکر شمس دبیر کے نام سے ملتا ہے۔ شمس دبیر کے شاعرانہ کمالات اور ان کے علمی مرتبہ و مقام کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو ایسا عظیم المرتبت شاعر نہ صرف ان کی سخن سنجی اور سخن فہمی کا قائل و معترف رہا بلکہ امیر خسرو نے اپنی صغر سنی میں بلبن کے ابتدائی دَور میں شمس الدین دبیر کی شان میں قصیدہ بھی لکھا۔

خواجہ شمس الدین دبیر چونکہ مولانا شمس الدین خوارزمی کے ہم عصر ہونے کے علاوہ مشائخِ چشت سے روحانی نسبت رکھتے تھے، دونوں اربابِ علم میں ممتاز مقام کے حامل

تھے۔ دونوں کو سلطان بلبن نے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا اور دونوں کے احوال قریب العہد مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کی تالیفات میں ملتے ہیں۔ اور دونوں کے القاب شمس الدین ہیں۔ اس لئے بعض اہل قلم اور دانشوروں نے بھی ان شخصیات کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیا ہے۔ اصل قصور مؤرخین کا ہے جنہوں نے دونوں شخصیات کے نام اور ان کے خاندانی حالات قلمبند کرنے میں غفلت و کوتاہی سے کام لیا ہے جس کے باعث قارئین کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ شخصیات کی علیحدہ علیحدہ شناخت ناممکن ہو جاتی ہے۔ اور بعض اوقات تو خود مؤرخین کے لئے یہ ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

مولانا شمس الدین خوارزمی اور خواجہ شمس الدین دبیر اس قسم کی صورتِ حال کی ایک مثال ہیں۔ ایسی اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں جہاں مؤرخین کی غفلت و کوتاہی یا عدم معلومات کی بناء پر ایسی مشکلات پیش آتی ہیں جو بڑے بڑے دانشوروں اور اہل قلم کو گمراہ کر دیتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک مثال قاضی جلال الدین کاشانی کی ہے کہ اس نام کے دو قاضی تھے جن کو آج ہم اپنی سہولت اور اُن کی شناخت کے لئے قاضی کاشانی اوّل اور قاضی کاشانی ثانی ہی کہہ سکتے ہیں، اس لیے کہ ہماری تمام کتبِ تاریخ و تذکرہ ان دو شخصیات کے بارے میں ایسی معلومات فراہم نہیں کرتیں جن سے ان کے نام و نسب کا پتہ چل سکتے اور ان میں فرق و امتیاز کیا جا سکے۔

برصغیر پاکستان و ہند کے جدید و قدیم اور چھوٹے بڑے درجنوں مؤرخ اور اہل قلم اپنی تساہل پسندی یا عدم تحقیق کی بناء پر افراد و شخصیات کے اسماء و القاب کے باب میں غفلت و کوتاہی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

شیخ محمد اکرام فاضل دانشور، قابلِ قدر محقق اور انتہائی محتاط صاحبِ قلم ہیں۔ بعض معاملات اور امور میں ان سے اختلافِ رائے ہو سکتا ہے لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ کر انتہائی احتیاط و ذمہ داری کے ساتھ مسلمانوں کی فلاح و صلاح کے پیش نظر لکھا ہے۔ شیخ صاحب چونکہ محنت و جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیتے ہیں اس لئے بہت کم غلطی کرتے ہیں۔ خواجہ شمس الدین دبیر کے بارے میں محمد اکرام سے بھی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ چنانچہ "آبِ کوثر" کے صفحہ ۱۲۴ پر "عہدِ ناصری کے اہلِ قلم" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں۔

"اس زمانے کا ایک مشہور شاعر اور شعراء کا سرپرست شمس الدین دبیر تھا۔ جسے

حضرت سلطان المشائخ کے استاد ہونے کا فخر حاصل ہے اور جو دبیری، منشی گری، ندیمی، ملکی مراتب طے کر کے ایک زمانے میں مستوفی ممالکِ ہندوستان (یعنی وزیرِ خزانہ) ہو گیا تھا۔ تاج الدین سنگریزہ نے اس موقع پر لکھا تھا۔ ''صدرا کنون بکام دوستاں شدی مستوفی ممالک ہندوستان شدی۔''

پھر ''آب کوثر'' ہی کے صفحہ ۱۳۹ پر شیخ محمد اکرام رقمطراز ہیں: ''ایک مشہور عالم شیخ شمس الدین خوارزمی تھے جن کی نسبت ''سیر العارفین'' کا مؤلف لکھتا ہے۔ ''دہلی کے اندر فقرا۔ اور عالم بے شمار تھے لیکن سرآمد روزگار اور اجلۂ علمائے کبار شمس خوارزمی تھے جن سے تمام علمائے شہر رجوع کرتے۔ وہ علمِ اصول و فروع کے جامع اور معقول و منقول میں بے نظیر تھے۔'' ان کے سب سے مشہور شاگرد حضرت نظام الدین اولیاء تھے، وہ اپنے شاگردوں کو بڑی محبت سے تعلیم دیتے۔ اگر کسی شاگرد کا ناغہ ہو جاتا اور وہ ناغے کے بعد آتا تو مذاقاً پوچھتے کہ میں نے تمہاری کیا خطا کی ہے جو تم درس سے غیر حاضر تھے۔''

گویا کہ شیخ محمد اکرام کی تحقیق کے مطابق مولانا شمس الدین خوارزمی اور خواجہ شمس الدین دونوں حضرت سلطان المشائخ کے اساتذہ میں سے تھے۔ نیز یہ کہ شمس الملک کا خطاب مولانا شمس الدین خوارزمی کو نہیں بلکہ خواجہ شمس الدین دبیر کو ملا تھا اور مستوفی ممالک بھی مولانا شمس الدین خوارزمی نہیں بلکہ خواجہ شمس دبیر بنائے گئے تھے اور خواجہ شمس دبیر ہی کی مدح میں ممتاز شاعر تاج الدین سنگریزہ نے شعر لکھا تھا۔

اصل حقیقتِ حال یہ ہے حضرت سلطان المشائخ کے اساتذہ میں سے شمس الدین نام کے ایک بزرگ تھے۔ جو مولانا شمس الدین خوارزمی تھے۔ خواجہ شمس الدین دبیر نہیں۔

غیاث الدین بلبن نے ایک شمس الدین کو شمس الملک کا خطاب دیا۔ وہ مولانا شمس الدین خوارزمی تھے خواجہ شمس الدین دبیر نہیں۔

سلطان بلبن نے ایک شمس الدین کو مستوفی ممالک بنایا وہ مولانا شمس الدین خوارزمی تھے خواجہ شمس الدین دبیر نہیں۔

تاج الدین سنگریزہ نے ایک شمس الدین کی مدح میں قصیدہ لکھا وہ مولانا شمس الدین خوارزمی تھے۔ خواجہ شمس الدین دبیر نہیں۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں دو الگ الگ مقامات پر یعنی حضرت سلطان المشائخ کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ سلطان المشائخ کے

استاد صدر ولایت شمس الملک تھے جن سے انہوں نے ''مقامات حریری'' پڑھی۔ دوسرے مقام پر محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ شمس الملک اپنے زمانے کے بڑے فاضل بلکہ صدرالافاضل تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے اساتذہ میں سے تھے اور خواجہ نظام الدین نے 'مقامات حریری' انہیں سے پڑھی۔'' مولانا عبدالحق محدث نے مولانا خوارزمی کے احوال شمس الملک کے عنوان کے تحت قلمبند کئے ہیں اور ان کا پورا نام مولانا شمس الدین خوارزمی نہیں لکھا۔ یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے حضرت سلطان المشائخ کے اساتذہ میں صرف ایک شمس الملک کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے اس ایک شمس الملک کو انہوں نے صدر ولایت بھی لکھا ہے اور جو ان کے اوصاف اور خصوصیات بیان کی ہیں ظاہر ہے کہ وہ خصوصیات مولانا شمس الدین خوارزمی کی ذات گرامی پر صادق آتی ہیں۔ خواجہ شمس الدین دبیر پر نہیں۔ بلبن نے شمس الملک کا خطاب مولانا خوارزمی کو دیا تھا خواجہ شمس الدین دبیر کو نہیں۔ صدر ولایت (مستوفی ممالک) کے منصب پر بلبن نے مولانا خوارزمی کو مقرر کیا تھا خواجہ شمس دبیر کو نہیں اور پھر سب سے بڑھ کر خواجہ نظام الدین اولیاء کو ''مقاماتِ حریری'' کا درس مولانا شمس الدین خوارزمی دے سکتے تھے۔ خواجہ شمس الدین دبیر نہیں۔

مولانا عبدالحئ حسنی نے ''نزہتہ الخواطر'' میں ''مولانا شمس الدین خوارزمی'' کے احوال بیان کئے ہیں اور واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ''وہ اپنے عہد کے ممتاز عالم اور صوفی تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے انہیں دہلی کی سربراہی تفویض کی تو شمس الملک سے ملقب کیا۔ تدریس بھی مشغلہ تھا۔ حضرت سلطان الاولیاء (خواجہ نظام الدین اولیاء) نے ''مقامات حریری'' کے چالیس (۴۰) مقامے آپ سے سبقاً پڑھے۔''

شیخ محمد اکرام نے شمس الدین دبیر کے ساتھ شمس الملک کا خطاب کہیں استعمال نہیں کیا۔ جس سے شیخ صاحب کے اس دعویٰ کی نفی ہو جاتی ہے کہ انہیں ''مستوفی ممالک ہندوستان'' بنایا گیا۔ اس لئے کہ سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر تک برصغیر کے حکمرانوں کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ جب اپنے کسی امیر، ملک یا سردار کو کوئی عہدہ و منصب عطا کرتے تو اس کے ساتھ اس کی خصوصیات اور مرتبہ و مقام کے مطابق کوئی نہ کوئی مناسب خطاب ضرور عطا کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو کسی اہم مہم پر روانہ کرنے سے پہلے منصب میں اضافہ کرنے کے علاوہ خطاب بھی عطا کرتے تھے۔

جیسے مولانا شمس الدین خوارزمی کو مستوفی ممالک مقرر کیا تو انہیں شمس الملک کا خطاب بھی ساتھ ہی دیا۔ چنانچہ مولانا خوارزمی، شمس الملک کے خطاب ہی سے مشہور ہو گئے اور عوام و خواص نے انہیں ''شمس الملک'' ہی کہنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ان کا پورا نام لینے کی بجائے ان کا خطاب استعمال کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

امیر خورد کرمانی کی مایہ ناز تالیف ''سیر الاولیاء'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ بھی اپنے استادِ گرامی قدر مولانا خوارزمی کو ان کے خطاب ہی سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ امیر خورد کرمانی لکھتے ہیں کہ ''سلطان المشائخ نے فرمایا... شمس الملک کی عادت تھی، اگر کوئی شاگرد ناغہ کرتا یا کوئی دوست دیر سے آتا تو اس سے فرماتے کہ ہم نے کیا کیا جو تم نہیں آتے... جب میں دیر کر کے جاتا یا کبھی مجھ سے ناغہ ہو جاتا تو میں خیال کرتا کہ شاید مجھ سے بھی یہی فرمائیں گے، لیکن مجھ سے فرماتے:

آخر کم از آنکہ گاہے گاہے

آئی و بمانی نگاہے

یہ شعر پڑھ کر سلطان المشائخ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تمام حاضرین پر آپ کا گریہ اثر انداز ہوا۔ کیونکہ آپ نے شمس الملک سے ''مقامات حریری'' پڑھی تھی اور ان کے حقوق کو ملحوظ رکھتے تھے۔ پھر سلطان المشائخ نے فرمایا کہ بعد میں شمس الملک ہندوستان کے مستوفی ممالک ہو گئے تھے۔ تاج سنگریزہ نے ان کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے:

صدر اکنوں بکامِ دلِ دوستاں شدی

مستوفی ممالک ہندوستاں شدی

کم و بیش یہی واقعات مولانا جمالی نے ''سیر العارفین'' میں لکھے ہیں جن کا حوالہ خود شیخ محمد اکرام نے ''آبِ کوثر'' میں دے دیا ہے۔ اس لئے اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ امیر حسن سجزی معروف بہ خواجہ حسن دہلوی نے ''فوائد الفواد'' میں بھی یہی لکھا ہے کہ شمس الدین خوارزمی کو مستوفی ممالک کا منصب ملا تھا۔

مولانا شمس الدین کے شمس الملک، مستوفی ممالک، استاد الاساتذہ، صدر الافاضل اور سلطان المشائخ کے استادِ گرامی ہونے کے بارے میں ان قطعی و حتمی وضاحتوں کے بعد اب ہم خواجہ شمس الدین دبیر کی طرف آتے ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ خواجہ شمس الدین دبیر حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر کے خادم، شاگرد اور مرید تھے۔ جیسا کہ

سید امیر خورد کرمانی نے ''سیر الاولیاء'' میں سلطان المشائخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: ''ایک مرتبہ میں اور شیخ جمال الدین ہانسوی اور خواجہ شمس الدین دبیر اور بعض دوسرے مرید اور عزیز شیخ شیوخ العالم سے اکٹھے رخصت ہوئے۔ رخصت کے وقت شیخ جمال الدین نے شیخ شیوخ العالم سے درخواست کی کہ انہیں کوئی وصیت فرمائیں۔

پیری مریدی کے آداب میں یہ ہے کہ جب سفر کے لئے شیخ سے رخصت ہوتے ہیں تو وصیت کی درخواست کرتے ہیں۔ اگر شیخ خود ہی کوئی وصیت کر دیں تو سبحان اللہ! ورنہ مرید اپنے شیخ سے درخواست کرتے ہیں۔ شیخ جمال الدین کی درخواست پر شیخ شیوخ العالم نے میری طرف (سلطان المشائخ) اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ہماری وصیت یہ ہے کہ اس سفر کے دوران ان کو خوش رکھو'' چنانچہ شیخ جمال الدین، شیخ کی وصیت کے مطابق مجھ پر مہربانی فرماتے تھے اور خواجہ شمس الدین دبیر جو معدنِ لطافت اور کانِ ظرافت تھے وہ بھی میرے ساتھ نہایت لطف و مدارت سے پیش آتے تھے۔''

''سیر العارفین'' میں بھی حضرت سلطان المشائخ ہی کی زبانی شمس الدین دبیر کے جو احوال رقم ہیں ان سے بھی یہی ظاہر و ثابت ہوتا ہے کہ وہ حضرت فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے خادم، شاگرد اور مرید تھے۔ سلطان المشائخ نے فرمایا۔

> ''شمس الدین دبیر سنام کا باشندہ تھا وہاں سے اجودھن آیا اور حضرت شیخ شیوخ العالم کی خدمت میں رہنے لگا اور علم سلوک پر شیخ حمید الدین ناگوری کی کتاب ''لوائح'' ان سے پڑھی۔ یہ دبیر اور شاعر تھا۔ اس نے ایک طویل قصیدہ حضرت شیخ کے حضور پڑھا۔ قصیدہ ختم ہوا تو شیخ نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ اور دوبارہ پڑھو۔ حضرت شیخ فرید الدینؒ شمس دبیر کی تسکینِ قلب کی خاطر ہر شعر پر تعریف فرماتے اور شعر کی اصلاح بھی کر دیتے پھر حضرت شیخ نے فرمایا کیا چاہتے ہو؟ شمس دبیر نے عرض کی کہ ناداری اور غربت کا عالم ہے، میری والدہ بھی ہیں اور ایک بیٹا بھی، ان کی کفالت میرے ذمہ ہے۔ آپ توجہ فرمادیں تو کچھ مرفہ الحالی نصیب ہو جائے۔ یہ کیفیت سن کر حضرت شیخ نے فرمایا کہ جاؤ شکرانہ لاؤ۔ جب حضرت شیخ کسی کی فریاد سن کر ارشاد فرماتے کہ جاؤ اور شکرانہ لاؤ تو اس کا کام ضرور ہو جاتا تھا۔ شمس الدین دبیر

نے پچاس چیتل حضرت شیخ کے سامنے رکھ دیئے اور خود دعا کے لئے کھڑا ہو گیا۔ حضرت شیخ نے وہ رقم درویشوں میں تقسیم کر دی اور اس کے حق میں دعائے خیر کی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اسے مال و دولت حاصل ہو گیا۔ شمس الدین بادشاہ کا وزیر ہو گیا۔''

سلطان المشائخ کے ملفوظات ''فوائد الفواد'' میں بھی یہ واقعہ ملتا ہے۔ امیر حسن سنجری نے دسویں مجلس کے آغاز میں لکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کے ارشاد پر میں نے کچھ اشعار پیش کیے تو اس کی مناسبت سے سلطان المشائخ نے فرمایا کہ ''ایک دفعہ شمس دبیر نے شیخ الاسلام فرید الدین کی خدمت میں کچھ اشعار پیش کئے ...... حضرت شیخ نے اشعار سن کر فرمایا، تمہاری احتیاج کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاتھ تنگ ہے اور میری ایک بوڑھی ماں ہے جس کی کفالت کرتا ہوں۔ حضرت شیخ نے فرمایا جاؤ شکرانہ کے طور پر نیاز لاؤ ...... حضرت شیخ جس کام کے متعلق کسی کو کہتے کہ جاؤ اور نیاز لاؤ وہ کام یقینی طور پر ہو جاتا تھا۔ الغرض شمس دبیر گیا اور چند چیتل لے آیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ انہیں تقسیم کر دو۔ شمس دبیر نے وہ چیتل تقسیم کر دیئے۔ پھر حضرت شیخ نے فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد شمس دبیر کو رزق میں بڑی وسعت ہوئی اور اسے خوب مال و منال ملا۔ وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے کا معلم اور اتالیق بن گیا۔''

اسی مجلس میں سلطان المشائخ نے شمس دبیر کے حضرت بابا فریدؒ سے قاضی حمید الدین ناگوری کی تصنیف ''لوائح'' پڑھنے کا ذکر بھی فرمایا اور نیز اپنا یہ واقعہ بھی بیان کیا: ''میں اور شمس دبیر اور شیخ جمال الدین ہانسوی ایک دفعہ حضرت شیخ کبیرؒ کے ہاں سے واپس آ رہے تھے۔ چند منزلوں تک ہمارا ساتھ رہا پھر ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں دو راستے ہو جاتے تھے۔ شمس دبیر سنام جانا چاہتے تھے اور ہم سرسہ کی طرف۔ جب ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہا تو شیخ جمال الدین ہانسوی نے شیخ دبیر کی طرف رُخ کر کے یہ مصرعہ پڑھا:

اے یارِ قدیم راست می روی۔''

''فوائد الفواد'' میں بتیسویں مجلس کے احوال بیان کرتے ہوئے امیر حسن سجزی لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم نے شمس دبیر کو دیکھا تھا؟ میں نے عرض کیا، جی ہاں، اس سے میری رشتہ داری تھی۔ فرمایا۔ انہوں نے قاضی حمید الدین

ناگوری کی ''لوائح'' شیخ الاسلام فرید الدینؒ سے پڑھی تھی۔ وہ نیک آدمی تھے۔ بعد ازاں فرمایا جب شیخ الاسلام روزہ افطار کرنے کے بعد بڑے انہماک سے مشغول بہ حق ہو جاتے۔ یہاں تک کہ عشاء کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ اس دوران شمس دبیر کچھ کھانا پکا لیتے اور دو تین دوستوں کو بلا کر ان کا افطار کراتے۔ یہاں تک کہ شیخ الاسلام کے افطار کا وقت ہو جاتا۔ ان دنوں میں (یعنی سلطان المشائخ) بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شمس دبیر کے ابتدائی زمانے کا ذکر ہے۔ اس وقت وہ مفلس تھے۔ پھر جب وہ برسر روزگار ہو گئے تو ان میں وہ روحانی آب و تاب نہ رہی، بعد ازاں ارشاد فرمایا کہ دنیا کے عروج و اقبال سے یہی ہوتا ہے۔''

سلطان المشائخ کے ان ارشادات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شمس دبیر کسی طور ان کے استاد نہیں ہو سکتے۔ سلطان المشائخ اپنے استادِ گرامی کے متعلق ان الفاظ اور اس انداز سے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ شیخ الاسلام فریدالدین کے خادم، شاگرد اور مرید ہونے کے حوالے سے خواجہ شمس دبیر کو زیادہ سے زیادہ سلطان المشائخ اور شیخ جمال الدین ہانسوی کا پیر بھائی کہا جا سکتا ہے۔ جو شیخ الاسلام فرید الدین کی دعائے خیر سے صاحب مال و منال اور صاحبِ منصب ہوئے۔ یہ منصب وہی ہے جس کا ذکر سلطان المشائخ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ ''وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے (بغرا خان) کے معلم و اتالیق بن گئے۔''

شمس الدین دبیر کے بارے میں شیخ محمد اکرام کی اپنی تحقیق بھی یہی ہے کہ ''بلبن نے جب اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگالہ کا حاکم باختیار مقرر کیا تو دربار دہلی کے بعض ذی لیاقت اور قابل اعتماد لوگوں کو بھی اس کی ملازمت میں ساتھ دیا۔ ان میں شمس الدین دبیر بھی تھا جسے ''منشی مملکت بنگالہ و کامرود'' مقرر کیا گیا۔'' اس کی تفصیلات مؤرخ برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' میں دی ہیں۔

غیاث الدین بلبن (۶۶۴۔۶۸۶ھ) کے ایک غلام طغرل جسے بلبن نے لکھنوتی کا حاکم مقرر کیا تھا، سرکشی اختیار کی اور دو مرتبہ سلطانی لشکر کو شکست دی، تو سلطان بلبن باغی طغرل کی سرکوبی کے لئے خود لکھنوتی کی طرف روانہ ہوا۔ بغرا خان شمس دبیر اور امیر خسرو بھی اس کے ساتھ تھے۔ بلبن منزلوں پر منزلیں مارتا، بڑھتا چلا گیا۔ جب لکھنوتی کے قریب پہنچا تو طغرل ڈر کے مارے ایک جنگل میں جا گھسا۔ لیکن سلطان بلبن کے ایک

سردار نے اسے زندہ گرفتار کر کے اس کی کھال کھنچوائی اور اس میں بھس بھر کر بارگاہِ سلطانی میں بھیج دی۔ مؤرخ برنی نے لکھا ہے کہ اس منزل سے جہاں طغرل کا سر اس کے سامنے پیش کیا گیا سلطان لکھنوتی آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے حکم دیا کہ لکھنوتی کے بڑے بازار میں طغرل کے بیٹوں اور اس کے خاندان کے تمام افراد اور اس کے امراء ملوک اور سرداروں کے علاوہ عہدیداروں اور کارکنوں کو سولی پر لٹکا دیا جائے۔ یہ سزائیں اتنی سخت تھیں کہ بعض دیکھنے والوں کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

سلطان ان سزاؤں سے فارغ ہوا تو اس نے اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خان کو اقلیم لکھنوتی سپرد کی۔ چتر، دور باش اور دیگر نشاناتِ شاہی کا اس کے لئے حکم دیا اور اقطاع داروں، کارکنوں کو خود اپنے پاس سے متعین کیا اور ہاتھی اور سونے کے علاوہ جو کچھ طغرل کا ساز و سامان ہاتھ لگا تھا وہ سب بغرا خان کو بخش دیا...... پھر بلبن نے اپنے بیٹے کو خلوت میں اور اپنے امراء کی موجودگی میں نصیحتیں کیں اور دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ بغرا خاں چند منزل تک سلطان کے ہمراہ رخصت کرنے کے لئے آیا۔ چنانچہ اس کے الوداع کہنے سے ایک روز پہلے سلطان نے نمازِ اشراق پڑھنے کے بعد چند تجربہ کار امراء کو طلب کیا اور بغرا خاں سے کہا کہ اپنے دبیر شمس کو دوات، قلم اور کاغذ کے ساتھ میرے پاس لاؤ تاکہ میں کچھ نصیحتیں تمہارے لئے اس کو لکھوا دوں۔ جب بغرا خاں شمس دبیر کو سلطان کے حضور میں لایا تو سلطان نے حکم دیا اور بغرا خان اور شمس دبیر دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

سلطان نے حاضرین کی طرف رخ کر کے کہا 'میں جانتا ہوں کہ جو نصیحت بھی حکومت کے معاملات سے متعلق میں اپنے اس بیٹے کو کروں گا، اس پر کان نہیں دھرے گا اور نہ اس پر عمل کرے گا۔ مگر محبتِ پدری مجھ کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ تم جیسے سن رسیدہ لوگوں کے سامنے جو صاحبِ تجربہ ہیں اپنے بیٹے کے لئے کچھ نصیحتیں لکھوا دوں، ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اس کو توفیق عطا فرمائے اور یہ میری نصیحتوں پر عمل کرے۔ یہ کہہ کر سلطان نے شمس دبیر کو حکم دیا کہ لکھو۔''

سلطان بلبن نے بغرا خان کے لئے شمس دبیر سے چار نصیحتیں لکھوائیں جو ''تاریخ فیروز شاہی'' کے چار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ چوتھی نصیحت میں سلطان نے بغرا خان کو چند وصیتیں کی ہیں جو نہ صرف لائق مطالعہ ہیں بلکہ آئین جہانبانی و جہانداری اور رعایا پروری کے لئے بہت اہم اور مفید ہیں۔ دارالسلطنت دہلی اور لکھنوتی میں جو فاصلہ تھا اور

بغرا خان جو عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اس زمانے میں جو ہندو مسلم کشمکش بالخصوص ہندوؤں کی اکثریت کی بنا پر ان کا جو اثر و رسوخ تھا اور بنگالہ کی حسین و جمیل عورتوں، وہاں کی دلنواز موسیقی اور عیش و طرب کے ساز و سامان، حشم و خدم اور شراب و شاہد، یہ اور اس قسم کی دوسری تمام باتوں کے بارے میں سلطان بلبن نے بغرا خاں کے لئے شمس دبیر کو نصیحتیں اور وصیتیں لکھوائیں جو برنی نے "تاریخ فیروز شاہی" میں محفوظ کر لی ہیں اور سلطان بلبن کے مخصوص نظریہ حکمرانی اور آئین جہاں بانی کی عکاس و ترجمان ہونے کی بنا پر تاریخی اہمیت اور عملی و سیاسی افادیت کی حامل ہیں۔

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں برصغیر میں مسلم حکمرانوں کے اقتدار کو درپیش خطرات و خدشات کی نشان دہی کے علاوہ مسلمان حکمرانوں یعنی بلبن کے جانشینوں کی غفلت و کوتاہی اور عیش و عشرت پر بلبن کی سرزنش کی روشنی میں مسلم سلطنتوں بالخصوص سلطنتِ مغلیہ کے زوال، سقوطِ ڈھاکہ، مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کے اسباب و محرکات اور وجوہات کو بھی واضح طور پر دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے، اور جو سلطان بلبن کی غیر معمولی فہم و فراست اور بے مثال سیاسی تدبر کا ثبوت بھی ہے۔

بلبن کے بعد اس کا پوتا معزالدین کیقباد تخت نشین ہوا۔ اس کے باپ بغرا خان حاکم بنگالہ نے سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کیا اور لکھنوتی میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا۔ خواجہ شمس الدین دبیر اس وقت لکھنوتی میں اس کی ملازمت میں تھے۔ کیقباد نے بلبن کے زیر سایہ تربیت پائی تھی۔ اس کے اتالیق اور نگران اسے اتنی اجازت بھی نہیں دیتے تھے کہ وہ کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا سکے یا شراب کو ہاتھ لگا سکے۔ لیکن سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں جب وہ بادشاہ بنا تو تمام پرانے سبق بھول گیا۔ یک دم بے لگام ہو کر عیش و عشرت میں غرق ہو گیا۔ اس نے ملک الامراء کوتوال دہلی کے داماد کو دہلی کا داد بیگی مقرر کیا تھا۔ لیکن وہ نائب ملک کے اختیارات استعمال کرتا تھا اور حکومت کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک ایک کر کے بلبنی امراء کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ جس سے بلبنی سلطنت کی بنیاد کمزور اور خلجیوں کی حکومت کی راہ ہموار ہونے لگی۔

سلطان ناصر الدین کو کیقباد کی عیش پرستی اور ملک نظام الدین کی سازشوں کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ ان حالات میں ناصر الدین نے کیقباد سے سلسلۂ مراسلت شروع کیا

اور پند و نصائح کے علاوہ نظام الدین کے ہوسِ ملک گیری کے مذموم عزائم سے بھی اشاروں کنایوں میں اسے آگاہ کیا۔ لیکن سلطان کیقباد پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بالآخر ناصر الدین نے کیقباد کے نام اپنے قلم سے ایک پُر تاثیر خط میں اس سے ملاقات کرنے کے شوق کا بھرپور اور پُر زور اظہار کیا۔ اس خط نے اپنا اثر دکھایا اور کیقباد اپنے باپ سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے باپ سے ملاقات کے لئے جائے گا۔ لیکن ملک نظام الدین باپ بیٹے کی اس ملاقات کو اپنے ناپاک مقاصد کے منافی سمجھتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ باپ بیٹے میں اختلافات کی خلیج حائل ہو اور بدگمانی پیدا ہو۔ چنانچہ اس نے سلطان کیقباد کا مخلص و خیر خواہ بن کر مؤدبانہ عرض کیا کہ بادشاہ کا تنہا جانا مناسب نہیں بلکہ بادشاہ کو شاہی جاہ و جلال، شان و شوکت اور مرتب و مستعد لشکر کے ساتھ جانا چاہئے۔ بادشاہ کو قائل کرنے کے لئے اس نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ حکومتی معاملات میں باپ یا بیٹے کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

عقلمندوں نے کہا ہے ''الملک عقیم'' یعنی حکومت کے اولاد نہیں ہوتی۔ عربی کے ان دو لفظوں سے مراد یہ ہے کہ ملک گیری کی ہوس میں باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اقتدار کے معاملے میں باپ کی یا بیٹے کی محبت کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ ہر ملک و مذہب میں باپوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر بیٹوں کو اور بیٹوں نے حصولِ اقتدار کے لئے باپوں کو قتل کیا ہے۔ اس سفر میں بادشاہ کی ملاقات باپ سے ہو گی اور باپ صاحبِ خطبہ و سکہ اور سلطنت کا اصلی وارث بھی ہے۔ کس کو معلوم کہ جب دونوں لشکر جمع ہوں تو کیا صورت پیدا ہو؟ مؤرخ برنی نے نظام الدین کے اس مشورہ سے اتفاق کیا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ نظام الدین کا یہ مشورہ نیک نیتی پر مبنی نہیں تھا۔ بہر حال بادشاہ اودھ لشکر سمیت اودھ کی جانب روانہ ہوا۔ سلطان ناصر الدین کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بھی اپنی فوج اور ہاتھی لے کر دریائے سرو (گھاگھرا) کے کنارے پہنچ گیا۔ دونوں لشکر دریا کے دونوں طرف اس طرح مقیم تھے کہ ایک کو دوسرے کے خیمے نظر آتے تھے۔

ملک نظام الدین اپنی سازش میں اس حد تک تو کامیاب ہو گیا تھا کہ اس نے باپ بیٹے کے لشکروں کو آمنے سامنے یوں خیمہ زن کرا دیا کہ کسی وقت بھی تصادم ہو سکتا تھا اور کسی معمولی لغزش پر بھی جنگ شروع ہو سکتی تھی۔ اس پُر خطر اور نازک موقع پر شمس دبیر اور

کیقباد کے چند وفادار بلبنی امراء نے حالات کو قابو میں رکھنے اور باپ بیٹے کے مابین ملاقات کرانے کی بھرپور کوشش کی جس کے نتیجے میں ملاقات اور اس کا طریق کار طے پایا۔ یہ کہ سلطان ناصر الدین، سلطان دہلی کی تعظیم وتکریم ملحوظ رکھے گا اور دریا عبور کر کے بیٹے سے ملاقات کے لئے آئے گا۔ بیٹا تخت پر بیٹھے گا اور باپ دست بوسی کی شرائط بجا لائے گا۔ چنانچہ نجومیوں کے زائچہ کے مطابق ملاقات کا دن اور وقت مقرر ہوا۔ شاہی کروفر کے ساتھ دربار کو سجایا گیا۔ سلطان ناصر الدین آ کر انتظار گاہ میں بیٹھا، پھر دربار میں گیا۔

یہ ایک عجیب منظر تھا۔ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی ایسی صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی تھی۔ امراء وملوک اور درباریوں کے سانس رکے ہوئے تھے کہ چشمِ فلک نے ایک باپ کو اپنے بیٹے کے سامنے تعظیمی سجدے کرتے ہوئے دیکھا۔ سلطان ناصر الدین نے دربار میں زمین بوسی کی جگہ پہنچ کر اپنا سر زمین پر رکھا اور تین مرتبہ زمین بوسی کی شرائط پوری کیں۔ پھر وہ مؤدبانہ چل کر تخت کے قریب پہنچا تو معزالدین کیقباد اپنے باپ کی اور ذلت برداشت نہیں کر سکا اور شاہی نخوت اور شاہی آداب کو خیر باد کہہ کر تخت سے اتر کر باپ کے قدموں میں گر پڑا۔

اس ملاقات میں شمس دبیر بھی موجود تھے اور سلطان دہلی کے امراء میں امیر خسرو بھی حاضر تھے۔ چنانچہ اس اپنی نوعیت کی واحد تاریخی ملاقات کو، جس میں دربار شاہی کی رسم زمین بوسی جسے خاک بوسی بھی کہا جاتا تھا، کی شرائط بجا لاتے ہوئے ایک مسلمان باپ نے اپنے مسلمان بیٹے کو تین تعظیمی سجدے کئے تھے، امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی ''قران السعدین'' میں نظم کر کے زندہ جاوید کر دیا ہے۔ چونکہ شمس دبیر اس ملاقات کے مراحل طے کرانے میں پیش پیش رہے تھے، اس لئے امیر خسرو نے اپنی مثنوی میں ان کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے تاکہ ان کا تاریخی کردار اجاگر ہو سکے۔ اس موقع پر خواجہ شمس دبیر اور امیر خسرو کی بھی آپس میں ملاقات ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے بڑے پیار ومحبت اور والہانہ انداز سے ملے۔

ملاّ عبدالقادر بدایونی نے ''منتخب التواریخ'' میں شمس دبیر کا ذکر سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں کیا ہے اور ان کو عہدِ ناصری کا ملک الکلام بتایا ہے اور لکھا ہے کہ شاعر شمس الدین دبیر کے فضائل وکمالات بیان سے باہر اور تعریف وتوصیف سے مستغنی

ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو اپنے اشعار کے اچھے ہونے کا معیار ان ہی کی پسندیدگی پر رکھتے تھے۔

مولانا عبدالحئی حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کا تعارف اِن الفاظ میں کرایا ہے۔

''مولانا شمس الدین سامی الشیخ الفاضل الدہر، انشاء میں بر سر عنوان اور نقدِ شعر و سخن میں بلند پایہ کتاب ''لوائح'' قاضی حمید الدین ناگوری سے پڑھی اور درسِ طریقت میں بابا فرید الدین مسعود گنج شکر سے مستفیض ہوئے۔ سلطان بلبن نے انہیں اپنے فرزند بغرا خان کے ساتھ بنگالہ میں عہدۂ میر منشی پر مقرر کر کے بھجوایا۔ ان کی شاعری کا اعتراف حضرت امیر خسرو کو بھی ہے۔''

خواجہ شمس الدین دبیر نے لکھنوتی میں ۷۰۷ھ۔ ۱۳۰۷ء میں وفات پائی۔

صفی الدین محمد ارموی

شیخ صفی الدین محمد ارموی اپنے عہد میں دنیائے اسلام کے منفرد و ممتاز عالم دین، بے مثال متکلم اور جلیل القدر فقیہ تھے۔ وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (متوفی ۷۲۵ھ) امیر خسرو (متوفی ۷۲۵ھ) امیر حسن سنجری (متوفی ۷۰۷ھ) بوعلی قلندر (متوفی ۷۲۴ھ) امام ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) اور شاہ رکن عالم ملتانی (متوفی ۷۳۵ھ) ایسی علو مرتبت ہم عصر دینی و روحانی شخصیات میں اپنی ایک عالمانہ شان رکھتے تھے۔ ان کا نام ونسب یوں ہے: محمد بن عبدالرحیم بن محمد الشافعی الہندی، صفی الدین ان کا لقب ہے۔ ماہ ربیع الاول ۶۴۴ھ میں برصغیر میں ان کی ولادت ہوئی۔ علم و فضل، صدق و صفا، خلوص و ایثار اور جود و سخا شیخ صفی الدین کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہتہ الخواطر'' میں اُن کا تعارف ان شاندار الفاظ میں کرایا ہے:

''الشیخ العالم الکبیر الامام العلامتہ محمد بن عبدالرحیم بن محمد الشیخ صفی الدین الشافعی الھندی۔''

شیخ صفی الدین کا تعلق ایک دینی وعلمی خانوادے سے تھا۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی۔ پھر دس سال تک برصغیر کے نامور علماء، فضلاء، صلحا اور فقہا کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور علم حدیث، فقہ، اصول فقہ، منطق، علم الکلام میں مہارت تامہ پیدا کی۔ تحصیلِ علم سے فراغت پا کر شیخ صفی الدین فریضہ حج ادا کرنے اور اسلامی علوم وفنون کے اہم اور بڑے مراکز کی سیر و سیاحت اور وہاں کے علماء و فضلا اور بزرگان دین کی زیارت کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور عرب

ممالک میں پہنچ گئے۔

صاحب نزہۃ الخواطر شیخ صفی الدین محمد کے احوال بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''٦٦٧ھ میں یمن تشریف لے گئے۔ جہاں کے سلطان مطع نے ان کی حد درجہ تعظیم وتکریم کی اور ان کی خدمت میں نو سو دینار نذرانے کے طور پر پیش کئے۔ پھر حج کعبہ کے لئے چلے گئے تو مکہ معظمہ میں تین ماہ تک قیام فرمایا۔ یہاں ان کی ملاقات ابن سبعین سے ہوئی۔ شیخ صفی الدن نے ان سے علمی استفادہ بھی کیا۔''

پھر مختلف شہروں میں جا کر وہاں کے ارباب دین و دانش سے ملاقاتیں کی۔ اور ٦٧١ھ میں قاہرہ جا پہنچے۔ قاہرہ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد بلادِ روم کی طرف نکل گئے اور وہاں کے بزرگانِ دین سے اکتساب فیض کیا اور بالآخر ٦٨٥ھ میں دمشق آ گئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ دمشق میں شیخ صفی الدین نے مسندِ ارشاد و وعظ قائم کر کے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

شیخ صفی الدین محمد ایک متقی و پرہیز گار اور مرتاض بزرگ ہونے کے علاوہ اپنی فیاضی اور سخاوت کے لئے بھی مشہور تھے۔ چنانچہ صاحب نزہۃ الخواطر کی تحقیق کے مطابق انہوں نے عملاً محتاجوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ ہمدردی کا ہاتھ ہمیشہ بڑھائے رکھا۔

نامور مورخین اور معروف وممتاز تذکرہ نگاروں نے شیخ صفی الدین کے حالاتِ زندگی کو بیان کرنے کے علاوہ ان کے دینی وعلمی کارناموں کو تسلیم کیا ہے اور ان کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کے تذکرہ نگاروں میں علامہ تاج الدین السبکی، امام ابن حجر عسقلانی، امام شوکانی اور نواب صدیق حسن ایسے فضلاء اور اہلِ قلم شامل ہیں۔ شیخ صفی الدین محمد ارموی کے احوال و آثار مولانا عبدالحئی حسنی اور ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر احسان الٰہی رانا نے، علامہ السبکی نے اپنی کتاب ''طبقات شافعیہ'' میں، امام ابن حجر عسقلانی نے ''الدار لکافتہ'' میں، امام شوکانی نے ''البدر الطالع'' میں اور صدیق حسن قنوجی نے اپنی تصانیف ''ابجد العلوم'' اور ''تاج مکلل'' میں پیش اور بیان کئے ہیں۔

علامہ تاج الدین سبکی لکھتے ہیں کہ شیخ صفی الدین امام ابو الحسن الاشعری کے مسلک

پر تھے اور اعلم العلماء تھے۔ قرآن اور حدیث کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ انہوں نے فخر الدین بخاری اور قاضی سراج الدین مولف کتاب التحصیل سے استفادہ کیا اور حافظ ذہبی نے ان سے روایت حدیث کی۔ ان کی تمام کتابیں خصوصاً ''النہایہ'' نہایت عمدہ ہے۔ وطن ان کا ہندوستان ہے۔ ۶۸۵ھ میں دمشق تشریف لائے۔ ان کا خط نہایت بدنما تھا مگر خود وہ نہایت ظریف اور سخن ساز تھے۔

شیخ صفی الدین محمد ارموی کا امام ابن تیمیہ کے ساتھ امیر تنکز کی صدارت میں ایک بڑا مناظرہ ہوا۔ اس مناظرے کا موضوع امام ابن تیمیہ کا تالیف کردہ ''رسالہ الحمویہ'' تھا۔ مجلس مناظرہ میں عوام و خواص کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ بے شمار علماء بھی موجود تھے۔ شیخ صفی الدین نے ''رسالہ الحمویہ'' پر اعتراضات سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ ان کا انداز خطابت اور زور بیان دیکھنے کے لائق تھا۔ دلائل و براہین تھے کہ ختم ہی نہ ہوتے تھے۔ جزئیات تک کو سمیٹتے چلے جاتے تھے۔ امام ابن تیمیہ کے رسالے کے رد میں شیخ صفی الدین اپنا موقف پیش کر چکے تو ابن تیمیہ نے اپنے رسالے میں بیان کردہ افکار و نظریات اور اپنے مخصوص انداز فکر کے دفاع میں تقریر شروع کی۔ اور وہ ایک ایک بات کا جواب دینے لگے۔ امام ابن تیمیہ بات میں سے بات پیدا کر کے اپنی علمیت اور زور خطابت کا اظہار کر رہے تھے کہ شیخ صفی الدین نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے ابن تیمیہ! تم چڑے کی مانند ادھر ادھر پھدک رہے ہو۔ یہ کیا انداز بیان ہے؟''

بالفاظ دیگر شیخ صفی الدین نے امام ابن تیمیہ سے یہ کہا کہ آپ اپنی تقریر کو بلاوجہ پھیلا کر وقت ضائع نہ کریں۔ بلکہ اپنے دلائل و براہین کو موضوع زیر بحث تک محدود رکھیں جو مجلسی گفتگو اور مناظروں کا مسلمہ اصول ہے۔ مولانا عبدالحئی حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں اس تاریخی مناظرے کی روئداد اسی طرح روایت کی ہے اور لکھا ہے۔

''ہندی صاحب (یعنی شیخ صفی الدین محمد) رئیس تنکز کے ممدوح تھے اور حاضرین مجلس نے بھی شیخ صاحب کا ساتھ دیا۔ مسئلہ متنازعہ تھا۔ رئیس مذکور نے امام ابن تیمیہ کو (شکست خوردہ تسلیم کرتے ہوئے) زندان میں بھیج دیا اور ان کے ہمنواؤں کے وظائف موقوف کر کے شہر میں تشہیر کرادی۔

جن کتب تاریخ و تذکرہ سے مولانا عبدالحئی حسنی نے شیخ صفی الدین ارموی کے

احوال و آثار بالخصوص مناظرے کی روائداد رقم کی ہے ان ہی کتابوں کے حوالے سے ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند'' کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر احسان الٰہی رانا نے پاکستان و ہند میں عربی ادب کی نشوونما اور ارتقاء کے حوالے سے شیخ صفی الدین کے حالات قلم بند کئے ہیں اور لکھا ہے کہ:

''خلجیوں کے دور ہی میں یہاں کے ایک عالم صفی الدین محمد بن عبدالرحیم الارموی الشافعی الھندی جنہوں نے علم الکلام اور اصولِ فقہ میں بڑا نام پیدا کیا، ۶۶۷ھ میں عرب ممالک میں چلے گئے۔ رجب ۷۱۲ھ میں امام ابن تیمیہ سے دمشق میں مناظرہ کیا اور غالب رہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر احسان الٰہی رانا نے وکلمین کی تحقیقات کے مطابق ان کی تصنیفات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

۱۔ الفائق فی اصول الدین، جس کا ایک نسخہ ٹیونس میں بتایا جاتا ہے۔

۲۔ الرسالة التسعينية فی الاصول الدينية، جس کے نسخے ٹیونس اور قاہرہ میں محفوظ

ہیں۔

۳۔ نهاية الوصول فی (الی) 'علم الاصول '، نادر الوجود ہے۔ اس عنوان سے ایک کتاب جمال الدین ابن مطہر الحلی (متوفی ۷۲۶ھ) کی تالیف ہے جو شیعی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔

۴۔ الزبدة (یا زبدة الكلام) فی علم الکلام، یہ کتاب نایاب ہے۔

شیخ صفی الدین محمد نے مذکورہ بالا اصول دین ایسے اہم موضوع پر قابلِ قدر کتابیں لکھنے کے علاوہ دمشق میں اپنے قیام کے دوران فتاویٰ پر بھی ایک کتاب مدوّن کی۔

ابن حجر عسقلانی ''الدار الکامنة'' میں لکھتے ہیں کہ: شیخ صفی الدین ارموی رات کو وظیفہ کے لئے اٹھتے تو پوشاک میں پتاوے اور نعلین تک بدلتے تب نماز کے لئے کھڑے ہوتے۔ ان کی زبان میں ہندیوں کا سا عقدہ تھا۔ انتہائی نیک، دین دار اور عبادت گزار تھے۔

شیخ العالم امام الکبیر علامہ محمد بن عبدالرحیم الشافعی الھندی نے ۷۱۵ھ میں دمشق میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

محی الدین کاشانی

قاضی محی الدین کاشانی اپنے عہد کی معروف وممتاز دینی وعلمی اور روحانی شخصیات میں سے تھے۔ اودھ کے قاضیوں کے مشہور علمی خانوادے سے تعلق تھا اور عالم ابن عالم، ابن عالم اور قاضی ابن قاضی ابن قاضی تھے۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی علوم وفنون کے وسعت وفروغ میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ معاصر مؤرخین نے اپنی کتب تاریخ تذکرہ میں قاضی محی الدین کے فضل وکمال اور ان کی دینی وعلمی خدمات کو سراہا ہے اور ان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ قاضی صاحب حنفی المذہب اور صوفی مشرب تھے۔ اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ ۶۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔

معاصر مؤرخ ضیاء الدین برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' میں قاضی محی الدین کاشانی کا ذکر سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے ممتاز ترین علماء واساتذہ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ایسے علماء اور اساتذہ تھے جن میں سے ہر ایک علامۂ وقت سمجھا جاتا تھا اور ان میں سے بعض تو علوم وفنون میں کمال حاصل کر کے غزالی اور رازی کے مرتبہ پر پہنچ گئے تھے۔

شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی خلیفۂ اعظم حضرت سلطان المشائخ اپنی کتاب ''خیرالمجالس'' میں لکھتے ہیں کہ ''قاضی محی الدین کاشانی تبحر عالم تھے۔ میں (یعنی شیخ نصیرالدین محمود) نے ان سے ''بزدوی'' پڑھی ہے۔

سید امیر خورد کرمانی اپنی تالیف ''سیر الاولیاء'' میں لکھتے ہیں:

عالمِ ربانی، قاضی محی الدین کاشانی، جو علم وحلم، زہد وتقویٰ کے لحاظ سے سلطان

المشائخ کے اعلی مریدوں میں مشہور تھے۔ ایک صاحب علم وفضل خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قاضی قطب الدین کاشانی کے نواسے تھے اور شہر بھر کے استاد تھے۔ ان فضیلتوں کے باوجود سلطان المشائخ کی مریدی کو اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ سلطان المشائخ کی نظر میں بھی ان کی بڑی عزت تھی۔ جس وقت وہ سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو سلطان المشائخ ان کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ یہ عزت و احترام مریدوں میں سے بہت کم لوگوں کو حاصل تھا۔ ان کی تشریف آوری پر سلطان المشائخ کی مجلس طویل ہو جاتی تھی۔ وہ علمی مشکلات جو قاضی صاحب کو پیش آتی تھیں، وہ ان علمی مشکلات کو سلطان المشائخ سے حل کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اہلِ طریقت کے تذکرے، رموزِ عشق، لطائف اور دوسرے سوال و جواب کثرت سے ہوتے تھے جن میں سے بعض کو اس کتاب (یعنی سیر الاولیاء) میں لکھا گیا ہے۔ بعض وہ مرید، جن کو سلطان المشائخ کی مجلس میں دیر تک بیٹھنے کا موقع نہ ملتا تھا وہ قاضی محی الدین کاشانی کا انتظار کرتے رہتے تھے تاکہ ان کو قاضی صاحب کے طفیل میں سلطان المشائخ کی مجلس میں دیر تک بیٹھنے کا موقع مل جائے۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں قاضی محی الدین کاشانی کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے: ''آپ شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدوں میں سے عالمِ کامل، زہد و تقویٰ کی صفات سے آراستہ کشف و کرامات کا منبع اور تمام شہر کے استاد تھے۔''

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' کے حصہ دوم میں شیخ محی الدین کاشانی کے نام سے ان کے احوال بیان کئے۔ چنانچہ ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔ ''الشیخ الفاضل الکبیر شیخ محی الدین کاشانی ابنِ جلال الدین بن قطب الدین حنفی، صوفی کاشانی فقہ و اصول و طریقت میں فخرِ روزگار تھے۔ شیخ شمس الدین تو شجی اور دہلی کے دیگر نامور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر حضرت نظام المشائخ سے شرف بیعت حاصل کیا۔

مولوی فقیر محمد ''حدائق الحنفیہ'' میں رقمطراز ہیں: قاضی محی الدین کاشانی، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے اجل خلفاء میں سے علوم حدیث و تفسیر و فقہ میں شہر دہلی کے استاد اور زہد و تقویٰ، خوارق عادات اور کشف و کرامات میں مشہور زمانہ تھے۔

امیر خورد کرمانی مؤلف ''سیر الاولیاء'' کے بیان کے مطابق ''قاضی محی الدین کاشانی

تکلفات سے پاک اور اسلاف کے طریقے پر کاربند تھے۔"

زمانۂ طالب علمی میں قاضی محی الدین کاشانی اور مولانا فصیح الدین بہت مدت تک ایک ساتھ رہے۔ دونوں نے اصولِ فقہ کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم مولانا شمس الدین قوشجی سے حاصل کی۔ دونوں حضرات کے مزاج و کردار میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ اکٹھے تعلیم حاصل کی اور پھر دونوں نے غیاث پور جا کر حضرت سلطان المشائخ سے ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی درخواست کی۔ قاضی محی الدین نے مرید ہوتے ہی علائق دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے وظائف و جاگیر کے فرامین کو سلطان المشائخ کے سامنے چاک کر دیا اور خود سخت ریاضتوں اور مجاہدوں میں مشغول ہو گئے اور ایک طویل عرصے تک عبادت و ریاضت اور ذکر وفکرِ الٰہی میں مصروف رہے۔

جب سلطان المشائخ نے ان سے بکثرت کارِ خیر ہوتے دیکھے تو انہوں نے اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا اور ان کا خلافت نامہ خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا، جس کی عبارت یہ تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"تمہیں چاہئے کہ تارکِ دنیا رہو اور دنیا اور اہلِ دنیا کی طرف مائل نہ ہو۔ جاگیریں قبول نہ کرو اور بادشاہوں کا عطیہ نہ لو۔ اگر مسافر تمہارے پاس آئیں اور تمہارے پاس کچھ نہ ہو تو اپنی اس حالت کو غنیمت سمجھو اور انعام الٰہی میں سے مہمان کو ایک نعمت جانو۔ اگر تم نے ایسا کیا، جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے، میرا گمان یہ ہے کہ تم اس پر ضرور عمل کرو گے، تو تم میرے خلیفہ ہو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو بس اللہ ہمارا خلیفہ ہے مسلمانوں پر"۔

صوفیہ کرام اور مرشدان طریقت اپنی مریدوں کو اُن کے مزاج اور افتادِ طبع کی مناسبت سے تعلیم و تربیت فرماتے تھے گویا کہ وہ مریض کا علاج اُس کے مرض کے پیش نظر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ قاضی محی الدین کو بھی کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا، گزر اوقات کیسے ہوتی؟ نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ان کے اہل و عیال نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی، عمدہ خوراک کھائی اور نفیس لباس پہنا تھا اور آرام و

آسائش کی زندگی کے خوگر تھے۔ قاضی صاحب کو پریشان کرنے لگے۔ اُن کے ایک معتقد نے انہیں بتائے بغیر اُن کے مناقب و فضائل اور اُن کی پریشان حالی کا قصہ ماجرا سلطان علاء الدین خلجی کے گوش گزار کر دیا۔ سلطان نے حکم دیا کہ اودھ کی قضاۃ جو قاضی محی الدین کی موروثی ہے، انعامات اور متعدد دیہات کے ساتھ ان کے سپرد کی جائے۔

جب قاضی صاحب کو اس صورت حال کی اطلاع ملی تو وہ سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ بیان کر کے عرض کیا کہ بادشاہ نے میری خواہش کے بغیر ایسا فرمان جاری کر دیا ہے، اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ سلطان المشائخ قاضی صاحب سے یہ بات سن کر ناراض ہو گئے اور فرمایا کہ تمہارے دل میں ضرور اس قسم کا خیال پیدا ہوا ہو گا تب ہی تو یہ چیزیں تمہارے لئے پیش کی گئی ہیں۔ یہ فرما کر سلطان المشائخ دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ غرض کہ قاضی صاحب کو اس واقعہ سے نہایت تشویش اور پریشانی پیدا ہو گئی۔ یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ سلطان المشائخ نے قاضی صاحب سے وہ خلافت نامہ واپس لے لیا جو انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا تھا۔ ایک سال تک سلطان المشائخ قاضی صاحب سے ناراض رہے۔ تب کہیں جا کر ان کی برہمی دور ہوئی اور قاضی صاحب کی پریشانی کا خاتمہ ہوا۔ اس طرح ایک سال گزرنے کے بعد سلطان المشائخ نے قاضی کو تجدیدِ بیعت اور مریدی سے از سر نو مشرف فرمایا۔ الحمد للّٰہ علیٰ ذالک۔

قاضی محی الدین کاشانی اکثر حضرت سلطان المشائخ کی مجلس میں حاضری دیا کرتے تھے اور سلوک و طریقت کے بارے میں حضرت سے راہنمائی حاصل کرتے تھے جس کی تفصیلات ''سیر الاولیاء'' میں ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ مراقبہ قلب کے بارے میں سلطان المشائخ نے فرمایا، اصل کام دل کا مراقبہ ہے کہ وہ اعضاء کی تمام عبادتوں پر راجع اور موثر ہے... قاضی محی الدین کاشانی نے پوچھا کہ نمازی یا ذاکر جب حضور میں ہو اور مذکر کا باطن یادِ الٰہی میں مشغول ہو، کیا اسے اس حال مراقب کہہ سکتے ہیں؟ اور کیا یہ حقیقت میں اس کا مراقبہ ہے؟ فرمایا ''مراقبہ لغت کے اعتبار سے یہی ہے لیکن مشائخِ طریقت کی اصطلاح میں دل میں جمالِ حق کو دیکھنا ہے اور قلب کا عمل مخفی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہی جانتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا دیکھ رہا ہوں۔ لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے کار ہے لیکن حقیقت میں وہ کام میں لگا ہوا ہے۔''

پھر فرمایا کہ "ذکر خفی، مراقبے سے ستر درجہ بالاتر ہے کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ مراقبہ قلب سے جمال حق کو دیکھنا ہے، لیکن ذکر خفی ذاتِ حق تعالیٰ کا علم ہے جو بندے کے ظاہر و باطن پر طلوع ہوتا ہے اور اس عالم میں بندے کو شعور ہوتا ہے اس دیکھنے کا اور علم کا، لیکن جب یہ رؤیت اور علم بندے کے دل پر غالب آ جاتے ہیں تو شعور سے بے شعور ہو جاتا ہے، اس کو ذکرِ خفی کہتے ہیں۔"

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ اعظم شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی "خیرالمجالس" میں لکھتے ہیں:

"قاضی محی الدین کاشانی جن سے میں نے "بزدوی" پڑھی ہے، متبحر عالم تھے۔ اچانک بیمار پڑ گئے، یہاں تک کہ لوگوں کو اُمید زیست نہ رہی اور سمجھے کہ اب قاضی رحلت کر جائیں گے۔ اتفاق سے سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ قاضی نزع کے عالم میں ہیں، ہوش و حواس بالکل جاتے رہے ہیں۔ مگر وہ ہوش میں آ گئے۔ شیخ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پورے طور سے صحت یاب ہو گئے گویا کوئی مرض ہی نہ تھا۔"

قاضی محی الدین کاشانی نے سلطان المشائخ سے پوچھا کہ مرید کو حق تعالیٰ، جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے پیر کا مراقبہ علیحدہ علیحدہ کرنا چاہیے یا اکٹھے؟ فرمایا کہ "ان کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے اور علیحدہ علیحدہ بھی۔ جب وہ ان سب کو اکٹھا کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ یہ سمجھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کے دائیں جانب اور بائیں جانب اس کے پیر (شیخ یا مرشد) ہیں۔ اور جو حرکات و سکنات اس سے ظاہر ہو رہی ہیں اور جو خطرہ اس کے دِل میں گزر رہا ہے، حق تعالیٰ عز و جل اس کو دیکھتا اور جانتا ہے۔"

قاضی محی الدین کاشانی نے فرمایا کہ میں نے سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ محمد حاجی کہتا ہے کہ جب سے حج کر کے آیا ہوں میرا دل ڈانواں ڈول ہے اور مجھے کسی حالت میں آرام و قرار نہیں۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ اس سے کہو کہ "یہ آیات ہر روز سات بار پڑھا کرے۔"

ھو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المومنین لیزدادوا ایماناً مع ایمانھم و للّٰہ جنود السمٰوات والارض و کان

اللہ علیماً حکیماً۔

ترجمہ:

وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھالیں۔ زمین اور آسمان کے سب لشکر اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ علیم و حکیم ہے۔

یہ آیات مبارکہ پڑھتے وقت داہنا ہاتھ سینے پر رکھے۔ اور اس کی پابندی، شکایت دور ہو جائے گی۔ سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ شیخ شیوخ العالم فریدالحق ولدین قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا کہ فقیر، صابر، شاکر، مال دار پر فضیلت رکھتا ہے کیونکہ غنی شاکر سے وعدہ کیا گیا ہے کہ:

''لئن شکرتم لازید لکم''

یعنی اگر تم شکر کرو گے تو میں اپنی نعمتیں تم پر زیادہ کر دوں گا۔

اور فقیر صابر کو اُس کے صبر کرنے پر معیت کی نعمت کی بشارت

''ان اللہ مع الصابرین''

''یعنی بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''، سے نوازا گیا ہے۔ ان دونوں مرتبوں میں کتنا عظیم فرق ہے۔

اس موقع پر قاضی محی الدین کاشانی نے سلطان المشائخ سے سوال کیا کہ: وھو معکم اینما کنتم (حق تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو) اور 'ان اللہ مع الصابرین ' خاص ہے۔ اس صورت میں عام و خاص میں کیا فرق ہے؟ فرمایا کہ عام کو محض معیت حاصل ہو گی یعنی وہ جانیں گے اور دیکھیں گے اور خاص کو جو معیت حاصل ہو گی وہ حق تعالیٰ کی خاص عنایتوں کے ساتھ ہو گی یعنی اللہ تعالیٰ ان سے محبت بھی کرے گا اور ان سے راضی بھی ہو گا۔

فاضل اجل عالم ربانی قاضی محی الدین کاشانی نے ۷۱۹ھ۔۱۳۱۹ء میں وفات پائی۔ ''عالی درجات'' تاریخ وفات ہے۔

ضیاءالدین نخشبی

خواجہ ضیاء الدین نخشبی آٹھویں صدی ہجری کے نامور عالم اور صاحبِ کمال صوفی بزرگ تھے۔ علم وفضل میں مشہور ہونے کے علاوہ زہد وتقویٰ اور استقامت وعزیمت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ کتبِ تاریخ وتذکرہ میں ان کی شخصی خصوصیات اور علمی کمالات کے علاوہ ان کی بلند پایہ تصنیفات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ شیخ حمید الدین ناگوری کے خانوادے میں شرف بیعت رکھتے تھے اور عالی دماغ وروشن ضمیر صوفی تھے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے ''خزینۃ الاصفیاء'' میں لکھا ہے کہ'' مولانا نخشبی مشائخ عظام میں سے تھے اور سلطان التارکین شیخ حمید الدین صوفی کے پوتے شیخ فرید الدین کے خلفائے کبار میں سے تھے۔''

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مولانا نخشبی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ لیکن یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں لکھا ہے کہ ''حضرت نظام الدین اولیاء کے زمانے میں تین شخص ضیاء الدین نام کے تھے۔ ضیاء الدین سنامی جو منکر شیخ تھے، دوسرے ضیاء الدین برنی جو شیخ کے معتقد ومرید تھے۔ تیسرے ضیاء الدین نخشبی جو شیخ کے نہ منکر تھے اور نہ معتقد۔

مولانا عبدالحق محدث نے ''اخبار الاخیار'' میں اور مولانا عبدالحئ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں شیخ ضیاء الدین نخشبی کے عنوان سے ان کے احوال بیان کئے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحئ لکھتے ہیں:

> ''الشیخ الفاضل العلامۃ شیخ ضیاء الدین نخشبی صاحبِ فضل وکمال اور شہرۂ آفاق تھے۔ درسیات شیخ شہاب الدین ہروی سے پڑھیں اور طریقت کا درس

فریدالدین بن عبدالعزیز بن شیخ حمید الدین ناگوری سے لیا... حضرت شیخ نخشی زہد و تقویٰ اور استقامت اور تبتل الی اللہ میں فرد تھے۔ دنیا اور اس کے متاع سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ طب و موسیقی، شعر و انشاء سے دل بستگی تھی۔ شیخ نخشی نظم و نثر کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے ان میں سے طوطی نامہ اور سلک السلوک بہت مقبول ہوئیں۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے خواجہ ضیاء نخشی کے عنوان سے ان کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے ضیاء الدین نخشی شیخ فرید کے مرید کے مرید تھے جو سلطان التارکین شیخ حمیدالدین ناگوری کے خلیفہ اور پوتے تھے۔ آپ بدایوں میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے اور مطالعہ کتب، تصنیف و تالیف وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کی کئی کتابیں ہیں مثلاً سلک سلوک، عشرہ مبشرہ، کلیات و جزئیات، طوطی نامہ وغیرہ۔ آپ کی تمام تصنیفات بلند مرتبہ اور مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے متشابہ ہیں۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر کے بیان کے مطابق شیخ ضیاء الدین نخشیؒ نے یہ سات کتابیں لکھی ہیں۔

۱۔ شرح دعائے سریانی
۲۔ شرح قصیدہ فاطلبنی تجدنی
۳۔ طوطی نامہ
۴۔ الکلیات الجزئیات
۵۔ سلک السلوک
۶۔ چہل نامہ
۷۔ عشرہ مبشرہ

مولانا عبدالحئ کے مطابق اول الذکر چار کتب عربی زبان میں ہیں۔ جبکہ آخرالذکر تین کتابیں فارسی زبان میں ہیں اور حلاوت کی چاشنی سے مملو ہیں۔ جبکہ ''طوطی نامہ'' نصائح وحکم میں نہایت عمدہ عبارت اور عجیب استفادات سے مرصع، نظم و نثر ہر دو سے آراستہ ہے۔ یہ کتاب تیس سال میں مکمل ہوئی۔ شیخ ضیاء الدین کی کتاب ''الکلیات والجزئیات'' کے بارے میں مولانا عبدالحئ حسنی نے لکھا ہے کہ ان کی یہ کتاب علمِ طب پر ہے اس میں مفرد ادویات کے علاوہ اشیاء مافی الباب کے اردو نام بھی دیئے گئے ہیں۔ مولانا عبدالحئ حسنی نے شیخ ضیاء الدین کے بعض اشعار بھی نمونے کے طور پر لکھے ہیں۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے شیخ ضیاء الدین نخشی کے اشعار کے علاوہ ان کی کتابوں سے بعض انتہائی دلچسپ اور سبق آموز حکایات بھی نقل کی ہیں۔ چنانچہ مولانا

عبدالحق محدث رقمطراز ہیں:

''خواجہ ضیاء الدین نخشبی کی 'سلک السلوک' وہ کتاب ہے جو اپنی حلاوت، رنگینی اور لطافت بیان کے ساتھ ساتھ پر تاثیر حکایات اور اولیاء اللہ کے پند و نصائح سے لبریز ہے۔ آپ کی اکثر کتابوں میں ایک ہی طرز کے قطعات ہیں جیسا کہ یہ قطعہ ہے:

نخشبی خیز و با زمانہ بساز!
ورنہ خود را نشانہ ساختن است
عاقلان زمانہ مے گویند
عاقلی بازمانہ ساختن است

یعنی اے نخشبی کھڑا ہو جا اور زمانے کا ساتھ دے ورنہ تم خود لوگوں کا نشانہ بن جاؤ گے۔ دنیا کے عقلمندوں کا یہ کہنا ہے کہ زمانے کا ساتھ دینا ہی عقلمندی ہے۔

''سلک السلوک' میں شیخ ضیاء الدین نخشبی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ایک حکایت بیان کی ہے جس سے یہ سبق نکلتا ہے کہ عبادت پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔ جو شخص عبادت و اطاعت نہیں کرتا وہ اس شخص سے بہتر ہے جو عبادت کرتا ہے اور اسے لوگوں پر فخر یہ ظاہر کرتا ہے۔

''اسلامی دستور کے مطابق اسلامی مملکت میں مدعا علیہ کو سزا دی جاتی ہے مگر اقلیم طریقت میں مدعی کو قید و بند میں بھیج دیا جاتا ہے۔

قطعہ:

نخشبی تانظر بخود نکنی!
مثل ایں کار مردہٗ نکند!
ہر کرا سوئے خود نگہ باشد
ہیچ کس سوئے او نگہ نکند

یعنی اے نخشبی جب تک تم اپنی طرف نہ دیکھو گے تو مردے کی مانند ہو گے اور اس کام کو نہ کر سکو گے۔ اور جو کوئی تکبر کرتا ہے اس کی طرف کوئی شخص التفات نہیں کرتا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو شخص اپنی حفاظت کرتا ہے، یعنی احکام شریعت پر چلتا ہے تو اس کی طرف کوئی بھی ضرر رساں نظر نہیں اٹھا سکتا۔

''میرے عزیز دوستو! وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت کعب بن احبارؒ مسجد میں سب سے پچھلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے توریت میں پڑھا ہے کہ امتِ محمدیہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جب ان میں سے کوئی ایک خدا کے حضور سربسجود ہو گا تو ابھی سجدہ سے سر نہ اٹھائے گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے پیچھے والے لوگوں کو بخش دیں گے۔

''میرے عزیز دوستو! جب ابراہیمؑ آگ کے قریب پہنچے تو آگ کو اتنا بے ضرر اور بے بس پایا کہ آپ کو آگ پر رحم آیا۔ نبی کریم صاحب لولاک لما خلقت الافلاک فرماتے ہیں کہ کسی کو راہِ حق میں اتنی مصیبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنا کہ مجھے مصیبتوں سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ ابراہیمؑ کو آگ میں گرایا گیا، زکریاؑ کو چیرا گیا۔ یہ اتنی مصیبتیں نہیں جتنی ہمارے اوپر ڈالی گئیں، ہمیں اہل زمین و آسمان سے مقدم رکھا گیا اور بنی آدم کے گناہوں کو ہماری شفاعت کے ذیل سے وابستہ کر دیا گیا۔ بے راہوں کو ہماری راہ اختیار کرنا چاہئے، مجرموں کو ہماری طرح عذر کرنا چاہئے اور کاہل اور سست لوگوں کو ہماری طرح کام کرنا چاہئے، میرا پروردگار مجھے کبھی تو قاب قوسین کے قریب لے گیا اور کبھی ابوجہل جیسے ظالم و جابر کے پاس بھیج دیا اور کبھی مجھ کو شاہد و مبشر کے لقب سے ملقب کیا اور کبھی لوگوں نے مجھے پاگل اور ساحر کہا، کبھی جبرئیل امین کو میرا رکاب دار اور ساتھی بنا دیا اور کبھی اجازت نامہ کے بغیر مکہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ کبھی ملکوت کے خزانے میرے حجرے میں لائے گئے اور کبھی ایک جو کی خاطر ابوشحمہ کے دروازے پر بھیجتے تھے۔ کبھی میرے غلاموں سے خیبر فتح کرواتے ہیں اور کبھی ظالموں کے ہاتھوں میرے دندان (مبارک) شہید کرواتے ہیں...

''ہمارے ساتھ یہ سب کچھ اس لئے کرواتے ہیں تاکہ اہل دنیا یہ یقین کر لیں کہ ہمارا راستہ پُرخار راستہ ہے جس پر چلنے کے لئے پاؤں کو سر پر رکھ کر چلنا پڑتا ہے اور اگر کسی سے یہ نہیں ہو سکتا تو وہ اس راہ پر چلنے کا نام تک نہ لے۔ اس راستہ کو عام راستوں کی طرح عبور اور طے نہیں کیا جا سکتا۔

''حضرت بشر حافی فرماتے ہیں: مجھے سب سے زیادہ سخت تازیانہ امام حسن بصریؒ کی بیٹی نے مارا تھا۔ اس کی صورت اس طرح پیش آئی کہ میں ایک دن امام حسن بصریؒ کے گھر گیا اور ان کے گھر پہنچ کر دستک دی، ان کی بیٹی نے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا بشر حافی۔ اس

نے کہا یہاں سے سیدھے بازار جاؤ اور وہاں سے جوتا خرید کر پاؤں میں پہن لو اور اس کے بعد اپنے آپ کو بشر حافی (ننگے پاؤں والا) مت کہنا۔ اگر کوئی سوال کرے کہ جنت میں وجوہ یومئذ ناظرۃ الی ربہا ناظرہ کا عاشقوں کو مشاہدہ ہوگا تو اس مشاہدے کے بعد عاشقوں کو لوٹا دیا جائے گا یا یہ خود بخود لوٹ آئیں گے۔ سو بصورت اول یہ رجوع قابل ندامت ہے اور بصورت ثانی کیا انہیں تجلی الٰہی کا مشاہدہ ہوگا بھی نہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ عاشقوں کو نہ تو لوٹایا جائے گا اور نہ وہ خود بخود ہی لوٹ جائیں گے بلکہ وہ تو ہر وقت خدا کے جمال میں مستغرق رہیں گے اور اسی کے جاہ و جلال کو دیکھیں گے۔

''میرے عزیز دوستو! آدم کو آٹھ بہشت عطا کئے گئے اور وہ ایک روز اس بہشت کو چھوڑ گئے لیکن عشق کا جو ذرہ اس میں رکھا گیا تھا وہ اس سے متصل رہا۔ جی ہاں! آدم کی لغزش بھی مشغولیتِ حق کی وجہ سے تھی اور شیطان کا گناہ فارغ البالی کی وجہ سے۔

نخشی از فراغ بیروں است
غمِ دل جز چراغِ دل نہ بود
دل فارغ نشاں بیکاری است
عاشقاں را فراغِ دل نہ بود

یعنی نخشی فراغت سے باہر ہو گیا۔ دل کا غم بجز چراغِ دل کے نہیں ہوتا۔ فراغت قلبی بیکاری کی دلیل ہے، عاشقوں کا دل فارغ نہیں رہتا۔

''حضرت رابعہ بصری سے لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ ابلیس کو دشمن سمجھتی ہیں؟' فرمایا 'نہیں۔' لوگوں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا، 'میں دوست کے خیال میں اس قدر مشغول ہوں کہ مجھے دشمن کی خبر ہی نہیں ہے۔''

''کسی کا قول ہے کہ بامروّت آدمی وہ ہے جو بے مروّت لوگوں سے کبیدہ خاطر اور رنجیدہ نہ ہو۔

''حضرت ابو بکر شبلیؒ کو ان کی وفات کے بعد کسی شخص نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ ''منکر و نکیر کے سوالوں کے آپ نے کیا جواب دیئے؟'' فرمایا، ''اگر تم اس وقت موجود ہوتے تو دیکھتے کہ ہمارے درمیان کیا معاملہ ہوا؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ 'بتاؤ تمہارا خدا کون ہے؟' میں نے جواب دیا کہ میرا خدا وہ ہے جس نے تم تمام فرشتوں کو میرے

باپ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا اور میں اس وقت اپنے باپ (آدمؑ) کی پشت میں تم سب بھائیوں (یعنی ملائکہ) کو دیکھ رہا تھا۔ جس پر انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ 'ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے کیونکہ ہم اس سے جو سوال کرتے ہیں وہ اس کا جواب تمام اولادِ آدم کی جانب سے دیتا ہے۔''

''دولت مندوں اور اغنیاء کو چار چیزیں ملتی ہیں۔ اوّل جسمانی تکلیف، دوم مشغولی دل، سوم نقصانِ دین، چہارم قیامت کا حساب اور درویشوں کو بھی فقر و فاقہ سے چار چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ اوّل آسائش، دوم فارغ البالی، سوم سلامتیِ دل، چہارم قیامت کے حساب سے خلاصی۔ اے درویش! صبح سے شام تک اپنے نفس سے جنگ کرنا کہ یہ چار چیزیں ظاہر ہو جائیں اور فی الحقیقت مرد وہی لوگ ہیں جو اپنے نفس سے جنگ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

''میرے عزیز دوستو! جو شخص اپنے نفس کا ہمیشہ محاسبہ کرتا ہے تو وہ تمام دعویٰ اور معنی ترک کر دیتا ہے اور دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

''غور سے سنو! ایک بنئے نے جس کی ترازو کا پلڑا آسمان کی طرف تھا، ایک شخص کو دیکھا جو شیر پر سوار ہاتھ میں سانپ کا کوڑا لئے جا رہا تھا۔ بنئے نے اسے روک کر کہا کہ تیرا کام تو بہت سہل اور آسان ہے۔ اصل اور مشکل کام تو یہ ہے کہ ترازو کے دو پلڑوں کے درمیان بیٹھ کر ٹھیک تولا جائے یعنی صحیح اور حق کام سرانجام دیا جائے۔

''ایک متقی و پرہیز گار شخص کچھ سامان خریدنے کے لئے بازار جانے لگا تو اس نے ایک اشرفی لی اور اس کا گھر میں وزن کیا۔ پھر جب بازار میں جا کر اس کا وزن کیا تو گھر والے سے کچھ کم رہا۔ یہ دیکھ کر وہ شخص رونے لگا۔ لوگوں نے پوچھا بھائی روتے کیوں ہو؟ اس نے جواب دیا آج گھر کا ماجرا جب بازار میں لایا گیا تو گھر کے مطابق نہ رہا تو کل یعنی قیامت کے روز جب دنیا کا ماجرا پیش ہوگا کیسے صحیح و درست رہ سکے گا۔

''کسی نے حضرت یحییٰ معاذ رازی کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور ان سے دریافت کیا کہ عالم بالا میں آپ کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا؟ فرمایا 'مجھ سے پوچھا گیا کہ دنیا سے کیا لائے ہو، میں نے عرض کیا کہ زندان سے آ رہا ہوں۔ وہاں سے کیا لاتا؟ اگر

میرے پاس کچھ ہوتا تو ستر برس تک دنیا کی قید و بند میں نہ رہتا۔''

قادرالکلام شاعر اور ادیب شہیر شیخ ضیاء الدین نخشی نے ۷۵۱ھ ۔ ۱۳۵۰ء میں وفات پائی۔

ضیاء الدین برنی

خواجہ ضیاء الدین کا شمار سلطنت دہلی کے عہد آخر کے ممتاز علماء و فضلاء اور محدثین میں ہوتا ہے۔ وہ حدیث، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، منطق اور علم الکلام کے نام ور ماہر اور شعر و سخن، لغت اور ادبیات کے فاضل کامل تھے۔ تاریخ فیروز شاہی کے مصنف ہونے کی حیثیت سے ضیاء الدین برنی نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔

اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق خواجہ ضیاء الدین ۶۵۶ھ میں ہندوستان کے شہر برن موجودہ بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد موئد الملک سے حاصل کی اور قرآن کریم پڑھ چکنے کے بعد حدیث اور فقہ پر دسترس حاصل کی۔ ''تاریخ فیروز شاہی'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء الدین برنی کو فقہ و حدیث کے علاوہ منطق، کلام، تفسیر اور تاریخ و ادبیات ایسے علوم وفنون پر کامل دسترس حاصل تھی۔

''تاریخ فیروز شاہی'' غیاث الدین بلبن کی ۶۶۴ھ میں تخت نشینی سے لے کر خاندان تغلق کے سلطان فیروز شاہ تغلق کے ساتویں سال جلوس یعنی ۷۵۸ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے اور اہم ترین معاصر ماخذ ہونے کے علاوہ ہمارے تاریخی ادب میں کلاسیکی مقام رکھتی ہے۔ ضیاء الدین نے اپنی تاریخ وہیں سے شروع کی جہاں قاضی منہاج سراج نے ''طبقات ناصری'' کو ختم کیا تھا۔ ان کا طرز تحریر قاضی منہاج کی طرح سادہ و سلیس اور کہیں کہیں صاحبِ ''تاج المآثر'' صدر الدین نظامی اور امیر خسرو کی طرح مسجع و مقفع ہے۔

''تاریخ فیروز شاہی'' ۷۵۸ھ میں ''طبقات ناصری'' کی تالیف کے ۹۵ سال بعد مکمل ہوئی یہ مختصر طور پر سلطان غیاث الدین بلبن کے حالات سے لے کر سلطان فیروز

شاہ تغلق کے عہد حکومت کے ابتدائی چند برسوں کے واقعات پر مشتمل ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں لکھے جانے کے سبب ''تاریخ فیروز شاہی'' کے نام سے منسوب ہوئی۔ یہ روایت بھی ملتی ہے کہ برنی نے اس کو تغلق سلطان کے نام سے اس لیے منسوب کیا تھا کہ وہ سلطان سے انعام و اکرام کے خواہاں تھے۔ بہرحال خواجہ برنی خود بیان کرتے ہیں:

''اس کتاب تاریخ میں ملوک و سلاطین کے واقعات بھی ہیں اور احکام و انتظام اور اہتمام جہانبانی بھی۔ علاوہ ازیں بادشاہوں اور دُنیا والوں کے لیے اس میں پند و موعظت بھی دیگر تالیفات کی نسبت بیشتر و بہتر ہیں۔''

خواجہ ضیاء الدین برنی اپنے قارئین کو فنِ تاریخ کے ضمن میں بتاتے ہیں:

''یہ علم جاہلوں، پست فطرت اور گھٹیا قسم کے لوگوں کے لیے فائدہ مند نہیں اور نہ انہیں اس سے کوئی نسبت ہے۔ یہ بزرگوں اور بزرگ زادوں کے جاننے کا علم ہے۔ اس کے مطالعے سے آدمی تجربہ کار اور صاحب حلم بنتا ہے۔ یہ شعور، زیادتیٔ عقل اور درستیٔ رائے کا وسیلہ ہے۔ دین داری کی رُو سے مؤرخ پر واجب ہے کہ وہ کسی بادشاہ کے فضائل، نیک کاموں اور عدل و احسان کے کارناموں کے ساتھ اس کی برائیوں اور رذائل کا بھی تذکرہ کر دے۔''

فن تاریخ نویسی میں خواجہ ضیاء الدین کو جو کمال حاصل ہوا اس کی اصل اور بنیادی وجہ، دینی علوم، بالخصوص علم حدیث، فقہ اور تفسیر میں ان کی غیر معمولی مہارت و دست گاہ تھی۔ خواجہ ضیاء الدین سلطنت دہلی کے ایک بااثر اور ممتاز علمی خاندان میں پیدا ہوئے اور انہوں نے پاکیزہ مذہبی ماحول میں پرورش پائی۔ ان کا والد مؤیدالملک ارکلی خان کا نائب اور چچا ملک علاء الملک سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی کا کوتوال اور خلجی سلطان کا مشیر خاص تھا۔ اور ان کے نانا حسان الدین باربک سلطان بلبن کے عہد میں لکھنوتی کے شحنہ تھے۔

فن تاریخ میں اپنی دسترس کے بارے میں خود خواجہ برنی لکھتے ہیں کہ ''اس فن میں

مہارت حاصل کرنے کے لئے میں نے بہت محنت کی ہے۔" سید امیر خورد کرمانی مؤلف "سیر الاولیاء" خواجہ ضیاء الدین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی تعلیم بہترین ماحول اور بہترین اساتذہ کے زیر سایہ ہوئی۔ دینی علوم کے علاوہ تاریخ اور فلسفہ پر بھی انہوں نے عبور حاصل کیا۔ ان کے تعلقات بڑے بڑے امراء اور سلاطین کے ساتھ تھے۔ اس زمانے کے اکابر مشائخ سے بھی خواجہ ضیاء الدین کو شرف نیاز حاصل تھا۔ وہ محمد بن تغلق کے ندیم اور مشیر تھے۔ سید امیر خورد کرمانی جوان کا ہم عصر اور دوست بھی تھا، انہیں "عالم دل پذیر" اور مجمع الطائف" اور "جوامع الحکایات" ایسے معزز القاب و خطابات سے یاد کرتا ہے جو ضیاء الدین برنی کے وسعت مطالعہ اور تبحر علمی پر شاہد عادل ہیں۔

خواجہ ضیاء الدین برنی کے نزدیک ایک محدث کے لئے مؤرخ اور مؤرخ کے لئے محدث ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے نہ صرف "تاریخ فیروز شاہی" میں قرآنی آیات اور احادیث نبوی کے جابجا برمحل حوالے دیئے ہیں بلکہ شخصیات کے احوال و آثار اور تاریخی واقعات قلمبند کرتے وقت علم حدیث کے مسلمہ اصول و شرائط کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

مؤرخ کی صفات بیان کرتے ہوئے خواجہ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

"مؤرخ کو راست باز اور راست نگار ہونے کے ساتھ ساتھ دین دار بھی ہونا چاہیے۔ مزید برآں اس کو حقیقت پسند اور صداقت شعار بھی ہونا چاہیے۔"

تاریخ کے بارے میں ضیاء الدین برنی کا یہ نظریہ ہے:

"دینی علوم یعنی حدیث، فقہ، تفسیر اور تصوف و طریقت کے بعد کوئی دوسرا علم تاریخ سے زیادہ نفع بخش نہیں۔"

اس طرح ضیاء الدین برنی نہ صرف تاریخ کو علم نافع قرار دیتے ہیں بلکہ اس کو افعال انسانی کے وسیع تر پس منظر اور پیش منظر میں دیکھتے اور اسی انداز سے تاریخی واقعات کو پیش اور بیان کرتے ہیں تاکہ تاریخ کے طالب علم ماضی کے واقعات سے سبق حاصل کرکے اپنے حال اور مستقبل کو سنوارنے میں راہنمائی حاصل کرسکیں۔ گویا کہ تاریخ کا مطالعہ انسان کو فکر و شعور عطا کرکے اس کو صاحب بصیرت بنا دیتا ہے۔

خواجہ ضیاء الدین برنی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مؤرخ، تاریخ نویسی اور علم تاریخ کی اہمیت و افادیت کو اس انداز سے اجاگر کیا ہے کہ ان سے پہلے کسی شخص نے

ایسا نہیں کیا۔ چنانچہ ''تاریخ فیروز شاہی'' کے مقدمہ میں تاریخ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اس علم کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ کتب سماویہ میں انبیاء کرام کے احوال کے علاوہ سلاطین اور ان کی جباری و قہاری کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، چنانچہ یہ علم تاریخ ہی ہے جو اربابِ بصیرت کے لئے سرمایۂ اعتبار ہے۔''

علم تاریخ کی دوسری خوبی بیان کرتے ہوئے خواجہ برنی لکھتے ہیں کہ اس کا تعلق علم حدیث سے ہے جو تمام تر رسول اللہؐ کے اقوال و افعال سے متعلق ہے اور تفسیر کے بعد سب سے زیادہ بہتر اور نفع بخش علم ہے۔ راویوں کی تعریف و تنقید، ورودِ احادیث کی کیفیت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات، ناسخ و منسوخ، احادیث کا تقدم و تأخر، ان سب کا تعلق تاریخ ہی سے ہے۔ حدیث اور تاریخ کا یہی تعلق ہے جس کی وجہ سے ائمہ حدیث کا قول ہے کہ علم حدیث اور علم تاریخ جڑواں بچوں کی مانند ہیں۔ چنانچہ اگر محدث خود مؤرخ نہ ہوگا تو اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کے معاملات کا ـــــ کہ حدیث کے راوی حقیقت میں وہی ہیں ـــــ کوئی علم نہ ہوگا، اور مخلص و غیر مخلص اور حاضر باش و غیر حاضر باش صحابہؓ کے اخلاص کی کیفیت اس پر ظاہر نہ ہوگی۔ ایسی صورت میں کہ محدث پر یہ معاملات روشن نہ ہوں، وہ نہ تو روایت حدیث کے ساتھ انصاف کر سکے گا اور نہ حدیث بیان کرنے کا حق ادا کر سکے گا۔ عہد نبوتؐ اور عہد صحابہؓ کے حالات اور واقعات اور ان کی تشریح و تفصیل ہم پر تاریخ ہی کے ذریعے روشن ہوتی ہے۔

خواجہ ضیاء الدین برنی علمِ تاریخ کی ساتویں اور آخری خوبی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ساتویں خوبی علم تاریخ کی راست گوئی کا لازم ہونا ہے، اس لئے کہ تاریخ کی بنیاد صدق پر ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی ''واجعل لی لسان صدق فی الآخرین'' اور جھوٹ لکھنے والوں کو خدا تعالیٰ نے ان الفاظ میں ملامت کی ہے: ''یحرفون الکلم عن مواضعہ''۔ تاریخ کی کتابیں تالیف کرنا اور اس علم کا

جاننا سر برآوردہ اور مشاہیر کے لئے مخصوص ہے اور بزرگ اور بزرگ زادوں کا کام ہے۔ بعد ازاں مؤرخ برنی لکھتے ہیں کہ:
''عرب وعجم کے جملہ مؤرخ قابل اعتبار لوگوں میں سے تھے۔ امام محمد اسحاق جو سیر النبی اور آثار صحابہؓ کے مؤلف ہیں ایک صحابی کے بیٹے تھے۔ امام واقدی صاحب مغازی بھی صحابی زادہ تھے، ان کے اقوال معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔ امام اصمعی علمِ قرأت کے بڑے امام تھے اور فضل و بلاغت کے استاد، اور امام بخاری حدیث کے بڑے عالم تھے۔ امام ثعالبی، امام مقدسی، امام دینوری، امام حزم اور امام طبری مؤرخ بھی ہیں اور مفسر بھی اور ان کی تصانیف معتبر سمجھی جاتی ہیں۔''

مؤرخ ومحدث ضیاء الدین برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' لکھنے کے علاوہ ''فتاویٰ جہاں داری،'' ''نعت محمدی'' اور ''تاریخ آل برمک'' ایسے اہم موضوعات پر بھی کتابیں تصنیف کیں۔ ''فتاویٰ جہاں داری'' میں انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کو بیان کیا ہے اور مختلف سلاطین کی حکمت عملی اور ان کی کامیابی و ناکامی کے اسباب وعلال پر بحث کی ہے۔ بنابریں اس کتاب یعنی ''فتاویٰ جہاں داری'' کا مطالعہ ''تاریخ فیروز شاہی'' کے بعض مباحث و مندرجات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

ضیاء الدین برنی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ نویسی کے قدیم تصور کو وسعت و گہرائی عطا کی۔ اور افراد انسانی کی اجتماعی زندگی اور اس کے عمرانی پہلوؤں پر قلم اٹھایا، جس سے ان کی وسعت نظر، مضبوط قوت مشاہدہ، تبحر علمی اور ان کی جدت طرازی کا ثبوت ملتا ہے۔ ضیاء الدین برنی نے یہ تاریخی کارنامہ علامہ ابن خلدون کی شہرۂ آفاق تصنیف ''مقدمہ'' کی تکمیل سے ربع صدی پیشتر انجام دیا۔ اس لحاظ سے برنی کو ابن خلدون پر فضیلت و برتری حاصل ہے۔ ''تاریخ فیروز شاہی'' ۷۵۸ھ میں مکمل ہوئی جب کہ ابن خلدون کا ''مقدمہ'' ۷۸۰ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

خواجہ ضیاء الدین برنی نے اپنی زندگی کا آخری حصہ مفلسی وعسرت میں گزارا۔ انہوں نے ناز ونعم میں پرورش پائی تھی اور ساری جوانی شاہی درباروں میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے تھے۔ سترہ برس سے زائد عرصے تک سلطان محمد بن تغلق کے قدیم اور مشیر

رہے۔ تغلق سلطان اپنی فیاضی و سخاوت میں بے مثل تھا۔ اس نے خواجہ برنی پر انعام و اکرام کی بارش کی تھی۔ لیکن اس کی وفات کے بعد خواجہ برنی اس کے جانشین فیروز شاہ تغلق اور خواجہ جہاں ایاز کی باہمی چپقلش کا شکار ہوکر بے یار و بے مددگار ہوگئے۔ اگرچہ خواجہ برنی سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید خاص ہونے کے حوالے سے امیر خسرو اور امیر حسن سجزی کے دوست اور ہم جلیس تھے لیکن یہ حضرات پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔

خواجہ نظام الدین اولیاء (متوفی ۷۲۵ھ) کے مکتب محدثین کے نامور نمائندے اور معتبر مؤرخ خواجہ ضیاء الدین برنی نے ۷۵۸ھ میں وفات پائی۔ امیر خورد کرمانی لکھتے ہیں کہ ان کی وفات کے وقت ان کے پاس کوئی روپیہ پیسہ نہ تھا بلکہ اپنے پہننے کے کپڑے بھی انہوں نے راہِ خدا میں خیرات کر دیئے تھے۔ ان کے جنازے پر ایک چادر اور بوریا تھا۔

یہ اثر سلطان المشائخ کی صحبت کا تھا جو بادشاہوں کی صحبت پر غالب تھی کہ انجام بخیر ہوا اور خواجہ ضیاء الدین برنی، سلطان المشائخ کے قبرستان میں اپنے والد بزرگوار کی پائنتی میں مدفون ہوئے۔

علی بن احمد مہائمی

شیخ علی بن احمد مہائمی برصغیر پاکستان و ہند ہی کے نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علماء نامور فقہاء اور جلیل القدر مشائخ میں سے ہیں۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت کے علاوہ تصنیف و تالیف کے میدان میں شاندار اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ ان کی لکھی ہوئی تفسیرِ قرآن عربی زبان میں ایک شاہکار تصنیف ہے۔ حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔ بعض مؤرخین نے انہیں شافعی المذہب لکھا ہے۔ ان کا پورا نام و نسب یوں ہے:

علی بن احمد مہائمی، النائطی الکوکنی، کنیت ابوالحسن اور لقب علاء الدین ہے۔

شیخ علی بن احمد مہائمی ۷۷۶ھ میں مہائم نامی شہر میں پیدا ہوئے جو گجرات کی بندرگاہ ہے۔ نوائط یا نوایت سے تعلق رکھتے تھے، جو قریشِ مکہ میں سے کیے جاتے ہیں ہیں۔ نوائط کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف رائے ہے۔ مولانا عبدالقدوس اور مولانا عبدالحئی لکھنوی وغیرہ نے نوائط کو ایک قوم قرار دیا ہے۔ اور ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے کہ وہ ایک قبیلہ تھا۔ نوائط دراصل ان عربوں کی اولاد ہیں جو قرنِ اوّل میں اور پھر بعد کے زمانوں میں وقتاً فوقتاً اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر دکن اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں آتے رہے اور یہاں اپنی نوآبادیاں قائم کرتے رہے۔ اس کا آغاز پہلی صدی ہجری کے دوران اس وقت ہوا جب عربوں نے قبائلی تعصب و تفاخر کی لعنت کو ازسرنو زندہ کر دیا تھا۔

حجاج بن یوسف کی شاندار اور بے مثال جنگی منصوبہ بندی کی بدولت سندھ سمیت دنیا کے مختلف وسیع و عریض علاقے اور ملک فتح ہوئے تھے۔ حجاج کی تیار کردہ مہم میں

کامیابی کے بعد محمد بن قاسم نے سندھ میں ہزاروں مسلمان خاندانوں کو آباد کیا تھا۔ اور حجاج ہی کی بدولت برصغیر کے ساحلی علاقوں میں عربوں کی قدیم ترین نو آبادیاں وجود میں آئیں۔ وہ اس طرح کہ عبدالملک بن مروان نے جب حجاج کو عراق اور مشرقی علاقوں کا گورنر مقرر کیا تو ہاشمیوں کی ایک بڑی جماعت اس کے ظلم و تشدد کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر برصغیر میں آ گئی۔ حجاج بن یوسف کی نہ صرف یہ خواہش تھی بلکہ یہ بات اس کی جنگی حکمت عملی میں شامل تھی کہ برصغیر کے مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں آباد کیا جائے اور پھر ان کے ذریعہ تبلیغ اسلام کی جائے۔

شیخ محمد اکرام کی تحقیق کے مطابق نقل وطن کرنے والی ہاشمیوں کی بڑی جماعت میں سے جو لوگ مغربی ساحل بالخصوص کونکن یا کوکن کے ساحلوں پر آباد ہوئے ان کی اولاد کو نوایت (نووارد) یا نوائط، اور جو لوگ راس کماری کے مشرق میں آ کر آباد ہوئے اور یہاں کی تامل عورتوں سے شادی کر کے ایک مخلوط قوم کے بانی ہوئے، انہیں لبی (Labbes) کہتے ہیں۔ ''تاریخ نوائط'' سے خیال ہوتا ہے کہ سبھی نوائط اس زمانے میں نہیں آئے تھے بلکہ بعض نے دوسری صدی ہجری اور بعض نے آٹھویں صدی ہجری میں ترکِ وطن کیا۔

ان لوگوں نے جہاز رانی اور تجارت سے اپنے نئے وطن میں عزت و وقار حاصل کر لیا۔ اب ساحلی علاقوں میں ان کی کثرت ہے۔ دکن کے ساحل پر نوائط تاجروں کی اچھی آبادیاں ہیں۔ نوائط بالعموم شافعی مذہب کے پیرو ہیں اور ان میں سے کئی بڑے عالم پیدا ہوئے ہیں۔ بالخصوص مخدوم علی مہائمی ہندوستان کے سب سے بڑے علماء کے ساتھ جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

ایک روایت کے مطابق فاتحِ میسور سلطان حیدر علی بھی عربی النسل تھا اور ان ہی نوائط سے تعلق رکھتا تھا۔

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد دوم عربی ادب کے مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد نے ''الاعلام، روح المعانی، ابجد العلوم، اور سبحۃ المرجان کے حوالے سے شیخ مہائمی کے احوال بیان کئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''شیخ علاء الدین ابوالحسن علی بن احمد مہائمی، الشافعی، النائطی جو مخدوم مہائمی کے نام سے مشہور ہیں، ۷۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور اپنی عمر کا اکثر حصہ مہائم

میں گزارا۔ جو دکن کے قرب و جوار میں ایک بندرگاہ ہے۔ مہائی ابن عربی کے عقیدت مندوں میں سے تھے اور انہوں نے ابنِ عربی کے نظریہ وحدت الوجود کی تائید میں کئی ایک رسائل لکھے اور دلائل سے اس کی صحت کو ثابت کیا۔ اس کے علاوہ انہیں قرآنِ کریم اور اس کے علوم پر بھی بڑا عبور حاصل تھا۔ اس کی تائید ان کی تفسیر سے ہوتی ہے۔ جو ''تبصیر الرحمان وتیسیر المنان فی تفسیر القرآن'' کے نام سے مشہور ہے۔''

مولانا عبدالحیؒ ''نزہۃ الخواطر'' میں شیخ علی مہائمی کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''الشیخ الامام العالم الکبیر العلامۃ علی بن احمد شافعی مہائم کے رہنے والے تھے۔'' صاحب ''نزہۃ الخواطر'' نے شیخ باقر کی ''فحۃ العنبریہ'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''شیخ مہائی نے اپنی تفسیر کا موازنہ لوحِ محفوظ سے کرلیا ہے۔''

مولوی فقیر محمد نے ''حدائق الحنفیہ'' میں شیخ علی بن احمد مہائی کے احوال بیان کئے اور لکھا ہے کہ شیخ مہائی حنفی المذہب ہیں۔ جبکہ صاحبِ ''نزہۃ الخواطر'' اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے انہیں شافعی المذہب قرار دیا ہے۔ بعض مؤرخین نے شیخ مہائی کا لقب علاء الدین لکھا ہے۔ لیکن مولوی فقیر محمد کے بیان کے مطابق ان کا لقب زین الدین ہے۔ جیسا کہ مولوی صاحب نے تحریر کیا ہے:

> ''شیخ علی بن احمد بن علی مہائی گجراتی، زین الدین لقب تھا۔ جامع علوم ظاہری و باطنی، فقیہ، محدث، مفسر، صاحبِ تصانیفِ عالیہ تھے۔ تفسیر تبصیر الرحمان وتیسیر المنان'' معروف بہ تفسیر رحمانی جو صفت ایجاز و تدقیق میں موصوف ہے، آپ کی تصنیفاتِ عالیہ میں سے ہے اور ایک رسالہ ''ادلتہ التوحید'' نہایت ہی موجز و منقح باثباتِ دلائلِ عقلیہ و براہینِ قطعیہ ایسا تصنیف فرمایا ہے کہ اس میں ذرّہ برابر شک و شبہ کو دخل باقی نہ رہا۔ اس اہم رسالہ کے آغاز میں بعض آیات واحادیث ایزاد کیں۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں شیخ علی پیرو گجراتی کے نام سے شیخ علی مہائی کے احوال رقم کئے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحق محدث لکھتے ہیں:

''آپ صوفی اور بڑے موحد عالم تھے، علوم باطنی اور ظاہری میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو بہت عمدہ اور مفید ہیں۔ آپ کی تالیفات میں

''شرح فصوص الحکم'' بھی ہے جس میں آپ نے ظاہر کو باطن کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''جلتہ التائید فی شرح ادلتہ التوحید'' بھی آپ کا رسالہ ہے جس میں مختصر اور پاکیزہ مضامین ہیں۔ اس رسالہ میں آپ نے عقلی ونقلی دلائل سے شکوک و شبہات کا محققانہ انداز سے احاطہ وازالہ کیا ہے۔ اس رسالہ کی ابتداء میں بہت سی قرآنی آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لکھی ہیں جو نفس مضمون کے لئے کافی اور مبین ہیں۔'' اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''یہ وہ دلائل ہیں جو منکرین توحید کے قلوب سے کفر و شرک کے مہیب پردوں کو دور کرتے ہیں۔'' اور اخبارِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بہترین وہ مقولہ ہے جس کو اہل عرب کہا کرتے تھے کہ قول ہے۔

ع الا کل شئی ماحلا اللہ باطل۔

حدیث میں آتا ہے کہ نوافل پڑھتے پڑھتے بندہ اللہ کے قریب ہو جاتا ہے اور اللہ کا محبوب بن جاتا ہے، اس کے بعد تو بندہ کی اللہ قوتِ سماعت بن جاتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ سنتا ہے اور قوتِ دید بن جاتا ہے جس کے ذریعے وہ دیکھتا ہے۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ رسول اللہ کی جان ہے اگر تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لوگے تو اللہ کے بن جاؤ گے۔''

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد سوم (فارسی ادب) کے فاضل مقالہ نگار عبدالحمید یزدانی نے بھی شیخ علاء الدین علی بن احمد معروف بہ ملا علی مہائی کے نام سے شیخ مہائی کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے:

''آپ شیخ احمد نوائت کے فرزند اور اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم و عارف تھے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ مولوی عبدالحئی کے نزدیک ''ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ کے سوا حقائق نگاری میں اُن کا کوئی نظیر نہیں'' بلکہ ان (مولوی عبدالحئی) کے خیال میں شاہ ولی اللہ کی ''حجتہ اللہ البالغہ'' کی بجائے علی مہائی کی ''انعام الملک العلام'' اسرارِ شریعت کے فن میں اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر لکھی، جو دو جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ ''تبصیر الرحمٰن'' کے علاوہ تفسیر رحمانی، اور تفسیر مہائی، کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس میں تمام آیات کے باہمی ربط کو واضح کیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحئی مرحوم کہتے ہیں کہ مہائی کی ایک کتاب فقہ میں اور ایک کتاب سلسلۂ پیرانِ طریقت کے بارے میں بھی تھی۔ نزہتہ الخواطر میں اس کتاب کا نام ''رسالہ در فقہ امام

شافعی'' بتایا گیا ہے اور اس کے علاوہ بھی سات کتابوں کے نام درج کیے گئے ہیں۔''

فاضل مقالہ نگار عبدالمجید یزدانی مزید لکھتے ہیں۔

''شیخ مہائمی وحدت الوجود کے اس شدت سے قائل تھے کہ ایک مرتبہ یمن کا سفر صرف اس غرض سے کیا کہ وہاں ایک فاضل شخص (شیخ اکبر) ابن عربی کا مخالف تھا اور یہ اسے قائل کرنا چاہتے تھے۔ ان کی کرامت سے ہندوؤں کے قبولِ اسلام کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مہائم میں قاضی بھی مقرر ہوئے۔۵۹ برس عمر پائی۔ ان کے عرس میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں۔''

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے مخدوم مہائمی کی تفسیر قرآن کی امتیازی خصوصیات بیان کی ہیں اور اس کی حد درجہ تعریف کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''علی مہائمی کی یہ تفسیر ہندی علمائے اسلام کی بہترین عربی تصانیف میں سے ایک ہے۔'' ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اگر دِل کھول کر یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ علی مہائمی کی یہ تفسیر ہندی علمائے اسلام کی عربی زبان میں بہترین تصنیف ہے تو بھی ان کا کہنا درست ہی ہوتا بلکہ حقیقت کے زیادہ قریب ہوتا۔

محمد غوثی مندوی اپنی تالیف ''گلزارِ ابرار'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''شیخ علی موضع پرو جو مہائم کے اطراف میں گجرات کے زیریں حصہ میں ایک بندرگاہ ہے، کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد کا نام احمد مہائمی ہے۔ شیخ علی دونوں جہانوں کے حقائق و اسرار کے عارف ہیں۔ صوفیہ کی اصطلاحات میں شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ صدرالدین قونوی کے پیرو ہیں اور ان دونوں بزرگانِ دین کی تصنیفات پر آپ نے عمدہ شرحیں لکھی ہیں اور سنجیدہ حواشی لگائے ہیں۔ ''زوارف شرح عوارف'' آپ ہی کی تصنیف ہے۔ تفسیر رحمانی میں آپ نے عبارت ترجمہ کے ساتھ قرآنی ترتیب کو ملایا ہے اور آیات کو تکرار سے علیحدہ کیا ہے۔ یہ پسندیدہ طریقہ آپ کی اختراع ہے۔''

محمد غوثی مندوی لکھتے ہیں:

> ''میں نے ایک رسالہ دیکھا جس میں لکھا تھا کہ شیخ علی مہائمی

فرماتے ہیں کہ 'یمن کے ایک عالم امام جمال الدین نے ایک خط مجھے ارسال کیا۔ جس میں لکھا تھا کہ یمن میں شرف الدین نامی ایک معلم قرآن ہیں جو شیخ محی الدین ابن عربی کے کلام کو سمجھنے کی فہم وفراست تو نہیں رکھتے مگر اپنی اس کم فہمی، نارسائی کے باوجود شیخ اکبر اور ان کے معتقدین کی تکفیر کرتے ہیں۔ مجھے جب اس صورت حال کا علم ہوا تو میں نے مضطرب و بے چین ہوکر یمن جانے کا فیصلہ کیا اور وہاں جا کر قطعی و حتمی دلائل و براہین سے اس معلم قرآن کے اعتراضات کو رَد کر کے اس کے فاسد و باطل عقائد کو درست کیا۔ کیونکہ جماعت صوفیہ جنہوں نے ماسوائے طریقت کو ترک کر کے حقیقت اور شریعت میں تطبیقِ باہم دی ہے اور اپنے تئیں نیست شمار کر کے درمیان میں نہیں لاتے ہیں، ان کی امداد تمام خداشناس علماء پر لازم ہے۔''

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، مخدوم علی مہائمی کی تفسیر قرآن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق ''مہائمی کی تفسیر بے شمار خصوصیات کی حامل ہے۔ ان میں سے چند اہم اور قابل ذکر خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ مہائمی نے اپنی تفسیر میں متاخرین ومتقدمین علمائے تفسیر کی آراء واقوال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے لیکن وہ امام رازی اور زمخشری کے مکتبِ فکر کے علمائے تفسیر کی آراء کو جوں کا توں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

۲۔ قرآن کریم کی سورتوں کے اسماء کے بارے میں علماء کے متعدد اقوال کتبِ تفسیر میں ملتے ہیں۔ جس سے ان سورتوں کے نام متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، اکثر سورِ قرآنی ایک سے زائد ناموں کی حامل ہیں۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ کے بیس سے زائد نام بتائے جاتے ہیں لیکن عموماً مفسرین چند ایک نام کا ذکر کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ مگر مہائمی اس بات میں منفرد نظر آتے ہیں۔ وہ حتیٰ الامکان سورتوں کے تمام ناموں کا ذکر کرتے ہیں۔

۳۔ اسی طرح آیات قرآنی کا باہمی ربط بھی ایک کامل فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ مہائمی

نے اس میدان میں قابل قدر کام کر کے اہل علم سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔''

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کی طرح ڈاکٹر زبید احمد بھی تفسیر مہائمی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' کے باب تفاسیر قرآن میں سب سے پہلے علی بن احمد مہائمی کی تفسیر ''تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان'' کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''یہ جلالین کی مانند ہے مگر اس سے بہت زیادہ جامع اور وسیع تر مضامین میں حاوی ہے۔ اس میں تمام قرآنی قصص، اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور قرآنی آیات کا سبب نزول بھی واضح کیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ ایک آیت سے پہلے اور اس کے بعد جو آیات ہیں ان میں باہمی ربط کی بھی تشریح کی گئی ہے ... اس تصنیف میں دو خصوصیات ایسی ہیں جو مصنف نے بڑی قابلیت کے ساتھ از اول تا آخر برقرار رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر سورۃ کے آغاز میں مختصراً یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سورۃ کا یہ نام کیوں رکھا گیا؟ اور دوسرے یہ کہ ہر سورۃ سے قبل بسم اللہ کی تشریح اس سورۃ کے مضمون کے مطابق کی گئی ہے۔

بسم الله المتجلي باسمائه و صفاته و افعاله في الناس

شروع اللہ کے نام سے جو اپنے نام وصفات اور افعال کے ذریعے لوگوں میں ظہور پذیر ہے۔

الرحمٰن بتكميله بعد اضافة نور الوجود عليه

ایسا رحم واﻻ ہے جو اپنے وجود کا نور ڈال کر اسے مکمل کر دیتا ہے۔

الرحيم بحفظه من شرما فيه و شرما خرج عنه

ایسا مہربان جو اس کے داخلی اور خارجی شر سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔

آخری سورۃ سے قبل کی سورۃ میں بسم اللہ کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

بسم الله المتجلي بكمالاته في النور الفلق

شروع اللہ کے نام سے جو نور فلق میں اپنے کمالات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

الرحمٰن باشاعة ذٰلک النور

ایسا رحم والا جو اس نور کو پھیلا دیتا ہے۔

الرحيم باعاذة من عاذبه من الشرور

ایسا مہربان جو شر سے پناہ مانگنے والوں کو پناہ دیتا ہے۔

بسم اللہ کی تشریح میں لفظ اللہ کے بعد المتجلی بکمالاتہ ضرور لکھا گیا ہے اور اس کے بعد جو عبارت لکھی گئی ہے وہ متعلقہ سورۃ کے مضمون کے مطابق ہے۔ الرحمٰن اور الرحیم دونوں کے بعد ایک فقرہ آتا ہے جو حرف جار با اور اس کے مجرور پر مشتمل ہوتا ہے۔ تبصیر الرحمٰن کے یہ اقتباسات اور بسم اللہ کی تشریح کے بارے میں وضاحت کرنے کے بعد ڈاکٹر زبید احمد ''تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان'' کے اس منفرد و ممتاز انداز تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ '' راقم الحروف کے علم میں کوئی اور ایسی تفسیر نہیں ہے جس میں بسم اللہ کی تشریح کا یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا گیا ہو۔''

صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر دو جلدوں میں قاہرہ سے چھپ چکی ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے لکھا ہے کہ تفسیر رحمانی اور ''الزوارف فی شرح العوارف'' کے علاوہ شیخ علی بن احمد مہائی کی کئی اہم اور قابل ذکر کتابیں ہیں جن میں ''مشرع الخصوص فی شرح الفصوص، استجلاء البصر فی الرد علی استقصاء النظر لابن مطهر الحلی، النور الاظهر فی کشف سر القضاء والقدر، الضوء الازهر فی شرح النور الاظهر، اجلة التائید فی شرح ادلة توحید، شرح الفصوص للقونوی، خصوص النعم فی شرح فصوص الحکم، تجلیات الفصوص، انعام الملک العلام باحکام حکم الاحکام جو اسرارِ فقہ اور محاسن شریعت پر ایک لاجواب کتاب ہے۔ اراءۃ الدقائق فی شرح مراۃ الحقائق اور رسالہ فی الفقه الشافعی۔''

مولانا آزاد بلگرامی نے ان کے ایک عجیب و غریب اور نادر رسالے کا تذکرہ کیا ہے جس میں الم٥ ذلک الکتاب لا ریب فیه ط هدی اللمتقین کی وجوہِ اعراب سے بحث کی ہے۔

شیخ محمد غوثی شطاری مندوی نے شیخ علی بن احمد مہائی کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ''وہ ہر دو عالم کے حقائق واسرار کے عارف تھے۔''

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں ''مخدوم علی مہائی ہندوستان کے سب سے بڑے علماء کے ساتھ جگہ پانے کے مستحق ہیں۔''

یگانۂ روزگار عالمِ دین اور بے مثال مفسرِ قرآن شیخ علی بن احمد مہائی نے ۸۲۵ھ میں وفات پائی۔ ''سخن فہم'' آپ کی تاریخ وفات ہے۔ مزار مہائم، بمبئی میں زیارت گاہِ عام ہے۔

خواجہ محمد گیسو دراز

حضرت خواجہ محمد گیسو دراز برصغیر پاکستان و ہند کے اکابر علماء و مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت کے باب میں شان دار اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ تصوف و طریقت کی تعلیم و تدریس اور تبلیغ اسلام کے ساتھ ایک سو سے زاید کتابیں تصنیف کیں۔ مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے حضرت خواجہ کے علم و فضل کو تسلیم کیا ہے اور سبھی ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔

مولانا عبدالحئ حسنی ''نزہتہ الخواطر'' میں خواجہ محمد گیسو دراز کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آپ ایک بہت بڑے عالم، صوفی و عارف، قوی النفس، عظیم الہیبت اور جلیل الوقار تھے۔ شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ بڑے متقی پرہیزگار، زاہد اور حقائق و معارف کے سمندروں میں غوطہ زنی کرنے والے تھے۔ فقہ، تصوف، تفسیر اور دیگر علوم میں آپ نے اہم کام کیا۔''

مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ ''سید محمد گیسو دراز سیادت، علم اور ولایت کے جامع تھے، نیز شان رفیع، استوار طبیعت اور عالی کلام کے مالک تھے۔''

سید محمد گیسو دراز ۷۲۱ھ میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی وفات سے چار سال پیشتر بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ابھی چار سال کے تھے کہ والدین کے ہمراہ دولت آباد چلے گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے والد اور دادا سے علوم متداولہ کی تحصیل کا آغاز کیا اور

پھر سولہ سال کی عمر میں اپنی والدہ اور ایک بھائی حسین بن یوسف کے ہمراہ دہلی میں وارد ہوئے جہاں اُس زمانے میں حضرت خواجہ سلطان المشائخ کے خلیفہ اعظم حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کا ہنگامۂ مشیخت گرم تھا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن حضرت چراغ دہلی نے ان کی ذہانت و فطانت اور حسن گفتار کی تعریف کے ساتھ باطنی علوم سے قبل ظاہری علوم کی تکمیل کا مشورہ دیا۔ چنانچہ خواجہ محمد گیسو دراز نے اُس زمانے کے معروف و ممتاز اساتذہ و علماء جن میں مولانا سید شرف الدین کیتھلی، مولانا تاج الدین المقدم اور فقیہ دوراں علامہ قاضی عبدالمقتدر الکندی خاص طور قابل ذکر ہیں، کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کر کے ظاہری علوم کی تکمیل کی۔ اوّل الذکر دو اساتذہ سے درسی کتب کی تعلیم حاصل کی اور مؤخرالذکر فقیہ اور عالم قاضی عبدالمقتدر کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر خواجہ گیسو دراز نے اُن سے ''الشمسیہ''، ''الصحائف''، ''مفتاح العلوم''، ''ہدایہ''، ''اصول بزدوی'' اور ''تفسیر الکشاف'' ایسی اہم کتابوں کی تکمیل کی اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ میں بھی کامل ہو گئے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' دوسری جلد (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر احسان الٰہی رانا نے مستند و معتبر کتب تاریخ و تذکرہ کے حوالوں سے حضرت خواجہ گیسو دراز کے احوال و آثار بیان کیے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''برصغیر پاک و ہند میں اشاعت اسلام اور روحانی ہدایت کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور اسلامی علم کی شان دار خدمات انجام دینے والے متشرع صوفیوں میں سید محمد بن یوسف بن علی بن محمد بن یوسف بن حسین بن محمد بن علی بن حمزہ بن داؤد بن ابی الحسن زید الجندی ابوالفتح صدرالدین دہلوی ثم گلبرگوی عرف سید بندہ نواز گیسو دراز کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا... تصوف اور تبلیغ کے ساتھ ایک سو پچیس سے زاید کتابیں تصنیف کرنا یقیناً ایک غیر معمولی کارنامہ ہے اور خصوصاً اس دور میں جب صوفیہ کرام کے لیے اوراد و وظائف اور غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کے علاوہ کسی کام کے لیے وقت نکالنا ایک مشکل کام تھا۔''

علوم کی تکمیل کے بعد خواجہ محمد گیسو دراز حضرت چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور اپنے تبحر علمی اور زہد و تقویٰ کی بدولت جلد ہی اُن کے مقرب بن گئے۔ حضرت نصیرالدین چراغ دہلی نے ۷۵۷ھ میں وفات پائی۔ اس سے تین روز پہلے خواجہ گیسو دراز کو خلافت عطا کی۔ بعدازاں حضرت خواجہ گیسو دراز ایک عرصے تک دہلی میں مقیم رہے اور ۸۰۱ھ میں اسی برس کی عمر میں دہلی سے دکن کی طرف روانہ ہوئے۔

''ہندوستان میں مسلم ثقافت'' کے مؤلف نے ''خواجہ گیسو دراز دکن میں'' کے زیرعنوان لکھا ہے:

'پروفیسر آرنلڈ کی کتاب ''دعوت اسلام'' (**The Preaching of Islam**) کے مطابق 'دکن میں اگرچہ ۷۰۴ھ میں خواجہ گیسو دراز کی ولادت سے کم و بیش پندرہ سال پہلے ایک عرب مبلغ کے ورود کا سراغ ملتا ہے جس نے پیر مہابیر کندایت کا نام اختیار کر کے تبلیغ اسلام شروع کی تھی لیکن حقیقت میں سب سے زیادہ نام وَر اور کامیاب مبلغ سید گیسو دراز ہی تھے۔ مغربی ساحل کے علاقہ کونکن میں شیخ بابا عجب، سید ہاشم گجراتی، شاہ محمد صادق، سرمست حسینی اور متعدد دیگر مبلغین اسلام نے کام کیا جن کے مزارات اب تک قصبہ دھانو، ناسک، دھاروار میں موجود ہیں۔ بلگام، ستارا، احمد نگر، کے اضلاع میں بھی بعض بزرگ دعوت و تبلیغ میں مصروف رہے۔ جنوبی ہند، دکن اور ساحلی علاقوں میں اسلام کی بے حد مقبولیت حاصل ہوئی لیکن افسوس ہے کہ سلاطین نے اس زرخیز زمین کی طرف توجہ نہ کی جس کی تخم ریزی تو قدسی نفس بزرگوں نے کر دی تھی لیکن اس کے بعد آبیاری کی ضرورت تھی۔ ان علاقوں میں کروڑوں اچھوت آباد تھے جو قبول اسلام کے بعد صدیوں کی ذلت سے نجات پا جاتے تھے اور تہذیب و تمدن کے راستے پر بے تکلف گامزن ہو کر ترقی کی منزلیں طے کرتے تھے۔ اسلام ان کو ذات پات کے بندھنوں سے نجات دلا کر بڑے سے بڑے مسلمان کا بھائی بنا دیتا تھا اور انہیں مساوی مواقع عطا کرتا تھا۔ مسلمان ہو کر وہ شرک و بدعت، اوہام و جہالت، افلاس و

غلاظت اور افسردہ طبعی سے آزادی حاصل کر لیتے اور حکم رانوں کے ہم مذہب بن کر عزت آبرو کی زندگی بسر کرتے۔''

خواجہ محمد گیسو دراز کے تذکرہ نگار ڈاکٹر احسان الٰہی رانا نے لکھا ہے کہ ''۸۰۱ھ میں حملۂ تیمور کے باعث آپ دہلی سے دکن روانہ ہو گئے۔ گوالیار، چندیری، بڑودہ اور کھنبائت ہوتے ہوئے گجرات آئے اور پھر دولت آباد کے راستے گلبرگہ تشریف لے گئے جہاں بادشاہ فیروز شاہ بہمنی نے آپ کا استقبال کیا اور آپ وہیں مقیم ہو گئے۔ اس کے بعد آپ گلبرگہ میں ہی مقیم رہے اور اشاعت اسلام، روحانی تلقین و ارشاد اور زہد عبادت کے ساتھ ساتھ آپ تصنیف میں بھی مشغول رہے۔ آپ نے غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کرنے کے تمام عمدہ طریقے اختیار کیے۔ انہیں حکمت و تدبیر کے ساتھ دعوت اسلام دی اور پھر احسن طریق سے ان کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ بھی کیا۔''

''جوامع الکلم'' حضرت خواجہ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس میں نو مہینوں یعنی ۱۵ مارچ ۱۴۰۰ء سے لے کر ۱۰ دسمبر ۱۴۰۰ء کے ملفوظات آپ کے بڑے بیٹے سید حسین معروف بہ سید محمد اکبر حسینی نے جمع کیے تھے، شائع ہو چکا ہے، جس کے بارے میں شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ اس میں فاضل مرتب مولانا محمد صدیقی کی تصحیح و تحشیہ کے باوجود غلط کتابت یا مسوّدوں کی دُشواریوں سے بعض ایسی الجھنیں رہ گئی ہیں جن سے کئی اہم مقامات پر مطلب خبط ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی کام کی کئی باتیں ہیں۔ ایک طویل اندراج سے اُس دلچسپی کا پتا چلتا ہے جو حضرت گیسو دراز کو اشاعت اسلام سے تھی اور دُشواریوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے جن سے ہندوؤں کے مضبوط معاشرتی نظام کی وجہ سے مبلغین اسلام کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ایک ملفوظ میں ہندوؤں اور برہمنوں کی نسبت فرماتے ہیں:

''کئی مرتبہ اُن کے علماء اور درویش (یعنی پنڈت اور یوگی) میرے پاس دعویٰ اور بحث کے لیے آئے۔ طے یہ پایا کہ جو بحث میں کامیاب ہو دوسرا اُس کی بات مان لے اور اُس کی متابعت کرے۔ چنانچہ اس بات پر قول و اقرار ہو گیا۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ اپنی بات شروع کریں۔ انہوں نے کہا نہیں تم کہو۔ میں نے ان کی سنسکرت کی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں اور اُن کی روایات کو جانتا تھا۔ چنانچہ میں نے اُن سے شروع سے لے کر آخر تک

باتیں کیں اور انہوں نے ان سب باتوں کو دل وجان سے قبول کیا اور کہا کہ واقعی جو تم کہتے ہو ٹھیک ہے۔ پھر میں نے اپنے مذہب کا بیان شروع کیا اور دونوں کا موازنہ کر کے اپنے مذہب کو ترجیح دی۔ اس پر وہ حیران رہ گئے۔ شوروغوغا کرنے لگے۔ جس طرح بتوں کے سامنے ڈنڈوت کرتے ہیں اسی طرح میرے سامنے اظہار عقیدت کیا۔ میں نے کہا یہ سب بے کار ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان معاہدہ یہ ہے کہ جس کی بات سچی ہو دوسرا اُس کی پیروی کرے اور اُس کے راستے پر چلے۔ لیکن کوئی کہنے لگا میری بیوی بچے اور خاندان کے لوگ ہیں اُن کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ کسی نے کہا کیا کروں؟ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ ہمارے بزرگ اس راستے پر چلے تھے جو اُن کے لیے ٹھیک تھا ہمارے لیے ٹھیک ہے۔''

غرض یہ کہ جب بھی کسی پنڈت یا یوگی سے مباحثہ یا مناظرہ کرنے لگتے تو یہ طے پاتا کہ جو ہار گیا وہ جیتنے والے کا مذہب اختیار کر لے گا۔ فتح وکامیابی ہمیشہ آپ کے حصے میں آتی اور ہندو پنڈت یا حلقہ بگوش اسلام ہوئے یا بعض وعدہ خلافی کر کے روپوش ہو گئے۔ حضرت گیسو دراز کا جس طرح تصوف وعرفان کی منزل میں اونچا درجہ ہے اسی طرح علم وفضل اور تصنیف کی تاریخ میں ان کا نام روشن ہے۔ آپ سے پہلے بزرگان چشت میں بڑے بڑے عالم اور بزرگ ہوئے تھے۔ مثلاً حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات پڑھیں تو اُن کی وسعتِ معلومات، کشادہ مشربی اور علم وفضل کا اندازہ ہوتا ہے ــــ حضرت چراغ دہلی تو علم اور اہل علم کے خاص طور پر قدردان تھے لیکن افسوس کہ ان بزرگوں نے تصنیف وتالیف کی منزل میں قدم نہ رکھا اور اسلامی ہندوستان کی مذہبی زندگی کا یہ ایک افسوس ناک پہلو ہے کہ جن ہستیوں نے ہماری ابتدائی مذہبی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا مثلاً حضرت خواجہ اجمیری، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، بابا فرید، حضرت سلطان المشائخ، حضرت مخدوم جہانیاں، حضرت چراغ دہلی، انہوں نے اپنے خیالات تفصیل اور وضاحت سے صفحۂ کاغذ پر ضبط نہ کیے۔ حضرت گیسو دراز کے زمانے میں یہ حجاب کسی قدر دُور ہو رہا تھا۔ چنانچہ نور قطب عالم اور میر سید علی ہمدانی کے بعض رسالے ملتے ہیں اور ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر حضرت مخدوم علی مہائمی کی تصانیف کا

سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن شمالی ہندوستان کے مقبول سلسلوں (چشتیہ اور سہروردیہ) کے مشہور بزرگوں میں سب سے پہلے جس ہستی نے تصنیف و تالیف کی طرف پوری توجہ کی وہ حضرت سید گیسو دراز تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد آپ کی عمر کے سنین کے مطابق ایک سو پانچ بتائی جاتی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ ''سیر محمدی'' میں اکتیس کتابوں کے نام گنائے گئے ہیں جو زیادہ تر تصوف میں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ علوم اسلامی کا کوئی شعبہ نظر انداز نہیں ہوا۔ آپ نے ایک تفسیر کلام مجید کی لکھی، سلوک کے رنگ میں ''کشاف'' کے طرز پر ایک اور تفسیر شروع کی تھی لیکن پانچ سیپاروں سے آگے نہ جا سکی۔ ''کشاف'' پر آپ نے حواشی بھی لکھے۔ ان کے علاوہ حضرت خواجہ کی تصنیفات میں ''شرح فصوص الحکم''، ''شرح آداب المریدین'' اور ''اسماء الاسرار'' قابل ذکر ہیں۔

حضرت سید گیسو دراز نے ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں وفات پائی اور آپ گلبرگہ میں دفن ہوئے جہاں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے اور اس شہر کی شہرت کا سبب بھی ہے۔

شہاب الدین دولت آبادی

قاضی شیخ شہاب الدین حنفی دولت آبادی کا شمار برعظیم پاکستان و ہند کے نامور علماء وفقہاء میں ہوتا ہے ان کی قوم شیخ، لقب، ملک العلماء اور آبائی وطن غزنی تھا۔ جامع العلوم تھے۔ تاریخ وتذکرہ کی کتب معتمدہ میں قاضی شہاب الدین کا تعارف شان دار الفاظ میں کرایا گیا ہے اور ان کے اعلیٰ علمی مرتبہ و مقام کے علاوہ ان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت اور بے نظیر جرأت و بے باکی کی بھی خوب داد دی گئی ہے۔ چنانچہ ''حدائق الحنفیہ'' میں مولوی فقیر محمد نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا لقب ملک العلماء تھا۔ وہ فقیہ، مفسر، نحوی، لغوی، ادیب، بیانی، وحید العصر، فرید الدہر اور صاحب تصانیف عالیہ تھے۔''

مورخ فرشتہ ان کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''قاضی شیخ شہاب الدین سلطان ابراہیم کے عہد کے علماء وفضلاء میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ قاضی صاحب کا آبائی وطن تو غزنی تھا لیکن ان کی پرورش دولت آباد دکن میں ہوئی۔ ابراہیم شرقی قاضی صاحب کے علم وفضل کا بڑا قدردان تھا اور ان کا بہت خیال کرتا تھا۔ قاضی صاحب کی توقیر وتعظیم کا یہ عالم تھا کہ شاہی مجلسوں میں انہیں چاندی کی کرسی پر بٹھایا جاتا تھا۔ ایک بار قاضی صاحب سخت بیمار ہوئے تو ابراہیم شرقی ان کی بیمار پرسی کے لئے گیا۔ کافی دیر قاضی صاحب کا دل بہلاتا رہا پھر سلطان نے ایک پیالہ پانی کا طلب کیا۔ جب پانی کا پیالہ آیا تو سلطان ابراہیم شرقی نے اس کو قاضی صاحب کے سر پر سے تصدق کرکے پانی خود پی لیا اور کہا 'اے خدا! جو مصیبت قاضی صاحب کے

سر پڑی ہوئی ہے اس سے ان کو نجات دے اور ان کی جگہ وہ مصیبت مجھ پر ڈال دے تا کہ قاضی صاحب صحت یاب ہو جائیں۔" اس واقعہ سے سلطان ابراہیم شرقی کے مزاج و کردار کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علمائے دین کا کس درجہ عقیدت مند تھا۔"

قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے اپنے زمانے کے معروف وممتاز اساتذہ و شیوخ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ "حدائق الحنفیہ" اور "تاریخ شیراز ہند جونپور" کے مطابق انہوں نے دولت آباد میں پرورش پائی اور تحصل علوم دہلی میں علامہ زماں قاضی عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی دہلوی سے کی۔ قاضی شہاب الدین کو خدائے بزرگ و برتر نے بے پناہ ذہنی وفکری صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ انتہائی ذہین و زیرک ہونے کے علاوہ مضبوط قوت حافظہ کے بھی مالک تھے۔ جو کچھ پڑھتے تھے انہیں از بر ہو جاتا تھا اور ہر وقت طلب علم کی جستجو میں رہتے تھے۔ اسی بناء پر ان کے استاد قاضی عبدالمقتدر ان کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

"ہمارے پاس ایک طالب علم آیا ہے جس کا پوست علم، لحم علم اور مغز علم ہے۔"

قاضی شہاب الدین نے اپنی ذہانت و فطانت اور محنت و کوشش کی بدولت چند ہی برسوں میں جملہ علوم نقلی و عقلی میں مہارت تامہ حاصل کر لی اور ان کا شمار اجل علمائے وقت اور افضل فضلائے زمانہ میں ہونے لگا۔ اور ان کے علم و فضل کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اسی زمانے میں سلطان ابراہیم شرقی علماء فضلاء سے اکتساب فیض کرنے اور ملک کی تعمیر و ترقی کے ساتھ ساتھ رعایا کی خوش حالی کے لئے مختلف تدابیر و اقدامات کر رہا تھا۔ وہ ایک رعایا پرور، علم دوست اور علماء کا قدردان حکمران تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے ارباب علم و دانش جونپور میں جمع ہو گئے تھے۔ قاضی شہاب الدین اپنے استاد مولانا خواجگی دہلوی کے ساتھ کالپی میں وارد ہوئے تو ابراہیم شرقی نے انہیں جونپور آنے کی دعوت دی۔ شیخ شہاب الدین جونپور پہنچے تو سلطان نے ان کی بہت تعظیم و تکریم کی، انہیں دربار میں چاندی کی کرسی پر بٹھایا اور قاضی القضاۃ کے عہدۂ جلیلہ پر مامور کیا۔

مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ قاضی شہاب الدین جونپوری نے اپنے فرائض منصبی حسن و خوبی سے انجام دیئے اور بحیثیت قاضی انہیں جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔ "حاشیہ ہندی،" "مصباح

متن ارشاد،'' ''بدیع البیان،'' ''فتاویٰ ابراہیم شاہی،'' ''تفسیر فارسی معروف بہ بحرالمواج،'' ''رسالہ مناقب سادات'' اور ''رسالہ شہابیہ'' وغیرہ وغیرہ۔

تاریخ شیراز ہند جونپور میں مرقوم ہے:

''قاضی القضاۃ شیخ شہاب الدین کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ حالانکہ اس زمانہ میں ہندوستان میں اہل علم وفضل کی کوئی کمی نہ تھی لیکن پروردگار عالم نے جو شہرت ومقبولیت قاضی شہاب الدینؒ کو عطا فرمائی وہ دوسروں کو حاصل نہ ہوسکی۔''

سلطان ابراہیم شرقی کے عہد کے جونپور اور قاضی شہاب الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے ''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' کے مؤلف مولانا عبدالمجید سالک نے لکھا ہے:

''چودھویں صدی میں تیمور کی مار دھاڑ سے محفوظ رہنے کی غرض سے اکثر اہل کمال مرکز سے صوبوں کی طرف منتقل ہوگئے تھے۔ چنانچہ ابراہیم شرقی کے عہد میں جونپور کو علمی اعتبار سے بڑا فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ شاہجہان نے اس شہر کو ''شیراز ہند'' کا لقب دیا۔ ابراہیم شرقی کے دربار میں ایک بہت بڑے عالم قاضی القضاۃ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی موجود تھے جو فقیہ اور معلم کی حیثیت سے مشہور ہیں، ملک العلماء نے فارسی میں تفسیر قرآن لکھی جس کا نام 'بحر مواج' ہے۔ 'فتاویٰ ابراہیم شاہی' کے نام سے فقہ کی کتاب بھی مرتب کی اور بہت سی کتابیں بھی لکھیں۔''

صاحب نزہۃ الخواطر نے تاریخ فرشتہ کے حوالے سے سلطان ابراہیم شرقی جونپوری کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سلطان عادل وکریم، ابراہیم پسر خواجہ جہاں جونپوری سلطان الشرق نے اپنے بھائی مبارک شاہ کے بعد ۸۰۴ھ میں امور سلطنت کا آغاز عدل واحسان سے کیا۔ اقتدار سنبھالتے ہی حسن سیرت کا مظاہرہ کیا۔ وہ جملہ خصائل حسنہ کا مرقع تھا۔ اہل کمال ہر طرف سے کھنچ کر اس کے پاس آگئے۔ ازاں جملہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی، قاضی نظام الدین گیلانی، شیخ ابوالفتح بن عبدالحئی، ابن عبدالمقتدر شریحی کندی اور ان کے ہم مرتبہ اکثر اہل علم۔''

اس طرح سلطان ابراہیم شرقی کے دور حکومت میں جونپور کو علمی لحاظ سے بہت اہمیت حاصل ہوگئی اور یہ دہلی کے بعد اسلامی علوم وفنون کا دوسرا بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ مغل فرمانروا شاہجہان نے اس شہر کو ''شیراز ہند'' کا لقب دیا۔ ''تاریخ شیراز ہند جونپور'' کے نام سے مستقل اہمیت کی حامل ایک ضخیم کتاب تالیف کی گئی جس میں جونپور کے سینکڑوں نامور علماء وفضلاء، حکماء، اطباء، امراء، وزراء، عرفا اور مشائخ کے حالات زندگی کے علاوہ وہاں کی بے شمار تاریخی عمارتوں، اہم مقامات، مقابر ومزارات کے احوال وآثار قلمبند کئے گئے ہیں۔

قاضی شہاب الدین کا تذکرہ ''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' کے مولف مولانا عبدالمجید سالک نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ ابراہیم شرقی کے دربار میں ایک بہت بڑے عالم قاضی القضاۃ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی موجود تھے۔ مولانا موصوف نے قاضی صاحب کی جرات حق کا ایک اہم واقعہ بھی بیان کیا ہے جس کی تفصیل یوں ہے کہ سلطان بہلول لودھی نے جونپور کو فتح کیا تو اس کا بیٹا سکندر لودھی مشرقی اضلاع کا گورنر بنا۔ اسے اطلاع ملی کہ کوروکھشیتر کے میدان میں بہت سے ہندو جمع ہیں اور تالاب میں اشنان اور مندر میں پوجا کرنے کے علاوہ ہنگامہ آرائی بھی کر رہے ہیں۔ سکندر لودھی نے حکم دیا کہ مندر کو منہدم اور ہندوؤں کو قتل کر دیا جائے جس پر قاضی شہاب الدین نے فتویٰ صادر کیا:

> ''ہندو ذمی ہیں۔ ذمیوں کی قدیم عبادت گاہ کو گرانا احکام شریعت کے خلاف امر ہے اور اشنان اور پوجا ان کی عبادت میں شامل دیرینہ رسم ہے اس لئے ان کو بند کرنا بھی شرعاً ناجائز ہے۔''

اس فتویٰ پر سلطان لودھی بہت برافروختہ اور غضب ناک ہوا اور قاضی صاحب سے کہنے لگا کہ تم بھی کافروں کے ساتھی ہو۔ اس لئے سب سے پہلے تمہی کو قتل کروں گا۔ قاضی صاحب نے ترکی بہ ترکی مردانہ وار جواب دیا:

> ''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے اور جب کوئی شخص کسی ظالم کا سامنا کرتا ہے تو اسے زندگی کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ تم نے مجھ سے فتویٰ پوچھا۔ میں نے احکام شریعت کے مطابق جواب دے دیا۔ اگر تم کو اس پر عمل نہ کرنا تھا تو مجھ سے فتویٰ دریافت کرنے کی

کیا ضرورت تھی؟''

قاضی صاحب کے اس جرأت مندانہ جواب پر سکندر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اس طرح ایک عالم حق نے حاکم شہر سے احکام شریعت پر عمل کرا کے چھوڑا۔

قاضی صاحب بلند پایہ خوشنویس بھی تھے اور ہفت قلم کہلاتے تھے۔ اسلامی علوم و فنون کا درس دینے کے علاوہ شاگردوں اور علماء وفضلاء کو خوشنویسی بھی سکھایا کرتے تھے۔ چنانچہ شاہی طبیب سید ابراہیم مستند حکیم ہونے کے علاوہ خوش نویسی سے گہرا شغف رکھتے تھے اور قاضی صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ قاضی صاحب ایک قادر الکلام اور شیریں بیان شاعر بھی تھے اور صاحب دیوان تھے۔

قاضی صاحب کثیر التصانیف بزرگ تھے ان کی تصنیفات میں سے ایک ''شرح کافیہ'' ہے جو لطافت و متانت میں بے بدل اور ان کی زندگی ہی میں مشہور عالم ہو گئی تھی۔ دوسری کتاب ''ارشاد'' جو نحو میں لطیف و بے نظیر ہے۔ تیسری کتاب ''بدیع البیان'' جو علم بلاغت میں لاثانی ہے۔ چوتھی تفسیر قرآن ''بحر مواج'' ہے، پانچویں ''شرح اصول بزدوی تا بحث امر،'' چھٹی ایک رسالہ ''تقسیم علوم'' میں، ساتویں ایک رسالہ ''تقسیم صنائع'' میں، آٹھویں ایک رسالہ ''مناقب سادات،'' نویں قصیدہ ''بانت سعاد،'' علاوہ ازیں انہوں نے متعدد کتب و رسائل تصنیف کیے۔

قاضی شہاب الدین کی ''الارشاد'' یا ''ارشاد النحو'' ایک نصابی کتاب ہے اور بعض علماء کے نزدیک یہ ابن حاجب کی مشہور تصنیف ''کافیہ'' پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں ''ارشاد النحو'' کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس میں ایک اور خصوصیت بھی پائی جاتی ہے جو نحو کی دوسری کتابوں میں نہیں ہے اور جس کی تشریح خود مصنف نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے اس کے احکام کی تعبیر میں نظیریں لانے کی توفیق ہوئی جس میں ہر حکم کے لیے ایک مثال دی ہے جو اس عبارت یا گزشتہ عبارت پر بالکل منطبق ہو جاتی ہے۔''

یہ کتاب لکھتے ہوئے اس عجیب خصوصیت کو شروع سے آخر تک برقرار رکھنا کوئی آسان

کام نہیں ہے لیکن ''الارشاد'' کے مصنف ان دشوار قیود پر بہت کامیابی سے غالب آ گئے جو انہوں نے اپنی علمیت کے اظہار کے لیے از خود عاید کر لیے تھے۔''

قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ابن حاجب کی ''کافیہ'' کی ایک شرح بھی لکھی جو ''شرح الہندی'' کے نام سے مشہور ہے۔ حاجی خلیفہ کے بیان کے مطابق اس شرح کی بھی چار شرحیں لکھی گئیں۔ بہرحال ''شرح الہندی'' ''کافیہ'' کی ایک اہم ترین شرح ہے۔ دو مشہور شرحیں مولانا رضی الدین اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کی لکھی ہوئی ہیں۔

قاضی شہاب الدین کی تصنیفات میں ''مصدق الفضل'' بھی ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ مشہور و معروف قصیدہ بانت سعاد کی بہت ضخیم شرح ہے۔

قاضی صاحب کو تصوف و طریقت سے گہرا لگاؤ تھا صوفیہ کرام کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی سے اُن کی ملاقاتوں کا ذکر کتب تاریخ میں ملتا ہے۔

قاضی القضاۃ ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی ثم جونپوری نے ۸۴۸ھ میں وفات پائی اور جونپور میں مدفون ہوئے۔ ''صدر نشین انجمن'' تاریخ وفات ہے۔

سماءالدین سہروردی

شیخ سماء الدین سہروردی فقیہہ فاضل، عالم تبحر اور جامع علوم و معارف شریعت و طریقت تھے۔ ان کا پورا نام و نسب یوں ہے:
شیخ سماء الدین بن فخر الدین جمال الدین ملتانی دہلوی۔
شیخ سماء الدین سہروردی ۸۰۸ھ میں بزرگانِ دین کے مولد و مسکن ملتان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے نہایت کم سنی میں تحصیل علم کی طرف توجہ دی۔ چونکہ انتہائی ذہین و زیرک اور صاحبِ فہم و فراست تھے۔ اس لئے بہت جلد ضروری کتابیں پڑھ کر ابتدائی تعلیم مکمل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کی طرف توجہ دی۔ وہ نہایت متقی و پرہیزگار متوکل اور صاحبِ عزیمت و ایثار بزرگ تھے۔ انہوں نے برصغیر کے مختلف شہروں اور اہم مقامات کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت کا فریضہ کمال حسن و خوبی سے ادا کیا۔
شیخ سماء الدین کے علم و فضل، صدق و صفا اور زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے علماء، امراء اور سلاطین ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے اور ان کے پند و نصائح پر عمل کیا کرتے تھے۔ مولانا سماء الدین کی ایک امتیازی خصوصیت غیر معمولی جود و سخا تھی۔ ہزاروں روپے کے نذرانے آتے جو کھڑے کھڑے غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے اور اپنے لئے کچھ بھی نہ رکھتے تھے۔ مولانا سماء الدین حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔ ان کا شمار سلسلۂ عالیہ سہروردیہ کے اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔
کتب تاریخ و تذکرہ میں مولانا سماء الدین کے حالاتِ زندگی کے علاوہ ان کے

اقوال وملفوظات اور بعض تصانیف کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سماء الدین علم حدیث، فقہ، منطق اور علم الکلام کے علاوہ شعر و ادب میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اور تبحر علمی اور وسعت معلومات کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔

مولوی فقیر محمد ''حدائق الحنفیہ'' میں لکھتے ہیں کہ مولانا سماء الدین جامع علوم عقلیہ و نقلیہ، واقف فنون رسمیہ و ظاہریہ، صاحب تقویٰ و ورع اور اپنی قناعت شعاری کے لئے مشہور تھے۔

منشی عبدالرحمن مؤلف ''آئینہ ملتان'' کی تحقیق کے مطابق مولانا عبداللہ تلنبی اور ان کے بھائی مولانا عزیز اللہ ماہرین علوم عقلیہ اور علامہ شریف جرجانی ماہر منطق و فلسفہ مولانا سماء الدین ملتانی کے شاگرد تھے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کی تیسری جلد مشتمل بہ فارسی ادب کے فاضل مقالہ نگار عبدالمجید یزدانی مولانا سماء الدین کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ''آپ علوم رسمی وحقیقی کے جامع، صاحب تقویٰ و ورع اور اسباب دنیا سے صرف ضروری چیزوں پر قانع تھے۔ مولانا ثناء الدین کے شاگرد اور شیخ کبیرؒ کے مرید تھے۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی ''اخبار الاخیار'' میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا سماء الدین ظاہری اور معنوی علوم کے ماہر تھے۔ متقی اور پرہیزگار تھے۔ دنیا کی قطعاً خواہش نہ رکھتے تھے۔ صرف ضروریات کی حد تک دُنیا کی چیزوں کو استعمال کرتے تھے، آپ مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاریؒ کے پوتے شیخ کبیر کے مرید تھے۔''

مولانا سماء الدین ملتان میں مقیم تھے جو برصغیر میں سلسلہ عالیہ سہروردیہ کا سب سے بڑا اور اہم مرکز تھا۔ لیکن وہاں کے حالات خراب ہو جانے کے باعث وہاں سے نکل کھڑے ہوئے پہلے کچھ عرصہ رنتھمبور اور بیانہ وغیرہ میں قیام کیا پھر دہلی جا کر سکونت اختیار کی۔

''سیر العارفین'' چشتی اور سہروردی علماء و مشائخ کا اولین تذکرہ ہے۔ جس میں مولانا سماء الدین کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ مولانا حامد بن فضل اللہ

جمالی نے لکھا ہے جو اردو میں منتقل ہو کر چھپ چکا ہے۔ پیر حسام الدین راشدی نے اس تذکرہ پر ایک سو سے زائد صفحات پر مشتمل ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے۔ چنانچہ راشدی صاحب مولانا جمالی کے احوال و آثار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''شیخ سماء الدین کنبوہ ملتان کے رہنے والے تھے، بعد میں ترک وطن کر کے دہلی میں آ کر مقیم ہوئے اور ایک عرصے تک رنتھمبور میں بھی ان کا قیام رہا۔ اپنے دور کے جید عالم اور برگزیدہ شیخ طریقت تھے۔ جمالی نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی خدمت میں مدارج عرفانی اور علوم روحانی طے کر کے اعلیٰ مقامات پر فائز ہوئے۔ جمالی نے فقط روحانی، اور باطنی علوم اپنے مرشد سے حاصل نہیں کئے بلکہ ان کی مجلس اور صحبت میں رہ کر ظاہری علوم کا بھی استفادہ کرتے رہے۔''

مولانا سماء الدین سہروردی مولانا جمالی کے استاد اور مرشدِ طریقت ہی نہیں تھے بلکہ وہ ان کے خالو اور سسر بھی تھے۔ چنانچہ مولانا جمالی نے ان کا تعارف ان شاندار الفاظ میں کرایا ہے:

> ''قطب الملت شیخ سماء الملت والدین اگرچہ مشائخ کبار میں آخری تھے لیکن علوم ظاہر و باطن کے اعتبار سے ان کے اطوار میں جنیدؒ اور بایزیدؒ کے آثار نمایاں تھے اور جذب خواطر میں بہت تصرف رکھتے تھے۔ جس بیمار پر نظر مبارک ڈال دیتے تھے اس کا سینہ امراضِ باطن سے پوری طرح صحت یاب ہو جاتا تھا۔ ان کی نظر شفقت امیر و غریب اور اپنے پرائے پر یکساں تھی وہ اولاد اور غیر میں کوئی فرق نہیں رکھتے تھے۔ فاسق کو امر معروف کے اظہار کے بغیر نہایت شیریں الفاظ سے فسق و فساد کے راستے سے ہٹا کر نیکی اور اعتقاد کی بلندی پر لے آتے تھے۔

مولانا عبدالحئی حسنی ''نزہۃ الخواطر'' جلد چہارم میں لکھتے ہیں:

> ''الشیخ الفاضل العلامۃ'' سماء الدین بن فخر الدین بن جمال الدین ملتانی دہلوی مشہور علماء میں سے ہیں۔ مولانا ثناء الدین ملتانی کے شاگرد تھے اور شیخ کبیر الدین حسینی بخاری سے بیعت کی۔ حتیٰ کہ مسندِ تدریس و افادہ پر فائز ہوئے۔ برسوں ملتان میں وعظ و درس

دیتے رہے۔ پھر رتھمبور میں آکر برسوں قیام فرمایا۔ وہاں سے بیانہ آئے مگر کچھ عرصہ بعد بیانہ سے دہلی تشریف لے گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی... شیخ سماءالدین نہایت باوقار اور رعب دار بزرگ تھے۔ زہد و ورع اور استقامت دین سے متمتع اور دنیا سے بے نیاز تھے۔ زیادہ تر توجہ تدریس و افادہ پر تھی۔ لوگوں کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دینا ان کا معمول تھا۔"

مولانا سماءالدین سہروردی احکام شریعت کی سختی سے پابندی کرتے تھے ان کی اس خصوصیت کا اندازہ مولانا جمالی کی اس تحریر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ مولانا جمالی نے لکھا ہے کہ ایک ابتدائی زمانے میں ایک دفعہ میرے دل میں خیال آیا کہ فی الحال ظاہری علم کی تحصیل کو چھوڑ کر مکمل یکسوئی کے ساتھ صفائی قلب میں مشغول ہو جاؤں۔ جیسے ہی یہ بات میرے دل میں آئی حضرت کو کشف ہوا۔ فرمایا کہ علم ظاہری کو ترک نہیں کرنا چاہیے کہ اس پر تو شرح کی بنیاد اور دین کی اساس قائم ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے چاہتا ہوں کہ اہل ظاہر و باطن تجھ سے فائدہ حاصل کریں، جیسے ہمارے مرشد ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ تھے، مجھے اُمید ہے کہ تو بھی اسی طرح ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ و پیراستہ ہو جائے گا۔

مولانا سماءالدین سہروردی کے معمولات کو بیان کرتے ہوئے مولانا جمالی نے لکھا ہے کہ "حضرت سماءالدین آدھی رات کے وقت تجدید وضو فرماتے اور نماز شروع کر دیتے۔ ایک پہر رات تک نوافل ادا کرتے۔ دوسرے نصف پہر میں صبح صادق تک مراقبے میں رہتے اور دیدۂ باطن کو مشاہدۂ حق میں مصروف رکھتے، اس کے بعد سنت موکدہ ادا کرتے اور فجر کی نماز پڑھتے۔ ظاہری علوم کے علماء اور باطنی علوم کے صلحاء فجر کی نماز میں ان کے ساتھ شریک ہوتے۔ اشراق اور چاشت کی نمازوں کے بعد علماء و صلحاء سے سبق و درس میں مشغول ہو جاتے۔ حضرت کا درس زیادہ تر قرآن، احادیث اور اصول فقہ سے متعلق ہوتا تھا۔

مولانا سماءالدینؒ کے حلقۂ درس میں بعض ایسے طالب علم بھی ہوتے تھے جو دانشمندی کے مرتبہ پر پہنچ چکے ہوتے تھے۔ چنانچہ انہیں درس دینے کے علاوہ طالبان حقیقت کی تربیت پر بھی خاص توجہ فرماتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ:

کلمو الناس علی قدر عقولھم

یعنی لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق گفتگو کرو۔

مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ ان کے شیخ کی نظر میں فقیر اور امیر یکساں تھے اگر ایک ہزار تنکے کسی جگہ سے نذرانے میں آتے تو پانچ سو اور قرض لے لیتے اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ قرض لینے کا سبب یہ تھا کہ جب فقیروں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ کہیں سے نذرانہ آیا ہے تو وہ سب جمع ہو جاتے۔ ان ہزار دیناروں کو تقسیم کر دینے کے بعد جو اہل حاجت باقی رہ جاتے، ان کو قرض لے کر تقسیم کرتے۔ ایک مرتبہ دو ہزار تنکے نذرانے میں آئے۔ وہ سب مستحق لوگوں میں بانٹ دیئے۔ اسی دوران فقیروں کا ایک اور گروہ آ گیا۔ شیخ نے مزید ہزار تنکے منگوا کر ان میں تقسیم کئے۔

سلطان بہلول لودھی کو نصیحت کرنے کے حوالے سے مولانا جمالی نے یہ چشم دید واقعہ بھی قلمبند کیا ہے کہ ایک دن سلطان سکندر کا باپ سلطان بہلول میرے مخدوم و آقا شیخ سماء الدین کی زیارت کے لئے آیا۔ ان دنوں میں حضرت شیخ دارالملک دہلی میں رہتے تھے۔ انہیں اطلاع کی گئی کہ سلطان حضور کی زیارت کا امیدوار ہے، فرمایا اندر بلا لو۔ سلطان نے اندر آ کر اپنا سر حضور کے قدموں میں رکھ دیا اور سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد سلطان نے عرض کیا کہ حضرت مخدوم کی شفقت کا امیدوار ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فی الحقیقت درویش ہی بادشاہ ہوتے ہیں اور ہم ان کی صورت کے ریزہ چیں ہیں۔

حضرت مخدوم نے فرمایا کہ ان کی صورت کے ریزہ چیں ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اگر کسی میں ان کے سے حالات نہ پیدا ہوں تو افعال و اقوال و اعمال میں ان کی پیروی کرے تاکہ درویشوں کی ظاہری صورت اختیار کرنے سے اس کی باطنی کدورت کا زنگ صاف ہو جائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تین قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔ اوّل وہ بوڑھا جو بڑھاپے میں گناہ آلود زندگی گزارتا ہو۔ دوم وہ جوان جو توبہ کی امید میں معصیت میں گرفتار ہو۔ سوم وہ بادشاہ جو جزوی و کلی مرادات کے حصول کے باوجود اپنی سلطنت کے چراغ کو جھوٹ کی آندھی سے گل کر دے۔

اس گنہگار بوڑھے کو یہ حکم ہو کہ اے سفید بالوں والے سیاہ باطن! اس ضعفِ پیری کے باوجود تجھ کو اپنی زندگی کی کیا امید ہے کہ تیری دیوار مضبوط ہو سکے گی اور تو غفلت میں رہ کر گناہوں کی قوت سے اس کی بنیاد کیوں کھود رہا ہے؟

اس نوجوان سے یہ کہا جائے کہ اے احمق جوان! تو نہیں جانتا کہ بوڑھے اور بچوں میں سے ہر ایک کی روح اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تو جو بڑھاپے کی امید میں صحرائے معصیت میں گھوم رہا ہے اور انجام پر نظر نہیں کرتا کس طرح تجھ کو یقین ہے کہ بوڑھا ہو ہی جائے گا۔

اس جھوٹے بادشاہ کو تنبیہ کے ساتھ یہ بتایا جائے کہ اے غافل زمانہ! جھوٹ آخرت کی طلب کے لئے نہیں ہے، صرف اس دنیائے فانی کے ربط و ضبط کے لئے ہے۔ تو نے کیوں دروغ کا بیج اپنے اعمال کی کھیتی میں ڈالا ہے۔ تو نے بڑھاپے میں سلطنت کی ہے۔ اپنے دل کو خوف الٰہی سے آگاہ کر اور جہاں تک ممکن ہو سکے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہو جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

''اگر تم نے شکر کیا تو میں تمہیں زیادہ عطا کروں گا اور اگر تم نے کفر کیا تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔''

یہ کلمات سلطان کے دل پر اثر کر گئے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے نہایت عاجزی سے عرض کیا اے حضرت مخدوم! گناہوں کے باوجود درویشوں کی محبت برابر آہستہ آہستہ میرے دل میں ترقی کر رہی ہے اور مجھے ذات باری تعالیٰ سے اُمید ہے کہ اس جماعت کی محبت کی برکت سے وہ مجھ کو بخش دے۔ یہ بیان کرنے کے بعد مولانا جمالی لکھتے ہیں:

''مخدوم زادہ نصیر الدین روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ شیخ سماء الدین، سلطان بہلول غازی کی وفات کے بعد اس کی زیارت کے لئے گئے۔ قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد مراقبہ کیا۔ کچھ دیر کے بعد سر مبارک اٹھایا اور فرمایا کہ یہ شخص دنیا میں بھی کامیاب رہا اور صاحب سلطنت رہا اور مرنے کے بعد بھی اس نے فرط محبت کی برکت سے جو اس کو دوستانِ خدا سے تھی، عالی مرتبہ پایا۔''

صاحب ''نزھۃ الخواطر'' نے لکھا ہے کہ شیخ سماء الدین نسباً کنبوہ تھے۔ کنبوہ کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے بعض نے شہر کنب متصل غزنہ سے منسوب کیا ہے اور اس (کنبوہ) کی واؤ کو لفظ ہندو کی واؤ کے مطابق واؤ نسب بتایا ہے جبکہ بعض کے نزدیک کنبوہ مخفف ہے کم انبوہ کا جو فارسی لفظ میں ''معنی قلیل الجماعۃ'' اور یہ لفظ اس کا ہم معنی ہے یعنی جے

قرآن مجید کی آیت مبارکہ "و کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله ہے کہ ایک قلیل سی جماعت بڑی جماعت پر غالب آ گئی۔ پس آپ کنبوہ سے منسوب تھے جن کا نسب صاحب "مصباح العارفین" شیخ زین العابدین اور شیخ مراتب علی لکھنوی کی تحقیق کے مطابق حضرت مصعب بن زبیرؓ سے جاملتا ہے۔

لفظ کمبوہ یا کنبوہ کے بارے میں مولانا عبدالحئی حسنی نے جو تحقیقی حوالہ دیا ہے وہ صحیح معلوم نہیں دیتا۔ اس موضوع پر چوہدری وہاب الدین کمبوہ امرت سری نے اپنی عمر بھر کی تحقیق کے بعد "تاریخ کمبوہاں" قلم بند کی ہے اور اس میں بڑی سیر حاصل بحث کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ 'کمبوہ' نہ صرف یہ کہ حضرت مصعب بن زبیرؓ کی اولاد میں سے نہیں ہیں، بلکہ وہ سرے سے عربی النسل ہی نہیں ہیں۔

یہاں اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب "تاریخ کمبوہاں" فی الحقیقت "کمبوہ قوم کے حسب و نسب کی تاریخ" ہے، جیسا کہ اس کے سرورق سے ظاہر ہے۔ محقق چوہدری وہاب الدین کمبوہ جو برطانوی عہد میں پنجاب پولیس میں سب انسپکٹر تھے، نے اپنی تفتیش و تحقیق کرنے کی تربیت کا حق ادا کر دکھایا ہے اور نہایت محنت و جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ قوم کمبوہ کے حسب و نسب کو جاننے کی بھرپور سعی و کوشش کی ہے اور اس ضمن میں دلائل و براہین اور حقائق و شواہد کے علاوہ کتب تاریخ و تذکرہ سے جگہ جگہ حوالے بھی دیے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب کے دیباچے میں "صرف نسب پر فخر کرنا بے ہودگی ہے" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

"اگرچہ قومی و ملکی تفاخر کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور بمصداق فرمان پروردگار عالم ان اکرمکم عندالله اتقاکم (القرآن ۴۹:۱۳) یعنی حقیقتاً اللہ کے نزدیک تمہاری عزت پرہیزگاری سے ہے اور بمصداق حدیث خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم "خدا تعالیٰ نے تم میں سے جاہلیت کی نحوست اور باپوں پر فخر کرنے کی علت کو خارج کر دیا ہے۔ اب یا تو متقی مومن ہے یا فاجر، بدبخت بدکار ہونا ذلت کا سبب ہے، تمام آدمی آدم علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور آدم علیہ السلام کو کھرمٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔"

بر نسب نازان شدن نادانی است   حکم او اندر تن و تن فانی است

یعنی نسب پر ناز کرنا نادانی ہے۔ نسب کا تعلق جسم سے ہے اور جسم فانی ہے۔

وہاب الدین کمبوہ کی تحقیق کے مطابق شہنشاہ کمبوجیا، کمبوہ قوم کا مورثِ اعلیٰ تھا جسے

عرب ''قباذ'' کہتے ہیں اور یونانی مؤرخ اُسے ''کم بیاس'' (Combyas) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

''کمبوہ آریہ نسل سے ہیں'' کے زیر عنوان وہاب الدین کمبوہ نے دلائل دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''موجودہ کمبوہ اُن تمام نشانات سے جو محققین جدید نے نسلوں اور قوموں کی شناخت کے لیے مقرر اور وضع کیے ہوئے ہیں، آریہ نسل کے ہم جد ہیں۔ وہ چہرے کی بناوٹ، آنکھوں، بالوں اور اپنی زبانوں کی مماثلت، آبائی روایات و حکایات کی یک رنگی، دیوتاؤں اور معبودوں کی مطابقت، علم الاصنام کی یک جہتی کی رو سے بلاشبہ آریہ ہیں۔''

وہاب الدین کمبوہ نے ''مہا بھارت درونا پرب'' اور ''مہا بھارت استری پرب'' ایسی ہندوؤں کی کتابوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ کمبوہ کورو کھشیتر کے میدان میں لڑی جانے والی جنگ ''مہا بھارت'' میں بھی شریک ہوئے تھے اور کوروؤں کے طرف دار کی حیثیت سے پانڈوؤں کے خلاف صف اول میں داد شجاعت دیتے رہے تھے... نیز یہ کہ تاریخ کے ہر دور میں ہندوؤں اور بدھوں وغیرہ کے علاوہ آخری زمانے میں سکھوں میں کمبوہوں کی ایک قابل ذکر تعداد موجود رہی ہے۔ مزید برآں برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے پنجاب، کشمیر اور بنگال وغیرہ میں کمبوہوں کی ریاستوں کا سراغ لگانے کی بھی چوہدری وہاب الدین کمبوہ نے کوشش کی ہے۔ انہوں نے بعض غیر مسلم نامور کمبوہوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مثلاً راجہ کمود جام، رائے بنسی داس کمبوہ امیر دربار اکبری، دیوان متھرا داس کمبوہ مصنف ''انشاء برکرن'' راجہ بھیم سنگھ کمبوہ وغیرہ اور معاصر تاریخ میں سے سردار اُدھم سنگھ کمبوہ کا تذکرہ رقم کیا ہے جنہوں نے پنجاب کے سابق لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر —— جو معصوم آزادی پسند ہندوستانیوں کے قاتل کے طور پر جانا جاتا تھا —— کو لندن پہنچ کر ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ کو انڈیا ہاؤس میں عام مجمع میں گولی مار کر ہلاک کیا اور فرار ہونے کی کوشش تک نہیں کی۔ اس طرح سردار اودھم سنگھ کمبوہ نے تاریخ حریت میں اپنے نام کو ان مٹ بنا دیا۔

مولانا محمود احمد عباسی کی کتاب ''حقیقت قوم کمبوہ'' کے حوالے سے چوہدری

وہاب الدین کمبوہ لکھتے ہیں کہ" زبیریت کا یہ دعویٰ تازہ اور بالکل بے بنیاد ہے اور صرف گزشتہ صدی سے شروع ہوا ہے اور اس مذموم ذہنیت کی پیداوار ہے جس کے زیر اثر بعض نومسلم خاندانوں نے جھوٹی دُنیاوی عزت حاصل کرنے کی غرض سے اپنا تعلق سیدوں، قریشیوں، عباسیوں، مغلوں اور پٹھانوں سے جوڑنا شروع کر دیا ہے، حالانکہ کمبوہ قوم بذاتہ نہ صرف ماضی میں معزز و محترم رہی ہے بلکہ اس موجودہ زمانے میں بھی اس کے افراد ہندوستانی مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر اور ممتاز راہنما تصور ہوتے ہیں۔ ان کو عزت حاصل کرنے کے لیے کسی دوسری قوم سے تعلق قائم کرنے کی ضرورت نہیں... زبیریت کا دعویٰ کرنے والے بھائیوں کے خاندانی پیر جب یہ لکھتے ہیں کہ اُن کے بزرگ ملتان کے اولیائے کرام کی تلقین سے مسلمان ہوئے تو اُن کا زبیری بننا ایک مذموم و مکروہ حرکت ہے۔"

حضرت مخدوم سماء الدین کمبوہ کا ذکر کرتے ہوئے چوہدری وہاب الدین کمبوہ امرتسری لکھتے ہیں:

> "زبیری کمبوہوں میں سے سب سے پہلے جن بزرگ کا ذکر تاریخی کتابوں میں آتا ہے وہ حضرت مخدوم شیخ سماء الدین ہیں جو اپنے والد بزرگوار مولانا شیخ فخر الدین کے مرید تھے۔ مولانا شیخ فخر الدین شیخ راجو قتال کے، وہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت ملتانی کے، وہ شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانی کے اور وہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے خلیفہ بیان کیے جاتے ہیں... مخدوم شیخ سماء الدین ۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۹۰۱ھ مطابق ۱۴۹۵ء میں واصل بحق ہوئے۔"

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں اور مولوی رحمٰن علی نے "تذکرہ علمائے ہند" میں اور مولوی فقیر محمد نے "حدائق الحنفیہ" میں لکھا ہے کہ مولانا سماء الدین نے فارسی زبان کے شہرۂ آفاق شاعر اور حضرت بہاء الدین زکریا سہروردی کے خلیفۂ مجاز شیخ فخر الدین عراقی کی کتاب "لمعات" پر حواشی لکھے جس سے اس کتاب کے مشکل اور دقیق امور و مسائل کی اس طور اور اس انداز سے تشریح و توضیح کی گئی کہ ان کے معانی سمجھنے میں آسانی ہو گئی ہے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کے مقالہ نگار عبدالمجید یزدانی اور مولانا سماء الدین کے دیگر تذکرہ نویسوں نے بھی لکھا ہے کہ انہوں نے ایک رسالہ ''مفتاح الاسرار'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ ارواح کے بارے میں شیخ سماء الدین لکھتے ہیں کہ اہل شریعت، اہل حکمت اور اہل وحدت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل شریعت کہتے ہیں کہ ارواح جسموں سے ہزاروں برس پہلے تخلیق ہوئیں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا مقام معین ہوا اور اسی مقام پر واپس جائیں گی۔ سالک اس مقام کو موت سے پہلے معائنہ کر کے ''علم الیقین'' کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ اہل حکمت جسموں سے قبل ارواح کی تخلیق کے قائل نہیں تھے اور نہ مقامات کو تسلیم کرتے تھے بلکہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ روحیں دنیا میں ہی اپنا مقام خود پیدا کرتی ہیں۔ اہل وحدت کے نزدیک آدمی کے عروج کی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ ہزاروں سال بھی مجاہدے میں رہے تو ہر روز ایسے تازہ واردات و مشاہدات حاصل ہوتے چلے جائیں گے جو پہلے نہ ہو سکے تھے۔ ''مفتاح الاسرار'' ایک طویل رسالہ ہے جس کے بعض حصے شیخ عزیز نفیسی کے رسائل سے ماخوذ ہیں۔

آخری عمر میں مولانا سماء الدین کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بغیر کسی علاج معالجے کے دوبارہ بینائی عطا کر دی۔ روایت ہے کہ اس واقعہ کے بعد مولانا سماء الدین اپنے گھر کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ مہربانی یہ ہے کہ اس نے تمام مخلوق کو سماء الدین کی آنکھوں میں راہ دے دی۔

حضرت شیخ سماء الدین حنفی سہروردی نے ۱۷ جمادی الاول ۹۰۱ھ مطابق ۱۴۹۵ء وفات پائی اور دہلی میں حوضِ شمسی کے قریب دفن ہوئے۔ ان کی اولاد و احفاد کی قبریں بھی وہیں ہیں۔

حسن بن طاہر

مخدوم شیخ حسن بن طاہر نویں اور دسویں صدی ہجری کے ممتاز محدث، فقیہ اور عارف باللہ تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ طاہر ہے جو ملتان سے نقل مکانی کر کے علاقہ بہار میں چلے گئے تھے اور وہاں عرصہ دراز تک شیخ بدہ حقانی سے ظاہری علوم کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور صاحب فضل و کمال ہونے کے بعد شیخ حسن بن طاہر نے بھی برصغیر کے علمی حلقوں میں اچھی خاصی شہرت حاصل کی۔ چنانچہ مولانا عبد الحق محدث دہلوی کے تذکرہ ''اخبار الاخیار''، مفتی غلام سرور لاہوری کی تالیف ''خزینۃ الاصفیاء'' اور ڈاکٹر میاں محمد سعید کے ''تذکرہ مشائخ شیرازِ ہند'' کے علاوہ ''بحرِ ذخار'' (قلمی) اور ''ذکر جمیع الاولیاء'' میں ان کے احوال ملتے ہیں۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید نے مشائخ شیرازِ ہند'' میں لکھا ہے کہ:

''مخدوم شیخ حسن بن طاہر کے والد بزرگوار شیخ طاہر ملتان کے رہنے والے تھے۔ وہ شوقِ علم میں پہلے دہلی اور پھر جونپور پہنچے۔ جہاں انہوں نے علوم ظاہری کی تعلیم شیخ بدہ حقانی سے مکمل کی۔ قاضیٔ بہار کی بیٹی ان کی بیوی تھی۔ اس لئے انہوں نے کچھ عرصہ بہار میں قیام کیا۔ بالآخر جونپور چلے آئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔''

مخدوم شیخ حسن کا پورا نام حسن بن طاہر بن کمال عباسی جونپوری اور لقب ''کمال الحق'' ہے۔ وہ بہار میں پیدا ہوئے مگر جب ان کے والد شیخ طاہر بہار سے منتقل ہو کر جونپور آ گئے تو وہ بھی اپنے والدِ ماجد کے ساتھ جونپور میں آ گئے جسے مغل فرمانروا شاہجہان نے یہاں کے علماء و فضلاء اور مشائخ و صلحاء کی کثرت کے باعث ''شیرازِ ہند'' کا

لقب دیا تھا۔

سید عبد الحیٔ حسنی ''نزہۃ الخواطر'' جلد چہارم میں ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الشیخ العالم الفقیہ حسن بن طاہر بن کمال عباسی جونپوری برصغیر کے مشہور شیوخ طریقت میں سے تھے۔ مولد بہار اور منشا جونپور ہے۔ اصلاً ملتان وطن ہے، جہاں سے ان کے والد ترک اقامت فرما کر جونپور آ گئے اور مدت تک قیام کے بعد بہار پہنچے۔ یہاں مدرسہ شیخ محمد ابن طیب میں قیام فرمایا۔ یہیں نکاح کیا اور اولاد کے رزق پر متمتع ہوئے۔ شیخ حسن کی پیشانی پر اوائل ہی سے علاماتِ رُشد ہویدا تھیں۔ بچپن ہی میں تحصیل علم شروع کر دی اور جب اپنے والد کے ساتھ جونپور میں آئے تو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نامور تلامذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید نے ''بحرِ ذخار'' کے حوالے سے تذکرہ مشائخ ''شیراز ہند'' میں لکھا ہے۔

> ''شیخ حسن بن طاہر کی تعلیم و تربیت جونپور میں ہوئی۔ جہاں انہوں نے نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور اٹھارہ برس کی عمر میں تمام علومِ متداولہ کی تعلیم مکمل کر لی۔''

مولانا عبد الحق محدث لکھتے ہیں:

> ''شیخ حسن کو عالمِ شباب ہی میں طلب حق کا شوق دامن گیر تھا اور درویشوں کی صحبت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک درویش سے ''فصوص الحکم'' پڑھنی شروع کی تو ان کے والد بزرگوار نے اس کتاب کے پڑھنے سے منع کیا کیونکہ وہ اہلِ ظواہر میں سے تھے اور ''فصوص الحکم'' کے مخالف تھے اور نظریہ وحدت الوجود سے اختلاف رکھتے تھے۔ مگر جب ان کے والد نے مسئلہ توحید کے بارے میں ان سے چند سوال کئے تو انہوں نے اس مسئلہ کو علمائے ظاہر کی طرح ایسی وضاحت سے بیان کیا اور ایسے عمدہ دلائل پیش کئے کہ ان کے والد کے ذہن میں جو اشکال تھے ختم ہو گئے اور وہ اپنے

بیٹے کی قابلیت و ذہانت کے قائل ہو گئے۔ اس کے بعد پھر انہوں
نے اپنے بیٹے کو ''فصوص الحکم'' کے مطالعے سے کبھی نہ روکا۔''

ڈاکٹر محمد سعید ''بحر ذخار'' (قلمی) اور ''اخبار الاخیار'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شیخ حسن کو شروع سے ہی طلبِ حق اور درویشوں کی صحبت کا بڑا شوق تھا۔ جس زمانے میں ''فصوص'' کا مطالعہ کر رہے تھے اسی زمانے میں حضرت سید راجی حامد شاہ مالک پوری کی دنیائے تصوف میں بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ جب وہ اپنے تبلیغی دورہ پر جونپور تشریف لائے تو وہ ان کی زیارت کے لئے پہنچے اور پہلی ہی ملاقات میں ان کے ایسے گرویدہ و معتقد ہوئے کہ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ پھر ایک عرصہ دراز تک ان کی خدمت میں حاضر رہ کر سخت مجاہدات و ریاضات کیں۔ حتیٰ کہ بالآخر خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ان کے مرشد حضرت سید راجی حامد شاہؒ نے ان کو کمال الحق کا خطاب عطا فرمایا۔''

اربابِ علماء و فضلا میں سب سے پہلے جو عالم سید راجی حامد شاہ کے مرید و خلیفہ بنے وہ مخدوم شیخ حسن تھے۔ سید راجی حامد شاہ اپنے اس مریدِ خاص اور خلیفۂ مجاز سے بہت محبت و شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے اور ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

''روزِ محشر اگر مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو
تو میں کہوں گا کہ ایک فرزند جو شیخ حسنؒ ہیں۔''

صاحب نزہۃ الخواطر ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

''شیخ حسن بڑے عالم، عارف، صاحبِ مقاماتِ علیہ اور کرامات
عجیبہ و ذوق صحیحہ اور وجدِ صادقہ سے بہرہ مند تھے۔''

مخدوم حسن بن طاہر، صاحب تصنیف بزرگ ہیں۔ ان کا ایک رسالہ حقائق سلوک و توحید پر ''مفتاح الفیض'' ان کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ مولانا عبدالحق محدث لکھتے ہیں کہ شیخ حسن بن طاہر نے طریقہ سلوک اور علم توحید پر متعدد کتابیں لکھیں ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے ایک ''مفتاح الفیض'' ہے۔ جس میں سلوک، سالک، تزکیہ قلب و نفس، تخلیہ سر اور تخلیہ روح، منزل و جذبہ ایسی صوفیانہ اصطلاحات کے معانی و مفاہیم بیان کرنے کے علاوہ شریعت، طریقت اور حقیقت کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ چنانچہ ''سلوک'' سے سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے ہوئے ''حقیقتِ سلوک'' تک کے مراحل کی وضاحت کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:

''سلوک کے لغوی معنی چلنا ہے اور حسی طور پر چلنے کے معنی ہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانا۔ اور یہاں سلوک سے معنوی مراد چلنا ہے اور اسی انتقال کو مرتبہ نفس میں تزکیہ کہتے ہیں اور تزکیہ نفس سے مراد یہ ہے کہ حیوانی اوصاف کو ترک کر کے ملائکہ کے اوصاف سے متصف ہو جانا اور نفس امارہ کو نفس لوامہ اور مطمئنہ کے تابع کر دینا۔ دل کے سلوک کو تصفیہ کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے دل کو دنیاوی تمام تفکرات اور رنج وغم کی آلودگی سے صاف رکھا جائے۔ تخلیہ سر یہ ہے کہ اپنے سر میں کسی ماسویٰ اللہ کی کوئی خواہش نہ رکھے اور اللہ کے علاوہ خواہ وہ جنت ہی کیوں نہ ہو، کوئی خیال نہ کرے اور اپنے سر کی نگہداشت کرے یعنی اپنے دماغ میں غیر اللہ کا تصور تک نہ آنے دے اور اگر اچانک ماسویٰ اللہ کا کوئی خیال وتصور آ بھی جائے تو فوراً اسے نکال کر پھینک دے۔ تجلیِ روح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذوق وشوق اور اسرار وانوار کے ذریعے روح کو پاک وصاف اور ان اوصاف سے مزین رکھے، حقیقت سلوک سے مراد یہ ہے کہ حیوانی اور انسانی جملہ اوصاف سے نکل کر اوصافِ الٰہی اور اخلاق کو اپنا لے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ تخلقوا باخلاق اللہ۔''

حضرت قطب عالم نے اپنے رسالہ ''مہمات'' میں شریعت، طریقت اور حقیقت کے متعلق لکھا ہے کہ شریعت نام ہے اتباع وفرماں برداری کا اور طریقت کہتے ہیں تمام سے انقطاع کرنے کو۔ اور حقیقت سے مراد ہے اطلاع اور خبرداری... غرض کہ شریعت نام ہے انقیاد کا، طریقت نام ہے اپنے نفس پر تنقید کرنے کا اور حقیقت نام ہے اتحاد کا۔ گویا کہ شریعت درمیانہ روی اور اعتدال کو کہتے ہیں اور طریقت اپنے کو چھوڑ دینے اور حقیقت دوست سے مل جانے کو کہتے ہیں۔ یعنی بطیب خاطر فرمان برادری کرنا شریعت ہے، غیر سے بیزاری طریقت ہے، اور اپنے آپ کو مکمل طور پر دوست کے سپرد کر دینا حقیقت ہے۔

شریعت غنا ہے، طریقت فنا ہو جانے کو کہتے ہیں اور حقیقت بقاء کو کہتے ہیں۔ سالک ابتداً اچھی کیفیت رکھتا ہے۔ درمیان میں معاد کی عقل پیدا ہو جاتی ہے اور آخرکار وہ اللہ کا نور بن جاتا ہے۔

مخدوم حسن بن طاہر کے دامن کمال سے سینکڑوں ہزاروں افراد نے روحانی فیوض و برکات حاصل کئے۔ ان کے اجل خلفاء میں سے ایک مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خان ناصحی ظفر آبادی تھے۔ حضرت مخدوم کے چار فرزند تھے جن میں سے سب سے بڑے شیخ محمد حسن معروف بہ شاہ خیالی جو حضرت مخدوم ہی کے مرید و خلیفہ تھے اور بڑے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ مخدوم حسن بن طاہر کے دوسرے بیٹے شیخ شاہ محمد تھے جو شیخ امان پانی پتی کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے تیسرے بیٹے شیخ عبدالعزیز تھے جو مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خان ناصحی ظفر آبادی کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ مخدوم شیخ حسن بن طاہر، ان کے خلفاء اور بیٹوں نے چشتیہ سلسلہ کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا اور شیخ حسن بن طاہر کے معروف و ممتاز خلفاء اور ان کے عالم و فاضل اور عارف باللہ اولاد و احفاد کے ذریعے وعظ و ارشاد، درس و تدریس اور روحانی فیوض و برکات کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔

سلطان سکندر لودھی حضرت مخدوم سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا اور اس کا بھائی باربک شاہ حاکم جونپور ان کے مریدوں میں سے تھا۔ ایک روز وہ حضرت مخدوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے لئے سلطنتِ دہلی کے حصول کی دعا فرمائیں۔ آپ نے اس کو اس خام خیالی سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے ایک بھائی کو سلطنت عطا فرمائی ہے۔ تم اس سے کوئی اختلاف و حسد وغیرہ نہ کرو بلکہ اس کے مطیع، فرماں بردار بن کر رہو اور اس ملک گیری کی ہوس کو دل سے نکال باہر کرو۔'' سلطان سکندر لودھی کو جب اس واقعہ کے بارے میں علم ہوا تو وہ حضرت مخدوم کی فراست و دیانت کا اور زیادہ گرویدہ ہو گیا اور جب سلطان جونپور آیا تو اس نے حضرت مخدوم سے کڑہ میں ملاقات کی۔

حضرت مخدوم حسن بن طاہر جونپور سے آگرہ تشریف لے گئے جہاں وہ ایک عرصے تک قیام پذیر رہے۔ بعد ازاں دہلی میں وارد ہوئے۔ جہاں انہوں نے اپنے اہل خانہ سمیت بجے منڈل میں جس کا حصار اور گنبد سلطان محمد تغلق نے تعمیر ایا تھا، کی بدیع

منزل میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں انہوں نے وفات پائی۔ آپ کی اور آپ کی اکثر اولاد و احفاد کی قبریں یہیں ہیں۔

عالم کبیر، فقیہ شہیر اور صاحب مقام عارف باللہ حضرت مخدوم حسن بن طاہر عباسی چشتی جونپوری نے ۲۴ ربیع الاول ۹۰۹ھ کو بدیع منزل دہلی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

مولانا عبداللہ تلنبیؒ

شیخ عبداللہ اپنے زمانے کے نامور عالم دین اور یگانۂ روزگار شخصیت تھے۔ وہ علوم و فنون کے فاضل ماہر، معقولات اور منقولات میں کامل اور اپنی شخصی خصوصیات کی بناء پر وحید العصر تھے۔ اور عوام و خواص ہی نہیں بلکہ علماء و فضلاء اور امراء و سلاطین بھی انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی علمی جلالت کے قائل تھے، ان کا پورا نام و نسب یوں ہے۔ ''عبداللہ بن اللہ داد عثمانی تلنبی ملتانی دہلوی، ملتان کے قریب واقع قصبہ تلنبہ میں پیدا ہوئے اور اس نسبت سے تلنبی کہلائے۔ ان کے ہم عصر و ہم نشین و ہم مرتبہ عالم دین شیخ عزیز اللہ بھی تلنبہ ہی کے باشندہ تھے۔ اس لحاظ سے وہ مولانا عبداللہ کے ہم وطن بھی تھے۔ ملتان کے مقامی دانش ور منشی عبدالرحمن خان کی تحقیق کے مطابق مولانا عبداللہ اور مولانا عبداللہ اور مولانا عزیز اللہ ہم وطن ہونے کے علاوہ ایک دوسرے بھائی بھی تھے۔ مولانا عبداللہ تلنبی حنفی المذہب تھے۔

مولانا عبدالحئی حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں ملا عبدالقادر بدایونی کی ''منتخب التواریخ'' اور دیگر کتبِ معتمدہ کے حوالوں سے شیخ عبداللہ تلنبی کے احوال بیان کئے ہیں اور ان کا تعارف ان شاندار الفاظ میں کرایا ہے۔

''الشیخ الفاضل العلامۃ عبداللہ بن الہداد عثمانی تلنبی ملتانی ثم دہلوی یکے از مشاہیرِ علم و فن در ہند''۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے منتخب التواریخ، تذکرہ علمائے ہند، سبحۃ المرجان، ماثر الکرام،

نزہۃ الخواطر" ایسی کتب تاریخ و تذکرہ کے حوالوں سے شیخ عبداللہ تلنبی کے احوال بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ شیخ عبداللہ بن اللہ داد عثمانی نویں اور دسویں صدی ہجری کے ممتاز اور سرکردہ علماء میں سے تھے۔ ملتان کے قریب ایک قصبہ تلنبہ (بضم تا، بفتح لام، بسکون نون و بفتح با) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ اللہ داد بھی ایک عالم دین تھے۔ شیخ عبداللہ تلنبی نے خط اور حساب اور ابتدائی علوم اپنے گاؤں اور اپنے علاقے کے علماء و اساتذہ سے پڑھے۔ پھر اعلیٰ تعلیم بالخصوص منطق و فلسفہ اور دیگر معقولات کی تحصیل کے لیے عراق و عجم میں تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے اس زمانے کے نامور فاضل علامہ عبداللہ یزدی سے منطق و فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک عرصے تک اپنے استاد علامہ عبداللہ یزدی کی خدمت میں حاضر رہے اور ان سے اکتساب علم کرتے رہے۔

شیخ عبداللہ تلنبی نے جس محنت و جانفشانی، ذوق و شوق اور لگن سے علوم و فنون میں دسترس حاصل کی اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ عین عنفوان شباب ہی میں علم کی دولت سے مالا مال ہو گئے اور ایسی مدلل اور موثر اور فیصلہ کن گفتگو کرنے لگے کہ مخاطب لاجواب اور سننے والے متاثر و مسحور ہو جاتے۔ حاضر دماغی اور حاضر جوابی میں اپنی مثال آپ تھے اور خدائے بزرگ و برتر نے انہیں غیر معمولی حافظہ اور ذہن رسا عطا کیا تھا۔ چنانچہ جب وطن واپس آئے تو اکابر علماء میں شمار ہونے لگے۔ ملتان میں مسند تدریس آراستہ کی تو تشنگانِ علم کا جمگھٹا لگ گیا۔ ایک مدت تک ملتان میں درس و تدریس اور اضافہ و افادہ میں مشغول رہے۔ حتیٰ کہ ملتان کی تباہی اور فتنوں کے سبب گھربار چھوڑ کر کسی نہ کسی طرح دہلی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ دہلی اس زمانے میں سلاطین کا پایۂ تخت تھا اور علوم و فنون کا سرپرست اور علماء کا قدردان بادشاہ سکندر لودھی وہاں تخت نشین تھا۔ لودھی سلطان نے شیخ کی دہلی میں آمد کو غنیمت جانا اور ان کا شاندار استقبال کرنے کے علاوہ ملک العلماء کے خطاب سے نوازا۔

شیخ عبداللہ تلنبی سے پہلے برصغیر پاکستان و ہند میں منطق کی کتاب شرح الشمسیہ، اور علم الکلام کی کتاب "شرح الصحائف" کے سوا معقولات کی اور کوئی کتاب مدارس میں متداول نہ تھی۔ شیخ عبداللہ جب عراق و عجم کے فضلاء سے معقولات میں مہارت پیدا کر کے وطن واپس آئے تو معقولات کی متعدد کتابیں بھی اپنے ساتھ لائے اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ان کتابوں کو شاملِ نصاب کرا دیا۔ اس کام میں شیخ عزیز اللہ نے ان کے

ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ چنانچہ اب دونوں حضرات کی سعی و کوشش سے نصاب تعلیم میں فلسفہ کی بعض اہم اور مشکل کتابیں بھی شاملِ درس ہو گئیں۔ ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالہ ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' (Contribution of India and Pakistan to (the Arabic Literature میں لودھی سلاطین کے عہد میں اسلامی علوم کی ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''لودھی خاندان کے بانی بہلول لودھی نے اپنے عہد حکومت میں اسلامی علوم کو بہت ترقی دی، اس کا لڑکا سکندر لودھی اپنے خاندان کا ممتاز ترین حکمران تھا۔ اس کے عہد میں آگرہ دارالسلطنت بنایا گیا اور اس شہر نے اتنی تیزی سے ترقی کی کہ بہت جلد دہلی کا مدمقابل بن گیا۔ علوم وفنون کے ماہر یہاں جمع ہو گئے۔ اس زمانے کے ممتاز عالم اور فلسفی عبداللہ تلنبی ملتان کے باشندہ تھے مگر شاہانہ سرپرستی ان کو دہلی کے شاہی دربار میں لے آئی تھی۔ انہوں نے فلسفہ کے مطالعہ کا معیار بلند کر دیا جو پہلے بہت پست تھا۔ علم منطق پر ان کی ایک تصنیف اب بھی موجود ہے''۔

مولانا آزاد بلگرامی نے ''مآثر الکرام'' میں شیخ عبداللہ کے احوال بیان کئے ہیں اور ان کی علمی خدمات کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ''شش جہت را بہ نشر لوامع علوم منور ساخت''۔

مولوی فقیر محمد نے ''حدائق الحنفیہ'' میں شیخ عبداللہ تلنبی کے حالات بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ وہ فاضل ماہر، فقیہ متبحر اور راس العلوم نقلیہ وعقلیہ تھے۔ مدت تک اپنے وطن میں درس دیا پھر دہلی کو ہجرت کر گئے۔ جہاں سلطان سکندر لودھی نے آپ کی بڑی عزت کی اور وہاں کے لوگوں کو آپ سے بڑا فیض حاصل ہوا۔ شرح میزان المنطق آپ کی تصنیفات میں سے یادگار ہے''۔

منشی عبدالرحمن خان نے اپنی تالیف ''آئینۂ ملتان'' میں مولانا سماء الدین سہروردی کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مولانا عبداللہ اور ان کے بھائی مولانا عزیز اللہ تلنبوی ماہرینِ عقلیہ مولانا سماء الدین کے شاگرد تھے''۔

شیخ عبداللہ حنفی برصغیر کے پہلے عالم ہیں جنہوں نے معقولات پر قلم اٹھایا۔ انہوں نے علم منطق ایسے اہم موضوع پر سب سے پہلے ''میزان المنطق'' کے نام سے ایک

قابل قدر اور بیش قیمت رسالہ تصنیف کیا۔ پھر اپنے تصنیف کردہ اس رسالے کی خود ہی شرح لکھی اور اس کا نام ''بدیع المیزان'' رکھا۔ شرح کے مقدمے میں علم منطق کی اہمیت بیان کرتے ہوئے شیخ عبداللہ لکھتے ہیں۔

''قد اتفقت الآراء علی آن حکمة ذی الجلال فی ایجاد العقلاء هی معرفة الذات و الصفات بالاستدلال علیها بالآثار و الآیات و هی متوقفة علی العلم المسمی بالمنطق و لهذا حلم الفحول من العلماء و النحاریر من العظماء بفرضیة معرفته علینا۔''

ترجمہ:

اب اہل رائے اس بات پر متفق ہیں کہ اہل عقل کی تخلیق میں اللہ ذوالجلال کی حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعے آثار اور نشانیوں سے استدلال کرتے ہوئے اللہ کی ذات وصفات کی معرفت حاصل ہوتی ہیں اور یہ بات علم منطق کی تحصیل پر موقوف ہے۔ یہ وجہ ہے کہ بزرگ علماء اور بلند مرتبہ محققین نے اس کی معرفت کو فرض قرار دیا ہے۔

''بدیع المیزان'' شرح ''میزان المنطق'' ۱۲۶۱ھ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ جبکہ رسالہ ''منطق المیزان'' بھی مطبع احمدی دہلی سے چھپ چکا ہے۔ ''بدیع المیزان'' کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ'' یہ کتاب اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور اس کے مصنف کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ پاکستان و ہند میں فلسفہ کو فروغ دینے والے پہلے عالم ہیں۔ ''بدیع المیزان'' منطق کی مشہور کتاب ''میزان المنطق'' کی شرح ہے اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ فلسفہ یا منطق کے موضوع پر یہ برصغیر کے کسی عالم کی یہ اوّلین تصنیف ہے۔'''' میزان المنطق'' کی شرح ''بدیع المیزان'' کے نام سے خود شیخ عبداللہ نے کی۔ ان کی شرح فضل امام خیرآبادی نے ''تشحیذ الاذہان'' کے نام سے قلم بند کی۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ'' بدیع المیزان'' منطق کی ایک معیاری کتاب سمجھی جاتی ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا فضل امام خیرآبادی جیسے فاضل فلسفی نے ''تشحیذ الاذہان'' کے نام سے اس کی شرح لکھی۔

شیخ عبداللہ تلنبی کو مؤرخین نے انتہائی شاندار الفاظ اور باوقار انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے... مولوی فقیر محمد ان کے بارے میں لکھتے ہیں:'' فاضل ماہر، فقیہ متبحر، راس العلوم

نقلیہ و عقلیہ تھے۔"

مولانا آزاد بلگرامی کے الفاظ میں ... "تاج العلماء و سراج الفضلاء، و وحید العصرة تھے۔"

مولوی رحمان علی کا قول ہے ... "وہ عالموں کے سرتاج، فاضلوں کے چراغ، علوم معقول و منقول میں یگانۂ عصر اور فروع و اصول میں یکتائے دہر تھے۔"

نواب صدیق حسن خان کے نزدیک ... "وہ راس العلوم العقلیہ و النقلیہ ہیں۔"

سید عبدالحئی حسنی نے لکھا ... "وہ فرطِ ذکا، ذہانت، قوتِ حافظہ اور سرعتِ ادراک میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر زبید احمد کے مطابق ... "انہوں نے فلسفہ کے مطالعہ کا معیار بلند کر دیا جو پہلے بہت پست تھا۔"

شیخ کے ہم عصر اور ہم وطن شیخ عزیز اللہ تلنبی بھی ملتان سے ہجرت کر کے دہلی میں آ گئے تھے۔ ایک مرتبہ سلطان سکندر لودھی کے دربار میں علماء کے درمیان مناظرہ ہوا۔ ایک طرف شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز اللہ تھے اور دوسری طرف شیخ اللہ داد جونپوری اور ان کے فرزند شیخ بھکاری جونپوری تھے۔ فریقین میں زبردست مقابلہ ہوا۔ اس بحث و مناظرہ کے بعد سلطان نے فیصلہ دیا کہ تقریر میں اوّل الذکر بزرگوں کا پلہ بھاری ہے اس لیے وہ جیت گئے مگر تحریر میں مؤخر الذکر باپ بیٹے کا پلہ بھاری ہے۔ لیکن ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ تحریر و تقریر دونوں میں یکتائے روزگار تھے۔ ملا بدایونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ عبداللہ تلنبی سے چالیس سے زیادہ تبحر علماء نے استفادہ کیا جن میں اادن عبدالغفور بن نصیرالدین دہلوی، شیخ جمال الدین خان دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میراں سید جلال الدین بدایونی بھی شامل ہیں۔ شیخ زین العابدین عرف شیخ اڈھن دہلوی بھی شیخ عبدالحق دہلوی کے نانا اور ایک تبحر عالم و فاضل تھے۔ شیخ عبداللہ تلنبی کے شاگرد تھے۔

راس العلوم عقلیہ و نقلیہ، فروع و اصول میں یکتائے دہر، وحید عصرۃ، استاداا اساتذہ شیخ عبداللہ حنفی تلنبی ثم دہلوی نے ۹۲۲ھ کو وفات پائی۔

مولوی رحمان علی اور مولوی فقیر محمد جہلمی کے قول کے مطابق "اولئک لھم الدرجات العلیٰ" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

ابو یحییٰ معبری

شیخ ابو یحییٰ زین الدین معبری نویں اور دسویں صدی ہجری کے اکابر، علماء و فقہاء اور ممتاز مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ اسلامی علوم وفنون بالخصوص حدیث، فقہ، تفسیر کے فاضل اور علوم عربیہ کے ماہر ہونے کے علاوہ علوم حکمیہ میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ ایک عالمِ باعمل تھے اور احکامِ شریعت کی پابندی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ایک صوفی بزرگ ہونے کے ناتے سے جہاں علومِ ظاہری و باطنی کے ماہر تھے وہاں شریعت و طریقت کے بھی جامع تھے۔ دنیا انہیں متعدد کتابوں کے مصنف اور ایک امام طریقت کی حیثیت سے جانتی ہے۔ شافعی المذہب، روشن ضمیر و روشن خیال بزرگ تھے۔

ان کا نام ونسب یوں ہے۔

شیخ زین الدین بن علی بن احمد شافعی مالاباری کنیت ابو یحییٰ تھی۔ ۱۲ شعبان ۸۷۲ھ بروز جمعرات بوقت صبح کوشن جسے کوچین بھی کہتے ہیں، میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے معبر یعنی مالابار کے ایک معروف و ممتاز دینی و علمی گھرانے میں جنم لیا۔ اس خانوادے کے متعدد علماء و مشائخ نے تبلیغ اسلام کے علاوہ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کے والد شیخ علی بن احمد کا شمار معبر کے علماء و رؤساء میں ہوتا تھا۔ اس نسبت سے شیخ زین الدین اور ان کی اولاد میں ان کے دینی و روحانی اور علمی جانشین یعنی ان کے فرزند شیخ عبدالعزیز اور ان کے دو پوتے شیخ محمد بن عبدالعزیز اور شیخ زین الدین بن عبدالعزیز وغیرہ جو سب اربابِ علم وفضل، اصحابِ طریقت و شریعت اور صاحبِ تصانیف اہلِ قلم تھے، معبری کہلائے۔ ان کے چچا اور استاد جو ان کے ہم نام بھی

تھے یعنی شیخ زین الدین منصب قضا پر فائز تھے۔ چنانچہ قاضی زین الدین بن احمد بھی مالا بار کے اس صاحب ثروت دینی وعلمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔

برصغیر پاکستان و ہند کے ساحلی علاقوں میں سے مالا بار کو اسلام کے صدر اول ہی سے قابل ذکر اہمیت حاصل رہی ہے۔ مالا بار کے شہروں اور علاقوں کو اس اعتبار سے بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ یہاں پر دین اسلام عرب تاجروں اور صوفیہ کرام کی خالصتاً تبلیغی مساعی سے پھیلا۔ اور یہاں کے باشندے کلیتاً اپنی مرضی و پسند سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے ان کے بھی مسلمانوں کے ساتھ انتہائی عمدہ اور خوشگوار تعلقات قائم رہے۔ چنانچہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب پہلی صدی ہجری میں عرب تاجر جنوبی ہند میں وارد ہوئے تو ان کا ورود قطعی طور پر پُرامن تھا۔ وہ تجارت کی غرض سے یہاں آئے تھے اور یہ سلسلہ قبل از اسلام سے جاری تھا۔ لیکن جب عرب مشرف بہ اسلام ہوئے تو تبلیغِ دین ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی۔ اس لئے کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق ہر مسلمان کو اسلام کا مبلغ ہونا چاہئے اور اسے چاہئے کہ وہ اپنے قول و فعل سے غیر مسلموں کو متاثر کر کے انہیں اسلام قبول کرنے کی ترغیب و تشویق دلائے۔ چنانچہ یہ عرب تاجر بھی اپنے عمدہ اعمال و اخلاق سے اسلام کی صداقت و فضیلت اور خدائے واحد و یکتا کی عظمت و بزرگی کی تبلیغ کرتے تھے۔ پھر جب کالی کٹ جو مالا بار کا صدر مقام تھا، کے راجا زیمورن نے مسلمان تاجروں کے ذریعے اسلام کی خوبیاں معلوم کیں تو وہ اسلامی تعلیمات کو جان کر بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے مبلغینِ اسلام کی بہت خاطر مدارت کی۔ انہیں بطورِ خاص تجارتی اور رہائشی سہولتیں عطا کیں اور جن مقامی باشندوں نے اسلام قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا، راجا زیمورن نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

مالا بار کے راجگان ''چیرامن پیرومل'' کہلاتے تھے۔ ان راجاؤں میں سے آخری راجا تیسری صدی ہجری، یعنی نویں صدی عیسوی کے اوائل میں ''کدنکلور'' میں راج کرتا تھا۔ وہ کسی صوفی بزرگ کی تبلیغ سے مسلمان ہو گیا اور فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوا۔ وہ بندرگاہ ''شہر'' پر اترا اور چار سال بعد وہیں وفات پا گیا۔ اس نے مقامی عرب فضلاء میں سے شرف الدین مالک اور مالک بن حبیب کو معہ اہل و عیال مالا بار بھیجا اور ان کے ہاتھ اپنے جانشینوں کے نام ایک خط بھی بھیجا جس میں کچھ وصایا کے علاوہ ملکی نظم و نسق کے متعلق کچھ ہدایات بھی تھیں۔ جب یہ لوگ مالا بار پہنچے تو

ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اور انہیں مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس ملک میں راجا کے قبول اسلام کے واقعہ کی یاد اب بھی تازہ ہے اور اس کے جانشین راجاؤں کے راج سنگھاسن پر بیٹھنے کے وقت بعض مسلمانوں کی رسوم بھی شامل کر لی گئی ہیں۔ اس کی تفصیلات ڈاکٹر تارا چند کی کتاب ''ہندی ثقافت پر اسلام کا اثر'' (Influence of Islam on Indian Culture) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر تارا چند نے یہ بھی لکھا ہے کہ زیمورن محض چیرامن پیرومل کے نمائندے کی حیثیت سے حکومت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا قدیم راجا ایک دن مکہ سے واپس آ جائے گا۔ آج تک یہ کیفیت ہے کہ جب مہاراجا ٹراونکور کی تاج پوشی کے موقع پر نشانِ سلطنت کے طور پر اسے تلوار پیش کی جاتی ہے تو مہاراجا یہ فقرہ دہراتا ہے کہ ''میں اس تلوار کو اُس وقت تک اپنے پاس رکھوں گا جب تک وہ چچا جو مکہ گئے ہوئے ہیں وہاں سے واپس نہیں آ جاتے۔''

شیخ ابو یحییٰ زین الدین بن علی بن احمد کے ہم نام پوتے شیخ زین الدین بن عبدالعزیز بن ابو یحییٰ زین الدین نے ''تحفۃ المجاہدین'' کے نام سے کتاب لکھی جو برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان میں لکھی جانے والی تاریخ کی کتابوں میں اوّلین کتاب ہے۔ڈاکٹر تارا چند کی کتاب ''ہندی ثقافت پر اسلام کا اثر'' اور شیخ زین الدین معبری کی ''تحفۃ المجاہدین'' کے اندراجات میں حیرت انگیز حد تک مشابہت و مطابقت پائی جاتی ہے۔ ''تحفۃ المجاہدین'' میں لکھا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں جب مسلمان درویشوں کی ایک جماعت لنکا میں حضرت آدم کے نقشِ قدم کی زیارت کے لئے جا رہی تھی تو بادِ مخالف ان کا جہاز مالا بار کے شہر کدنگلور کے ساحل پر لے گئی۔ وہاں کے راجا زیمورن سامری نے ان کی آؤ بھگت کی۔ ان سے اسلام کا حال دریافت کیا اور ان کے بیان سے اتنا متأثر ہوا کہ اپنا راج پاٹ اپنے سرداروں کے سپرد کر کے خود ان کے ساتھ عرب کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہیں وہ فوت ہو گیا لیکن عرب درویشوں کو یہ ہدایت کر گیا کہ ''مالابار میں اسلام پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ان سے تجارت کرو''۔ اس نے اپنے سرداروں کے نام ایک خط بھی بھیجا جس میں یہ وصیت کی گئی تھی کہ عرب سوداگروں سے لطف و محبت کا سلوک کرنا۔ چنانچہ انہوں نے نووارد عربوں سے عمدہ سلوک کیا۔ جس کے باعث عرب تاجر کثیر تعداد میں وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ ''تحفۃ المجاہدین'' میں اس حسنِ سلوک کی ایک

نمایاں وجہ لکھی ہے۔ ''بحیثیت مجموعی مالا بار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے۔ علاوہ ازیں راجاؤں کو مسلمانوں کی جہاز رانی کے لئے بھی ضرورت تھی جس سے ہندو متنفر تھے۔ شیخ محمد اکرام نے ''آبِ کوثر'' میں ''تحفۃ المجاہدین'' کے اقتباسات دیئے ہیں اور مسز انز کے حوالے سے لکھا ہے کہ مالا بار کے جہازوں پر کام کرنے کے لئے جن پر سامری کی خوش حالی کا مدار تھا، سامری نے تبدیلیٔ مذہب میں خاص طور پر مدد دی۔ اس نے حکم دیا کہ ماہی گیروں کے ہر خاندان میں سے کم از کم ایک لڑکے کو مسلمانوں کی طرح تعلیم و تربیت کی جائے۔ ان تمام اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد معقول اور ان کا اثر وسیع ہو گیا۔

ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی ہجری مطابق تیرھویں صدی عیسوی میں کھمبایت سے چین کا سفر کیا تو اس نے مالا بار کے ساحل پر جا بجا مسلمانوں کی بستیاں دیکھیں۔ صوبہ بمبئی کی قدیم بندرگاہ ''مونادر'' میں سلطان جلال الدین ایک ہندو راجا کی طرف سے حاکم تھا۔ اور اس شہر میں بہت سے مسلمان علماء اور متعدد اسلامی مدارس موجود تھے۔ منگلور میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار کے قریب تھی۔ کالی کٹ کا راجا ہندو تھا لیکن تاجروں کا سردار مسلمان تھا اور بحری تجارت میں مسلمانوں کا بڑا عمل دخل تھا۔ ۱۹۲۱ کی مردم شماری کے مطابق مالا بار میں مسلمانوں کی تعداد گیارہ لاکھ تھی اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ اگر سولہویں صدی عیسوی میں پرتگیز اسلام کی پُرامن اشاعت کو تلوار کے زور سے نہ روکتے تو اس علاقے کے سب باشندے مسلمان ہو جاتے۔

''تحفۃ المجاہدین'' کے مصنف اور شیخ ابو یحییٰ زین الدین کے ہم نام پوتے شیخ زین الدین معبری کو شیخ محمد اکرام نے ایک غیرت مند عالم کے نام سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب عہدِ اکبری میں اُس وقت تصنیف کی جب پرتگیزی مالا بار کے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم توڑ رہے تھے۔ یہ کتاب بیجاپور کے سلطان علی عادل شاہ اوّل کے نام معنون تھی اور اس کی تصنیف کا مقصد مسلمان حکمرانوں اور امراء و رؤساء کو مالا بار کے مسلمانوں کی مدد پر آمادہ کرنا تھا۔

شیخ ابو یحییٰ زین الدین نے اپنی ایک نظم ''تحریض اهل ایمان علیٰ جهاد عبدة الصلبان'' میں پرتگیزوں کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب و تحریص دلائی۔ لیکن ان کے ہم نام پوتے شیخ زین الدین بن عبدالعزیز نے اس موضوع پر مستقل اہمیت

کی ایک قابل قدر اور انتہائی معلومات افزاء کتاب تصنیف کی جس کے اندراجات سے مسلمانوں کے اس اثر و اقتدار کا پتا چلتا ہے جو انہوں نے ماا بار میں بغیر کسی تیغ و تفنگ کے حاصل کر لیا تھا۔ ''تحفۃ المجاہدین'' کے علاوہ شیخ زین الدین بن عبدالعزیز بعض دوسری اہم کتب کے بھی مصنف ہیں۔

شیخ ابو یحییٰ زین الدین کے دوسرے پوتے شیخ محمد بن عبدالعزیز نے ''الفتح المبین للسامری الذی یحب المسلمین'' کے نام سے پانچ سو تین اشعار پر مشتمل ایک نظم لکھی۔ انہوں نے اپنی اس طویل رزمیہ نظم میں وہ سب واقعات بیان کر دیئے جو ان کے بھائی شیخ زین الدین بن عبدالعزیز نے نثر کی صورت میں اپنی کتاب ''تحفۃ المجاہدین'' میں قلمبند کئے تھے، دونوں بھائی ان انسانیت سوز مظالم کے چشم دید گواہ تھے۔ لہٰذا ایک نے ان دلخراش و جگر پاش واقعات کو نثر میں بیان کر دیا اور دوسرے بھائی نے ان کو منظوم کر دیا ہے۔

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں ''تحفۃ المجاہدین'' اور اس کے مصنف شیخ زین الدین بن عبدالعزیز اور ''الفتح المبین للسامری الذی یحب المسلمین'' اور اس رزمیہ نظم کے خالق محمد بن عبدالعزیز کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ نثر اور نظم کی ان دونوں کتابوں کا مقابلہ کرنے سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ صحیح اور قابلِ اعتماد ہیں۔

شیخ ابو یحییٰ زین الدین کے پوتوں کے دینی و علمی کارنامے بیان کرنے کے بعد اب ان کے فرزند شیخ عبدالعزیز بن شیخ ابو یحییٰ زین الدین کا ذکر کیا جاتا ہے جو اپنے والد کی طرح عالم فاضل شخص تھے اور اپنی خاندانی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے انہوں نے بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ انہوں نے اپنے والد کے قصیدہ ''ھدایۃالاذکیاء الیٰ طریق الاولیاء'' کی مفصل شرح لکھی جو ''مسلک الاتقیاء فی شرح ھدایۃالاذکیا'' کے نام سے ۱۲۹۲ھ۔۱۸۷۵ء میں بولاق سے طبع ہوئی۔

شیخ ابو یحییٰ زین الدین کے فرزند شیخ عبدالعزیز اور ان کے دو پوتوں یعنی شیخ زین الدین بن عبدالعزیز اور شیخ محمد بن عبدالعزیز اور ان کی تصنیفات کا اس تفصیل سے تذکرہ کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اکثر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں بالخصوص مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں اور مولانا عبدالقدوس نے ''تاریخ ادبیات مسلمانان

پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) میں ان شخصیات کے اسماء گرامی کی یکسانیت کی وجہ سے ان کو آپس میں یوں گڈ مڈ کر دیا ہے کہ ان کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے ڈاکٹر زبید احمد کے علاوہ صاحب نزہۃ الخواطر اور رسالہ ''زمانہ'' کانپور اشاعت جنوری ۱۹۳۳ء کے حوالے سے شیخ ابو یحییٰ زین الدین کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ''شیخ ابو یحییٰ زین الدین بن علی بن احمد الشافعی ایک عالم باعمل اور بحث و تحقیق کے امام تھے۔ ان کا معبری خاندان مالا بار کا بڑا علمی اور معزز گھرانہ تھا اور زہد و تقویٰ میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس خاندان کے چند افراد نے وہاں ایک مدرسہ اور خانقاہ بھی تعمیر کی جو اسلامی علوم کا مرکز ہونے کے علاوہ ملیبار میں آنے والے عرب و عجم کے مسلمان مہمانوں کی قیام گاہ بھی تھی۔ شیخ شہاب الدین ابن حجر ہیتمی جب ملیبار آئے تھے تو اسی خانقاہ میں ٹھہرے تھے اور اس خانقاہ میں انہوں نے تفسیر و حدیث کا درس بھی دیا تھا۔

شیخ محمد اکرام کی تحقیق سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شیخ زین الدین ابو یحییٰ نے پونانی میں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی تھی اور اس کے پاس خانقاہ اور مدرسہ بھی بنوایا۔ یہ مدرسہ مالا بار کا مشہور مدرسہ ہے اور یہاں مالا بار اور کرناٹک ہی سے نہیں بلکہ جزائر مشرق سے بھی طلباء تحصیلِ علم کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور شیخ ابن حجر جیسے بزرگوں نے یہاں درس دیا۔ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کے مقابلے میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کی تحقیق پر مبنی یہ بیان زیادہ وقیع اور درست معلوم ہوتا ہے۔

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' جلد چہارم میں ''مسالک الاتقیاء'' کے حوالے سے شیخ ابو یحییٰ زین الدین کے احوال بیان کئے ہیں اور ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''الشیخ العالم العلامۃ زین الدین ابن علی بن احمد شافعی ملیباری یکے از علمائے عاملین اور ائمہ محققین میں سے ہیں۔ ان کا مولد کش ہے جو مالا بار کے شہروں میں سے ایک شہر ہے۔ ان کے چچا قاضی شیخ زین الدین ابن احمد ملیباری جب فونان کے قاضی مقرر ہوئے تو وہ اپنے بھتیجے شیخ زین الدین (ابو یحییٰ) کو بھی اپنے ساتھ فونان لے گئے۔ شیخ زین الدین ابھی

بچے ہی تھے، چنانچہ فونان ہی میں شیخ زین الدین (ابو یحییٰ) نے اپنے چچا زین الدین بن احمد کی زیرِ نگرانی پرورش پائی اور ابتدائی تعلیم بھی ان ہی سے حاصل کی۔ انہوں نے قاضی زین الدین بن احمد سے صرف ونحو، ادب وسخن اور علم الکلام کے علاوہ فقہ و حدیث کا درس لیا۔ پھر فونان کے نامور علماء و اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا''۔

شیخ ابو یحییٰ زین الدین بن علی نے فونان میں شیخ شہاب الدین احمد سے فقہ، حدیث کی اہم اور بنیادی کتابوں کے علاوہ بعض دوسری عربی کتب بھی پڑھیں۔ پھر فخر زمانہ استاد شیخ ابو بکر فخر الدین ملیباری کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر فقہ اور اصول فقہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے فونان ہی میں شیخ شمس الدین جوجری، شیخ زکریا انصاری اور شیخ کمال الدین محمد بن ابو شریف ایسے نامور علماء سے اکتساب کیا۔ شیخ زین الدین نے ظاہری علوم میں کمال حاصل کرنے کے بعد باطنی علوم کی طرف توجہ کی اور اپنے زمانے کے مشہور صوفی بزرگ شیخ قطب الدین جو شیخ عز الدین اجودھنی کے فرزند ارجمند اور روحانی جانشین تھے، کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر سلسلۂ چشتیہ کے اوراد و اعمال اور وظائف کا اخذ و استفادہ کیا۔ شیخ قطب الدین چشتی اجودھنی نے انہیں ذکرِ جلی کی تلقین کی اور انہیں خرقۂ خلافت عطا کر کے مریدوں کی تعلیم و تربیت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اپنے مرشدِ طریقت سے روحانی فیوض و برکات حاصل کرنے کے بعد شیخ زین الدین ابو یحییٰ نے اپنا حلقۂ وعظ و ارشاد قائم کیا۔

شیخ قطب الدین چشتی کے علاوہ شیخ زین الدین نے اپنے زمانے کے ایک اور مرشدِ طریقت شیخ ثابت بن عین بن محمود زاہدی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ شیخ زاہدی نے انہیں طریقہ شطاریہ کے مطابق ذکر کی تلقین کی اور انہیں خلافت و اجازۃ مرحمت فرمائے۔ اس طرح شیخ زین الدین ابو یحییٰ سلسلہ عالیہ چشتیہ اور سلسلہ عالیہ قادریہ سے منسلک ہو کر بالآخر ان دو بڑے روحانی سلاسل کے بزرگوں میں شمار ہونے لگے اور اپنی خانقاہ میں اسلامی علوم اور معرفتِ الٰہی کی نشر و اشاعت میں برسوں سرگرم عمل رہے۔ ان کے فضل و کمال کا چرچا جلد ہی عام ہو گیا اور طالبانِ حق جوق در جوق ان کی خانقاہ میں حاضر ہونے لگے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ شیخ زین الدین کثیر الاذکار و اشغال تھے۔ اپنے اوقات و معمولات دونوں کے پابند اور عوام و خواص کو اوامر و نواہی کی

بطور خاص تلقین و تاکید فرمایا کرتے تھے۔ علوم کے ناشر، بدعات و منکرات کے مخالف اور مظلوموں کے حامی و مددگار تھے اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے جاری کرنے والے تھے۔ آپ کی ذاتِ گرامی سے لوگوں نے بہت سے دینی، علمی اور روحانی فیوض و فوائد حاصل کئے اور بے شمار لوگ آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

شیخ محمد اکرام نے ''آبِ کوثر'' میں لکھا ہے کہ شیخ زین الدین ابو یحییٰ علوم ظاہری اور باطنی میں کامل تھے۔ انہوں نے چشتیہ اور قادریہ سلسلوں میں بیعت کر رکھی تھی۔ مسلمانانِ مالابار انہیں اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے۔ انہوں نے پونانی (فونان) میں ایک جامعہ مسجد تعمیر کرائی اور اس کے پاس خانقاہ اور مدرسہ بنوایا۔ یہ مدرسہ مالابار کا مشہور مدرسہ ہے اور یہاں مالابار اور کرناٹک سے ہی نہیں بلکہ جزائر شرقی سے بھی طلبا تحصیلِ علم کے لئے آیا کرتے تھے... غرض یہ کہ شیخ محمد اکرام اور سید عبدالحیٔ حسنی کی تحقیق کے مطابق شیخ زین الدین ابو یحییٰ نے اپنے قائم کردہ مدرسے میں اسلامی علوم وفنون کی تعلیم اور اپنی بنوائی ہوئی خانقاہ میں طالبانِ حق کی اخلاقی و روحانی تربیت اور تعمیرِ سیرت اور کردار سازی کا وسیع پیمانے پر انتہائی مؤثر انتظام کر رکھا تھا۔ اور اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اسلامی علوم و فنون کی ترقی و ترویج اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی عظمت و سربلندی کے باب میں شاندار اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔ جس کی تفصیلات ''آبِ کوثر'' اور ''نزہۃ الخواطر'' اور ڈاکٹر زبید احمد کے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' کے علاوہ دیگر کتبِ تاریخ و تذکرہ میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

شیخ زین الدین ابو یحییٰ نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اسلامی علوم و فنون کی ترقی و ترویج اور درس و تدریس اور خدمتِ خلق کے علاوہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور مختلف دینی موضوعات پر بہت سے اہم کتب و رسائل بھی لکھے۔ جیسا کہ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ ''شیخ زین الدین ابو یحییٰ نے چشتیہ اور قادریہ سلسلوں میں بیعت کر رکھی تھی اور تصوف، فقہ، مسائلِ وعظ و تذکیر میں کئی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ جن میں سے بعض گزشتہ صدی (انیسویں صدی عیسوی) میں مصر میں طبع ہوئی ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ان کی ایک منظوم تصنیف ''ہدایۃ الاذکیاء'' ہے جس کی گزشتہ صدی میں دو شرحیں، ایک مکہ معظمہ میں اور دوسری جاوا میں تصنیف ہوئی ہیں۔ ان کے زمانے میں پرتگالی فتنہ نمودار ہو

چکا تھا اور انہوں نے اپنی نظم ''تحریض اهل ایمان علیٰ جهاد عبدة الصلبان '' میں پرتگیزیوں کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب وتحریص دلائی تھی''۔

شیخ زین الدین ابو یحییٰ معبری نے بہت سی مفید تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے قابل ذکر یہ ہیں۔

۱۔ تحفۃ الاحباء (اوقات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں)
۲۔ مرشد الطلاب (تصوّف)
۳۔ شمس الہدیٰ (پند ونصاح کا مجموعہ)
۴۔ ارشاد الطالبین (امام غزالیؒ کی ''منہاج العابدین'' کا اختصار)
۵۔ شعب الایمان (سید نورالدین کی فارسی تصنیف کا عربی ترجمہ)
۶۔ کتاب الصفاء من الشفاء (عباس قائمی کی ''الشفاء'' کا خلاصہ)
۷۔ تسہیل الکافیہ (ابن حاجب کی ''کافیہ'' کی شرح)
۸۔ کفایۃ الفرائض (''الکافی الفرائض'' کی شرح)
۹۔ حاشیہ الفیہ ابنِ مالک
۱۰۔ حاشیہ تحفۃ ابن الوردی
۱۱۔ حاشیہ، ارشاد ابن مقری
۱۲۔ قصص الانبیاء (از آدم تا داؤد)
۱۳۔ تحریص اہل الایمان علیٰ جہاد عبدۃ الصلبان
۱۴۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (جو آپ ادھوری چھوڑ کر وفات پا گئے)

شیخ زین الدین کی تصنیفات کی یہ فہرست ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار نے نزہۃ الخواطر، رسالہ ''زمانہ'' کانپور جنوری ۱۹۳۳ء اور ڈاکٹر زبید احمد کے تحقیقی مقالے کے حوالوں سے مرتب کی ہے۔ ''نزہۃ الخواطر'' کے مؤلف نے اپنے جس ماخذ ''مسالک الاتقیاء'' کا ذکر کیا ہے اس کا اصل نام ''مسلک الاتقیاء'' ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ شیخ زین الدین نے صوفیوں کی خاطر بطور خاص ''ہدایۃ الاذکیا الیٰ طریقۃ الاولیاء'' اور برائے نزولِ برکت اور اخراجِ فقر ایک قصیدہ بھی تحریر کیا ہے جو کتاب ''البرکت للوصابی'' سے ماخوذ ہے۔

مؤرخین نے شیخ زین الدین ابو یحییٰ معبری کی دینی و روحانی اور سماجی و رفاہی اور تبلیغی خدمات اور ان کی شخصی خصوصیات بڑی تفصیل سے بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ ان کی پرکشش اور پاکیزہ شخصیت اور ان کے کلام کی تاثیر کی بدولت ہزاروں افراد ان کے دست حق پرست پر بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر ان کے مرید بنے اور ہزاروں گنہگار اُن کی صحبتِ کیمیاء اثر کے باعث اعلیٰ روحانی مدارج پر فائز ہوئے۔

شیخ زین الدین ابو یحییٰ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ ظلم و زیادتی اور بے انصافی کو قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے اور ظالموں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ مگر غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان کی ہر ممکن مدد و اعانت کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتے تھے۔ اپنی ان خصوصیات اور اپنے علمی و روحانی کمالات کی وجہ سے عوام و خواص کے تمام طبقات کے لوگ ان کی حد درجہ تعظیم و تکریم کرتے تھے اور ان کے وجود کو اپنے لئے بہت بڑی سعادت و برکت سمجھتے تھے۔

شیخ زین الدین ابو یحییٰ قادری معبری نے جمعہ کی شب ۱۶ شعبان ۹۲۸ھ کو فونان میں وفات پائی اور وہیں ان کا مزار پُرانوار مرجع خلائق ہے۔

شاہ احمد شرعی

مولانا شاہ احمد شرعی اپنے زمانے میں اجل عالم، فاضل فقہ اور کامل درویش تھے۔ مالوہ کے شہر چندیری کے رہنے والے تھے۔ علم و فضل، صدق و صفا اور زہد و ورع میں یکتا ہونے کے علاوہ ایک بے مثال شاعر تھے اور عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے بزبان انگریزی ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' (The contribution of India & Pakistan to Arabic Literature) میں شاہ احمد شرعی کا ذکر کیا ہے اور مولانا رحمان علی نے تذکرہ ''علمائے ہند'' میں اُن کے احوال بیان کیے ہیں۔

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے ڈاکٹر زبید احمد کی متذکرہ کتاب نیز مولانا عبدالحق محدث دہلوی اور مولوی رحمان علی کے ''تذکرہ علمائے ہند'' اور ''نزہۃ الخواطر'' کے حوالوں سے مولانا شاہ احمد شرعی کے احوال رقم کئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''شیخ شاہ احمد شرعی، چندیری نویں اور دسویں صدی ہجری کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ شاہ احمد شرعی ایک فاضل متبحر، درویش کامل، شیخ بزرگ اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے مستند عالم تھے۔ چندیری ریاست مالوہ کا ایک شہر ہے۔ مولانا احمد شرعی اسی شہر کے باشندہ تھے۔'' ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کو شاید یہ علم نہیں کہ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے کچھ ہی عرصے بعد بھارت نے اپنی تمام ریاستوں کو ختم کر کے انہیں اپنے ملک کا حصہ بنا لیا تھا۔ اس لئے اب مالوہ نام کی کوئی ریاست موجود نہیں ہے۔ وگرنہ ڈاکٹر صاحب موصوف چندیری کو ریاست مالوہ کا شہر ہرگز نہ لکھتے۔ یہ تو اسی طرح ہے جس طرح کوئی مؤرخ، تذکرہ نگار اور قلم کار اپنے مضمون یا مقالے میں یہ لکھ

دے کہ صادق آباد ریاست بہاول پور، سید و شریف ریاست سوات اور تربت ریاست قلات میں ہے جب کہ آج پاکستان میں کوئی ریاست موجود نہیں ہے۔

مولانا عبدالحق دہلوی ''اخبار الاخیار'' میں لکھتے ہیں۔

''شاہ احمد شرعی ترکی النسل اور بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ کامل درویش بھی تھے۔ بہت ضعیف تھے۔ چندیری میں قیام پذیر تھے۔''

سید عبدالحئی حسنی نے ''نزہتہ الخواطر'' میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

''الشیخ الفاضل'' شاہ احمد شرعی چندیروی یکے از علمائے دعوت الاسماء، زاہد و پارسا و کم سوال اور متدین و کثیر العبادة، امراء و سلاطین کے دروازے پر نہ جاتے بلکہ یہ دونوں طبقے نماز جمعہ کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔'' لیکن حیرت ہے کہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم عربی ادب کے فاضل مقالہ نگار نے ڈاکٹر زبید احمد کے حوالے سے مولانا شاہ احمد شرعی کے احوال بیان کرتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے۔

''سلطان محمود والی مالوہ ایسے علم پرور حکمران کے دربار سے جو علمائے وقت وابستہ رہے ان میں سے ایک شیخ چندیری بھی ہیں۔''

ڈاکٹر زبید احمد کے تحقیقی مقالے زبان انگریزی کا اردو ترجمہ جو فاضل دانشور شاہد حسین رزاقی نے ''عربی ادبیات میں پاکستان و ہند کا حصہ'' کے عنوان سے کیا ہے، اور جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے، ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں ڈاکٹر زبید نے اس ضرورت کے تحت کہ نویں اور دسویں صدی ہجری میں برصغیر میں مسلمانوں کی کوئی ایک مرکزی سلطنت نہ تھی بلکہ مسلم انڈیا میں مسلمانوں کی متعدد سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں جن میں اکثر حکومتوں میں اسلامی علوم و فنون کو وسعت و فروغ ملا اور عربی کے کئی عالم اور مصنف ہوئے۔ چنانچہ پورے برصغیر میں عربی علوم اور عربی تصانیف کا جائزہ لینے کے لئے ڈاکٹر زبید احمد نے ان تمام سلطنتوں کا ذکر بھی اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ ''سلطنت مالوہ'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ شاہانِ مالوہ علم کے بڑے سرپرست تھے اور بالخصوص سلطان محمود نے اپنی سلطنت کے علماء کی بہت قدر دانی کی۔ مالوہ سے تعلق رکھنے والے مصنفوں میں شاہ احمد شرعی چندیروی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو صوفی بھی تھے اور مصنف بھی۔ کشاف کے نامور مصنف زمخشری کے دو اشعار کے جواب میں انہوں نے جو دو شعر کہتے تھے وہ اب تک محفوظ ہیں۔ اپنی اسی کتاب کے باب دوازدھم میں شاعری میں

ڈاکٹر زبید لکھتے ہیں کہ "شاہ احمد شرعی چندیری (مالوہ) کے رہنے والے تھے اور وہ عربی میں شعر بھی کہتے تھے۔ زمخشری نے اشاعرہ کی جو ہجو لکھی ہے اس کے جواب میں شرعی کے یہ دو شعر قابل ذکر ہیں" اس کے بعد شاہ احمد شرعی کے شعر نقل کئے ہیں اور اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھا۔ ڈاکٹر زبید کی ان عبارتوں سے ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے یہ تاثر کیسے لے لیا کہ وہ اُن علماء وقت میں سے تھے جو سلطان محمود والی مالوہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر ظہور ایسے ذمہ دار صاحب قلم سے جو ایک استاد بھی ہیں، اس قسم کی لغزش کی قطعی طور پر توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لغزش بلکہ غفلت کی صورت اور زیادہ سنگین ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا شاہ احمد شرعی کے احوال قلمبند کرتے وقت سید عبدالحئی حسنی کی "نزہۃ الخواطر" اور مولانا عبدالحق محدث دہلوی کا تذکرہ "اخبار الاخیار" ایسی مستند کتب ان کے پیش نظر تھیں جن کے حوالے انہوں نے اپنے مقالے کے فٹ نوٹ پر باقاعدہ دیئے ہیں۔ عبدالحق محدث دہلوی اور عبدالحئی حسنی نے مولانا شاہ احمد شرعی کے جو احوال بیان کئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ دیگر صوفیہ کرام اور اکابر مشائخ کی طرح شاہ احمد شرعی کسی شاہی دربار سے وابستہ نہیں تھے بلکہ صاحبِ نزہۃ الخواطر نے تو تذکرہ شاہ احمد شرعی کے پہلے ہی جملے میں صاف لکھ دیا ہے کہ "شیخ احمد شرعی زاہد و پارسا و کم سوال اور متدین و کثیر العبادت بزرگ تھے۔ امراء و سلاطین کے دروازوں پر نہ جاتے تھے بلکہ یہ دونوں طبقے نماز جمعہ کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔"

صاحبِ نزہۃ الخواطر کے اس تعارفی جملے کے بعد اس امر کی قطعی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کوئی سلیم الطبع صحیح الفکر اور صاف گو اہلِ قلم شیخ احمد شرعی کے بارے میں یہ لکھنے کی جسارت کرے کہ وہ کسی دربار سے وابستہ تھے۔ اندریں حالات اسے ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کی غلطی کہہ کر اس معاملے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ صوفیہ کرام کی عام روش اور بالخصوص مولانا احمد شرعی کے حالات سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود ان کے بارے میں اس قسم کی الزام تراشی ایک مخصوص اندازِ فکر کی غمازی کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح کا اندازِ فکر کسی بھی صاحبِ علم کو زیب نہیں دیتا۔

عبدالحق محدث دہلوی مولانا احمد کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بلادِ ہند میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم ترکی النسل ہیں وہ دراصل مولانا احمد شرعی کی اولاد میں سے ہیں۔ شیخ عبدالغنی سونی پتی جو اپنے زمانے کے مشہور عالم فاضل

اور زاہد و پارسا بزرگ تھے شیخ احمد شرعی کے شاگردوں میں سے تھے اور مولانا محدث دہلوی کے ہم عصر تھے۔ چنانچہ مولانا محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالغنی سونی پتی جو دہلی کے پرانے لوگوں میں سے ہیں وہ اکثر و بیشتر اپنے استاد شاہ احمد شرعی کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ جب میں تحصیل علم کر رہا تھا اس وقت شاہ احمد شرعی کی عمر چھیانوے برس کی تھی۔ اس عمر میں آپ ایک دن تیر اندازی اور نشانہ بازی کر رہے تھے کہ میں بھی وہاں موجود تھا۔ آپ نے ایک تیر مارا جو عین نشانے پر لگا۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر آپ کہیں تو دوسرا تیر اس تیر کی پوری نوک پر لگا دوں۔ اس کے بعد آپ نے دو تین تیر اس طرح مارے کہ ہر تیر پہلے تیر کی نوک پر کھڑا ہو جاتا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس طرح تیر ضائع ہو رہے ہیں اور یہ اسراف ہے، وگرنہ وہاں سے یہاں تک اسی طرح تیروں کی قطار لگا دیتا۔

عبدالحق محدث دہلوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ احمد شرعی کے بارے میں لوگوں میں مشہور تھا کہ آپ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک عظیم تر نشانی تھے۔ اپنے عمل کے ذریعے بادشاہِ وقت کو جمعہ کے دن کھینچ لیا کرتے تھے اور اس سے مخلوقِ خدا کے کام کراتے اور لوگوں کی مشکلات کو دور کراتے، بادشاہ کو اپنے عمل سے اس طرح کھینچتے تھے کہ تسبیح کا ایک دانہ پھراتے تو بادشاہ جنبش میں آ جاتا اور دوسرا دانہ پھیرنے سے وہ آپ کے پاس آنے کا ارادہ کرتا اور تیسرا دانہ پھیرنے کے بعد وہ سوار ہو جاتا۔ اس طرح ہر دانے پر اس کی کیفیت کو بتلاتے رہتے۔ یہاں تک کہ جتنے دانے اس عمل کے لئے مقرر کر رکھے تھے ان دانوں کے ختم ہو جانے کے بعد بادشاہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرتا تھا۔

عبدالحق محدث دہلوی نے دلچسپ روایت بھی بیان کی ہے کہ ایک دفعہ آپ وضو کے لئے اپنے کمرے سے باہر گئے کہ اتنے میں ایک شریر لڑکا آپ کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کبھی آپ کو تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ اس راز سے آگاہ تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کی تسبیح اٹھائی اور جس طرح آپ اس تسبیح کے دانے گھماتے تھے، یہ بھی گھمانے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ فوراً چلا آیا۔ آپ ابھی غسل خانہ ہی میں تھے۔ بادشاہ کے اچانک اور خلافِ توقع پہنچنے پر بڑے حیران ہوئے۔ پھر تحقیق پر معلوم ہوا کہ آپ کی طرح اس شریر لڑکے نے تسبیح کے دانے گھمائے جس کے اثرات سے بادشاہ حاضر ہو گیا۔

مولانا احمد شرقی صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ جیسا کہ ''اخبار الاخیار'' میں رقم ہے کہ ''آپ کے شاگرد شیخ عبدالغنی سونی پتی کے پاس آپ کی کچھ تصانیف اور قلمی نسخے موجود تھے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ آپ صاحبِ تصانیف ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کی کوئی تصنیف بھی اب دستیاب نہیں۔''

البتہ انہوں نے صاحبِ کشاف، علامہ جاراللہ زمخشری کے اشعار کے جواب میں جو اشعار کہے تھے ان میں سے دو شعر ''اخبار الاخیار'' کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

علامہ زمخشری پانچویں صدی ہجری کی شخصیت ہیں اور حجۃ الاسلام امام غزالی کے ہم عصر ہیں۔ زمخشری جلیل القدر عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم المرتبت مفسرِ قرآن بھی ہیں۔ ان کی تفسیر کا نام ''کشاف'' ہے۔ اس حوالے سے صاحبِ کشاف کہلاتے ہیں۔ مفسرینِ قرآن میں زمخشری کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ''الکشاف'' ایک عالمانہ تصنیف ہے جو نحوی اور لسانی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور آئندہ اس نوعیت کی جو تفسیریں لکھی گئیں ان کا ماخذ یہی تفسیر ہے۔ اس تفسیر کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ علامہ زمخشری حنفی المذہب ہیں، حدائق الحنفیہ میں ان کے احوال مرقوم ہیں۔ لیکن بعض علماء نے ان پر معتزلی ہونے کا الزام عائد کیا ہے۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے علامہ زمخشری کے ایک مجموعہِ کلام ''دیوانِ کشاف'' کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس دیوان میں اہل سنت کی منظوم مخالفت کی گئی ہے۔ شیخ شاہ احمد شرقی ایک نامور عالم دین ہونے کے علاوہ ممتاز ادیب اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ انہوں نے علامہ زمخشری کے اشعار کا اسی وزن اور قافیہ میں جواب لکھا ہے... پہلے علامہ زمخشری کے دو شعر لکھے جاتے ہیں۔

وجماعة سموا هواهم سنة
و جماعة حمر لعمری موكفه

قد شبهوه بخلقه فتخوفوا
شنع الورى فتستروا بالكلفه

ترجمہ:

۱۔ ایک ایسا گروہ جس نے اپنی خواہشات کو سنت سمجھ رکھا ہے فی الواقع یہ گدھوں کا

ایک گروہ ہے جن پر پالان پڑے ہوئے ہیں۔

۲۔ اس گروہ نے خدا کو انسانوں سے تشبیہہ دی اور پھر لوگوں کی ملامت کے خوف سے تاویلات میں پڑ گئے۔

بعض علماء نے یہ اشعار علامہ زمخشری کی بجائے امام فخرالدین جاربردی کی طرف منسوب کئے ہیں جو قاضی بیضاوی کے شاگرد ہیں۔ شیخ شاہ احمد شرعی نے علامہ زمخشری کے اشعار کے جواب میں یہ شعر کہے

عجبا لقوم ظالمين تلقبوا

بالعدل مافيهم لعمری معرفه

قد جاء هم من حيث لايد رونه

تعطيل ذات الله مع نفی الصفه

ترجمہ:

۱۔ تعجب ہے ان ظالموں پر جنہوں نے ''اہلِ عدل'' کا لقب اختیار کیا۔ حالانکہ ان میں کوئی معرفت نہیں۔

۲۔ یہ لوگ فرقہ لا ادری کی مانند ہیں جو ذاتِ خداوندی سے اس کی صفات کو علیحدہ کر کے ذات پروردگار کو معطل بنانے پر تل گئے ہیں۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے شاہ احمد شرعی کا سنِ ولادت ۷۹۲ھ تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے چھیانوے سال کی طویل عمر پائی۔

شیخ شاہ احمد شرعی نے ۹۲۸ھ میں وفات پائی۔

جمال الدین حضرمی

شیخ جمال الدین حضرمی برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہونے والے مشاہیرِ اسلام میں بلند پایہ محدّث اور ممتاز فقیہ تھے۔ ان کا پورا نام و نسب یوں ہے: ''مولانا شیخ جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک بن عبداللہ بن علی حضرمی الشافعی۔'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ حضر موت میں پیدا ہوئے۔ شافعی المذہب تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حضر موت ہی کے اساتذہ وشیوخ سے حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے حصول کی خاطر وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ شیخ جمال الدین حضرمی نے ظاہری علوم سیکھنے کے ساتھ باطنی علوم کی طرف توجہ کی اور سلوک و معرفت کی منزلیں طے کر کے اعلیٰ روحانی مدارج پر فائز ہوئے۔

مؤرخین، تذکرہ نگاروں اور محققین نے شیخ جمال الدین حضرمی کے سوانح حیات بیان کرنے کے علاوہ اُن کی امتیازی خصوصیات اور دینی وعلمی خدمات بھی قلم بند کی ہیں۔

''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' کی دوسری جلد (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے ''النور السافر'' کے حوالے سے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''مولانا شیخ جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک ابن علی الحمیر ی الشافعی المعروف بحرق الحضرمی علماء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو دیارِ عرب سے سرزمین ہند میں وارد ہوئے اور عربی اور اسلامی علوم کے سلسلے میں یہاں اپنا فیض عام کیا اور شہرت پائی۔ وہ نہ صرف یہ کہ حضر موت کے علماء میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں بلکہ دیارِ عرب سے سرزمین برصغیر پاک و ہند میں آنے والے علماء میں

بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔''

مولانا عبدالحئی حسنی نے ''نزہتہ الخواطر'' میں محمد بن عمر آصفی کے حوالے سے شیخ جمال الدین حضرمی کے احوال و آثار بیان کئے ہیں اور انہیں ''الشیخ العلامة المحدث'' ایسے القاب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''محدث جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک بن عبداللہ بن علی حمیری حضرمی شافعی المشہور بہ بحرق محقق علماء اور مدقق فضلاء میں سے تھے۔''

شیخ بحرق حضرمی ۱۵ ماہ شعبان ۸۶۹ھ کو حضرموت میں پیدا ہوئے اور وہاں کے اساتذہ وشیوخ سے علوم متداولہ کی تعلیم و تربیت کا آغاز کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر فقہ کی کتاب 'الحاوی' منظومة البرماوی' اور پورا ''الفیہ ابن مالک'' زبانی یاد کیا اور حضرموت کے نامور فقیہ محمد بن احمد کی خدمت میں رہ کر اکتسابِ علم کیا اور پھر تلاشِ علم کے لئے سفر پر نکلے۔

صاحبِ نزہتہ الخواطر شیخ جمال الدین کی تعلیم اور ان کے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اپنے مولد ومنشا حضرموت کے اساتذہ سے اکتسابِ علم کے بعد شیخ جمال الدین زبید گئے اور یہاں کے شیوخ یعنی زین الدین محمد بن عبداللطیف شرجی سے حدیث کا درس لیا اور فقیہ جمال الدین محمد بن ابوبکر صائغ سے فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم حاصل کی اور شیخ سید حسین عادل سے خرقۂ طریقت حاصل کرنے کے علاوہ قطبِ دوراں شیخ فخر الدین شمس الدین شمس الشموس ابوبکر بن عفیف عیدروس کی خدمت میں رہ کر فیوض و برکات حاصل کئے۔
> ۸۹۴ھ میں حج کا فریضہ ادا کیا اور مکہ معظمہ میں قیام کے دوران حافظ شمس الدین السخاوی سے حدیث میں مستفید ہوئے۔ جب طریق تصوف پر گامزن ہوئے اور زبید میں چلہ کھینچنا شروع کیا تو ابھی چلہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ان کے ہر ہر عضو سے اللہ اللہ کی آواز آنے لگی۔''

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر ''نزہتہ الخواطر'' کے علاوہ ''النور السافر'' ''الضوء اللامع'' اور ''ظفر الوالہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''شیخ جمال الدین نے حضرموت میں اس زمانے کے مشہور فقیہ محمد بن احمد سے

استفادہ کیا اور پھر تلاشِ علم کے لئے سفر پر نکلے۔ سب سے پہلے وہ عدن پہنچے جہاں اس وقت کے امام عبداللہ بن احمد مخرم سے فقہ، اصولِ فقہ اور عربی ادب و لغت کی تعلیم حاصل کی اور الفیہ ابن المالک کا اعادہ کیا اور ''سیرت ابن ہشام'' کی سند بھی لی۔ اس کے علاوہ وہاں کے ایک اور مشہور عالم اور فقیہ محمد بن احمد سے بھی استفادہ کیا۔ پھر وہ یمن کے مشہور شہر زبید میں پہنچے جو اس زمانے میں علمی و ثقافتی مرکز تھا اور وہاں کے جلیل القدر علماء و فضلا اور ائمہ فن سے اسناد حاصل کیں۔ چنانچہ شیخ زین الدین محمد بن عبداللطیف الشرجی سے حدیث کی سند لی۔ فقیہِ دوراں شیخ جمال الدین محمد بن ابی بکر الصائغ سے اصول فقہ، تفسیر، حدیث اور نحو کی تعلیم کے علاوہ ''شرح السجة الوردیة لابی زرعه بھی پڑھی۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد شیخ بحرق حضرمی نے روحانی تربیت اور طریقت و تصوّف کی طرف توجہ دی اور زبید کے مشہور بزرگ السید الشریف الحسین بن عبدالرحمٰن الاعدل سے بیعت ہوئے۔ پھر طریقہ عیدروسیہ کے امام شمس الشموس شیخ ابوبکر بن عفیف العیدروس کی صحبت سے مستفیض ہوئے اور ان کے فیض و برکت کے آثار ان کی شخصیت پر نمایاں ہوئے۔

صاحب نزہۃ الخواطر کی تحقیق کے مطابق شیخ محمد بن بحرق حضرمی طلباء پر احسان کرتے تھے یعنی اُن کے ساتھ بہت عمدہ سلوک روا رکھتے تھے اور اربابِ علم و مکتب ان کے بہت قدر دان تھے۔ ان کا رجحان حق تعالیٰ کی طرف رہتا۔ مقام شجر میں منصب قضاء ملا۔ مگر آپ نے استعفیٰ دے دیا۔ عدن تشریف لے گئے تو وہاں کا رئیس مرجان عامری بنفس نفیس آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے لکھا ہے کہ ۸۹۴ھ میں شیخ بحرق حضرمی زیارت حرمین اور حج بیت اللہ کے لئے جب مکہ گئے تو اس دور کے عظیم مؤرخ و محدث امام شمس الدین الحافظ السخاوی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ان سے سماع کیا اور سند لی۔ سلطان عامر بن عبدالوہاب والیِ یمن نے زبید کی درس گاہوں پر توجہ مبذول کی اور نئے نئے مدارس قائم کرنا شروع کئے تو شیخ بحرق نے سلطان کی مدح کی۔ وہ کچھ عرصہ الشجر کے قاضی بھی رہے مگر کچھ مدت کے بعد ان کی طبیعت اکتا گئی اور شہزادہ مرجان العامری والیِ عدن کے پاس چلے گئے اور اس کی وفات کے بعد برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے۔

مولانا شیخ جمال الدین بحرق حضرمی نے تاریخ، سیرت نبویؐ، عقائد، علم الکلام، فقہ،

ادب، موسیقی، نحو، لغت، تفسیر اور حدیث کے مختلف موضوعات پر کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ ایک عمدہ ادیب اور نثر نگار تھے۔ شیخ عیدروس کی طرف سے عامر بن عبدالوہاب کے قصائد اور رسائل کا جواب دیتے تھے۔ ان کے یہ قصائد اور رسائل ان کی غیر معمولی علمیت وسعتِ معلومات اور زورِ بیاں کا بین ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک فصیح اللسان اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اہلِ زبان ہونے کی بنا پر لغت، ادب، نحو اور بلاغت پر مکمل دسترس رکھنے کے علاوہ عربی شاعری کی روایات سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ پھر ان کی تمام عمر ان ہی موضوعات کو پڑھنے پڑھانے میں گزری تھی۔ اس لئے نظم اور نثر دونوں ہی اصناف ادب میں ان کا اسلوب انتہائی دلکش دلآویز ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس اور سہل بھی ہے۔

شیخ بحرق حضرمی نے چھوٹے رسائل سے لے کر بڑی بڑی ضخیم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اپنے مختصر رسائل میں سے ایک رسالة فی اثبات رسالة هارونؑ و کفر فرعون میں دو اہم سوالوں یعنی حضرت ہارونؑ کی رسالت اور فرعون کی حالتِ کفر میں موت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اعلم ان القرآن كله كسورة واحدة يصدق بعضه بعضا و يفسر الآية منه الآية الاخرى فمن استدل بمفهوم آية معارضاً به صريح آية اخرى فقد اٰمن ببعضه و كفر ببعضه و يقولون نومن ببعض و نكفر ببعض و بريدون ان يتخذوا بين ذلك سبيلاً اولئك هم الكافرون حقا، فلا بد من الجمع بين آياته و رد متشابهاته الى محكماته كل من عند ربنا''

ترجمہ:

سن لے سارے کا سارا قرآن ایک سورۃ کی مانند ہے جس کے بعض حصے دوسرے حصوں کی تصدیق و تفسیر کرتے ہیں۔ پس جس نے ایک آیت کے مفہوم میں استدلال کرتے ہوئے دوسری آیت کی مخالفت کی تو وہ گویا بعض آیات پر ایمان لایا اور بعض سے کفر کیا... پس ضروری ہے کہ تمام آیاتِ قرآنی پر مجموعی نظر ہو اور متشابہات کو محکمات کے حوالے سے سمجھا جائے کیونکہ سب آیات ہمارے پروردگار کا کلام ہے۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر نے جن کتب تاریخ و تذکرہ کے حوالے سے شیخ بحرق حضرمی

کی سولہ تصانیف کی فہرست دی ہے ان ہی کے حوالے سے ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' کے مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے ان کی بیس کتابوں کی فہرست دی ہے اور وہ بھی اپنے تبصرے سے اور تعارف کے ساتھ۔ چنانچہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر لکھتے ہیں:

''شیخ بحرق حضرمی کی تصانیف میں سے یہ قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ تبصرہ الحضرة الشاهية الاحمدية بسيرة الحضرة النبوية الاحمدية، سیرت نبویؐ کے موضوع پر یہی وہ نادر کتاب ہے جو انہوں نے احمد المظفر بن محمود گجراتی کے لئے تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب سیرت نبویؐ کے موضوع پر متقدمین کی کتب سیرت کا ملخص اور نچوڑ ہے۔ مصنف نے چونکہ یہ کتاب احمد شاہ گجراتی کے لئے لکھی اور اسی کے نام سے معنون ہے اس لئے قدرتی طور پر انہوں نے بادشاہ کو سیرتِ رسولؐ پر عمل کر کے اسم بامسمیٰ بننے کی تلقین بھی کی ہے۔

۲۔ الاسرار النبوية فی اختصار الاذكار النوويه، مختصر الترغيب والترهيب للمنذری، ابو محمد عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری الشافعی (متوفی ۶۵۶ھ) کی مشہور کتاب الترغیب والترھیب، کا خلاصہ ہے جس میں نیک اعمال کی ترغیب دلانے اور برے اعمال سے اجتناب دلانے کے لئے احادیث نبویؐ کا انتخاب کیا گیا ہے۔

۳۔ الحديقة الانقيه فی شرح العروة الوثيقه، یہ شیخ بحرق حضرمی کے اپنے ایک قصیدے کی شرح ہے۔ جس میں انہوں نے شریعت و حقیقت کے درمیان موافقت و تطبیق میں کمال کر دیا ہے۔

۴۔ عقد الدرر فی الايمان بالقضاء والقدر، یہ کتاب مسئلہ قضا و قدر کے اہم موضوع پر ہے۔

۵۔ العقد الثمين فی ابطال القول بالتقبيح والتحسين

۶۔ الحسام المسلول علىٰ مبغضی الرسولؐ۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہؐ سے نفرت کرنے والا مرتد ہے۔

۷۔ العقيده الشافعية

۸۔ مختصر المقاصد الحسنة

۹۔ حلية البنات

۱۰۔ ذخیرة الاخوان

۱۱۔ ترتیب السلوک الی ملک الملوک

۱۲۔ متعة الاسماع باحکام السماع ۔ یہ کتاب موسیقی کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہے۔

۱۳۔ السماع

۱۴۔ مواھب القدوس

۱۵۔ شرح المحلة للحریری

۱۶۔ رسالہ فی الفلاح

۱۷۔ رسالة فی الحساب

۱۸۔ ارجوزہ فی الطلب

۱۹۔ فتح الروف فی معانی الحروف

۲۰۔ شرح لامیة ابن مالک مختصر شرح الصندی علی ندمیة العجم

شیخ بحرق حضرمی کی عالمانہ نگارشات اور ان کے علمی کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے لکھا ہے کہ ان کے کمالِ علم اور ذہانت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ گجرات آنے کے بعد ایک سال کے مختصر عرصے کے دوران نہ صرف یہ کہ انہوں نے سیرت نبویؐ پر ایک عمدہ کتاب لکھ کر اپنی قابلیت کا سکہ منوایا بلکہ والیِ گجرات کے اتنے مقرب بن گئے کہ وزراء تک ان سے حسد کرنے لگے اور یہی بات بالآخر ان کی موت کا سبب بن گئی۔ ع اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

ہمارے نزدیک ڈاکٹر ظہور احمد اظہر یہ لکھنے میں حق بجانب ہیں کہ شیخ بحرق حضرمی ایک نادر روزگار شخصیت تھے مگر حیرت ہے کہ اسلامی ہند کے مسلمان مؤرخین اور تذکرہ نگار ان کے بارے میں بالکل خاموش ہیں، حتیٰ کہ آزاد بلگرامی اور نواب صدیق حسن خان آف بھوپال ایسے متاخرین علماء تاریخ و تذکرہ نے بھی ان کا مطلق ذکر نہیں کیا حالانکہ مؤخرالذکر نے اپنی کتاب ''ابجد العلوم'' میں علماء عرب اور علماء یمن پر بھی الگ الگ باب باندھے ہیں مگر ان کے ضمن میں شیخ بحرق حضرمی کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

گویا کہ شیخ بحرق حضرمی ایسی ہمہ جہت دینی و علمی اور ادبی شخصیت جو بلند پایہ محدث، ممتاز فقیہ اور علومِ عربیہ کے نبیل القدر امام ہونے کے علاوہ ایک عارف باللہ اور

درجنوں اہم دینی و تبلیغی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، آج مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کی غفلت و کوتاہی یا تعصب و تنگ نظری کے باعث ایک فراموش شدہ شخصیت ہیں۔ صرف محمد بن عمر المکی الاصفی نے ''ظفر الوالہ'' میں ان کا اجمالی تذکرہ کیا ہے اور پھر دورِ جدید کے امام العربیۃ مولانا عبدالحئی لکھنوی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ذکر کیا ہے۔ مگر یہ تذکرہ بھی ''ظفر الوالہ'' کے علاوہ حافظ سخاوی کی ''الضوء اللامع'' اور العیدروسی کی ''النور السافر'' سے ماخوذ ہے۔ بہرحال شیخ بحرق الحضرمی کی عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا۔ کیونکہ سخاوی جیسا ثقہ نقاد اور محدث بھی اپنے اس شاگرد کی تعریف کرتا ہے اور العیدروسی انہیں علماء حضرموت میں سب سے ممتاز اور بہتر قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ شیخ الحضرمی اللہ کی آیات میں سے ایک آیت تھے۔ ان کی کتابیں، ان کے تبحر علمی اور کثرتِ مطالعہ پر دلالت کرتی ہیں اور وہ تحقیق، جودتِ فکر اور باریک بینی میں بلندیوں پر پہنچے ہوئے تھے۔

اربابِ علم و دانش اور اہلِ تحقیق کا فرض ہے کہ تاریخ اسلام کی ان تمام فراموش شدہ شخصیات کے احوال و آثار اور اُن کی امتیازی خصوصیات، تحقیقی و تخلیقی تصنیفات اور دینی و علمی خدمات پر روشنی ڈالیں تاکہ قارئین اپنی اسلاف اور بزرگانِ دین کے کارہائے نمایاں سے آگاہ ہوسکیں۔ ظاہر ہے اس کے لیے بڑی محنت و کوشش اور تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔ مگر زندہ قوموں کی یہ نشانی ہے کہ نہ تو وہ اپنے محسنوں کو کبھی فراموش کرتی ہیں اور نہ ان کے دینی و علمی اور تاریخی کارناموں سے صرفِ نظر کرتی ہیں۔ بلکہ انہیں ہر حالت اور ہر صورت میں اپنی تہذیب و ثقافت اور تمدن میں زندہ و تابندہ رکھنے کا اہتمام کرتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو پھر وہ اپنے محسنوں کو کم از کم اوراقِ تاریخ میں تو ضرور محفوظ کر لیتی ہیں تاکہ ان کی یاد اُن کے لیے طاقت و توانائی کا سبب بنی رہے اور آنے والی نسلیں اُن کے بارے میں مزید تحقیق کر کے ان کے اصل مرتبہ و مقام اور اُن کی خدمات سے پوری طرح آشنا ہوسکیں۔

حضرت مولانا شیخ جمال الدین محمد المعروف بہ بحرق الحضرمی نے ۲۰ شعبان ۹۳۰ھ کو وفات پائی۔

عزیز اللہ تلنبی

مولانا عزیز اللہ اپنے زمانے کے نامور علماء وفضلا میں شمار ہوتے تھے۔ انتہائی ذہین و زیرک اور صاحبِ فہم و فراست ہونے کے علاوہ اپنے علم وفضل اور عبادت و ریاضت کے لئے بھی مشہور تھے۔ بہت کم آمیز تھے اور اپنا زیادہ تر وقت درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور علمی مباحث میں گزارتے تھے۔ کبھی کبھی مناظروں میں بھی شریک ہو جاتے تھے، حنفی المذہب تھے۔

ملتان کے مقامی دانش ور منشی عبدالرحمٰن خان مولف ''آئینۂ ملتان'' کی تحقیق کے مطابق مولانا عزیز تلنبی نامور عالمِ دین اور یگانہ روزگار شخصیت مولانا عبداللہ تلنبی کے بھائی تھے۔

مولانا عبدالحئی حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کے احوال ''اسراریہ'' کے حوالے سے بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ:

> ''الشیخ الفاضل العالمۃ' عزیز اللہ حنفی تلنبی ملتانی ثم سنبھلی یکے از علمائے عاملین و ائمہ محققین تھے۔ سلطان سکندر لودھی کے عہد میں دہلی آئے اور سنبھل پہنچ کر اقامت فرما ہو گئے۔ درس و افادہ میں محو ہو گئے۔ بے حد ذہین و طباع اور عبادت گزار اور قلیل الاختلاط اور تقویٰ پسند تھے۔ اصول و کلام اور فلسفہ و منطق و حکمت، شعر و ادب اور دیگر علوم پر حاوی تھے۔ شیخ نظام الدین خیر آبادی اور شیخ ابن ابو حاتم سنبھلی اور دیگر بے شمار افراد نے مولانا عزیز سے اکتسابِ علم کیا۔''

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے مختلف تاریخی حوالوں سے ان کے حالاتِ زندگی اور دینی و علمی کارنامے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''مولانا شیخ عزیز اللہ تلنبی ملتانی سنبھلی، جو مولانا عبداللہ تلنبی کے معاصر، ہم وطن اور غالباً عزیز بھی تھے، اپنے وقت کے عالمِ باعمل، بلند پایہ محقق، صاحب رُشد و ہدایت اور دانشمند فاضل تھے۔ وہ بھی مولانا عبداللہ کی طرح ملتان کی تباہی کے بعد دہلی میں آ گئے تھے اور پھر سنبھل میں مستقل سکونت پذیر ہوئے اور وہیں اپنا حلقۂ درس قائم کر کے سنبھل کو ارشاد و تلقین کا مرکز بنا لیا۔ شیخ عزیز اللہ جب ملتان سے دہلی آئے تو اس وقت سلطان سکندر لودھی حکمران تھا۔''

منشی عبدالرحمٰن خان مؤلف ''آئینہ ملتان'' کی تحقیق کے مطابق مولانا عبداللہ، مولانا عزیز اللہ کے بھائی تھے اور ملتان کے نواحی قصبہ تلنبہ کے رہنے والے تھے۔ علامہ تفتازانی کی کتاب شرح شمسیہ اور شرح عقائد میں انہی حضرات نے اضافے کیے۔ مورخین نے ان دونوں بھائیوں کو عہدِ سکندری کے انقلاب کا بانی قرار دیا ہے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ سلطان سکندر لودھی خود تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ علم دوست، علماء کا قدردان اور ایک خوش فکر شاعر بھی تھا اور ''گلرخی'' تخلص کرتا تھا۔ بہت سے علماء و فضلاء اور شعراء اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ سلطان سکندر نے پایۂ تخت دہلی سے آگرہ میں منتقل کیا تو علماء و فضلاء کا رجحان نئے دارالسلطنت کی طرف ہو گیا۔ سلطان سکندر نے حکم دے رکھا تھا کہ فوجی افسر سب تعلیم یافتہ ہونے چاہئیں۔ اس نے متعدد شہروں بالخصوص نروار اور متھرا میں بہت سے مدارس قائم کیے۔ لودھی خاندان کے بعد برصغیر میں برسرِ اقتدار آنے والے مغل فرمانروا اکبر کی طرح سلطان سکندر بھی مذہبی مباحثات کے سننے کا بے حد شائق تھا۔ چنانچہ کتب تاریخ میں اس کے دربار میں ہونے والے مناظروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جو علماء اس کے دربار سے مستقل طور پر وابستہ تھے ان میں سید صدرالدین قنوجی اور میاں عبدالرحمٰن کے علاوہ مولانا عزیز اللہ سنبھلی خاص طور قابل ذکر ہیں۔ ان علماء کرام کے علاوہ لودھی سلطان دہلی، تلنبہ، سرہند، قنوج اور دوسرے شہروں کے علماء کو بھی کبھی کبھی مباحثات میں شرکت کے لیے آگرہ طلب کر لیا

کرتا تھا۔

سلطان سکندر لودھی کے دربار میں نہ صرف برصغیر پاکستان و ہند کے علماء کا جمگھٹا لگا رہتا تھا بلکہ بیرونی ممالک بالخصوص عرب، ایران، بلخ، بخارا وغیرہ اسلامی علوم کے اہم مراکز کے بہت سے علماء و فضلاء تیموری حملہ آوروں کے مظالم سے اپنی جان اور عزت و آبرو بچا کر آگرہ میں جمع ہو گئے تھے۔ جن کی سلطان نے مناسب پذیرائی کی اور انہیں انعام و اکرام سے مالا مال کرنے کے علاوہ زمینیں اور جاگیریں بھی عطا کیں۔ اس کے ایک امیر مسند علی خان کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی صاحبِ علم جو اس امیر کا وظیفہ یاب ہوتا، انتقال کر جاتا تو وظیفہ اس کے وارثوں پسماندگان کی طرف منتقل کر دیا جاتا اور وفات پانے والے عالم اپنے پیچھے بیوی چھوڑ جاتا تو اس خاتون سے کہا جاتا کہ وہ کسی کو اپنا متبنیٰ کرے۔ امیر مسند علی اس متبنیٰ کو اپنے خرچ پر تعلیم دلواتا اور جنگی فنون خاص طور پر تیراندازی اور شہسواری کی تربیت دلاتا۔ سلطان سکندر لودھی کے امراء بھی علم دوست اور علماء کے قدردان ہونے کے ساتھ ساتھ فیاضی و سخاوت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

شیخ محمد اکرام نے ''آبِ کوثر'' میں ''خاندان لودھی'' کے احوال بیان کرتے ہوئے مولانا عزیز اور مولانا عبداللہ تلنبی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''بہلول لودھی کی وفات کے بعد سکندر لودھی تخت نشیں ہوا۔ سکندر ایک قابل اور بیدار مغز بادشاہ تھا اس نے آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کا بہت سا وقت افغان امراء اور اٹاوہ، چندیری اور گوالیار کے ہندو راجاؤں سے لڑائی میں گزرا۔ لیکن پھر بھی اس نے علم و فن کی طرف بہت توجہ کی۔ اس کے زمانے میں ملتان کے دو بڑے عالم شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز اللہ تلنبی دہلی تشریف لائے۔ انہوں نے درس و تدریس کے معیار کو بہت بلند کیا۔''

منشی عبدالرحمٰن خان نے اپنی تالیف ''آئینہ ملتان'' میں مولانا عزیز اللہ اور مولانا عبداللہ کے احوال بیان کئے ہیں اور ان کے اسماء گرامی کے ساتھ ملتانی کے لاحقے لگائے ہیں اور ملتان سے ان کی ہجرت کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''تیموری حملوں کے اثر سے رونقیں سمٹ کر جونپور پہنچ گئیں اور دہلی کے بازار سونے ہو گئے۔ ملتان میں سیاسی بحران کی بدولت جو طوائف الملوکی

پہلی اس سے ملتان کا دبستان علم و عرفان بھی اجڑ گیا اور یہاں کے علماء و مشائخ نے ملتان کو چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کیا۔ ان میں مولانا عزیز اللہ بھی تھے جو اپنے بھائی مولانا عبداللہ کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ سلطان سکندر لودھی نے مولانا عبداللہ کو اپنے پاس رکھ لیا اور مولانا عزیز اللہ کو سنبھل (مراد آباد) بھیج دیا جو اس علاقے کا مرکزی شہر تھا۔''

شیخ محمد اکرام نے مولانا عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی کی یہ عبارت بھی نقل کی ہے:

''ایں ہر دو عزیزان ہنگام خرابیِ ملتان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند و قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از منطق و کلام در ہند شائع نہ بود۔''

مولانا عبداللہ تلنبی اور مولانا عزیز اللہ تلنبی نے قاضی عضد کی تصانیف ''مطالع'' اور ''مواقف'' کے علاوہ سکاکی کی کتاب ''مفتاح العلوم'' کو داخلِ نصاب کیا۔ اور یہ تینوں کتابیں بہت جلد مقبولِ عام ہو گئیں۔ بادشاہ ان دونوں علماء یعنی مولانا عبداللہ اور مولانا عزیز اللہ کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ڈاکٹر ظہور نے ''تذکرۂ علمائے ہند'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''شیخ عزیز اللہ بڑے ذہین تھے اور مشکل کتابیں منتہی طلبہ کو پڑھاتے تھے اور مشکل سے مشکل سوال کا تسلی بخش اور فوری جواب دیتے تھے۔ آپ کے تلامذہ میں سے شیخ نظام الدین حیدر آبادی اور شیخ حاتم سنبھلی کا نام قابلِ ذکر ہے۔''

ڈاکٹر میاں محمد سعید نے ''تذکرہ مشائخ شیراز ہند'' میں مولانا الہداد محشی جونپوری کے احوال بیان کرتے ہوئے ایک تاریخی مناظرے کا ذکر کیا ہے اور ''تجلی نور'' اور تذکرہ علمائے ہند کے حوالے سے لکھا ہے:

''مولانا الہداد جونپوری کا تبحرِ علمی بے مثال تھا اور اس دور کے تمام علماء و صلحا ان کا علمی سکہ مانتے تھے۔ ان کے فرزند ارجمند شیخ بہکاری جونپوری بھی بڑے پایہ کے عالم تھے وہ سلطان سکندر لودھی کے دورِ حکومت میں علمائے فحول میں سے تھے۔ سلطان سکندر ان کے علمی تبحر کا قائل تھا۔ سلطان کو چونکہ علمی بحث و مباحثہ کا بڑا شوق تھا اس لئے اس نے ایک روز اپنی سلطنت کے بعض نامور علماء کا اجلاس منعقد کیا جس میں شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ

عزیز اللہ تلنبی کو ایک طرف اور مولانا الہداد اور ان کے بیٹے شیخ بہکاری کو دوسری طرف کھڑا کر دیا۔ فریقین میں زبردست مقابلہ ہوا۔ آخر میں سلطان نے یہ فیصلہ دیا کہ شیخ عبداللہؒ اور شیخ عزیز اللہؒ تقریر میں مولانا الہداد اور ان کے صاحبزادے تحریر میں بہتر ہیں۔''

اس مرحلے پر اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مناظرے کا تعلق تقریر و کلام کے ساتھ ہے نہ کہ تحریر کے ساتھ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سکندر نے مولانا الہداد اور شیخ بہکاری کا دل رکھنے کے لئے یہ جملہ کہہ دیا ہوگا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اس مناظرے میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ ہی کا پلہ بھاری رہا جیسا کہ مولوی رحمان علی نے ''تذکرہ علمائے ہند'' میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ کے بارے میں بڑے واضح اور واشگاف الفاظ میں لکھا ہے۔ ''وہ تحریر و تقریر دونوں میں یکتائے روزگار تھے۔''

شیخ عزیز اللہ صاحبِ تصنیف بزرگ ہیں۔ مولانا عبدالقدوس نے لکھا ہے کہ ''آپ کی تصانیف میں سے ''رسالہ عینیۃ'' قابل ذکر ہے جو آپ نے شیخ امان اللہ پانی پتی کے ''رسالہ غیریہ'' کے جواب میں تحریر کیا تھا۔

ممتاز عالمِ دین اور تحریر و تقریر میں یگانۂ روزگار شیخ عزیز اللہ تلنبی سنبھلی نے ۹۳۲ھ میں وفات پائی۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی برصغیر پاکستان وہند کے نامور علماء و مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے کئی روحانی سلاسل سے فیض حاصل کیا جن میں سلسلہ عالیہ چشتیہ اور اس کی ایک شاخ صابریہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس کے بانی مخدوم احمد علاء الدین صابر ہیں۔ حضرت مخدوم احمد صابر جن کا مزار کلیر شریف (بھارت) میں ہے شیخ الشیوخ حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر کے اکابر خلفاء میں سے تھے۔ اُن کے حالات مستند معاصرانہ تذکروں میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بہرحال شیخ عبدالقدوس گنگوہی بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے اور ایک زمانے نے اُن سے فیوض و برکات حاصل کیں۔ اُن کے مریدوں اور خلفاء میں حضرت مجدد الف ثانی کے والد گرامی شیخ عبدالاحد، شیخ عبدالغفور اعظم پوری اور شیخ جلال الدین تھانیسری مصنف ''تحقیق اراضی ہند'' ایسی عظیم روحانی شخصیات شامل ہیں جس سے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے تبحر علمی اور روحانی مرتبہ و مقام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے حضرت گنگوہی کے احوال و آثار بیان کیے ہیں۔ ان سے بہت سی کشف وکرامات بھی منسوب ہیں۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' چوتھی جلد (فارسی ادب: دوم) کے فاضل مقالہ نگار حامد خان حامد نے اپنے تحقیقی مقالے بعنوان ''تصوف'' میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے احوال و آثار بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

> ''شیخ عبدالقدوس گنگوہی شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالخالق چشتی صابری کے مریدوں میں سے تھے۔ اگرچہ شیخ محمد سے بیعت

تھی لیکن اویسی نسبت غالب تھی۔ باطنی سلسلہ شیخ احمد عبدالخالق
سے مربوط تھا۔ انہیں سے آپ کی روحانیت مکمل ہوئی۔ آپ عالمِ
باعمل تھے۔ نیکی، شرافت اور ترک علائق کے داعی، دین کے تفوق
کے قائل اور شریعت کے سختی سے پابند تھے۔''

مفتی غلام سرور لاہوری نے ''خزینۃ الاصفیاء'' میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بارے میں صاحب ''معارج الولایت'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''آپ مادر زاد ولی تھے۔ ایام طفولیت میں بھی جو کچھ آپ کی
زبان سے نکلتا من وعن پورا ہوتا تھا۔ آپ کسبِ حلال کے قائل
تھے اور زراعت سے شغف رکھتے تھے۔ غلہ تیار ہوتا تو اپنے لیے
صرف بقدر ضرورت رکھتے اور باقی درویشوں میں تقسیم کر دیتے
تھے۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبارالاخیار'' میں لکھا ہے کہ شیخ عبدالقدوس کے بہت سے مرید اور خلفاء تھے جن میں سے بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ شیخ بھورو، شیخ عمر، شیخ عبدالغفور پوری۔ آپ کی اولاد میں شیخ رکن الدین اور شیخ عبدالکبیر بالا پیر معروف ہیں۔ آخرالذکر اپنے والد کی وفات کے بعد مسند مشیخت پر بیٹھے۔

حضرت شیخ عبدالقدوس چونکہ اکثر سکر و مستی کے عالم میں رہتے تھے اس لیے زبان مبارک سے بعض ایسے کلمات نکلے جنہیں اُن کی شطحیات قرار دیا جا سکتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں شطحیات ان الفاظ و کلمات کو کہتے ہیں جو عالم سکر و مستی میں صوفیہ کرام کی زبان سے نکلتے ہیں۔ جو عوام الناس اور اہل ظاہر کے لیے ناقابل فہم ہیں اور اُن کے ظاہری معنی پر عمل کرنا بعض اوقات گمراہی کا سبب ہوتا ہے۔ شطحیات دراصل صوفیہ کرام کے رموز و کنایات ہیں ان سے صحیح مفہوم کا استخراج کرنا اہلِ بصیرت کا کام ہے۔ شطحیات کی بناء پر کسی بزرگ کے متعلق سوء ظن رکھنا درست نہیں۔ ''کشاف الاصطلاحات الفنون'' میں شطح کے بارے میں کہا گیا ہے:

''فلا قبول له ولا رد له لا یوخذ ولا یواخذ''

یعنی اسے قبول کیجیے نہ رَد اور نہ اس پر اخذ مواخذہ ہو۔

قبول اس لیے نہیں کہ عالمِ سکر کی بات ہے، رَد اس لیے نہیں کہ عارف کی زبان سے نکلی

ہے۔ ممکن ہے اس کا اشارہ کسی ایسے معنی کی طرف ہو جو دوسروں سے مخفی ہو۔ اس بناء پر قابل مواخذہ بھی نہیں۔

فاضل مقالہ نگار حامد خان حامد نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی متعدد شطحیات کے حوالے دے کر لکھا ہے:

> ''ایک دفعہ آپ کے منہ سے ایسے کلمات شطحیات نکلے جن کا تعلق معراج نبویؐ سے ہے۔ مثلاً فرمایا: '(حضرت) محمد مصطفیٰ در قاب قوسین او ادنیٰ و رفت و باز گردید، واللہ ما باز نگردیم: پھر فرمایا کہ 'محمد مصطفیٰ عہدہ دار و لنگر دار تھے اس لیے تشریف لے آئے لیکن ہم جان باختہ و جہان تافتہ تھے کیسے لوٹ سکتے تھے۔' شیخ کا اشارہ عہدہ داری اور لنگر داری سے مرتبۂ ختم نبوت اور مقام رسالت کی طرف تھا۔ لنگر سے آپ کی مراد وہ دعوت عامہ تھی جس کے لیے آنحضرتؐ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ پھر آپ نے اُسی کیف و سرمستی میں کہا: 'خدا ہی جانتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔'''

حکیم الامت علامہ اقبال نے اپنے سات خطبات میں سے پانچویں خطبے ''اسلامی ثقافت کی روح'' کا آغاز ہی شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ان شطحی کلمات سے کیا ہے۔ علامہ اقبال کے یہ خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' (Reconstruction of Religious Thoughts in Islam) کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال اپنے خطبے کا آغاز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"MUHAMMAD of Arabia ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached that point, I should never have returned.' These are the words of a great Muslim saint, Abdul Quddus of Gangoh. In the whole range of Sufi literature it will be probably difficult to find words which, in a single sentence, disclose such an acute perception of the psychological difference between the prophetic and

the mystic types of consciousness. The mystic does not wish to return from the repose of 'unitary experience'; and even when he does return, as he must, his return does not mean creative. He returns to insert himself into the sweep of time with a view to control the forces of history, and thereby to create a fresh world of ideals."

''محمد عربیؐ بر فلک الافلاک رفت و باز آمد۔ واللہ گر من رفتمے ہرگز باز نیامدے''
یہ مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے الفاظ ہیں جن کی نظیر تصوف کے سارے ذخیرۂ ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ شیخ موصوف کے اس جملے سے ہم اس فرق کا ادراک نہایت خوبی سے کر لیتے ہیں جو شعورِ ولایت اور شعورِ نبوت میں پایا جاتا ہے۔ صوفی نہیں چاہتا کہ وارداتِ اتحاد میں اسے جو لذت اور سکون حاصل ہوتا ہے اسے چھوڑ کر واپس آئے۔ لیکن اگر آئے بھی جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے تو اس سے نوعِ انسانی کے لیے کوئی خاص نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے نبی کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے، وہ اس واردات سے واپس آتا ہے تو اس لیے کہ زمانے کی رَو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ و تصرف سے جو عالم تاریخ کے صورت گر ہیں، مقاصد کی ایک نئی دُنیا پیدا کرے۔''

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کے مقالہ نگار حامد خان حامد نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی کتاب ''انوارالعیون'' کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ کی اس کتاب میں شیخ احمد کے مناقب درج ہیں۔ اُن کی کرامات اور خوارق کا بیان ہے —— ''انوارالعیون'' کی ترتیب سات فنون پر ہے۔ فنون اول میں شیخ احمد عبدالحق (متوفی ۱۴۳۴ء) کے مناقب لکھے ہیں جن پر آپ کا اعتقاد محبت کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس باب یا فن میں آپ نے اس بات کی توجیہہ کی ہے کہ شیخ صاحب موصوف ''حق'' کے اسم کو اسمائے الٰہی میں سب سے بہتر کیوں جانتے تھے۔ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کے خیال کے مطابق اسم حق کے معنی جملہ کمالات کے سزاوار اور ثابت بذات ہیں، جب کہ دوسرے

اسماء صرف ایک ایک صفت خداوندی کا اظہار کرتے ہیں۔ ''رسالہ قدسیہ'' میں گرسنگی کے معانی میں آپ نے لکھا ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں: سفلی اور علوی۔ سفلی تمام حیوانات کی ہے اور عروج سے محروم ہے۔ علوی تمام خاص و عام انسانوں کو حاصل ہے۔ یہ معدہ بشر میں فطری طور پر رکھی گئی ہے۔ بڑی تیز ہے، کثافت کو لطافت اور انسانیت کو رحمانیت کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ خاصیت دوسرے حیوانات میں نہیں اور انسان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ آپ کی دوسری تصنیفات یہ ہیں: نورالہدیٰ، رسالہ رشیدیہ، قرۃ العین، مکتوبات قدوسیہ، لطائف قدوسی، اسرار العجائب اور رسالہ قدسیہ۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی وحدت الوجود کے زبردست مبلغ تھے۔ انہوں نے صابریہ سلسلے کو ہر طرف پھیلایا اور اپنے زمانے کے امراء کو اتباع شریعت کی تلقین کی۔ انہوں نے سلاطین کی خطوط کے ذریعے اصلاح کی کوشش کی۔ ان کے کئی بیٹے تھے جو سب کے سب عالم، عبادت گزار اور لباسِ مشیخت سے آراستہ تھے۔ ان میں شیخ رکن الدین بڑے برگزیدہ بزرگ ہوئے ہیں۔ اُن کے پوتے شیخ عبدالنبی تھے جو اکبری دور میں مسندِ صدارت پر بھی فائز ہوئے۔ لیکن اولاد کی نسبت شیخ عبدالقدوس کے عالی حوصلہ خلفاء نے اُن کے کام کو بحسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ جاری رکھا۔ ان میں شیخ جلال الدین تھانیسری اور شیخ عبدالغفور اعظم پوری خاص طور پر مشہور ہیں۔

لودھی سلاطین شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے فضل و کمال کے قائل و معترف تھے اور اُن کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ حضرت شیخ کا پہلے ردولی میں قیام تھا۔ پھر گنگوہ ضلع سہارنپور میں سکونت اختیار کر لی اور ساری زندگی وعظ و ارشاد، تبلیغ اسلام اور لوگوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت میں گزار دی۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں وفات پائی۔

شاہ عبدالرزاق جھنجھانوی

شاہ عبدالرزاق جھنجھانوی اپنے زمانے کے اجل علماء وفضلاء اور ممتاز مشائخ میں سے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرزند محمد بن حنفیہ سے جا ملتا ہے۔ شیخ شاہ محمد حسن قادری کے شاگردِ رشید اور مریدِ خاص تھے۔ ان کا نام ونسب یوں ہے:

عبدالرزاق بن احمد بن محمد فاضل ابن عبدالعزیز نورالدین بن کمال الدین بن ابو سعید علوی رازی جھنجھانوی۔

شاہ عبدالرزاق ۸۴۲ھ میں پیدا ہوئے اور قرآن مجید حفظ کر کے چھوٹی عمر ہی میں علوم متداولہ میں کمال حاصل کرلیا۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن جھنجھانہ کے علاوہ برصغیر کے متعدد علمی مراکز میں جا کر اپنے زمانے کے معروف وممتاز اساتذہ ومشائخ سے اکتسابِ علم کیا۔

محمد غوثی مندوی نے ''گلزارِ ابرار'' میں شیخ عبدالرزاق کے احوال بیان کئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> ''آپ خانوادہ قادریہ کے سربرآوردوں میں سے ہیں۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی سے روحانی نسبت کی بدولت بہت سے فیوض وبرکات حاصل کئے اور شیخ شاہ محمد حسن قادری کی خدمت میں رہ کر دوام مشاہدہ کے مقام پر فائز ہوئے۔ اور محمدیؐ ہدایت کے طریقے پر عزم واستقامت کے ساتھ ثابت قدم رہ کر دانش وبینش حاصل کی۔ ظاہری علوم میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اور

عبادت و ریاضت اور مجاہدات میں بھی بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ کثرتِ عبادت و ریاضت اور ذکر و فکر الٰہی کے باعث اپنے نفس کو قابو میں رکھتے تھے۔ طالبانِ حق سے ہمیشہ محبت و مروّت سے پیش آتے اور غریبوں، محتاجوں اور مسکینوں کی امداد اور خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے... اپنے علمی و روحانی کمالات کی وجہ سے عوام و خواص میں مشہور و مقبول تھے۔ سخن گوئی کا ملکہ بھی حاصل تھا اور کلام عمدہ پسندیدہ ہوتا تھا۔ علماء، فضلا اور غربا و صلحاء کے علاوہ بڑے بڑے امراء اور صاحبِ منصب افراد بھی آپ کے عقیدت مند تھے۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی ''اخبار الاخیار'' میں شیخ عبدالرزاق کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''آپ شیخ محمد حسن کے مرید و خلیفہ تھے۔ اور سلسلۂ قادریہ کے مشائخ میں سے صاحب حال و کمال تھے۔ آپ نے ابتدائے عمر ہی میں علم دین حاصل کیا۔ عشق و محبت کا مشرب غالب تھا۔ بے حد عبادت و ریاضت اور مجاہدات کے بعد مرتبہ مشاہدہ پر پہنچے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ کو سلسلہ عالیہ قادریہ سے گہری نسبت تھی اور آپ بلاواسطہ بانیِ سلسلۂ قادریہ حضرت غوث الاعظم سے فیض حاصل کرتے تھے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ بغیر واسطہ کے حضرت سے مستفیض ہوں۔ مصائب و شدائد میں ہمیشہ ثابت قدم رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نواب نے ایک سید کو قیدی بنا لیا۔ آپ نے جب اس کو قید خانہ میں دیکھا تو بغیر کسی شناسائی کے اس کو ضمانت پر رہا کرا لیا اور بعد میں اس سید سے کہا کہ تم اس شہر سے کہیں دور چلے جاؤ۔ میں تمہارے بدلے میں جیل میں بند ہوں گا۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ پر بے حد مصائب آئے، سب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور کسی پر اپنا حال ظاہر نہیں کیا۔''

سید عبدالحئی حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' جلد چہارم میں شیخ عبدالرزاق کے احوال بیان

کئے ہیں۔ ان کی ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت اور ان کے اساتذہ و مشائخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ''الشیخ الغانم، عبدالرزاق بن احمد بن محمد فاضل علوی رازی محمد بن حنفیہ کی اولاد سے تھے۔ ۸۸۶ھ میں قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد مولانا جلال جھنجھانوی سے مختصر رسائل پڑھے۔ پھر مزید تعلیم کی غرض سے دہلی پہنچے اور وہاں عبداللہ تھٹوی کے مدرسہ میں پانچ سال تک درسیات پڑھتے رہے۔ پھر کالپی اور کورہ میں جا کر اکتسابِ علم کیا۔ پھر دہلی واپس آ کر مدرسہ ملا عبداللہ میں مزید تحقیق کی۔ بعد ازاں اسی مدرسہ میں تیس برس تک درس دیتے رہے۔ جب طریقت کی طرف مائل ہوئے تو شیخ محمد بن حسن جونپوری، شیخ مودود لاری اور سید اسماعیل قادری سے سلسلۂ قادریہ میں اور شیخ نور بن حامد حسینی مانک پوری سے سلسلۂ چشتیہ میں خلافت و اجازۃ حاصل کی اور ان شیوخ کی خدمت میں برسوں باریاب رہے حتیٰ کہ کشف و شہود کے حجاب اٹھ گئے۔''

شیخ عبدالرزاق، شیخ امان پانی پتی کے ہم عصر تھے۔ دونوں بزرگ صوفی المشرب اور توحید پرست تھے۔ دونوں سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے مسلک پر تھے اور وحدت الوجود کے قائل تھے۔ دونوں کے بعض اساتذہ و مشائخ مشترک تھے۔ مثلاً دونوں حضرات نے شیخ محمد مودود لاری سے علمی و معنوی استفادہ کیا۔ دونوں حضرات نے ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحاتِ مکیہ'' کا بغور مطالعہ کیا اور ان دو کتابوں سمیت تصوّف کی بعض دوسری کتابوں کا باقاعدہ درس لیا۔ دونوں حضرات انتہائی زاہد و پارسا، متقی و پرہیزگار اور غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کے مددگار تھے۔ دونوں کے اخلاق و عادات انتہائی عمدہ و پسندیدہ تھے۔ دونوں حضرات اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ، اخلاص و ایثار اور خدمتِ خلق کی وجہ سے نہ صرف مشہور تھے بلکہ عوام و خواص دونوں ان بزرگوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دینی و علمی حلقوں میں دونوں بزرگوں کا غیر معمولی ادب و احترام کیا جاتا تھا۔ دونوں بزرگوں کا اپنا اپنا حلقۂ درس اور حلقۂ اثر تھا اور دونوں بزرگوں کے بے شمار تلامذہ، مرید اور معتقدین تھے۔ اور دونوں حضرات دوام مشاہدہ کے مقام پر فائز تھے اور دونوں حضرات نہ صرف وحدت الوجود کے قائل تھے بلکہ انہوں نے نظریہ وحدت الوجود کو سمجھنے اور سمجھانے میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا تھا، ان سب باتوں کے مشترک ہونے کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ وحدت الوجود کے بارے میں ان دونوں بزرگوں کے نظریات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ''تاریخ ادبیاتِ

مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس نے شیخ امان پانی پتی کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شیخ امان اللہ پانی پتی نے مودود لاری سے ''فصوص الحکم'' پڑھی، وحدت الوجود کے قائل تھے۔ مگر عبدالرزاق جھنجھانوی کی طرح ممکنات کو عین واجب نہیں سمجھتے تھے۔''

شیخ امان پانی پتی اور مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی کا نظریہ وحدت الوجود کو سمجھنے اور اس کو پیش و بیان کرنے میں اختلاف انتہائی توجہ طلب، معنی خیز اور فکر انگیز ہے اور اس سے مفید و مثبت نتائج اخذ کر کے بہت سی قباحتوں، بحث مباحثوں اور مناظروں کے علاوہ مذہبی و مسلکی تفریق و تقسیم کی دل آزاریوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ مزید برآں ان بزرگانِ دین کی ''وحدت الوجود'' کی تشریح و توضیح میں باہمی اختلافات سے کئی مشکلات کی وضاحتیں بھی ہو جاتی ہیں۔

قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ وحدت الوجود ایک خالص علمی مسئلہ ہی نہیں بلکہ ایک عرفانی اور وجدانی مسئلہ ہے۔ چنانچہ اسے علمی اور عرفانی سطح پر صبر و تحمل، گہرے غور و فکر، دقت نظر اور وسعتِ مطالعہ کے ذریعے انتہائی سنجیدہ و پاکیزہ ماحول میں افہام و تفہیم کے عاقلانہ زاویۂ نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔ اس کو سمجھنا سمجھانا بلاشبہ ہر عالم، ماہر، عارف کے بس کی بات نہیں ہے۔ پھر ہر شخص بلکہ ہر عالم یا عارف کا اپنا ایک خاص مزاج اور اس کی اپنی افتادِ طبع ہے۔ اس کے علم حدیث، فقہ، اصول فقہ، منطق اور علم الکلام میں مطالعہ و مہارت کی اپنی ایک سطح اور معیار ہے۔ پھر وحدت الوجود ایسے اہم اور نازک مسئلے کے فہم و ادراک کے لیے عبادت و ریاضت، زہد و تقویٰ اور خشیت الٰہی کے علاوہ ایک خاص میلان طبع بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں عرفان الٰہی، وجدان اور کشف و مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ ایسی صفات ہیں جن سے ہر عالم، ماہر، عارف اور ہر زاہد اور متقی و پرہیزگار شخص اپنی اپنی ذات اور اپنی اپنی استعداد ہی کے مطابق متصف ہوتا ہے۔ جس عالم یا عارف کے ذہن کی جہاں تک رسائی ہوتی ہے، وہ جس قدر عالی ظرف ہوتا ہے اور جن اعلیٰ و ارفع روحانی مقامات پر فائز ہوتا ہے، اسی نسبت سے وہ عارف اپنی نگاہِ کشف سے حقائق و معارف کا مشاہدہ کرتا ہے۔

شیخ اکبر کے پیش کردہ نظریۂ وحدت الوجود کی جو گوناگوں یا بعض صورتوں میں مختلف

النوع تعبیرات منظر عام پر آئی ہیں تو اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ جن میں سے ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا کلام مشکل اور اَدق ہے اور دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مخالفین نے ان کی کتابوں میں کہیں کہیں الحاقی عبارتیں شامل کر دی ہیں۔ چنانچہ عبدالوہاب شعرانی (متوفی ۹۷۳ھ) اپنی کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں لکھتے ہیں:

''شیخ ابن عربی کا کلام جس قدر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا اس کا سبب اس کلام کا بلند پایہ ہونا ہے۔ اور جس قدر ان کا کلام ظاہر شریعت اور طریق جمہور کے خلاف ہے وہ ان کے کلام میں خارج سے داخل کیا گیا ہے۔ شیخ ابوطاہر مغربی نزیل مدینہ نے مجھ سے پہلے یہ بیان کیا۔ پھر بعد ازاں مجھے دکھانے کیلئے ''فتوحات'' کا وہ نسخہ نکالا جس کا حضرت شیخ کے اس نسخے سے مقابلہ کیا تھا جو شیخ (ابن عربی) کے خاص قلم کا لکھا ہوا شہر قونیہ میں محفوظ تھا۔ سو میں نے اس نسخے میں ان عبارتوں میں سے کوئی عبارت نہیں دیکھی جن میں مجھ کو تردّد تھا اور فتوحات کے اختصار کے وقت میں نے انہیں حذف کر دیا تھا۔''

امام شعرانیؒ کی شہادت اپنی جگہ بڑی اہم شہادت ہے۔ اور اس کی تصدیق مصر سے ۱۲۹۳ھ اور ۱۳۲۹ھ میں دوبار شائع ہونے والے چار جلدوں پر مشتمل فتوحاتِ مکیہ کے اس نسخے سے بھی ہو جاتی ہے جو شیخِ اکبر کے اپنے ہاتھ کے مخطوطے پر مبنی ہے۔ یہ مخطوطہ قونیہ میں محفوظ ہے۔ اگر شیخِ اکبر کی تحریر اتنی مشکل نہ ہوتی اور ان کی تصانیف میں الحاقی عبارات شامل نہ کی جاتیں تو اس صورت میں نہ تو وحدت الوجود کی اس قدر تعبیریں کی جاتیں اور نہ ان پر اتنے اعتراض وارد ہوتے، نہ مذہبی حلقوں میں اس قدر شور وغوغا ہوتا اور نہ پیشہ ور نام نہاد صوفیوں کو لوگوں میں جہالت و گمراہی پھیلانے کا موقع ملتا۔ نہ تو حافظ ابن تیمیہ کو اس قدر مغز ماری کرنا پڑتی اور نہ حضرت مجدد الف ثانی کو نظریہ وحدت الوجود پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔

شیخ ابوطاہر مغربی اور امام شعرانیؒ کی تصحیح کا کام نویں صدی ہجری کے اواخر میں مکمل ہوا۔ اس وقت ابن تیمیہ کو وفات پائے ڈیڑھ دو سو برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے ابن تیمیہ نے شیخِ اکبر کے نظریات سے جو اختلاف کیا وہ الحاقی عبارتوں کی بنیاد پر کیا۔ اس کی

بنیاد وہ الحاقی عبارتیں تھیں جیسا کہ پروفیسر لطیف اللہ نے اپنی تحقیقی کتاب ''تصوف اور شریعت'' میں لکھا ہے کہ ابن تیمیہ کے انتقال تک شیخ اکبر کی صحیح تحریریں سامنے نہیں آئیں۔ اس لئے ابن تیمیہ نے جو اختلاف کیا وہ الحاقی عبارتوں کی بنیاد پر کیا۔ اگر ان تک شیخ اکبر کی صحیح تحریریں پہنچ جاتیں تو امام ابن تیمیہ کا اتنا شدید ردِعمل نہ ہوتا... بعینہٖ یہی دلیل مجدد الف ثانیؒ کے لئے پیش کی جا سکتی ہے کہ آپ نے شعرانیؒ کی ''الیواقیت الجواھر'' کا مطالعہ فرما لیا ہوتا (جو آپ تک نہیں پہنچی تھی) تو مسئلہ کی نوعیت یکسر بدلی ہوئی ہوتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد اور وحدت الوجود کے مسئلے کی حقیقت واضح ہو جانے پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''مکتوبِ مدنی'' میں، اور شاہ اسمٰعیل شہید نے ''عبقات'' میں اور مولانا اشرف علی تھانوی نے ''التکشف'' میں شیخ اکبر کے نقطۂ نظر کی تطبیق و تاویل کی ہے۔ گویا برصغیر پاک و ہند میں اب مسئلہ وحدت الوجود سے متعلق کوئی صورت نزاع نہیں ہے۔

پروفیسر لطیف اللہ کے اس دعویٰ پر کوئی تبصرہ کئے بغیر ہم نفسِ مضمون کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ شیخ عبدالرزاق نظریہ وحدت الوجود کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔ ہمارا یہ منصب نہیں کہ ہم یہ فیصلہ کریں کہ شیخ امان پانی پتی نے اپنے رسالہ فی اثبات الاحدیت میں وحدت الوجود کے نظریے کو بہتر طور پر پیش کیا ہے یا شیخ عبدالرزاق نے اپنے مکتوبات میں اس نظریے کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے یا یہ کہ دونوں میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط؟ البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ دونوں حضرات نہ صرف اظہار و بیان کا زبردست ملکہ رکھتے ہیں بلکہ اپنے موقف کی تائید و حمایت میں ان کے پاس دلائل و براہین کا زبردست ذخیرہ ہے... قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر دونوں حضرات کے پاس بحث مباحثہ اور مناظرے بھی ضرور ہوئے ہوں گے۔ بلکہ ''اخبارالاخیار'' میں تو اس کا ذکر بھی ملتا ہے جیسا کہ مولانا عبدالحق نے لکھا ہے کہ غالباً شیخ عبدالرزاق اور شیخ امان پانی پتی کے درمیان توحید الٰہی اور اطلاق وجودی اور عینیت و غیریت کے مسائل پر گفتگو ہوئی تھی۔ شیخ امان اور ان کے ہم خیال مشائخ نے مسئلہ اطلاقِ حق کو ایک دوسری صورت سے پیش کیا تھا۔ شیخ امان نے اس بارے میں ایک رسالہ موسومہ اثبات اور احدیت تحریر کیا تھا جبکہ شیخ عبدالرزاق نے اللہ تعالیٰ کی عینیت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی درائیت کے بارے میں شیخ امان سے گفتگو کے بعد اپنے ایک

دوست کو خط لکھا تھا۔

شیخ عبدالرزاق کا خط جو مولانا عبدالحق نے ''اخبار الاخیار'' میں نقل کیا ہے وہ بہت طویل ہے۔ ہم اس کا خلاصہ یہاں پیش کرتے ہیں۔ ''نزہتہ الخواطر'' میں مولانا عبدالحئی حسنی نے تمہیدی کلمات کے ساتھ اس خط کا خلاصہ ہی پیش کیا ہے۔ چنانچہ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

> ''شیخ عبدالرزاق کو توحید پر تقریر میں ایک خاص ذوق ودیعت تھا یہ انداز شیخ اکبر ابن عربی کے مطابق تھا جس انداز میں آپ کے ہم عصر عبدالملک بن عبدالغفور امان اللہ پانی پتی مختلف تھے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ شیخ عبدالرزاق توحید کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''جملہ موجودات'' (ممکنات) عین وجود الواجب تعالیٰ ہے'' اور شیخ امان فرماتے ہیں کہ ''واجب تعالیٰ و تقدس موجودات (ممکنات) سے ''ماورا'' (منزہ) ہیں۔''

مسئلہ وحدت الوجود پر شیخ عبدالرزاق کے بے شمار مکتوبات ہیں۔ جو انہوں نے اپنے مسترشدین کے نام لکھے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ''معرفت باری تعالیٰ کی دو قسمیں ہیں، استدلالی اور وجدانی۔

۱۔ معرفت استدلالی کی صورت یہ ہے کہ جس نے اللہ کے حسن کی چمک اور یقین کو آسمان و زمین کی تخلیق اور ان دونوں کی درمیانی اشیاء کی تحقیق میں دیکھا تو اس کو وہ تمام علامات مل گئیں جو اللہ کے صانع وحکیم ہونے کی دلیل ہیں اور یہ تمام تخلیق و صفت اللہ تعالیٰ کے عرفان کے اثراتِ دلیل ہیں۔ اگر یہ معرفت ضروری ہو تو پھر کسی مسلمان کو اس سے بے خبر رہنے کی جسارت ہو ہی نہیں سکتی۔ حالانکہ ایمان کی تکمیل اللہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے ساتھ ہوتی ہے اور اس طرح معرفت عامہ ہر مسلمان کو حاصل ہو جاتی ہے، جس میں معرفت حقیقی شامل نہیں ہے۔

چو آیاتست روشن گشت از ذات
بگردد ذاتِ او روشن ز آیات

جو لوگ دلیل سے خدا کی معرفت حاصل کرتے ہیں وہ ذاتِ خداوندی وراء عالم

سمجھتے ہیں اور دلائل کی روشنی میں ایمان بالغیب لاتے ہیں۔

زہے ناداں کہ او خورشید تاباں
بنور شمع جوید در بیاباں!

۲۔ معرفتِ حقیقت وجدانی یہ ہے کہ عارف اپنے لباسِ وجود سے کٹ کر ریاضت، مجاہدہ، دوام ذکر، قلب و زبان کے ذریعہ اپنے شیخ کے اعتماد کے ساتھ مسلک فنا پر گامزن ہو جائے تاکہ اللہ اس کو اپنے احسانات سے سرفراز کر کے اس کو اپنے اسماء سکھا دے۔ اس طرح حق کی معرفت کر لیتا ہے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "عرفت ربی بربی" یعنی میں نے اللہ کو اللہ کے ذریعے پہچانا۔

رویت حق بحق شہود بود
خاصہ حضرت وجود بود!

اس معرفتِ وجدانی کا حاصل یہ ہے کہ تمام موجودات ممکن بنورِ حق ہیں یعنی اس کی تجلی سے پیدا اور روشن ہوگئی ہیں، اور اللہ کی تجلی کے واسطے سے تمام اشیاء موجود ہیں، حقیقتاً ذات خداوندی کے سوا کوئی موجود نہیں اور جتنے بھی موجودات ہیں وہ ذاتِ باری کی وجہ سے ہیں۔ یہ بات غلط ہے کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ وراء عالم ہیں اور عالم وراء حق سبحانہٗ و تعالیٰ ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ ہر قسم کی لغزش و خلل اور تفسیر بالرائے سے، بلکہ یہ اللہ کا فضل و عطا ہے، قال اللہ تعالیٰ:

"یا ایھا الذین امنو باللہ" یعنی اے وہ لوگو! جو غیب پر ایمان لا چکے ہو اب اللہ کی ملاقات سے کسی شک میں نہ رہو اور ہر متعین چیز میں بے تعین اللہ کا مشاہدہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ مشہود ہے اور ہر مقید و متعین میں اپنے اسماء و صفات کے ساتھ موجود ہے اور اللہ تعالیٰ بظاہر مقید نہیں ہے بلکہ تمام چیزوں سے علیحدہ مطلق موجود ہے۔

ہمہ عالم جمال حضرت اوست
او جمیل و جمال دار دوست

اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے اور جبکہ اس کا وجود واجب ہے تو اور دوسری چیزوں کا عدم ضروری ہے اور کوئی یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ غیر اور سوا ہے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ وہ اس سے منزہ و پاک ہے۔ نیز اس کی جانب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۃً فرمایا ہے "لا تسبو الدھر فان اللہ ھو الدھر" یعنی زمانہ کو برا نہ کہو کیونکہ

اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے... یعنی وجودِ زمانہ دراصل وجودِ پروردگار ہے اور یہ بات نہیں ہے کہ زمانہ سے اللہ تعالیٰ علیحدہ ہو، جس سے یہ امر واضح تر ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو یا ایھا الذین آمنوا باللہ ، یعنی اے مومنین! اللہ پر ایمان لاؤ، اور یہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''من عرف نفسه فقد عرف الله '' اور جب اول و آخر اور ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ ہی ہے تو یہ امر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے موجود نہیں ہے بلکہ اللہ کی ذات کی وجہ سے موجود ہے۔ اور جب انسان نے اس طرح اپنی ذات کا عرفان حاصل کر لیا تو اس نے اللہ کی معرفت حاصل کر لی ورنہ نعوذ باللہ۔ اللہ کی ذات ایک جزئی حقیقت ہو گی جو موجودات سے بالا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ مزید وضاحت کے لئے لکھا جاتا ہے کہ یا ایھا الذین امنوا امنوا باللہ کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! جب تم تمام اشیاء پر ایمان لائے اور تم نے یقین کر لیا کہ تمام اشیاء اپنا مستقل اور الگ وجود رکھتی ہیں اور حقیقت مطلقہ سے دور ہیں تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت کا حکم نازل ہوا کہ اشیاء پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ کیونکہ اعیانِ معلومہ ہمیشہ معدوم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وجود کے ساتھ موجود رہتے ہیں۔ ارشادِ نبویؐ ہے ''اللھم ارنا الاشیا کماھی یعنی اے اللہ ہم کو اشیاء کی حقیقت سے آگاہ کر دے۔

شاہ عبدالرزاق نے جس آیت مبارکہ کا حوالہ دیا ہے، یہ سورۃ نساء کی ۱۳۶ویں آیت ہے اور اس میں آسمانی کتابوں، فرشتوں اور یومِ آخرت کے حوالہ سے غیب پر ایمان کا ذکر ہے:

> یا ایھا الذین امنوا امنوا باللہ و رسولہٖ و الکتٰبِ الذی نزل علیٰ رسولہٖ و الکتٰب الذی انزل من قبل ط و من یکفر باللہ و ملٰئکتہٖ و کتبہٖ و رسلہٖ و الیوم الاٰخر فقد ضل ضللاً بعیداًO

> ترجمہ: اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور رسول پر اور اس کتاب (قرآن) پر جو اس نے اپنی رسول (محمدؐ) پر اتاری اور ان کتابوں پر جو اس سے قبل (پہلے پیغمبروں پر) اتاریں۔ اور جو شخص منکر ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے

رسولوں اور روزِ آخرت کا، تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل چکا ہے۔
شیخ عبدالرزاق نے اپنے مؤقف کی صحت و صداقت ثابت کرنے کے لئے بعض اور دلائل دیئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے۔ الحمدللہ، جس کی بابت تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ الحمد میں الف لام استغراق وکل کے لئے ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ صحائف کائنات میں ثناء وحمد کی جتنی چیزیں ہیں ان سب کی ثناء ومحامد ذاتِ واحد ہے۔ الحمدللہ سے اشارۃً معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات کے سوا کوئی ذات موجود نہیں ہے اور ممکن بھی نہیں ہے کہ ذاتِ باری کے بغیر کوئی ذات موجود ہو، غرض کہ اگر کوئی ذات وراء ذاتِ حق موجود ہو تو اس صورت میں وہ صفاتِ حق سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو بھی ذات، ذاتِ مطلق سے علیحدہ ہو وہ حرکت وسکون، فنا و بقاء، ابتداء و انتہا سے خالی نہیں ہوتی اور اس کی ذات صفاتِ الٰہی ہے۔ اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ جملہ صفات صرف اللہ کے لئے ہیں۔ پس یہ ثابت ہوا کہ نہیں ہے کوئی ذات بغیر ذاتِ الٰہی کے۔ اس کی مزید وضاحت اسی ارشادِ خداوندی ''یا ایھا الذین امنو امنو باللہ'' سے کی جاتی ہے یعنی جو لوگ اللہ پر اس طرح سے ایمان لائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور تم سے پہلے موجود ہے۔ اپنی تمام صفات کمالیہ سے موصوف ہے لیکن تمہارا غیر نہیں ہے۔ چونکہ نقص و زوال سے پاک ہے بلکہ یہ موصوف تم خود ہو، پس اس طرح ایمان لاؤ کہ تم صفات کمالیہ سے موصوف ہو لیکن اس حقیقت سے کہ تم نہیں ہو، جب اس طرح لاؤ گے تو مومن ہو جاؤ گے۔ جیسا کہ اللہ نے خود کہا ہے۔ واللہ المومن۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

بیروں زحدودِ کائنات است دِلم
بیروں زاحاطۂ جہاں است دِلم
فارغ زتقابلِ صفات است دِلم
مراتِ تجلیاتِ ذات است دِلم

شیخ عبدالرزاق نے مکتوبات لکھنے کے علاوہ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ چنانچہ اپنے ایک رسالہ میں رقم طراز ہیں کہ ''فرض کریں کہ راہِ الٰہی ذکرِ حق ہے جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ تصوّرِ شیخ کرے اور جس کو اللہ تعالیٰ تصوّرِ شیخ نصیب کرے اس سے زیادہ بہتر اور کوئی کام نہیں ہے۔ مبتدی کے لئے تصوّرِ شیخ ضروری اس لئے ہے کہ

عالمِ الٰہی وہ عالمِ معنی ہے جس کو دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ صاحبِ کمال کی صورت کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ انسانِ کامل کی ذات اللہ تعالیٰ کے کمالات کا مظہر ہے۔''

شیخ عبدالرزاق نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مکتوبات کی بسیط تشریح بھی قلمبند کی۔ تاہم ان کی دیگر تصنیفات کے بارے میں معلومات دست یاب نہیں ہیں۔

الفاضل العالم الشیخ شاہ عبدالرزاق قادری، چشتی، جھنجھانوی نے ایک سو سات برس کی طویل مگر درس و تدریس، زہد و تقویٰ، رشد و ہدایت اور خدمتِ خلق کے کاموں سے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ۹۴۹ھ میں وفات پائی۔

شیخ امان پانی پتی

شیخ امان اللہ پانی پتی اپنے زمانے کے جلیل القدر علماء اور اکابر صوفیہ میں سے صاحبِ کشف و کرامات اور صاحبِ تصنیفات بزرگ تھے۔ حنفی المذہب تھے اور سلسلہ قادریہ سے روحانی نسبت رکھتے تھے۔ شیخ امان مولانا عبدالحق محدّث دہلوی کے والد ماجد شیخ سیف الدین سیفی کے مرشد اور استاد تھے اور مولانا عبدالحق محدث اپنے والد کے شاگرد اور مرید تھے۔ گویا کہ شیخ امان اللہ کا علم و فضل اور روحانی فیض مولانا عبدالحق محدث دہلوی کو اُن کے والد اور شیخ امان کے مرید کے ذریعے منتقل ہوا تھا۔

ان کا نام و نسب یوں ہے: عبدالملک بن عبدالغفور حنفی المعروف بہ امان اللہ پانی پتی۔ ان کا سنِ ولادت ۸۷۶ھ ہے۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی ''اخبار الاخیار'' میں اپنے والد بزرگوار کے استاد اور مرشدِ طریقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کا نام عبدالملک اور لقب امان اللہ تھا۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے مسلک پر تھے۔ اور اکثر کہا کرتے تھے کہ آج اگر عدل و انصاف کا دور ہوتا تو میں توحید کے اَسرار کو برسرِ منبر اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان کرتا کہ اس میں کسی کو انکار کی گنجائش نہ رہتی۔''

تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس تاریخ و تذکرہ کی کتبِ معتمدہ کے حوالے سے مغلیہ عہد کے مشہور علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''علامہ عبدالملک بن عبدالغفور، حنفی الشہیر بالشیخ امان اللہ پانی پتی نے مودود

اری سے '' فصوص الحکم '' پڑھی۔ وحدت الوجود کے قائل تھے مگر عبدالرزاق جھنجانوی کی طرح ممکنات کو عین واجب نہیں سمجھتے تھے۔ '' رسالہ غیریہ، رسالہ فی اثبات الاحدیہ، مراۃ الحقیقۃ اور شرح لوائح جامی، ان کی تصنیفات ہیں۔ رسالہ فی اثبات الاحدیہ کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری میں موجود ہے۔ جیسا کہ اس کا موضوع توحید باری تعالیٰ کا اثبات ہے اور مصنف نے احادیث نبوی کی بنیاد پر متصوفانہ رنگ میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔''

ڈاکٹر زبید احمد اپنے تحقیقی مقالے '' عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ The (Contribution of India & Pakistan to Arabic Literature میں لکھتے ہیں: '' عبدالملک بن عبدالغفور معروف بہ شیخ امان پانی پتی شیخ مودود اری کے شاگرد اور شیخ محمد بن حسن بن طاہر جونپوری کے مرید تھے، کہا جاتا ہے کہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔''

جہانگیری عہد کے نامور تذکرہ نگار محمد غوثی مندوی '' گلزار ابرار '' میں رقمطراز ہیں:

'' شیخ امان اللہ پانی پتی جن کا نام عبدالملک بن عبدالغفور ہے، شیخ محمد حسین قادری سے بیعت بھی تھے اور خلافت بھی رکھتے تھے۔ ظاہری علوم کے علاوہ تصوف و طریقت میں بھی شیخ محمود مودود اری کے شاگرد تھے۔ شیخ مودود اری، بابا نظام ابدال کے مرید اور مولانا عبدالغفور اری کے شاگرد تھے اور ان (مولانا عبدالغفور اری) کی روحانی تربیت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے کی تھی۔ شیخ مودود مغل بادشاہ ظہیرالدین بابر کے عہد میں برصغیر میں وارد ہوئے اور آگرہ میں خلوت نشینی کی زندگی گزارنے لگے۔ پھر وہاں سے پانی پت منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے اپنا حلقہء درس قائم کیا اور ایک عرصے تک ظاہری و باطنی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ شیخ محمود مودود اری کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتب تصوف بالخصوص، 'فصوص' اور 'فتوحات' میں کامل دسترس رکھتے تھے اور اپنے خاص خاص مریدوں کو ان کا درس بھی دیتے تھے۔ انہوں نے ۹۵۷ھ میں وفات پائی اور ان کی قبر پانی پت میں شیخ امان کی قبر

کے متصل ہے۔ شیخ امان تصوف میں ان کے شاگرد رشید تھے۔

مولانا عبدالحق محدث نے بھی ''اخبار الاخیار'' میں شیخ محمود لاری کے حالات بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ''آپ ماہر علم توحید اور اہل تفرید تھے۔ مشرب عالی اور ہمت بلند کے مالک تھے۔ بڑے بڑے علماء و فضلاء سے مناظرے کر چکے تھے۔ ۹۰۰ھ میں آگرہ آئے۔ شیخ امان سے بڑے اچھے تعلقات ہو گئے جنہوں نے آپ سے علم توحید حاصل کیا اور ''فصوص الحکم'' کو آپ سے پڑھا۔ جب رات ہو جاتی تو آپ شیخ امان سے مخاطب ہو کر فرماتے ''اے دیوانے! کتاب بند کرو! ہماری باتیں سنو۔ پھر آپ روحانی حقائق و اسرار بیان فرماتے۔''

روایت ہے کہ شیخ مودود کو بعض نفع رساں علوم کیمیا بھی معلوم تھے چنانچہ شیخ امان سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں ایک میوہ دار درخت ہوں، مجھے ہلاؤ اور پھل چن لو۔ جس کے جواب میں شیخ امان ہمیشہ یہی کہتے کہ آپ کی علم توحید کی گفتگو میرے لئے ہزار کیمیا سے زیادہ عمدہ اور سودمند ہے۔ شیخ امان کی بابت آپ فرمایا کرتے تھے ''ہمیں ایک جوہر قابل ملا لیکن افسوس یک چشمی ہے''۔ گفتگو میں بھی آپ شیخ امان کو ''یک چشمی'' ہی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

سید عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں شیخ محمود مودود لاری کے احوال محمد غوثی مندوی کے تذکرہ ''گلزار ابرار'' سے نقل کئے ہیں اور ان کے لئے ''الشیخ العلامۃ'' کے القاب استعمال کئے ہیں اور لکھا ہے کہ وہ حنفی صوفی تھے۔ انہوں نے ظاہری علوم کی تحصیل شیخ و علامہ عبدالغفور لاری سے کی اور کئی مشائخ کبار کا زمانہ پایا، یعنی شیخ نعمت اللہ ولی شیخ قاسم الانوار وغیرھما۔

شیخ امان اللہ کے تذکرہ میں محمد غوثی لکھتے ہیں کہ وحدت وجود کے بارے میں ان کی تحقیقات سے شیخ محی الدین ابن عربی کے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ 'فصوص' اور 'فتوحات' اور دیگر کتب صوفیہ کی تمام مشکلات بآسانی بیان فرمایا کرتے تھے۔ ہمیشہ اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے ''اگر اہل زمانہ ضد اور ہٹ دھرمی کی عادت کو چھوڑ کر انصاف سے کام لیں تو وحدت وجود کے مقدمات عقلی اور نقلی دونوں طرح سے خواص و عوام کے ذہن نشین کرا دیئے جائیں۔ اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سلوک کی بدولت ظاہری علوم کے تنگ و تاریک کوچہ سے نکل کر معرفت الٰہی کے نشان میدان میں قدم رکھا

ہے۔''

محمد غوثی مندوی مؤلف ''گلزارِ اسرار'' خود بھی صاحبِ اور مستقیم الحال صوفی تھے اور سلسلۂ شطاریہ میں شیخ صدر الدین محمد برودوی سے منسلک تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''وحدتِ وجود کے مقام کو اہلِ تصوف طاقتِ عقل سے باہر سمجھ کر کشفِ صحیح کے حوالے کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن شیخ امان اللہ نے عنایتِ ایزدی کی مدد سے عقل کو اس عالی مقام سرحد تک پہنچا کر سولہ (۱۶) معقول دلیلیں اس پر قائم کی ہیں۔ پھر انہوں نے مولانا جامی کی کتاب لوائح پر ایک شرح بھی لکھی ہے جو علمِ تصوف کی تمام ضروریات کو حاوی ہے اور شیخ امان نے اپنی سولہ دلیلوں سے بعض دلیلیں اس شرح میں بھی رقم کی ہیں۔ جو شخص تلاش کرے گا وہ ان کلیاتِ تصوف کے مطالعے سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔

شیخ امان کی تصانیف چونکہ دستیاب نہیں ہے اور پھر ہمیں یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ وہ وحدت الوجود کو کس طرح سمجھتے اور بیان کیا کرتے تھے اس لئے ان کے مشہور اور اہم رسالے یعنی ''رسالہ اثباتِ احدیت'' کے ایک اقتباس سے اُن کے بیان کردہ نظریۂ وحدت الوجود کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے یعنی شیخِ اکبر کے نظریۂ وحدت الوجود کی شیخ امان پانی پتی نے کس انداز سے شرح کی ہے۔

یہ اہم اقتباس مولانا عبدالحق نے اپنے والد اور شیخ امان کے مرید خاص شیخ سیف الدین قادری کے حوالے سے ''اخبار الاخیار'' میں نقل کیا ہے۔ چنانچہ شیخ سیف الدین فرماتے ہیں کہ ان کے مرشد شیخ امان نے رسالہ کی ابتداء میں لکھا ہے کہ ''محققین عرفاء، گہری نظر رکھنے والے وحدتِ وجود کے قائلین اور فائیزانِ سعادت و معرفت و شہود کا ارشاد ہے کہ ہمیں کشف وجدان کے ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقتِ وجود کا عین ہے اور تمام موجودات کے ساتھ ظاہر و مشہود ہے۔ بعض صوفیہ نے وحدتِ الٰہی کو نئے زاویۂ نگاہ سے سمجھا اور انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔''

شیخ امان لکھتے ہیں کہ ''صوفیہ کرام کی دو قسمیں ہیں جن کے نظریات کے نتائج علیحدہ علیحدہ سپردِ قلم ہیں تاکہ حق و باطل اور ناقص و کامل میں فرق و امتیاز ہو سکے۔ جان لو کہ مولانا جلال الدین رومی نے اپنی رباعیات کی شرح میں لکھا ہے کہ بعض قاصروں نے محققین سے یہ سنا کہ اللہ تعالیٰ عینِ ذاتِ وجود ہے تو یہ مطلب سمجھے کہ اللہ تعالیٰ تمام موجودات کے درمیان جامعیتِ مشترکہ رکھتا ہے اور جب انہوں نے علمائے عقلیہ سے

ہر موجود کے لئے تعین ضروری ہے خواہ تعینات مطلقہ ہو۔ اس طرح پر کہ اس کا تعین شرکت تعیناتِ عالم سے مانع نہ ہو، جیسا کہ حقیقت مطلقہ کہ سارے حقائق عالم کا اصل ہے اور سب پر صادق آتا ہے، اگرچہ فی نفسہٖ متعین ہے خواہ اخص تعینات کے ساتھ ہو، یعنی اس کا تعین شرکتِ غیر سے مانع ہو، جیسے تعین زید وعمر، ان کا تعین سوائے ان کے اور کسی چیز پر صادق نہیں آتا ہے۔ چاہے اعم من وجہ واخص من وجہ کے ساتھ مانند حقائق کلیہ متوسطہ کے کہ وہ حقیقت سے زائد ہوں یا عین حقیقت ہو، راز اس میں یہ ہے کہ ہر موجود جسمی ترکیب ہے۔ اس کا تعین وامتیاز حقیقت سے زائد ہے جیسا کہ مثال کے طور پر اگر موجود قائم بذاتہ ہو تو اس کو جوہر کہتے ہیں اور اگر قائم بذلتہٖ نہ ہو تو اس کو عرض کہتے ہیں۔ بلا شک اس کا تعین وامتیاز ان کی حقیقت مشترکہ سے زائد ہے اور وہ موجود جسمی ترکیب نہیں ہے بلکہ واحد بوحدۂ حقیقی ہے۔ اس کا تعین عین حقیقت ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ واحد نہیں رہے گا۔ جبکہ وہ واحد ہے۔ پس لامحالہ غیر ذات موجود بنفسہٖ قائم بذلتہٖ متعین بنفسہٖ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن وہ ذات جس کو وجود مل جائے، اسے اپنی ذات سے تمیز وامتیاز مل جاتا ہے اور وہ قائم بنفسہٖ ومتعین بذلتہٖ ہوتا ہے یعنی اس کا وجود عینِ ذات ہے اور ذات خود بخود متعین ہے۔ اس قسم کا وجود سوائے وجود مطلق اور ذات باری تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، وجودِ حق تعالیٰ عین ذات باری تعالیٰ ہے۔ اسی طرح تعین بھی عین ذات ہے، اس مقام میں تعین اپنے نفس میں وہی فائدہ دے گا جو تعینِ خارجی خارج کے اندر فائدہ دیتا ہے۔

محقق حضرات فرماتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ موجودات متعینہ کا سلسلہ غیر متعین تک پہنچتا ہے، چونکہ ہر متعین مسبوق ہے بلاتعین کے ساتھ، اور ہر متعین چاہتا ہے کہ پہلے کوئی غیر متعین ہو۔ اس لئے کہ تعین کے لئے مبداء ومحل کی ضرورت ہے جس کو وہ عارض ہوں لامحالہ کوئی غیر متعین ہوگی اور اس غیر متعین کے لئے ضروری ہے قبل عروض تعینات و تقیدات خود بخود موجود ہو تاکہ تعینات کو عارض ہوں اس لئے کہ یہ قانون ہے کہ ثبوت فرع ہے وجود مثیت لہٗ کا، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ماہیات قطع از تعینات و تمیزات سے موجود نہیں تاکہ ان کو کوئی چیز عارض ہو سکے بلکہ ماہیت نام ہے اعراض و تعینات کے لئے، چنانچہ اس کو ہم دلائل سے واضح کرتے ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں جب حقائق موجودات کو تحلیل کیا جاتا ہے تو بجز اعراض کے اور کوئی چیز ظاہر نہیں ہوتی

یہ سنا کہ اللہ تعالیٰ کلی طور پر موجود نہیں ہے بلکہ ضمن افراد ممکنات میں اس کا وجود ممکنات کے وجود پر موقوف ہے۔ اس کی صفات کا انحصار ممکنات کی صفات میں ہے یعنی جس طرح ممکنات کا علم ہے اس طرح علمِ باری تعالیٰ ہے۔ اور یہی حال قدرت اور دیگر صفات کا ہے جس طرح انسان گفتگو کرتا ہے اسی طرح خدا گفتگو کرتا ہے۔ غرض کہ یہ لوگ جہالت اور گمراہی میں ہیں۔ اس قسم کے لوگوں سے ملاقات کا اتفاق ہوا ہے۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ وجودِ باری تعالیٰ منحصر ہے ضمن وجودِ کائنات میں، اور اللہ کا علم و کلام منحصر ہے ممکنات کے علم و کلام میں، تو میں نے ہمیشہ یہی جواب دیا ہے کہ آپ کے اس قول سے لازم آتا ہے کہ بعض ممکناتِ حق کو معلوم ہو جائیں اور بعض معلوم نہ ہوں، جیسے بارش کے قطرات اور ریگستان کی ریت کے ذروں کی تعداد کسی انسان کو معلوم نہیں ہے اور تمہارے دعویٰ کے پیشِ نظر لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے بے خبر اور بے علم رہے نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ممکنات خود بخود پیدا ہو گئے ہیں بغیر موجد کے اس لئے کہ ممکنات کے لئے موجد سوائے حقیقتِ وجود کے اور کوئی چیز نہیں بن سکتی ہے اور حقیقتِ وجود کو انہوں نے امرِ مشترک تسلیم کیا اور جو برا نتیجہ اس سے نکلتا ہے یہ لوگ اس سے بے خبر رہے۔

بعض اس طرح کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تنہا موجود تھا، اس کے ساتھ کوئی چیز موجود نہ تھی۔ لیکن صرف اس کی تجلی کی وجہ سے جیتی جاگتی چیزیں پیدا ہو گئیں اور اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں میں حلول کئے ہوئے ہے اور ممکنات کے وجود کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے بلکہ وجودِ باری تعالیٰ وجودِ ممکنات میں مخفی ہے۔ یہ گروہ اس اعتبار سے کہ وجودِ باری تعالیٰ کو قدیم اور ظہور و بروز سے قبل مستقل مانتا ہے، پہلی جماعت سے بہتر ہے۔ لیکن ظہور و بروز کے بعد دونوں کے خیالات ایک طرح کے ہیں بغیر کسی کمی بیشی کے، یہاں پر بہت سے مباحث ہیں۔ قبل اس کے ان عقائد کو دلائلِ عقلیہ ونقلیہ سے غلط ثابت کیا جائے ان کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

ان لوگوں نے جو یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ متعین نہیں ہے ورنہ ذاتِ باری کا مشخص ہونا لازم آتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ہر موجود جو کسی وجود سے موجود ہوتا ہے چاہے اس کا وجود حقیقی ہو یا اعتباری، عینی ہو یا علمی، لفظی ہو یا خطابی بغیر تعین کے نہیں ہوتا اس لئے کہ موجود کے لئے تمیز و امتیاز ضروری ہے اور تمیز و امتیاز مستلزم ہے تعین کو، پس لامحالہ

ہے۔ مثال کے طور پر جب کہا جاتا ہے کہ انسان، 'حیوانِ ناطق ہے'، ناطق و حیوان جسم نامی ہیں جو متحرک بالارادہ ہیں اور جسم ایک ایسا جوہر ہے جو ابعادِ ثلاثہ کو قبول کرتا ہے اور جوھر موجود فی الموضوع ہے اور جوہر کے لئے تحقیق وحصول ثابت ہے، اس وقت اس میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ قبیل اعراض میں سے ہے۔ بخلاف اس ذاتِ مبہم کے جو اُن میں موجود ہے جیسا ناطق میں مبہم ہے ذات من لہٗ نطق اور نامی میں ذات من لہٗ نمو ہے۔ یہ اپنے وجود پر قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو اعراض اس کے ثابت نہیں ہوتے۔ حالانکہ یہ سارے کے لئے معروض ہے، لامحالہ یہی ذات مبہم غیر متعین و مطلق اور عین وجود محض اور ذات بحت ہے جو اپنی ذات پر قائم ہے اور اعراض کے لئے مفہوم ہے اور ہر تعین کے ساتھ اس کا علیحدہ ایک نام واحکام وآثار ہے۔

صوفیہ کے نزدیک ذات مبہم موجود خارجی ہے اور مطلق حقیقی ہے۔ اس میں کسی قسم کا تعین وتعدّد وتکثر ممکن نہیں ہے۔ ورنہ مسبوق بلاتعین لازم آتا ہے۔ غرض کہ وجود مطلق نہ کلی ہے نہ جزئی، نہ عام ہے نہ خاص، نہ واحد ہے نہ کثیر، نہ مطلق ہے نہ مقید بلکہ سارے قیودات سے مطلق ہے۔ حتیٰ کہ قیدِ اطلاق سے بھی، اگر مقید کیا گیا قید اطلاق کے ساتھ تو اس میں ضروری ہے کہ وصف سلبی مراد لی جائے یعنی لابتقید بشیٔ، اطلاق سے مراد ضد تقید نہ ہو، بلکہ مطلق ہو کثرت و وحدت سے اور جمع بین الاطلاق وتقید سے، اس صورت میں نسبت ثبوتیہ اور سلبیہ برابر ہوں گی۔ اس کو کشف صریح اور ذوق صحیح سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ باقی عقلِ جمع بین اضداد کا منکر ہے۔ اس موجودِ حقیقی میں سارے اضداد مجتمع ہیں اور ایک دوسرے کے عین ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ محکوم علیہ نہیں بن سکتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ نسبتوں کا اس کی حقیقت میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اگرچہ خارج میں ان کے ذریعے سے موجود ہوتا ہے جیسا کہ اہلِ ظاہر نے کہا ہے ماہیات کے متعلق کہ وہ نہ کلی ہیں نہ جزئی، اس کے معنی یہ ہیں کہ نسبتِ کلی و جزئی کو ماہیت میں کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ یہ نسبت زائد ہے۔ اگر اس کے ساتھ کلی کو اعتبار کیا جائے تو کلی ہو جائیں گی اور اگر جزئی کو اعتبار کیا جائے تو جزئی ہوگی اور اگر کسی بھی نسبت کو اعتبار نہ کیا جائے تو موجود جامع بین اضداد ہوگا۔ اس صورت میں نہ وہ اوّل ہے نہ آخر، نہ ظاہر ہے نہ باطن، اوّل بھی ہے آخر بھی، ظاہر بھی ہے باطن بھی، اوّل اس جہت سے کہ آخر ہے اور آخر اس جہت سے کہ اوّل ہے۔ اور ظاہر اس حیثیت سے کہ باطن ہے اور باطن اس وجہ سے کہ ظاہر

ہے۔ یہی حال دیگر اضداد کا ہے۔

اور یہ جو بات مشہور ہے کہ جو چیز خارج میں موجود ہوتی ہے وہ متعین ہوتی ہے اور جو چیز متعین ہوئی وہ مطلق نہیں ہو سکتی، اس قاعدے کے مطابق ذاتِ باری تعالیٰ خارج کس طرح مطلق ہو سکتی ہے؟ اس اہم سوال کا جواب شیخ امان یوں دیتے ہیں:

''مطلق کے وہ معنی مراد نہیں ہے جو فلاسفہ کہتے ہیں بلکہ مطلق سے مراد یہ ہے کہ وہ اس قسم کا تعین ہے جو دوسرے تمام تعینات کے منافی نہیں ہے بلکہ جامع ہے سارے متعینات کو جو اسے لاحق ہوتے ہیں مراتب تنزلات میں اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلق فی نفسہٖ متعین نہ ہو ایسے تعین کے ساتھ جو کلیہ و اطلاق سے خارج ہو بلکہ وہ اپنی ذات و حقیقت کے اعتبار سے خارج میں متعین ہے اور دیگر تعینات کے اعتبار سے مطلق ہے، متعین اور مطلق دونوں ہے اور اس کے تعین و اطلاق میں کوئی منافات نہیں ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ کلی طبعی بعض عقلاء کے نزدیک خارج میں موجود ہے اس کے باوجود وہ کلی ہے اور اس کا وجود خارجی کلی ہونے کے لئے منافی نہیں ہے۔ اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک وجودِ خارجی اور کلی ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ اس وجہ سے وہ کلی طبعی کو موجود نہیں مانتے ہیں۔''

خلاصہ کلام یہ ہے کہ وجودِ مطلق کا تعین مثل تعینات متعینہ نہیں ہے اس لئے کہ تعینات متعینہ کسی اور تعین کے مقابلے میں آتے ہیں اور اس کے ساتھ جمع نہیں ہوتے ہیں۔ بخلاف تعین وجود مطلق کے کہ اس میں تغائیر و تقابل نہیں ہے بلکہ عین ہے علوی و سفلی وصوری و معنوی کا، اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ وجود خارجی اطلاق کے لئے منافی نہیں ہے بلکہ وہی موجود متعینہ خارجیہ مطلق ہے، اطلاق حقیقی کے ساتھ، جس نے کہ بہت سے کمالات میں تجلی کر کے اپنے آپ کو صورِ متعینہ اور موجوداتِ متکثرہ میں نمودار کیا، اس کے ساتھ قبل البروز والی حالت میں جو احدیت تھی وہ بھی باقی ہے۔ گویا اس میں تعدد صوری ہے، واحدیت معنوی، اس طرح پر کہ اگرچہ ذاتِ باری تعالیٰ اس حیثیت سے کہ وہ عین ذات ہے آنکھوں سے نظر نہیں آتا ہے لیکن بصیرت فہم سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودات کی نسبت ذات باری تعالیٰ سے باعتبار تمائیز و تغایر اس طرح ہے کہ جب موجوداتِ کونیہ میں سے دو صورۃ ہوں گی تو اللہ تیسرا ہے اور جب موجودات تین صورۃ

ہوں گی تو باری تعالیٰ چوتھا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔

"مایکون من نجوی ثلاثۃ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنی من ذالک ولا اکثر الا ھو معھم"

ترجمہ: تین آدمی سرگوشی نہیں کرتے ہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چوتھا ہے اور سرگوشی نہیں کرتے پانچ آدمی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کا چھٹا ہے۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ اگر عالم کا غیر نہ ہوتا تو یہ آیت مبارکہ صحیح نہ ہوگی حالانکہ آیت صحیح ہے۔ تو بالمحالہ باری تعالیٰ عالم کا غیر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ غیریت بحسب حقیقت ممکن نہیں۔ بالمحالہ بحسب تعین و تقید ہوگا۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ ذات سبحانہ کے لئے ایک تعین اور افراد عالم کے لئے مستقل تعینات ہوں اور وحدت معنوی اس طرح پر ہے کہ موجودات روحانی و جسمانی کا عین نہ ذات خداوندی ہے۔ یہی حالا ہو یہ کا ہے وہ عین غیر نہیں ہے۔ اگر حق سبحانہ و تعالیٰ کو احدیت ذاتیہ و ہو یہ عینہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو تمام عالم اس میں پوشیدہ ہے اور وہ عالم کا عین ہے۔

اور اگر حالتِ ظہور کا لحاظ کیا جائے تو خود باری تعالیٰ ان کی صورتوں میں جلوہ نما ہے دونوں صورتوں میں غیریت کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے بجز اس کے کہ تقید و تعین کا لحاظ کیا جائے۔ غرض کہ غیریت باعتبار صورت ہے اور عینیت بلحاظ حقیقت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہوتا ہے "واللہ من ورائھم محیط" کشفِ صریح اور ذوقِ سلیم سے دو حیثیت کو تسلیم کیا گیا اور ان کے لئے علیحدہ علیحدہ احکام و آثار کو ثابت کیا گیا۔

کامل عارفین اور محققین کی معرفت یہ ہے کہ کثرت بالکل ختم ہو جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کثرتِ حقیقی و تغایر نفس الامری کو تسلیم نہ کیا جائے اور تغایر صوری و غیریت اعتباری کو مان لیا جائے تاکہ وحدت و کثرت اپنے اپنے مقامات میں برقرار رہ سکے اور ہر ایک کے لئے احکام و آثار کا ثبوت ہو، یہ لوگ نہ ثبوت عالم کے قائل ہیں جس طرح کہ اہل ظاہر قائل ہیں اور نہ عدم عالم کے قائل ہیں جیسا کہ اہلِ باطن مانتے ہیں، بلکہ ثبوت ونفی دونوں کے قائل ہیں نہ عالم کو غیر حق سمجھتے ہیں اور نہ حق سبحانہٗ کو وراء عالم تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ حکماء متکلمین کا عقیدہ ہے، نہ عالم کو عین ذات حق تعالیٰ کہتے ہیں، نہ حق سبحانہٗ کو عین عالم بتلاتے ہیں جس طرح کہ اہل توحید نے تسلیم کیا تھا بلکہ یہ گروہ عالم کو عین

ذات و غیر ذات تسلیم کرتا ہے۔ غرض کہ یہ لوگ وحدتِ حقیقی احدیت معنوی کے اعتبار سے عینیت کے قائل ہیں اور بلحاظ تعددِ صوری و غیریت اعتباری غیریت ماننے والے ہیں۔ ان کی عینیت غیریت کے منافی نہیں ہے اور غیریت، عینیت کی منافی نہیں ہے، حق سبحانہٗ و تعالیٰ من وجہ وراء عالم ہے اور من وجہ وراء عالم نہیں ہے، نیز عالم بھی من وجہ وراء حق سبحانہٗ ہے اور من وجہ عین باری تعالیٰ ہے۔

غرض کہ ''رسالہ فی اثبات الاحدیہ'' میں اللہ تعالیٰ کے ثبوت میں شیخ امان نے وحدت الوجودی نقطۂ نظر سے بہت سے دلائل و براہین دیئے اور ایک طویل بحث و تمحیص کے بعد لکھا ہے کہ اس تحقیق کے پیشِ نظر تم جو چاہو کہو اپنے متعلق، ''میں خدا ہوں'' اور ''خدا میں ہوں'' اس لئے کہ حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر چہ اعتباری فرق یہی ہے جمع بین حقیقت العینۃ اور بین غیریۃ الصوریۃ ہے۔ تم اگر چاہو کہو کہ میں عین ذاتِ باری تعالیٰ ہوں اس لئے کہ میرا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ میرا کوئی وجود نہیں ہے یہ سب ذاتِ خداوندی ہے کیونکہ وجودِ مطلق کے سوا اور کوئی وجود نہیں ہے۔ اس صورت میں میرا وجود کس طرح ہو سکتا ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ بھی میں ہوں اس لئے کہ اطلاق معدوم ہے اور مظہر میں بجز تقید کے اور کچھ نہیں ہے۔ بھــو اللہ تعالیٰ میرا عین کس طرح بن سکتا ہے۔ اور میرا وجود بھی اللہ کا عین نہیں ہے۔ اگر چہ موجود ہے، وہاں پر، چونکہ وہاں اطلاق ہے اور میرا وجود اطلاق سے خالی ہے اور اللہ اختصاص سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ میرا عین نہیں ہے۔ اگر چہ مجھ میں موجود ہے۔ اور اللہ اختصاص سے پاک ہے اللہ تعالیٰ میرا عین نہیں ہے۔ اگر چہ مجھ میں موجود ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تقید سے پاک ہے۔ میں، میں ہوں ثبوتِ تقید کی وجہ سے، اور تو تو ہے ثبوتِ اطلاق کی وجہ سے، میں تو ہوں باعتبارِ، اتحاد مظہرِ ظاہر کے ساتھ باطن کے لحاظ سے، اور اللہ میرا وجود ہے باعتبار اتحاد ظاہر مظہر کے ساتھ بلحاظ ظہور، حق سبحانہٗ کے لئے کمال ہے وراء ان کمال کے اور وہ کمالِ ذات ہے بشر کی طاقت نہیں کمالِ باری تعالیٰ کا ادراک کر سکے اور اللہ تعالیٰ اوّل ہے ابد ہے۔ کسی مقام پر رکتا نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ کمال اسمی و ظہور وصفی ہے۔ اگر چہ بجز غیریت کے متحقق نہیں ہوتا لیکن تقید۔ سے بھی پاک ہے اور اس کا انحصار جہت دون جہت نہیں ہے بلکہ ساری جہات پر محیط ہے۔ غرض کہ اگر چہ اس کمال میں تعدد و تکثر ہے لیکن اجمالِ ذات بھی مضمر ہے۔ لامحالہ اللہ تعالیٰ انحصار سے پاک ہے۔ اس لئے کہ انحصار

منافیِ کمال ہے۔

من با تو چنانم اے نگار ختنی
کاندر غلطم کہ من توام یا تو منی
نے من منم و لے تو توئی نے تو منی
من ہم منم و ہم تو توئی ہم تو منی

مولانا عبدالحق محدث دہلوی ''رسالہ اثبات الاحدیت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شیخ امان اللہ نے اللہ تعالیٰ کے حاکم علی الاطلاق ہونے اور کائنات کے حقائق کو علم الیقین کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا آنکھوں دیکھا حال ہو اور علم کے مطابق کامل ذوق کو کلماتِ اربابِ توحید اور اہلِ تحقیق کے مطابق تحریر کیا ہے۔ یہاں مولانا عبدالحق محدث نے جو ''آنکھوں دیکھا حال'' لکھا ہے تو اس سے اُن کا مطلب شیخ امان کا کشف ہے اور جو انہوں نے اربابِ توحید کے کلمات کے الفاظ استعمال کئے ہیں، اس سے اُن کی مراد حضرت بایزید بسطامی، حضرت سری سقطی اور سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی کی تحقیق و کلمات ہیں۔ لیکن وحدت الوجود کی اس علمی بحث کو ہم شیخِ اکبر محی الدین عربی کے خود اپنے تصنیف کردہ ''رسالۃ الاحدیہ'' کے اقتباس سے سمیٹتے ہیں کہ صوفیہ کرام کے نزدیک شیخِ اکبر ''قطبِ ارشاد'' ہیں اور ان کا قول، قولِ فیصل ہے۔ شیخِ اکبر فرماتے ہیں ''وہ ہے۔ اس کے ساتھ نہ قبل ہے نہ بعد، نہ فوق ہے نہ تحت، نہ قرب ہے نہ بُعد، نہ وحدت ہے نہ تقسیم، نہ کیسے ہے، نہ کہاں ہے اور نہ کب، نہ زمان ہے، نہ لحظہ ہے نہ عمر، نہ ہستی ہے نہ مکان (جگہ) وہ اب بھی ہے جو وہ تھا، وہ احدِ بے وحدت ہے وہ فردِ بے فردیت ہے، وہ اسم اور مسمّٰی کا مرکب نہیں۔ اس لئے کہ اس کا اسم بھی وہ (ھُو) ہے اور اس کا مسمّٰی بھی وہ (ھُوَ) ہے پس جان لے کہ وہ کسی شے میں نہیں اور نہ کوئی شے اس میں ہے۔ خواہ وہ داخل ہوتا اور خواہ آگے بڑھتا ہو، یہ واجب ہے کہ اسے اسی انداز سے جانے، نہ علم کے توسط سے، نہ عقل کے ذریعے نہ فہم کی معرفت، نہ تخیل کے طفیل، نہ حواس کے باعث اور نہ ادراک کی مدد سے اسے کوئی خود اس کے سوا دیکھ نہیں سکتا۔ کوئی اس کا خود ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے آپ کو اپنے ذریعے دیکھتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اپنے ہی ذریعے جانتا ہے۔''

شیخ امان اللہ پانی پتی نے مولانا عبدالرحمٰن جامی کی کتاب ''لوائح'' کی ایک انتہائی

مبسوط اور تفصیلی شرح بھی لکھی ہے۔ جس کے آغاز میں انہوں نے ایک نہایت جامع اور مفید مقدمہ لکھا ہے۔ شیخ امان اللہ تہذیب اور اخلاق و عادات میں بلند مقام رکھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک درویشی دو چیزوں میں ہے۔ ایک خوش اخلاقی اور دوسری محبت اہلِ بیت۔ محبت کا کامل درجہ یہ ہے کہ محبوب کے متعلقین سے بھی محبت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ سے کمال محبت کی نشانی یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کی علامت یہ ہے کہ جن لوگوں سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم محبت کرتے تھے اُن سے محبت ہو۔

جہاں تک شیخ امان کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے وہ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ہر حالت میں اللہ پر بھروسہ کرتے تھے۔ اپنے آرام و آسائش اور خواب و خور کے لئے کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ زمین پر لیٹتے تھے اور غذا بہت کم کھاتے تھے اور ہمہ وقت درویشوں، مریدوں اور شاگردوں کو سلوک کی تعلیم دیتے تھے۔"

شیخ امان اللہ اپنا زیادہ تر وقت اسلامی علوم و فنون کی درس و تدریس اور تعلیم و تبلیغ اسلام میں گزارتے تھے۔ ذکرِ حق بھی جاری رہتا۔ ان کی مجلس یا صحبت میں کوئی شخص کسی کی غیبت یا فضول بات کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ طالبانِ حق ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اُن سے فرماتے۔ پہلے کچھ پڑھو، علم کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ حصولِ علم کے بغیر کسی کو سلوک کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ اور اپنے مریدوں کو اُن کی ذہنی صلاحیت کے مطابق ان کی دینی اور روحانی تعلیم و تربیت کرتے تھے اور اس ضمن میں اکابر مشائخ اور صوفیہ کرام کی طرح بہت ذوق و شوق، فہم و فراست اور حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ان کی روحانی تربیت کے طریقِ کار کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ جو شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب "رودِ کوثر" میں "اخبار الاخیار" سے مولانا عبدالحق محدث کے والد شیخ سیف الدین سیفی قادری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"شیخ سیف الدین فرماتے ہیں کہ جب میں پہلے دن شیخ امان کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے کہا کہ اپنے تصوّرات اور خیالات کا کچھ حال بیان کرو۔ شیخ سیف الدین نے جواب دیا کہ مجھے تو صوفیانہ احوال ہی کوئی نہیں پیش آئے۔ میرے تصوّرات و خیالات کیا ہوں گے؟ شیخ امان نے کہا کہ یہ میں اس لئے پوچھتا ہوں کہ تمہاری طبعی مناسبت کا اندازہ لگاؤں اور یہ معلوم

کروں کہ تمہارے ذہن کا کیا اسلوب ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ کئی دفعہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارا جہان فرش سے عرش تک میں نے گھیر رکھا ہے (محاطہ من است .... و من بر ہمہ محیطم) شیخ نے فرمایا کہ تمہارے دل میں توحید کا سمندر موجزن ہے اور اس لئے مسئلہ توحید میں ہی زیادہ تعلیم و تربیت دی۔''

شیخ امان کے اس طریقہ تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ طریقت کے سلسلوں کے دیرپا ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان سلسلوں کے بزرگ انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے اور اپنی تعلیم و تربیت میں اس کو نظر انداز نہ کرتے تھے۔ آج کل ہمیں نفسیات کے عالم بتا رہے ہیں کہ ذہن انسانی میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہمیں افراد کے ذہن تحت الشعور یعنی اُن خیالات اور تصورات سے آگہی ہو، جو اُن کے ذہن کی گہرائیوں میں موجزن ہیں۔ اہل تصوف اس اصول پر شروع ہی سے عمل پیرا تھے اور سب اہل نظر مرشد، مرید کو تلقین کرنے سے پہلے اس کے تحت الشعور سے بخوبی واقف ہو جاتے۔ شیخ امان بھی اس اصول کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔

شیخ امان کے تلامذہ اور مریدین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے والد شیخ سیف الدین کے علاوہ شیخ تاج الدین بن زکریا اجودھنی، شیخ رکن الدین اور مولانا حسین نقشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب صاحب کمال بزرگ تھے اور ان کے احوال ''اخبار الاخیار'' میں درج ہیں۔ مولانا حسین نقشی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خطاطی میں ماہر اور مہریں بنانے میں بے نظیر تھے۔ انتہائی خوش اخلاق، بیدار مغز، روشن خیال اور ولی صفت انسان تھے اور بلند پایہ شاعر بھی۔ ہر چند کہ شیخ بہلول کے حلقہ ارادت میں شامل تھے لیکن شیخ امان اللہ کی خدمت اور محبت و صحبت کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ ان کا یہ شعر زندۂ جاوید ہے۔

چنیں کہ ہر پر طاوس قیس را میلے است
مگر درد اثرے پائے ناقہ لیلیٰ است

مولانا عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ میرے والد ماجد شیخ سیف الدین اپنے پیر و مرشد شیخ امان سے نہایت درجہ محبت و اعتقاد رکھتے تھے۔ اکثر اوقات ان کے ذکر سے

رطب للسان رہتے تھے اور فرماتے کہ ہمارے پیر و مرشد کے تمام دوست احباب آپ سے اس طرح ملتے تھے جس طرح شاگرد اپنے استاد سے ملتے ہیں۔ شیخ امان پانی پتی کئی روحانی سلاسل سے تعلق رکھتے تھے، مسلک قادریہ میں دو واسطوں سے شیخ نعمت اللہ شاہ ولی تک پہنچتے ہیں اور مسلک قادریہ آپ پر غالب تھا۔

شیخ امان اللہ اپنے دوستوں سے ملاقات کے لئے دہلی آیا کرتے تھے۔ آخری مرتبہ جب دہلی آئے ہوئے تھے اور پانی پت واپس جانے لگے تو دوستوں سے کہا کہ اس مرتبہ لمبا سفر کرنا ہے جس پر آپ کے دوست شیخ زکریا اجودھنی نے کہا ہم بھی آپ کے ساتھ سفر میں رہیں گے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر ظاہری سفر ہوتا تو آپ ساتھ ہوتے لیکن یہ دوسرا سفر ہے۔ اس لئے آپ کو اللہ کی حفاظت میں دے کر جا رہا ہوں۔ چنانچہ دہلی سے پانی پت واپس آ گئے۔ ایک روز اپنے گھر کی ہر شے کو غور سے دیکھا۔ قرآن شریف کو کھول کر دیکھا اور فرمایا۔ اے کتاب کریم! میں نے تجھ سے استفادہ کر کے بہت فوائد حاصل کئے۔ اسی طرح ہر کمرے میں گئے اور کمرے میں موجود چیزوں کو الوداع کہا۔ اسی حالت میں آپ کو بخار چڑھ گیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ بہت سا پانی گرم کرو اور نئے لوٹے لے آؤ تا کہ عمر بھر کے وسوسے دور ہو جائیں۔

گیارہ ربیع الثانی ۹۵۷ھ کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے عرس کا اہتمام کیا اور کہا کہ غوث الاعظم سے پہلے قدم اٹھانا درست نہیں۔ چنانچہ اُس دن عرس کے لئے جو کھانا پکوایا تھا تقسیم کر دیا۔ ۱۲ ربیع الثانی ۹۵۷ھ کو آپ پر سکراتِ موت کا غلبہ ہوا تو آپ نے اُسی حالت میں کہا۔ مشائخین طریقت کھڑے ہیں اور فتویٰ توحید طلب کر رہے ہیں۔ چنانچہ کلماتِ توحید آپ کی زبان پر جاری تھے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

سید عبدالاوّل

میر سید عبدالاوّل دسویں صدی ہجری کے مشہور علماء اور اکابر صوفیاء میں سے تھے۔ وہ بلند پایہ محدث، ممتاز فقیہ اور عارف باللہ تھے۔ انہوں نے درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ حنفی المذہب تھے اور میر سید محمد گیسو دراز کے خانوادے میں سلسلۂ عالیہ چشتیہ سے نسبتِ ارادت رکھتے تھے اور اُن کے والد ماجد کا نام علاء الحسینی تھا۔ میر سید عبدالاوّل برصغیر کے پہلے عالم ہیں جنہوں نے ''فیض الباری'' کے نام سے شرح بخاری لکھی۔

کتبِ تاریخ و تذکرہ میں میر سید عبدالاوّل کے احوال ملتے ہیں۔ مولانا عبدالحئی حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں میر سید عبدالاوّل کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''الشیخ العالم المحدث مولانا عبدالاوّل بن العلاء الحسینی جونپوری علمائے کبار میں سے تھے۔ جونپور کے نواح میں زید پور آپ کا وطنِ مالوف تھا، جہاں سے آپ کے مورثِ اعلیٰ دکن منتقل ہو گئے۔ حنفی المذہب تھے۔ آپ نے دکن میں شیخ علاء الدین، شیخ حسین فتحی اور محمد بن جزری مؤلف ''حصنِ حصین'' ابن یوسف الحسینی سے حدیث پڑھی۔ پھر گجرات تشریف لے آئے اور وہاں سکونت اختیار فرمائی، حرمین کا سفر کیا اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر احمد آباد میں آ کر مقیم ہو گئے۔ مدت تک یہاں درس و افادہ فرمایا۔ آپ سے طاہر بن یوسف سندھی اور بے شمار افراد نے اکتسابِ علم کیا۔ آخر عمر میں دہلی تشریف لے آئے اور دو سال قیام کرنے کے بعد یہیں وفات پائی۔''

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس نے بھی یہی لکھا ہے۔

''عبدالاوّل بن العلاء الحسینی فقیہ و محدث تھے۔ ان کے اجداد میں سے کوئی صاحب زید پور (جونپور) سے دکن گئے اس لئے شیخ عبدالاوّل زیدپوری کہلاتے ہیں۔ وہ خود دکن (گجرات) میں پیدا ہوئے اور احمد آباد میں حدیث کا درس دیا۔ آخر میں احمد آباد سے دہلی آئے اور وہیں فوت ہوئے۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی ''اخبارالاخیار'' میں لکھتے ہیں۔

''آپ علاء الحسینی کے فرزند ارجمند تھے۔ تمام علوم عقلی و نقلی، رسمی و حقیقی میں کامل اور بڑے دانشمند تھے۔ اکثر علوم میں خود بھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ صحیح بخاری کی شرح ''فیض الباری'' بھی آپ ہی نے لکھی ہے۔ ''سراجی'' جو علم الفرائض کی کتاب ہے اس کو منظوم کر کے اس پر شرح لکھی ہے۔ تحقیق نفس و معرفت پر فارسی میں نہایت تحقیق سے ایک کتاب تالیف کی ہے۔ نیز اکثر کتابوں پر آپ کے شروح و حواشی و تعلیقات موجود ہیں۔''

مولانا عبدالحئ حسنی نے میر سید عبدالاوّل کی چھ کتابوں کی ایک فہرست دی ہے جس میں فیض الباری شرح صحیح البخاری کے علاوہ شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی کی مایہ ناز کتاب فتوحاتِ مکیہ پر دو حواشی یعنی مطول اور مختصر بھی شامل تھے۔

مولانا عبدالقدوس، میر سید عبدالاوّل کی تصنیفات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''فیض الباری شرح صحیح بخاری، منظومہ فی علم المیراث اور اس کی مبسوط شرح، رسالہ فی تحقیق النفس، مختصر السیرت النبویۃ، ابنِ عربی کی ''فتوحاتِ مکیہ'' کے حواشی ''مطول، (علم بلاغہ) کے حواشی وغیرہ آپ کی تصنیفات ہیں۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں میر عبدالاوّل کے رسالہ تحقیق النفس سے چند اقتباسات نقل کئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''آپ کے رسالہ تحقیق نفس و معرفت کا کچھ بیان یہ ہے:

فصل۔ سمجھ لو کہ نفس مشترک لفظی ہے کبھی اس کو نفس ہی کہتے ہیں اور کبھی ذات و حقیقتِ الٰہی کہتے ہیں جس کی مثال یہ ہے۔ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک

ترجمہ:

میرے نفس میں جو ہے اسے میں جانتا ہوں اور تمہارے نفس میں جو ہے اُس سے

میں ناواقف ہوں۔

کبھی اس نفس کو روحِ علوی سے تعبیر کرتے ہیں جس کا دوسرا نام نفسِ ناطقہ ہے۔ کبھی اس کو بخارِ لطیف سے یاد کرتے ہیں۔ یہ وہ حرارت ہے جو تہہ دل سے نکل کر رگوں کے ذریعے تمام جسم میں سرایت کرتی ہے۔ دو آدمی جو قد و قامت اور لاغری و فربہی میں بالکل برابر ہوں ان میں سے ہر ایک کا ایک ظاہری حصہ ہے جس کو جسم کہتے ہیں اور دوسرا باطنی حصہ ہے، جس کو نفس کہتے ہیں۔ بدن کی مثال اس کپڑے کی ہے جو جسم پر ہوتا ہے اور نفس وہ بخارِ عمودی ہے جو تمام اجزاء لباس میں موجود ہوتا ہے اور لباس کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جان لو کہ آدمی ایک بخاری حیوان ہے جس کی وجہ سے وہ متحرک و حساس ہے اور بھوک، پیاس، حرص و ہوا صفاتِ نفسانی، یہ سب انسان کے اندر موجود ہیں۔ عرفِ تصوّف میں اس کو نفس کہتے ہیں۔''

فصل۔ آیتِ قرآن کی تفسیر سے متعلق ''ثم انشانا خلقاً آخر '' کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان کو دوبارہ پیدا کیا ارسالِ روح کے ساتھ جبکہ خالص نباتی تھا، دونوں روحیں اس میں موجود نہ تھیں اور حدیث شریف ''ثم ارسل الله ملکاً با ربع کلمات'' کا بھی یہی مطلب ہے۔ سمجھ لینا چاہئے کہ اوّل تبخیرات، حیوانی اور ابتدائی تعلق انسانی ہمیشہ ساتھ ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔ وجودِ انسانی بغیر وجودِ حیوانی کے ممکن نہیں ہے اور اسی طرح وجودِ حیوانی بغیر وجودِ انسانی ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ایک سو بیس دن کے بعد مضغہ انسان میں روح ڈالی جاتی ہے۔ تب اسی وقت جنین اپنے شکم مادر میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوا کہ ان دونوں کے درمیان لازم و ملزوم کی نسبت موجود ہے۔

فصل: روح جو کہ صاف اور لطیف ہے جسم انسانی سے جو کثیف اور ظلماتی ہے کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے۔ اس لئے روحِ انسانی سے پہلے روحِ حیوانی سے جو کہ فی الجملہ پاکیزہ ولطیف ہے اپنا تعلق قائم کر لیا اور اسی کی وجہ سے بدن کثیف سے مناسبت ہوگئی۔ پہلے پہل تو روحِ انسانی اپنے مقام سے فراق کے سبب بہت پریشان ہوگئی تھی لیکن بعد میں روحِ حیوانی سے مانوس ہوگئی اور اپنے مقام کو بھول گئی۔ بعض روحیں اپنے نفس کے تابع ہو کر تنزل اور پستی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور بعض روحیں اپنے نفس کو سواری بنا کر ترقی اور کسبِ کمال کے لئے وسیلہ بناتی ہیں۔

اس لئے محققین مذہب کا قول ہے کہ ارواح مجرّد ہیں، اعضاء و آلات وغیرہ نہیں رکھتی ہیں جب تک جسم کے ساتھ مرکب نہ ہوں تو ترقی ان کے لئے غیر ممکن ہے۔

فصل۔ روح علوی عرصہ دراز تک موثرِ تام اور مبدع کمالِ الٰہی کے سایہ میں رہی اور روح سفلی اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال سے دور تھی۔ چونکہ ان دونوں میں مرد و عورت کی قوتیں موجود تھیں جن کے جوڑ دیئے جانے پر ان کی اولاد کا نام قلب و دل رکھا گیا اس لئے روح جس میں دو چیزیں، ایک نسبت پدری اور دوسری مادری ہے ہمیشہ انقلاب پذیر رہتی ہیں۔ نیز یہ بھی یقین کر لو کہ جو چیز محسوسات کے ذریعے معلوم ہوتی ہے وہ نفس ہے اور معقولات کے ذریعے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ روح ہے اور محسوس و معقول کے مرکب کا نام قلب ہے اور جو چیزیں کہ حس و عقل کے ذریعے معلوم نہ ہوں وہ ذات و صفات خداوندی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اپنی مہربانیوں سے ایک خاص رحمت کو دل سے متعلق کر دیا ہے جس کو سِرّ یا بھید کہتے ہیں اور اس سے زیادہ قوی بھید بھی ہے جو دل سے متعلق ہے جس کو سِرِّ خفی کہتے ہیں اور ذاتِ الٰہی کا کشف اس چشم سِرِّ خفی کے سبب سے ہوتا ہے جیسا کہ حدیثِ قدسی میں ہے۔ ''و فی الخفی انا'' یعنی سِرِّ خفی میں ہم ہیں۔''

میر سید عبدالاوّل کے رسالہ ''تحقیق نفس'' کی یہ تین فصلیں ان کے نمونہ تحریر کے طور پر ''اخبار الاخیار'' سے لی گئی ہیں۔ انہوں نے بعض دوسرے موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں ہیں۔ رسالہ فرائض ''سراجی'' کو نظم کر کے اس پر شرح لکھی اور ایک مختصر سیر میں کتاب ''سفر السعادت'' سے منتخب کی اور اکثر کتب پر حواشی اور شروح و تعلیقات لکھے۔ اور نہایت تحقیق و تدقیق سے ''فیض الباری شرح صحیح بخاری'' قلمبند کی۔

مولوی فقیر محمد نے ''حدائق الحنفیہ'' میں میر سید عبدالاوّل بن علاء حسینی کے حالات بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ''وہ فقیہ، محدث، جامع علوم عقلی و نقلی اور فنون ظاہری و باطنی تھے۔ ان کا آبائی وطن زید پور علاقہ جونپور تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد میں سے کسی بزرگ نے دکن میں جا کر سکونت اختیار کر لی۔ جہاں میر سید عبدالاوّل کی ولادت ہوئی اور وہیں کے علماء و فضلا کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے مرتبۂ فضل و کمال کو پہنچے اور علمِ باطن میں سید محمد گیسودراز کی اولاد میں ان کے خلیفہ کے مرید ہوئے۔ پھر فریضۂ حج ادا کیا اور حج سے واپسی کے بعد احمد آباد میں مقیم ہو گئے۔ اس وقت بہت معمر و مسن تھے۔ اس ضعیفی و پیری کے عالم میں غربت اور انکسار کا عالم ان پر ایسا غالب آیا جس سے وہ علومِ رسمیہ سے بالکل ذہول ہو گئے۔ علماء و فضلاء کے قدردان خانِ خاناں بیرم خان کی استدعا پر دہلی

تشریف لے گئے۔ جہاں دو سال قیام کے بعد راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اسی سال بیرم خان کو قتل کر دیا گیا۔"

میر سید عبدالاوّل بن علاء حسینی نے ۹۶۸ھ ۔ ۱۵۶۱ء میں وفات پائی۔ اور قلعۂ دہلی میں غریبوں کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ "شیخ اوان" تاریخِ وفات ہے۔

مصلح الدین لاری

مولانا مصلح الدین لاری اپنے زمانے کے نامور عالمِ دین، بلند پایہ محدث، ممتاز فقیہ اور بے مثال مناظر تھے۔ علوم عربیہ اور حکمیہ کے زبردست ماہر ہونے کے علاوہ وہ ایک معروفِ زمانہ استاد و معلم بھی تھے اور ایک صاحبِ تصنیف بزرگ بھی۔ انہوں نے اسلامی ممالک کی سیاحت بھی کی۔ وہاں کے علماء و فضلا سے ملاقاتوں کے علاوہ ان سے مناظرے بھی کئے اور سب پر غالب رہے مگر قسطنطنیہ میں مفتی ابو السعود حنفی نے انہیں بے بس کر دیا۔

مفتی ابو السعود حنفی ممتاز فقیہ جلیل القدر مفسر قرآن اور علم عربیہ کے زبردست ماہر ہونے کے علاوہ قسطنطنیہ کے قاضی القضاۃ بھی تھے۔ انہوں نے ''**ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم**'' کے عنوان سے قرآن کریم کی تفسیر لکھی ہے جس کے بارے میں صاحبِ ''کشف الظنون'' نے لکھا ہے کہ یہی وہ تفسیر ہے جو ''کشاف'' کے بعد تصنیف ہوئی اور جس اعتبار اور اشتہار کے رتبہ کو پہنچی ہے، ''بیضاوی'' اس کو نہیں پہنچی اور یہاں تک اس کے حسن سبک اور لطیف تعبیر سے اس کے نسخے دُنیا کے ہر ملک میں پہنچے اور محول علماء و کبار فضلاء نے اس کو سندِ قبولیت دی اور اس کے مصنف کو خطیب المفسرین کا خطاب دیا...

چنانچہ قسطنطنیہ کے قاضی القضاۃ، مفتی ابو السعود حنفی وہ واحد عالم دین تھے جنہیں مولانا مصلح الدین لاری حنفی الہندی مناظرے میں شکست نہ دے سکے وگرنہ مولانا مصلح الدین لاری مناظروں میں عرب و عجم کے تمام علماء فضلاء پر ہمیشہ غالب رہے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس لکھتے ہیں:

''مولانا مصلح الدین لاری علوم عربیہ اور حکمیہ کے ماہر حنفی عالم تھے۔ ۹۶۰ھ میں حجاز کی طرف ہجرت کی اور قسطنطنیہ پہنچ کر علماء سے مناظرے کئے، سب پر غالب آئے، مگر مفتی ابوالسعود حنفی کے سامنے ان کی نہ چل سکی۔ پھر وہاں سے دیار بکر کے شہر آمد میں آئے اور بڑی قدر و منزلت کے ساتھ رہے''۔

مولانا عبدالحئی حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الشیخ الفاضل العلامہ'' مصلح الدین لاری علومِ عربیہ اور معارفِ حکمیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ برسوں مسند تدریس مزین کئے رہے۔ ان سے سلطان سندھ مرزا شاہ حسین اور دوسرے اہل علم میں سے بیشمار افراد نے اکتسابِ علم کیا۔ ۹۶۰ھ میں مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور واپس نہ لوٹے''۔

مولانا مصلح الدین لاری کے مدرسے کی شہرت دور و نزدیک پھیلی ہوئی تھی۔ طالبانِ حق اور تشنگانِ علم جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق مستفید و مستفیض ہوتے۔ بڑے بڑے علماء و فضلاء بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے اور ان کے شاگردوں میں سے بے شمار افراد نامور علماء بنے۔ مولانا مصلح الدین لاری کی علمی جلالت و عظمت کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ سلطانِ سندھ مرزا شاہ حسین بھی ان کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہے۔ جیسا کہ مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ''تاریخ معصومی'' کے حوالے سے ''تاریخ سندھ'' جلد دوم میں مولانا مصلح الدین کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا مصلح الدین نہایت دانشمند اور متبحر عالم تھے، کچھ عرصہ انہوں نے مرزا شاہ حسین کو بھی تعلیم دی۔ ۹۵۱ء میں وہ حج کی غرض سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ ان کی تصانیف میں شرح شمائل نبوی، حواشی تفسیر بیضاوی، شرح منطق فارسی اور دوسرے رسائل شامل ہیں۔''

مولانا مصلح الدین نے درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا اہم کام بھی جاری رکھا۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر بے شمار کتب و رسائل تصنیف کئے اور بعض قابلِ قدر شرحیں بھی لکھیں۔ مولانا عبدالقدوس اپنے مقالے مطبوعہ ''تاریخ

ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" کی جلد دوم (عربی ادب) میں لکھتے ہیں کہ مولانا مصلح الدین کی تصانیف میں تین کتابیں ممتاز ہیں۔

۱۔ حواشی بیضاوی، حدیث میں ۲۔ شرح شمائل ترمذی اور ۳۔ شرح اربعین نووی

مولانا مصلح الدین کی یہ شرح "الاربعین النوویۃ" کی بہترین شروح میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب انہوں نے ترکیہ میں اپنے قیام کے دوران لکھی تھی۔ چہل حدیث کے موضوع سے ترکیہ کے اہلِ علم کو بڑا گہرا شغف رہا ہے اور اس پر جتنا کام ترکوں نے کیا ہے اتنا شائد اور کسی اسلامی ملک میں شاذ و نادر ہی ہوا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کی مقبولیت نے ہی مولانا لاری کو اس کام پر آمادہ کیا تھا۔ چہل حدیث کے موضوع پر چونکہ بہترین کتاب امام نووی کی ہے اس لئے شرح کے لئے اسی کو منتخب کیا گیا۔ یہ کتاب انہوں نے ایک ترک وزیر اعظم علی پاشا کے لئے تصنیف کی تھی جیسا کہ انہوں نے اس کی خود بھی صراحت کی ہے۔

مولانا لاری کی یہ شرح مفصل بھی ہے اور جامع بھی۔ کتاب کے اٹھائیس صفحات صرف اربعین نووی کے خطبے اور مقدمے کی شرح پر مشتمل ہیں۔ اسی سے باقی تفاصیل کا اندازہ ممکن ہے۔ اسی طرح اس شرح کی جامعیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ وہ سب سے پہلے الفاظِ حدیث کی لغوی تشریح کرتے ہیں۔ اس کے بعد متقدمین و متاخرین علمائے حدیث کے اقوال نقل کرتے ہیں اور ان کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور سب سے آخر میں اپنی رائے دیتے ہیں۔ صرف چالیس احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شرح پورے سوا دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس کا ایک نادر نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

وہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو چہل حدیث کے فن کو عام کرنے کی بنیاد بنی یعنی "**من حفظ علی امتی اربعین حدیثاً فی امر دینها بعثه الله تعالیٰ یوم القیامة فی زمرة الفقها**" کہ جس نے امورِ دین کے بارے میں چالیس احادیث میری امت کے لئے محفوظ کر دیں، اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فقہاء کے زمرے میں اٹھائے گا۔ اس حدیث کو علماء اصولِ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام نووی نے ایسی ضعیف حدیث پر عمل پیرا ہو کر یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ اس لئے وہ اس کے جواز میں علماء کا اجماع نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **و قد اتفق العلماء علی جواز العمل بالحدیث الضعیف**

فی فضائل الاعمال، یعنی علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اعمال کے فضائل کے ضمن میں ضعیف حدیث پر بھی عمل جائز ہے۔
مولانا لاری اس قول کی تشریح یوں کرتے ہیں: لعل مراد القائل انه یجوز روایة الحدیث للعمل بقضاه و حاصله انه اذا ثبت فضیلة نوع من العمل بحدیث حسن او صحیح یجوز العمل فی ذلک الباب ای فی عمل خاص من ذلک النوع بمقتضی الحدیث الضعیف بل یستحب کما ثبت مشروعیه ابلاغ الحدیث بالصحاح مجمع العلماء الاربعین بمقتضی الحدیث الضعیف ،ترجمہ: اس سے قائل کی مراد یہ ہے کہ ضعیف حدیث کے مطابق بھی عمل جائز ہے، اور اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی قسم کے عمل کی فضیلت کسی دوسری حسن یا صحیح حدیث سے ثابت ہو جائے تو اس خاص نوع کے اعمال کے سلسلے میں ضعیف حدیث پر بھی عمل جائز بلکہ مستحب ہو گا۔ مثلاً حدیث کی اشاعت و تبلیغ تو صحاح سے ثابت ہے۔ اب اسی اشاعت و تبلیغ کی ایک خاص نوع یعنی چہل حدیث کے مجموعے تیار کر کے عام کرنا بھی جائز ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت نے اس مذکورہ بالا ضعیف حدیث پر بھی عمل کیا اور بہت سے علماء و مشائخ نے چہل حدیث کے مجموعے مرتب کئے۔
مولانا مصلح الدین لاری نے شرح اربعین نووی، شرح شمائل ترمذی اور حواشی بیضاوی کے علاوہ فقہ شافعی میں 'شرح ارشاد' علم میراث میں ''شرح سراجیہ''، نحو میں 'حاشیہ شرح جامی'، علم بلاغت میں ''حاشیہ مطول''، عقائد میں ''شرح مواقف'' فلسفہ میں ''حواشی شرح ہدایۃ الحکمۃ''، ''رسالہ فی بحث الحرکۃ''، ''رسالہ فی تحقیق المعاد والمبداء''، منطق میں ''شرح تہذیب المنطق'' اور ''رسالہ فی بحث تمام المشترک''، علم فلکیات میں ''شرح تذکرہ'' لکھنے کے علاوہ کئی اور کتابیں بھی تصنیف کیں۔
مناظر اسلام، استاد الاساتذہ مولانا مصلح الدین حنفی لاری نے ۹۷۱ھ وفات پائی۔

علی متقی جونپوریؒ

شیخ علی متقی جونپوری کا شمار برصغیر پاکستان و ہند کی معروف و ممتاز دینی و روحانی شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ متبحر عالم، بلند پایہ محدث، جلیل القدر فقیہ اور بے مثال مفسرِ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ مقام صوفی اور عارف باللہ بھی تھے۔

ان کا نام ونسب یوں ہے:

علی بن حسام الدین بن عبد الملک بن قاضی خان متقی جونپوری۔

شیخ علی متقی جونپوری حنفی المذہب تھے اور سلسلۂ عالیہ قادریہ سے روحانی نسبت رکھتے تھے۔ انہیں سلسلۂ عالیہ چشتیہ اور شاذلیہ میں بھی خرقۂ خلافت و اجازۃ حاصل تھی۔ جامع کمالات ظاہری و باطنی تھے۔

شیخ محمد اکرام ''رودِ کوثر'' میں لکھتے ہیں: ''شیخ علی متقی، جن کا فیض شیخ عبد الحق (محدث دہلوی) کو شیخ عبد الوہاب کی وساطت سے پہنچا خود ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں اور خاص شان اور پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کا آبائی وطن جونپور تھا۔ لیکن وہ خود مانڈو میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ خاندان کے تھے اس لئے عنفوانِ شباب امراء و اکابر کے درمیان گزرا۔ لیکن عین عالمِ شباب میں ایک جذبہ کے تحت دنیوی دلچسپیاں ترک کر دیں اور ملتان پہنچ کر شیخ حسام الدین متقی کی خدمت میں راہِ سلوک طے کی اور تفسیر بیضاوی اور عین العلم کا درس لیا۔ وہاں سے مانڈو اور احمد آباد کے قیام کے بعد حجاز روانہ ہوئے اور مزید علمی اور روحانی سربلندی کا سامان کیا۔ آپ کے اساتذہ میں شیخ ابو الحسن البکری، شیخ محمد سخاوی اور شیخ ابن حجر مکی جیسے بزرگ تھے۔ تکمیلِ علم کے بعد درس و تصنیف میں مشغول ہو گئے اور بڑا درجہ حاصل کیا۔ حتیٰ کہ آپ کے استاد شیخ ابن حجر مکی

سلوک میں آپ کے مرید ہو گئے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔
شیخ علی متقی کے علمی و روحانی کمالات اور ان کی دینی و تبلیغی خدمات کو تمام مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے تسلیم کیا ہے اور ان کا تعارف و تذکرہ شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحئی حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں لکھتے ہیں:

''الشیخ الامام العالم الکبیر المحدث علی بن حسام الدین بن عبد الملک ابن قاضی خان متقی الشاذلی چشتی برہان پوری مہاجری و دفین مکہ عفت و عبادت کی گود میں پروان چڑھے۔ والد نے صغرسنی ہی میں انہیں شیخ بہاء الدین صوفی سے بیعت کرا دیا۔ جب بالغ ہوئے تو شیخ نے اپنا تقرب بخشا اور اپنی نیابت کے لئے منتخب فرما لیا۔ شیخ کی رحلت کے بعد ان کے بیٹے شیخ عبد الحکیم نے خرقہ خلافت عنایت فرمایا۔ آپ نے شیخ عبد الحکیم کی خدمت میں باریاب رہنے کی درخواست کی تو شیخ نے آپ کو اپنی صحبت سے اہم طریق الحق پر گامزن ہونے کی ہدایت فرمائی جس پر آپ سفر کے لئے کمربستہ ہو گئے اور ملتان آ کر شیخ حسام الدین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے۔ دو سال تک رہے۔ ان سے اکتساب علم کرنے کے بعد حدیث ابو الحسن شافعی البکری سے پڑھی اور ان کی طریقۂ قادریہ میں بیعت کی۔ ان دونوں طریقوں میں علامہ سخاوی مصری سے استفادہ کیا۔ حدیث ابن حجر مکی شافعی شاذلی سے بھی پڑھی اور بیت اللہ کے جوار میں طرحِ اقامت ڈال دی۔ سلطان محمود شاہ صغیر گجراتی ان کے مرید تھے۔''

آصفی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ سے سلطان محمود شاہ کے پاس آئے اور اس نے آپ کی خاطر مدارت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس لکھتے ہیں:

علاء الدین بن حسام الدین متقی برہان پوری محدث کبیر اس دور کے علماء کے واسطۃ العقد تھے۔ شریعت و طریقت میں تربیت پانے کے بعد ملتان پہنچے اور شیخ حسام الدین متقی ملتانی سے ''تفسیر بیضاوی'' اور ''عین العلم'' پڑھی۔ وہاں سے حجاز گئے، ابو الحسن بکری اور ابن

حجر مکی سے علوم حدیث کی تکمیل کی اور بقیہ زندگی حجاز ہی میں گزاری۔ اس دوران دو مرتبہ ہندوستان بھی تشریف لائے اور سلطان محمود صغیر گجراتی نے ان کی بڑی قدر کی۔ وہ حجاز میں زائرین اور محتاجوں کی امداد کرتے تھے۔ جس کا بہت سا حصہ گجرات کے شاہی خزانہ سے آتا تھا۔

شیخ علی متقی کی علمی شان اور مناقب میں ایک رسالہ ''القول التقی اور مناقب المتقی'' علامہ فاکہی نے لکھا ہے۔ چنانچہ علامہ فاکہی بیان کرتے ہیں:

''شیخ علی متقی کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ انہوں نے علم حدیث، فقہ، منطق علم الکلام اور تصوف و اخلاقیات پر ایک سو سے زائد اہم اور بیش قیمت کتابیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر زبید احمد نے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں ''کنز العمال'' کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شیخ علی متقی کی سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے اور ان کی کتاب ''شئون المنزلات'' جو قرآن کی تفسیر ہے، کے بارے میں لکھا ہے کہ اس تفسیر میں انہوں نے آیاتِ قرآنی کے سبب و محلِ نزول کا تذکرہ کیا ہے جو مستند و مسلم قرار دیئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بعض الفاظ اور جملوں کی لغوی اور لسانیاتی توضیحات بھی کی ہیں اور ان موضوعات پر سند کا درجہ رکھنے والوں کے حوالے دیئے ہیں۔ اس کتاب میں آیت بہ آیت پورے متن کی تفسیر نہیں لکھی گئی ہے بلکہ صرف ایسی آیات کی تشریح کی گئی ہے جن کی مستند توضیحات موجود ہیں اور جن کے سبب النزول کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔''

شیخ علی متقی اپنی مشہور کتاب ''کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال'' کے بارے میں خود لکھتے ہیں کہ امام جلال الدین سیوطی نے احادیث کا سب سے بڑا مجموعہ ''جمع الجوامع'' مشہور بہ ''جامع کبیر'' تیار کیا تھا۔ پھر خود ہی اس کی قولی حدیثوں کا انتخاب ایک دوسری تالیف ''جامع صغیر، اور اس کے تکملہ (زوائد الجامع الصغیر) کو ترتیب دے کر اس کا نام ''منہج العمال فی سنن الاقوال'' رکھا۔ پھر ''جمع الجوامع'' کی بقیہ قولی حدیثوں کو ''الاکمال'' کے نام سے مبوّب کیا۔ پھر ان دونوں کتابوں کو جمع کر کے نئی تالیف کا نام

''غایۃ العمال فی سنن الاقوال'' رکھا۔ پھر ''جمع الجوامع'' کی فعلی حدیثوں کو مبوب کیا اور اس کا نام ''مستدرک الاقوال بسنن الافعال'' رکھا۔ پھر ''غایۃ العمال'' اور ''مستدرک الاقوال'' کو جمع کر کے اس کا نام ''کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال'' رکھا۔ یہ کتاب حیدر آباد سے آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے اور مصر میں مسند احمد کے حاشیہ پر بھی موجود ہے۔

امام علاء الدین علی متقی ہندی کی کتاب ''کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال'' درحقیقت احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائرہ معارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے۔ امام سیوطی نے احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ذخائر مختلف مجموعات کی شکل میں مرتب کئے تھے انہیں شیخ علی متقی نے یکجا کر کے اس خوش اسلوبی سے مرتب کر دیا کہ ان سے استفادہ بہت آسان ہو گیا۔ تمام احادیث کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے مختلف فقہی ابواب کے تحت مرتب کیا ہے... ''کنز العمال'' کے متعلق شیخ ابو الحسن الشافعی البکری کہا کرتے تھے کہ ''سیوطی نے اگر حدیث کے مجموعات مرتب کر کے دنیا پر احسان کیا ہے تو علی متقی نے ان مجموعات کو یکجا کر کے حروفِ تہجی کے مطابق فقہی ابواب کے تحت انہیں ترتیب دے کر خود سیوطی پر بڑا احسان کیا ہے۔''

شیخ علی متقی نے ترتیب وتبویب میں جس امانتِ علمی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف اہلِ تقویٰ اور صاحبِ کمال فقہا وصلحاء ہی کی شان ہے۔ کسی قسم کی کمی یا اضافہ تو کجا انہوں نے تو سیوطی کے تمام مجموعات کے خطبے اور دیباچے بھی جوں کے توں نقل کر دیئے ہیں۔ وہ اپنی ''کنز العمال'' کی افادیت و جامعیت اور اپنی دیانت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''پس جسے یہ کتاب میسر آ گئی تو گویا اسے ترتیب ابواب سمیت ''جمع الجوامع'' بھی میسر آ گئی اور اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث بھی میسر آ جائیں گی جو ''جمع الجوامع'' میں نہیں کیونکہ مصنفؒ (سیوطی) نے ''جامع صغیر'' اور اس کے ضمیمے میں کچھ ایسی احادیث کا اضافہ کیا ہے جو ''جمع الجوامع'' میں موجود نہ تھیں۔ اب میں وہ دیباچے بھی پیش کرتا ہوں جو مصنف نے ''جامع صغیر'' اس کے ضمیمے اور ''جامع کبیر'' یعنی ''جمع الجوامع'' کے شروع میں لکھے تھے تاکہ میں نہ تو کسی چیز کو ترک کرنے کا مرتکب ٹھہروں اور نہ مصنف کے الفاظ میں سے کسی چیز کے تبدیل کرنے کا۔ انشاء اللہ۔''

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ''

(The contribution of India and Pakistan to the Arabic Literature) میں علی متقی کی ایک اور اہم کتاب "جوامع الکلم فی مواعظ الحکم" کا حوالہ دیا ہے (جو تصوف و اخلاقیات کے موضوع پر ہے) اور لکھا ہے کہ "اس کتاب کے مصنف علی متقی ہیں۔ اس کتاب میں تین ہزار کے قریب نصائح جمع کیے گئے ہیں جن میں پانچ سو ایسے اقتباسات ہیں جو قرآن پاک سے لئے گئے ہیں۔ پانچ سو تضمینات ہیں جو احادیث سے ماخوذ ہیں اور ان کے اختصار کے پیشِ نظر ان کے ساتھ بطور تمہید ہم معنی تشریحی جملے بھی لکھے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں تین سو اقوال ابو عطا سکندری کے اور ایک سو اقوال ان کے شاگرد کے ہیں۔ باقی ماندہ حصہ متقدمین کے اقوال پر مشتمل ہے۔ یہ تمام مواد مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق کوئی اسی (۸۰) ابواب کے تحت حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ مثلاً "باب فی الایمان" اور "باب فی الاحسان" وغیرہ۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ کتاب صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو حافظ، مفسر یا محدث ہیں اور تصوّف سے بھی شغف رکھتے ہیں۔"

صاحب نزہۃ الخواطر نے "النور السافر" کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ علی متقی بہت بڑے پارسا و متقی اور بے حد عبادت گزار اور ماسویٰ اللہ سے بے نیاز تھے۔ ان کی کرامات کا تذکرہ عام ہے۔ ازاں جملہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رویا میں دیکھا تو عرض کیا کہ اس دور میں افضل الناس کون شخص ہے؟ فرمایا تم ہو! پھر عرض کیا، دوسرا؟ فرمایا ہند میں محمد بن طاہر ہے۔ اسی شب ان کے شاگرد شیخ عبد الوہاب بعینہ یہی خواب دیکھ کر حضرت شیخ کے پاس اپنا خواب سنانے کے لئے آئے تو شیخ نے ان کے اظہار سے پہلے فرمایا کہ جو خواب جس طرح تم نے دیکھا اسی طرح میں نے دیکھا۔ یہ ۲۷ ماہ رمضان کی تھی۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر نے عبد القادر بن احمد فاکہی کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ علی متقی کی سیرت و ریاضتِ عظیمہ اور مجاہدات دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ شیخ تاج العارفین ابو الحسن البکری، عارف باللہ فقیہ الزاہد الوجیہ العمودی، شیخ امام الحرمین ابن حجر ہیتمی مکہ اور فقیہ شہر شمس الدین رملی ان سب حضرات کی تحریریں میرے پاس ہیں جو شیخ علی متقی کی جلالت و منزلت اور استقامت فی الدین کی مؤید ہیں۔ ان کے مناقب میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ممدوح کے ایک مرید نے مکہ مکرمہ میں شیخ کے زمانہ حیات میں نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کون سا عمل کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوا ''علی متقی کی پیروی کرو، جو وہ کرے تم بھی کرو۔''

شیخ حضرمی کے حوالے سے مولانا سید عبدالحیٔ نے لکھا ہے کہ ''شیخ علی متقی نہ صرف زمانہ کے حسنات میں سے تھے بلکہ تقویٰ میں ہندوستان کا نکتہ عروج اور باعث شہرت تھے۔ ان کا تذکرہ تسویہ سے مستغنی اور ان کی مدحت بیان سے بالاتر ہے۔ اس لئے کہ ان کی تعظیم تو دلوں میں سمائی ہوئی ہے۔''

شیخ مکہ، محدثِ کبیر، عالمِ شہیر، فقیہِ جلیل عارف باللہ حضرت شیخ علی متقی حنفی، قادری، چشتی شاذلی جونپوری نے ۲ جمادی الاول ۹۷۵ھ کو وفات پائی اور مکہ مکرمہ میں جبل کے کنارے واقع جنت المعلیٰ میں حضرت فضل بن عباسؓ کی قبر کے قریب دفن ہوئے۔

''حدائق الحنفیہ'' کے مطابق ان کی تاریخ ولادت ''سحر خیز'' اور تاریخ وفات ''شیخ مکہ'' ہے۔

شیخ عبدالعزیز دہلوی

شیخ عبدالعزیز دہلویؒ مغلیہ عہد کے اکابر علماء اور نامور مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا پورا نام ونسب یوں ہے:

عبدالعزیز بن طاہر عباسی دہلوی۔

شیخ عبدالعزیز دہلوی ۸۹۸ھ مطابق ۱۴۹۳ء میں ''شیرازِ ہند'' جونپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اُن کی کم سنی میں وفات پا گئے اور ان کی والدہ نے آپ کو پالا پوسا۔ شیخ محمد حسن چشتی (متوفی ۹۴۴ھ مطابق ۱۵۳۷ء) ان کے بڑے بھائی تھے۔ شیخ محمد حسن چشتی کے نامور مرید وخلیفہ شیخ امان پانی پتی تھے اور ان کے مرید اور خلیفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے والد بزرگوار شیخ سیف الدین سیفی دہلوی تھے۔

شیخ حسن طاہر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ تین بڑے روحانی سلاسل یعنی قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ سے روحانی نسبت رکھتے تھے۔ شیخ عبدالعزیز دہلوی کے تبحر علمی اور ان کے روحانی مرتبہ ومقام کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ جدید و قدیم تمام مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے ان کے احوال قلمبند کئے ہیں اور انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں، محمد غوثی مندوی نے ''گلزارِ ابرار'' میں، مولانا سید عبدالحیٰ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں، ڈاکٹر میاں سعید نے ''تذکرہ مشائخ شیراز ہند'' میں اور ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے ''رودِ کوثر'' میں شیخ عبدالعزیز دہلوی کے احوال بیان کئے ہیں۔ ڈاکٹر زبید احمد نے بھی اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں ان کی تصانیف کے حوالے سے ان کا ذکر کیا ہے جبکہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار

مولانا عبدالقدوس نے بھی ان کے حالات بیان کئے ہیں، جس سے ہم ان کے علمی اور روحانی کمالات کا تعین کر سکتے ہیں۔

محمد غوثی مندوی لکھتے ہیں ''آپ کا لقب عزیز الحق اور پدر بزرگوار کا نام شیخ کمال الحق حسن بن طاہر تھا۔ جونپور میں ۸۹۲ھ کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ دو سال بعد آپ کے والد نقل مکانی کر کے دہلی آ گئے وہاں پر کچھ عرصہ حیات رہے۔ آخری وقت پیش آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنے مریدِ رشید مولانا قاضی خان یوسف ناصحی ظفر آبادی کے سپرد کیا۔ ظاہری و باطنی تربیت و پرورش کی بدولت وہ کمالات پیدا ہو گئے جو آپ کی استعداد میں نہاں تھے۔ ستتر برس تک مسندِ وعظ و ارشاد پر رونق افروز رہے۔''

مولانا عبدالحیٔ حسنی لکھتے ہیں ''الشیخ الکبیر عبدالعزیز بن طاہر عباسی مشائخ کبار میں سے تھے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب حسینی بخاری دہلوی اور شیخ ابراہیم بن معین حسینی ایرجی سے اکتسابِ علم کیا۔ عوارف المعارف اور فصوص الحکم اور دیگر کتبِ تصوّف کا درس شیخ عبدالوہاب سے لیا اور طریقہ سہروردیہ میں ان ہی سے فیض یاب ہوئے۔ اور طریقہ قادریہ کے اوراد و اشغال شیخ ابراہیم بن معین سے اخذ کئے۔ شیخ قاضی خان اور شیخ تاج محمد جونپوری سے اجازۃ طریقتِ چشتیہ حاصل کر کے مزید اکتساب کے لئے دہلی کا سفر فرمایا اور یہاں فضیلت مشیخت سے سرفراز ہوئے۔''

مولانا عبدالحیٔ نے غلطی سے محمد بن عبدالوہاب لکھ دیا ہے۔ شیخ عبدالعزیز کے استاد کا نام شیخ عبدالوہاب بخاری ہے جو راجو قتال کے خلیفہ تھے۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید نے ''تذکرہ مشائخ شیراز ہند'' میں ''تجلی نور'' جلد اول قلمی کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''شیخ عبدالعزیز چشتی، مخدوم جلال الحق قاضی خان ناصحی ظفر آبادی کے اجل خلفاء میں سے تھے، علوم شریعت و طریقت پر مکمل عبور حاصل تھا اور سلسلہء چشتیہ کے اپنے زمانے کے بڑے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے۔''

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم عربی ادب کے مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس لکھتے ہیں:

> ''شیخ عبدالعزیز بن حسن بن طاہر دہلوی سلسلہ چشتیہ کے مشہور

بزرگ گزرے ہیں۔ لقب ''بحر مواج'' تھا اور اپنے آپ کو ''ذرہ ناچیز'' لکھتے تھے۔''

شیخ محمد اکرام ''رودِ کوثر'' میں مغلیہ عہد کے ابتدائی زمانے میں چشتیہ سلسلہ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت چراغ دہلیؒ کے بعد نظامی سلسلہ دہلی سے منتشر ہو گیا اور جونپور، کالپی، گلبرگہ، پٹن اور پنڈوہ ان بزرگوں کے قدوم سے فیض یاب ہوئے لیکن اکبر کی تخت نشینی سے کچھ عرصہ پہلے دہلی میں اس خانوادے کے ایک ایسے بزرگ نے ظہور کیا جنہوں نے پھر سے اولیاء کبار کی نیک نفسی اور پاک سیرتی کی یاد تازہ کر دی۔ یہ بزرگ شیخ عبدالعزیز دہلوی ہیں جنہیں عوام میں شہرت حاصل نہیں ہوئی، لیکن جن کا ذکر خواص کی روح کو تازگی بخشتا ہے۔ ان کے والد شیخ حسن طاہر جونپور کے مشائخ کبار میں سے تھے۔ سکندر لودھی کی استدعا پر دہلی تشریف لائے۔''

شیخ محمد اکرام مزید لکھتے ہیں:

شیخ عبدالعزیز اپنے والد کے خلیفہ میاں قاضی خان ظفر آبادی کے مرید تھے۔ علومِ ظاہری کی تکمیل سید راجو قتال کے خلیفہ حاجی عبدالوہاب بخاری اور ان کے صاحبزادے میر سید محمد سے کی اور ارشاد و ہدایت میں عمر صرف کر دی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''اخبار الاخیار'' میں لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالعزیز اپنے زمانے میں مشائخ چشت کی یادگار تھے اور اخلاقِ حسنہ مثلاً تواضع، حلم، صبر و رضا، خلقِ خدا پر شفقت اور عنایت، غرض کہ فقراء میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی یہی لکھا ہے کہ ''شیخ عبدالعزیز محتاجوں کی حاجت روائی میں بڑی سعی و کوشش کرتے تھے۔ جب وہ شیخ قاضی خان کے پاس پہنچے تو اپنا مال و متاع، گھوڑا گاڑی اور جو کچھ پاس تھا، سارے کا سارا راہِ خدا میں تقسیم کر دیا۔''

اکبر کے دورِ حکومت کے ابتدائی زمانے میں شیخ عبدالعزیز چشتی کو بڑا قبولِ عام حاصل ہوا۔ بیرم خان، ان کا معتقد تھا اور دوسرے امرائے سلطنت بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔ عوام میں آپ ''بحرِ مواج'' اور ''شکر بار'' کے عرف سے مشہور تھے۔

شیخ قطب عالم آپ کے فرزند ارجمند تھے۔ جن کی نسبت مولانا عبدالحق محدث

دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں لکھا ہے:

''عالم و فاضل و صاحب اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ، قدم صفا و استقامت بر سجادہ پدر نہادہ اوقات بطاعت و عبادت معمور دارد''
ان خوبیوں کے علاوہ شیخ قطب عالم دو اور اسباب کی بناء پر یاد کے مستحق ہیں۔ ایک تو ان کی پوتی حضرت شاہ ولی اللہ قدوس سرہٗ کی دادی تھیں اور انہیں ایک ایسے خاندان سے تعلق تھا جس کے احسان سے اسلامی ہندوستان کبھی عہدہ براء نہیں ہو سکتا۔ دوسرے حضرت مجدد الف ثانی کے مرشدِ طریقت حضرت خواجہ باقی باللہ نے ایک زمانے میں ان کی خانقاہ میں رہ کر ان سے روحانی فیض حاصل کیا۔ تجلی نور کے حوالے سے قصبہ بلگرام کے سادات کا تعلق ان سے ان کے داماد سید حسین بلگرامی کے واسطہ تعلق سے ہے۔''

شیخ محمد اکرام نے شیخ عبدالعزیز دہلوی کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً شیخ امان پانی پتیؒ کے رسالہ ''غیریہ'' کے جواب میں آپ نے رسالہ ''عینیہ'' تحریر کیا اور ''آداب السلوک'' بھی علمِ سلوک کے متعلق تصنیف کی۔ آپ کے والد شیخ حسن طاہر بھی مصنف تھے اور تذکروں میں ان کی کتاب ''مفتاح الفیض'' کا ذکر آتا ہے۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ شیخ نے ۲۲ کتابیں تصنیف کیں۔ ازاں جملہ: ا۔شرح الحقیقۃ المحمدیہ۔ مؤلفہ شیخ وجیہ الدین گجراتی۔ ۲۔ رسالہ عینیہ فی الرد علی الغیریہ، مصنفہ شیخ عبدالملک بن عبدالغفور معروف بہ شیخ امان پانی پتی ۔۳۔ الرسالۃ العزیزیہ در اذکار و اشغال صوفیہ ۔۴۔ عمدۃ الاسلام در فقہ حنفی بزبان فارسی۔

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں شیخ عبدالعزیز دہلوی کا تذکرہ ان کے رسالہ ''عینیہ'' کے حوالے سے کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر زبید احمد سے ایک فاش غلطی یہ ہوگئی ہے کہ انہوں نے شیخ کے احوال بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''شیخ عبدالعزیز دہلوی بن حسن بن طاہر جونپوری ۸۹۸ھ میں جونپور میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں اپنے والد کے ساتھ دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ علومِ ظاہری و باطنی اپنے والد سے حاصل کئے۔'' جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ شیخ عبدالعزیز کے والد

جونپور سے دہلی منتقل ہونے کے بعد کچھ عرصہ حیات رہے اور پھر راہیِ ملک عدم ہوئے۔ چنانچہ محمد غوثی مندوی مولف گلزارِ ابرار کے بیان کے مطابق شیخ کے والد شیخ کمال الحق حسن بن طاہر نے اپنے کم سن بیٹے کو اپنے مریدِ رشید مولانا قاضی خان یوسف ناصحی ظفرآبادی کے سپرد کیا تھا جنھوں نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی۔ جیسا کہ ''تذکرہ مشائخ شیراز ہند'' کے مولف ڈاکٹر میاں محمد سعید نے ''تجلی نور'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''شیخ عبدالعزیز چشتی مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خان ناصحی ظفرآبادی کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ نیز یہ کہ ان کو علوم شریعت و طریقت پر مکمل عبور حاصل تھا۔'' یہاں ایک غلطی مولانا سید عبدالحیٔ حسنی سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ انہوں نے ''نزہۃ الخواطر'' کی جلد چہارم میں شیخ عبدالعزیز دہلوی کے احوال بیان کرتے ہوئے شیخ قاضی خان ناصحی ظفرآبادی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ شیخ عبدالعزیز کے والد کے یارانِ طریقت میں سے تھے۔ جبکہ معاصر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق شیخ قاضی خان ظفرآبادی، شیخ عبدالعزیز کے والد شیخ حسن طاہر کے مرید تھے۔

شیخ عبدالعزیز دہلوی نے کثرتِ عبادت، خدمتِ خلق اور تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ وعظ و ارشاد اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ قرآن حکیم کی تفسیر کے علاوہ تصوف کی کتب بالخصوص ''عوارف المعارف'' اور ''فصوص الحکم'' اور ان کی شروح پر درس دیتے تھے۔

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم عربی ادب کے مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس نے لکھا ہے کہ شیخ عبدالعزیز دہلوی کی تمام تصنیفات ناپید ہیں جبکہ فاضل محقق ڈاکٹر زبید احمد اور مولانا سید عبدالحیٔ حسنی نے ان کی تصانیف کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی بلکہ ان کی کتب کی فہرست دی ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے بھی ان کی کتابوں کے ناپید ہونے کے بارے میں اشارہ تک نہیں کیا۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں میاں قاضی خان ظفرآبادی کے احوال بیان کئے ہیں، چنانچہ پہلا جملہ ہی یہ لکھا ہے: ''آپ شیخ حسن کے مرید اور خلیفہ تھے۔ راہِ طریقت کے صادقین میں سے تھے۔ صاحبِ کرامت و استقامت اور اہلِ حرمت و تقویٰ تھے، زمانہ کے لحاظ سے اگرچہ آپ متاخرین میں سے تھے لیکن صفائی معاملہ کے پیشِ نظر متقدمین میں شمار ہوتے تھے۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی مزید لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالعزیز بن حسن طاہرؒ میاں قاضی خان کے خلیفہ اور متاخرین مشائخ چشتیہ کے مشہور بزرگ تھے۔ علوم شریعت و طریقت کے عالم تھے۔ بچپن میں جو وظائف و اوراد اور اوقات مقرر کئے تھے وہ آخر عمر تک باقی رکھے۔ مشائخ کی پیروی اور ان کے قواعد اور آداب کی حفاظت میں یکتائے زمانہ تھے۔ بچپن ہی سے عبادت و ریاضت اتنی کی کہ مشائخ کے مرتبہ پر پہنچ گئے۔ اپنے زمانے میں مشائخِ چشت کی یادگار تھے۔ دہلی میں آپ کی وجہ سے سلسلۂ ارشاد و وعظ اور مشیخیت قائم تھا۔ سماع کے قائل تھے۔ کہتے ہیں کہ رحلت کے وقت بھی ذوق و حالت کی کیفیت تھے۔ آپ نے یہ آیت پڑھ کر انتقال فرمایا

فسبحان الذی بیده ملکوت کل شئی و الیه ترجعون

ترجمہ:

پروردگارِ عالم کے دستِ قدرت ہی میں تمام چیزوں کی ملکیت ہے اور اسی کے پاس سب کو جانا ہے۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ان کی یہ تاریخ وفات کہی ہے۔

شیخ کامل، عارف دوراں خود عبدالعزیز
آنکہ می داد اہل دل را مجلسش یاد از بہشت
ہرچہ از اوصاف اہل اللہ در عالم بود
حق تعالیٰ از ازل فطرت بذاتِ او سرشت
یادگارِ اہلِ چشت او بود در دورانِ خود
گشت ازاں تاریخ فوتش یادگارِ اہلِ چشت
۹۷۵ھ

شیخ عبدالعزیز دہلوی کے فرزند ارجمند شیخ قطب عالم ہیں جو بڑے عالم فاضل، خوش اخلاق اور خوش سیرت ہیں۔ صدق و استقامت میں اپنے والد کے سجادہ نشین تھے اور اکثر و بیشتر اطاعت و عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ شیخ عبدالعزیز کے سب سے بڑے خلیفہ شیخ جائیلدہ ہیں جو تمام مریدوں اور خلفاء میں خصوصیت، عزت اور رازداری کے مالک ہیں۔ بعض لوگ انہیں شیخ کا جانشین قرار دیتے ہیں۔ شیخ کے ایک دوسرے خلیفہ شیخ عبدالغنی بدایونی ہیں جو عالمِ باعمل، صاحبِ حال و ریاضت اور گوشہ نشین ہونے کے باوجود

تمام آداب سلوک سے متصف ہیں اور دہلی شہر کے اندرون میں واقع فیروز شاہی عمارت کی مسجد میں مصروف عبادت رہتے ہیں۔ اُن کے طور طریقہ اور حالات سے استقامت اور روحانی قوت کے آثار نمایاں ہیں۔"

یہ بزرگ مولانا عبدالحق کے ہم عصر تھے۔ اس لئے مولانا محدث نے ان کے لئے حال کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

شیخ کبیر فاضل اجل عارف باللہ مولانا عبدالعزیز دہلوی نے ۶ جمادی الثانی ۹۷۵ھ مطابق ۱۵۶۷ء کو وفات پائی اور اپنی خانقاہ کے صحن میں دفن کئے گئے۔ آپ اپنے آپ کو "ذرّہ ناچیز" کہا کرتے تھے اور مکتوبات میں بھی اپنے نام کے ساتھ "ذرّہ ناچیز" لکھتے تھے۔ اُن کی وفات پر جب اس کے اعداد شمار کئے گئے تو آپ کا سالِ وفات بھی یہی تھا۔

شیخ بایزید انصاری

شیخ بایزید انصاری تحریک روشنیہ کے بانی تھے اور پٹھانوں کے قبیلہ اڑمڑے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد ماجد کا نام قاضی عبداللہ تھا جو شیخ سراج الدین کی اولاد میں سے تھے۔ شیخ بایزید انصاری نے صوبہ سرحد اور افغانستان میں بہت شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ان کے تبحر علمی کے علاوہ ان کی پُرکشش روحانی شخصیت نے اپنے معتقدین پر گہرے اور دوررَس اثرات مرتب کیے اور وہ پیر روشن میاں بایزید انصاری کے نام سے مشہور ہوئے۔

شیخ بایزید انصاری ۹۳۲ھ/ ۱۵۲۵ء میں پنجاب کے قدیمی شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ یہی وہ سال ہے جب مغل فاتح ظہیرالدین بابر برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہوا۔ اگلے ہی برس اُس نے پانی پت کے میدان میں سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر ہندوستان میں افغان حکومت کا خاتمہ کر دیا اور سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی۔ شیخ بایزید کا شجرۂ نسب صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ ڈاکٹر جہانگیر نے اپنے مضمون مطبوعہ ''اورینٹل کالج میگزین'' لاہور اشاعت فروری ۱۹۵۵ء میں ''تذکرۃ الانصار'' کے حوالے سے شیخ بایزید کا مکمل شجرہ نسب درج کیا ہے اور شیخ بایزید انصاری کی اپنی تصنیف ''حالنامہ'' (قلمی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری) میں بھی ان کا شجرہ نسب موجود ہے۔

شیخ محمد اکرام نے ''رودِ کوثر'' میں لکھا ہے:

> ''میاں بایزید ایک ممتاز اور اہل علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد عبداللہ کوہستان (وزیرستان) میں معتبر اور قاضی تھے۔

خاندان کے کچھ لوگ تو افغان علاقے میں رہتے تھے اور ایک شاخ ہندوستان میں بھی آباد تھی۔ بایزید کے باپ دادا بھی اس سلسلے میں ہندوستان آتے جاتے تھے اور جالندھر میں بایزید کے دادا کا ایک بھائی مقیم تھا۔ یہیں عبداللہ کی شادی ہوئی اور ۱۵۲۵ء میں بایزید پیدا ہوئے۔"

"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" چوتھی جلد (فارسی ادب:دوم) کے مقالہ نگار حامد خان حامد لکھتے ہیں:

"شیخ بایزید بچپن سے نیکی اور پارسائی کی طرف مائل تھے۔ ابتدائی تعلیم ملاّ پائندہ، اور اپنے بھائی یعقوب اور ملاّ سلیمان سے حاصل کی۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ہمیشہ پیر کامل کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اور ریاضتیں اور مجاہدے کرتے تھے۔ اس دوران قندھار کا سفر بھی کیا اور پھر واپس آ کر پانچ سال تک خلوت نشین رہے۔ اس کے بعد لوگوں سے فرمایا کہ جو کوئی میرے پاس آئے گا، سکونِ قلبی سے بہرہ وَر ہوگا۔"

شیخ بایزید انصاری نے اپنی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے ایک رسالہ تحریر کیا۔ چنانچہ اُن کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے:

۱...... شریعت: شریعت کے اوامر و نواہی کی پوری پوری تقلید اور قرآنی احکام و سنت نبویؐ کی پیروی۔

۲...... طریقت: شرعی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسری عبادتوں کی طرف بھی توجہ دینا۔ شریعت و طریقت لازم و ملزوم ہیں۔

۳...... حقیقت: جو انبیاء علیھم السلام کا شیوہ ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی ذکرِ خفی، طہارتِ قلب اور یادِ خدا سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

۴...... معرفت: اس کی بنیاد قوت، عقل، فکر اور مشاہدے پر قائم ہے۔

۵...... قربت: جو بلند مراتب طے کرنے اور نفس پر قابو پا لینے کا نام ہے۔

۶...... وصلت: انسان کو چاہیے کہ اپنی ہستی کو بھلا کر اپنے اندر صفات الٰہی پیدا کرے۔

۷...... وحدت: انسان کو چاہیے کہ توحید میں اپنے آپ کو فنا کر کے ذاتِ حق کو اپنے دل

میں بسا لے۔

۸..... سکونت: یہ خود تحقیق کی آخری منزل ہے۔

شیخ بایزید انصاری نے جنوبی وزیرستان کے ایک اہم مقام کالڑی گرم کو اپنا مرکز بنا کر اپنی تحریک کا باقاعدہ آغاز کیا۔ یہی وہ تحریک ہے جو آگے چل کر تحریک روشنائی کہلائی بلکہ شیخ بایزید کے تذکرہ نگار حامد خان حامد نے تو یہ لکھا ہے:

''ایک پہلو سے آپ کی تحریک روشنائی مذہب کے روپ میں ایک ملّی تحریک تھی۔ اس تحریک کے پرچم تلے تمام پٹھان بلاامتیاز قبیلہ و خاندان جمع ہو گئے۔ آفریدی، مہمند خیل، اورک زئی، بنگش اور یوسف زئی سب نے متحد ہو کر آپ کی قیادت کو قبول کیا۔ اس تحریک کے ذریعے وہ پٹھانوں میں تزکیہ نفس، حسن اخلاق، بلند سیرت و کردار، تفکر و تعقل اور حصولِ علم کے جذبات کو ابھارنا چاہتے تھے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ آپ اس تحریک کے ذریعے سے پٹھانوں میں تنظیم پیدا کر کے افغانوں کی ایک داخلی اور قومی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور مغل جو ہندوستان میں غلبہ پا چکے تھے، ان کی غلامی سے اپنے علاقے کو آزاد رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کی مغلوں سے جنگ ہوئی جس کی وجہ سے ایک بار قیدی بھی ہوئے۔''

شیخ بایزید انصاری کے معتقدین اور شاگردوں میں بڑے نامی گرامی علماء شامل تھے۔ مثلاً ملّا ارزانی، ملّا عمر، ملّا علی محمد مخلص خویشگی، ملّا پائندہ، ملّا دولت اکوزئی اور ملّا دولت مہمند زئی۔ ان علمائے کرام نے تحریک روشنائی کو بڑی طاقت و توانائی فراہم کی اور یہ اہل علم شیخ بایزید کے دست و بازو ثابت ہوئے۔ کالڑی گرم کے بعد اس افغان تحریک کا مرکز کلاز ہیر میں منتقل ہو گیا جو اُس زمانے میں ضلع مردان میں شامل تھا۔

شیخ بایزید انصاری نے وعظ و تلقین اور اصلاح و ارشاد کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ اُن کے تذکرہ نگار حامد خان حامد لکھتے ہیں:

''آپ ایک بلند پایہ ادیب، قابل قدر انشاء پرداز اور صاحب طرز شاعر بھی تھے اور مسکین تخلص کرتے تھے۔ آپ کے متبعین میں اُس

دور کے پشتو شاعروں کا ایک مستقل سکول ملتا ہے۔ آپ کی تقلید کرنے والوں میں ملّا ارزانی، میرزا خان انصاری اور دولت روحانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بعد ازاں پشتو زبان کے مشہور ادیب عبدالسلام اور عبدالحلیم بن عبداللہ بن اخوند درویزہ نے آپ کے طرزِ تحریر کو اختیار کیا۔ آپ کے طرزِ تحریر کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے ہم عصر ابوالقاسم نے اپنی پشتو کی مشہور کتاب ''فوائدالشریعہ'' (مؤلفہ ۹۶۸ھ) آپ ہی کی کتاب ''خیرالبیان'' کی طرز پر لکھی۔ آپ کے اندازِ بیان نے صرف معتقدین کو متاثر نہیں کیا بلکہ آپ کے مخالفین نے بھی اس سے اثر قبول کیا۔ مثلاً اخوند درویزہ نے جو آپ کے زبردست مخالف تھے آپ کی طرزِ انشا میں ''مخزن اسلام'' اور فارسی میں ''تذکرۃ الابرار والاشرار'' کے عنوان سے کتابیں تصنیف کیں۔''

شیخ بایزید انصاری کی تصنیفات میں سے ''خیرالبیان،'' ''صراط التوحید،'' ''فخر الطالبین،'' ''مقصود المؤمنین'' اور ''حالنامہ'' مشہور ہیں۔ ''خیرالبیان'' اُن کی اہم ترین تصنیف ہے جس کا واحد نسخہ برلن جرمنی میں محفوظ ہے، جس کا روٹو گراف پشتو اکیڈیمی پشاور نے بطور خاص منگوایا تھا۔ یہ کتاب چار زبانوں یعنی عربی، فارسی، پشتو اور ہندی میں لکھی گئی تھی۔ اسی بناء پر شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

''میاں بایزید کا دائرۂ کار افغان علاقہ رہا لیکن اُن کی ذہنی ساخت میں فقط مقامی اثرات نہ تھے اور نہ ہی ان کا مطمح نظر محض مقامی تھا۔ وہ تو سارے ہندوستان اور خراسان کو مسخر کرنے کے خواب دیکھتے تھے۔ (ولافہازدہ کہ تمام ہندوستان و خراسان خواہم در تصوف خود آوردہ) اور یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ ان کے خیالات کا مجموعہ ''خیرالبیان'' فقط پشتو زبان میں نہیں لکھا گیا بلکہ میاں بایزید نے اسے چار زبانوں یعنی عربی، فارسی، پشتو اور ہندی میں لکھا تاکہ سب زبانوں میں اپنے خیالات کی ترویج کر سکیں۔''

شیخ بایزید انصاری کی زبان سے بعض اوقات عجیب و غریب کلمات نکل جاتے تھے

جن میں سے بعض اب بھی اُن کی تصنیفات میں موجود ہیں۔ مثلاً یہ جملہ ان کی تصنیف ''صراط التوحید'' کے تعارف میں ملتا ہے:

''پنداشتم کہ خدائے تعالیٰ وجود شریف وہستی او با ہر چیز یکیست و یکی خواہد بود۔ ہیچ چیز از ہستیٔ او جدا نمی دیدم۔ ہستی من در ہستی او می گداخت۔''

بادی النظر میں یہ جملہ قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے حقیقی معانی کو صرف ارباب تصوف ہی جان سکتے ہیں۔ یہ عوام الناس کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

شیخ بایزید انصاری کی مغل حکمرانوں سے کشمکش جاری تھی۔ فریقین کے مابین کئی جنگی معرکے ہوئے جن میں ایک مرتبہ شیخ بایزید اور روشنیہ عقائد رکھنے والے اُن کے معتقدین کو کامیابی بھی حاصل ہوئی اور شیخ بایزید کی عسکری طاقت میں اضافہ ہو گیا جس پر مغل گورنر حکیم میرزا نے پشاور میں اپنے نائب کو لکھا کہ بایزید کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں۔ یہ جنگی معرکے جاری تھے کہ شیخ بایزید انصاری کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے پانچ بیٹے شیخ عمر، نورالدین، خیرالدین، کمال الدین اور جلال الدین تھے جنہوں نے اپنے والد کے سلسلے کو جاری رکھا اور شیخ عمر اپنے والد کی مسند پر بیٹھے۔ لیکن شیخ عمر جلد ہی یوسف زئی قبیلہ کے افراد کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ خیرالدین بھی اسی لڑائی میں مارے گئے جب کہ ان کے تیسرے بیٹے نورالدین نے راہ فرار اختیار کی۔ لیکن نورالدین کو بھی اشتغر کے گوجروں نے ہلاک کر دیا۔ کمال الدین کو شہنشاہ اکبر نے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ وہ بحالت قید ہی انتقال کر گیا اور اب جلال الدین اپنے والد کا جانشین بنا اور اُس نے مغل دربار سے خوش گوار مراسم استوار کر لیے۔ مگر کچھ عرصے بعد وہ اپنے ایک مخالف شادمان ہزاروی کے ہاتھوں زخمی ہو کر وفات پا گیا۔

میاں جلال الدین کے بعد شیخ عمر کا بیٹا اور شیخ بایزید کا پوتا احداد خان مسند خلافت پر بیٹھا۔ لیکن ۱۰۳۵ھ میں احداد خان بھی مغلوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اُس کا جانشین اُس کا بیٹا عبدالقادر بنا۔ شاہجہان نے اپنے عہد حکومت میں عبدالقادر کو اعلیٰ منصب دے کر اپنے زمرۂ امراء میں شامل کر لیا اور میاں جلال الدین کے بیٹے اللہ داد خان کو رشید خاں کا خطاب دے کر چار ہزاری بنا دیا۔ اس طرح فرقہ روشنیہ اور مغل حکام کی کشمکش بالآخر ختم ہو گئی۔ لیکن فی الحقیقت فرقہ روشنیہ کے زوال کا اصل سبب وہ اکابر علماء و مشائخ تھے

جنہوں نے روشنیہ فرقہ کے عقاید کی شدید مخالفت کی۔ ان مخالفین میں اخوند درویزہ پیش پیش تھے۔ اُن کا تذکرہ بھی ہوگا۔

شیخ بایزید انصاری کے بعض عقائد و خیالات کی بناء پر اُن کے بہت سے مخالفین پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ اُن کی مخالفت کے باوجود کئی لوگ اُن کے مرید ہو گئے۔ ان کے مخالفوں نے بادشاہ مرزا محمد حکیم کے پاس شکایت کی جس کے نتیجے میں شیخ بایزید اور کابل کے قاضی کے مابین مذاکرہ ہوا۔ بایزید سے پوچھا گیا کہ ''تم اپنے آپ کو مہدی کہتے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا ''میں مہدی نہیں بلکہ ہادی ہوں اور گمراہوں کو راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہوں۔'' دوسرا اعتراض تھا: ''تم کہتے ہو مجھ پر وحی آتی ہے۔'' بایزید نے جواب دیا، ''مجھ پر وحی نہیں آتی بلکہ الہام ہوتا ہے۔'' اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پیش کی ''الالهام نور ینزل فی القلب یعرف هما حقیقة الاشیاء کما هی''۔ قاضی نے پوچھا ''ندائے رحمانی و شیطانی میں کیسے تمیز کرتے ہو؟'' بایزید نے جواب دیا ''جو الہام قرآنی آیات اور احادیث کے مطابق ہو صرف وہ قابل قبول ہے۔'' پھر قاضی نے پوچھا، ''کس خاندان کے توسط سے تم نے یہ علم حاصل کیا ہے؟'' بایزید نے جواب دیا کہ ''ہمارا طریقہ اویسی ہے اور حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل بے واسطہ خدائے تعالیٰ نے مجھے علم لدنی سے بہرہ مند کیا ہے۔''

قاضی اور حاضرین ان جوابات سے مطمئن ہو گئے اور حکیم مرزا نے میاں بایزید کو اسپ و خلعت دے کر رخصت کیا۔

شیخ بایزید انصاری کے احوال و آثار اور اُن کی تعلیمات کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر ظہورالدین احمد کی کتاب ''پاکستان میں فارسی ادب''، نیز شیخ محمد اکرام کی ''رودِ کوثر'' اور مولانا اعجازالحق قدوسی کی تالیف ''تذکرہ صوفیائے سرحد۔''

بانی سلسلہ روشنیہ شیخ بایزید انصاری نے ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں وفات پائی۔

شیخ داؤد کرمانی

شیخ داؤد کرمانی دسویں صدی ہجری کے نامور علماء وفضلاء اور اکابر مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ صاحبِ علم وفضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ حال بزرگ تھے۔ زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں اپنی مثال آپ تھے۔ جامع علوم عقلیہ ونقلیہ، واقف فنونِ رسمیہ وعرفیہ اور صاحبِ شریعت وطریقت تھے۔ ان کے خرمنِ کمال سے ایک زمانہ فیض یاب ہوا اور بے شمار لوگوں نے رشد وہدایت حاصل کی۔ پنجاب کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید فتح اللہ کرمانی تھا۔

شیخ محمد اکرام نے ''رودِ کوثر'' میں ملا عبد القادر بدایونی کی ''منتخب التواریخ'' کے حوالے سے شیخ داؤد کرمانی کے احوال وآثار بیان کئے ہیں۔ چنانچہ ان کے آباؤ اجداد کی برصغیر میں آمد اور شیخ داؤد کرمانی کی ولادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شیخ داؤد کے بزرگ عرب سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور ملتان کے قریب ایک قصبے میں اقامت پذیر ہوئے۔ آپ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے اور والدہ پیدائش کے تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئیں اور آپ دریتیم ہو کر رہ گئے۔''

مفتی غلام سرور لاہوری ''حدیقۃ الاولیاء'' میں لکھتے ہیں:

> ''اول سید فتح اللہ والد بزرگوار سید داؤد کرمانی عرب سے ہند آئے اور بمقام ہیبت پور پٹی میں سکونت اختیار کی۔ پھر وہاں سے قصبہ چونیاں میں رہائش کی۔ جب وہ وفات پا گئے تو سید داؤد ان کی وفات کے چار ماہ بعد پیدا ہوئے۔''

صاحب شجرہ الانوار ان کا شجرۂ نسب اس طرح امام موسیٰ کاظمؓ کے ساتھ ملاتے ہیں: سید داؤد بن سید فتح اللہ کرمانی بن سید مبارک بن سید قیص الدین بن صفی الدین آدم کرمانی بن سید تقی الدین احمد بن عبد المجید بن سید عبد الحفیظ بن سید عبد الرشید بن سید ابوالقاسم بن سید ابوالمکارم، بن سید ابوالمحاسن بن سید ابو الفیض بن سید ابو الفضل بن سید عبد الباقی بن سید عبدالوہاب بن سید ابو الحیات بن سید محمد بن سید محمد ماہ بن سید شاہ محمد پیر بن سید مسعود بن سید محمود بن سید ابوالاحمد بن سید داؤد بن سید ابو ابراہیم اسماعیل بن سید محمد اعرجی بن موسیٰ مبرقع بن امام موسیٰ رضا رضوان اللہ عنہم اجمعین۔

صاحب حدیقۃ الاولیاء نے یہ شجرہ نسب نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ایک اور شجرہ میں اس طرح صحت ہوئی کہ سید محمد اعربی بن سید موسیٰ مبرقع بن امام محمد تقی بن امام علی موسیٰ رضا۔ کیونکہ سید مبرقع نام کا کوئی صاحبزادہ حضرت امام رضا کا نہ تھا۔

ملا عبد القادر بدایونی کی کتاب ''منتخب التوارخ'' کے مطابق شیخ داؤد نے علوم ظاہری کی تحصیل و تکمیل مشہور شاعر اور عالم مولانا عبد الرحمٰن جامی کے شاگرد رشید مولانا اسماعیل اُچہؒ سے شہر لاہور میں کی۔

شہزادہ دارا شکوہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ ابتداء میں آپ نے مولانا اسماعیل اُچہؒ سے علم کی تحصیل کی جو مولانا عبد الرحمٰن جامی کے شاگرد تھے۔ ایام طفولیت میں اصفہانی کا مطالعہ بڑی قدرت اور بڑے شوق سے کرتے تھے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی ''حدیقۃ الاولیاء'' میں ان کی تعلیم کے بارے میں یہی لکھا ہے کہ مولانا اسماعیل لاہوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علوم ظاہری سے بہرۂ کامل پایا۔ پھر باطنی علوم حاصل کرنے میں مشغول ہوئے۔

مولانا عبد الحق محدث دہلوی ''اخبار الاخیار'' میں روایت کرتے ہیں:

''شیخ داؤد کرمانی شیخ حامد حسینی الجیلانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ صاحبِ کمال اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ آپ نے سلوک میں بے انتہا مجاہدے اور ریاضتیں کی تھیں... نفس اور خواہشات کے خلاف آپ نے اس ضبط و تحمل سے کام لیا کہ اس کو تحریر یا تقریر میں لانا کسی کے بس میں

نہیں... سلسلۂ قادریہ میں منسلک ہونے کی غیبی بشارت بھی آپ کو مل چکی تھی، پھر آپ نے خدا سے دُعا کی کہ اے خدا! میں کس کو اپنا شیخ بناؤں؟ تو غیبی اشارہ ہوا کہ شیخ حامد جیلانی سے تعلق قائم کرو، چنانچہ آپ شیخ حامد جیلانی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے بیعت ہوئے اور اس کے بعد ان ہی کے خلیفہ ہوئے۔''

شیخ محمد اکرام نے ''رودِ کوثر'' میں شیخ داؤد کے روحانی دنیا میں داخل ہونے کے بارے میں لکھا ہے کہ ''جلد ہی جذبہ الٰہی غالب آ گیا اور آپ کی توجہ تمام تر ذاتِ واحد کی طرف منعطف ہو گئی۔ روحانیت آپ نے حضرت غوث الاعظمؒ سے اویسی طریقے سے حاصل کی لیکن ''بجہت نگاہداشت سلسلہ'' شیخ حامد قادری کے مرید ہوئے۔ آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ برہنہ سر و برہنہ پا آپ علاقہ دیپالپور کے صحرا میں پھرا کرتے تھے اور جنگل کے جانوروں اور پرندوں کے سوا آپ کا کوئی رفیق نہ ہوتا۔ بالآخر آپ نے شیر گڑھ میں اقامت اختیار کی اور جلد ہی آپ کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس وقت سلیم شاہ سوری کی بادشاہت تھی اور ملا مخدوم الملک عبد اللہ سلطان پوری ردِ بدعت کا دُرّہ ہاتھ میں لئے مصروف کار تھے۔ چنانچہ گوالیار سے فرمان جاری ہوا کہ شیخ داؤد دربار میں حاضر ہوں۔ آپ دو ایک رفیقوں کے ساتھ اس دور دراز سفر پر روانہ ہوئے۔ گوالیار کے باہر مخدوم الملک سے ملاقات ہوئی، لیکن شیخ کے تقدس نے مخدوم الملک پر بھی اثر کیا اور ان کی ملاقات بڑی خوشگوار رہی۔ ابتدائی گفت وشنید کے بعد آپ نے مخدوم الملک سے پوچھا کہ فقراء کی طلبی کس لئے ہوئی ہے؟۔

مخدوم نے کہا کہ سنا ہے کہ آپ کے مرید ذکر کرتے وقت ''یا داؤد'' ''یا داؤد'' کہتے ہیں۔'' آپ نے کہا نہیں ممکن ہے سننے والے کو غلطی ہوئی ہو۔ ''یا ودود'' ''یا ودود'' کہتے ہوں گے۔

قطع نظر اس جواب کے مخدوم آپ کے ورع وتقویٰ کا قائل ہو گیا تھا۔ آپ نے اسے چند نصیحتیں کیں اور شیر گڑھ کی راہ لی۔''

شیخ محمد اکرام نے حضرت شیخ داؤد کرمانی کے احوال وآثار شرح وبسط کے ساتھ اپنی کتاب ''رودِ کوثر'' میں بیان کئے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''شیخ حامد کے خلیفہ شیخ داؤد کرمانی منٹگمری (ساہیوال) کے قصبہ شیر

گڑھ میں آرام فرما ہیں۔ ایک بڑے باکمال بزرگ ہوتے ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی آپ کا ذکر اس عقیدت و احترام سے کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لیکن دوسرے ہم عصر مؤرخین کے بیان سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں ''صاحبِ حال صحیح و کشف صریح، در حین سلوک ریاضیات شاقہ و مجاہداتِ فوق الطاقہ کشیدہ'' اور شیخ قطب عالم کا جو اس زمانے کے مشہور چشتی بزرگ تھے بیان نقل کرتے ہیں کہ جب میں شیخ داؤد کی خدمت میں پہنچا تو ان کے وعظ و نصیحت کے طریقے دیکھ کر میرے دل میں خیال گزرا کہ کہیں شیخ مہدوی نہ ہوں، لیکن جونہی میرے دل میں یہ خیال گزرا شیخ نے بغیر میری طرف سے کسی اظہار کے یا کسی اور تقریبِ گفتگو کے فرمایا کہ مہدویہ فرقہ گمراہ ہے اور ان کے پاس اپنے طریقے کی کوئی صحیح سند نہیں۔

آپ کا معمول تھا کہ سال میں ایک یا دو دفعہ جو کچھ آپ کے پاس نذر و فتوحات کی صورت میں آتا، تقسیم کر دیتے اور اپنے گھر میں ایک مٹی کے کوزے کے سوا کچھ نہ رکھتے۔ جب حضرت غوث الاعظم کا عرس میلاد آپ کی خانقاہ میں ہوتا تو بقول بدایونی ایک لاکھ کے قریب انسان جمع ہوتے اور ان سب کو لنگر میں کھانا ملتا۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر اس طرح حیران و پریشان بیٹھے رہتے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے یا کسی آنے والے کے منتظر ہیں کہ اتنے میں یکایک کوئی حالت طاری ہوتی اور آپ حقائق و معارف کا بیان شروع کر دیتے۔ کبھی کبھی کہتے کہ عراق کی طرف سے جو ہوا آتی ہے اس کے ساتھ میرے دل پر فیض الٰہی کے جھونکے آتے ہیں۔''

آپ بڑے پابند شریعت تھے اور کوئی امر خلاف حدیث شریف آپ سے صادر نہ ہوتا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے شیر گڑھ جا کر آپ کی زیارت کی۔ وہاں تین چار دن تک قیام رہا اور شیخ کی روحانیت اور تقدس سے بڑے متاثر ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ کے جمال میں کوئی ایسی چیز نظر آتی تھی جس سے دنیا کے سب صاحب جمال محروم ہیں۔ اور

تبسم و تکلم کے وقت ان کے چہرے پر ایک ایسا نور چمک اٹھتا جس سے دلوں کی تاریکیاں دور ہو جاتیں اور ''وجہ اللہ'' کا بھید عیاں ہو جاتا تھا۔ شیخ نے بدایونی پر بڑی مہربانی کی، کئی نصائح بیش قیمت کیں۔ ان کے مطلوبہ سوالات کا جواب دیا اور اپنی کلاہ بھی عنایت کی۔

یہ بیان کرنے کے بعد شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''بعض لوگ کہتے ہیں کہ اولیاء و مشائخ کے تذکروں میں خارق عادت واقعات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مشنریوں کی طرح اشاعتِ مذہب کی منظم اور باقاعدہ کوششیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ فقط خارق عادت واقعات سے جن کی صحت مشتبہ ہے یہ بزرگ اشاعتِ اسلام میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن نکتہ چین مشرقی مذاہب کی تاریخ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ہندو یوگیوں اور رشیوں کے تذکروں میں بھی خارق عادت واقعات کے سوا کچھ نہیں اور ایشیاء میں مذہب پھیلانے کے لئے دوسرے مذاہب کی مذمت کے بجائے طریق کار یہی رہا ہے کہ داعیانِ مذہب اپنے روحانی کمالات اور اپنی خوبیوں کو نمایاں کریں اور عوام الناس عموماً خارق عادت واقعات یا مقدس روحانی زندگیوں ہی سے متأثر ہوتے ہیں۔ شیخ داؤد کے عام صوفیانہ تذکروں اور ملفوظات میں اشاعتِ اسلام کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن ملا بدایونی جو تین چار دن ان کی خدمت میں رہے، لکھتے ہیں کہ شاید ہی کوئی دن ہو گا جب سو سو پچاس پچاس ہندو مع اپنے اہل و اعیال کے حاضر خدمت ہو کر مسلمان نہ ہوتے ہوں۔''

ایک دفعہ اکبر بادشاہ نے جب وہ پنجاب میں تھا، اپنے ایک امیر شہباز خان کنبوہ کو بھیج کر چاہا کہ شیخ اس کے پاس جائیں، لیکن انہوں نے عذر کیا اور کہلا بھیجا کہ ''میں یہاں بیٹھا غائبانہ دُعا دیتا ہوں، مجھ سے یہی کچھ ہو سکتا ہے۔''

حضرت شیخ سید داؤد قادری کرمانی شیر گڑھی نے ۹۸۲ھ میں وفات پائی اور آپ کا مزار گوہر بار بمقام شیر گڑھ زیارت گاہِ خلق اللہ ہے اور ہر سال حضرت کے عرس مبارک پر عقیدت مندوں کا بہت بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ تاریخ وفات ''حق پرست'' سے ظاہر ہوتی ہے۔

محمد بن احمد میانجی

حضرت شیخ محمد بن احمد کا شمار برصغیر پاکستان و ہند کے ممتاز علمائے دین اور معدودے چند مفسرین قرآن میں ہوتا ہے۔ صاحب علم وفضل ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی راست باز و رودار اور وسیع المشرب صوفی بزرگ تھے۔ ان کا تعلق گجرات کے مشہور شہر احمد آباد کے ایک معروف علمی اور صاحبِ ثروت خانوادے سے تھا۔ ان کے والد میانجی یگانۂ روزگار عالم اور صوفی تھے۔

ان کا نام ونسب یوں ہے:

شیخ محمد بن احمد المیانجی شریجی کندی تھانیسری گجراتی۔ ان کی کنیت ابو صالح تھی۔

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' کے باب دوم (تفاسیر قرآن) اور فصل چہارم (تصوف و اخلاقیات) میں محمد بن احمد کا ذکر کیا ہے۔ اپنے مقالے کے باب دوم (تفاسیر قرآن) میں ڈاکٹر زبید احمد نے ان کا اسم گرامی شیخ محمد بن احمد میاں جی ناصر گجراتی لکھا ہے۔ جب کہ فصل چہارم (تصوف اور اخلاقیات) کے تحت اُن کا نام محمد بن محمد بن احمد معروف بہ میاں جی کے زیرعنوان ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ ''محمد بن احمد میاں جی کے لڑکے تھے ـــــ یہ خواجہ کمال الدین کی اولاد میں تھے جو نصیر الدین چراغ دہلی کے ایک خلیفہ اور بھانجے تھے۔

ڈاکٹر زبید احمد اور مولانا عبدالقدوس ہاشمی ایسے نام وَر علماء وفضلاء نے شیخ محمد بن احمد میانجی کے مختصر احوال بیان کرنے کے علاوہ ان کی تفسیر قرآن موسوم بہ ''کاشف الحقائق'' کا تعارف بھی اس قدر اختصار کے ساتھ کرایا ہے کہ نہ تو مفسر قرآن شیخ محمد بن احمد میاں جی کی شخصیت نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے اور نہ ان کی تفسیر قرآن کی

خصوصیات کے بارے میں کچھ تفصیلات ملتی ہیں۔ دیگر کتب تاریخ و تذکرہ بھی ہمیں اس سلسلے میں مطلوبہ معلومات فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ ڈاکٹر زبیداحمد اور مولانا عبدالقدوس کی تحریروں سے شیخ محمد بن احمد کے بارے میں صرف دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اوّل یہ کہ وہ ایک صوفی اور عالم تھے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے قرآن مجید کی صوفیانہ انداز میں ایک تفسیر لکھی۔

ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن کی تفسیر لکھے گا اس کے عالم فاضل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور تفسیر صوفیانہ انداز میں لکھے گا اور اس میں صوفیہ کرام کے اقوال کے کثرت سے حوالے دے گا، تو اُس کا صوفی ہونا بھی لازمی امر ہے۔ لیکن اس سے ہمیں نہ تو مفسر قرآن مولانا محمد بن احمد کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور نہ ان کی تفسیر کی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے، اس لیے کہ محمد بن احمد میانجی کے بارے میں کتب تاریخ و تذکرہ خاموش ہیں اور اُن کی تفسیر ''کشف الحقائق'' دستیاب ہے اور نہ اس تفسیر کا اردو زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ البتہ مولانا عبدالقدوس نے شیخ محمد بن احمد کو ''الشریحی، الکندی، تھانیسری گجراتی'' لکھا ہے اور ڈاکٹر زبید احمد نے ذرا زیادہ تحقیق سے کام لیتے ہوئے ان کے بارے میں یہ لکھ دیا ہے کہ وہ خواجہ کمال الدین کی اولاد میں تھے جو حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کے ایک خلیفہ اور بھانجے تھے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''تاریخ مشائخ چشت'' میں ''گجرات میں سلسلۂ چشتیہ'' کے زیرِ عنوان ''شجرۃ الانوار'' کے حوالے سے علامہ کمال الدین (متوفی ۷۵۶ھ) کا ذکر کیا ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ حضرت چراغ دہلوی (دہلی) کے خلیفہ اور بھانجے تھے۔ علم و فضل میں ممتاز تھے۔ ان کی اولاد میں برابر ایسے بزرگ پیدا ہوتے رہے جنھوں نے چشتیہ سلسلہ کو گجرات میں قائم رکھا۔ علامہ کمال الدین کے بعد اُن کے فرزند ارجمند شیخ سراج الدین مسیحائی مشیخت پر بیٹھے۔ انہوں نے مولانا احمد تھانیسری، مولانا عالم پانی پتی اور مولانا عالم سنگریزہ سے علوم ظاہری حاصل کیے۔'' اس کے بعد نظامی صاحب نے شیخ سراج الدین سجادہ نشین کی اولاد میں سے علی الترتیب اُن کے نصف درجن خلفاء کے نام گنوائے ہیں لیکن ان میں شیخ محمد یا ان کے والد شیخ احمد میانجی کا نام شامل نہیں ہے۔ اور نہ ''تاریخ مشائخ چشت'' میں نظامی صاحب نے ''کشف الحقائق'' نامی قرآن مجید کی کسی تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مولانا احمد تھانیسری نامی جس

بزرگ کا ذکر کیا ہے "حدائق الحنفیہ" کے مطابق انہوں نے ۸۲۰ھ میں وفات پائی اس لیے وہ مفسر قرآن شیخ محمد کے والد ماجد احمد میانجی نہیں ہو سکتے۔

شیخ محمد بن احمد کے دینی و علمی کارناموں میں ایک عظیم دینی کارنامہ اُن کی تفسیر قرآن ہے جس کا نام "کاشف الحقائق" ہے۔ اُن کا دوسرا بڑا کارنامہ ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر ہے۔

"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد دوم (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار مولانا عبد القدوس نے شیخ محمد بن احمد کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے:

"ابو صالح شیخ محمد بن احمد المیانجی کی التفسیر المحمدی مسمیٰ بہ "کاشف الحقائق" ہے۔ شیخ محمد نے احمد آباد میں ایک لاکھ کے خرچ سے مسجد بنوائی جس کی تاریخ "بنائے شیخ" سے نکلتی ہے۔ تفسیر محمدی کے علاوہ انہوں نے "بیضاوی" کا حاشیہ بھی لکھا۔ جواب ناپید ہے۔ لیکن کاشف الحقائق کے نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (Asiatic Society Bangal) اور انڈیا آفس لائبریری (India Office Liberary) میں محفوظ ہیں۔

لبنانی فاضل ڈاکٹر صبحی صالح "علوم القرآن" میں علم تفسیر کے نشر و ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تفسیر کا آغاز پہلے پہل عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کے اوّل شارح و ترجمان تھے۔ قرآن کا جو حصہ نازل ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ترجمانی فرماتے۔ عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرامؓ تفسیر قرآن کی جسارت نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم خود اس عظیم بار کے کفیل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآنی اسرار و رموز سے آگاہ و آشنا صحابہؓ کے لئے اپنے علم کے اظہار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کردہ معلومات کے کشف و توضیح کے سوا چارہ نہ تھا۔ یوں تو ماہر تفسیر صحابہؓ کثیر تعداد میں تھے مگر اس ضمن میں دس صحابہ کو خاص طور پر شہرت حاصل ہوئی جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت اُبی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ۔

پھر ڈاکٹر صبحی صالح تابعین اور تبع تابعین میں مفسرین کے طبقات کا ذکر کرتے ہوئے مفسر قرآن ابوجعفر محمد بن جریر طبری تک آ گئے ہیں اور لکھتے ہیں کہ روایات و آثار کی مدد سے جو تفاسیر لکھی گئی ہیں ان میں سب سے بہتر ابن جریر طبری کی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن ہے۔ ڈاکٹر صبحی صالح نے امام فخرالدین رازی کی تفسیر ''مفاتیح الغیب'' اور تفسیر بیضاوی المسمّٰی ''انوار التنزیل و اسرار التاویل'' اور ابوالسعود حنفی کی تفسیر ''ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم، اور امام احمد بن محمود نسفی کی ''مدراک التنزیل و حقائق التاویل'' کومشہورترین کتبِ تفاسیر قرار دیا ہے جو اہل السنّت والجماعت کے عقائد کے مطابق لکھی گئی ہیں۔

علامہ جار اللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی ''کشاف'' کے بارے میں ڈاکٹر صبحی رقمطراز ہیں کہ یہ عقلی انداز پر تحریر کردہ تفاسیر کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ تفسیر بلاغی نکات اور بطریق سوال و جواب اعجاز کے بیان کرنے میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ منقولات پر مشتمل تفاسیر میں اسرائیلیات کی جو بھرمار ہوتی ہے ''کشاف'' کا دامن اس سے پاک ہے۔ اس کی عبارت بلیغ اور حشو و تطویل سے عاری ہے۔

''کشاف'' کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ زمخشری آیت ختم اللّٰہ علٰی قلوبھم کی تفسیر فرماتے ہیں:

''یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ختم (مہر لگانے) کے فعل کو اللہ تعالٰی نے اپنی جانب کیوں منسوب کیا؟ مہر لگانے کا فعل قبیح ہے اور جب اس کو اللہ تعالٰی نے اپنی جانب منسوب کیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالٰی افعال قبیحہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآن میں وارد ہوا ہے کہ ''میں بندوں پر ظلم نہیں کرتا'' نیز فرمایا کہ ''ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنی ذات پر وہ خود ظلم کرتے تھے۔'' ایک جگہ یوں فرمایا ''اللہ تعالٰی فواحش و منکرات کا حکم نہیں دیتا۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ ختم کی نسبت اللہ تعالٰی کی طرف بطور مجاز اور استعارہ کے کی گئی ہے۔ دراصل مہر لگانے والا کافر یا شیطان ہے۔ اس فعل کو ذات باری تعالٰی کی جانب منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ قدرت اس کو اسی نے دی، ورنہ بذاتِ خود وہ یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔'' یہ سب عبارت کشاف کی جلد اول ص ۲۶۔۲۷ اور ۲۸ سے لی گئی ہے۔

علامہ ابن خلدون نے بھی کشاف کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ جار اللہ زمخشری نے اپنی تفسیر میں سب سے پہلے قرآنی آیات کا تتبع کر کے اس فنِ بلاغت کے مسائل پر انہیں منطبق کیا جس سے بعض سے قرآن کا اعجاز بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے تفسیر کشاف اس حیثیت سے تمام تفسیروں سے افضل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ابن خلدون نے یہ بھی لکھا ہے کہ صرف پختہ عقائد کے حامل اور فنِ بلاغت پر عبور رکھنے والے حضرات ہی کشاف کا مطالعہ کریں۔

ڈاکٹر زبید احمد ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' کے باب دوم ''تفاسیر قرآن'' میں لکھتے ہیں کہ چھٹی صدی ہجری میں ہر ایک مفسر نے ایک نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھ کر تفسیر لکھی ہے جس میں اسے خصوصی مہارت حاصل تھی۔ مثلاً ایک لغت دان نے نحوی نقطۂ نظر سے تفسیر لکھی اور فلسفی یا صوفی نے اپنے نقطۂ نظر سے۔ چنانچہ اس زمانے میں مختلف اقسام کی تفسیریں قلمبند کی گئیں۔ ان مفسرین میں زمخشری کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی لکھی ہوئی تفسیر ''الکشاف'' ایک عالمانہ تصنیف ہے۔ جو نحوی اور لسانی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور آئندہ اس نوعیت کی جو تفسیریں لکھی گئیں ان کا ماخذ یہی تفسیر ہے۔ اس تفسیر کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔

چھٹی صدی ہجری کے بعد کی صدیوں میں آنے والے مفسرین نے جو تفاسیر لکھیں ان کا ماخذ انہوں نے اسی نوعیت کی ان تفسیروں کو بنایا جو ان سے پہلے کے زمانوں میں لکھی جا چکی تھیں۔ ان میں ڈاکٹر زبید احمد کے نزدیک دو تفسیریں بہت بلند پایہ ہیں۔ یعنی تفسیر بیضاوی اور جلالین، موخر الذکر حیرت انگیز اختصار و بلاغت کی وجہ سے مشہور ہے اور اول الذکر بہت عمدہ اور جامع تفسیر ہے۔

شیخ ابو صالح محمد بن احمد میانجی کی تفسیر محمدی صوفیانہ انداز سے لکھی گئی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شیخ محمد بن احمد نے یہ تفسیر لکھتے وقت مشکل اور ادق اسلوب اختیار کیا ہے یا اسے آسان اور عام فہم زبان میں تحریر کیا ہے۔ اس لئے کہ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ صوفیانہ انداز کی تفاسیر اپنے مشکل اندازِ بیان کے علاوہ صوفیانہ اصطلاحات کے کثرت استعمال کی وجہ سے عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر صبحی صالح نے ''علوم القرآن'' میں لکھا ہے کہ صوفیاء کی تفاسیر کا اندازِ تحریر اکثر نہایت دقیق وعویص ہوتا ہے۔ ان کے کلام کے فہم و ادراک پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے جو بحرِ تصوف کا شناور ہو

ورنہ ان کا مطلب سمجھنا آسان نہیں۔

ڈاکٹر زبید احمد ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں ''التفسیر المحمدی'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''یہ تفسیر شیخ محمد بن احمد میاں جی بن ناصر گجراتی نے لکھی ہے۔ جو صوفی بھی تھے اور عالم بھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے تفسیر بیضاوی کی شرحیں بھی لکھی تھیں، اس تفسیر کے لکھنے سے ان کا مقصد آیاتِ قرآنی میں باہمی ربط کو واضح کرنا تھا اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اس سے قبل کسی عالم نے یہ کام نہیں کیا۔''

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم عربی ادب کے مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس لکھتے ہیں۔

> ''شیخ محمد بن احمد میاں جی الشریحی الکندی تھانیسری گجراتی کی تفسیر قرآن کریم جو ''التفسیر المحمدی'' یا ''کاشف الحقائق و قاموس الافائق'' کے نام سے مشہور ہے، ایک منفرد تفسیر ہے۔ شیخ محمد بن احمد نے اس تفسیر کا آغاز شعبان ۹۸۱ھ میں کیا اور رمضان ۹۸۲ھ میں اس کی تکمیل سے فارغ ہوئے۔ یہ تفسیر دو لحاظ سے ممتاز ہے ایک تو یہ کہ مفسر نے ہر آیت کا آگے اور پیچھے والی آیات سے تعلق اور ربط بیان کیا ہے، دوسرے یہ صوفیانہ تفسیر ہے۔ مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ ان کی اچھوتی اور اولین کوشش ہے۔ مسائلِ تصوف کی تشریح کے سلسلے میں انہوں نے متقدمین اہل تصوّف مثلاً شیخ ابن عطاء، حسن بصری، القشیری، جلال الدین رومی، شمس تبریزی اور شیخ سعدی وغیرہ کے اقوال سے مدد لی ہے۔ ضمنی طور پر شیخ نے عقائد، عبادات اور اعجاز القرآن کے علاوہ لغوی اور نحوی مسائل بھی اٹھائے ہیں اور ان سے بحث کی ہے۔''

شیخ ابو صالح محمد بن احمد میاں جی تھانیسری نے ۹۸۲ھ میں وفات پائی۔

محمد بن طاہر پٹنی

ملک المحدثین الہند شیخ محمد بن طاہر پٹنی مغلیہ عہد کے معروف و ممتاز عالم، جلیل القدر محدث اور صاحبِ استقامت مصلح تھے۔ شیخ محمد طاہر نے برصغیر میں تبلیغِ اسلام، مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت اور دینی علوم و فنون کی ترقی و ترویج میں شاندار اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ ان کی امتیازی خصوصیات میں فتنہ مہدویت کو فرو کرنے اور بدعات کے خاتمے کی سر توڑ اور بھرپور کوششیں شامل ہیں۔ حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔

شیخ محمد بن طاہر پٹنی کا نام و نسب یوں ہے:

نام محمد، لقب مجد الدین اور خطاب ''شیخ الاسلام'' ہے۔ بعض مؤرخین نے ان کا لقب ''مجد الدین'' کی بجائے ''جمال الدین'' لکھا ہے۔ ''النور السافر'' میں مرقوم ہے کہ ''جمال الدین محمد طاہر ملک المحدثین ہندی کے پدر بزرگوار کا نام طاہر اور دادا کا نام علی بن الیاس خواجہ ہے۔''

شیخ محمد بن طاہر ۹۱۴ھ میں گجرات کے شہر پٹن جو ''انہل واڑہ'' بھی کہلاتا تھا، میں پیدا ہوئے۔ انہلواڑہ کا عربی تلفظ نہروالہ ہے۔

مولانا سید عبد الحئ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں شیخ محمد بن طاہر کے احوال بیان کئے ہیں اور ان کا تعارف اس شاندار انداز میں کرایا ہے۔

> ''الشیخ العالم، الکبیر المحدث اللغوی العلامۃ، مجد الدین محمد بن طاہر بن علی، حنفی، فتنی، گجراتی، مؤلف ''مجمع بحار الانوار فی غریب الحدیث'' جن کی تصانیف حد درجہ مقبول ہوئیں اور جن کے علم و تبحر

کا سب نے اعتراف کیا۔''

نواب صدیق حسن خان قنوجی نے ''اتحاف النبلا'' میں روایت کیا ہے کہ محمد بن طاہر صدیقی الاصل تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ شیخ محمد بن طاہر کے پوتوں میں سے شیخ عبد القادر بن ابوبکر مفتیِ مکہ جو شیخ محمد بن طاہر کے احفاد میں سے بلند پایہ عالم اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ازاں جملہ چار جلدوں پر مشتمل فتاویٰ کی کتب ہیں۔ مفتی صاحب کے انتقال پر شیخ انصاری مکی شافعی نے ان کی مدح میں جو مرثیہ لکھا ہے اس کے ایک شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ طاہر کا سلسلہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔

''تیرے جد کہ اللہ ان کی لحد ٹھنڈی رکھے، علم و فضیلت میں یکتا تھے۔ یعنی محمد بن طاہر بلاشبہ حضرت صدیقؓ کی نسل سے تھے۔''

لیکن پھر انہوں نے خود ہی اس کی تردید کر کے ان کو نومسلم قرار دیا ہے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے لفظ شیخ کی توجیہہ اس طرح کی ہے کہ برصغیر میں ایسا دستور ہے کہ جو شخص نومسلم ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو شیخ صدیقی کہتا ہے کیونکہ تصدیق اسلام میں اس نے حضرت صدیق اکبرؓ کی تقلید کی۔ لیکن یہ توجیہہ برصغیر کے بعض مخصوص نومسلم خاندانوں کے متعلق تو صحیح ہے مگر اس کا اطلاق تمام نومسلم خاندانوں پر نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ محمد بن طاہر ہندی الاصل تھے۔ یہ بات خود انہوں نے اپنی تصنیف تذکرۃ الموضوعات میں بھی لکھی ہے۔

شیخ عبد الوہاب ''رسالہ مناقب'' میں لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام محمد بن طاہر کے حنفی اور سنی ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور جمہور اہل اسلام اس پر متفق ہیں کہ قومیت کے لحاظ سے وہ بوہرہ تھے۔ خود شیخ نے اپنا لقب بوہرہ بتایا ہے۔ لیکن لفظ بوہرہ کے معنی کیا ہیں اور اس کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے، بعض مؤرخین نے بوہروں کو ہندوستان کے مقامی باشندے قرار دیا ہی اور لفظ بوہرہ کی تحقیق کی ہے۔ چنانچہ احمد آباد کے محمد صدیق واعظ (متوفی ۱۰۴۱ھ) لکھتے ہیں کہ ''بواہر، بوہرہ سے نکلا ہے جو تجارت، حرفت اور خرید و فروخت میں مستعمل ہے۔ مررہ احمدی کے نزدیک بوہرہ کے معنی تاجر ہی کے ہیں۔ مولانا آزاد بلگرامی نے ''سبحۃ المرجان'' میں لکھا ہے کہ بعضوں نے ''بوہ راہ'' بمعنی صراط مستقیم اور ''بہوراہ'' بہت سے راستے یعنی مختلف قبائل کا

مجموعہ اور ''بہرے'' اونٹوں کی قطار کے معنی میں لکھا ہے، جس سے مراد غالباً تاجر ہی ہیں۔ اور ''بہراج'' یہ معنی دور اندیش بھی لوگوں نے لکھا ہے لیکن گجراتی اور سنسکرت کی ڈکشنری کے مطابق یہ لفظ سنسکرت کے مادہ ''دوہرا ادیہ ورو'' سے نکلا ہے۔ جس کے معنی لین دین کے ہیں۔ پھر اسی سے ''دیہ وہاری'' یعنی بیوپاری نکلا جس کے معنی تاجر کے ہیں اور یہ لفظ تخفیف ہوکر ''ورہ رہ'' ہوگیا جس کو بوہرہ کہتے ہیں۔

لیکن یہ لفظ عربی بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا ماخذ عربی ہو۔ چونکہ عربی لغت قاموس میں ہے۔ ''بھراء قبیلة و بھرة بالضم بنواحی المدینة و بالیمامة'' ترجمہ: بہراء ایک قبیلہ کا نام ہے اور بہرہ مدینہ اور یمامہ کے آس پاس رہتے ہیں۔

''رسالہ مناقب'' میں صراح کے حوالے سے یہ بھی مرقوم ہے کہ ''بھراء قبیلة از قضاعه'' یعنی بہراء قضاعہ میں سے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ پس ممکن ہے کہ یہ لفظ عربی ہو جیسا کہ احمد آباد اور سورت کے مزمہ والے، ولی اللہ اور کم کوڑی والے بوہرے خاندانوں کے افراد کا دعویٰ ہے کہ ہم لوگ طائف اور مدینہ سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔''

نامور مؤرخ اور سیاح مسعودی 303ھ میں سندھ آیا تھا، وہ بہروچ اور کنھایت تک گیا تھا۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ جے سور میں بغداد وغیرہ شہروں کے دس ہزار بیاسر مسلمان ہیں۔

بوہروں کے بارے میں مؤرخین نے جو تحقیق کی ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ بوہرہ قوم ایک ایسی جماعت یا گروہ کا نام ہے جو مختلف نسلوں اور مختلف قوموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی۔ خالص عرب بھی ہیں اور خالص ہندی بھی، ایرانی بھی ہیں اور عراقی بھی۔ قدیم الاسلام بھی ہیں اور جدید الاسلام یعنی نومسلم بھی۔ تاجر بھی ہیں اور غیر تاجر بھی۔ غرض کہ بوہرہ قوم میں ہندی نژاد بھی ہیں اور عربی النسل بھی، ایرانی وعراقی بھی ہیں اور شیعہ اور سنی بھی اور پھر بوہروں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ تاجر ہی ہوں۔ تجارت کے علاوہ اور پیشوں سے متعلق لوگوں کا تعلق بھی بوہرہ قوم سے ہے۔

شیخ محمد بن طاہر کا تعلق پٹن کے متمول ومعزز تاجر خاندان سے تھا۔ ان کے دادا علی کا شمار ملک کے بڑے تجار میں ہوتا تھا۔ جب شیخ علی کا انتقال ہوا تو ان کے دو بیٹوں

میں اشرفیاں گن گن کر نہیں بلکہ ترازو میں تول تول کر تقسیم کی گئیں۔ شیخ محمد کے والد بزرگوار طاہر بھی تاجر تھے۔ شیخ محمد بچپن ہی سے انتہائی ذہین و زیرک اور تیز طبع تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔ کم سنی کے عالم میں قرآن حفظ کر لیا اور پندرہ برس کی عمر میں مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت حاصل کر کے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

مولوی فقیر محمد نے ''حدائق الحنفیہ'' میں شیخ محمد بن طاہر کے احوال بیان کئے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''محمد بن طاہر پٹنی: خادم حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، ناصر سننِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم، جامع منقول و معقول، حاوی فروع و اصول تھے، پہلے اپنے ملک میں مولانا شیخ ناگوری، شیخ برہان الدین سمہودی، مولانا ید اللہ سوہی اور مُلّا مہتہ ایسے فاضل اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا۔ پھر حرمین شریفین کے لئے روانہ ہو گئے اور وہاں کے علماء و مشائخ مثل شیخ ابی عبیداللہ زبیدی، سید عبداللہ عدنی، شیخ عبیداللہ حضرمی، شیخ جاراللہ مکی، شیخ ابن حجر مکی صاحب صواعق محرقہ اور شیخ علی مدنی، شیخ برخوردار سندھی اور شیخ ابوالحسن بکری سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی۔ خصوصاً شیخ اجل اور ولیِ کامل علی بن حسام الدین متقی سے بے شمار فیوض حاصل کئے اور ان کے مرید ہوئے۔ پھر وطن واپس آئے۔''

شیخ علی متقی آفاق تصوف کا ایک درخشندہ روشن ستارہ تھے۔ علم حدیث میں بھی ان کا مرتبہ کچھ کم نہ تھا، کنز العمال انہی کی تصنیف ہے۔ چنانچہ شیخ محمد بن حسن نے اپنا زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارا اور بلند روحانی مقام پر فائز ہوئے۔ ۹۵۰ھ میں وطن واپس آ کر تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ جو کچھ والد بزرگوار سے ورثہ میں ملا تھا سب طلباء پر خرچ ڈالا۔ بچوں کے اساتذہ کے پاس رقوم بھیجتے اور ان سے کہتے کہ جو طلباء ذہین ہوں ان کو میرے پاس بھیج دیا کرو۔ طلبا کو بڑی شفقت اور توجہ سے پڑھاتے اور امام اعظم ابوحنیفہ کی تقلید میں غریب طلباء کی مالی امداد بھی کرتے۔ اسی التفات کی بدولت طلباء کثیر تعداد میں مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کر کے ملک کے گوشے گوشے میں

پھیل گئے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم عربی ادب کے مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس نے شیخ الاسلام محمد بن حسن کے احوال بیان کئے ہیں، اور لکھا ہے کہ ''ان کی مطبوعہ تصنیفات میں ''مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار'' بہت مشہور ہے۔ یہ اہم اور مفید کتاب مطبوع اور متداول ہے۔'' محمد بن طاہر کی اسی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں لکھا ہے کہ'' یہ فرہنگِ حدیث محمد طاہر نے اپنے مرشد علی متقی کے نام معنون کی ہے۔ یہ بہت ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ۱۶۶۸ صفحے ہیں اور بہت گنجان کتابت ہے۔ یہ حدیث اور قرآن دونوں کی بہت جامع فرہنگ ہے۔ اس میں الفاظ مصادر کے حروف کے اعتبار سے مرتب کئے گئے ہیں۔ احادیث میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کے مصادر اور تمام مشتقات اس فرہنگ میں موجود ہیں اور جن احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ ان کا متن بھی درج کر دیا ہے۔ مصنف نے الفاظ کے معنی لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ متعلقہ حدیث کے بارے میں وضاحت طلب نکات کی تشریح بھی کی ہے۔ اس فرہنگ سے پہلے اس قسم کی جتنی کتابیں لکھی گئی تھیں وہ سب اس کے سامنے ماند پڑ گئی ہیں۔''

ڈاکٹر زبید احمد نے شیخ حسن بن طاہر کی دوسری کتاب ''الموضوعات'' کے بارے میں لکھا ہے کہ ''اس کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے یہ تنبیہ کی ہے کہ کسی حدیث کو محض اس بناء پر موضوع نہ قرار دیا جائے کہ اس کو کسی نے موضوع کہا ہے۔ بلکہ اس بارے میں مستند کتب سے رجوع کرنے کے بعد فیصلہ کیا جائے۔ شیخ محمد بن طاہر نے ابن جوزی کی مثال دی ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''موضوعات'' میں ایسی احادیث بھی شامل کر لی ہیں جو حسن قرار دی گئی ہیں اور ان کے علاوہ کچھ ضعیف احادیث بھی ہیں۔ اپنی اس اہم کتاب میں شیخ محمد بن طاہر نے احادیث کے حسن و قبح پر تنقیدی بحث کی ہے جو کسی نہ کسی عالم نے موضوع قرار دی ہیں۔ اس موضوع پر یہ ایک انتہائی مفید کتاب ہے...''

ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے کہ شیخ محمد بن طاہر کو بجا طور پر ملک المحدثین ہند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ملک المحدثین ہند کی کتاب ''لطائف الاخبار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالحئی

حسنی نے لکھا ہے کہ "یہ حدیث کے الفاظ کی لغت ہے گویا کہ یہ کتاب "صحاح ستہ" کی شرح ہی ہے۔ اس کتاب کی جامعیت پر تمام اہل علم متفق ہیں اور یہ کتاب شیخ کا ہم سب پر بڑا احسان ہے۔"

شیخ محمد بن طاہر فتنہ مہدویت اور بوہروں کے اسماعیلی فرقے میں رائج بدعات کے خاتمے کا تہیہ کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے سر سے عمامہ اتار دیا تھا کہ جب تک اس فتنے اور ان بدعات کا خاتمہ نہ ہو جائے عمامہ سر پر نہیں رکھیں گے۔ اسی دوران شہنشاہ اکبر نے ۹۸۰ھ بمطابق ۱۵۷۴ء میں گجرات فتح کیا تو اس نے اپنے ہاتھوں سے شیخ کے سر پر عمامہ بندھوایا اور کہا کہ میں دین کی نصرت کا ذمہ دار ہوں۔ اکبر نے اپنے رضاعی بھائی مرزا عزیز الدین کو یہ فتنہ فرو کرنے پر مامور کیا جس نے مہدویت کی بدعات کا خاتمہ کرنے میں شیخ کی حتیٰ الامکان امداد و اعانت کی۔ لیکن پھر اس کی جگہ عبد الرحیم خانِ خاناں کو گجرات کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔ جو آزاد خیال اور شیعی مسلک کا حامل تھا۔ بس پھر کیا تھا مہدویت کو پر لگ گئے۔ شیخ محمد بن طاہر نے دوبارہ عمامہ اتار دیا اور بادشاہ سے ملاقات کے لئے آگرہ کا رخ کیا۔

مہدوی ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ شیخ جب احمد آباد پہنچے تو شیخ وجیہہ الدین علوی نے کنایۃً سمجھایا اور کہا کہ سیاست فراست کی بات نہیں اور مشغولی حق کے ساتھ ہی ہونا زیبا ہے، نہ خلق کے ساتھ ... مگر شیخ محمد بن طاہر نے شاہ صاحب کے نصائح پر عمل نہ کیا اور آگرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں مہدویوں نے موقع پا کر اجین کے قریب شیخ محمد بن طاہر کو شہید کر دیا۔ یہ ۹۸۶ھ کا واقعہ ہے۔ "خلیفۂ دوراں" تاریخ وفات ہے۔

ملک المحدثین الہند شیخ الاسلام محمد بن طاہر پٹنی نے ۹۸۶ھ مطابق ۱۵۸۷ء میں جامِ شہادت نوش کیا۔

شیخ رزق اللہ

شیخ رزق اللہ دہلویؒ اپنے زمانے کے ارباب علم و دانش میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے فاضل اور ہندی کے نامور شاعر تھے۔ علم و فضل میں ممتاز ہونے کے علاوہ صبر و استقامت میں یگانۂ روزگار تھے۔ صوری و معنوی فضائل کے جامع اور سلف صالحین کی یادگار تھے۔ فارسی میں مشتاق اور ہندی میں راجن تخلص کرتے تھے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ کے والد شیخ سیف الدین سیفی قادری کے بڑے بھائی تھے۔ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوئے۔

شیخ محمد اکرام نے ''رودِ کوثر'' میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے آباؤ اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت میں برصغیر میں آئے اور معزز عہدوں پر مامور ہوئے۔ شیخ محدث کے دادا شیخ سعد اللہ تھے۔ ان کی زیادہ توجہ سلوک اور طریقت کی طرف رہی اور ان کے دو بیٹوں کو بھی یہی ذوق وراثت میں ملا۔ شیخ کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی نے علم و ادب میں نام پایا۔ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے فاضل اور ہندی کے نامور شاعر تھے۔ ہندی میں ان کا تخلص راجن تھا اور ان کے کئی رسالے... مثلاً پیمان اور جوت نرنجن وغیرہ مشہور ہیں۔ ہندوؤں کے علوم کا بھی انہوں نے خوب مطالعہ کیا تھا اور علم تاریخ سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے ان کی مشہور تالیف ''واقعات

مشتاقی" لودھیوں کے متعلق معلومات کا بیش قیمت خزانہ ہے۔
طریقت میں وہ شطاری سلسلے سے منسلک تھے جو اس زمانے میں
مشرق اور وسطی ہندوستان میں زوروں پر تھا۔"

مولانا عبدالحئی حسنی نے "نزہتہ الخواطر" کی جلد چہارم میں مولانا رزق اللہ دہلوی کے احوال بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

"الشیخ الفاضل رزق اللہ بن سعد اللہ بخاری دہلوی، شعر، تاریخ، تصوف اور موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سنسکرت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ دہلی میں ۸۹۷ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد بن الحسن عباسی دہلوی اور شیخ محمد بن منکن ملادی سے اکتسابِ علم کیا۔ طریقت میں بھی آخر الذکر سے مستفیض ہوئے۔"

پروفیسر خلیق احمد نظامی "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" میں "اخبار الاخیار" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"شیخ فیروز ۸۶۰ھ میں بہرائچ کے کسی معرکہ میں شہید ہو گئے تھے اور وہیں سپرد خاک کر دیئے گئے تھے۔ لڑائی پر جانے سے قبل ان کی بیوی نے جو اُن دنوں حاملہ تھیں، ان کو روکنے کی کوشش کی تو جواب دیا 'میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ بیٹا ہو اور اس سے ہماری نسل چلے، اس کو اور تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ نہ معلوم اب مجھے کیا پیش آئے'۔ کچھ دنوں بعد شیخ سعد اللہ (شیخ محدث کے دادا) پیدا ہوئے۔ شیخ سعد اللہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان میں اپنے شہید باپ کے سب اوصاف و خصائل موجود تھے۔ ابتدائی زمانہ تحصیل علم میں گزارا۔ پھر عبادت و ریاضت کی طرف متوجہ ہو گئے اور شیخ محمد منکن کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی۔ شیخ محمد منکن صاحبِ حال بزرگ تھے۔ مصباح العاشقین کے لقب سے مشہور تھے۔ ابتدائی زمانہ میں شیخ احمد رواتی کے مرید تھے پھر شاہ جلال گجراتی کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گئے۔ سماع کا بڑا شوق تھا۔ ان کے تقدس و تعبد کی بناء پر سلطان سکندر لودھی کو بھی ان سے عقیدت ہو گئی تھی۔ ملاوہ قصبہ قنوج میں ان کی خانقاہ ارشاد و تلقین کا مرکز تھی۔ شیخ سعد اللہ نے ان کی راہنمائی میں سلوک و معرفت کی دشوار گزار راہیں طے کیں اور عبادت و ریاضت کا ایسا شوق ہو گیا کہ راتوں کو جاگنے لگے اور ان کی زندگی خسروؒ کے اس شعر کی مکمل تفسیر بن گئی ۔

عاشقاں را ہمہ شب از پئے نظارۂ تو
شب بزاری و سحرگہ بدعا میگذرد

شیخ سعد اللہ کے دو بیٹے تھے، شیخ رزق اللہ اور شیخ سیف الدین۔ دونوں کو محبتِ الٰہی کا بے پناہ جذبہ باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ شیخ محدث دونوں کی مخصوص صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی مجلس شروع سے آخر تک سراپا شوق و گریہ و محبت تھی۔ شیخ رزق اللہ کی نسبت سوز و گرمی کے لحاظ سے ایسی تھی جیسے کہ راکھ کے نیچے آگ دبی ہوئی ہو۔ جوں ہی ذرا سا اس کو کریدا آگ نکل آئی اور ان کے برعکس والد ماجد (یعنی شیخ سیف الدین) کی یہ حالت تھی جیسے کہ کسی چیز سے پانی برابر ٹپکتا رہے۔ ان کو اگر معمولی سی تکلیف بھی پہنچتی تو فوراً آنسو بہنے لگتے تھے۔''

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ان دونوں بھائیوں کو دہلی میں بڑی عزت اور شہرت حاصل ہوئی۔ شیخ محدث کا بیان ہے کہ:

''اس شہر کے تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ دہلی ان ہی بھائیوں سے عبارت تھی۔''

شیخ رزق اللہ اپنے بھائی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے والد شیخ سیف الدین سے عمر میں بڑے تھے اور اپنے زمانے کے مشہور عالم اور مرتاض بزرگ تھے۔ جیسا کہ شیخ محدث نے لکھا ہے:

''شیخ رزق اللہ مردِ کامل، فاضل نوادرِ روزگار اور یادگارِ سلف صالحین تھے۔ فضائل صوری و معنوی کے جامع تھے۔ مشربِ عشق و محبت، سلامتی عقل، وسعتِ حوصلہ اور مصائب پر صبر کرنے میں استقامت اور دوامِ حضور میں یگانۂ عصر تھے۔ بانوے سال کی عمر تک پہنچ جانے کے باوجود آپ کے اندر عشق و ذوق اسی طرح تازہ تھا جس طرح کہ جوانی کے عالم میں تھے۔ یہ مصرعہ ع

من اگرچہ پیر شدم جواں است ہنوز

آپ کی شان پر بڑا صادق آتا ہے۔ آپ سے جو کوئی ملاقات کرتا اس سے ایسے عارفانہ نکات بیان کرتے اور ایسے محبت آمیز کلمات میں گفتگو فرمایا کرتے تھے، جنہیں اہلِ دل اور اہلِ ذوق سن کر تڑپ جایا کرتے تھے۔ قدیم قصے، مشائخ کے احوال اور بادشاہوں کی

تاریخ اَزبر تھی اور تاریخی حالات و واقعات کو بڑی خوش اسلوبی اور سلاست و روانی کے ساتھ بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ کی مثل بہت کم اولیاء گزرے ہیں۔ آپ نہایت اطمینان اور بے نظیر انداز سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ محبت کی باتوں کو بڑے شوق سے کہتے اور سنتے تھے اور اس وقت اکثر و بیشتر آبدیدہ ہوا کرتے تھے۔ آپ کثیرالاسفار تھے اور ان سفروں کے دوران بڑے لوگوں کی صحبت حاصل کر کے بڑے تجربہ کار اور جہاندیدہ بزرگ بن گئے۔ آپ ہمیشہ فقیروں، درویشوں اور مشائخ کے ساتھ نشست و برخواست رکھتے تھے۔ ہندی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ مدتِ دراز تک ہندی زبان میں شعر کہتے رہے۔ آپ کی نظموں کے مجموعے پیان اور جوت نرنجن نہایت مقبول ہیں۔''

شیخ رزق اللہ کے احوال بیان کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''ابتدائی زمانہ سے علماء و مشائخ کی صحبت میں رہے تھے اور ان سے درد و سوز کا بڑا سرمایہ پایا تھا۔ وہ شیخ منکن کے مرید تھے لیکن ذکر کی تعلیم شیخ بدھن شطاری سے حاصل کی تھی۔ شیخ بدھن شطاریہ سلسلے کے مشہور بزرگ تھے۔ سکندر لودھی کے زمانہ میں ان کی خانقاہ مرجع خلائق تھی۔ وہ شاہ عبداللہ شطاری کی اولاد میں سے تھے اور شیخ حافظ جونپوری سے بیعت تھے۔ شیخ رزق اللہ کو شیخ بدھن شطاری کی صحبت سے عشق و محبت کی بے پناہ طپش ملی۔ شطاریہ سلسلہ کے مشائخ کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ انہوں نے ہندو مذہب کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا ہے۔ سید محمد غوث گوالیاری کی کتاب ''بحرالحیات'' اس رجحان کی بہترین آئینہ دار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ رزق اللہ مشتاقی نے بھی ہندوؤں کے علوم کا مطالعہ کیا تھا۔ صبحِ گلشن میں لکھا ہے:

و در کتب علمیہ ہندواں مہارتے کامل داشت''

جیسا کہ بیان کیا جا سکا ہے کہ شیخ رزق اللہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے فاضل تھے اور ہندی کے نامور شاعر تھے۔ فارسی میں مشتاقی اور ہندی میں راجن تخلص کرتے تھے۔ ''صبحِ گلشن'' میں ان کے اشعار موجود ہیں۔ اور جیسا کہ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ ان کے دو دیوان یعنی ''پیان'' اور ''جوت نرنجن'' ان کے زمانے میں بہت مقبول تھے۔

برصغیر پاکستان و ہند کی غیر مسلم آبادی کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے ان کی مقامی اور علاقائی زبانوں کا جاننا ضروری تھا۔ علاوہ ازیں مقامی آبادی کے مذاہب کے بارے میں بھی مناسب معلومات کا ہونا ضروری تھا تاکہ ان کے مذہبی افکار و

عقاید کو سمجھ کر ان کی مقامی اور علاقائی زبانوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت مؤثر طور پر کی جا سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اکابر مشائخ اور صوفیہ کرام نے نہ صرف یہ کہ مقامی مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا بلکہ مقامی زبانوں میں زیادہ تر شعر وشاعری کو تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنایا جو صوفیہ کرام کے تبلیغی مقاصد کی کامیابی میں بہت مفید و مؤثر ثابت ہوا۔ سید بلھے شاہ کا تعلق بھی قادری شطاری سلسلے سے تھا۔ انہوں نے بھی سید محمد غوث گوالیاری کی کتاب ''بحرالحیات'' کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا، جس کا مقصد ہندو مذہب کے افکار اور ہندوؤں کے مزاج اور افتادِ طبع کو سمجھ کر انہیں اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ چنانچہ سید بلھے شاہ نے تبلیغ اسلام اور لوگوں کی اخلاقی اور روحانی اور معاشرتی اصلاح و تربیت میں ایسی زبردست کامیابی حاصل کی جو سیکڑوں علماء کی خطابت اور سیکڑوں واعظوں کے وعظ سے بھی ممکن نہ تھی۔ شیخ رزق اللہ راجن ہندی زبان کے سید بلھے شاہ ہیں۔

''صبحِ گلشن'' میں مرقوم ہے کہ مشتاقی کو تاریخ سے بھی دلچسپی تھی وہ پرانے تاریخی قصے اور واقعات بڑے ذوق و شوق کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ احباب کے اصرار پر انہوں نے ان واقعات کو کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔ شیخ رزق اللہ نے اپنی اس کتاب کا نام ''واقعاتِ مشتاقی'' رکھا۔ خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ ایلیٹ نے اپنی ''تاریخِ ہند'' میں اس کے کچھ حصے کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ لودھیوں کی تاریخ جاننے کے لیے ''واقعاتِ مشتاقی'' کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔

عارف باللہ، مبلغ اسلام شیخ رزق اللہ مشتاقی دہلوی نے ۲۰ ربیع الاوّل ۹۸۹ھ کو وفات پائی۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ان کی تاریخ وفات یوں رقم کی ہے:

مخدومی عارف زماں مشتاقے!
وے گفت بوقت نقل مشتاق ھم
حقے جو بتاریخ وفاتش نگریست
نوک قلمش ہماں سخن کرد رقم

جلال الدین تھانیسری

شیخ جلال الدین تھانیسری برصغیر کے ممتاز علماء اور اکابر مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ محدث، جلیل القدر فقیہ اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ مشہور زمانہ صوفی شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے اجل خلیفہ اور حافظ قرآن تھے۔ ۱۴ ذی الحجہ ۹۶۹ھ کو پیدا ہوئے۔ پورا نام ونسب یوں ہے:

شیخ جلال الدین محمد عمری تھانیسری

شیخ محمد اکرام نے ''رود کوثر'' میں لکھا ہے کہ ''شیخ عبدالقدوس گنگوہی خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ انہوں نے کئی سلسلوں سے فیض حاصل کیا۔ لودھیوں کے عہد میں انہیں مرکزی حیثیت حاصل رہی اور صدہا لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کے خلفاء میں سے حضرت مجدد الف ثانی کے والد شیخ عبدالاحد، شیخ جلال الدین تھانیسری اور شیخ عبدالغفور اعظم پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔''

مولانا عبدالحئی حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں لکھتے ہیں:

''الشیخ الصالح المعمر جلال الدین محمد عمری تھانیسری یکے از مشائخ کبار نے حفظ قرآن کے بعد درسیات پڑھنے شروع کیے۔ بحث و اشغال میں ایسا کمال کیا کہ نوادر زمانہ میں شمار ہوئے۔ کچھ مدت مسندِ تدریس مزین فرمائی۔ پھر راہِ طریقت پر چلتے ہوئے حضرت گنگوہی شیخ عبدالقدوس کے حلقۂ مسترشدین میں داخل ہوئے۔ حتیٰ کہ ان کے حکم سے بیعت و ارشاد کا اپنا سلسلہ قائم کیا۔ ۹۳ سال کی طویل عمر پائی۔ آخر عمر میں زہد و عبادت اور کثرتِ ریاضت سے اس قدر کمزور ہو گئے کہ تکیہ پر لیٹے رہتے لیکن بایں ضعف و پیری جب اذان کی آواز کان میں پڑتی تو قوت کی ایک لہر ان کے پورے بدن میں دوڑ

جاتی اور فوراً اٹھ کر پورے خشوع وخضوع سے نماز ادا کرتے۔

صاحب نزہتہ الخواطر نے شیخ جلال الدین تھانیسری کے جو احوال بیان کیے ہیں ان میں اُن کی اہم کتاب ''تحقیق اراضی ہند'' کا مطلق ذکر نہیں کیا۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ شیخ جلال الدین تھانیسری بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ علوم ظاہری و باطنی میں کامل اور عہد اکبری کے علمائے کبار میں سے سمجھے جاتے تھے۔ اقبال نامہ جہانگیری کا بیان ہے کہ جب اکبر بادشاہ نے اپنے بھائی محمد حکیم میرزا کے خلاف لشکر کشی کی تو راستے میں تھانیسر کے مقام پر شیخ جلال الدین کی زیارت کی۔ ملاقات کے دوران شیخ نے مسئلہ توحید کی وضاحت میں یہ رباعی پڑھی۔

آفتابے در ہزاراں آبگینہ تاختہ
پس برنگے ہر یکے تابِ عناں انداختہ
جملہ یک نور است اما رنگ ہائے مختلف
اختلافے درمیاں ایں و آں انداختہ

مولانا عبدالقدوس شیخ جلال الدین کے احوال میں رقم طراز ہیں:

''شیخ جلال الدین بن محمد عمری تھانیسری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ ان کی تصانیف میں سے ایک ''ارشاد الطائف'' اور دوسری ''تحقیق اراضی ہند'' مشہور ہیں۔ اول الذکر کتاب سلوک میں ہے اور موخر الذکر فقہ کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ ''تحقیق اراضی الہند'' ایک نادر اور بہت ہی اہم کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے حنفی اور شافعی فقہ کی رو سے زمین پر مالیہ یا عشر و جزیہ وغیرہ کے احکام بیان کئے ہیں۔ کتاب کا خاص موضوع سرزمین پاکستان و ہند کی اراضی اور اس کے مالکانہ حقوق کے ضمن میں فقہی احکام ہیں۔

''تحقیق اراضی الہند'' کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب شیخ جلال الدین تھانیسری کی لکھی ہوئی ہے جو عالم بھی تھے اور صوفی بھی۔ اور حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے خلیفہ تھے۔ اس کتاب کا تعلق ہند میں زمین کی ملکیت کے مسئلہ سے ہے۔ چونکہ یہ کتاب ایسے مسائل سے متعلق ہے جو ہند (یعنی برصغیر

پاکستان و ہند) سے مختص ہیں اس لئے کسی قدر تفصیل سے اس کا تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کے لکھنے سے مصنف کا مقصد بعض علماء کے اس نظریہ کی تردید کرنا ہے کہ اگر ہند میں کوئی امام یعنی بادشاہ کسی کو زمین عطا کرے تو وہ قانونی طور پر اس کی ملکیت نہیں ہو جاتی۔ چنانچہ اس کے لئے اس زمین کو فروخت کرنا اور اس کی قیمت سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔''

شیخ جلال الدین تھانیسری کا موقف یہ ہے کہ مسلمانوں نے چار سو برس پہلے ہندوستان کو پُرامن ذرائع سے نہیں بلکہ طاقت سے فتح کیا تھا اور یہ علم نہیں کہ کس زمین کا مالک کون تھا؟ کسی شخص کو یہ پتہ نہیں کہ اس طویل مدت میں ان لوگوں کا کیا حشر ہوا جو پہلے زمینوں کے مالک تھے۔ اس لئے ان حالات میں تمام زمینیں ایسی املاک ہیں جن کا کوئی دعویدار نہیں۔ اگر کسی گاؤں میں ان غیر مسلموں کی اولاد موجود ہے جو مسلمانوں کی فتح ہندوستان سے قبل زمینوں کے مالک تھے تو یہ اولاد ان زمینوں کی جائز مالک نہیں ہو سکتی کیونکہ مسلمانوں سے ان کے تعلقات خوشگوار نہیں رہے ہیں۔ ہندوستان میں زمینوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نہ تو فاتح سپاہیوں میں تقسیم کی گئیں اور نہ ہی غیر مسلموں کے قبضہ میں رہیں۔ اور اگرچہ آگے چل کر ان زمینوں کے پرانے مالکوں کی اولاد کسی نہ کسی طرح ان پر کاشت کرنے لگی، تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ حکومت نے ان کے قبضے کی توثیق کر دی ہے۔ اس طرح مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندوستان میں تمام زمینیں بیت المال کی ملکیت ہیں اور جو شخص بھی امام کی اجازت سے زمین کاشت کرتا ہے وہ حق کاشت کاری کی بناء پر زمین کا جائز مالک ہو جاتا ہے۔

شیخ جلال الدین نے مزید استدلال یہ کیا ہے کہ اگر کسی گاؤں میں ان غیر مسلموں کی اولاد موجود ہے جن کی ملکیت زمین کی امام نے تصدیق کر دی تھی تو اس صورت میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا سلسلۂ نسب مشتبہ ہے اور دوسرے یہ کہ حنفی اور شافعی فقہ میں اس مسئلہ پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ مسلمان جب کسی علاقہ کو فتح کر لیں تو امام کسی غیر مسلم مالک کے قبضہ کی توثیق کر سکتا ہے یا نہیں؟ شافعی فقہ کے مطابق امام کسی کافر کو زمین نہیں دے سکتا کیونکہ اس سے فاتح سپاہیوں اور لڑنے والی فوجوں کی حق تلفی ہو گی۔ مگر حنفی فقہا کا خیال اس کے برعکس ہے۔ مصنف کی رائے میں ان حالات میں جبکہ

مسلموں سے غیر مسلموں کے تعلقات خوشگوار نہ ہوں اور وہ اپنی عاجزی کا اظہار نہ کرتے ہوں، اس صورت میں قرآن مجید کی اس آیت کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا۔''

حتی یعطوا الجزیہ عن یدوھم صاغرون۔''

ترجمہ: حتیٰ کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ ادا کریں۔

مولانا عبدالمجید سالکؒ کی کتاب ''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' ایک معلومات افزاء اور قابل قدر کتاب ہے جس میں تاریخ و تذکرہ کی کتب معتمدہ کے مستند اور قابل اعتماد والے جا بہ جا ملتے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالمجید لکھتے ہیں: ''شیخ جلال تھانیسری علوم ظاہری اور نسبت طریقت کے اعتبار سے کامل تھے اور عہد اکبری کے بڑے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے ''تحقیق اراضی ہند'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس بات کی تردید کی ہے کہ'' اگر بادشاہ کسی غیر مستحق مسلمان کو ہندوستان میں کوئی زمین دے تو شرعاً وہ اس کا حق نہیں ہو جاتی کیونکہ یہ زمین غیر مسلم ذمیوں کی ہے۔'' آپ نے یہ ثابت کیا کہ وہ زمین بیت المال کی ہے اور امام وقت جس کو چاہے دے سکتا ہے۔''

شیخ جلال الدین تھانیسری کو یہ کتاب لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ان کے زمانے میں اراضی کے بارے میں ایک واقعہ پیش آیا۔ یعنی وہ اراضی جو پہلے ہندوؤں کے قبضہ و تصرف اور ملک میں تھی مسلمان سلاطین نے فتح ہند کے بعد ان میں سے کچھ زمینیں بعض مستحق مسلمانوں کو بطور ملک عطا کر دیں جس پر اس دور کے بعض علماء نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ اس بناء پر دیا کہ اسلامی فتح کے بعد جبکہ مالکان اراضی ہندوؤں کو ان کی زمینوں پر فاتحانِ اسلام نے قائم و برقرار رکھا تو وہ ہی اپنی زمینوں کے مالک رہے۔ اب سلاطین کو یہ حق نہیں کہ یہ زمینیں عطیہ میں مسلمانوں کو دے دیں۔ اس لئے جن لوگوں کو یہ زمینیں دی گئی ہیں وہ ان کے مالک نہیں ہوئے۔ ان کی بیع و شراء اور جملہ مالکانہ تصرفات غلط و ناجائز ہیں۔ اس پر شیخ جلال الدین تھانیسری نے اپنی کتاب ''تحقیق اراضی الہند'' ان علماء کے رد میں تحریر کی۔

مولانا مفتی محمد شفیع نے اپنی کتاب ''اسلام کا نظام اراضی'' میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ'' حضرت جلال الدین تھانیسریؒ نے یہ رسالہ ان لوگوں کے رد میں تحریر فرما کر یہ ثابت کیا کہ سلاطینِ اسلام کا یہ تصرّف جائز و نافذ ہے اور اصحابِ عطیات ان اراضی کے مالک ہیں اور ان کے مالکانہ تصرفات درست ہیں۔'' مفتی

صاحب لکھتے ہیں:

'' شیخ جلالؒ نے اراضی ہند کی آٹھ اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ اصل مالک زمین لاوارث مر گیا مگر کسی دوسرے نے قبضہ کر لیا پھر اس دوسرے قابض شخص کے وارث ملکیت کے مدعی ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ اراضی ان کی ملکیت نہیں ہوسکتی۔

۲۔ سلطنتِ اسلامیہ کے زوال کے وقت بعض غاصبوں نے اصل مالکانِ اراضی کو جبراً ان کی زمینوں سے نکال کر خود قبضہ کر لیا۔ یہ اراضی بھی ان غاصبوں کی ملکیت نہیں قرار پا سکتی۔

۳۔ وہ زمینیں جو امام نے اوّل فتح میں بعض غانمین یا مستحق افراد کو دیں تو اس قسم کی اراضی بے شک ان کے مِلک میں داخل ہو جائے گی اور یہ زمینیں عشری ہوں گی۔

۴۔ افتادہ غیر آباد زمین جس پر کوئی متصرف نہیں مگر اس کا قابض سابق معلوم ہے، سو اس پر اگر کوئی دوسرا شخص قبضہ کر لے گا تو قابض ثانی کی مِلک ہو جائے گی۔

۵۔ غیر آباد زمین جس کا کوئی قابض سابق معلوم نہیں، اس پر اگر کسی نے بااجازت امام قبضہ کر کے آباد کر لیا تو وہ اس کی مِلک میں داخل ہو جائے گی اور بلا اجازت امام آباد کیا تو 'صاحبین' کے نزدیک پھر بھی مِلک ہو جائے گی۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک مِلک نہیں ہوگی۔

۶۔ وہ زمین جو مزروع اور قابل کاشت ہے مگر بعد فتح اس کے اس کا کوئی مالک معلوم نہیں تو اگر یہ زمین امام نے کسی شخص کو بطورِ مِلک دے دی تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا اور بدونِ تملیک کے محض اس کا خراج دے دیا تو وہ زمین کا مالک نہ ہوگا بلکہ صرف خراج کا مستحق ہوگا۔

۷۔ وہ زمین جو اصل سے معطل غیر مزروع غیر آباد ہے اور کوئی مالک معروف نہیں اگر یہ زمین امام نے کسی شخص کو دے دی اور اس کا خراج بھی اس کو معاف کر دیا تو یہ زمین اس شخص کی مِلک ہو جائے گی۔ خراج بھی معاف ہوگا۔

۸۔ وہ مزروع یا غیر مزروع زمین جس کا کوئی مالک معلوم و معروف ہے اگر امام نے کسی شخص کو اس زمین کی کاشت کی اجازت دے دی تو یہ زمین اس کاشتکار کی مِلک میں داخل نہ ہوگی۔

شیخ جلال الدین تھانیسری اراضیِ ہند کی یہ آٹھ اقسام بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''پھر سمجھئے کہ جب اراضیِ ہند ان ہی مختلف انواع و اقسام پر ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے تو ان کی ملکیت یا عدم ملکیت کا حکم علی الاطلاق جائز نہیں جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کس نوع میں داخل ہے اور جب کسی زمین کے متعلق کسی خاص نوع میں داخل ہونا یقینی طریقے سے معلوم ہو جاوے اس وقت بھی خاص اس نوعِ معین پر حکم کیا جاوے (علی الاطلاق نہیں) اور اس کا علم ہونے سے پہلے فتویٰ دینے میں جلدی نہ کی جائے کہ یہ ممنوع ہے۔

معلوم ہوا کہ شیخ جلال الدین کا اصل منشا اور مقصد یہ نہیں کہ ہندوستان کی زمینوں کو مطلقاً غیر مملوک ثابت کریں بلکہ ایسے حکم سے شیخ نے خود منع فرمایا ہے۔ شیخ کی غرض اصلی اس مقام پر یہ ہے کہ امام نے اگر کچھ اراضی مستحق افراد کو بطور ملک دے دی تو وہ ان کی ملک میں داخل ہو جائے گی، امام کے اس فیصلہ پر مالکان سابق کی ملکیت کی بناء پر اعتراض اور فیصلہ کو غیر نافذ قرار دینا درست نہیں اور یہ فیصلہ اپنی جگہ پر بلاشبہ صحیح اور درست ہے جس کو حضرت شیخ کے زمانے میں اس وقت کے مشاہیر علماء اربابِ فتویٰ شیخ اللہ داد جونپوری، شیخ طیب، مولانا محمد مفتی وغیرہم نے بھی قبول فرمایا۔ فرق صرف یہ رہا کہ ان علماء نے اس فیصلے کی بنیاد اس پر رکھی کہ ان اراضی پر بتقریر امام مالکانِ سابق کی ملکیت تسلیم ہونے کے باوجود امام کا یہ فیصلہ اس لئے درست ہے کہ مالکانِ سابق کی ملکیت بتقریر امام مسئلہ مجتہد فیہا ہے اور قضا قاضی و حکم امام مسئلہ مجتہد فیہا میں ہر دو جانب نافذ ہو جاتے ہیں۔

حضرت شیخ جلالؒ نے اس پر مزید یہ بھی اضافہ کیا کہ مالکانِ سابق کی ملکیت بھی اراضیِ ہند میں متعین طریق سے ثابت نہیں بلکہ اس میں بہت سے احتمالات ہیں جن کی رو سے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی ان کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔ پھر اس کی تصریح بھی فرما دی کہ ہم عدم ملکیت کا فیصلہ بھی علی الاطلاق نہیں کرتے، جس سے واضح ہو گیا کہ جمہور علماء ہند اور حضرت شیخ جلال قدس سرہٗ کے فیصلے میں درحقیقت کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔ کیونکہ حضرت شیخ بھی تمام اراضی ہند کے متعلق نہ علی الاطلاق ملکیت کا حکم فرماتے اور نہ عدم ملکیت کا بلکہ مختلف انواع پر تقسیم کر کے بعض میں ملکیت بعض میں عدم ملکیت ان کی تحقیق ہے اور یہی فیصلہ جمہور علماء ہند کا ہے۔ تفصیلات میں البتہ کچھ اختلاف رہے گا۔

غرض یہ کہ مولانا مفتی شفیع نے اپنی کتاب ''اسلام کا نظام اراضی'' میں حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری کی کتاب ''تحقیق اراضی ہند'' کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اپنی کتاب کے آغاز میں لکھا ہے کہ جب کوئی ملک فتح کیا جائے تو اس کی زمینیں ابتداً دو قسم پر ہوں گی۔ اول غیر مملوک جن کو اصطلاحِ فقہا میں ارضِ مباحہ کہا جاتا ہے یعنی جن کا کوئی خاص شخص مالک نہیں۔ دوم مملوک زمینیں جن پر خاص خاص زمیندار مالک و متصرف ہیں۔ پھر مفتی صاحب نے امیر المومنین حضرت فاروق اعظمؓ کے ان فیصلوں کا حوالہ دیا ہے جن میں انہوں نے جلیل القدر صحابہ کرامؓ کے مشورے سے عراق اور شام کی زمینوں کو غانمین میں تقسیم کرنے کی بجائے مصالحِ مسلمین کے لئے باقی رکھا۔ چنانچہ روایات کے عام الفاظ یہ ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق، شام اور مصر کی زمینوں کو مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ اس جگہ یہ تو ظاہر ہے کہ لفظ وقف اپنے حقیقی معنوں میں نہیں کیونکہ اس کے لئے ملک واقف شرط ہے اور ظاہر کہ حضرت فاروق اعظمؓ ان زمینوں کے مالک نہیں تھے اس لئے امام اعظم ابو حنیفہؒ اور پھر ان کے بعد آنے والے ائمہ فقہاء نے اس جگہ وقف کرنے کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ اراضی پر مالکان سابق کی ملکیت کو برقرار رکھ کر ان پر خراج مقرر کر دیا۔ جو ہمیشہ ہمیشہ بیت المال میں جمع ہو کر مسلمانوں کی ضروریات میں کام آتا رہے گا۔ جیسے اراضی موقوفہ کی آمدنی مصارف وقف کے لئے دائمی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کتبِ حنیفہ میں ان ممالک کی زمینوں کو باوجود مِلک مالکان تسلیم کرنے کے بمنزلہ وقف کیا ہے۔ چنانچہ ''جامع الغموص'' کے یہی الفاظ ہیں اور ابنِ حزم نے ''محلی'' میں امام اعظم ابو حنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ امام مختار ہے چاہے مفتوحہ زمینوں کو غانمین میں تقسیم کر دے اور چاہے وقف کر دے پس اگر وقف کیا تو یہ زمینیں اُنھیں کفار کی مِلک رہیں گی جن کی مِلک میں پہلے سے تھیں۔ اس وقف سے مراد یہ ہے کہ اراضی موقوفہ کی طرح ان کے خراج کی آمدنی ہمیشہ مفادِ مسلمین کے لئے محفوظ رہے گی۔

امام ابو یوسف روایت کرتے ہیں کہ امیر المؤمنین عمر فاروق کے پاس جب حضرت سعد بن ابی وقاص عامل عراق کا وفد حاضر ہوا تو آپ نے اصحاب رسول اللہ کے ساتھ مجلس مشاورت میں فرمایا کہ ''اے مسلمانو! اب حکومت کے شعبے متعین کیے جائیں۔'' کیوں کہ حضرت عمرؓ اب تک اموالِ غنیمت شرکائے جہاد میں ہر کہ ومہ کے لیے مساوی

تقسیم پر متفق تھے۔ مگر (ان) فتوحاتِ عراق سے جب مسلمانوں کے ہاتھ اموال غنیمت بکثرت آ گئے تو آپ نے اپنے سابقہ اندازِ تقسیم میں بہ مصلحتِ وقت تبدیلی کرتے ہوئے مساوی کی بجائی تفاضل کا ارادہ کر لیا اور صحابہ کرام نے بھی بخوشی و مجبوری امیر المؤمنین کی رائے سے اتفاق کر لیا۔

مگر امیر المؤمنین نے فتح عراق میں اراضی کی تقسیم میں جب مشاورت فرمائی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم نے اس کے بھی تقسیم ہی کر دینے کا مشورہ دیا۔ مگر امیر المؤمنین اس پر متفق نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا: ''آخر ان مسلمانوں کا کیا حشر ہو گا جو ہمارے بعد آئیں گے، کہ تمام اراضی اور ممالک مفتوحہ تقسیم کیے جا چکے ہوں گے۔ پس میری رائے اراضی کی تقسیم پر نہیں'' ـــــ جس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کھڑے ہو کر فرمایا: ''کیا یہ اراضی اور ان کے غیر مسلم مالکان اللہ نے ہمیں فتح میں نہیں دیے؟''

امیر المؤمنین نے فرمایا: ''اے عبدالرحمٰن بات یہی ہے جو آپ فرماتے ہیں۔ مگر میری رائے ان اراضی کی تقسیم سے متفق نہیں (کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں) اب میرے بعد کوئی ایسا شہر فتح نہ ہو گا جس سے مسلمانوں کو اتنا نفع حاصل ہو جتنا اب تک ہو چکا ہے۔ جب کہ آئندہ فتح ہونے والے علاقے مسلمانوں پر اور بھی بار ثابت ہوں گے۔ پس اگر شام و عراق کی اراضی اور باشندے موجودہ مسلمانوں پر تقسیم کر دیے گئے تو آئندہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لیے کہاں سے مال آئے گا؟ اور آج کے بعد فتح ہونے والے شہروں کے یتیم اور بیواؤں کی کفالت کیونکر کی جا سکے گی؟''

اس موقع پر شام و عراق کے محاذ پر لڑنے والوں نے دوبارہ اصرار کیا کہ انہیں یہ اراضی اور ان کے باشندے بصورتِ غلام تقسیم کر ہی دیے جائیں، بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

''و لا تقف ما آفاء اللہ علینا باسیافنا علیٰ قوم لم یحضروا و لم یشھدو او لابناء قوم و لابناء ھم لم یحضروا۔''

ترجمہ: اے امیر المؤمنین! ہماری تلواروں کے ذریعے سے جو مال اللہ نے ہمیں عنایت فرمایا ہے، آپ کو اس کی حوالگی میں توقف نہ برتنا چاہیے۔ ان لوگوں کی بھلائی کے لیے جو اس وقت موجود ہی نہیں، نہ ان لوگوں کی اولاد کے لیے جو آئندہ آنے والی ہے۔

اس پر امیر المؤمنین نے معاملہ مشاورت کے لیے پہلے مہاجرین اولین کے سامنے رکھا۔ پھر قبیلہ اوس اور خزرج کے پانچ پانچ بزرگوں سے مشورہ کیا اور بالآخر امیر المؤمنین سیدنا فاروق اعظم کی اس رائے کو تسلیم کر لیا گیا کہ عراق کی اراضی اور غیر مسلم باشندے تقسیم نہیں ہوں گے اس لیے کہ ریاست کا استحکام اسی میں ہے کیونکہ اس طرح حضرت عمرؓ کے قول کے مطابق:

ا۔ اراضی سے خراج (لگان) وصول ہوگا۔

ب۔ غیر مسلم رعایا سے جزیہ حاصل ہوگا۔

اور یہ دونوں قسم کے محاصل جنگوں کے کام آئیں گے، بیت المال میں جمع ہونے سے موجودہ مسلمانوں کی اولاد کی معونت ان سے ہوگی اور دوسرے آج کے بعد مسلمانوں کو جو ضرورتیں درپیش ہوں گی اُن میں مدد حاصل ہوگی۔ نیز یہ کہ اس سے فوجی چھاونیاں قائم کی جائیں گی۔

شہزادہ دارا شکوہ نے ''سفینۃ الاولیا'' میں حضرت شیخ جلال تھانیسری کے احوال بیان کیے ہیں اور لکھا ہے ''پدری اور مادری سلسلے سے آپ کا نسب حضرت فاروق اعظم سے ملتا ہے۔ آپ کا وطن مالوف بلخ ہے۔ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں آپ نے علوم دینی کی تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ درس و تدریس اور افتاء کے منصب پر فائز ہوئے... وجد و سماع کا ذوق رکھتے تھے۔ آپ کا مستقل قیام قصبہ تھانیسر میں رہتا تھا۔ سلسلہ چشتیہ کے مشائخ متاخرین میں آپ کا ہم پایہ درویش کوئی نہیں ہوا۔ منقول ہے کہ شیخ جلال الدین کے مریدین میں سے ایک مرید نے آپ کی بے حد خدمت کی۔ لیکن اس عرصہ میں اس نے کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ ایک دن شیخ سے گفتگو کے دوران اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ عہدِ ماضی میں شیخ نجم الدین کبریٰ ایسے صاحب کمال شیخ تھے کہ جس پر ایک نظر ڈالتے تھے اسے مقام ولایت پر فائز کر دیتے تھے۔ آج اس مرتبے کا کوئی درویش نظر نہیں آتا۔ شیخ کو مرید کے خیال سے آگاہی ہوئی۔ آپ نے فرمایا ''آج بھی ایسے لوگ ہیں جو ایک نظر میں فقر و سلوک کے مقامات طے کرا سکتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی وہ مرید بیہوش ہو گیا اور جب ہوش آیا تو ولایت کے اعلیٰ مقام تک پہنچا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر زندہ رہ کر جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ شیخ نے فرمایا کہ ''ہر شخص یہ بارِ ولایت برداشت نہیں کر سکتا۔''

شیخ محمد غوثی مندوی مؤلف ''گلزارِ ابرار'' میں لکھتے ہیں کہ شیخ جلال الدین محمد تھانیسری عالمانہ کمالات اور درویشانہ مقامات کے جامع، دریائے توحید کے غواص اور بلند پایہ محقق و معلم تھے۔ رسمی علم کی فروع و اصول کے مطالعہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اکثر کتب متداولہ پر مشکل کشا حواشی لکھے اور تعلیقات لگائی ہیں۔ دن میں روزہ رکھتے اور رات عبادت میں گزارتے تھے۔ نماز تہجد ادا کرنے کے بعد کھانا کھایا کرتے تھے۔ ہر روز رات دن میں خانقاہ کے حافظوں کے ساتھ دو دفعہ قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ نمازِ ظہر سے فارغ ہونے کے بعد درس میں مشغول ہو جاتے تھے۔ آپ کی صحبت باطنی فروغ اور ظاہری فیض زیادہ کرتی تھی۔ درویشانہ سماع کے قائل تھے۔

شیخ عبدالقدوس حنفی گنگوہی کے مُرید تھے۔ آپ کے مرشدِ طریقت کا سلسلہ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا سہروردی تک پہنچتا ہے۔ اس ترتیب کے ساتھ شیخ عبدالقدوس شیخ درویش قاسم ابن شیخ برہان الدین اودھی۔ شیخ بدھن بہڑائچی، شیخ سید اجمل، مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری۔ شیخ رکن الدین ابوالفتح، شیخ صدر الدین عارف، ابو شیخ الاسلام بہاء الاولیاء قدس اسرارھم۔

شیخ جلال الدین تھانیسری کے روحانی جانشین شیخ عبدالبصیر تھے اور ان کے مریدانِ کاملین اور خلفاء میں شیخ بہاء الدین احمد سرہندی اور شیخ نظام الدین تھانیسری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مغل فرمانروا جہانگیر کی خود نوشتہ سوانح عمری ''توزک جہانگیری'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے خسرو کی حمایت کی بناء پر گورو ارجن دیو اور ایک پیر سے مواخذہ کیا تھا۔ یہ مسلمان پیر شیخ نظام الدین بن عبدالشکور بلخی، شیخ جلال الدین تھانیسری کے خلیفہ تھے۔ انہیں ہندوستان سے جلاوطن کیا گیا۔

''تحقیق اراضیِ ہند'' کے بارے میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ انڈیا آفس لائبریری کے فہرست ساز نے یہ کتاب ''احکام الاراضی'' کے نام سے درج کرتے ہوئے اسے شیخ محمد اعلیٰ تھانوی نامی ایک شخص سے منسوب کر دیا، جو غلط ہے۔ کیونکہ کتاب کی داخلی شہادت اس بیان کی تردید کرتی ہے اور وہ یہ کہ مصنف اپنی کتاب میں جب یہ کہتا ہے کہ ہند میں اسلامی حکمرانی کو قائم ہوئے چار صدیاں بیت چکی ہیں تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے مصنف کا تعلق دسویں صدی ہجری یعنی سولھویں صدی عیسوی سے ہونا چاہئے نہ کہ گیارھویں صدی سے یا اس کے بعد کے زمانے سے، اور شیخ محمد تھانوی تو بعد

کی شخصیت ہے۔ مزید برآں اب تو اہل علم کے ہاں یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ یہ کتاب شیخ جلال تھانیسری کی تصنیف ہے۔

مرشد کامل، فاضل اجل حضرت شیخ جلال الدین محمد تھانیسری نے ۹۸۹ھ میں وفات پائی۔

شیخ قطب لاہوری

شیخ قطب الدین محمد لاہوری ثم نہروالی کا شمار دسویں صدی ہجری کے مشاہیر اسلام میں ہوتا ہے۔ شیخ قطبؒ نے برصغیر پاکستان و ہند کے علاوہ دنیائے اسلام بالخصوص مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور مصر، شام، عراق ایسے ممالک میں قابلِ قدر شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اس زمانے میں یہ سب شہر اور ممالک سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھے۔ شیخ قطب الدین محمد بلند پایہ محدث، ممتاز فقیہ، نامور انشاء پرداز ہونے کے علاوہ شعر وسخن سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ ان کا پورا نام ونسب یوں ہے:

محمد بن احمد بن محمد بن محمود حنفی لاہوری نہروالی۔ وہ ۹۱۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔ شیخ قطب الدین محمد کا اپنا بیان ہے کہ میں نے طریقہ تصوف شیخ علاؤالدین کرمانی نقشبندی سے حاصل کیا۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس نے شیخ قطب الدین محمد کے احوال بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

> ''قطب الدین محمد بن علاء الدین احمد حنفی نہر والی لاہوری ۹۱۷ھ میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ ابتدائی علوم اپنے والد سے حاصل کئے، بعد میں مکہ اور مصر گئے اور وہاں کے علماء سے علم اخذ کیا۔''

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالہ ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' (**The Contribution of India & Pakistan to the Arabic Litrature**) میں لکھا ہے کہ ''قطب الدین محمد بن علاء الدین احمد نہروالی کے والد وطن سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے اور مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور یہیں قطب

الدین ۹۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ مکہ معظمہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۹۴۳ھ میں بغرض تعلیم مصر گئے جہاں انہوں نے سربرآوردہ علماء سے تحصیل علم کیا اور اپنی قابلیت کی وجہ سے مشہور ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد وہ مکہ کے دینی مدرسہ میں درس دینے لگے اور پھر مفتی مقرر ہوئے۔"

مولانا عبدالحئی حسنی نے "نزہۃ الخواطر" میں شیخ محمد بن احمد نہروالی کے احوال بیان کیے ہیں اور ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> "الشیخ العالم المحدث محمد بن احمد بن محمود حنفی نہروالی حدیث و فقہ میں ممتاز تھے اور انشا و شعر میں فرد تھے، وہ ۹۱۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے پڑھ کر مصر اور مکہ کے لیے روانہ ہوئے جہاں ان حضرات سے اکتساب علم کیا: خطیب احمد بن محب الدین بن ابوالقاسم محمد النویری مکی، محدث یمن وجیہہ الدین عبدالرحمٰن بن علی الزبیدی، شیخ شہاب الدین احمد بن موسیٰ مغربی الاصل ثم مصری نزیل حرمین از والدش و از شیخ محمد بن المالکی اور ان کے والد شیخ محمد بن عبدالرحمٰن۔"

شیخ قطب الدین محمد کی سند حدیث ابوالفتوح نورالدین احمد بن عبداللہ طاوسی کے واسطہ سے بہت عالی تھی جو اہل حرمین کو بھی علمائے برصغیر، جیسے شیخ عبداللہ بن سعد لاہوری وغیرہ کے ذریعے سے حاصل ہوئی تھی۔ اس ضمن میں صاحبِ نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں: "صحیح بخاری کی سند و اجازۃ میں انہیں جو علوِ سند حاصل ہے میرے اندازے میں تو وہ علو کسی اور کو حاصل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے والد شیخ علاء الدین احمد بن محمد نہروالی سے روایت کرتے ہیں اور وہ روایت کرتے ہیں حافظ نورالدین ابوالفتوح احمد بن عبداللہ طاوسی شیرازی سے اور وہ روایت کرتے ہیں شیخ معمر بابا یوسف ہروی سے اور وہ روایت کرتے ہیں محمد بن شاد بخت فارسی فرغانی سے اور انہوں نے سماع کیا ہے امام بخاری ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل سے۔"

مولانا عبدالحئی حسنی مزید لکھتے ہیں کہ "بعض فہرست نگاروں نے لکھا ہے کہ شیخ قطب الدین محمد نہروالی نے اگر بخاری کی روایت حافظ نورالدین ابوالفتوح طاوسی سے اپنے والد کے واسطے کے بغیر بھی کی تو اس سے ان کے اور بخاری کے درمیان آٹھ واسطے رہ

گئے، پس بخاری کی ثلاثیات بارہ واسطوں پر مشتمل ہیں کیونکہ انہوں نے حافظ ابن حجر سے بطریق اجازۃ یہ ثلاثیات سنیں۔ اس سند میں حافظ ابن حجر اعلیٰ ہیں باعتبار اجازۃ کے۔ جن کے بعد امام بخاری تک چھ واسطے اور رہ جاتے ہیں۔ پس میں نہیں جانتا اس سند سے اعلیٰ کوئی اور سند ہو۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ قطب الدین کا ترجمہ قاضی شوکانی نے اپنی کتاب ''البدر الطالع'' میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ اشراف مکہ کے لیے خطوط لکھ دیتے، وہ نہایت فصیح عربی جانتے تھے جس کا اندازہ ان کی کتاب ''البرق الیمانی فی فتح العثمانی'' سے ہوسکتا ہے۔ ان کی تالیفات میں الاعلام فی اخبار بیت اللہ الحرام بھی ہے۔''

شیخ قطب الدین محمد محدث وفقیہ ہونے کے علاوہ ایک مشہور مؤرخ بھی تھے، چنانچہ ان کی کتاب الاعلام باعلام بیت الحرام مکہ معظمہ کی مفصل تاریخ ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک مقدمہ، دس ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں مصنف نے اپنی کتاب کے مآخذ کی فہرست درج کی ہے اور لکھا ہے کہ مکہ کا قدیم ترین مؤرخ عبدالولید محمد بن عبدالکریم الارزقی ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد نے شیخ قطب الدین محمد کی کتاب کے ابواب کی فہرست نقل کی ہے جس سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

باب اوّل: مکہ اور کعبہ کا جغرافیائی بیان۔
باب دوم: کعبہ کی بناء اور تعمیر۔
باب سوم: عہد جاہلیت اور آغاز اسلام میں مسجد الحرام کی کیفیت۔
باب چہارم: امویوں کے عہد میں مسجد الحرام میں اضافہ کیا گیا۔
باب پنجم: منصور کے عہد میں شروع ہوکر اس کے بیٹے مہدی کے عہد میں مکمل ہونے والی تعمیر کے بعد آئندہ عباسیوں کے عہد میں ہونے والے دو اہم اضافوں کا خصوصی بیان۔
باب ششم: جراکسہ کے عہد میں مسجد کی مرمت۔
باب ہفتم: مسجد الحرام عہد عثمانیہ میں۔
باب ہشتم: مسجد الحرام سلیم اول کے عہد حکومت میں۔
باب نہم: مسجد الحرام سلیم دوم کے عہد حکومت میں۔

باب دہم: مسجد الحرام سلطان مراد کے عہد میں۔
ضمیمہ مکہ میں مقدس مقامات کا بیان، کعبہ کی تاریخ کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے مصنف نے عہد رسالت سے لے کر خود اپنے زمانے تک مسلمانوں کی پوری تاریخ کا سرسری خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

مغربی علماء نے اس کتاب کی اہمیت کو بخوبی محسوس کیا اور اس نوعیت کی دوسری کتابوں کے ساتھ اس کو بھی ووسٹن فلڈ نے مرتب کیا۔''

شیخ قطب الدین محمد کی تاریخ کی ایک اور کتاب ''البرق فی الفتح العثمانی'' ہے۔ یہ کتاب ۹۰۰ھ سے لے کر ۹۷۸ھ تک یمن میں رونما ہونے والے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کے تین ابواب ہیں: پہلا باب، تیرہ فصلوں میں منقسم ہے جس میں دسویں صدی ہجری کے آغاز سے لے کر ترکان عثمانی کی فتح یمن تک یمنی بادشاہوں کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ۳۷ فصلیں ہیں اس میں یمن پر ترکوں کے قبضہ سے لے کر سلطان سلیمان کے عہد تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں دس فصلیں ہیں جس میں سلطان سلیم کے عہد کے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اختتامی باب چار فصلوں پر مشتمل ہے جن میں سنان پاشا کی مصر کو واپسی اور اس کی شمالی افریقہ میں فتوحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ ترک شیخ قطب الدین محمد کی بہت قدر کرتے تھے۔ جو بھی مکہ معظمہ آتا، وہ ادائے مناسک میں نہ صرف اس کی معیت میں رہتے بلکہ کسی اور کا ان کے ساتھ رہنا پسند نہ کرتے اور ان کو اس خدمت کے لیے عطایا بھی ملتے تھے جو وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے یا پھر عمدہ کتابیں خرید لیتے تھے۔ وہ باغات کی تزئین کے بھی دلدادہ تھے۔ دوستوں کو ساتھ لے کر طائف بھی جاتے۔ یہ دوست عالم، ادیب اور شاعر ہوتے جو ان کے مصارف پر سیر و سیاحت کرتے تھے۔ شیخ قطب الدین نے اپنی تالیف ''تاریخ مکہ'' میں خود لکھا ہے کہ ''سلطان احمد شاہ گجراتی کا جو مدرسہ مکہ معظمہ میں حرم محترم میں ہے اس کا منتظم میں ہوں۔'' سید عبدالحئی لکھتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ ان کے والد علاء الدین احمد بن محمد نہروالی حجاز گئے تو اس مدرسہ کی تولیت ان کے سپرد کی گئی اور ان کی وفات کے بعد حسب معمول قطب الدین کو یہ منصب وراثتاً مل گیا۔ وہ دو مرتبہ قسطنطنیہ گئے جہاں ان کی بہت پذیرائی کی گئی، سلطان سلیمان نے انہیں خلعت

عطا فرمایا۔

شیخ قطب الدین محمد نے یہ بھی لکھا ہے کہ عثمانی سلاطین نے سرزمین حجاز اور شام وغیرہ میں مدارس بھی تعمیر کرائے جن کے اخراجات سلطنتِ عثمانیہ برداشت کیا کرتی تھی، مکہ مکرمہ میں مدرسہ حنفیہ سلمانیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ۹۷۵ھ کے دوران میں نے اس مدرسہ میں کشاف کا کچھ حصہ اور کچھ حصہ تفسیر ابوالسعو دعمادی کا پڑھا۔ اور ان دنوں میں وہاں پر ابن ہمام کی شرح ہدایہ کا آخری حصہ جسے مولانا شمس الدین احمد قاضی زادہ نے ملحق کیا ہے پڑھاتا ہوں اور طب اور حدیث و اصول کا بھی درس دیتا رہا ہوں۔

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد دوم عربی ادب کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ الاعلام باعلام بیت الحرام مفتی قطب الدین محمد لاہوری ثم مکی حنفی کی تمام تصانیف میں ممتاز اور اہم مقام رکھتی ہے اور مکہ مکرمہ اور خانہ کعبہ کی جامع اور مستند تاریخ متصور ہوتی ہے۔ حرم شریف کی تاریخ کے علاوہ مفتی صاحب نے اس کتاب میں دیگر معلومات کا ذخیرہ بھی جمع کر دیا ہے مثلاً وہ ضمنی طور پر مصر، شام، ترکی اور دیگر بلادِ اسلامیہ میں اپنے اسفار اور واقعاتِ سیاحت کو بھی قلمبند کرتے ہیں۔ مصر کے قیام کے دوران انہیں مصر کے عباسی خلیفہ متوکل ثالث سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا اور مفتی صاحب نے خلیفہ سے علوم کی سند بھی حاصل کی تھی، چنانچہ وہ خلیفہ متوکل کو اپنے شیوخ و اساتذہ میں شمار کرتے تھے۔ ترک سلطان مراد خان مفتی صاحب سے بہت ادب و احترم سے پیش آتا تھا اور ان کی بڑی قدر و منزلت اور مالی معاونت بھی کرتا تھا۔

مفتی صاحب نے سلطان مراد کی فتوحات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں سلاطین گجرات کی خدماتِ حرمین کا بھی ذکر کیا ہے اور اپنے دور کی علمی شخصیات اور ادباء و شعراء کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی کتاب ''الاعلام باعلام بیت الحرام'' معلومات و معارف کا ایک خزینہ ہے۔

مفتی شیخ قطب الدین محمد بن احمد بن محمود حنفی نقشبندی لاہوری مکی نے ۹۹۰ھ میں وفات پائی۔

محمد بن عبدالعزیز معبری

شیخ محمد بن عبدالعزیز دسویں صدی ہجری کی معتبر و متمول شخصیات میں سے تھے۔ علوم عربیہ کے فاضل اور عربی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک حساس، غیرت مند اور آزادی پسند قومی شاعر کی حیثیت سے انہوں نے قابلِ قدر شہرت حاصل کی۔ ''تحفۃ المجاہدین'' کے مصنف شیخ زین الدین بن عبدالعزیز معبری کے بھائی اور معبر کے معزز دینی وعلمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، ان کا نام ونسب یوں ہے:

''شیخ محمد بن عبدالعزیز بن زین الدین ابی یحییٰ بن علی بن احمد معبری ثم ملیباری۔''

شیخ محمد بن عبدالعزیز کے والد شیخ عبدالعزیز بن زین الدین الشافعی، قادری چشتی اپنے زمانے کے ممتاز عالم اور عارف باللہ تھے۔ انہوں نے اپنے والد شیخ زین ابو یحییٰ معبری کے مشہور قصیدہ ''ھدایۃ الاذکیاء الیٰ طریق الاولیاء'' کی ۹۹۳ھ میں ایک مفصل شرح لکھی جو ''مسلک الاتقیاء فی شرح ھدایۃ الاذکیا'' کے نام سے ۱۲۹۲ھ-۱۸۷۵ء میں بولاق سے شائع ہوئی۔ شیخ زین الدین ابو یحییٰ (۸۷۳ھ تا ۹۲۸ھ) ظاہری و باطنی علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ چشتیہ اور قادریہ سلسلوں میں بیعت کر رکھی تھی۔ انہوں نے فقہ، تصوف اور مسائل وعظ وتذکیر میں کئی کتابیں لکھیں۔

شیخ زین الدین ابو یحییٰ کے زمانے میں فتنہ پرتگیزی نمودار ہو چکا تھا اور پرتگالی بحری بیڑہ بحر ہند میں اپنا اقتدار قائم کر کے لوٹ مار، قزاقی اور قتل و غارت میں مصروف تھا۔ چنانچہ شیخ زین الدین ابو یحییٰ نے اپنی ایک طویل نظم بعنوان ''تحریض اھل ایمان علی جھاد عبدۃ الصلبان'' میں پرتگیزی لٹیروں کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب و تحریص دلائی ہے۔

شیخ محمد بن عبدالعزیز کے بھائی زین الدین بن عبدالعزیز نے ایک انتہائی قابلِ قدر اور نادر کتاب تاریخ مسمی ''تحفة المجاهدین فی بعض اخبار البرتکالین '' ۹۹۳ھ۔۱۵۸۵ء میں لکھی جو فریضہ جہاد اور مالا بار کے عجیب و غریب ہندوانہ رسوم و رواج کے علاوہ برصغیر میں پرتگیزوں کے داخلے اور ان کے مظالم کی داستانِ خونچکاں ہے۔ فی الحقیقت پرتگالیوں کی برصغیر کے ساحلی علاقوں پر یلغار اور مقامی باشندوں پر ان کا ظلم و تشدد اس کتاب کا اصل موضوع اور اس کا مقصد مسلمان حکمرانوں اور امراء و روٴساء کو مالا بار کے مظلوم مسلمانوں کی مدد پر آمادہ کرنا تھا۔ یہ کتاب سلطان علی عادل شاہ والیِ بیجا پور کے نام معنون کی گئی جو جلال الدین اکبر بادشاہ کا ہم عصر تھا۔ 'تحفة المجاہدین'' ۱۹۳۱ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔

شیخ محمد بن عبدالعزیز نے اپنے بھائی شیخ زین الدین بن عبدالعزیز اور اپنے بھائی کے ہم نام اپنے دادا شیخ زین الدین ابو یحییٰ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پرتگیز بحری قزاقوں کی لوٹ مار اور ننگی جارحیت کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے نثر کی بجائے نظم کو ذریعہ اظہار بنایا۔ جیسا کہ ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم عربی ادب کے مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس نے شیخ زین الدین معبری کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ان کے بھائی محمد بن عبدالعزیز نے ایک ساحلی معرکہ کے حالات ایک طویل رِجز میں نظم کئے ہیں جس کا نام ہے ''الفتح المبین للسامری الذی یحب المسلمین '' اس میں جنوبی ہند کے مقامی راجہ زیمورین کے پرتگالیوں کے مقابلے میں فتح یاب ہونے کی داستان بیان کی ہے۔''

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیق مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں لکھا ہے۔

> ''محمد بن عبدالعزیز کالی کوٹی مالاباری کا تعلق دسویں صدی ہجری کے آخر نصف سے ہے اور یہ بھی عربی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے حالات کا علم بہت کم ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ معبر کے ایک ذی علم خاندان کے فرد تھے۔ ان کے بھائی زین الدین ''تحفة المجاہدین'' کے مصنف تھے۔''

مولانا سید عبدالحیٔ حسنی نے برصغیر پاک و ہند کے علماء اور مشاہیر اسلام کے ہزار

سالہ تذکرہ مسمی ''نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر'' کی جلد چہارم میں شیخ محمد بن عبدالعزیز اور ان کے معروف دینی خانوادے کے دیگر ممتاز علماء، فقہاء اور صوفیاء کے حالات بیان کرنے میں حزم و احتیاط اور مؤرخانہ ذمہ داری سے کام نہیں لیا جس کے باعث معبر کے ان مشائخ کی شخصیت ان کے احوال اور ان کے دینی و علمی کارنامے قارئین تک پہنچ نہیں پائے۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالحئی نے شیخ زین الدین کی ''تحفۃ المجاہدین'' ایسی اہم تصنیف کو یکسر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ برصغیر پاک و ہند میں پورے مسلم عہد میں عربی زبان میں لکھی جانے والی کتب تاریخ میں یہ کتاب سرفہرست ہے جس سے اس کی تاریخی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس اہم تاریخی کتاب میں نہ صرف پرتگیزی درندوں کے مسلمانوں پر مظالم اور قتل و غارت گری کے واقعات بڑے مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں بلکہ یہ کتاب اس لحاظ سے بہت مفید و کارآمد ہے کہ اس کے مندرجات سے ہمیں اس اثر و اقتدار کا پتہ چلتا ہے جو مسلمانوں نے مالابار میں تبلیغ اسلام کے ذریعہ حاصل کر لیا تھا۔ مولانا عبدالحئی حسنی نے شیخ محمد بن عبدالعزیز کے حالات ''آداب الفقه العربية'' کے حوالے سے تین چار سطروں میں بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں... الشیخ الفاضل محمد بن عبدالعزیز کالی کوٹی مالاباری اپنے علاقے کے مشہور عالم تھے۔ ''الفتح المبین السامری الذی یحب المسلمین'' یہ قصیدہ ہے۔ ۱۵۰ اشعار کا، در واقعہ زامعدی، فیمابین اہل پرتگال و ہنود در ۹۰۳ھ۔ ۱۴۹۷ء۔''
محمد بن عبدالعزیز اور ان کے تالیف کردہ قصیدے کے بارے میں مولانا عبدالحئی نے یہ دو جملے نقل کرنے کے بعد یہ اضافہ کیا ہے کہ اس قصیدہ کا ایک نسخہ انڈین لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ اس قصیدے کے بارے میں یہ جملہ مولانا عبدالقدوس نے بھی اپنے مقالے میں لکھا ہے۔

مولانا عبدالحئی نے اپنے روایتی انداز فکر کے تحت اور اپنے مسلک کے پیش نظر شیخ محمد بن عبدالعزیز کے ساتھ بھی وہی سلوک اور رویہ اختیار کیا ہے جو رویہ انہوں نے معبر کے اس صوفی المشرب دینی و علمی خانوادے کے دیگر بزرگان دین کے احوال بیان کرتے ہوئے اختیار کیا۔ مولانا عبدالحئی نے محمد بن عبدالعزیز کے قصیدہ کے اشعار کی تعداد ایک سو پچاس لکھی ہے، جو غلط ہے۔ اس لئے کہ ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں اس قصیدے کے اشعار کی تعداد پانچ سو تین لکھی

ہے۔ ہمیں افسوس اور دُکھ کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی کتر بیونت، کاٹا چھانی، کھینچا تانی اور افراط و تفریط مولانا عبدالحیٔ حسنی کے تذکرہ موسوم بہ ''نزہۃ الخواطر'' میں اکثر مقامات، بالخصوص بزرگانِ دین اور مشائخ کرام کے احوال میں دکھائی دیتی ہے۔ جو نہ صرف ان کے مخصوص اندازِ فکر کی غماز اور ان کے مخصوص طرزِ تحریر اور مخصوص مؤرخانہ رویے کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ تمام اہلِ علم اور صاحبِ قلم دانشوروں کے لئے اس لحاظ سے سبق آموز ہے کہ تحریر و تصنیف اور تالیف میں تسامح و تساہل پسندی اور غفلت و جانب داری کی بجائے انتہائی حزم و احتیاط اور عدل و انصاف سے کام لیا جانا چاہئے اور کسی بھی قیمت پر امانت و دیانت کے قرآنی اصولوں کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ امام المؤرخین ابو جعفر محمد بن جریر طبری، ابوریحان البیرونی اور موید الملک شیخ ضیاء الدین برنی مؤلف ''تاریخ فیروز شاہی'' نے تاریخ نویسی اور سوانح عمری کے جو اصول بیان کئے ہیں وہ ہر مسلمان صاحبِ قلم دانشور کے پیشِ نظر ہونے چاہئیں۔ علامہ ابن خلدون کے ''مقدمہ'' کے اصول و مبادیات کو بھی مشعلِ راہ بنانا چاہئے۔

تذکرہ نویسی بھی تاریخ نگاری کا حصہ ہے۔ چنانچہ ایک تذکرہ نویس کو ایک اچھے مؤرخ کی طرح دیندار و دیانت دار، راست باز، راست نگار ہونا چاہئے۔ افراد و شخصیات کے حالات و واقعات لکھتے وقت مؤرخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے مذہبی و معاشرتی تعصبات، نسلی و قومی تفاخرات حتیٰ کہ حب الوطنی جیسے نازک احساسات و جذبات کو بھی نظر انداز کر دے اور تاریخی حالات و واقعات کو جوں کا توں بیان کر دے۔ اسے اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور اپنے مسلک و مذہب سے بلند و بالا ہو کر لکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ مؤرخ اپنی ذات اور اپنے قبیلہ کے حالات و واقعات نہیں لکھ رہا ہوتا اور جو کچھ وہ لکھ رہا ہوتا ہے وہ اپنی ذات یا اپنے خاندان کے مطالعہ کے لئے نہیں لکھ رہا ہوتا بلکہ وہ سینکڑوں ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی تاریخ کے افراد و شخصیات کے حالات و واقعات اور ان کے مختلف النوع کمالات اور کارنامے قلمبند کر رہا ہوتا ہے۔ جسے ہر ملک و قوم اور ہر مسلک و مذہب سے وابستہ لوگوں نے پڑھنا ہوتا ہے اور اس کی تحریر نے آگے چل کر خود تاریخ کا حصہ بننا ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر لازم ہے کہ حقیقت پسندی اور صداقت شعاری کا مظاہرہ کرے اور ذاتی و خاندانی مفاد اور جماعتی و مسلکی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی تمام توجہ کو حقائق نگاری پر مرکوز کر دے۔

تاریخ نگاری بھی ایک قسم کی شہادت ہے۔ معاصر مؤرخین اپنے چشم دید واقعات کو قلمبند کرتے ہیں یا پھر ثقہ، راستباز، حق گو، لوگوں سے ان کے چشم دید واقعات سن کر ان کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے دور کے تاریخی حالات و واقعات کی شہادت دیتے ہیں۔ پھر وہ مؤرخین جو تحقیق و مطالعہ سے تاریخ کتب و تذکرہ سے اپنی کتابیں مرتب کرتے ہیں تو گویا وہ ایک دور کی شہادت کو ایک کتاب یا ایک سے زائد کتابوں کی شہادت کو اپنی مرتب شدہ کتاب میں منتقل کرتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ نگاری اور تذکرہ نویسی شہادت کی منتقلی کے زمرہ میں آتی ہے اور شہادت کے لئے صحیفۂ انقلاب قرآنِ حکیم میں واضح احکام موجود ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے کہ ''شہادت دو عدل کے ساتھ خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے ماں باپ کے خلاف ہو، اور یہ بھی ارشادِ خداوندی ہے کہ ''شہادت دو خواہ وہ دشمن کے حق ہی میں کیوں نہ جاتی ہو اور جس طرح اپنوں کے ساتھ عدل و انصاف کرتے ہو اسی طرح اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف سے کام لو۔'' چنانچہ قرآنی احکام کے مطابق مؤرخین پر لازم ہے کہ جس طرح وہ اپنوں اور اپنی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں احوال و کوائف بیان کرنے میں پوری سعی و کوشش کرتے ہیں، بالکل اسی طرح دوسرے تمام افراد و شخصیات کے حالات قلمبند کریں تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ کسی تاریخی شخصیت کی کسی خصوصیت اور اس کے کسی کمال یا کارنامے کو چھپانا یا اس کی کسی تصنیف کو نظر انداز کرنا یا اسے اس کے مرتبہ و مقام سے کم ظاہر کرنا یقیناً اس کی حق تلفی کے مترادف ہے اور قارئین کے ساتھ بے انصافی کے علاوہ مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ایک جرم بھی ہے۔

مسلمان مؤرخین میں بھی درجنوں مؤرخ ایسے ہیں جنہوں نے کتبِ تاریخ لکھتے وقت انتہائی امانت و دیانت، حق گوئی و بے باکی اور جرات و صداقت کا مظاہرہ کیا۔ جن میں نمایاں ترین مثال علامہ ابوریحان البیرونی کی ہے۔ علامہ البیرونی نے ''کتاب الہند'' لکھ کر دنیا پر اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ اسلام ایک ایسا عظیم اور سچا دین ہے کہ جس کے پیروکار اگر کسی غیر ملک، غیر قوم اور غیر مذہب کے تاریخی احوال و آثار، ان کے رسوم و رواج اور معتقدات کو ضبطِ تحریر میں لائیں گے تو اس میں بھی حقائق نگاری کے اصول کو اسی طرح ملحوظِ خاطر رکھیں گے کہ گویا وہ اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنی مذہب کی خصوصیات بیان کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دُنیا میں ہر ملک اور ہر مذہب کے اہلِ علم علامہ البیرونی

کو دنیا کا سب سے سچا انسان قرار دیتے ہیں۔ اگر البیرونی دنیا کا سب سے سچا انسان تھا تو جس مذہب کی تعلیمات نے البیرونی جیسا سچا انسان پیدا کیا اس مذہب کی سچائی اور صداقت و عظمت میں شک و شبہ کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے اور جس شخصِ اکبر، پیغمبرِ اعظم، خیر البشر اور نبی آخر الزماں یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مذہب یعنی دین اسلام کو نوع انسانی تک پہنچایا، اس کی فضیلت و بزرگی اور روحانی و دنیاوی بلندیوں سے کون جراتِ انکار کر سکتا ہے؟

اسی نبی آخر الزماں اور پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی انقلابی دین کے ماننے والے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں علماء وفضلاء، فقہا اور صوفیاء میں سے شیخ محمد بن عبدالعزیز معبری ہیں۔ ان کے اپنے خانوادے میں درجنوں علماء وفقہا اور بزرگانِ دین نے جنم لیا اور ان کے خرمنِ کمال سے ہزاروں علماء فضلاء فقہا محدثین نے فیض حاصل کیا۔

شیخ محمد بن عبدالعزیز کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زبید احمد نے ''اخبار الاخیار'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''شیخ علی متقی، کی محمد بن عبدالعزیز سے ملاقات ہوئی تھی اور شیخ علی متقی ان کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔ نیز یہ کہ محمد بن عبدالعزیز نے الفتح المبین للسامری الذی بحب المسلمین کے نام سے ایک طویل رزمیہ نظم لکھی ہے جو ۵۰۳ھ پانچ سو تین اشعار پر مشتمل ہے اور جس میں کالی کٹ کے راجہ سامری اور واسکوڈی گاما کے پرتگالی سپاہیوں میں جنگ کے حالات نظم کئے گئے ہیں۔ اس رزمیہ نظم اور ''تحفۃ المجاہدین'' کا موضوع ایک ہی واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو ایک نے نثر میں بیان کیا ہے اور دوسرے نے نظم میں۔ اور یہ دونوں بھائی ان تمام واقعات کے شاہد ہیں۔ یہ نظم بعض خوبیوں کی حامل ہے۔ شروع سے آخر تک اندازِ بیان سادہ اور نفیس ہے۔''

ان چند اشعار سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ نظم کس انداز کی ہے۔ حسب دستور نظم کا آغاز حمد اور نعت سے ہوا ہے اور پھر اصل موضوع کی ابتداء ان اشعار سے کی گئی ہے۔

فان هذی قصه عجیبه	فی شرح حرب شانها غریبه
وقعة فی خطة الملیبار	و مثلها لم یجر فی تلک الدیار
بین المحب المسلمین السامری	و بین خصبه الفرنجی الکافر
نظمت بغضها و مالک لملوک	یسمع القصه سائر الملوک

لعلهم از سمعو یتفکرون	فی الحرب اولعلهم یعتبرون
لعلها تسیر فی الافاق	لا سیما فی الشام والعراق
و لیعلمو الهمة للسطان	السامری المشهور فی البلدان
صاحب کالیکوت المشهور	لازوال من فضل الغنی للعموره
و هو محب دیننا الاسلام	والمسلمین بین داالانام
ناصر دیننا و مجری شهعنا	حتی نخطة علی سلطانا

ترجمہ

''یہ عجیب واقعہ ہے اس لڑائی کے بارے میں جس کی عجیب شان ہے۔
یہ ایک لڑائی ہے مالا بار کے خطے میں جس کی مثل اس دیار میں اور کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔
یہ لڑائی محبّ مسلمین سامری اور اس کے دشمن یعنی فرنگی کافر کے درمیان ہوئی۔
میں نے اس ایک حصے کو منظوم کیا ہے۔ مالک الملوک کی قسم۔ تاکہ تمام فرمانروا اس قصے کو سنیں۔
تاکہ جب وہ اسے سنیں تو اس لڑائی پر غور کریں یا اس سے عبرت حاصل کریں۔
تاکہ تمام اطراف میں یہ پھیل جائے خصوصاً شام اور عراق میں۔
تاکہ لوگ شہرۂ آفاق سلطان سامری کی ہمت سے واقف ہو جائیں۔
یعنی مشہور سلطانِ کالی کٹ، خدائے غنی کے فضل سے یہ معمورہ ہمیشہ قائم رہے۔
وہ ہمارے دین اسلام کا بھی محبّ ہے اور ہماری شریعت کا جاری کرنے والا ہے۔
یہاں تک کہ خطبے میں بھی ہمارے سلطان کا نام لیا جاتا ہے۔''

ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے کہ اس نظم کا ایک نادر مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔

شیخ محمد بن عبدالعزیز اور ان کے بھائی شیخ زین الدین بن عبدالعزیز معبری دونوں کے سن وفات کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ شیخ زین الدین کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کی وفات ۹۹۱ھ یا ۹۹۳ھ کے بعد ہوئی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ شیخ محمد بن عبدالعزیز اور ان کے بھائی شیخ زین الدین بن عبدالعزیز نے دسویں صدی ہجری کے آخری برسوں میں سے کسی سن میں وفات پائی۔

شیخ عبدالعزیز معبری

شیخ عبدالعزیز معبری دسویں صدی ہجری کی قابل ذکر علمی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ علوم ظاہری و باطنی کے ماہر تھے۔ کتبِ تاریخ و تذکرہ میں شیخ عبدالعزیز معبری کا تذکرہ کئی حوالوں سے آتا ہے۔ پہلا حوالہ تو یہ ہے کہ وہ مالابار کے ایک معزز و ممتاز، دینی وعلمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ سادات مشائخ کا خاندان تھا جو کالی کٹ کے جنوب میں واقع قصبہ پونان (فونان) میں آ کر سکونت پذیر ہو گیا تھا اور بعد ازاں موپلا مسلمانوں کا بڑا علمی اور مذہبی مرکز بن گیا سادات کے اس خاندان میں کئی اہم اور نامور شخصیات نے جنم لیا۔

شیخ عبدالعزیز کے کتبِ تاریخ و تذکرہ میں ذکر کا دوسرا بڑا حوالہ ان کے دو صاحب فضل و کمال اور نامور بیٹے یعنی شیخ زین الدین معبری اور شیخ محمد بن عبدالعزیز ہیں۔ یہ شیخ زین الدین عبدالعزیز وہی ہیں جنہوں نے ''تحفۃ المجاہدین'' ایسی اہم تاریخی کتاب کے علاوہ چار کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی تصنیف ''ارشاد العباد'' پندو موعظہ کا مجموعہ ہے۔ ایک رسالے میں احادیث کے مطابق ان کوائف کا تذکرہ ہے جو موت کے بعد انسان پر گزرتے ہیں۔ ان کی تیسری کتاب ''قرۃ العین فی مہمات الدین'' ہے جو فقہی مسائل پر ہے اور انہوں نے ''فتح المعین'' کے نام سے خود ''قرۃ العین'' کی شرح لکھی ہے۔ شیخ زین الدین بن عبدالعزیز معبری کی یہ سب تصنیفات مصر میں کئی بار شائع ہو چکی ہیں۔ اور ''فتح المعین'' پر کئی علماء نے مبسوط حواشی لکھے ہیں۔ جبکہ شیخ عبدالعزیز کے دوسرے بیٹے یعنی شیخ محمد بن عبدالعزیز نے اپنے بھائی شیخ زین الدین کو ''تحفۃ المجاہدین''

جو کہ مالا بار میں پرتگیزیوں کے مسلمانوں سمیت تمام مقامی باشندوں پر لرزہ خیز مظالم کی عبرت انگیز داستان ہے ،کو"الفتح المبین للسامری الذی یحب المسلمین" کے نام سے منظوم کر دیا ہے۔ شیخ محمد معبری کی یہ طویل رزمیہ نظم عربی کے ۵۱۳ اشعار پر مشتمل ہے جس کا ذکر ڈاکٹر زبید احمد نے بھی اپنے تحقیقی مقالے"عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ" میں قدرے تفصیل کے ساتھ اور مولانا عبدالحیٔ حسنی نے "نزہۃ الخواطر" میں مختصر طور پر کیا ہے۔

شیخ عبدالعزیز کی شہرت کا ایک بڑا حوالہ ان کے والد ماجد حضرت شیخ زین الدین ابو یحییٰ علی بن احمد چشتی قادری معبری ہیں۔ جنہوں نے "فونان میں ایک جامعہ مسجد تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ خانقاہ اور مدرسہ بنوایا۔ شیخ زین الدین ابو یحییٰ اس پایہ کے عالم دین ،جلیل القدر فقیہ ،ممتاز محدث اور نامور صوفی بزرگ تھے کہ ان کے علم و فضل ، زہد و ورع ،صدق و صفا اور جود و سخا اور ان کے روحانی کمالات کی وجہ سے صرف مالا بار اور اس کے گرد و نواح کے شہروں اور علاقوں ہی کے نہیں بلکہ جاوا و سماٹرا تک کے جزائر مشرق کے تشنگانِ علم اور طالبِ حق جوق در جوق تحصیلِ علم اور سلوک و معرفت کی منزلیں طے کرنے آتے تھے۔ شیخ شہاب الدین ابن حجر الہیتمی (متوفی ۹۷۴ھ۔ ۱۵۶۶ء) جب مالابار تشریف لائے تو اسی خانقاہ میں فروکش ہوئے تھے اور یہیں انہوں نے تفسیر و حدیث کا درس بھی دیا تھا۔ اسی روح پرور پاکیزہ علمی ماحول میں شیخ عبدالعزیز کی پرورش ہوئی اور انہوں نے ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل و تکمیل اپنے والد ماجد شیخ زین الدین ابو یحییٰ سے کی۔

شیخ عبدالعزیز کے احوال مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے ان کے اپنے علم و فضل کے حوالے سے بھی بیان کئے ہیں۔ اس لئے کہ شیخ عبدالعزیز عالم فاضل ہونے کے علاوہ صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے والد کے قصیدہ "ہدایۃ الاذکیاء الی طریق الاولیاء" کی ایک مفصل شرح لکھی ہے جو اپنی جگہ ایک قابلِ ذکر علمی کارنامہ ہے۔ "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند" جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے شیخ عبدالعزیز معبری کے حالات مختلف کتب و رسائل کے حوالوں سے بیان کئے ہیں اور لکھا ہے:

"شیخ عبدالعزیز بن زین الدین ابی یحییٰ بن علی بن احمد معبری ثم ملیباری،

مالابار کے علمی و دینی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو کئی پشتوں تک علم و فضل کا سرچشمہ رہا، تحفۃ المجاہدین کا مصنف زین الدین معبری جو ایک مؤرخ اور عالم تھا آپ ہی کا فرزند ہے۔ شیخ عبدالعزیز معبری کی تاریخ پیدائش کہیں مذکور نہیں، البتہ وہ ۹۹۳ھ۔۱۵۸۵ء تک زندہ تھے کیونکہ اسی سال آپ نے اپنے والد کے قصیدہ ''ہدایۃ الاذکیاء الی طریق الاولیاء'' کی ایک مفصل شرح لکھی۔ جو ''مسلک الاتقیاء فی شرح ہدایۃ الاذکیاء'' کے نام سے ۱۲۹۳ھ۔۱۸۷۵ء میں بولاق سے طبع ہوئی۔ شیخ عبدالعزیز نے اپنے والد کے اس قصیدے کی ایک مختصر شرح بھی لکھی ہے جس کا خطی نسخہ ''ارشاد الاولیاء الی ہدایۃ الاذکیاء'' کے نام سے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔''

شیخ عبدالعزیز معبری کے علمی مرتبہ و مقام کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے لکھا ہے کہ ''شیخ عبدالعزیز نے مسلک الاتقیاء و منہج الاصفیاء علی ہدایۃ الاذکیاء طریق الاولیاء'' کے نام سے اپنے والد کے تحریر کردہ قصیدے کی جو شرح قلمبند کی ہے، اس سے ان کے علم و فضل کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ شرح بڑی تقطیع کے تقریباً پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ شارح یعنی شیخ عبدالعزیز نے اس شرح میں علوم و معارف اور طریقت کے بارے میں قیمتی معلومات کے ذخائر جمع کر دیئے ہیں۔ لغت، حدیث، تفسیر، نحو، عقائد، کلام اور اقوالِ صوفیہ کے نمونے جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ عبارت بڑی سلیس و شستہ اور اسلوب بڑا سہل اور دلچسپ ہے۔ اپنے والد کے اس منظومے کی اہمیت اور شرح کی ضرورت بیان کرتے ہوئے شیخ عبدالعزیز لکھتے ہیں۔ 'میں نے جب دیکھا کہ میرے والد، شیخ زین الدین المعبری کا قصیدہ بعنوان، ہدایۃ الاذکیاء الی طریق الاولیاء، کثرتِ فوائد، اختصار، غزارت علم اور قلتِ حجم کے باعث اہلِ تصوف کی کتابوں میں سب سے زیادہ نفع بخش اور رہنمائی کی رغبت رکھنے والوں کے قریب تر ہے اور پھر ہماری جماعت کے لوگ بھی اس کتاب کی مصروفیت کے لئے راغب اور اس کے فوائد معلوم کرنے کے پیاسے نظر آئے۔ چنانچہ میں نے اس قصیدے کی ایسی شرح لکھنے کا ارادہ کرلیا جس میں اس کے الفاظ کا ’ل اور فوائد کی تکمیل ہو۔

یہاں شیخ ابو یحییٰ زین الدین بن... ی المعبری کے بحر الکامل میں منظوم قصیدہ کے (۱۸۰) اشعار میں سے چند بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

الحمد لله الموفق للعلا

حمداً یوافی بره المتکاملا

حمد و ستائش اللہ کے لئے ہے، جس نے بلندی کی توفیق بخشی۔ ایسی حمد جو اس کے احسان کے برابر ہو سکے کامل احسان کے مطابق ہو۔

ثم الصلوۃ علی الرسول المصطفیٰ

والآل مع صحب و اتباع الولا

اس کے رسول مصطفیؐ پر درود و سلام اور آل وصحابہ و تابعین پر درود و سلام

تقویٰ الالہ مدارِ کل سعادۃ

وتباع اھوا راس شرھائلا

اللہ کی خشیت تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ اور خواہشات کی پیروی خوفناک برائی ہے۔

ان الطریقۃ شریعتہ و طریقتہ

و حقیقۃ فاسمع نھا ما مثلا

اللہ کی طرف جانے والا راستہ شریعت، طریقت اور حقیقت پر مبنی ہے۔

فشریعۃ کسفینۃ و طریقۃ

کالبحر ثم حقیقۃ درغلا

چنانچہ شریعت تو سفینہ کی مانند ہے اور طریقت سمندر ہے اور حقیقت قیمتی موتی

فشریعتہ اخذ بدین الخالق

وقیامہ بالامھو النھی انجلا

شریعت دینِ خالق سے تمسک کا نام ہے۔ اور اس کا قیام منہیات سے پرہیز ہے

و طریقۃ اخذ باحوط کالورع

و عزیمۃ کریاضۃ متبلا

طریقت کے معنی احوط پر عمل کرنا ہے۔ اور عزیمت اس ریاضت کو کہتے ہیں جو مخلصانہ ہو۔

و حقیقۃ لو صولہ للمقصد

و مشاھد نور التجلی بانجلا

حقیقت کا مطلب مقصد کو پالینا ہے۔ اور نور تجلی کو برملا دیکھ لینا ہے۔

من دام درا السفینة یرکب
و یغوص بنحراً درا حصلا

جس کو موتی کی تلاش ہے وہ سفینہ پر سوار ہوگا اور سمندر میں غوطہ لگائے گا تب جا کر یہ موتی حاصل ہوگا۔

فکذ الطریقة و الحقیقة یا اخی
من غیر فعل شریعة لن تحصلا

یہی حال طریقت وحقیقت کا ہے۔ میرے بھائی بغیر شریعت کے پیروی کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔

من رام ان یسلک طریق الاولیا
فلیحفظن ھذی الوصایا عاملا

جو شخص طریق اولیاء پر چلنا چاہتا ہے اسے ان نصیحتوں کو یاد رکھنا اور ان پر عمل کرنا چاہئے۔

شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر زبید احمد، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اور مولانا عبدالحئی حسنی سمیت مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے شیخ عبدالعزیز معبری اور مالا بار کے اس معزز علمی اور مذہبی خانوادے کے جو احوال و آثار قلمبند کئے ہیں ان میں سے زیادہ تر حالات و واقعات حکیم سید شمس اللہ قادری کی ایک تحریر سے ماخوذ ہیں اور یہ تحریر عام دست یاب نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر بہت دکھ اور افسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ کاش یونان کے علماء خود اپنے بزرگوں کے حالات لکھیں تاکہ خاص و عام کو معلوم ہو کہ اس مقدس سرزمین نے کیسے کیسے گوہر نایاب پیدا کئے ہیں، جن کی چمک دمک نے نہ صرف مالا بار اور کرناٹک بلکہ جزائر مشرقی یعنی جاوا اور ملایا کی تاریکیاں روشن کر دیں۔

شیخ عبدالعزیز بن شیخ زین الدین ابو یحییٰ معبری کے سنِ وفات تک رسائی نہیں ہو سکی۔ البتہ ان کے بیٹے شیخ زین الدین مصنف ''تحفۃ المجاہدین'' اپنے والد کی زندگی ہی میں ۹۹۱ھ میں وفات پا گئے تھے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شیخ عبدالعزیز معبری نے دسویں صدی ہجری کے آخری برسوں میں وفات پائی ہوگی۔

عبداللہ سندھی

شیخ عبداللہ بن سعد اللہ سندھی دسویں صدی ہجری کے مشہور و معروف علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ محدث، ممتاز فقیہ اور عارف باللہ تھے۔ انہوں نے اسلامی علوم و فنون کے وسعت و فروغ میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں اور اپنی ساری زندگی درس و تدریس اور اشاعتِ دین میں گزار دی۔ وہ برصغیر پاکستان و ہند کے بعض مقامات بالخصوص سندھ اور گجرات کے علاوہ سرزمینِ حجاز میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بھی حدیث اور تفسیر کا درس دیتے رہے۔ حنفی المذہب اور صوفی المشرب صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق نے ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (The contribution of India and Pakistan to the Hadith Literature) میں شیخ عبداللہ کے مختصر احوال بیان کرنے کے علاوہ ان کے تصنیفی کارنامے کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''شیخ عبداللہ بن سعد اللہ سندھی، سندھ کے شہر دربیلہ کے باشندہ تھے اور اپنے استاد شیخ علی متقی کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے جہاں انہوں نے امام ابن حجر مکی سے حدیث کا درس لیا۔ آخرکار انہوں نے بھی اپنے ہم نام اور اپنے ہم وطن قاضی عبداللہ سندھی کے ساتھ مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی اور ان کے لڑکے شیخ رحمت اللہ کے ساتھ ان کے بہت دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں لکھا ہے کہ شیخ رحمت اللہ کے والد ماجد قاضی عبداللہ بعض حوادثِ زمانہ کی وجہ سے سندھ سے ہجرت کر کے اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ زیارتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان مقامات متبرکہ میں رہنے کی غرض سے روانہ ہوئے، دورانِ سفر کچھ دنوں احمد آباد میں قیام کیا اور وہاں شیخ علی متقی کی صحبت سے سرفراز ہوئے۔ پھر متبرک مقامات کی زیارت کرتے ہوئے مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ مدینہ پہنچنے کے کچھ دنوں بعد قاضی عبداللہ وفات پا گئے اور یہ شیخ عبداللہ دراصل قاضی عبداللہ کے قریبی دوست اور ساتھی تھے۔ ان کی نشو و نما بھی مدینہ منورہ میں ہوئی تھی، انہوں نے عرصے تک وہاں تعلیم دی تھی اور عبادت بھی کی۔ پھر شیخ عبداللہ کو ۹۷۷ھ کے قریب ہندوستان میں آنا پڑا اور کچھ عرصہ احمد آباد میں مقیم رہے۔ شیخ رحمت اللہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ بعد ازاں یہ دونوں بزرگ احمد آباد سے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

شیخ عبداللہ بن سعد اللہ کے تصنیفی کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اسحاق رقمطراز ہیں:

''شیخ عبداللہ نے مشکوٰۃ المصابیح بہت تفصیلی حواشی کے ساتھ مرتب کی، ان کا مقصد حنفی مسلک کی برتری کو ثابت کرنا تھا۔''

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں شیخ عبداللہ کے مختصر حالات زندگی بیان کرنے کے علاوہ ان کی تصانیف کے نام بھی لکھے ہیں لیکن مولانا موصوف نے شیخ عبداللہ کے ''مشکوٰۃ المصابیح'' کو تفصیلی حواشی کے ساتھ مرتب کرنے کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ البتہ ان کی دوسری دو کتابوں ''جمع المناسک و نفع الناسک'' مصنفہ ۹۵۰ھ۔۱۴۹۹ء اور حاشیہ بر ''عوارف المعارف السہروردی کا حوالہ ضرور دیا ہے۔

شیخ عبداللہ السندھی کا تعارف کراتے ہوئے مولانا عبدالحیٔ حسنی نے لکھا ہے:

''الشیخ العالم محدث عبداللہ بن سعد اللہ متقی سندھی مہاجر مدینہ منورہ۔ ان کے معاصرین میں علم حدیث اور تفسیر میں کوئی عالم ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ سرزمین سندھ میں تو ان کی بہت زیادہ تعظیم و تکریم کی جاتی تھی۔ آپ گجرات تشریف لے گئے تو قاضی عبداللہ بن ابراہیم سندھی نے آپ کی صحبت اختیار کی۔ یہ واقعہ ۹۴۷ھ کا ہے۔ ممدوح حرمین شریفین میں قیام کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے اور یہاں شیخ رحمت اللہ ابن قاضی عبداللہ سندھی نے ۹۷۷ھ۔۱۵۶۹ء میں آپ سے اکتساب کیا۔ آپ نے برسوں گجرات

میں قیام فرمایا۔ جب تک یہاں مقیم رہے علماء اور عوام دونوں طبقوں کو پڑھاتے رہے۔ آخر میں مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔'' مولانا عبدالحئی حسنی نے شیخ عبداللہ سندھی کے یہ احوال، شیخ حضرمی کی کتاب ''النور السافر'' کے حوالے سے رقم کئے ہیں۔

مولوی فقیر محمد جہلمی ''حدائق الحنفیہ'' میں شیخ عبداللہ سندھی کے احوال اور ان کے علمی کارنامے بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''مولانا عبداللہ سندھی شیخ علی متقی کے اصحاب میں سے تھے اور کو شیخ ابن حجر مکی سے شاگردی کی نسبت رکھتے تھے لیکن شیخ ابن حجر نے آپ سے علم عربی میں استفادہ کیا اور اکثر اوقات کہا کرتے تھے کہ ہمارے اس کلام کو عربی کر دو۔ شیخ نے آپ کی اجازت کے واقعہ میں یہ لکھا کہ ''فائدہ دیا انہوں نے مجھ کو زیادہ اس سے جو فائدہ پکڑا۔''

گویا کہ امام حجر مکی نے علم حدیث میں اپنے لائق شاگرد شیخ عبداللہ سندھی کو جو سند عطا کی اس میں انہوں یہ بھی لکھ دیا:

''شیخ عبداللہ سندھی نے مجھ سے جو استفادہ کیا اس سے کہیں زیادہ علمی استفادہ ان سے میں نے کیا۔''

دنیائے درس و تدریس میں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ کسی استاد کو شیخ عبداللہ ایسا فاضل شاگرد رشید میسر آئے جس سے استاد بھی علمی استفادہ کر سکے اور پھر وہ علمی استفادہ اس پائے کا ہو یعنی اپنی قدر و قیمت اور اہمیت کے اعتبار سے اس لائق ہو کہ استاد اس پر فخر کر سکے اور جب اس کا شاگرد اپنی تعلیم مکمل کرے تو اسے سند فراغت دیتے وقت استاد تشکر و امتنان کے طور پر اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے کہ میرے اس شاگرد نے مجھ سے اتنا علم حاصل نہیں کیا ہے جتنا علم میں نے اپنے اس شاگرد سے حاصل کیا ہے۔ تاریخ میں معدودے چند واقعات ایسے ملیں گے جہاں اساتذہ نے اپنے لائق اور فاضل تلامذہ سے اکتسابِ علم کیا ہو اور پھر اس کا یوں برملا اعتراف بھی کیا ہو۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ایسا صرف اس صورت میں ہوتا ہے جہاں استاد کسی ایک علم میں مہارت رکھتا ہو اور دوسرے علوم پر اس کی کامل دستگاہ نہ ہو اور اتفاق سے اسے کوئی ایسا شاگرد مل جائے جو ان علوم میں مہارت پیدا کر چکا ہو جن علوم میں اس کے استاد کو مزید استفادہ و استفاضہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ محدثین

تو بطور خاص اس صورت حال سے دوچار رہے ہیں۔ اس لئے کہ علم حدیث ایک مشکل اور دقت طلب علم ہے۔ اس کے حصول میں توجہ و یکسوئی کے علاوہ کافی محنت اور وقت درکار ہے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر طلباء علم حدیث میں دسترس حاصل کرنے کے بعد آگے بڑھنے کی ہمت اور جسارت نہیں کرتے۔ حالانکہ حدیث کا بنیادی علم حاصل کرنے کے بعد فقہ، اصول فقہ اور تفسیر کی باری آتی ہے۔ پھر منطق، علم الکلام اور شعر و ادب کا اپنا مقام ہے۔ فقیہ اور مفسر قرآن کے لئے لازم ہے کہ وہ علم حدیث پر عبور رکھتا ہو۔ لیکن ایک محدث کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ فقیہ بھی ہو، منطق اور علم الکلام کا بھی ماہر ہو اور شعر و ادب سے بھی شغف رکھتا ہو۔

امام سلیمان بن مہران الاعمش اس صورت کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ امام اعمش کوفہ کے جلیل القدر محدث و فقیہ اور تابعی تھے۔ علم حدیث میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ مگر فقہ میں کامل دستگاہ نہ رکھتے تھے۔ امام اعمش، امام اعظم ابو حنیفہ کے معاصرین میں سے تھے اور امام ابو حنیفہ نے ان سے روایات بھی کی ہیں۔ امام بخاری اور امام مسلم سمیت تمام اصحاب صحاح ستہ کے شیخ ہیں اور ان کی روایات موجود ہیں۔ چنانچہ عظیم المرتبت محدث ہونے کے باوجود علم حدیث میں اپنے شاگرد امام اعظم کے تفقہ و اجتہاد کے بڑے مداح تھے۔ ایک بار امام ابو حنیفہ ان کی مجلس میں موجود تھے۔ کسی نے سوال کیا تو امام اعمش نے امام ابو حنیفہ ہی کو جواب کے لئے ارشاد فرمایا۔ امام ابو حنیفہ نے جواب دیا تو اس کو بہت پسند فرمایا اور پوچھا کہ یہ جواب آپ نے کس دلیل سے دیا؟ امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ فلاں حدیث سے جو آپ ہی سے میں نے سنی ہے۔ امام اعمش اس پر اور آپ متحیر ہوئے اور فرمایا ''اے گروہ فقہاء! واقعی ہم لوگ تو صرف عطار ہیں اور آپ طبیب۔''

اسی طرح کا واقعہ امام اعمش ہی کا امام ابو یوسف کے ساتھ بھی پیش آیا تھا کہ امام اعمش نے فرمایا تھا کہ ''یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے کہ تمہاری پیدائش کے آثار بھی نہ تھے لیکن اس کے معانی سے آج پوری طرح آگاہ ہوا۔ بے شک ہم لوگ دوا فروش ہیں اور آپ لوگ اطباء ہیں۔'' یعنی دوا فروش تو دواؤں کی نام اور ان کے اچھے برے اقسام وغیرہ کو جانتا ہے لیکن طبیب نہ صرف ان چیزوں کا عالم ہوتا ہے بلکہ وہ ان کے خواص و تاثیرات اور طریقِ استعمال وغیرہ کو بھی جانتا ہے۔

امام اعمش کوفی کی طرح امام ابن حجر مکی بھی حدیث کے بہت بڑے عالم تھے مگر دیگر علوم میں انہیں راہنمائی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے علم حدیث میں اپنے شاگرد شیخ عبداللہ سے استفادہ کیا اور اپنے دوسرے شاگرد شیخ علی متقی کے مرید ہو گئے۔ جیسا کہ ''حدائق الحنفیہ'' میں شیخ علی متقی کے احوال میں لکھا ہے کہ ''شیخ ابن حجر مکی مفتی حرم جو ابتداء میں آپ کے استاد تھے، اخیر کو اپنے آپ کو شیخ علی متقی کا تلمیذ تصور کرنے لگے اور رسم ارادت بجالا کر شیخ علی متقی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ سندھی کے احوال اکٹھے بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ دو عزیز مدینہ طیبہ کے فقہاء اور صوفیاء میں سے تھے۔ ان دونوں کو شیخین کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں علم و عمل اور تقویٰ کا مجسمہ تھے۔ شیخ علی متقی کے اصحاب خاص اور خلیفہ تھے۔ شیخ علی متقی کی خدمت میں جو کچھ بھی تحفے تحائف اور جنس و مال آتا وہ سب اپنے دوستوں، خادموں اور فقیروں میں تقسیم کر دیتے۔ لیکن اس میں کوئی چیز ان دونوں شیخین یعنی شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ کے علاوہ شیخ عبدالوہاب کو اس لئے نہ دیتے کہ شاید یہ مال کسب حلال نہ ہو۔

مولوی فقیر محمد نے شیخ عبداللہ کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''آپ بڑے دانشمند تھے اور کسی سے کچھ طمع اور کام نہ رکھتے تھے، محض خدا کے لئے درس دیتے اور خلق خدا کو فائدہ پہنچاتے تھے اور تصحیح کتب کیا کرتے تھے۔ آپ نے ایک نسخہ مشکوٰۃ کا اپنے ہاتھ سے نہایت عمدہ صحیح کیا تھا اور اس کو محشی کر کے ورق ورق کر دیا تھا۔ بہت لوگ ایک مجلس میں اس سے استفادہ و انتساخ کرتے تھے۔ حواشی میں آپ نے مذہب حنفیت کا اثبات کر کے اس کے دلائل درج کئے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ میں نے مشکوٰۃ کو حنفی بنا دیا ہے اور کہا کرتے تھے کہ ''تمام عمر میں جو میں نے کام کیا ہے وہ تصحیح مشکوٰۃ کی ہے اور امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے مجھے بخش دے۔''

محدث اور عارف باللہ شیخ عبداللہ بن سعد اللہ حنفی، قادری سندھی نے ۹۹۲ھ مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات آپ کی ''چشمہ رحمت'' ہے۔

شیخ رحمت سندھی

شیخ رحمت اللہ سندھی کا شمار دسویں صدی ہجری کے نامور اور صاحبِ تصنیف علمائے دین میں ہوتا ہے۔ وہ ایک بلند پایہ محدث، ممتاز فقیہ اور صاحبِ مقام صوفی تھے۔ زہد و ورع میں یکتا، صدق و صفا میں فرد اور علم و تقویٰ میں یگانۂ روزگار تھے۔ رزقِ حلال پر بہت زور دیتے تھے۔ نہ تو تحفے تحائف قبول کرتے تھے اور نہ کسی مشتبہ چیز کو ہاتھ لگاتے تھے۔ حنفی، صوفی تھے۔ سلسلہ عالیہ قادریہ میں شیخ علی متقی کے مرید اور خلیفہ مجاز تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق سے جا ملتا ہے۔

ان کا نام و نسب یوں ہے:

''رحمت اللہ بن عبد اللہ بن ابراہیم العمری السندھی''۔ شیخ رحمت اللہ سندھ کے مقام دربیلہ میں پیدا ہوئے تھے۔

مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے شیخ رحمت اللہ سندھی کے احوال اور ان کے علمی کارنامے بیان کئے ہیں اور ان کے زہد و تقویٰ، تسلیم و رضا اور شانِ استغناء کے واقعات قلمبند کرنے کے علاوہ ان کی دینی، تبلیغی اور تصنیفی خدمات کو بھی سراہا ہے۔

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> ''الشیخ العالم الکبیر المحدث رحمت اللہ ابن عبد اللہ بن ابراہیم العمری السندھی المہاجر المدنی دربیلہ (سندھ) میں پیدا ہوئے اور نہایت خوش حالی میں پروان چڑھے۔ پھر اپنے والد کے ہمراہ گجرات میں آئے۔ یہاں سے حرمین وارد ہوئے۔ جہاں علی بن محمد ابن غریق صاحبِ ''تنزیہ الشریعۃ'' اور دوسرے ائمہ حدیث سے علمِ حدیث کی

تحصیل کی۔ ہندوستان واپس آئے تو شیخ عبد اللہ بن سعد اللہ
سندھی آپ کے ہم سفر تھے۔ ہندوستان پہنچ کر گجرات میں سکونت
اختیار کی۔ کیونکہ حرمین جانے سے قبل انہوں نے ایک طویل عرصے
تک گجرات میں قیام کیا تھا کہ گویا یہی ان کا وطن ہو گیا تھا۔
گجرات میں سال ہا سال تک تدریس فرمائی۔ آپ سے بے شمار
افراد نے علوم کی تحصیل کی۔"

ڈاکٹر زبید احمد اپنے تحقیقی مقالے "عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ" (**The contribution of India and Pakistan to the Arabic Literature**) میں لکھتے ہیں:

"(شیخ) رحمت اللہ اور ان کے ایک دوست (شیخ) عبد اللہ دونوں سندھ کے باشندے تھے۔ یہ دونوں حجاز چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی اور دونوں کنز العمال کے مصنف (شیخ) علی متقی برہانپوری کے مرید ہو گئے۔ اپنے علم و تقویٰ کی وجہ سے یہ دونوں دوست بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور شیخین کہلاتے تھے۔ عبد الحق دہلوی (مولانا عبد الحق محدث) نے جو علی متقی کے شاگرد تھے، لکھا ہے کہ خواجہ عبد الرشید کہا کرتے تھے کہ یہ شیخین انہیں دوسرے شیخین یعنی حضرت (سیدنا) ابو بکرؓ اور حضرت (سیدنا) عمرؓ کی یاد دلاتے ہیں۔"

"اخبار الاخیار" میں خواجہ عبد الشہید عبید اللہی کے حوالے سے مولانا عبد الحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ خواجہ عبد الشہید عبید اللہی فرماتے ہیں کہ "یہ دونوں شیخین حقیقت میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ شیخین کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ دونوں علم و عمل اور تقویٰ کا مجسمہ تھے۔ ان جیسے اشخاص مدینہ منورہ سے آج تک نہیں آئے۔ یہ دونوں شیخ علی متقی کے خصوصی دوست اور خلیفہ تھے۔" مولانا عبد الحق نے شیخ رحمت کے احوال میں لکھا ہے کہ ان کے والد قاضی عبد اللہ حوادث زمانہ کی وجہ سے سندھ سے ہجرت کر کے اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مقامات متبرکہ میں رہنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ دوران سفر احمد آباد میں قیام کر کے شیخ علی متقی کی صحبت سے سرفراز ہوئے۔ پھر متبرک مقامات کی زیارت کرتے ہوئے مدینہ منورہ میں جا کر سکونت اختیار کی۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے کچھ روز بعد قاضی عبد اللہ وفات پا گئے۔ شیخ عبد اللہ بن سعد اللہ سندھی، شیخ

رحمت اللہ کے والد قاضی عبد اللہ سندھی بھی کے یار غار اور ساتھی تھے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق ''علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ'' (**The contribution of India and Pakistan to the study of Hadith literature**) میں لکھتے ہیں۔

'' مکہ معظمہ میں علی متقی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا رحمت اللہ مدینہ منورہ چلے گئے اور وہاں حدیث کا درس دینے لگے۔ ۹۸۲ھ۔۱۵۷۴ء میں مولانا رحمت اللہ، حاجی بیگم کے ساتھ جو حج کے لئے مکہ معظمہ گئی تھیں، ہندوستان میں واپس آ گئے اور آگرہ چلے گئے جہاں ''منتخب التواریخ'' کے مصنف عبد القادر بدایونی نے ان سے حدیث کا درس لیا۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ تک احمد آباد میں حدیث کا درس دیتے رہے۔ پھر مکہ واپس آ گئے۔ انہوں نے علم حدیث میں ''موضوعات'' پر بھی ایک کتاب لکھی جو اَب موجود نہیں ہے۔''

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں شیخ رحمت اللہ سندھی کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' المناسک الصغیر رحمت اللہ بن عبد اللہ السندھی کی تصنیف ہے۔ راقم الحروف نے اس کتاب کا مخطوطہ برلن کی لائبریری میں دیکھا ہے۔ یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، مناسک حج سے متعلق ایک مختصر کتاب ہے۔ اس موضوع پر مصنف نے ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام ''المناسک الکبیر'' ہے اور زیر تبصرہ کتاب اسی کا خلاصہ ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایران کے نامور عالم دین ملا علی القاری (۱۰۱۴ھ۔۱۶۰۵ء) نے اس کی ایک شرح لکھی ہے۔''

مولانا عبد الحئی حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں کتاب المناسک کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' کتاب المناسک'' کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ ''الحمد للہ اکمل الحمد علیٰ ما ھدانا الاسلام ۔'' اس کتاب کی شرح نور الدین علی بن سلطان محمد القاری الہروی نے کی اور اس شرح کا نام ''المسک المقسط فی لنسک المتوسط'' رکھا۔

منسک صغیر: اس کتاب کی شرح بھی نور الدین علی بن سلطان نے ''ھدایۃ السالک فی نھایۃ المسالک کے مشہور نام سے لکھی۔ ان باتوں کا تذکرہ خلیفہ چلپی نے کشف

الظنون میں کیا ہے۔ شیخ علی بن محمد الخطیب کی مشہور کتاب "تنزیہ الشریعہ عن الاحادیث الموضوعہ" کی تلخیص بھی انہوں نے لکھی جو بہترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ (ابجد العلوم)

حضرمی نے "النور السافر" میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "علمائے عاملین اور عباد اللہ الصالحین میں سے تھے، رحمۃ اللہ۔"

"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد دوم (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار مولانا عبد القدوس نے شیخ رحمت اللہ سندھی کے احوال اور علمی کارنامے بیان کئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"مدینہ منورہ میں شیخ علی بن محمد بن غریق سے حدیث کی سند لی۔ مدتوں درس و افادہ میں مصروف رہے۔ ہمیشہ زہد و عفاف کی زندگی بسر کی۔ ان کی تصانیف میں مناسک حج پر کئی رسالے ہیں۔ ملا علی القاری نے ان کی "منسک اوسط" کی شرح "مسلک مقسط" کے نام سے اور "منسک صغیر" کی شرح "ھدایۃ السالک" کے نام سے کی ہے۔ ایک اور تالیف "تنزیۃ الشریعۃ" کی تلخیص ہے جو احادیث موضوعہ سے متعلق ہے۔ شیخ رحمت اللہ سندھی کی تصنیف "مجمع المناسک و نفع الناسک" کے متعدد قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ فقہ حنفی کی رو سے فریضہ حج کے احکام اور مسائل بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف سے وہ ۲۲ صفر ۹۵۰ھ۔۱۵۴۳ء کو فارغ ہوئے۔ اپنی کتاب کی اہمیت اور موضوع کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چونکہ حج بڑی عبادات میں سے ایک ہے اور اس کے بارے میں بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں بعض ملل اور خلل سے خالی نہیں۔ پھر طویل کتابوں سے لوگوں کی ہمتیں بھی قاصر ہوگئی ہیں۔ سو اسی بات نے مجھے آمادہ کیا کہ میں درمیانہ حجم کی ایک ایسی کتاب تصنیف کروں جس میں حج کے متعلق تمام معتبر اور معتمد علیہ کتابوں کا مواد نقل کر دیا جائے۔"

شیخ رحمت اللہ سندھی رزقِ حلال کا بہت خیال رکھتے تھے اور انتہائی سادہ و پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لوگوں کے ہدایہ اور تحائف بھی قبول نہ فرماتے تھے۔ جیسا کہ مولانا عبدالحیٔ حسنی نے "نزہۃ الخواطر" میں لکھا ہے کہ

''آپ صاحبِ تقویٰ وعزیمت تھے۔ حجاز میں قیام کے دوران کسی کا ہدیہ قبول نہ فرماتے تھے۔ ترک سلطان کچھ رقم شیخ علی متقی برہانپوری کے پاس بھجواتا تھا تاکہ وہ اسے اربابِ ضرورت اور علماء میں تقسیم کر دیں مگر شیخ رحمت اللہ سندھی نے اس رقم میں سے کبھی کچھ قبول کرنا گوارا نہ کیا۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں شیخ عبداللہ اور ان کے دوست شیخ رحمت اللہ سندھی کے احوال اکٹھے بیان کئے ہیں اور لکھا ہے:

شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ سندھی مدنی یہ دو عزیز مدینہ طیبہ کے فقہاء اور صوفیاء میں سے تھے جو وہاں سے ہندوستان میں آتے اور علم حدیث پڑھاتے تھے۔ یہاں کے طلباء وغیرہ ان دونوں کو شیخین کہتے تھے۔ خواجہ عبدالشہید عبیداللّٰہی فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ شیخین حقیقت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ شیخین کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ دونوں علم وعمل اور تقویٰ کا پیکر اور شیخ علی متقی کے اصحابِ خاص اور خلیفہ تھے۔ سلطان روم کی جانب سے جو حاکم مکہ معظمہ میں آتا وہ شیخ علی متقی کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔ شیخ علی متقی کی خدمت میں جو کچھ بھی از قسم جنس و مال آتا وہ سب اپنے دوستوں، خادموں اور فقیروں میں تقسیم کر دیتے اور اس میں سے کوئی چیز ان دونوں شیخین اور شیخ عبدالوہاب کو اس لئے نہ دیتے کہ شاید یہ مال کسب حلال نہ ہو۔''

عارف باللہ شیخ رحمت اللہ حنفی سندھی المدنی نے ۹۹۴ھ۔۱۵۸۶ء میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ ''النور السافر'' کے مصنف شیخ حضرمی کے استادِ گرامی، شیخِ فاضل محمد بن عبداللطیف جامی مکی مشہور بہ مخدوم زادہ نے اپنے ایک قصیدہ میں شیخ رحمت اللہ حنفی سندھی کا مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

رحمة الله لا تفارق مثوىٰ　　رحمت الله بالحياء انصام

ترجمہ:

اللہ کی رحمت تیری قبر سے دور نہ ہو اور یہ رحمت تجھ پر اَبر اور مینہ کا سایہ رکھے۔

زین الدین معبری

شیخ زین الدین معبری مغلیہ عہد کی ممتاز شخصیات میں سے تھے۔ صاحب علم و فضل ہونے کے علاوہ انتہائی ذہین و زیرک، حساس اور دلِ دردمند رکھنے والے مردِ حق آگاہ تھے۔ قومی غیرت اور ملی حمیت کے جذبات سے سرشار تھے۔ ان کا تعلق معبر کے ایک معزز علمی خانوادے سے تھا۔ معبر کے اس علمی خانوادے نے کئی علماء و فضلاء، فقہا اور شعراء کو جنم دیا۔ ان کے والد شیخ عبدالعزیز قاضی تھے اور دادا شیخ ابو یحیٰ بھی صاحب علم و فضل، زاہد عابد، متقی اور صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ شیخ زین الدین معبری شافعی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔

ان کا پورا نام و نسب یوں ہے: شیخ زین الدین بن عبدالعزیز بن زین الدین ابو یحیٰ شافعی، چشتی قادری۔

شیخ زین الدین معبری نے اپنی کتاب ''تحفۃ المجاہدین'' کی بدولت شہرت دوام پائی۔ اُن کی یہ کتاب برصغیر میں عربی زبان میں لکھی جائے والی تاریخ کے موضوع پر اوّلین کتاب ہے جو اپنی جگہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

شیخ محمد اکرام نے ''آبِ کوثر'' اور ڈاکٹر زبید احمد نے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں شیخ زین الدین بن عبدالعزیز مصنف ''تحفۃ المجاہدین'' کے احوال رقم کئے ہیں۔ جبکہ مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' کی جلد چہارم میں پہلے شیخ زین الدین ابن عبدالعزیز ملیباری اور پھر اس کے ساتھ ہی شیخ زین الدین علی ملیباری کے نام سے آگے پیچھے مالابار کے اس علمی خانوادے کی دوسری شخصیات کے احوال و آثار بھی ''مسالک الاتقیاء'' کے حوالے سے بیان کئے ہیں مگر مولانا عبدالحیٔ نے ان بزرگوں کے

احوال اور ان کی تصانیف کا اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ سب کچھ گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے۔

شیخ محمد اکرام کی تحریر واضح اور غیر مبہم ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''تحفۃ المجاہدین'' کے مصنف شیخ زین الدین، ابو یحییٰ کے پوتے اور ان کے ہم نام تھے۔ انہوں نے (یعنی شیخ زین الدین مصنف تحفۃ المجاہدین نے) اس کتاب (یعنی تحفۃ المجاہدین) کے علاوہ چار کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ''ارشاد العباد'' جو پند و موعظ کا مجموعہ ہے۔ ایک رسالے میں احادیث کے مطابق ان کوائف کا تذکرہ کیا ہے جو موت کے بعد انسان پر گزرتے ہیں۔ ''قرۃ العین فی مہمات الدین'' میں فقہ شافعی کے مسائل ہیں۔ ''فتح المعین'' میں خود مصنف نے ''قرۃ العین'' کی شرح لکھی ہے۔''

شیخ محمد اکرام نے مزید لکھا ہے کہ ''یہ سب کتابیں مصر میں کئی بار چھپی ہیں اور ''فتح المعین'' پر کئی علماء نے مبسوط حواشی لکھے ہیں جو جاوا سماٹرا میں مروج و متداول ہیں۔''

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے شیخ زین الدین بن عبدالعزیز کا تعارف اور ان کے احوال یوں بیان کئے ہیں:

> ''الشیخ العالم الفقیہ زین الدین بن عبدالعزیز بن زین الدین ابن علی الشافعی ملیباری یکے از علمائے مشہور ہیں۔ اساتذہ شیخ ابن حجر ہیتمی در مکہ مکرمہ، تصانیف (۱) قرۃ العین فی مہمات الدین (فقہ شافعیہ) یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس کی مفصل شرح خود انہوں نے فتح المعین شرح قرۃ العین کے نام سے ۹۸۲ھ میں لکھی (۲) ارشاد العباد الیٰ سبیل الرشاد (موعظ) (۳) رسالہ بر احادیث و آثار و مواعظ۔''

شیخ زین الدین بن عبدالعزیز ملیباری کے بارے میں مولانا عبدالحیٔ حسنی نے اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھا۔ پھر مولانا موصوف نے شیخ زین الدین کی صرف تین تصانیف کا ذکر کیا ہے اور چوتھی تصنیف ''تحفۃ المجاہدین'' کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر اس کتاب کو بھی مولانا عبدالحیٔ کی تحریر میں شامل کر لیا جائے تو شیخ محمد اکرام اور مولانا عبدالحیٔ کے شیخ زین الدین کے بارے میں بیان کردہ احوال و آثار میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اور اس امر کا تعین ہو جاتا ہے کہ شیخ زین الدین بن عبدالعزیز ہی ''تحفۃ المجاہدین'' کے مصنف ہیں۔

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے فاضل مقالہ

نگار مولانا عبدالقدوس نے بھی شیخ زین الدین کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے
''زین الدین ابن عبدالعزیز شافعی معبری۔ معبر (مالابار) کی طرف منسوب ہے، جہاں وہ رہتے تھے۔ ان کے والد قاضی تھے اور ان کے دادا تصوف کی ایک کتاب ''ہدایۃ الاذکیا'' کے مصنف تھے۔ خود زین الدین بیجاپور کے علی عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی وفات ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء کے بعد ہوئی۔ تصنیفات میں قرۃ العین اور اس کی شرح ''فتح المعین'' (فقہ شافعی) تحفۃ المجاہدین، (مالابار میں پرتگیزیوں کی آمد کی تاریخ ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء سے ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء تک) شیخ زین الدین بن عبدالعزیز بن زین الدین بن علی بن احمد المعبری کی نادر کتاب'' تاریخ مسمی تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتکالین'' (جس کی تالیف سے وہ ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں فارغ ہوئے تھے) ہے۔''

مولانا عبدالحیٔ حسنی کی تحریر کے بعد ان مولانا یعنی مولانا عبدالقدوس کی اس عبارت کو ذرا غور سے پڑھنے کے بعد نتیجہ وہی نکلتا ہے کہ شیخ زین الدین بن عبدالعزیز معبری ہی نے ''تحفۃ المجاہدین'' لکھی تھی۔ مولانا عبدالحیٔ نے شیخ زین الدین کی سب سے اہم کتاب یعنی ''تحفۃ المجاہدین'' کو سہواً یا بوجوہ نظر انداز کر دیا ہے اور ان کی چار تصانیف کی بجائے تین تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ نے ''نزہۃ الخواطر'' کی جلد چہارم کی شخصیت نمبر ۲۰۷ پر شیخ زین الدین ابن عبدالعزیز کے احوال بیان کیے ہیں۔ جبکہ انہوں نے اگلے نمبر ۲۰۸ پر شیخ زین الدین علی ملیباری کا تعارف ''مسالک الاتقیاء'' کے حوالے سے ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''الشیخ العالم العلامۃ زین الدین ابن علی بن احمد شافعی ملیباری یکے از علمائے عاملین و ائمہ محققین مولدکش از شہرہائے ملیبار... پیدائش ۱۲ ماہ شعبان ۸۷۱-۲ھ ان کے عم قاضی زین الدین ابن احمد ملیباری جب فنان کے قاضی مقرر ہوئے تو انہیں بھی ان کی صغر سنی ہی میں وہیں ساتھ لے گئے اور جب بالغ ہوئے تو یہیں قرآن حکیم حفظ کیا اور اپنے عم ممدوح ہی سے صرف ونحو، فقہ اور دوسرے علوم پڑھے... شیخ قطب الدین اجودھنی سے سلسلۂ چشتیہ کا اخذ و استفادہ کیا۔ جنہوں نے انہیں خرقۂ مشیخیت سے نوازا... شیخ ثابت بن عین بن محمود زاہدی نے آپ کو طریقۂ شطاریہ کے مطابق ذکر کی تلقین کے ساتھ اس کی اجازۃ بھی مرحمت فرمائی۔ پس آپ نشر علوم و

معرفت پر قائم ہو گئے۔"
اس تعارف کے بعد مولانا عبدالحیٔ حسنی نے شیخ زین الدین علی ملیباری کی ۲۲ کتابوں کی فہرست دی ہے جس میں ایک کتاب کا نام "کتاب درتحریص اہل الایمان علیٰ جہاد عبدہ الصلبان" ہے اور اس کتاب کے بارے میں مولانا موصوف نے لکھا ہے کہ "یہ رسالہ انہوں نے اس موقع پر تالیف کیا جبکہ پرتگالیوں نے ملیبار پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کیا۔"

مولانا عبدالقدوس سے غلطی یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے پہلے اپنے قارئین کو یہ بتایا ہے کہ "شیخ زین الدین بن عبدالعزیز کی وفات ۹۹۱ھ کے بعد ہوئی اور پھر اگلے ہی جملے میں مولانا موصوف نے یہ لکھا ہے کہ وہ ۹۹۴ھ میں "تحفۃ المجاہدین" کی تالیف سے فارغ ہوئے۔" گویا کہ انہوں نے اپنی وفات کے بعد اپنی کتاب "تحفۃ المجاہدین" لکھی۔ مولانا عبدالقدوس نے اردو ٹائپ کی کھلی کھلی پرنٹنگ کے ایک پیراگراف میں شیخ زین الدین کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کو بیان کیا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا ہے۔ دوسرے پیراگراف میں انہوں نے "تحفۃ المجاہدین" کے دیباچے سے ایک حوالہ دیا ہے اور تیسرے پیراگراف میں دیباچے کے عربی متن کا اردو ترجمہ پیش کر دیا ہے۔ جبکہ مولانا عبدالحیٔ حسنی نے شیخ زین الدین کے جو چھ سات سطروں میں احوال رقم کئے ہیں وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ نیز یہ کہ مولانا عبدالحیٔ نے ان کے اصل تصنیفی کارنامے یعنی "تحفۃ المجاہدین" کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے۔

ہمارے اس بیان کی تائید مزید ڈاکٹر زبید احمد کی تحقیق سے بھی ہوتی ہے کہ شیخ زین الدین عبدالعزیز ہی "تحفۃ المجاہدین" کے مصنف ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر زبید نے اپنے تحقیقی مقالے کے باب نہم "تاریخ وسوانح اور جغرافیہ" کا آغاز ہی شیخ زین الدین بن عبدالعزیز المعبری اور ان کی کتاب "تحفۃ المجاہدین" سے کیا ہے اور لکھا ہے:

"یہ کتاب مالابار میں پرتگالیوں کے طرزِ عمل اور کارروائیوں کی تاریخ ہے۔ جس میں ۹۰۴ھ/ ۱۴۹۸ء میں اس علاقے میں پرتگالیوں کی آمد سے لے کر ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء تک کے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں... اس کتاب کے چار حصے ہیں۔ حصہ اوّل جہاد کے بارے میں اسلامی احکام کے متعلق ہے۔ حصہ دوم میں اسلام کے آغاز اور اس کی اشاعت پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

اور حصہ سوم میں اس علاقے کے بت پرست باشندوں کے انوکھے رسوم و رواج کا مختصر حال لکھا گیا ہے اور آخری حصہ جو کتاب کا اصل حصہ ہے اور پہلے تین حصوں کو جس کا مقدمہ کہا جا سکتا ہے، ۱۴ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔''

گویا کہ شیخ محمد اکرام، مولانا عبدالقدوس اور ڈاکٹر زبید احمد کی تحقیق نے مولانا عبدالحئی حسنی کے پیدا کردہ تمام شکوک وشبہات کا ازالہ کر دیا ہے اور یہ بات قطعی طور پر طے ہو گئی کہ ''تحفۃ المجاہدین'' شیخ زین الدین بن عبدالعزیز ہی کی تصنیف ہے۔ البتہ ڈاکٹر زبید احمد سے بھی اس ضمن میں چند ایک فاش غلطیاں ہو گئی ہیں۔ مثلاً انہوں نے اپنی کتاب کے باب چہارم ''فقہ'' کے عنوان کے تحت ضیاء الدین بن عبدالعزیز کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''قرۃ العین'' اصل تصنیف ہے اور ''فتح المعین'' اس کی شرح ہے۔ یہ دونوں کتابیں ضیاء الدین بن عبدالعزیز نے لکھیں جن کا انتقال ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء کے بعد ہوا۔ ''تحفۃ المجاہدین'' بھی ان ہی کی تصنیف ہے۔ ضیاء الدین نے ایک اور کتاب بھی لکھی ہے جس میں موت اور حیات بعد الموت سے متعلق احادیث و آثار قلمبند کئے ہیں''... ڈاکٹر زبید احمد سے یہاں غلطی صرف نام کی سرزد ہوئی ہے۔ انہوں نے زین الدین کی کتابوں کو ضیاء الدین کی تصانیف لکھ دیا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی کتاب کے باب دوازدہم ''شاعری'' کے تحت صفحہ ۲۳۴ پر محمد بن عبدالعزیز کے بارے میں رقم کیا ہے کہ ... ''ایک شاعر محمد بن عبدالعزیز کے حالات لکھے گئے ہیں جو ''تحفۃ المجاہدین'' کے مصنف زین الدین کا بھائی تھا۔'' اس طرح انہوں نے صفحہ ۲۳۹ پر لکھا ہے کہ محمد بن عبدالعزیز کالی کوٹی مالاباری... عربی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے بھائی زین الدین ''تحفۃ المجاہدین'' کے مصنف تھے۔ محمد بن عبدالعزیز نے ''الفتح المبین للسامری الذی یحب المسلمین'' کے نام سے ایک طویل رزمیہ نظم لکھی۔ جو ۵۱۳ اشعار پر مشتمل ہے اور جس میں کالی کٹ کے راجا سامری اور واسکوڈی گاما کے پرتگالی سپاہیوں میں جنگ کے حالات نظم کئے گئے ہیں۔ اس رزمیہ نظم اور ''تحفۃ المجاہدین'' کا موضوع ایک ہی واقعہ ہوا ہے۔ اس واقعہ کو ایک نے نثر میں بیان کیا ہے اور دوسرے نے نظم میں۔ یہ دونوں بھائی ان تمام واقعات کے شاہد ہیں۔ اسی طرح فصل دوم ''علوم حدیث'' کے زیر عنوان صفحہ ۲۸۲ پر لکھا ہے کہ ''زین الدین بن عبدالعزیز کا تعلق مالابار کے ایک علمی گھرانے سے تھا۔ علی

عادل شاہ والیِ بیجا پور کی ملازمت میں تھے اور چند کتابیں تصنیف کیں جن میں سب سے اہم ''تحفۃ المجاہدین'' ہے۔''

ڈاکٹر زبید احمد نے ''The Contribution of India and Pakistan to the Arabic Literature'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری ملی اور اس مقالہ کو شاہد حسین رزاقی نے اردو میں منتقل کیا اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے اسے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ہمارے پیش نظر اس کا ۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والا تیسرا ایڈیشن ہے۔ اسی طرح مولانا عبدالحیٔ حسنی کی ''نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر'' کے بھی کم و بیش ڈیڑھ دو درجن ایڈیشن مُنظر عام پر آ چکے ہیں۔ مگر اس پائے کی کتابیں بھی اغلاط سے پُر ہیں۔ نہ تو مولانا عبدالحیٔ حسنی ایسے جید عالم، کہنہ مشق ادیب اور تجربہ کار تذکرہ نگار سے امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے قلم سے ایسی اَغلاط سرزد ہوں اور نہ کسی ڈاکٹریٹ کے حصول کی خاطر تحقیقی مقالہ لکھنے والے فاضل دانشور سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس قسم کی غلطیاں کرے گا۔ اور اسے ڈگری بھی مل جائے گی۔ ہم یہ نہیں کہتے ڈاکٹر زبید احمد نے اپنا تحقیقی مقالہ لکھتے وقت محنت نہیں کی لیکن یہ بھی تو ان ہی کی ذمہ داری تھی کہ ان کا مقالہ کم از کم اس قسم کے کھلے تضادات سے پاک ہو۔ اور نہ ہمیں مولانا عبدالحیٔ حسنی سے یہ توقع تھی کہ وہ اسلامی شخصیات کا تذکرہ لکھتے وقت ان کی اہم ترین کتابوں کو نظر انداز کر دیں گے۔

شیخ زین الدین نے چار کتابیں لکھی ہیں اور ان میں سے ''تحفۃ المجاہدین'' ان کی اہم ترین تصنیف ہے۔ پھر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ ''نزہۃ الخواطر'' مولانا عبدالحیٔ کے قلم سے لکھا ہوا برصغیر کے مشاہیر کا ہزار سالہ تذکرہ ہے اور اس ہزار سالہ دور میں تاریخ کے موضوع پر عربی زبان میں صرف چار کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ''تحفۃ المجاہدین'' سرفہرست ہے۔ بالکل اسی قسم کی زیادتی مولانا عبدالحیٔ نے شیخ جلال الدین تھانیسری کے ساتھ بھی کی ہے کہ ان کی اہم ترین کتاب ''تحقیق اراضی الہند'' (در زبان عربی) کا ''نزہۃ الخواطر'' میں مطلق ذکر نہیں کیا ہے۔ کچھ اسی قسم کا سلوک مولانا صاحب نے شیخ علی بن احمد مہائمی کے ساتھ بھی کیا ہے کہ ان کی تعریف و تعارف میں وہ ضروری جملے ''نزہۃ الخواطر'' میں شامل نہیں کئے جو وہ اپنی دوسری کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔

شیخ محمد اکرام نے شیخ زین الدین بن عبدالعزیز کی تصنیف ''تحفۃ المجاہدین'' کا کئی حوالوں سے ''آب کوثر'' میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اسے ایک غیرت مند عالم شیخ زین الدین نے اس زمانے (وسط عہد اکبری) میں تصنیف کیا جب پرتگیز مالابار کے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم توڑ رہے تھے۔ یہ کتاب بیجا پور کے بادشاہ سلطان علی عادل شاہ اول کے نام معنون تھی اور اس کی تصنیف کا مقصد مسلمان حکمرانوں اور رؤسا کو مالابار کے مسلمانوں کی مدد پر آمادہ کرنا تھا۔

پہلے تین ابواب میں جہاد کے احکام، مالابار میں اشاعت اسلام کا ذکر اور یہاں کی ہندو اقوام کی عادات و مراسم کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں پرتگالیوں کے مظالم کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

شیخ زین الدین ''تحفۃ المجاہدین'' کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں ''یعنی ان پرتگالیوں نے لاتعداد مسلمانوں کو قید کیا، بہت سوں کو قتل کیا اور کچھ کو عیسائی بنایا۔ مسلمان قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنالیا۔ حتیٰ کہ ان سے نصرانی بچے پیدا ہوئے۔ جو مسلمانوں سے لڑنے اور انہیں اذیت دینے لگے۔ چنانچہ میں نے ان واقعات و حادثات کو ضبط تحریر میں لانا چاہا اور کتاب لکھی جس کا نام میں نے ''تحفۃ المجاہدین'' فی بعض اخبار البرتکالین'' رکھا اور اس میں ان کے افعالِ بد کا ذکر کیا۔ اس کے علاوہ دیارِ ملیبار میں ظہورِ اسلام، جہاد کے احکام، ثواب اور اس پر ابھارنے کے لئے آیات و احادیث کا ذکر اور اس علاقے کے کفار کے عجیب و غریب واقعات کا بھی بیان ہے۔''

مستشرقین اور یورپی مؤرخین کی کتابوں میں بھی پرتگالیوں کے مسلمانوں پر مظالم اور ان کے بحر ہند پر اقتدار حاصل کر کے عرب اور ترک جہازوں کی آمد ورفت کو روک دینے اور ان کی بحری قزاقی کے واقعات کی تفصیل ملتی ہے۔ فی الحقیقت پرتگیزی استعمار پسند ایک ظالم و جابر استحصالی طاقت کی حیثیت سے سولھویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند کے ساحلوں پر مقامی پیداوار اور مصنوعات حاصل کرنے کے لیے نمودار ہوئے تھے۔ تجارت کے علاوہ لوٹ مار اور امن و امان کو درہم برہم کرنا بھی ان کے جارحانہ مقاصد میں شامل تھا۔ یہاں تک کہ اُن کی جارحیت سے حاجیوں کے جہاز بھی محفوظ نہ تھے۔ سلاطینِ گجرات نے ان کی مدافعت کی کوشش کی مگر وہ اپنی تدابیر میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مغلوں کو سمندر میں جہاز رانی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ شہنشاہ اکبر نے ۹۸۰ھ میں جب

گجرات فتح کیا تو اس نے پہلی بار سمندر دیکھا۔ اس وقت دیو، دمن بسین پر پرتگیزیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور اکبر جیسا طاقت ور مغل بادشاہ پرتگالی بحری بیڑے کے سامنے خود کو بے بس پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے پرتگالیوں سے مصالحت آمیز رویہ اختیار کیا اور بحری آمد و رفت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کی جانب سے غافل ہو گیا۔ جس کے نتائج اس زمانے کے مسلمانوں کے علاوہ مسلمانوں کی بعد میں آنے والی نسلوں کو بھگتنے پڑے۔ بلکہ آج تک مسلمان بھگت رہے ہیں۔

شہنشاہ اکبر سمیت اس کے جانشین مغل حکم ران سمندری راستے سے برعظیم میں وارد ہونے والی مغربی اقوام کے اصل عزائم اور اُن کی ہندوستان میں آمد سے پیدا شدہ حقیقی خطرات سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکے۔

''تحفۃ المجاہدین'' لکھ کر شیخ زین الدین بن عبدالعزیز معبری نے حملہ آور پرتگالیوں کے مظالم کے لرزہ خیز مناظر کو پیش و بیان کرنے کے علاوہ ان کے اصل عزائم کو بھی بے نقاب کرنے کی پہلی بار کوشش کی جو اپنی جگہ برعظیم کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

''تحفۃ المجاہدین'' کی قدر و قیمت اور اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ اس کے تراجم دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں اور مغربی دانشوروں نے اس کتاب کے مصنف کو اس کی حقائق نگاری پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زین الدین معبری کی تحریر:

''اسروا منهم من لا يحصىٰ كثرة وقتلوا منهم كثيرين و ردوا جملة منهم الى النصرانية واسترقوا المسلمات المأسورات حتىٰ خرج لهم منهم اولاد نصارىٰ يقاتلون المسلمين و ينوذونهم فاردت ان اذكر تلك الواقعات و اسطر هذه الحادثات وضعت كتابا و سميته تحفة المجاهدين فى بعض اخيار البر تكالين ذكرت فبها بعض ما مضى من مساوبهم و ظهور دين الاسلام فى ديارِ مليبار و نبذه بسيرة من احكام الجهاد و عظيم ثوابه والنحر بعض عليه بنص التنزيل والآثار و شيئاً مما اختص به كفرتها من غرائب الاخبار''

''تحفۃ المجاہدین'' کے مصنف نے روایات کو قبول کرنے کے سلسلے میں معروضی اندازِ

فکر اختیار کیا ہے اور اپنی تنقیدی صلاحیت اور قوت فیصلہ کو بروئے کار لانے کے علاوہ تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ مثلاً اس نے یہاں کی اس مروجہ روایت کو مسترد کر دیا ہے کہ مالابار کا ہندو راجا معجزہ شق القمر سے متاثر ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

شیخ زین الدین بن عبدالعزیز شافعی معبری نے دسویں صدی ہجری کے آخری سالوں میں یعنی ۹۹۳ھ کے بعد کسی سال میں وفات پائی۔ ان کا مزار کالی کٹ کے جنوب میں واقع قصبہ پونانی جسے عربی میں فنان کہتے ہیں، میں واقع ہے جو موپلا مسلمانوں کا بڑا علمی اور مذہبی مرکز ہے۔

وجیہہ الدین علوی

وجیہہ الملت مولانا شیخ وجیہہ الدین علوی کا شمار برصغیر کی مشہور و معروف دینی و علمی شخصیات میں ہوتا ہے۔ شیخ وجیہہ الدین علوی کا پورا نام و نسب یوں ہے:

وجیہہ الدین بن نصر اللہ بن عماد الدین علوی گجراتی۔

چونکہ ایک مدت تک گجرات کے اہم اور بڑے شہر احمد آباد میں مقیم رہے اس لئے احمد آبادی بھی کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ شیخ محمد اکرام نے ''رودِ کوثر'' میں لکھا ہے کہ:

''شیخ وجیہہ الدین پیدا تو مشرقی گجرات کے قدیمی شہر جاپانیر میں ہوئے لیکن ان کے علم و فضل کا دریا احمد آباد میں بہتا رہا۔ انہوں نے کئی سال درس دیا اور ایک عالم کو سیراب کیا۔''

شیخ وجیہہ الدین علوی علمِ حدیث، فقہ، تفسیر، منطق اور علم الکلام کے فاضل اجل ہونے کے علاوہ ایک صاحبِ بصیرت صوفی اور عارف باللہ بھی تھے۔ ۹۱۱ھ میں گجرات کے قدیمی شہر جاپانیر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا شمس الدین سے حاصل کی۔ اپنے ماموں سید ابو القاسم سے حدیث پڑھی۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں علامہ محمد بن محمد سے حدیث کا اختتام فرمایا۔ آخر میں علومِ عقلیہ مولانا طارمی، مولانا جلال الدین دوانی اور محمد گازرونی سے حاصل کئے۔

شیخ وجیہہ الدین علوی دینی علوم کے فاضل کامل ہونے کے علاوہ علم ریاضی، فلکیات کے بھی ماہر بے بدل تھے۔ انہوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ کی زندگی ہی میں اپنا حلقۂ درس قائم کیا۔ اور مولانا عبدالحئ حسنی کی تحقیق کے مطابق بیس سال کی عمر میں فیصلہ جات، فتویٰ نویسی اور تدریس و تصنیف کا کام شروع کر دیا تھا۔

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے شیخ وجیہہ الدین کو یگانۂ روزگار شخصیت قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''محمد غوثی مندوی نے ''گلزار ابرار'' میں شیخ علوی کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ شیخ وجیہہ الدین احمد نے اپنی ولادت کے بعد پانچویں سال کے آغاز سے اخیر تینتیس سال تک تمام علوم متداولہ میں مہارت تامہ پیدا کر لی۔ یہاں تک کہ آپ ساٹھ سے زیادہ علوم و فنون کے عالم و فاضل اور ماہر ہو گئے۔ شیخ محمد غوثی مندوی شیخ شطاری وجیہہ الدین کا شاگرد ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تالیف ''گلزار ابرار'' میں ان کے لئے وجیہہ الملّۃ کا لقب استعمال کرتا ہے اور اس نے اس لقب کی توجیہہ یہ کی ہے کہ وجیہہ الملّۃ سے مراد دانش آموز صوری و معنوی، بینش اندوز حقیقی و مجازی استادی شیخ وجیہہ الدین احمد بن نصر اللہ علوی احمد آبادی۔''

مولانا عبدالحیٔ حسنی ''نزہۃ الخواطر'' کی جلس چہارم میں شیخ وجیہہ الدین کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الشیخ الامام العالم الکبیر العلامۃ ۹۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے نامور علما سے اکتساب علم کرنے کے بعد علامہ عمادالدین محمد بن محمود طاری سے منطق، فلسفہ وکلام وغیرہ از قسم جملہ علوم آلیہ و عالیہ حاصل کئے۔ وہ تحصیل علم اور تحقیق و مطالعہ سے اس قدر رغبت رکھتے تھے کہ کسی طرف توجہ ہی نہیں کرتے تھے۔ جس کی بدولت فائق وممتاز اقران کے درجے تک آ پہنچے۔''

ان تعارفی جملوں کے بعد مولانا عبدالحیٔ نے لکھا ہے کہ ''ان کی کثرت تصانیف کے علاوہ تدریس میں ان کا کوئی معاصر ان کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔''

پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی تالیف ''حیات شیخ عبدالحق دہلوی'' میں لکھتے ہیں کہ ''احمد آباد میں 'شیخ عبدالحق دہلوی' شیخ وجیہہ الدین علوی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور اُن کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔'' مولانا عبدالحق محدث دہلوی خود اپنی کتاب ''اخبارالاخیار'' میں فرماتے ہیں کہ ''میں جب سید کائناتؐ کی زیارت کے ارادے سے

احمد آباد گجرات پہنچا تو اُس وقت وہاں مشائخ متاخرین میں شیخ وجیہہ الدین جو جامع کمالات و برکات سن رسیدہ بزرگ تھے۔ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ کتابوں کی تصنیف و ترتیب اور ارشاد طالبان میں اُن کا انہماک تھا۔ ان کی ملاقات کی سعادت حاصل کی اور سلسلہ قادریہ کے کچھ اذکار و اشغال ان سے حاصل کیے۔''

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس لکھتے ہیں: ''مولانا وجیہہ الدین ابن نصر اللہ بن عماد الدین علوی گجراتی ۹۱۱ھ میں اپنے زمانے کے مشاہیر سے علوم حاصل کرنے کے بعد علامہ عماد الدین محمود طارمی کی صحبت سے خوب استفادہ کیا اور تدریس بھی جاری رکھی۔ زندگی ہمیشہ زہد و قناعت سے بسر کی۔ لباس بھی سادہ پہنتے تھے اور شغل بھی مطالعہ کتب یا عبادت و ریاضت سے رکھتے تھے۔''

صاحب ''نزہۃ الخواطر'' نے لکھا ہے:

''ما رأی احد فی بیته او فی المسجد الامشتغلا بالافادة''

ترجمہ: گھر یا مسجد میں وہ ہمیشہ تدریس میں مشغول نظر آتے تھے۔

شیخ وجیہہ الدین علوی کو زمانے کے تمام متداول علوم و فنون میں یکساں فاضلانہ مہارت حاصل تھی اور انہوں نے بیشتر فنون کی کتابوں کی شروح لکھیں یا ان پر حواشی تحریر کئے ہیں۔ ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ دینی علوم کے درس میں مشغول رہتے تھے۔ تمام عقلی و نقلی علوم پر ان کا عبور اس حد تک پہنچ گیا کہ شاید ہی کوئی درسی کتاب چھوٹی ہو یا بڑی ہوگی جس کی شیخ وجیہہ الدین نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو۔ لوگ ہمیشہ اُن کی ذات بابرکات سے فیض حاصل کرتے تھے۔

ڈاکٹر زبید احمد اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں لکھتے ہیں کہ مولانا وجیہہ الدین گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ) ایک ولی تھے اور عالم بھی۔ گجرات میں بمقام چاپانیر ۹۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ملا عماد طارمی کے شاگرد تھے۔ گجرات کے فرمانروا سلطان محمود پر ان کا بہت اثر تھا۔ مختلف اسلامی علوم پر انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔

شیخ وجیہہ الدین نے چونکہ مختلف موضوعات پر متعدد اہم اور قابل قدر کتابیں لکھنے کے علاوہ متعدد درسی کتب پر حواشی اور کئی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں اس لئے ''عربی ادبیات'' کی تاریخ ان کی ان بیش بہا اور گراں قدر کتب کے حوالوں کے بغیر مکمل نہیں ہو

سکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر زبید احمد نے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ''
(The contribution of India and Pakistan to the Arabic Literature) میں برصغیر میں مختلف موضوعات پر عربی میں لکھی جانے والی کتابوں کے احوال و تعارف کے لئے گیارہ فصول مختص کی ہیں جن میں سے فصل اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ہفتم اور نہم یعنی کل گیارہ میں سے سات فصلوں میں شیخ وجیہہ الدین کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔

شیخ وجیہہ الدین کے بارے میں مولانا عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں کہ:

''انہیں تصانیف میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ ترتیب عبارات و تقسیم ابواب و فصول میں نہایت شستگی ہوتی۔''

شیخ وجیہہ الدین کی تصانیف اور حواشی و شروح میں حاشیۃ علی نفیس البیضاوی، حاشیہ شرح الوقایہ، حاشیہ شرح التلویح، شرح نخبۃ الفکر اور ان کی تصانیف ''الحقیقۃ المحمدیۃ'' انتہائی مفید ہونے کے علاوہ خاص طور پر قابل ذکر بھی ہیں۔ یہ کتابیں علم فقہ، تفسیر، حدیث، تصوف و اخلاقیات، علم الحساب اور علم اللسان وغیرہ پر ہیں۔

''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد دوم (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس نے شیخ وجیہہ الدین کی نگارشات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شیخ وجیہہ الدین علوی کو زمانے کے تمام متداول علوم و فنون میں یکساں فاضلانہ مہارت حاصل تھی اور انہوں نے بیشتر فنون کی کتابوں کی شروح لکھیں یا ان پر حواشی تحریر کئے۔ ان میں سے ''حاشیہ تفسیر البیضاوی'' کے ایک قلمی نسخے کا ذکر فہرست آصفیہ میں ہے۔ شرح نخبۃ الفکر پر ان کی مفید تعلیقات ہیں اور قلمی نسخہ رام پور کی لائبریری میں موجود ہے۔ شیخ علوی کی متعدد تصانیف میں سے ایک ''الحقیقۃ المحمدیۃ بھی ہے۔''

''الحقیقۃ المحمدیۃ'' (بزبان عربی) کو شیخ وجیہہ الدین کی تصانیف میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اپنی اس کتاب میں انہوں نے تصوف کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالقدوس لکھتے ہیں:

''الحقیقۃ المحمدیۃ'' اپنے موضوع، جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اسلامی تصوف کے اصول بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ ایک راسخ العقیدہ صوفی شریعت اسلامی سے کبھی سرِ مُو انحراف نہیں کرتا بلکہ اس کا قول و عمل

مین شرع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ، دو مقاصد اور ایک تملہ پر مشتمل ہے۔ چنانچہ شیخ علوی اپنی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فهذه رسالة في التصوف مسماة بالحقيقة المحمدية مرتبة على مقدمة و مطلبين و تكملة''

''مقدمے میں ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ مطلب اول میں یہ بتایا ہے کہ کس طرح حق سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندے کو نورِ صمدیت کی تجلیات دکھاتا ہے۔ مطلب ثانی میں اہل السنۃ والجماعۃ کے علمائے علم الکلام اور صوفیوں کے نظریات کے درمیان موافقت و تطبیق کا بیان ہے۔ اس تکملے میں مختلف النوع اور متفرق مسائل کا اجمالی ذکر ہے۔ مثلاً یہ کہ ہر عقلِ انسانی میں اللہ کی ذات کا تصور راسخ ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض نادان ملحد اسے ضائع کر دیتے ہیں۔ سب سے آخر میں ولایت کے درجات اور اولیاء اللہ کی اقسام بیان فرمائی ہیں۔''

صاحب ''نزہۃ الخواطر'' نے لکھا ہے کہ شیخ وجیہہ الدین نے فیصلہ جات و فتویٰ نویسی اور تدریس و تصنیف کا آغاز بیس سال کی عمر میں ہی کر دیا تھا اور اپنے اساتذہ و شیوخ کی زندگی ہی میں وہ اعلیٰ مراتب پر فائز ہو کر فائق و کامران ہو گئے تھے۔ انہیں خرقۂ خلافت شیخ قاضی خان چشتی نہروالی المعروف بہ قاضی قاضن نے عطا فرمایا اور طریقہ شطاریہ میں انہوں نے شاہ محمد غوث گوالیاری مؤلف ''جواہر خمسہ'' سے استفادہ کیا۔''

ظاہری و باطنی علوم میں مہارت تامہ حاصل کر کے وجیہہ الملت شیخ وجیہہ الدین مسند وعظ و ارشاد پر رونق افروز ہوئے اور انہوں نے اپنا حلقۂ درس قائم کیا تو اُن کے زہد و تقویٰ اور فضل و کمال کی شہرت جلد ہی پورے برصغیر پاکستان و ہند میں پھیل گئی اور برصغیر کے دور دراز علاقوں اور شہروں سے تعلق رکھنے والے طالبانِ حق اور تشنگانِ علم جوق در جوق اُن کے خرمنِ کمال سے فیض یاب و سیراب ہونے لگے۔

شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری کی شیخ وجیہہ الدین سے ملاقات کا سبب وہ فتویٰ بنا جو شیخ علی متقی صدر علماء نے شیخ محمد غوث کے خلاف دیا تھا۔ یہ شیخ وجیہہ الدین کی زندگی کے آخری زمانے کے دوران کا واقعہ ہے۔ اس ضمن میں شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

''تذکروں میں آپ کا نام اکثر شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری کے واقعہ تکفیر کی وجہ سے آجاتا ہے۔ جن کی بعض تصنیفات کی بناء پر شیخ علی متقیؒ نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا

تھا۔ بادشاہ نے یہ فتویٰ آپ کے پاس بھیجا لیکن آپ نے نہ صرف اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ اس قسم کی تکفیر کی سخت مخالفت کی اور اس مسئلے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا۔ جس میں ابتداً فقہی کتابوں سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر احادیث سے سنداً سب کو مشرح بیان کیا ہے۔ آخر میں صوفیہ کرام کے احوال سے بحث کی ہے کہ حالت سکر میں جو کہہ جاتے ہیں وہ قابل مواخذہ نہیں ہوتا۔ پھر سید محمد غوث گوالیاری کی کتاب ''اورادِ غوثیہ'' پر لوگوں نے جو اعتراضاف کئے تھے ان کا جواب دیا ہے... آپ کا یہ ارشاد تھا کہ کسی شخص کی سو باتوں میں سے ایک بات بھی اسلام کی ہو تو اس کو مسلم سمجھو اور کسی کلمہ گو اہل قبلہ کو کافر نہ کہو۔''

اس تاریخی واقعہ سے شیخ وجیہہ الدین کے علمی مرتبہ و مقام، ان کے معاشرتی اثر و رسوخ اور بادشاہ وقت کی ان سے عقیدت و ارادت کے علاوہ اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کتاب وسنت کے کتنے بڑے عالم تھے۔ نیز یہ کہ اگر اسلامی علوم کے عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ بذاتِ خود احکامِ شریعت کے سختی کے ساتھ پابند نہ ہوتے۔ تو شیخ علی متقی ایسے عظیم المرتبت عالم دین اور ممتاز محدث وفقیہ کے فتویٰ کو مسترد کرنے کی کبھی بھی جرأت نہ کرتے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ وجیہہ الدین کا سلسلہ شطاریہ میں سید محمد غوث کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونا بھی اس زمانے کی بات ہے۔ جیسا کہ مولوی رحمان علی نے ''تذکرہ علمائے ہند'' میں لکھا ہے کہ ''جب شیخ محدث غوث گجرات پہنچے تو وہاں کے صدر علماء شیخ علی متقی نے ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا لیکن شیخ وجیہہ الدین نے سلطان محمود سے اس کے نفاذ کو موقوف کرا دیا اور کہا کہ جب تک ہم دیکھ نہ لیں ان کے متعلق کسی قسم کا فتویٰ عائد نہیں کر سکتے۔''

مولانا رحمان علی کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک شیخ وجیہہ الدین اور شاہ محمد غوث شطاری کی شناسائی نہ تھی۔ یہ بات ''گلزارِ ابرار'' کے مؤلف محمد غوثی مندوی شطاری کے اپنے احوال سے ظاہر ہے کہ وہ شاگرد تو شیخ وجیہہ الدین کے تھے مگر مرید شیخ محمد غوث گوالیاری کے تھے۔ مولوی رحمان علی نے تو صاف الفاظ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ:

''جب شیخ وجیہہ الدین شیخ محمد غوث سے ملے تو اس قدر متأثر ہوئے کہ اُن کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے۔ شیخ علی متقی کو

اس کی اطلاع ہوئی تو شیخ وجیہہ الدین کے پاس آ کر اپنے کپڑوں کو تار تار کر ڈالا اور پوچھا "بدعت کی اشاعت اور دین میں رخنہ پیدا کرنے میں تم کس طرح راضی ہو گئے؟۔"

شیخ وجیہہ الدین نے جواب دیا۔ "ہم اربابِ قال ہیں شیخ اہلِ حال ہیں۔ ہمارا فہم ان کے کمالات تک نہیں پہنچ سکتا اور بظاہر شریعت کا کوئی اعتراض ان پر عائد نہیں ہوتا۔"

شہنشاہ جہانگیر کی تزک میں ہے:

شیخ وجیہہ الدین شیخ گوالیاری کے خلیفہ ضرور تھے مگر ایسے خلیفہ تھے کہ مرشد کو بھی ان پر فخر تھا۔ "مرشد بخلافت او مباہات کند۔"

صاحب "نزہتہ الخواطر" نے لکھا ہے:

"مولانا وجیہہ الدین بڑے صاحب صدق و اخلاص، قناعت شعار، متقی و پرہیز گار اور شریف الطبع بزرگ تھے۔ عام سادہ لباس پہنتے تھے اور لباس میں کسی فرد بشر سے امتیاز نہیں کرتے تھے بلکہ جو موٹے جھوٹے کپڑے مل جاتے تھے، پہن لیتے تھے اور جو کچھ حاصل ہوتا طلباء پر صرف کر دیتے۔ مگر تدریس و رغبت الی اللہ اور اسبابِ دنیوی سے تجرّد میں کمی نہ آتی۔ نہ امراء اور اغنیاء کے دروازوں پر جاتے۔ الا معاذ، وہ بھی مجبوراً یعنی کسی ضرورت مند کی سفارش کے لئے۔ اپنے مکان اور مسجد میں عبادت اور طلباء کو افادہ کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔"

ملا عبد القادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں لکھا ہے:

"شیخ وجیہہ الدین ایک جید عالم تھے... لوگ انہیں ایک ولی مانتے تھے۔

"خلائق را پیوستہ از انفاس متبرکہ او فیض مے رسید، وحق سبحانہٗ اسم الشافی را ظاہر و او را مظہر ساختہ بود۔ تا ہر روز جمع لا تعداد ولاتحصیٰ از بیماراں ومحنت زدگان بہ ملازمت او آمدہ التماسِ دعا می نمودند و اثر آں زود می یافتند۔"

یگانہء روزگار عالمِ دین صاحبِ مقام صوفی عارف باللہ وجیہہ الملت شیخ وجیہہ الدین

علوی نے احمد آباد میں ۹۹۸ھ کے دوران وفات پائی۔

مادہ تاریخ ''شیخ وجیہ الدین'' ہے۔ اپنے مدرسے کے وسط میں دفن ہوئے۔ ان کے مزار کا چھپر کھٹ نواب مرتضیٰ خان (شیخ فرید بخاری) نے تیار کروایا جس پر سیپ کا نہایت اعلیٰ درجے کا کام ہوا ہے۔ احمد آباد میں ان کا مزار آج بھی زیارت گاہ عوام ہے۔

عبدالوہاب متقی

شیخ عبدالوہاب متقی اپنے زمانے کے جید عالم، بلند پایہ محدث، ممتاز فقیہ اور نامور صوفی تھے۔ تمام عمر اسلامی علوم و فنون بالخصوص حدیث فقہ اور تصوّف وطریقت کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہے۔ شیخ علی متقی کے شاگردِ خاص اور خلیفہ مجاز تھے اور مولانا عبدالحق محدث دہلوی ایسی صاحبِ کمال علمی شخصیات شیخ عبدالوہاب کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ مکہ معظمہ میں شیخ علی متقی اور وہاں کے دوسرے نامور اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا اور مکہ معظمہ میں ہی چالیس برس تک مسلسل درس دیا۔ جہاں ہر ملک وقوم کے طالب علموں اور علماء نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ہر طالب علم کو اس کی زبان میں درس دیتے تھے اور ہر عالم سے اس کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ حنفی المذہب تھے۔

سیدی شیخ عبدالوہاب متقی ۹۴۲ھ میں شہر مندو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد کا اسم گرامی شیخ ولی اللہ تھا جو مندو کے اکابرین میں سے تھے۔ پھر حوادثِ زمانہ کے باعث نقلِ مکانی کر کے برہان پور میں سکونت پذیر ہوئے اور وہاں عزت و وقار کے ساتھ رہنے لگے۔ مگر تھوڑے ہی عرصے بعد فوت ہو گئے اور اسی زمانے میں ان کی والدہ ماجدہ نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا۔ گویا کہ شیخ عبدالوہاب کو ان کے والد اور والدہ نے کم سنی کے عالم میں داغِ مفارقت دیا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں بچپن ہی سے تحصیلِ علم کا بہت شوق اور تصوّف و روحانیت سے گہرا شغف تھا۔ چنانچہ رحمتِ الٰہی نے بچپن ہی کے زمانے سے شیخ عبدالوہاب کی دست گیری کی اور انہوں نے کم سنی ہی کی عمر میں طلبِ حق کے لئے فقر و تجرید اور تحصیلِ علم کی خاطر دنیا کی سیر و

سیاحت کو نکلے اور مختلف علاقوں، شہروں اور ملکوں میں جا کر بے شمار علماء، صلحا اور مشائخ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

مولوی فقیر محمد نے ''حدائق الحنفیہ'' میں لکھا ہے کہ شیخ عبدالوہاب بیس سال کی عمر میں ۹۶۳ھ میں مکہ معظمہ پہنچے اور فریضہ حج ادا کرنے کے بعد شیخ علی متقی حنفی قادری (متوفی ۹۷۵ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اُن دنوں میں مکہ معظمہ میں مسند وعظ و ارشاد اور حلقہ درس و تدریس قائم ہوئے تھے۔ شیخ عبدالوہاب نے اپنے استاد گرامی شیخ علی متقی سے فقہ و حدیث اور دوسرے علوم پڑھے۔ اور علوم شرعیہ میں فاضل اجل اور قاموس اللغۃ ہوئے۔ سلسلہ عالیہ قادریہ شاذلیہ میں ان کی بیعت کر کے معارف فقر و تصوف میں عارفِ کامل اور ولیِ اکمل ہوئے اور اپنے مرشدِ طریقت کے خلیفہ و جانشین ہو کر ۲۶ سال تک ان کی مسندِ دعوت وارشاد پر بیٹھے اور ربع صدی سے زائد عرصے تک مکہ معظمہ میں علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم میں مشغول رہے۔ ان کے علمی فضل و کمال اور روحانی مرتبہ ومقام کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ بے شمار تشنگانِ علم اور طالبان حق ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سیراب وفیض یاب ہوئے۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں شیخ عبدالوہاب کی مکہ معظمہ میں آمد اور ان کی شیخ علی متقی سے ملاقات کو قدرے مختلف انداز میں لکھا ہے۔ مولانا عبدالحق محدث چونکہ شیخ عبدالوہاب کے شاگردِ رشید ہیں، اس لئے ان کا بیان اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحق محدث بیان کرتے ہیں:

''بیس سال کی عمر کے لگ بھگ جبکہ آپ کی شادی بھی نہ ہوئی تھی مکہ معظمہ پہنچے۔ شیخ علی متقی کی چونکہ آپ کے والد سے شناسائی تھی اس لئے وہ آپ کی مکہ معظمہ میں آمد کی خبر سن کر آپ سے ملنے آئے اور کمال شفقت و مہربانی سے اپنے ساتھ قیام کرنے کی استدعا کی۔ پھر جب انہوں نے آپ کی خوش خط تحریر دیکھی تو اور زیادہ اصرار کیا کہ غریب خانے پر ضرور تشریف لائیں اور ہماری چیزیں کتابت کر دیں۔ اس پر آپ نے اپنی شانِ استغناء اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیخ علی متقی کی دعوت قبول نہ کی اور کہا کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے؟ لیکن آخر کار شیخ علی متقی کے فضل و کمال اور استقامتِ حال سے متاثر ہو کر ان کے پاس جا کر رہنے لگے۔ نیز آپ کو اپنے والد گرامی کی یہ نصیحت بھی یاد تھی کہ اگر تمہیں راہِ حق کے سلوک کی توفیق ہو تو شیخ علی متقی اور ان جیسے

صالح بزرگوں کی صحبت اختیار کرنا اور فلاں فلاں لوگوں کے ساتھ سکونت رکھنے کی کوشش کرنا۔ اس نصیحت میں ایک ایسے شخص کا نام بھی شامل تھا جو دعوتِ اسماء الٰہی اور بادشاہوں کے مسخر کرنے میں مشہور تھا مگر اس کے بارے میں ہدایت کی گئی تھی کہ اس شخص سے ہمیشہ پرہیز کرنا۔

سیدی عبدالوہاب خطِ نستعلیق بہترین لکھتے تھے لیکن چونکہ قرآن شریف خطِ نسخ میں لکھا جاتا ہے اور یہی صلحاء کی عادت رہی ہے اس لئے شیخ علی متقی نے آپ کو خطِ نسخ کی مشق کرنے کے لئے کہا۔ چنانچہ آپ نے جلد ہی خطِ نسخ لکھنے میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ اور شیخ کی تالیفات کی کتابت اور تصحیح و ترتیب میں مصروف ہوئے۔ آپ نے شیخ کی بے حساب کتابیں لکھی ہیں۔ تیز لکھنے میں اتنے ماہر تھے کہ ایک مرتبہ بارہ ہزار اشعار کی بارہ راتوں میں کتابت کر دی۔ ایک رات میں ایک ہزار اشعار لکھتے اور دن میں حسبِ معمول کتابوں کی تصحیح و ترتیب میں مصروف رہتے تھے۔ جن دنوں مکہ معظمہ میں قحط سالی ہوئی اور نوبت فاقوں تک آ گئی تو آپ لوگوں کے پاس جا کر کتابت کا کام کرتے اور اس کام کی اجرت پر آپ کی اور شیخ کی گزر بسر ہوتی تھی۔ ان دنوں بینگن بہت ارزاں تھے اس لئے انہیں خرید کر ان میں نمک لگا کر اچار کے طور پر رکھ دیتے اور یہی روزانہ اپنے شیخ کے ساتھ مل کر تناول فرماتے تھے۔ غرض کہ آپ اپنے مرشدِ طریقت کی اطاعت اور رضا میں اس قدر منہمک تھے آپ کو فنا فی الشیخ کہا جائے تو بجا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ کی ظاہری و باطنی مہربانیوں کے لئے مخصوص ہو گئے۔ اور انوار و اسرار کے کمالات میں بہرہ ور ہوئے۔ اپنے پیر و مرشد کے کمالات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اپنے مرشد کی ذات بن گئے۔''

شیخ علی متقی فرمایا کرتے تھے ''میں نے راہِ خدا میں ایک بھائی پایا جو عبدالوہاب ہے''

شیخ عبدالوہاب کا بیان ہے ''پیر و مرشد نے مرید کرتے وقت مجھ سے اقرار لیا تھا کہ مال و دولت پر فقر کو مقدم رکھنا اور اس اعتقاد پر جمے رہنا۔ چنانچہ اب تک میرا یہی عقیدہ ہے۔ شیخ کے ہاتھ پر میں نے جمادی الاوّل ۹۶۳ھ میں بیعت کی اور ۲ جمادی الاوّل ۹۷۵ھ تک ان کی خدمت میں رہا۔ مکہ معظمہ میں اپنے قیام کے دوران ہم چوالیس حج کیے۔''

چوالیسویں حج کے بعد اپنے شیخ کے واسطے ادائے حقوق ذوی الارحام کے مکہ معظمہ سے گجرات آئے، کشتی کے ذریعے آپ کی آمد میں پندرہ دن اور واپسی کے لئے چالیس دن صرف ہوئے اور اس سال بھی آپ نے مکہ پہنچ کر فریضہ حج ادا کیا۔ آپ کی آمد و رفت کا یہ قلیل عرصہ آپ کی کرامت سمجھی گئی۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی جو ان کے مرید اور ہم عصر ہیں، نے لکھا ہے کہ شیخ عبدالوہاب اس زمانے میں علم و عمل، حال و اتباع، استقامت و تربیت، مریدوں کے سلوک اور طالب علموں کی افادیت، امداد اور غرباء و فقراء پر مہربانی و شفقت، مخلوق خدا کو نصیحت و برکت، عطائے نورانیت اور تمام نیک کاموں کی تلقین و تاکید میں اپنے مرشد طریقت کے حقیقی وارث، اولین خلیفہ اور صاحبِ اسرار ہیں۔ اہالیانِ حرمین، اور مصر، شام، یمن وغیرہ ملکوں کے مشائخ نے آپ سے ملاقاتیں کی ہیں اور یہ سب حضرات آپ کی ولایت اور علوّ شان کے قائل ہیں اور سب اس پر متفق ہیں کہ شیخ عبدالوہاب دراصل قطب وقت امام ابو الحسن شاذلی کے شاگرد شیخ ابو العباس مرسی کے قدم بہ قدم گامزن ہیں۔ یمن کے بعض مشائخ نے اہالیانِ حرمین کے نام شیخ عبدالوہاب کی تعریف میں لکھا ہے کہ

''اے اہالیانِ حرمین! تم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک شمع روشن ہے اس سے روشنی حاصل کرو۔''

مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے مکہ مکرمہ کے نامور اور ممتاز بزرگ شیخ علاء الدین کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''یمن کے مشائخ و فقراء نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ شیخ عبدالوہاب مکہ مکرمہ میں قطبِ دوراں ہیں۔''

مولوی فقیر محمد نے لکھا ہے کہ شیخ عبدالوہاب تمام علوم شرعیہ و نقلیہ پڑھاتے تھے لیکن تفسیر و حدیث کی تعلیم برغبت تمام و خوشی مالا کلام دیتے تھے اور جو شخص جس ملک کا ہوتا تھا اس کو اسی کی زبان میں تعلیم دیتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مکہ معظمہ میں جا کر آپ ہی سے حدیث کا درس لیا اور صحاحِ ستہ وغیرہ کتبِ حدیث کی سند حاصل کی اور نیز تصوّف میں آپ کے مرید ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ''زاد المتقین'' میں شیخ عبدالوہاب کے احوال میں لکھا ہے کہ ایک دن آپ کی مجلس میں امام شافعی کے مذہب

میں بات ہوئی۔ کسی نے کہا کہ ان کا مذہب ظاہر حدیث کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے حقیقت کو واضح کرنے کے لئے فرمایا کہ "بات اس طرح پر نہیں ہے کیونکہ حنفی کتب میں جو ماوراء النہر اور ہندوستان میں مشہور ہیں اکثر احکام کا اثبات قیاس اور دلائلِ عقلیہ سے کیا گیا ہے۔ لیکن اس جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں کہ ہر ایک قول حنفی پر حدیث صحیح کو وارد کر کے اس کا اثبات کیا گیا ہے بلکہ بعض علمائے حنفیہ نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ہر ایک مطلب پر آیت اور حدیث کو معا لاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بات بے اختیار کہنی پڑتی ہے کہ شافعی فقہ کے ماننے والے ہی اصحابِ رائے ہیں نہ کہ حنفی۔

چنانچہ امام ابن ہمام کی "شرح ہدایہ"، اور امام تقی الدین شمسی کی "شرح مختصر وقایہ" اور "مواہب الرحمن" اور اس کی شرح سے جو علمائے مصر نے تصنیف کی ہیں، کے مطالعے سے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پھر جس شخص نے امام شافعی کے مذہب کے بارے میں بات کی تھی اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کو یہ شبہ ظاہراً "مشکوٰۃ" کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہو گا کہ اکثر احادیث اس کی شافعی مذہب کے موافق ہیں کہ اس کے مؤلف نے احادیث کو بڑی جستجو و تفحص سے شافعی مذہب کے موافق جمع کیا ہے۔ لیکن حنفی مذہب کے اثبات میں اور احادیثِ راجح تر جو کتابوں میں مذکور ہیں، موجود ہیں۔ پھر فرمایا کہ مذہب حنفی کے صدق و حقانیت کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ایسے اصحاب و تلامذہ مل گئے جو علمِ فقہ و حدیث میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے اور اپنے زہد و تقویٰ اور امانت و دیانت کے لئے مشہور ہونے کے علاوہ تقدم و قرب زمانہ سلف جیسی امتیازی خصوصیت کے بھی حامل تھے۔

شیخ عبدالوہاب نے یہ بھی فرمایا کہ امامِ اعظم کے مناقب و فضائل میں جو کتب و رسائل لکھے گئے ہیں ان کا مطالعہ بھی ضروری ہے تا کہ حقیقتِ حال منکشف ہو۔ پھر فرمایا کہ امام ابو حنیفہ چونکہ نہایت اعظم یعنی بہت بڑے عالم تھے اس لئے ان کے حاسد بھی بہت تھے جو ان پر طعن کرتے تھے۔ جیسا کہ مشہور ہے "ہر کہ فاضل تر محسود تر" پس یہ امام اعظم کی فضیلت و بزرگی کی علامت ہے۔

فاضلِ اجل، عارف باللہ سیدی شیخ عبدالوہاب متقی حنفی قادری شاذلی نے ۱۰۰۱ھ میں وفات پائی۔

"شیخ کامل" تاریخ وفات ہے۔

یعقوب صرفی کشمیری

شیخ یعقوب صرفی کا شمار خطۂ کشمیر کے معروف و ممتاز علماء اور اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ حضرت ایشاں، گنائی اور عاصمی شیخ یعقوب کے القاب ہیں۔ ان کے والد کا نام شیخ حسن گنائی اور اُن کے پردادا میر بایزید گنائی عاصمی مشہور عالم دین تھے۔ انہیں سلطان زین العابدین بڈ شاہ کی طرف سے امیر القوم کا خطاب ملا تھا۔ شیخ یعقوب صرفی نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے شعبوں میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔ مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے شیخ یعقوب صرفی کے احوال و آثار بیان کیے ہیں۔

شیخ یعقوب صرفی ۹۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے چھ بھائی تھے۔ سب نیکوکار اور متقی و پرہیزگار لیکن شیخ یعقوب اور سب میں ممتاز تھے۔ بچپن میں قرآن پڑھا۔ پھر شاہی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ مولانا عبدالرحمٰن کے شاگرد خاص مولانا محمد قاآنی سے اکتساب فیض کیا۔ مولانا جامی ان کو جامی ثانی کہا کرتے تھے۔ موزوں طبع تھے۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں شعر موزوں کرنے لگے۔ اپنے والد گرامی سے اصلاح لیتے تھے۔ خود فرماتے ہیں:

چو در سال ہفتم نہادم قدم زطبعم رواں گشتم شعر عجم

پدر کردی اصلاح اشعارِ من بہ اصلاح بودی مددگارِ من

مولانا محمد قاآنی کے علاوہ شیخ یعقوب صرفی نے جن علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ان میں اخوند بصیر خندہ بونی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو بصارت سے محروم لیکن صاحبِ بصیرت بزرگ تھے۔ شیخ یعقوب صرفی نے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک معروف علمی خاندان میں جنم لیا تھا جو اپنی دولت و ثروت کے لیے بھی مشہور تھا۔ چنانچہ

تعلیم سے فارغ ہو کر شیخ یعقوب نے زمین داری کا کام سنبھالا تو اوباش طبع نوجوانوں نے انہیں آ گھیرا۔ والد کو اس صورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے تنبیہ و تحدید کی جس پر شیخ یعقوب نادم و شرم سار ہوئے اور ان کے دل میں تلاش حق کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ بدخشاں، بلخ اور غورستان کے شہروں سے ہوتے ہوئے بالآخر سمرقند پہنچے۔ پھر وہاں سے عراق و حجاز کا رُخ کیا۔ مکہ مکرمہ میں مشہور محدث ابن حجر سے درس حدیث کی سند حاصل کی۔ شیخ محمد حسن شافعی مکی سے شیخ اکبر ابن عربی کی ''فصوص الحکم'' پڑھی اور شیخ فتح اللہ مدنی سے ''فتوحات مکیہ'' کے اسرار و رموز سمجھے۔ حرمین الشریفین سے واپس ہوئے اور ایران کے راستے برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہوئے۔

مولوی فقیر محمد اپنی مشہور کتاب ''حدائق الحنفیہ'' میں لکھتے ہیں:

''شیخ یعقوب صرفی خلف شیخ حسن گنائی عاصمی بڑے عالم فاضل، فقیہ و محدث جامع علوم ظاہری و باطنی تھے ـــــ صغرسنی میں آپ سے آثار زیرکی اور تیز فہمی اور بزرگی کے نظاہر تھے ـــــ مشہد مقدس کی زیارت کر کے مکہ معظمہ میں آئے اور شیخ المحدثین ابن حجر مکی وغیرہ سے حدیث کی سند حاصل کی اور بغداد میں آ کر امام ائمہ ابو حنیفہ کوفی کا جبہ مبارک حاصل کر کے کشمیر میں آئے۔ چند سال کے بعد پھر حج کو تشریف لے گئے اور بعد ایک سال کے معاودت فرما کر بہت سے کتب حدیث و تفسیر و فقہ وغیرہ اپنے ساتھ لائے اور اُن کو خطۂ کشمیر میں مروج کیا۔''

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کی چوتھی جلد (فارسی ادب: دوم) کے فاضل مقالہ نگار حامد خان حامد نے شیخ یعقوب صرفی کے احوال و آثار بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ شیخ یعقوب ایران پہنچے تو وہاں شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں علمائے شیعہ کے ساتھ خلافت اور حضرت علی کی افضلیت کے بارے میں مباحثہ ہوا۔ پھر فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتی، سرہند میں حضرت مجدد الف ثانی اور نارنول میں شیخ نظام الدین، قاضی محمد صالح اور علامہ شاہ ابوالخیر کی صحبتوں سے استفادہ کیا۔ اپنی سیاحت کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے:

سیاحت بعالم بسی کردہ ام ملاقات باہر کسی کردہ ام
دریں راہ ہر جا کہ بودہ است کس نگاہی از او کردہ ام ملتمس

سیاحت کے بعد وطن میں مقیم ہو گئے اور کمالات معنوی سے لوگوں کو مستفید فرماتے رہے۔ حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی نے سلسلہ کبرویہ سے ارشاد وہدایت کی اجازت دی۔

حضرت مجدد الف ثانی کے والد بزرگوار استاد مکرم اور مرشد طریقت حضرت مخدوم عبدالاحد کا تذکرہ کرنے کے بعد شیخ محمد اکرام اپنی مشہور کتاب ''رود کوثر'' میں لکھتے ہیں

''حضرت مجدد کے دوسرے بااثر استاد شیخ یعقوب صرفی کشمیری تھے جن سے انہوں نے حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں اور سلسلہ کبرویہ میں بیعت کی۔ (حضرات القدس) برصغیر کی روحانی، ادبی اور سیاسی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ تعلیم ظاہری کے بعد سمرقند جا کر شیخ حسین خوارزمی کے مرید ہوئے۔ مرشد نے خاص توجہ اور مہربانی کی۔ واپس کشمیر آئے تو خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ فیض کے لیے حاضر ہوئے۔ انہوں نے کچھ عرصے کے بعد خراسان کے رستے حجاز کا رُخ کیا۔ شیخ ابن حجر سے حدیث پڑھی اور سند لی۔ بڑے سفر کیے اور کئی اولیاء اللہ سے ملاقاتیں کیں۔ واپس کشمیر پہنچے تو یہاں شیعہ سنی جھگڑے زوروں پر تھے۔ جب یعقوب چک نے قاضی موسیٰ کو شیعہ طریقے سے خطبہ نہ پڑھنے پر شہید کرا دیا اور اہل سنت کے لیے حالات بہت ناسازگار ہو گئے تو شیخ یعقوب، بابا داؤد خاکی کو ساتھ لے کر اکبر کے پاس لاہور پہنچے اور کشمیری عوام کی طرف سے دعوت دی۔ اکبر تو اس موقع کا پہلے سے منتظر تھا۔ اُس نے اپنی فوجیں بھیجیں اور اکتوبر ۱۵۸۶ء میں کشمیر مملکت مغلیہ کا حصہ ہو گیا۔''

شیخ محمد اکرام مزید لکھتے ہیں کہ شیعہ سنی مسئلے پر شیخ یعقوب کے جو شدید احساسات تھے اُس کا اندازہ ان اقدامات سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے قاضی موسیٰ کی شہادت پر شروع کیے۔ لیکن ان کی مثالیں اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔ شیخ یعقوب کے سری نگر میں ایک استاد تھے اخوند ملا بصیر، بڑے بڑے صاحب عظمت بزرگ اُن کے حلقۂ تلمذ میں

شریک تھے، مثلاً شیخ داؤد خاکی۔ لوگوں نے مشہور کیا کہ ملا بصیر بھی مائل بہ تشیع ہیں تو شیخ صرفی اُن کے مدرسے سے اٹھ آئے۔ حضرت مجدد کا شیعیت کی نسبت ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ اُن کی ابتدائی کتابوں میں سے ایک رسالہ تھا ''رد روافض۔'' کیا اس نقطۂ نظر کے پیدا کرنے یا اسے تقویت دینے میں اُن کے مرشد اور استاد شیخ یعقوب صرفی کا اثر بھی کارفرما تھا؟

شیخ یعقوب کی ہستی جامع صفات تھی۔ وہ عالم اور شیخ ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ خمسہ کا جواب لکھا۔ ''پاکستان میں فارسی ادب'' کے بارے میں جو طویل مقالہ لکھا گیا ہے اس میں شیخ یعقوب صرفی کا تذکرہ ساٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس سے فارسی شاعری میں اُن کے مرتبہ و مقام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بدایونی نے اُن کے متعلق جو طویل اندراج دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے فیضی سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اُن کی لکھی ہوئی ''تفسیر فیضی'' کی تکمیل کی تاریخ اکثر مؤرخین نے نقل کی ہے ــــ یہ تاریخی حوالے دینے کے بعد شیخ محمد اکرم بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجدد کی فیضی اور ابوالفضل کے ہاں کافی آمد و رفت تھے۔ اور ان کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ انہوں نے تفسیر بے نقط کی تکمیل میں فیضی کا ہاتھ بٹایا۔ کیا فیضی (اور ابوالفضل) سے اُن کے تعلقات کی استواری میں ان کے استاد (شیخ یعقوب صرفی) کو بھی دخل تھا؟

آخر میں شیخ محمد اکرام یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ''شیعہ سنی مسئلے پر شیخ یعقوب اور حضرت مجدد کے اشتراکِ احساسات اور فیضی سے دونوں کے قریبی تعلقات کی بناء پر بعض سوالات اُن کے سوانح نگار کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا یقینی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اتنا یقینی ہے کہ حضرت مجدد اپنی تمام عمر میں تین بزرگوں کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ ایک اُن کے والد بزرگوار تھے۔ دوسرے خواجہ باقی باللہ قدس سرہ۔ تیسرے شیخ یعقوب صرفی کشمیری۔ مؤخرالذکر کا بھی اُن کی علمی اور روحانی زندگی میں ایک اہم مقام ہے۔ جب حضرت مجدد علوم عقلیہ ونقلیہ سے استفادہ کر چکے تو آپ نے سرہند میں درسِ علوم کا سلسلہ شروع کیا اور مدت تک طالبانِ علوم کو فیوض و برکات سے بہرہ ور کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ (بیس سال کی عمر؟) میں اکبرآباد تشریف لے گئے اور ایک مدت تک وہاں قیام کیا۔''

یہاں تک تعارفی کلمات شیخ محمد اکرام کے تھے جو انہوں نے شیخ یعقوب صرفی کے

بارے میں حضرت مجدد الف ثانی کے استاد اور مرشد کی حیثیت سے اپنی کتاب ''رود کوثر'' میں مختلف کتب تاریخ و تذکرہ بالخصوص ''زبدۃ المقامات'' اور ''حضرات القدس'' کے حوالوں سے رقم کیے ہیں۔

شیخ یعقوب صرفی نظم و نثر، دونوں اصناف ادب پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ اور عربی اور فارسی زبانوں میں یکساں مہارت و روانی سے لکھنے پر قادر تھے۔ چنانچہ انہوں نے پانچ مثنویاں ''خمسہ نظامی'' کی تقلید میں کہیں ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں:- ۱: مسلک الاخیار، ۲: لیلیٰ مجنوں، ۳: مغازی النبی، ۴: وامق عذریٰ، ۵: مقامات مرشد، علاوہ ازیں ان کی تصانیف ہیں: دیوان صرفی، شرح رباعیات، تفسیر مطلب الطالبین (عربی) تفسیر فارسی، شرح اربعین، رسالہ اذکار، مناقب الاولیاء، تقریظات بر سوانح الالھام، رسالہ در تصوف بنام ''روائح''، یہ کتاب مولانا جامی کی ''لوائح'' کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ مولانا جامی نے ہر فصل کو لائحہ کا عنوان دیا ہے تو شیخ یعقوب صرفی نے ''رائحہ'' کا عنوان دیا ہے۔ ''روائح'' کا موضوع تصوف ہے۔

شیخ یعقوب صرفی نے خلفائے راشدین کی مدح کے ساتھ ساتھ بارہ اماموں کی منقبت بھی بیان کی ہے۔

شیخ یعقوب صرفی، صوفی اور درویش مشرب تھے۔ صلح کل مذہب رکھتے تھے۔ فرقہ دار سے سخت محترز تھے۔ ان صوفیہ کرام میں ممتاز مقام رکھتے تھے جو شریعت اور طریقت کو الگ نہیں رکھتے بلکہ دونوں کا امتزاج لازمی سمجھتے ہیں۔ اہل سنت و الجماعت کے مسلک پر سختی سے کاربند تھے۔ خود فرماتے ہیں:

گر خود ز خدا اعانت نبود — باللہ کہ عادت تو طاعت نبود!

راہی کہ صراطِ مستقیمش گویند — جز مذہبِ سنت جماعت نبود

شیخ یعقوب صرفی کی کوششوں سے سرزمین کشمیر میں دین اسلام کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

مبلغ اسلام شیخ یعقوب صرفی کشمیری نے ۱۲ ذیقعد ۱۰۰۳ھ کو بروز جمعرات وفات پائی اور زینہ کدل میں دفن ہوئے۔ سال تاریخ

نقل ہادی دیں — اول و آخر چراغ بہ بیں

''شیخ امم'' سے بھی ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

شاہ حسین لاہوری

حضرت شاہ حسین لاہوری کا شمار برِعظیم کے معروف و ممتاز صاحب قال و صاحب حال بزرگوں میں ہوتا ہے۔ شاہ حسین نے اپنی کافیوں کے علاوہ اپنے عشق مجازی اور عشق حقیقی کے واقعات کی صورت میں پنجابی شاعری اور پنجابی تہذیب و ثقافت پر گہرے اور دور رَس اثرات مرتب کیے۔ انہوں نے اپنے جذب و شوق، وجد و حال اور کشف و کرامات کی بدولت غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ شاہ حسین وہ صاحب کمال صوفی شاعر ہیں جنہوں نے پنجابی شاعری کا رُخ عظمتوں اور بلندیوں کی طرف کر دیا۔ اُن کی کافیوں میں وہ سوز و گداز، لطافت اور بانکپن پایا جاتا ہے جو کسی بھی بڑی زبان کا سرمایۂ افتخار قرار دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ شاہ حسین سرخ لباس پہنتے تھے اس لیے لال حسین کے نام سے مشہور ہوئے۔

شیخ حسین لاہوری حضرت میاں میر صاحب کے ہم عصر تھے۔ اُن کی ولادت ۹۵۴ھ/ ۱۵۳۸ء میں ہوئی۔ آپ کے دادا کلس رائے ہندو لاہوری نے سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اسلام قبول کیا اور اُن کے والد عثمان ڈھڈا ایک متقی اور دین دار انسان تھے جو کپڑا بُن کر رزق حلال کماتے تھے اور اُس پر گزر اوقات کرتے تھے۔ بعض مؤرخین نے شاہ حسین کے جد اعلیٰ کا نام کلجس رائے لکھا ہے اور بیان کیا ہے شاہ حسین کا تعلق کائستھ ہندوؤں سے تھا۔ یا یہ کہ اُن کے مورث اعلیٰ ڈاہڈھی راجپوت تھے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ شاہ حسین کے آباء و اجداد کے سلسلے میں یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ وہ نیچی ذات کے افراد تھے جنہوں نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اسلام قبول کیا۔

شاہ حسین سات برس کے ہوئے تو اُن کے والد انہیں لاہور کے نام وَر عالم دین

اور اُستاد شیخ ابوبکر کے پاس لے گئے۔ شاہ حسین نے حافظ شیخ ابوبکر سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ جن دنوں میں شاہ حسین حافظ شیخ ابوبکر کی مسجد میں قران حکیم کا درس لیتے تھے اُن ہی دنوں میں حضرت شیخ بہلول دریائی لاہور تشریف لائے اور انہوں نے اُسی مسجد میں قیام کیا۔ حضرت شیخ بہلول دریائی سلسلہ عالیہ قادریہ کے صاحب کرامت اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ چنانچہ انہوں نے شاہ حسین پر ایسی نگاہِ فیض اثر کی کہ وہ قال سے حال کی طرف مائل ہو گئے۔ روایت ہے کہ شیخ بہلول قادری رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ حسین کو پانی لانے کو کہا۔ اُس زمانے میں دریائے راوی ٹکسالی دروازے کے قریب بہتا تھا۔ شاہ حسین دریائے راوی سے ایک کوزہ پانی بھر کر لائے جس سے حضرت شیخ نے وضو کیا اور دوگانہ تحیتِ وضو ادا کر کے حسین کے حق میں دعا کی کہ یا الٰہی اس بچے کو عارف اور اپنا عاشق بنا دے۔ شیخ بہلول قادری کی دعا قبول ہوئی اور شاہ حسین نے اُن کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ بیعت کے پہلے سال ماہ رمضان آیا تو حضرت شیخ بہلول نے شاہ حسین جو کہ اس وقت صرف بارہ تیرہ برس کے تھے، نماز تراویح کا امام مقرر کر دیا۔ چنانچہ مرشد طریقت کی توجہ اور عنایت سے شاہ حسین نے نماز تراویح میں پورا قرآن مجید سنا دیا، حالانکہ انہوں نے اپنے استاد حافظ شیخ ابوبکر سے قرآن شریف کے صرف چھ پارے حفظ کیے تھے۔

حضرت شیخ بہلول دریائی کچھ عرصے تک اپنے مرید خاص شاہ حسین کی باطنی تربیت کرتے رہے پھر وہ اپنے وطن تشریف لے گئے۔ لیکن اُس وقت تک شاہ حسین طریقت کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے۔ بہرحال مرشد کے لاہور سے چلے جانے کے بعد شاہ حسین چھبیس (۲۶) برس تک مسلسل عبادت و ریاضت اور سخت مجاہدات میں مشغول رہے اور انہوں نے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ مزار پُرانوار پر کئی چلّے کاٹے۔ زندگی کے اس حصے میں شاہ حسین دن کے وقت جنگلوں اور ویرانوں میں یاد الٰہی اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے اور رات کو حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس پر اوراد وظائف میں مشغول رہتے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' تیرھویں جلد (علاقائی ادبیات) کے مقالہ نگار فقیر محمد فقیر شاہ حسین کے احوال و آثار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نام لال حسین اور حسین تخلص کرتے تھے۔ اپنے فقر و غنا کی وجہ

سے شاہ حسین کے نام سے بھی متعارف ہیں۔ حضرت لال حسین نے مسلسل کوششوں سے فہم قرآن، متعلقہ علوم تفسیر، فقہ و حدیث میں کامل دست گاہ حاصل کی۔ مبادیات تصوف سے متعلقہ آگاہی کے بعد ۲۶ سال مسلسل داتا گنج بخش کے مزار پر چلہ کشی کی۔''

عبادات و ریاضت اور مجاہدات کے اس کٹھن اور طویل دور سے گزرنے کے بعد شاہ حسین ایک مرتبہ پھر ظاہری علوم کی تحصیل کی جانب متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنے زمانے کے مشہور عالم دین شیخ سعد اللہ لاہوری سے ''تفسیر مدارک'' کا درس لینا شروع کیا۔ جب ''وما الحیوۃ الدینا الا لعب و لھو'' کی آیت پر پہنچے تو شاہ حسین نے اپنے استاد سے اس آیتِ مبارکہ کے معنیٰ دریافت کیے۔ استاد نے ظاہری معنی بیان کیے تو شاہ حسین نے عرض کیا کہ مجھے قال مطلوب نہیں حال درکار ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاہ حسین پر حالتِ وجد و حال طاری ہوگئی اور وہ رقص کرتے ہوئے بازاروں میں نکل گئے۔

اس طرح شاہ حسین کی زندگی کا ایک حصہ وجد و سماع اور جذب و مستی میں گزرا۔ اسی دوران ایک روز مخدوم الملک قاضیٔ لاہور نے اُنہیں ڈھول کی آواز پر رقص کرتے ہوئے دیکھا اور سزا دینا چاہی، لیکن شاہ حسین نے قاضی صاحب کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور فرمایا کہ اے قاضی! ارکانِ اسلام پانچ ہیں۔ اول کلمہ توحید اور اقرارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو میں اُن میں تیرا شریک ہوں... میں صوم وصلوٰۃ کا تارک ہوں اور حج و زکوٰۃ کا۔ اس لیے تعزیر صرف مجھ پر ہی نہیں تم پر بھی جاری ہونی چاہیے۔ قاضی صاحب شیخ حسین کی بات سنی ان سنی کر کے چل دیے۔

مؤرخین اور تذکرہ نگار شاہ حسین کی شاعرانہ عظمتوں کے قائل اور اُن کی علمی کمالات کے معترف ہیں۔ اُن کے ایک تذکرہ نویس محمد کریم تونسوی اپنے مضمون ''کہے حسین فقیر نماناں'' مطبوعہ مجموعہ ''شاہ حسین'' اشاعت ۱۹۶۷ء میں لکھتے ہیں:

''شاہ حسین وہ صوفی بزرگ تھے جن کا مسلک عشق اور فقط عشق تھا۔ وہ عشق حقیقی میں سراپا گم تھے۔ مادھو لال کی محبت اُسی عشق کی ایک ظاہری صورت تھی اور اسی کوشش میں انہوں نے پنجابی اور ملتانی زبان کو جذبات و احساسات کے اظہار کا ایک ایسا انمول سرمایہ دیا جو ہمیشہ ان کے لیے باعث صد افتخار رہے گا۔ اور جب تک وادی

چناب اور سندھ کی سرزمین میں ان زبانوں کے بولنے والے موجود ہیں، شاہ حسین زندہ ہیں۔ اُن کی یاد دلوں سے بھی محو نہ ہو سکے گی۔''

پنجابی کے دوسرے عظیم المرتبت صوفی شعراء کی طرح شاہ حسین نے برہمنی سازش کی ساختہ و پرداختہ بھگتی تحریک کے خلاف اسلامی فقر کی صدا بلند کی۔ چنانچہ ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' تیرھویں جلد (علاقائی ادبیات) کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی نے لکھا ہے:

''اگر ایک طرف بھگتی کی آواز بلند ہو چکی تھی تو دوسری طرف اُسی جاذبیت کے ساتھ شاہ حسین نے اسلامی فقر کی صدا لگائی جس کی روایت حضرت اویس قرنی اور حضرت خواجہ حسن بصری کے زمانے سے اسلامی معاشرے میں چلی آ رہی تھی۔ چنانچہ بھگتی تحریک کا جواب مسلمان صوفیہ کرام اور صوفی شعراء نے اپنے والہانہ اظہار عشق سے دیا جو قلب و نظر دونوں کے لیے سرشاری کا پیغام لایا اور روح کے لیے تسکین کا باعث ہوا۔ شاہ حسین کے کلام میں سپردگی کی بڑی کیفیت ہے، ابیات سلطان باہو میں توانائی ہے اور بلھے شاہ کی کافیوں میں عرفان کی درخشندہ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں صوفی شعراء کے کلام میں وثوق اور گیرائی بلکہ بے باکی ہے جو شاہ حسین کی سپردگی کا تقابل پیش کرتی ہے۔ دنیائے ادب میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جو اس صفت کے لحاظ سے شاہ حسین کا ہم پلہ ہو۔ وہ اپنی جان و آبرو، اپنا مال و متاع، اپنے دوست اور اپنے رشتہ دار یعنی اپنا سب کچھ اپنے محبوب کے لیے ترک کر دیتے ہیں اور اس پر خوش ہیں۔ یہ سب کچھ دے کر وہ ایک سچے عاشق کی طرح فقط محبوب کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ مگر وہ جس قدر اپنی خودی کو مٹاتے چلے جاتے ہیں اُسی قدر اُن کے محبوب یعنی ذات حقہ کا جلال و کمال آشکارا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اُن کے پُر تاثیر کلام کو پڑھ کر ذات خداوندی کی عظمت و کبریائی کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ اپنے آپ کو مٹا

کر شاہ حسین نے ذات الٰہی کی بقاء کو نمایاں کیا۔ ان کا محبوب اُن کی وجہ سے ایک خاص رفعت و شان کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ شاہ حسین کی شاعری کا یہ خصوصی پہلو ہے جو کسی اور صوفی شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا ــــــ متصوفانہ شاعری میں روح انسانی کو روح کل سے وصال کے لیے بے تاب اور سرگرداں دکھایا جاتا ہے اور اس کے لیے مختلف علامات استعمال کی جاتی ہیں۔ اس لیے شاعری میں روح انسانی کے لیے رادھا اور روح کل کے لیے کرشن کی علامات اختیار کی گئی ہیں۔ ہمارے پنجابی شعراء نے ان تعلیمات کو گوارا نہیں کیا، سوائے اس کے کہ شاہ حسین نے کہیں شیام کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ اسلامی توحید کے علم بردار تھے اور رسول اللہ کی تعلیمات کو یہاں رائج کرنا چاہتے تھے۔ کرشن اور رادھا کو علامت کے طور پر اختیار کیا جاتا تو لوگوں کے ذہن اُن کے ماضی سے الگ نہ ہو پاتے۔ بھگتی تحریک کا بنیادی طور پر مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو ہندو معاشرے میں جذب کر لیا جائے۔ اگر ان علامات کا استعمال جاری رہتا تو مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو نقصان پہنچتا۔"

ڈاکٹر عبدالغنی نے بھگتی تحریک کے بارے میں یہ صحیح لکھا ہے کہ بھگتی تحریک کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو ہندو معاشرے میں جذب کر لیا جائے۔ ہم اس کی وضاحت میں صرف یہ کہیں گے کہ برصغیر پاکستان و ہند میں جب صوفیہ کرام نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا تو ہندو راہنماؤں اور برہمنوں نے بڑی شدت سے یہ محسوس کیا کہ ہندو مت سمیت برصغیر کے چھوٹے بڑے تمام مذاہب میں کوئی ایک مذہب بھی دین اسلام کی زندہ و جان دار اور انقلابی تعلیمات کا مقابلہ کرنے کی طاقت و صلاحیت نہیں رکھتا چنانچہ ہر طرف سے مایوس اور بے بس و لاچار ہو کر انہوں نے اپنی قدیم مذہبی کتابوں میں سے ایک لفظ "بھگتی" نکالا اور اس کے اردگرد محبت و آشتی، انسان دوستی، ہمدردی، رواداری، بھائی چارے ایسے خوبصورت و خوش نما الفاظ کا جال بن کر بھگتی تحریک کی داغ بیل ڈالی جس کے مقاصد میں پہلے مرحلے پر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو روکنا اور

دوسرے مرحلے پر نومسلموں کو ہندومت میں واپس لانا شامل تھا۔

حضرت شاہ حسین لاہوری سے بہت سی کرامات منسوب ہیں۔ اُن کی زبان سے حالت وجد و مستی میں بعض ایسے کلمات بھی ادا ہوئے جو بظاہر شریعت کے خلاف ہوتے ہیں، جیسا کہ شیخ منصور سے ''اناالحق'' اور حضرت بایزید بسطامی سے ''سبحانی ما اعظم شانی'' ان کلمات کو تصوف کی اصطلاح میں شطحیات کہا جاتا ہے۔ اکابر مشائخ نے ان کلمات کو نہ تو رد کیا ہے اور نہ قبول۔ شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی تصنیف ''شطحیات دارا'' میں شاہ حسین کی بعض کرامات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر، شہزادہ سلیم اور شاہی حرم کی خواتین شاہ حسین کی روحانی قوت کے قائل تھے اور اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جہانگیر نے اپنے ایک خاص درباری بہار خان کو اس کام پر مامور کر رکھا تھا کہ وہ ہر وقت شاہ حسین کے ساتھ رہے اور اُن کے ہر قول و فعل کو روزنامچے کی صورت میں لکھ کر روانہ کرے۔ یہ روزنامچہ ''بہاریہ'' کے نام سے موسوم ہے اور اس میں شاہ حسین لاہوری کے بارے میں بہت مفید اور دلچسپ معلومات ملتی ہیں

شاہ حسین فی الحقیقت فقر کی طرف فطری میلان رکھتے تھے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ شروع ہی سے باقاعدگی اور ذوق و شوق کے ساتھ عبادت الٰہی کیا کرتے تھے۔ وہ ذات حق کی تلاش میں تھے، کہتے ہیں:

دل میرے وچ ایہو گزری میں سچے سونہیوں لائیں

حق کی تلاش میں شاہ حسین کا سفر جاری رہا اس دوران میں وہ غور وفکر میں مستغرق رہے اور اپنے سلوک و معرفت کے مراحل کو اپنی کافیوں میں بیان کرتے ہیں۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کی تیرھویں جلد (علاقائی ادب) کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی شاہ حسین کے اس دور کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ تک جو جلوہ انہیں مقصود تھا اس کا نظارہ عام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے درد سے بھری ہوئی کافیاں لکھتے تھے۔ ان میں تلاش کا جذبہ نمایاں ہے، ''نی سیومینوں ڈھول ملے تاں جاپے،'' ''جنگل بیلے پھراں ڈھونڈیندی اجے نہ پایو لال'' وغیرہ۔ ان ایام کی شاعری میں بے حد عجز و نیاز اور درماندگی ہے۔ خدا کو مختلف ناموں سے مخاطب کرتے ہیں۔ سائیں، صاحب، پیارا، ساجن، سانول، رانجھن وغیرہ، مختلف طریقوں سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن بالآخر انہیں وصال نصیب ہو گیا اور وہ طالب سے

مطلوب بن گئے۔

تسیں رل مل دیو مبارکاں میرا سوہنا سجن گھر آیا

اور

رانجھن رانجھن مینوں سب کوئی آکھو ہیر نہ آکھو کوئی

جب وہ فقر کی اس منزل پر پہنچے تو انہوں نے بڑے زور شور سے لوگوں کو اس راستے کی طرف بلانا شروع کیا جو خود اُن کے لیے سعادت کا موجب بنا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا، ''زندگی بڑی قیمتی چیز ہے اسے ضائع نہ کرو، موت کا آنا یقینی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ موت آجائے اور تمہیں کفِ افسوس ملنا پڑے۔'' اُن کی کافیوں میں موت کا بار بار ذکر ہے۔ ترک اعمال کی بھی بڑی تلقین ہے اور وقت کے ضیاع پر اظہارِ افسوس بھی بڑا شدید ہے۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے وہ حلیمی اور نرمی کا درس دیتے ہیں۔ فقیر محمد فقیر لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ حسین پنجابی شاعری میں کافی کے موجد ہیں۔ کافی میں حضرت لال حسین کے کلام کی بنیاد عشق الٰہی اور طلب صادق پر استوار ہے۔ کافیوں میں انہوں نے ملتانی، ہندی اور عربی الفاظ عمدگی اور سلاست سے استعمال کیے ہیں اور مقامی تلمیحات بلکہ گھریلو ماحول کے استعارے ان کے ہاں عام ہیں۔ نیز یہ کافیاں انہوں نے مختلف راگوں اور راگنیوں کے وزن پر کہی ہیں۔ مگر ایک بات جو ان تمام کافیوں میں جاری ہے وہ اُن کی اللہ تعالیٰ سے والہانہ محبت ہے، وہ اس محبت میں سرشار بلکہ مبہوت نظر آتے ہیں اور اسی پر مستزاد اُن کی انکساری اور اُن کا جذبۂ تعبد ہے۔ اُن کی کافیاں جو انہیں صوفیانہ شاعری میں اعلیٰ مقام کا حق دار قرار دیتی ہیں۔ اپنی سرمستی و کیف کی وجہ سے ایک ایسے سرمدی عشق کا پتہ دیتی ہیں جس میں نفسِ انسانی کا شائبہ نظر نہیں آتا۔''

حضرت شاہ حسین لاہوری کے بارے میں یہ امر طے شدہ ہے کہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں وہ پابند صوم صلوٰۃ ہو گئے تھے اور احکام شریعت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اور اسی حالت میں انہوں نے وفات پائی۔ شاہ حسین لاہوری کی روحانی عظمتوں کا اندازہ ان کی بے پناہ شہرت و مقبولیت سے کیا جا سکتا ہے۔ تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق اُن کے مریدوں کی تعداد سوا لاکھ تھی اور اُن کے خادموں میں نو ہزار کامل افراد شامل تھے۔ علاوہ ازیں اُن کے خلفاء میں کئی قابل قدر بزرگانِ دین بھی ملتے ہیں۔

شاہ حسین لاہوری کے خلفائے گرامی میں سے چار خلفاء کا خطاب ''غریب'' چار

خلفاء کا خطاب ''دیوان''، چار خلفاء کا خطاب ''خاکی'' اور چار خلفاء کا خطاب ''بلاول'' تھا۔
پہلا شاہ غریب وزیرآباد سے تین کوس کے فاصلے پر موضع رتی تھٹہ میں اور دوسرے شاہ غریب وزیرآباد کے موضع سنگو والی میں مدفون ہیں۔ تیسرے شاہ غریب دکن کے شہر اچیلا پور میں دفن ہیں، چوتھے شاہ غریب ہزاروی اپنے مرشد کے مزار کے قریب دفن ہیں۔

شاہ حسین کے چار دیوانوں میں سے اُن کے محبوب مرید اور خلیفہ دیوان مادھو اور دیوان گورکھ لاہور میں مدفون ہیں۔ تیسرے خلیفہ اللہ دیوان کی قبر بھی لاہور ہی میں ہے۔ جب کہ چوتھے دیوان بخشی کا مزار بیجا پور میں ہے۔

شیخ حسین کے خلفائے خاکی میں سے پہلا مولا بخش خاکی اور دوسرا خاکی شاہ لاہور میں اپنے مرشد کے مزار کے متصل دفن ہیں۔ تیسرا خاکی شاہ وزیرآباد میں اور چوتھے حیدر بخش خاکی حیدرآباد دکن میں مدفون ہیں۔

شاہ حسین کے چار بلاولوں میں سے اول شاہ رنگ بلاول، دوسرا بدھو بلاول اور تیسرا شاہ مست بلاول لاہور میں اپنے مرشد شاہ حسین کے مزار کے قریب آسودۂ لحد ہیں اور اُن کے چوتھے شاہ بلاول کی قبر حیدرآباد دکن میں ہے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' (علاقائی ادبیات) کے مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

> ''شاہ حسین صاحب حال صوفی تھے اُن کی جو کیفیات ہوتی تھیں سادہ الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔ اپنے کلام میں انہوں نے تکلف داخل ہونے ہی نہیں دیا۔ لیکن ایک تو اُن کی قوت مشاہدہ تیز تھی۔ دوسرے حافظ قرآن تھے اور تفسیر و تصوف کا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ تیسرے انہوں نے فقر کی بڑی منزلیں طے کی تھیں، اس لیے ان کے سادہ الفاظ میں بھی گہرے معانی پائے جاتے ہیں اور اُن کی کافیوں کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عامیانہ الفاظ بھی علامات بن چکے ہیں۔ مثلاً چرخہ سے وہ اپنا وجود مراد لیتے ہیں۔ تانے بانے سے تعلق باللہ، وَپاری سے ملک الموت، بابل کے آنگن سے پیاری محبوب دنیا، ساہورا گھر سے اگلی دنیا، ساہلو سے مقام قرب و رضا

وغیرہ وغیرہ۔ اُن کی مثالیں اور استعارے وہ ہیں جو لاہور کے قرب و جوار سے متعلق ہیں اور مرئی اور مجسم ہیں۔ مثلاً گڈی (پتنگ)، بوھڑ (بڑ کا درخت) بھور (بھنورا)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تخیل سے کام لیتے ہوئے بھی اُن کے قدم زمین پر قائم رہے ہیں۔ اسی لیے وہ واضح تصورات پیش کرتے ہیں اور پھر ان کی کافیاں مختلف راگوں سے تعلق رکھتی ہیں۔''

ایک شاعر کی حیثیت سے شاہ حسین کا شمار پنجابی زبان کے صفِ اول کے شعراء میں ہوتا ہے اور اُن کا کلام آج بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ سنا جاتا ہے۔ مشاہیر کے علاوہ اکابر مشائخ نے حضرت شاہ حسین لاہوری کے روحانی کمالات اور اُن کی شاعرانہ عظمتوں کو تسلیم کیا ہے۔ اور اُن کی خدمت میں شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز حضرت شیخ محمد طاہر لاہوری (متوفی ۱۰۴۰ھ) کہا کرتے تھے کہ اگر مجھے علمائے ظاہر کے طعنوں کا خدشہ نہ ہوتا تو میں حضرت شاہ حسین کے مزار پر جا کر استمداد کرتا۔

حضرت شاہ حسین لاہوری کو اُن کے روحانی کمالات اور اُن کے عارفانہ کلام کی بدولت پنجاب کی تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی میں بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ ہر شخص اُن کے نام سے آشنا ہے۔ گھر گھر میں اُن کی کافیاں گائی جاتی ہیں۔ حضرت شاہ حسین لاہوری کی کافیوں کے سوز و گداز کی اپنی ایک خاص تاثیر ہے جب کہ اُن کی زبان بڑی صاف اور اُن کا اسلوب بڑا موثر و دل نشین ہے، ملاحظہ ہو:

	ترجمہ
درد وچھوڑے دا حال نی میں کینوں آکھاں	اپنے فراق کے درد کا حال میں کسے سناؤں
سولاں مار دیوانی کیتی برہوں پیا خیال	ان دکھوں نے مجھے دیوانہ کر دیا
نی میں کینوں آکھاں	فراق کے خیال نے مجھ پر تسلط جمالیا
	میں اپنا حال کسے سناؤں
جنگل بیلے پھراں ڈھونڈیندی اجے نہ آیا مہینوال	میں جنگل جنگل آوارہ پھرتی ہوں
نی میں کینوں آکھاں	میرا مہینوال ابھی تک نہیں آیا
	میں اپنا حال کسے سناؤں
دُھنجن دھوئیں شاہاں والے جاں پھولاں تاں لال	سلگتی آگ سے سیاہ دھواں اٹھ رہا ہے
نی میں کینوں آکھاں	جب بھی اس کو کریدتی ہوں

کہے حسین فقیر ربانا ویکھ نمانیاں دا حال	دہکتے ہوئے سرخ کوئلے نظر آتے ہیں
نی میں کینوں آ کھاں	خدا کا فقیر حسین کہتا ہے
	بے کسوں کے حال پر رحم
	میں اپنا حال کسے سناؤں

شاہ حسین اور اُن کی شاعری پر تحقیق کرنے والوں نے یہ لکھا ہے کہ شاہ حسین نے عشاق میں سے صرف ''رانجھے'' کا نام لیا ہے۔ وہ اپنے مرشد کے علاوہ کسی اور صوفی کا ذکر بھی نہیں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر لاجونتی نے اپنے تحقیقی مقالے ''پنجابی صوفی شاعر'' (**Punjabi Sufi Poets**) میں لکھا ہے کہ ''میں نے قوالوں کی زبانی شاہ حسین کی ایک کافی سنی جس میں مہینوال کا لفظ تھا، لیکن ڈاکٹر لاجونتی نے خود تسلیم کیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطے کافی میں مہینوال کا یہ لفظ نہیں رکھتے۔ یہ کافی نمبر ۱۰۵ ہے جو مجلس شاہ حسین کے مجموعہ ''کافیاں شاہ حسین'' میں موجود ہے اور جس مصرعے میں ڈاکٹر لاجونتی نے لفظ مہینوال سنا وہ مصرعہ یوں درج ہے ۔

''جنگل بیلے پھراں ڈھونڈیندی اجے نہ پایو لال''

ہم نے شاہ حسین کی یہ کافی ''پنجابی ادب'' سے لی ہے جس کے مرتب پروفیسر محمد سردر ہیں اور اسے ''ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی'' نے چھاپا ہے اور اس میں لفظ ''مہینوال'' موجود ہے۔

ہر سال موسم بہار میں لاہور شہر کے دو بڑے میلے حضرت شاہ حسین کے مزار گوہر بار پر منعقد ہوتے ہیں۔ ایک میلہ بسنت کے موقع پر اور دوسرا مارچ کے آخری ہفتے میں جسے ''میلہ چراغاں'' کہا جاتا ہے۔ ان میلوں میں پنجاب کے ہر علاقے سے شیخ حسین لاہوری کے ہزاروں معتقدین شریک ہوتے ہیں۔

پنجابی زبان کے عظیم المرتبت اور منفرد و ممتاز صوفی شاعر اور عارف باللہ حضرت شاہ حسین لاہوری نے لاہور ہی میں ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں وفات پائی۔

خواجہ محمد باقی باللہ

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کا شمار برصغیر پاکستان و ہند کی بلند مرتبت دینی و روحانی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے برصغیر میں اسلامی علوم کی نشر و اشاعت اور خواص و عوام کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت میں شاندار اور ناقابلِ فراموش کردار انجام دیا۔

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ ۵ ذی الحجہ ۹۷۱ھ، ۱۵ جولائی ۱۵۶۴ء کو بمقام کابل پیدا ہوئے۔ اسم مبارک محمدؐ اور لقب رضی الدین تھا۔ لیکن زیادہ تر باقی باللہ، محمد باقی باللہ اور عبدالباقی کے نام سے دنیائے اسلام میں مشہور ہیں۔

خواجہ محمد باقی باللہ کے والد ماجد قاضی عبدالسلام اپنے زمانے کے معروف علماء میں سے تھے۔ فقہ و حدیث میں مرتبۂ کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے اپنے ہونہار بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے ملا صادق حلوائی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے بہت جلد مروّجہ علوم میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ پھر تزکیہ نفس کی طرف توجہ کی اور خواجہ عبیداللہ احرار، حضرت شیخ افتخار اور امیر عبداللہ بلخی کی صحبت میں رہ کر اعلیٰ روحانی مدارج طے کئے۔ آپ نے عنفوانِ شباب میں ہی کشمیر جا کر شیخ بابا ولی سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔ اس طرح سنبھل، لودھیانہ، گڑھ مکتسر، سرہند اور دہلی میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد بالآخر شیخ قطب العالم کے کشف کے مطابق بخارا پہنچے اور ماوراء النہر کی معروف و ممتاز روحانی شخصیت مولانا خواجگی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند روز کی صحبت کے بعد خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ مولانا خواجگی نے نقشبندی سلسلے میں تعلیم دی اور برصغیر واپسی کا حکم دیا۔

اپنے عہد میں مسلمانوں میں ذہنی و فکری وحدت و یگانگت پیدا کر کے انہیں ایک

دینی و روحانی طاقت بنا دینا حضرت خواجہ کا ایک دینی کرشمہ ہے جو صرف صوفیہ کرام اور اولیاء کرام ہی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ سنتِ نبویؐ کا احیاء اور بدعات کا خاتمہ ان کا دوسرا عظیم کارنامہ ہے۔ خواجہ محمد باقی باللہ کے دینی مرتبہ و مقام اور ان کے علمی و روحانی کمالات کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی اور مولانا عبدالحق محدث دہلوی ایسی معجز نما شخصیات ان کے مرید و خلفاء میں سے تھے اور اراکین سلطنت میں بخشی الملک نواب مرتضیٰ خاں، امیر الامراء عبدالرحیم خان خاناں، گورنر دکن، قلیج خان، گورنر پنجاب خان اعظم مرزا کوکہ اور صدر جہاں صدر الصدور و خواجہ حسام الدین ان کے زمرۂ معتقدین میں شامل تھے۔ حنفی المذہب تھے اور سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے اکابر مشائخ میں سے تھے۔

مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے حضرت خواجہ کی خدمت میں شاندار الفاظ اور مؤثر انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ شیخ محمد اکرام اور خلیق احمد نظامی نے حضرت خواجہ کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر قلم اٹھایا ہے اور حضرت خواجہ کی حیات و تعلیمات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مولوی فقیر محمد ''حدائق الحنفیہ'' میں حضرت خواجہ کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خواجہ محمد باقی نقشبندی دہلوی اپنے وقت کے امام اور مقتدائے زمانہ، جامع کمالات ظاہری و باطنی، زاہد، متقی اور اوصافِ کریمہ سے آراستہ تھے۔ اوائل میں کابل سے سمرقند میں گئے اور علوم فقہ و حدیث اور تفسیر وغیرہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد خواجہ امکنگی، خلیفہ خواجہ عبید اللہ احرار کے مرید ہوئے اور ان سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے دہلی میں آئے اور تدریس و تلقینِ خلائق میں مصروف ہو کر صاحبِ تصانیف ہوئے۔ آپ نہایت کم گو و کم خور اور کم خواب تھے۔ نمازِ عشاء کے بعد تہجد تک دو مرتبہ قرآن شریف ختم کرتے تھے۔ پھر تہجد کی نماز کے بعد فجر تک ۲۱ مرتبہ سورہ یاسین پڑھا کرتے تھے۔''

ماوراء النہر سے واپسی کے بعد حضرت خواجہ پہلے لاہور تشریف لائے۔ جیسا کہ تذکرہ نگار محمد غوثی ماندوی نے ''گلزارِ ابرار'' میں لکھا ہے کہ کتابی علم کی تحصیل کے بعد ہندوستان کا رُخ کیا۔ جب آپ دارالسلطنت لاہور میں پہنچے تو شیخ فرید بخاری (یعنی نواب مرتضیٰ خان) اکبر بادشاہ کے بخشی بیگی جو نہایت غریب دوست شخص تھے، انہوں نے آپ کے

روزینہ مصارف کی ذمہ داری اپنے اوپر لازم کر لی۔ شیخ محمد اکرام نے ''رودِ کوثر'' میں لکھا ہے کہ ''گلزار ابرار'' کی اس عبارت میں اس انتظام کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت شیخ فرید نے آپ کی خانقاہ کے اخراجات اپنے ذمہ لئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر اپنے درباریوں سمیت لاہور میں مقیم تھا... شیخ محمد اکرام نے ''اکبر نامہ'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ اکبر نے ۱۵۸۵ء سے لے کر ۱۵۹۸ء تک لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنائے رکھا۔ اسی دوران شمالی ہندوستان میں عظیم قحط پڑا جس میں قحط زدگان کی امداد اور غربا میں روپیہ اور اشیائے ضرورت کی تقسیم کا کام شیخ فرید کے سپرد تھا۔ قحط کے خاتمے کے بعد اکبر اپنے درباریوں سمیت ۶ نومبر ۱۵۹۸ء کو آگرے کی طرف روانہ ہوا۔ اکبر کے لاہور میں قیام کے آخری دو سال اس لئے اہم ہیں کہ اس دوران میں ابوالفضل کا ستارہ گردش میں آ گیا اور شیخ فرید کا ملکی معاملات میں عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ مئی ۱۵۹۷ء میں ابوالفضل کی یہ حالت تھی کہ اس نے دربار جانا ترک کر دیا۔ بلکہ خودکشی یا خانہ بدوشی کے ارادے بھی اس کے ذہن میں آئے۔ پھر جنوری ۱۵۹۹ء میں اس کے مخالفوں نے اسے دکن بھجوا دیا جہاں سے اسے آگرے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ نے دہلی میں مسندِ وعظ وارشاد قائم کی تو ان کے فضل و کمال اور ان کی روحانیت کا شہرہ عام ہو گیا اور دور ونزدیک سے طالبان حق آ کر فیض یاب ہونے لگے۔ شیخ محمد اکرام نے ''حضرات القدس'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولانا یوسف، شیخ نور محمد پٹنی اور مولانا عبدالہادی بدایونی پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ذکر وغیرہ کی تعلیم کے بعد تکمیل کے لئے حضرت مجدد کی خدمت میں بھیجے گئے۔ خواجہ محمد صدیق کشمی، بدخشاں کے قریب کشم کے رہنے والے تھے۔ عنفوانِ شباب میں ہندوستان آئے اور محب الفقراء عبدالرحیم خانِ خاناں کی صحبت اختیار کی۔ پھر حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے ذکر سیکھا۔ زبدۃ المقامات میں حضرت مجدد کے کئی دوسرے خلفائے کبار کے حالات درج ہیں جنہیں حضرت خواجہ باقی باللہ نے سرہند بھیجا یا جنہوں نے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کے لئے دہلی کا قصد کیا اور ان کی وفات کی بناء پر حضرت مجدد کی خدمت میں پہنچے، مثلاً شیخ طاہر بدخشی، مولانا یوسف سمرقندی، مولانا قاسم علی اور مولانا عبدالواحد لاہوری۔ طبقات شاہجہانی کے حوالے سے شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ سید مصطفےٰ باغیت جنہوں نے مدتوں بزرگوں کی مسندِ مشیخت پر بیٹھ

کر سجادہ نشینی کی لیکن جب خواجہ باقی باللہ کی ارشاد و ہدایت کا شہرہ سنا تو سب کچھ چھوڑ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلسلۂ نقشبندیہ میں ان سے بیعت کی۔ ''طبقاتِ شاہجہانی'' میں حضرت خواجہ کے بعض ایسے مریدوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کا ان کی سوانح عمری اور نقشبندیہ تذکروں میں ذکر نہیں۔ مثلاً شیخ احمد بکری، شیخ مرتضیٰ سنبھلی، شیخ نعمت اللہ جونپوری، شیخ نور الحق بن مولانا عبدالحق۔''

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی'' میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ''رسالہ وصیت میں شیخ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں کہ ''جب ہندوستان واپس آیا تو خواجہ محمد باقی نقشبندی کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، عرصہ تک طریقہ خواجگان کی مشق کی اور ذکر، مراقبہ، رابطہ، حضور اور یادداشت کی تعلیم حاصل کی۔''

''کلمات الصادقین'' کے حوالے سے خلیق نظامی نے لکھا ہے کہ ''شیخ محدث'' نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے روحانی اشارے پر حضرت خواجہ باقی باللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔ اگر سولہویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی کے شروع کی مذہبی اور روحانی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی ذاتِ گرامی احیاء سنت اور اماتتِ بدعت کی تمام تحریکوں کا منبع و مخرج تھی۔ ان کے ملفوظات و مکتوبات کا ایک ایک حرف ان کی مجددانہ مساعی، بلندیِ فکر و نظر کا شاہد ہے۔ شیخ عبدالحق نے جب احیاء علوم الدین کا بیڑا اٹھایا تو حضرت باقی باللہ کا آفتاب ارشاد نصف النہار پر تھا۔''

خلیق نظامی مزید لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے خواجہ باقی باللہ کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہو کر بہت کچھ حاصل کیا۔ ''کتاب المکاتب والرسائل'' میں مختلف اہم موضوعات پر سات خطوط ہیں جو شیخ محدث نے مرشد کے نام لکھے ہیں۔ یہ مکتوب مستقل رسائل کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے شیخ محدث کی اپنے مرشد سے عقیدت اور اس زمانے کے حالات پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ شیخ محدث نے بعض اہم وقتی مسائل پر ان سے گفتگو کی اور ان کی رہنمائی چاہی ہے۔ لیکن یہ تمام خطوط نہایت حزم و احتیاط سے لکھے گئے ہیں۔ اس لئے پہلی نظر میں ان کا سمجھنا مشکل ہے۔ جتنا ان کے الفاظ پر غور کیا جاتا ہے

اسی قدر شیخ کا مفہوم صاف ہوتا جاتا ہے اور ''ستر و کتمان'' کے پردے اٹھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اخیر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان خطوط کو لکھنے والا مذہبی انتشار پر خون کے آنسو رو رہا ہے... خواجہ باقی باللہ نے شیخ محدث سے ایک مرتبہ رسالہ ''فقرِ محمدی'' کے مصنف شیخ احمد بن ابراہیم واسطی اور اس رسالے کے مضمون کے متعلق دریافت کیا۔ شیخ محدث نے ان کے استفسار کے جواب میں جو کچھ لکھا وہ ہندوستان کے حالات پر ایک بصیرت افروز تبصرہ تھا۔ پردے پردے میں انہوں نے عہد اکبری کے سب فتنوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور اپنے پریشان دل کی دھڑکن کو اپنے پیر و مرشد کے کانوں تک پہنچا دیا ہے۔ شیخ محدث ایک مکتوب میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں ''ہمارے شہر میں اس نسبت (نقشبندیہ) کے داعی اور مرشد شیخ العارف الکامل، سر اللہ الاعظم و نور الاتم سیدنا و مولانا خواجہ محمد الباقی قدس سرہٗ تھے۔ وہ اس طریقے میں ہمارے مشائخ میں ہیں، اللہ ان کو جزائے خیر دے۔''

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے روحانی سلاسل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کو سلسلۂ قادریہ، چشتیہ، شاذلیہ، مدنیہ اور نقشبندیہ کی خدمت ملی تھی۔ لیکن ان کا قلبی اور حقیقی تعلق سلسلۂ قادریہ سے تھا۔ ان کی عقیدت و ارادت کا مرکز حضرت غوث الاعظم شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ وہ بعض وقتی ضروریات اور ماحول کے اثرات کی بناء پر دوسرے خانوادوں کے بزرگوں سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن ان کے دل و دماغ کا ریشہ ریشہ شیخ جیلانیؒ کے عشق میں گرفتار تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حضرت خواجہ باقی باللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے روحانی اشارے پر کی تھی۔

شیخ محمد اکرام ''رودِ کوثر'' میں حضرت خواجہ باقی باللہ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ جب آپ لاہور سے دہلی تشریف لائے تو قلعہ فیروزی میں قیام فرمایا اور ہدایت خلق میں مشغول ہوئے۔ یہاں آپ کو بڑا عروج ہوا۔ مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث جیسی ہستیاں آپ کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوئیں لیکن آپ نے کم عمری میں وفات پائی۔ دہلی میں آپ کا قیام تین چار سال سے زیادہ نہیں رہا... لیکن حضرت خواجہ کی ہمت اور کارشناسی کی داد دینی چاہئے کہ اگرچہ ہندوستان میں آپ کو زیادہ عرصے تک رہنا نصیب

نہیں ہوا اور اس عرصے میں بھی طبیعت نحیف ہی رہی، لیکن اس قلیل عرصے میں انہوں نے نقشبندیہ سلسلے کی بنیاد مستحکم طریقے سے اس ملک میں رکھ دی۔ خوش قسمتی سے ایک تو ''مرید'' حضرت مجدد الف ثانی جیسا میسر آیا جس کے فیض سے اس سلسلے کا مستحکم ہو جانا لازمی تھا۔ لیکن ان کے علاوہ آپ نے دوسرے کئی ایسے بزرگوں کو متاثر کیا جن کے ذریعے سے نہ صرف اس سلسلے کی بقاء کا سامان ہوا بلکہ ملک میں اسلام کو تقویت ہوئی اور جو پراگندگی اکبری بے اعتدالیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی اس کا ازالہ ہوا۔

شیخ محمد اکرام مزید لکھتے ہیں کہ خواجہ عبید اللہ احرار کا اصول تھا کہ بادشاہوں اور امیروں کا قرب ترک کرنے کی بجائے ان سے ربط بڑھاتے اور انہیں مسخر کر کے اسلام کی رونق اور مسلمانوں کے آرام کا انتظام کرتے۔ خواجہ محمد باقی باللہؒ اس اصول اور اس اصول کی مصلحت سے خوب واقف تھے۔ اور جب وہ ہندوستان تشریف لائے تو اس اصول پر عمل کرنے کی ضرورت خاص طور پر تھی۔ اکبری بدعتوں نے اگرچہ عام مسلمانوں کو متاثر نہ کیا تھا لیکن اونچے طبقوں میں جو دربار سے قریب تھے، خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں اس لئے اس طبقے کو اسلام سے قریب لانے کی بڑی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے ادھر خاص طور پر دھیان رکھا اور خدا نے ان کی کوششوں میں بڑی برکت دی... نواب مرتضٰی خان سمیت طبقہ امراء میں ان کے کئی معتقد تھے جو انہیں زر و سیم بھیجتے رہتے اور حضرت خواجہ اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ ان امرائے مخلص میں عبدالرحیم خانخاناں بھی تھا جس نے یہ سن کر حضرت خواجہ کو حج پر جانے کی خواہش ہے، ان کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ بھجوایا۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس طرح دوسروں سے پیسے لے کر حج پر جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

قلیچ خان عہدِ اکبری کا ایک سربرآوردہ سردار تھا۔ اکبر کے آخری ایام میں کئی سال تک پنجاب کا گورنر رہا، وہ ایک بہادر، شجاع متدین اسلام کا درد رکھنے والے مسلمان تھا۔ لاہور کی گورنری کے دوران ہر روز مدرسہ میں جا کر تین گھنٹے تک فقہ، حدیث اور تفسیر کا درس دیتا تھا اور علوم شرعی کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے تذکروں میں تو قلیچ خان کا کہیں ذکر نہیں لیکن حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے پتا چلتا ہے کہ اس امیر کے تعلقات بھی حضرت خواجہ باقی باللہ سے بڑے گہرے تھے۔ چونکہ اس کی گورنری کے زمانے میں حضرت خواجہ ایک سال سے زیادہ لاہور میں مقیم

رہے... حضرت مجدد الف ثانی کا قلیچ خان سے تعارف نہیں لیکن اسے ایک سفارشی خط لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ میرے مرشد اور آپ کے درمیان بڑی گہری محبت تھی اس لئے آپ کو یہ چند سطور لکھنے کی جرات کر رہا ہوں۔

آخر میں شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ خواجہ باقی باللہ کے متعلق منتشر اور نامکمل اندراجات بھی دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ان کے عقیدت مند امراء میں بخشی الملک شیخ فرید، قلیچ خان حاکم پنجاب، خان اعظم مرزا کوکہ، امیر الامراء مرزا عبدالرحیم خانخاناں سپہ سالار دکن، صدر جہاں صدر الصدور اور ابو الفضل کا بہنوئی خواجہ حسام الدین شامل تھے۔ علماء میں شیخ عبدالحق محدث کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور حضرت مجدد الف ثانی تو ان کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اگر یہ بات دھیان میں رکھیں کہ یہی وہ مبارک ہستیاں تھیں جنہوں نے اکبری خیالات کا قلع قمع کیا تو حضرت خواجہ باقی باللہ کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان بزرگوں کے درمیان رشتہ تسبیح کی حیثیت رکھتے تھے...

حضرت خواجہ کی زندگی میں بہرکیف حضرت مجدد کی حیثیت ثانوی تھی۔ مرشد کی وفات کو دو سال نہ ہوئے تھے کہ اکبر مر گیا اور جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس دوران میں آپ (حضرت مجدد) کے پیر بھائیوں سے اختلافات رونما ہوئے اور آپ سرہند میں مقیم ہو گئے۔ اکبر کے طور طریقے یقیناً ناپسندیدہ تھے اور رسالہ ''اثبات النبوت'' معاصرانہ خیالات کی اصلاح کے لیے لکھا گیا، لیکن اس ایک رسالہ سے (جس کے فقط ناتمام مخطوطے ملتے ہیں اور جو بظاہر کبھی مکمل نہ ہوا) اکبری خیالات کا کس طرح قلع قمع ہو سکتا تھا——

مولانا ابوالکلام آزاد (اور مجددی تذکرہ نگاروں) کے بیان کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے تمام صورت حالات کو ذہن میں رکھنے کی بجائے حضرت خواجہ باقی باللہ کے چند ارشادات سے جو انہوں نے اپنے بلند مرتبہ مرید کی تعریف میں کہے، مرشد کے کام کی اہمیت کو کم کرنا چاہا ہے۔ مولانا (ابوالکلام) لکھتے ہیں ''اصحاب طریقت میں حضرت خواجہ باقی باللہ جیسے عارفِ کامل خود دہلی میں بعہد اکبری مقیم رہے لیکن وہ خود کہتے تھے کہ 'میں چراغ نہیں ''چقماق'' ہوں۔ آگ نکال دوں گا۔ چراغ شیخ احمد سرہندی ہیں۔'' حضرت خواجہ کا کوئی بیان بدیں الفاظِ خاص ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن حضرت کا طریقہ درویشی اور انتہائی مسکنت کا تھا۔ وہ شیخ عبدالحق محدث سے بھی اسی طرح برتاؤ کرتے تھے گویا وہ استاد ہیں اور حضرت خواجہ شاگرد۔ حضرت مجدد کے تو وہ خاص طور پر

قدر دان تھے اور ان کی تو انہوں نے دل کھول کر تعریف کی ہے جس سے مجددی تذکرہ نگاروں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے غلط نتائج اخذ کر لیے لیکن صحیح صحیح حالات کو جاننے کے لیے فقط حضرت خواجہ کے مدحیہ ارشادات پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت مجدد کے اُن بیانات کو بھی دیکھنا چاہیے جو انہوں نے ''مبداء و معاد'' میں اور دوسری جگہ مرشد کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھے ہیں —— اور بالخصوص وہ مکاتیب ملحوظ خاطر رہنے چاہئیں جو انہوں نے حضرت خواجہ کو لکھے۔ ان کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان مرشد اور سعادت مند مرید کا رشتہ تھا۔ حضرت مجدد اپنے مقاماتِ عروج کا ذکر کرتے ہیں اور بار بار لکھتے ہیں کہ یہ سب آپ کا فیض ہے ورنہ ''من ہماں احمدِ پارینہ کہ ہستم، ہستم!''

شیخ محمد اکرام نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی شخصیت اور ان کے دینی و تجدیدی کارناموں پر کافی تحقیق کی ہے۔ ''رودِ کوثر'' میں ان کے احوال بیس سے زائد صفحات پر بیان کئے ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت خواجہ کا یہ قول کہ ''اے اللہ! تو مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور مسکین ہی مار اور مسکینوں کے گروہ میں اٹھا، نقل کر کے لکھتے ہیں کہ فروتنی اور کسر نفسی ان کی رگ رگ میں تھی۔ انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی کی اتنی تعریف کی ہے کہ بعض کوتاہ فہم سخت غلطی بلکہ بے انصافی اور بے ادبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں... حضرت خواجہ باقی باللہ ہمیشہ اپنے واقعات اور روحانی مدارج کو چھپاتے اور انتہائی روحانی سربلندیوں پر پہنچ کر بھی ان کی عالی ظرفی ''ھل من مزید'' کا نعرہ لگاتی۔ ان کے سب سے قدیم تذکرے میں ان کی جس خصوصیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ ''سترِ احوال'' اور ''غایت انکسار'' ہے... شیخ محمد اکرام تحقیق کے مطابق حضرت خواجہ باقی باللہ کو علمی دنیا میں وہ پایہ حاصل نہیں جو آپ کے ایک معتقد شیخ عبدالحق کو میسر تھا اور نہ ہی آپ کو اپنے دوسرے جلیل القدر مرید حضرت مجدد کا زورِ قلم نصیب ہوا، لیکن جہاں تک اصل کام، یعنی ارشاد و ہدایت کا تعلق ہے آپ اپنے زمانے میں منفرد تھے اور ہندوستان کی تاریخ تصوف میں آپ کی جگہ حضرت خواجہ بزرگ، حضرت سلطان المشائخ اور حضرت مجدد کے ساتھ ساتھ ہے۔

حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ نے چالیس برس کی عمر میں ۲۶ جمادی الثانی ۱۰۱۲ھ، ۳۰ دسمبر ۱۶۰۳ء کو وفات پائی۔ ''فخر اسلام'' تاریخ وفات ہے۔ حضرت خواجہ کا مزار دہلی میں زیارت گاہِ عام ہے۔

میر معصوم بھکری

میر معصوم بھکری کا شمار مغلیہ عہد کے نامور امراء اور قابلِ قدر علماء میں ہوتا ہے۔ وہ انتہائی نیک و پارسا، بہادر و شجاع اور صاحب جود وسخا انسان تھے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی فہم و فراست، مضبوط قوتِ ارادی، اور حسنِ کارکردگی کی بدولت بہت جلد ترقی کے مراحل طے کئے اور مغل حکمرانوں کا تقرب و اعتبار حاصل کر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ شہنشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں شاہی ملازمت اختیار کی اور شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں اپنے اقتدار اور شہرت کے نقطۂ عروج پر پہنچ گئے۔

میر معصوم کے آباء و اجداد کا تعلق ترمذ کے مشہور سادات خاندان سے تھا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ ترمذ سے ہجرت کر کے قندھار میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ جہاں میر معصوم کے بزرگ دیگر سادات کی شراکت و تعاون سے نامور روحانی شخصیت بابا شیر قلندر کے مقبرے کی تولیت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ میر معصوم نظم و نثر دونوں اصنافِ ادب پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور نامی تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام میر سید صفائی تھا۔ اس وجہ سے میر معصوم کو سید صفائی بھی کہتے ہیں۔ ان کے والد بھکر میں آ گئے۔ حاکم سلطان نے ان کی بہت پذیرائی کی اور اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا تو ان کے والد نے بھکر ہی میں مستقل اقامت اختیار کر لی اور سیوستان کے کھابروت سادات میں شادی کر لی۔ چنانچہ میر معصوم اور ان کے دو بھائی بھکر ہی میں پیدا ہوئے۔

''تاریخ سندھ'' مؤلفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی کے مطابق میر سید صفائی ۸۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ سلطان محمود خان کے عہدِ حکومت میں بھکر آئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے سیوہن کے نواحی موضع کھاہروٹ کے سادات میں شادی کر لی۔

عہدِ اکبر کا مشہور مؤرخ میر معصوم اور ان کے دو بھائی شہر بھکر میں پیدا ہوئے۔ میر سید صفائی ایک تبحر عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ سلطان محمود خان نے ان کے علم و فضل کی قدر کرتے ہوئے انہیں بھکر کے ''شیخ الاسلام'' کے عہدہ پر مامور کیا۔ انہوں نے ۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ء میں وفات پائی۔

میر معصوم بھکری نے اپنے عہد کے معروف اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا۔ اُن کے اساتذہ میں قاضی دتہ سیوستانی بن مخدوم راھو بھی شامل تھے جو حدیث اور تفسیر کے فاضل تھے۔ میرزا شاہ حسن نے بھی قاضی دتہ سیوستانی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا اور وہ اُن کی بے حد تعظیم و توقیر کرتا تھا اور انہیں اُس نے مخدوم اور استاد کا لقب دیا تھا۔ وہ انہیں علم میں امام جاراللہ زمخشری کہا کرتا تھا۔ میر معصوم بھی اُن کے تلامذہ میں سے تھے۔

میر معصوم کو آغاز جوانی میں سیر و شکار کا شوق تھا، اس لئے ان کا زیادہ تر وقت سیر و سیاحت اور شکار میں گزرتا تھا۔ چونکہ کوئی مستقل ذریعہ آمدن نہ تھا اس لئے انہیں غربت و افلاس نے آن لیا اور ان کا ذہنی اطمینان و سکون تباہ کر دیا تو وہ بے سرو سامانی کے عالم میں پیدل ہی گجرات کی جانب چل نکلے۔ جہاں ان کے دوست اور ہم مکتب شیخ اسحٰق فاروقی بھکری سکونت پذیر تھے اور گجرات کے دیوان خواجہ نظام الدین احمد ہروی کی سرکار میں صاحبِ اختیار تھے۔ چنانچہ شیخ اسحاق فاروقی نے میر معصوم کی ملاقات خواجہ نظام الدین ہروی سے کرادی۔

شیخ اسحاق بھکری کے بارے میں مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ''تاریخ سندھ'' کی جلد دوم میں لکھا ہے کہ مُلّا شیخ اسحاق بھکری ابتدا سلطان محمود خان بھکری کی ملازمت میں منسلک تھے اور آخر میں مرزا غازی وقاری کے ملازم مقرر ہوئے۔ سید حسام الدین راشدی نے لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود خان بکھری کی وفات کے بعد گجرات چلے گئے۔ اس وقت گجرات میں خواجہ نظام الدین ہروی صاحب طبقات اکبری دیوان اور بخشی تھے۔ یہ ان سے وابستہ ہو کر ان کے وکیل مطلق العنان بن گئے۔ میر معصوم بھکری اپنے دیرینہ مراسم کی بناء پر ان کے پاس گجرات چلے گئے۔ جس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

خواجہ نظام الدین ہروی ان دنوں میں ''طبقات اکبری'' مرتب کر رہے تھے۔ انہوں نے میر معصوم کے علم و فضل بالخصوص ان کی وسیع معلومات اور علم تاریخ سے گہری دلچسپی

سے متأثر ہو کر انہیں ''طبقاتِ اکبری'' کی ترتیب و تالیف میں اپنا مددگار و معاون بنا لیا۔ چنانچہ میر معصوم نے ''طبقاتِ اکبری'' کو مرتب کرنے میں خواجہ نظام الدین کا ساتھ دیا۔ خواجہ نظام الدین نے اپنی کتاب ''طبقات اکبری'' میں میر معصوم کی شرکت اور مصاحبت کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں میر معصوم بھکری گجرات ہی میں شہاب الدین احمد خان سے وابستہ ہو کر صاحبِ منصب ہو گئے۔

مولانا اعجاز الحق نے ''ذخیرۃ الخوانین'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ اسحاق فاروقی اور شیخ فرید بھکری، مؤلف ''ذخیرۃ الخوانین'' دونوں گجرات کے دیوان اور بخشی خواجہ نظام الدین ہروی کے مطلق العنان وکیل تھے۔ میر معصوم بھکری کو شیخ اسحاق کی محبت کھینچ کر گجرات لائی کہ دونوں نے بھکر میں یک جا تعلیم پائی تھی۔ شیخ اسحاق نے میر معصوم کی گجرات میں تشریف آوری کو غنیمت سمجھ کر صوبے دار گجرات شہاب الدین احمد خان نیشا پوری سے سفارش کر کے دیوانی کی خدمت دلائی اور منصب مقرر کرایا۔

شیخ اسحاق اور میر معصوم بھکری نے خواجہ نظام الدین ہروی کو ان کی گراں بہا کتاب ''طبقات اکبری'' کی تالیف میں بھی مدد دی۔ ۹۹۸ھ۔۱۵۸۹ء میں خواجہ نظام الدین ہروی کی تعیناتی لاہور میں ہوگئی تو غالباً شیخ اسحاق بھی ان کے ساتھ لاہور آ گئے۔ ترخانی دور کا مشہور مؤرخ سید طاہر محمد نسیانی مؤلف ''تاریخ طاہری'' بھی شیخ اسحاق کے شاگردوں میں ہے۔ شیخ اسحاق نے میر معصوم کی رحلت کے دو تین سال بعد وفات پائی۔

''مآثر الامراء'' کے مطابق جن دنوں میں میر معصوم گجرات کے صوبہ دار شہاب الدین کی ملازمت میں تھے تو رفتہ رفتہ ان کی ذہانت و شجاعت کی شہرت عام ہوئی اور انہوں نے اکبر بادشاہ کی خدمت میں روشناسی کا اعزاز حاصل کر لیا۔ چنانچہ چالیسویں سال جلوس اکبری میں وہ ڈھائی سو کے منصب پر فائز ہوئے اور انہوں نے اپنی فہم و فراست، فرض شناسی اور اعلیٰ کارکردگی کے باعث اکبر بادشاہ کی قربت اور اعتماد حاصل کر لیا۔ حتیٰ کہ بادشاہ نے ان کو ایران کی سفارت پر مامور کر دیا۔ ایران کا فرمانروا شاہ عباس صفوی بھی میر معصوم بھکری کی لیاقت و قابلیت سے متأثر ہوا اور اس نے انہیں شاہی عنایات سے نوازا۔ میر معصوم ۱۰۱۵ھ۔۱۶۰۶ء میں ایران کی سفارت سے واپس آئے تو جہانگیر بادشاہ نے ان کی خدمات کے صلے میں انہیں ''امین الملک'' کا خطاب عطا کیا۔

میر معصوم متعدد علوم و فنون میں دسترس رکھتے تھے اور صاحبِ سیف و قلم تھے۔

انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ یہ ان ہی کا شعر ہے۔

چہ خوش است آنکہ از خود روم و تو حال پرسی
بشنو شرح حال گویم بزبان بے زبانی

نظم میں ان کی تالیفات میں ''دیوانِ نامی'' کے علاوہ ایک مثنوی ''معدن الافکار'' کے نام سے ہے جو انہوں نے ''مخزن الاسرار'' کے جواب میں لکھی تھی۔ نثر میں ان کی کتابوں میں ''تاریخ سندھ'' اور طب میں ایک مختصر کتاب ''مفردات معصومی'' کے نام سے موجود ہے۔ ''تاریخ سندھ'' کے اردو اور سندھی زبان میں تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جبکہ ان کی کتاب ''مفرداتِ معصومی'' کے خطی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

میر معصوم خوش خط اور عمدہ کتبہ نویس تھے۔ برصغیر پاکستان و ہند کے مختلف شہروں اور مقامات کے علاوہ برصغیر سے باہر ترمذ و تبریز اور اصفہان تک تمام جگہ راستوں اور منزلوں پر انہوں نے اپنے اشعار مسجدوں اور اہم عمارتوں کے پتھروں پر کندہ کرائے۔ آگرہ کے قلعہ کے دروازے اور فتح پور کی جامع مسجد کے کتبے ان کے خط میں ہیں۔ ان کتبوں کی تفصیلات ''مرقع اکبر آباد'' اور ''رہنمائے فتح پور سیکری'' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ راجپوتانہ گزٹ اور ''چراغ راجستھان'' کے مدیر مولوی مراد علی نے جیسلمیر کی ایک مسمار شدہ مسجد کے حصے سے میر معصوم بھکری کے کتبات کے یہ چند شعر نقل کئے ہیں۔ جن میں ان کا تخلص ''نامی'' بھی استعمال ہوا ہے۔

نامی بکشا چشم بصیرت دریاب
بنیادِ زمانہ ہمچو نقشت بر آب
با تو گویم حقیقتِ دنیا چیست
بیداری یک زماں و باقی ہمہ خواب

اسی قطعہ کے نیچے میر معصوم کا یہ قطعہ کندہ ہے۔

دو جہاں در نظر دیدہ دراں مختصر است
ہر کہ بر بست ازو چشم طمع دیدہ ور ست
تا تو بد عہد رہِ مہر و وفا بر بستی
ناتی واشدہ زا دیدہ بہ دیوار و در است

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ میر معصوم بھکر میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کا مدفن سکھر نہیں ہے۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی نے میر معصوم کے احوال ''میر معصوم بکھری'' کے نام سے بیان کیے ہیں جب کہ نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خان نے ''مآثر الامراء'' میں اُن کے سوانح حیات ''میر معصوم بھکری'' کے عنوان کے تحت قلم بند کیے ہیں۔ ''آئینِ اکبری'' میں ان کا نام ''بکر'' یا ''بھکر'' لکھا ہے جب کہ ''جغرافیہ سندھ'' کے مؤلف بشیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ ''آئین اکبری'' کے مؤلف ابوالفضل کا یہ بیان درست نہیں ہے، اس لیے کہ بھکر ضلع سکھر میں میں واقع ہے۔ یہ جزیرہ ہے جہاں قدیم قلعہ اب بھی موجود ہے۔

مولانا اعجاز الحق جو ''بھکر'' کو ''بکھر'' لکھتے ہیں کے مطابق میرزا شاہ حسن کی وفات سے کچھ پہلے سلطان محمود کوکلتاش اور میرزا عیسیٰ خان ترخان نے باہم سندھ کو تقسیم کر لیا تھا۔ بالائی سندھ پر سلطان محمود کا قبضہ تھا جس کا مرکز (دارالحکومت) بکھر تھا اور زیریں سندھ پر میرزا عیسیٰ خان ترخان کا تسلط تھا، جس کا مرکز (دارالحکومت) ٹھٹہ تھا۔

میر معصوم کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو ''مقدمہ تاریخ معصومی'' مرتبہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ (پونا ۱۹۳۸ء)۔

''مقالات شعراء'' میں مرقوم ہے کہ میر معصوم نے دو ساقی نامے اور ایک مثنوی بعنوان ''حسن و ناز'' بھی لکھی۔

میر معصوم نے بہت سی عمارات بھی تعمیر کرائیں، خاص طور پر شہر بھکر میں جو ان کا وطن مالوف ہے۔ دریائے سندھ کے درمیان جو شہر بھکر کے گرد بہتا ہے ایک یادگار عمارت ستیاسر کے نام سے بنوائی جو دنیا کے نوادر میں شمار ہوتی ہے۔ اور ''گنبد دریائی'' (۱۰۰۷ھ) سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ میر معصوم بھکری کا یہ گنبد سکھر میں آج بھی موجود ہے اور یہ میر معصوم کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔ نیز منزل گاہ کی عمارت میں بھی میر معصوم کا ایک کتبہ ثبت ہے۔

میر معصوم بھکری بہت متقی و پرہیز گار اور بہادر و شجاع اور بلند ہمت انسان تھے۔ ان کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ اپنے آبائی شہر بھکر کے عوام الناس تک کو دارالسلطنت آگرہ سے تحفے بھیجتے تھے اور انہوں نے چھوٹوں اور بڑوں کو سالانہ ماہانہ، یومیہ، فصل اور لگان کے موقع پر معقول امداد مقرر کر رکھی تھی۔ ان کا اصول تھا کہ آبادکاری اس طرح کی جائے کہ

جاگیر کے محال میں شکار کے لئے کچھ جنگل چھوڑ دیا جائے جس سے سکھر کے بعض لوگوں کو کچھ شکایات پیدا ہوئیں۔

صاحبِ فضل و کمال اکبری عہد کے نامور مؤرخ اور قادرالکلام شاعر امین الملک میر معصوم نامی بھکری نے ۱۰۱۵ھ۔۱۶۰۶ میں وفات پائی اور سکھر میں دریائے سندھ کے قریب واقع اس نادر زمانہ گنبد میں دفن ہوئے جو ''میر معصوم بھکری کا گنبد'' کے نام سے مشہور ہے۔

شاہ ابوالمعالی لاہوری

شاہ ابوالمعالی لاہوری نامور عالمِ دین، ممتاز مبلغ اور معروف روحانی شخصیت تھے۔ ظاہری و باطنی علوم کے فاضل اور شریعت وطریقت کے جامع ہونے کی بناء پر اکابر علماء و مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق سرگودھا کے ایک معروف صاحبِ ثروت دینی و علمی خانوادہ سے تھا۔

ان کا اسم گرامی شاہ خیرالدین اور لقب ابوالمعالی تھا۔ اپنے لقب سے اس قدر مشہور ہوئے کہ عام لوگ ان کے نام سے واقف نہیں ہیں۔

دوشنبہ کے روز ماہ ذوالحجہ کی دس تاریخ کو ۹۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد چہارم (فارسی ادب) کے مقالہ نگار حامد خان حامد نے شاہ ابوالمعالی کے احوال قلمبند کئے ہیں۔ چنانچہ ''انوارالعارفین'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''شاہ خیرالدین ابوالمعالی، شیخ داؤد کرمانی کے برادر زادے، داماد اور خلیفہ تھے۔ شاہ ابوالمعالی کے والد ماجد کا اسمِ گرامی سید رحمت اللہ اور دادا کا نام نامی سید فتح اللہ تھا۔ آپ کے بزرگوں کا اصل وطن کرمان تھا۔ ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد اپنے چچا شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ قادریہ سلسلہ میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اویسی طریقہ سے بھی مرید تھے۔ تیس سال تک شیخ داؤد کرمانی کی خدمت میں رہ کر ریاضت ومجاہدہ کیا۔ آخر خرقۂ خلافت عطا ہوا۔ پھر شیخ کے حکم پر لاہور تشریف لائے۔ راستے

میں جہاں سے گزرے، کنویں اور تالاب کھدواتے اور باغات لگواتے تھے۔ شیر گڑھ سے لاہور تک آج بھی آپ کے تعمیر کرائے ہوئے مکانات موجود ہیں جو شاہ ابوالمعالی کے جھوک کے نام سے مشہور ہیں۔"

مفتی غلام سرور لاہوری نے "حدیقۃ الاولیاء" میں شاہ ابوالمعالی کے احوال قلمبند کئے ہیں اور لکھا ہے:

"شیخ عالم و فاضل اور ولی اللہ تھے۔"

شاہ ابوالمعالی اور ان کے مرشد طریقت شیخ داؤد کرمانی کے احوال و آثار مولانا عبدالحق محدث دہلوی "اخبار الاخیار" میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی کو ان دونوں بزرگوں سے ملاقات کی بڑی آرزو تھی۔ ان کی یہ آرزو اس طرح پوری ہوئی کہ وہ شاہ ابوالمعالی سے پہلی ہی ملاقات کے دوران ان کے حلقہء ارادت میں شامل ہو گئے۔ شیخ محمد اکرام "رودِ کوثر" میں لکھتے ہیں:

"شیخ محدثؒ نے خواجہ باقی اللہ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ کی وفات کے بعد ان پر پھر قادری نسبت غالب آ گئی اور فی الواقع ان کا تعلقِ خاطر اسی سلسلہ سے تھا۔ ان کے پہلے مرشد اوچ کے مخدوم موسیٰ گیلانی تھے۔ ان کی بدولت شیخ کا پنجاب کے قادری بزرگوں سے رشتۂ عقیدت استوار ہو گیا تھا اور آخر عمر میں لاہور کے شاہ ابوالمعالی قادری کو اُن کا روحانی راہنما سمجھنا چاہئے۔ وہ مخدوم موسیٰ گیلانی کے ایک مشہور پیر بھائی شیخ داؤد شیر گڑھی کے جانشین تھے۔"

شاہ ابوالمعالی کے مرید شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی حضرت باقی باللہ سے بیعت کے بارے میں "کلمات الصادقین" میں محمد صادق ہمدانی لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ محدث نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے روحانی اشارے پر حضرت خواجہ باقی باللہ نقش بندی کے دست حق پرست پر بھی بیعت کی تھی۔ حالاں کہ آپ کو کئی سلاسل کی خدمت تفویض ہوئی تھی مگر سلسلۂ قادریہ سے آپ کو خصوصی تعلق تھا۔ چنانچہ حضرت غوث الاعظم کے روحانی اشارے پر حضرت محدث کی خواجہ باقی باللہ کے دستِ حق پرست پر

بیعت کرنے کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر خلیق نظامی نے لکھا ہے کہ اگر سولھویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی کے شروع کی مذہبی اور روحانی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی ذاتِ گرامی احیاء سنت اور اماتت بدعت کی تمام تحریکوں کا منبع ومخرج تھی۔ ان کے ملفوظات و مکتوبات کا ایک ایک حرف ان کی مجددانہ مسائی اور بلندیٔ فکر ونظر کا شاہد ہے۔ شیخ عبدالحق نے جب احیاء علوم الدین کا بیڑا اٹھایا تو حضرت باقی باللہ کا آفتابِ ارشاد نصف النہار پر تھا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب ''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی'' مطبوعہ ندوۃ المصنفین کے حصہ سوئم باب دوم میں شیخ عبدالحق کے حوالے سے حضرت شاہ ابوالمعالی کے احوال بیان کئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''شیخ محدث ان سے اپنا 'احوالِ درون' بیان فرمایا کرتے تھے اور ان کی روحانی راہنمائی اور دعاؤں کے ملتجی رہتے تھے۔ ایک خط میں انہوں نے نہایت تفصیل سے اپنی قلبی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ ''نفسِ بدکیش'' نے ان کو دھوکا دیا کہ ''تو آہنِ سردی کوبی و ترا دریں راہ نصیبے نیست'' اور نفس نے انہیں ترغیب دی کہ عوام کی راہ اختیار کرو کہ اس میں فوائد ہیں۔ اس طرح ان کے اندر ایک عجیب ذہنی اور قلبی کشمکش پیدا ہوگئی۔ جب قلق و اضطراب نے کرب و بے چینی کی صورت اختیار کر لی تو انہوں نے شاہ صاحب (شاہ ابوالمعالی) سے رجوع کیا اور امداد کی التجا کی۔''

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے یہ التجا ایک خط میں کی تھی جو فارسی زبان میں ہے۔ اس خط سے ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد خلیق نظامی نے لکھا ہے کہ:

''خط کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت شیخ محدث سخت قسم کی قلبی تکلیف میں مبتلا تھے اور انہیں شاہ ابوالمعالی کے علاوہ کوئی دوسرا بزرگ نظر نہ آتا تھا جس سے راہنمائی اور امداد کے خواہاں ہوں۔ اسی مکتوب کے آخر میں نہایت غمگین لہجہ میں یہ شعر لکھا ہے۔

فریادِ دلِ غمزدہ را گر نکنی گوش
پس پیش کہ از دستِ تو فریاد تواں کرد''

مولانا عبدالحق کی ان ہی کیفیات کو شیخ محمد اکرام نے ذرا مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ ''رودِ کوثر'' میں لکھتے ہیں کہ:

''شیخ عبدالحق محدث کا ابتدائی ماحول صوفیانہ تھا۔ اور انہیں اس راستے سے گہری دلچسپی تھی۔ مثلاً ان کے عزیز دوست اور مربی نظام الدین بخشی اُن کی نسبت لکھتے ہیں۔ 'امروز در دہلی است... و در لباس صوفیہ می گزراند' لیکن انہوں نے مشغلہ علماء کا اختیار کیا ہوا تھا۔ انہوں نے ان دونوں میں تطبیق و ہم آہنگی کا راستہ نکالا۔ لیکن بسا اوقات اس کوشش میں شدید باطنی کشمکش اور انتہائی روحانی سربلندی سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالخصوص حضرت مجددؒ کے دعاوی تو ان کے لئے بڑے خلجان کا باعث ہوئے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد وہ جس بزرگ سے اپنی روحانی مشکلات کے حل کے لئے رجوع کرتے وہ شاہ ابوالمعالی تھے۔ شاہ صاحب کے نام ان کے کئی خط ہیں۔ یہ خطوط ''کتاب المکاتیب'' میں محفوظ ہیں۔''

شیخ محمد اکرام اور خلیق نظامی ان ہی خطوط کے حوالے سے شیخ محدث کی شاہ ابوالمعالی سے روحانی نسبت کے احوال بیان کر رہے ہیں۔ ان خطوط سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ شاہ ابوالمعالی نے شیخ محدث کو لاہور میں اپنی صحبت میں رکھ کر ان کی روحانی تربیت کر دی تھی اور اب یہ ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ شیخ محدث بار بار لاہور آئیں۔ یہ ۱۰۲۵ھ سے قبل کا واقعہ ہے۔ اسی خط میں شیخ محدث لکھتے ہیں کہ ''شاہ ابوالمعالی نے مشکوٰۃ کی شرح مکمل کرنے کا اصرار کیا تھا۔ شرح مشکوٰۃ ۱۰۲۵ھ میں مکمل ہوئی۔''

خلیق نظامی لکھتے ہیں کہ شیخ محدث شاہ ابوالمعالی کی روحانی صلاحیتوں کے دل سے قائل تھے۔ شیخ محدث نے ان کو اپنا روحانی رہبر بنالیا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ایسا سنگ دل کون ہوسکتا ہے جو ان کی صحبت کے اثر سے نرم نہ ہو جائے۔ خلیق نظامی کے مطابق شیخ محدث فرماتے ہیں:

> ''ذوقِ صحبتِ ایشاں و رنگِ حالِ ایشاں کہ در ظاہر و باطن فقیر نشستہ است بتقریر گنجائش بیان ندارد۔''

شیخ محمد اکرام شاہ ابوالمعالی کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''شیخ محدث ان کی سطوتِ روحانی کے بڑے قائل تھے۔ شیخ محدث کی تصنیفی زندگی

میں بھی انہیں دخل تھا۔ مثلاً ''فتوح الغیب'' کی شرح ان ہی کے اصرار پر لکھی گئی۔ شرح مشکواۃ کی تالیف میں بھی ان کی تشویق و ترغیب کو دخل تھا۔ طرز تحریر کی نسبت بھی وہ مشورے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ شرح مشکواۃ کی نسبت انہوں نے لکھا کہ اس میں جا بجا اشعار درج ہونے چاہئیں تاکہ انداز بیان دلچسپ اور مؤثر ہو۔ ''فرمودند در ترجمہ گاہے بتقریب بعضے از کلمات قوم نیز در آوردہ باشید چنانچہ ملا حسین در تفسیر خودمی کند و فرمودند یگاں بیتے مناسب مقام ہم می نوشتہ باشد۔''

حضرت شاہ ابوالمعالیؒ نے اپنے شاگرد رشید اور مرید خاص شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے جو کتابیں اور جن کتابوں کی شرحیں لکھوائی ہیں ان میں ''فتوح الغیب'' اور مشکواۃ کی شروح خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ''فتوح الغیب'' جو ۱۳۰۴ھ میں مصر سے شائع ہوئی اس سے برسوں بیشتر یورپ پہنچ چکی تھی۔ یہ کتاب حضرت غوث الاعظمؒ کے اٹھہتر (۷۸) وعظوں کا انتہائی دلکش و مؤثر اور گرانقدر مجموعہ ہے۔ ان کی فصاحت و بلاغت اور تاثیر کا اعتراف انگلستان کے نامور فاضل اور مشہور مستشرق ڈی۔ایس مارگولیتھ (D.S.Margoliduth) نے بھی اپنے مقالے مطبوعہ ''انسائیکلو پیڈیا آف اسلام'' میں کیا ہے۔

''فتوح الغیب'' کے بارے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی ''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی'' میں شیخ محدث کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں مذہبی مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں تصوف کی چاشنی دے کر اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شیخ محدث کا تو یہ خیال ہے کہ:

''در تحقیق مقالات دین و کمالات اہل یقین موافق لسانِ رسالت و زبانِ نبوت است

چناں کہ شانِ معارفِ صدیقان است فرمودہ اند۔''

شیخ محدث نے اس کی شرح نہایت ہی عالمانہ انداز میں لکھی ہے۔ شرح لکھنے کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ شیخ محدث نے یہ کتاب شیخ عبدالوہاب متقیؒ کے پاس دیکھی تھی بلکہ شیخ متقیؒ نے فرمایا تھا:

''ایں را حاصل کنید و دست دراں زنید و براں باشید و ہر قدر کہ توانید براں عمل کنید و بدانیہ و آگاہ باشید کہ طریقہ حضرات قادریہ و راہِ روشن ایں سلسلہ علیہ اینست''

مکہ معظمہ میں شیخ محدث کو "فتوح الغیب" کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ ہندوستان آئے تو قادریہ سلسلہ کے ایک بزرگ نے اس کا نسخہ عنایت فرمایا۔ شیخ محدث نے استاد کی ہدایت کے مطابق اس کو کافی غور سے پڑھا۔ فرماتے ہیں:

"بوصیت شیخ ذکرہ اللہ بالخیر آنرا گرفتم و بخواندم و درد ساختم"

اس کے بعد حضرت شاہ ابوالمعالی قادری نے ترجمہ کرنے اور شرح لکھنے کا حکم دیا اور فرمایا:

"ہمہ کارہا گذاشتہ ایں کار باید کرد"

لیکن شیخ محدث کو اس کام کے کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ لاہور گئے۔ وہاں بیس (۲۰) روز تک شاہ ابوالمعالی کی خدمت میں رہنا ہوا۔ شاہ صاحب کی صحبت میں رہ کر اس کام کو انجام دینے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ لکھتے ہیں:

"ناگاہ حال دیگر گشت و ہمت درکار شد و فتح باب روئے نمود و بیم از دل ما رفتہ، امید ے بہم رسید و ہیبت فرو نشستہ اُنسے پیدا آمد"

۱۰۲۳ھ میں اس شرح کی تکمیل ہوئی۔ "مفتاح فتوح" تاریخی نام رکھا گیا۔ خاتمہ پر ایک رباعی لکھی ہے ۔

ایں شرح کہ مفتاح فتوح الغیب است
از غیب است ایں ازاں بری از عیب است
مفتاح مفتوح (۱۰۲۳ھ) نام و تاریخ افتاد
در خاطر آں کہ مظہر لاریب است

شیخ محدث کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے جو بے پناہ عقیدت تھی اس کا اظہار اس کتاب میں عجیب طریقہ سے ہوا ہے۔ شیخ محدث نے اس شرح کے شروع میں اپنا مقدمہ یا نام نہیں لکھا۔ اور یہ اس لئے کہ حضرت شیخ جیلانیؒ کی تصنیف کے شروع میں انہوں نے اپنی طرف سے کچھ لکھنا سوءادب خیال کیا:

"ذکر نام ایں حقیر خود چہ حد و مجال کہ دریں مقام تواں برد"

کتاب کے خاتمہ پر شارح نے ایک مختصر سا نوٹ لکھا ہے اور "فتوح الغیب" کے متعلق اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے:

"انچہ دریں کتاب ازاں مودع است ہمہ بیان کتاب وسنت است"

''فتوح الغیب'' کی شرح لکھنے کے بارے میں پروفیسر نظامی کی اس روئداد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ابوالمعالی نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو نہ صرف اس عظیم علمی کارنامے کو انجام دینے کے لئے آمادہ و تیار کیا، اس کے لئے انہیں حکم دیا بلکہ اس کارنامے کے انجام دینے میں ان کی علمی و روحانی راہنمائی بھی فرمائی۔

شہزادہ داراشکوہ نے ''سفینۃ الاولیاء'' میں حضرت شاہ ابوالمعالی کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے:

> ''حضرت شاہ ابوالمعالیؒ صحیح النسب سید تھے آپ سے خوارق عادات و کرامات کا بڑی تعداد میں ظہور ہوا ہے۔ حضرت استاد فرماتے تھے کہ ایک دن میں اپنے استاد ملا نعمت اللہ کے ہمراہ جو عالم باعمل تھے آپ کی زیارت کے لئے گیا۔ ہم سب وہاں موجود تھے کہ ایک شخص ایک تسبیح شاہ صاحب کے لئے لایا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اگر شاہ صاحب کوئی صاحبِ کرامات بزرگ ہیں تو یہ تسبیح مجھے مرحمت فرما دیں۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو شاہ صاحب نے مجھے بلایا اور وہ تسبیح مجھے مرحمت فرمائی۔ فرمایا ہر وقت تمہاری تسبیح تم کو پہنچتی رہے گی۔ سو مرتبہ درود پڑھ لیا کرو۔ استاد ملا نعمت اللہ سے روایت ہے کہ ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ میں حضرت غوث الثقلین سے عقیدت رکھتا ہوں، انہیں بھی اس کی اطلاع ہوگی۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی فکر میں مبتلا ہوں۔ میرا سر برہنہ ہے۔ اسی وقت حضرت غوث الثقلین تشریف لائے اور مجھے ایک سفید دستار عطا فرمائی اور فرمایا کہ ملا نعمت اللہ! ہم ایسے موقع پر تمہیں یاد رکھتے ہیں۔ شاہ ابوالمعالیؒ نے مجھے طلب کیا اور ایک سفید پگڑی عنایت فرمائی اور کہا کہ یہ پگڑی ہے۔''

شیخ محدث کے دل میں اپنے مرشد طریقت شاہ ابوالمعالی سے ملاقات کرنے اور ان کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی خواہش اس قدر شدید تھی کہ وہ بار بار لاہور آنے کی اجازت کے لئے ان سے خطوط کے ذریعے درخواست کرتے تھے مگر شاہ

ابوالمعالی چاہتے تھے کہ وہ دہلی ہی میں بیٹھ کر اپنے دینی و تبلیغی اور علمی و تدریسی کاموں میں مصروف رہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت شاہ ابوالمعالی نے شیخ محدث کو ہدایت فرمائی تھی کہ وہ دہلی سے باہر قدم نہ نکالیں، وہیں گوشہ تنہائی میں بیٹھے ہوئے اپنا کام کریں۔ ایک مرتبہ شیخ محدث، شاہ صاحب سے ملنے کے لئے لاہور چلے گئے تو ان کو اس سے بھی ناگواری ہوئی اور فرمایا

''اکنوں بدہلی بروید در فراق شما بزبان حال می نالد، بروید، بروید۔''

ایک مرتبہ شاہ ابوالمعالی کی علالت کی خبر سن کر شیخ محدث نے عیادت کے لئے لاہور جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب شاہ صاحب کی تنبیہہ کا خیال آیا تو مجبور ہو کر بیٹھ رہے اور اس مضمون کا ایک عریضہ ارسال خدمت کیا:

''قصہ شوق و محبت و مقتضائے عرف و عادت آں بود کہ بہ شنیدن
ایں خیال بیتابانہ بہ ملازمت می رسید کہ امروز دوستی برائے خود کہ خیر
دنیا و آخرت خواہد جز ذات شریف ایشاں رائگی داند، بخلاف ایں
حال متعلق شدہ است جرات نہ توانست۔''

جب حضرت شاہ ابوالمعالی کی صحت کی اطلاع ملتی ہے تو شیخ عبدالحق محدث انہیں خط ارسال کرتے ہیں اور اس میں لکھتے ہیں:

''حق جل و علا سایہ عنایت و محبت ایشاں را برفقرائے ایں سلسلہ
پایندہ داد کہ وسیلہ حل بسے از مشکلات و سبب آسانی
دشواریہاست۔''

غرض کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حضرت شاہ ابوالمعالی کے نام بہت سے خطوط لکھے جن میں آپ سے اپنی قلبی عقیدت کا اظہار کیا اور اپنی روحانی بے چینی کے لئے علاج کی استدعا کی اور اپنے مسائل اور روحانی اسرار و رموز کے حل میں آپ سے راہنمائی حاصل کی۔ نیز یہ کہ شیخ محدث شاہ ابوالمعالی کو اپنا روحانی پیشوا سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ ابوالمعالی نے شیخ محدث کو بہت سے مشورے دیئے تھے۔ جن پر وہ تمام عمر عامل رہے اور جن کی وجہ سے ان کے علمی کاموں میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی۔

شاہ ابوالمعالی کثیر التصانیف ہونے کے ساتھ شعر بھی کہتے تھے اور غربتی تخلص کرتے تھے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں ''تحفۃ القادریہ''، ''حلیہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم''،

''نفحاتِ داؤدی''، ''مونسِ جان''، ''زعفران زار''، ''گلدستہ باغِ ارم''، ''رسالہ شوقیہ''، ''ہشت محفل'' جو ملفوظات پر مشتمل ہے، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مفتی غلام سرور لاہوری (متوفی ۱۳۰۷ھ) نے 'حدیقۃ الاولیاء' میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ ابوالمعالی کی تصنیفات تحفۃ القادریہ اور ان کے اشعار کا دیوان ان کی اولاد کے پاس ہے۔ یہ تذکرہ مفتی غلام سرور نے سوا سو سال پہلے لکھا تھا اور اس امر پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ان کی اولاد جو لاہور میں سکونت پذیر ہے مگر ایسے عالی قدر و فاضل اور ولی کی اولاد کے ہونے کے باوجود علم سے بے بہرہ ہے۔

حضرت شاہ ابوالمعالی کے دیوان ''تحفۃ القادریہ'' سے حضرت غوث الاعظم کی شان میں کہے گئے دو اشعار تبرکاً پیش کیے جاتے ہیں:

گر کسے واللہ بعالم از مئے عرفانی است — از طفیلِ شاہِ عبدالقادر گیلانی است

ہست ہر دم جلوہ گر از چہرہ اش حسنِ حسن — زاں جمالش مصطفیٰ را راحت و ریحانی است

حضرت شاہ ابوالمعالی قادری لاہوری نے ۱۰۲۴ھ میں وفات پائی۔ روضہ مبارک لاہور میں مرجع عام ہے۔ عرس کے روز اور عیدین کے موقع پر مزار پُرانوار پر عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا ہے۔

شیخ فرید بخاری

نواب مرتضیٰ خان کا شمار عہد اکبری اور عہد جہانگیری کے اکابر امراء اور مشاہیر علماء میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف لائق و قابل منتظم، بہادر و شجاع سپاہی اور دین دار و فیاض امیر تھے بلکہ ظاہری و باطنی علوم سے بھی آراستہ تھے۔ ان کا نام شیخ فرید الدین تھا لیکن اپنے خطاب نواب مرتضیٰ خان اور شیخ فرید کے نام سے مشہور ہوئے۔ نواب شاہنواز خان ''مآثر الامراء'' میں ان کے لئے ''شیخ'' ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی ولادت دہلی میں ہوئی۔

نواب مرتضیٰ خان نے عہد اکبری میں بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح اور لوگوں کی فوز و فلاح کے لئے قابل قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ ابو الفضل کے قتل کی وجہ سے اکبر، جہانگیر سے ناراض تھا۔ شیخ فرید نے باپ بیٹے کی صلح کروا کر جہانگیر کی ولی عہدی مسلم کرائی، علماء و مشائخ کی بے حد خدمت کی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ اور ان کے خلیفہ اکبر حضرت مجدد الف ثانی اور مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے مکتوبات میں سے متعدد مکتوبات شیخ فرید کے نام ہیں جن سے شیخ فرید کی شخصیت کی اہمیت اور ان کے بلند مرتبہ و مقام کی نشاندہی ہوتی ہے۔ پھر مکتوبات میں قرآن، حدیث اور فقہ کے پیچیدہ امور و مسائل پر بحث کی گئی ہے جس سے شیخ فرید کے علم و فضل میں مہارت و کمال کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اکبر کے انتقال کے وقت شیخ فرید ہی نے جہانگیر کی جانشینی کا اہتمام کیا بلکہ جہانگیر سے وعدہ بھی لیا کہ وہ اسلامی احکام و قوانین کا پورا احترام کرے گا۔

جہانگیر شیخ فرید کی حد درجہ قدر کرتا تھا۔ چنانچہ اپنی توزک میں اس نے شیخ فرید کی وفات پر بہت قدر دانی اور رنج و افسوس کا اظہار کیا ہے۔ مشرقی ممالک میں بادشاہ کا اپنے

امراء سلطنت میں سے کسی امیر کے گھر جا کر قیام کرنا کوئی معمولی بات نہیں بلکہ ایسا شاذ ہی ہوتا تھا۔ ''آئینِ اکبری'' اور ''توزکِ جہانگیری'' سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر اور اس کے بعد جہانگیر نے اپنے دورِ حکومت میں کئی مرتبہ دہلی میں شیخ فرید کے ہاں قیام کیا۔ دہلی میں لال قلعہ کے قریب سلیم گڑھ ایک قلعہ نما عمارت ہے۔ عہدِ اکبری میں اس کے چاروں طرف جمنا بہتی تھی۔ اکبر نے یہ عمارت شیخ فرید کو دے رکھی تھی اور شہنشاہ اکبر کئی مرتبہ شیخ فرید کا مہمان ہوا۔

رکن السلطنت نواب مرتضیٰ خان شیخ فرید کے احوال بیان کرنے سے پہلے شیخ محمد اکرام نے ''رودِ کوثر'' میں یہ تمہیدی کلمات لکھے ہیں۔ ''۱۸۵۷ء کے بعد اسلام پر مشنریوں کے حملے ہوئے تو ان کے جواب کے لئے فقط مولانا محمد قاسم، مولانا رحمت اللہ اور دوسرے علماء کرام ہی نہ اٹھے بلکہ سرسید احمد خان، سید امیر علی اور خواجہ کمال الدین نے بھی اس بارے میں کچھ کم کام نہیں کیا۔ عہدِ اکبری میں بھی یہی ہوا، اکبر کے خیالات بگاڑنے میں جتنا دخل بعض علماء و مشائخ کو تھا امراء کو نہ تھا۔ لیکن علماء میں ہی بعض بزرگوں نے حالات کو سنوارنے کے لئے بڑی قربانیاں کیں۔ امراء کا معاملہ بھی اسی طرح تھا۔ انہوں نے دربار کے قواعد و آئین تسلیم کر لئے لیکن بعض امراء مثلاً شہباز خان کنبوہ، قطب الدین کوکہ، خان اعظم نے بڑی جرات سے بادشاہ کو سمجھایا اور جب یہ کوشش ناکام رہی تو اپنے اثر و رسوخ سے اکبری بے قاعدگی کو دربار اور محل سے باہر عام ہونے سے روکا۔

عہدِ اکبری کے متدین امراء میں خان اعظم، قلیچ خان شیخ شہباز کنبوہ کے علاوہ بعض دوسرے نام بھی شامل ہیں لیکن ان میں جو خاص مرتبہ شیخ فرید کا ہے کسی اور کا نہ تھا۔ اور چونکہ انہوں نے دوسرے نیک اور برگزیدہ کاموں کے علاوہ طریقہ نقشبندیہ کو غیر معمولی مدد دے کر اسلامی ہندوستان کی مذہبی تاریخ پر بھی گہرا اثر ڈالا، اس لئے ان کے حالات تفصیل سے لکھے جانے کے مستحق ہیں۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کے مؤرخین سے اس کام میں بہت تھوڑی مدد ملتی ہے۔ حالانکہ یہ امراء شہنشاہ اکبر کے ملحدانہ اقدامات اور لادینی افکار کے خلاف سب سے مضبوط دیوار ثابت ہوئے۔

شیخ فرید کی قسمت کا ستارہ اس وقت چمکا جب عہدِ اکبری کے مشہور مورخ مثلاً بدایوانی، خواجہ نظام الدین احمد مصنف ''طبقاتِ اکبری'' وفات پا چکے تھے اور عہدِ جہانگیری کے مؤرخین بیشتر ان کی ملکی خدمات کا ذکر کرتے ہیں، ان کے سارے کارنامے کسی نے

نہیں گنوائے۔ شیخ کے اپنے ایماء پر دو تاریخیں لکھی گئیں۔ ایک شیخ عبدالحق محدث کے صاحبزادے شیخ نورالحق نے، جن کی شادی شیخ فرید کے گھرانے میں ہوئی تھی، شیخ کے ایماء پر اپنے والد کی تالیف ''تاریخ حقی'' کو اضافہ کے بعد ''زبدۃ التواریخ'' کے نام سے مرتب کیا۔ دوسری کتاب ''اکبر نامہ'' ہے جسے شیخ الہ داد فیضی سرہندی ابن ملا علی شیر نے لکھا، جو شیخ کی ملازمت میں تھا۔ ان دونوں کتابوں میں بھی بہ تقاضائے موضوع فقط ملکی خدمات کا ذکر ہے۔ شیخ فرید کے باقی کارنامے کسی میں نہیں۔ ہم کچھ حضرت مجدد اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے مکتوبات اور ملفوظات سے اور کچھ ''مآثر الامراء'' اور دوسری تاریخی کتب سے پھول پتی جمع کر کے اس فخر روزگار کے مزار پر اعتراف و عقیدت کا گلدستہ پیش کرتے ہیں۔

اس تمہید اور ان تعارفی کلمات کے بعد شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

''شیخ فرید بخاری سید تھے، حکومت اسلامی کے دوران سادات کی قدر ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے آباؤ اجداد کو بھی مدد معاش ملتی تھی اور اس پر ان کی گزر تھی۔ شیخ کے جد چہارم سید عبدالغفار دہلوی کو خیال ہوا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ مدد معاش ترک کر دینی چاہئے اور نوکری سپاہ گری اختیار کرنی چاہئے۔ چنانچہ اس پر ان کی اولاد کا عمل رہا... شیخ فرید کے والد کا نام احمد بخاری تھا۔ ان کے ایک بھائی محمد بخاری تھے جو شیخ فرید کے بھائی سید جعفر کے ساتھ گجرات کے ایک معرکے میں ۱۵۷۳ء میں کام آئے تھے۔ شیخ محمد ایک عرصے تک اجمیر میں حضرت خواجہ کی درگاہ کے مہتمم رہے۔

شیخ فرید صغر سنی میں ہی اکبر کے ملازم ہوئے اور اپنی معاملہ فہمی، ذہانت، دیانت داری اور بہادری کی وجہ سے جلد شہرت حاصل کر لی۔ اکبر نے انہیں کئی اہم کام سرانجام دینے پر مامور کیا۔ ۱۵۹۸ء میں ہندوستان میں سخت قحط پڑا تو لوگوں میں روپیہ اور اشیاء تقسیم کرنے کے لئے بادشاہ نے انہیں مقرر کیا۔ ۱۶۰۰ء میں حاکم خاندیش سے مذاکرات میں شیخ فرید نے شہنشاہ اکبر کی نمائندگی کی۔ حالانکہ اس وقت ان کا منصب بڑا نہ تھا لیکن چونکہ ان کی دیانت داری اور کارگزاری مسلمہ تھی اس لئے انہیں اکثر ذمہ داری کے کام سونپے جاتے۔ پھر جب انہیں میر بخشی بنایا گیا تو ان کا اثر و اقتدار اور بھی بڑھ گیا۔ بلکہ دیوان بن گئے۔ شیخ فرید نے عہد اکبری کی بہت سی مہمات میں حصہ لیا۔ شیخ فرید کا عہدہ

میر بخشی کا تھا لیکن جب ابو الفضل دکن کو رخصت ہوا اور پھر مارا گیا تو اس کے بعد بادشاہ کے سب سے زیادہ حاضر باش اور معتمد افسر شیخ فرید ہی تھے۔ ''آئین اکبری'' کے مطابق جب اکبر کی ماں مریم مکانی وفات پا گئی اور دربار میں ماتمی رسوم و آئین جاری تھے کہ دسہرہ کا تہوار آ گیا۔ بادشاہ نے چاہا کہ ہندوؤں کو یہ خوشی کا تہوار منانے کا موقع دینا چاہئے اور ماتم کی میعاد ختم کرنی چاہئے۔ چنانچہ شیخ فرید کو اس قسم کا فرمان جاری کرنے کا حکم ہوا۔ آخر شیخ فرید کو یہ فریضہ ادا کرنا پڑا۔ اسی طرح جب اکبر کے مرض الموت میں حکیم علی گیلانی کے معالجے سے تمام بیگمات ناراض تھیں بلکہ جہانگیر بھی کہتا تھا کہ میرے باپ کو حکیم علی نے غلط علاج سے ہلاک کر دیا تو حکیم نے شیخ فرید کے گھر جا کر پناہ لی۔ چنانچہ تمام بیگمات اور نئے بادشاہ کے غیظ و غضب کے باوجود انہوں نے حکیم کو کوئی آزار نہ پہنچنے دیا۔

عہد جہانگیری میں شیخ فرید کا مرتبہ بڑھ گیا اور وہ اپنے ساتھیوں بلکہ تمام اعیانِ سلطنت سے بازی لے گئے۔ اس کا باعث ان کے دو اہم کام تھے جو انہوں نے بڑی خوبی سے سر انجام دیئے۔ ایک تو جہانگیر کی تخت نشینی کا اہتمام، جس سے خوش ہو کر جہانگیر نے ''صاحب سیف و قلم'' کا خطاب دیا۔ دوسرا اہم کام خسرو کی شکست۔ اس پر اظہار خوشنودی کے لئے بادشاہ خود شیخ کے خیمے میں گیا۔ ان سے بغل گیر ہوا اور شیخ کو نواب مرتضیٰ خان کا خطاب دے کر گجرات کا صوبیدار مقرر کیا۔ یہ واقعہ جہانگیر کے پہلے سال جلوس میں ہوا۔ اس کے چار سال بعد شیخ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا اور اسی عہدے پر انہوں نے ۱۶۱۶ء میں وفات پائی۔

شیخ فرید کے فرائض منصبی اور ان کی شاندار انتظامی خدمات بیان کرنے کے بعد شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''نواب مرتضیٰ خان شیخ فرید کی اسلامی ہندوستان کے امراء میں ایک عدیم النظیر حیثیت تھی۔ لیکن ان کا اصل مرتبہ ان نیک کاموں کی وجہ سے ہے جن کا سلسلہ بڑا وسیع تھا اور بزرگانِ کبار ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ شیخ فرید نے اپنے زمانہ گورنری کے دوران لاہور میں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی تھی چنانچہ حضرت مجددؒ اس مسجد کے بارے میں ان کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''ایک درویش لاہور سے آیا ہوا ہے اس نے بیان کیا کہ شیخ جیو (یعنی شیخ

فرید) پرانی منڈی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لئے حاضر ہوئے تھے اور میاں رفیع الدین نے آپ کے التفات کے اظہار کے بعد کہا کہ نواب شیخ جیو نے اپنی حویلی میں جامع مسجد بنائی تھی۔ الحمد اللہ علی ذالک۔ حق تعالیٰ آپ کو زیادہ توفیق عنایت فرمائے۔ مخلصوں اور یاروں کی اس قسم کی باتیں سن کر بہت ہی خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" میں نواب مرتضیٰ خان شیخ فرید کے احوال بیان کئے ہیں اور ان کی تعریف و توصیف اسی انداز سے کی ہے جیسا کہ شیخ محمد اکرام نے ان کی تعریف کی ہے۔ دونوں دانشوروں اور محقق صاحبان قلم کے ماخذ بھی مشترک ہیں۔ چنانچہ نظامی صاحب لکھتے ہیں کہ "نواب مرتضیٰ خان شیخ فرید دورِ مغلیہ کے مشہور اکابر و اعیان سلطنت میں سے تھے۔ علماء اور مشائخ سے ان کی گہری عقیدت تھی۔ وہ مذہبی شعار کو رواج دینے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ ان کے زمانے کے علماء و مشائخ نے اس جذبے کو سمجھ لیا تھا اور وہ پوری طرح اس کی قدر کرتے تھے۔ اکبری دور میں جب سنت و شریعت سے بے تعلقی بڑھی اور محلاتِ شاہی فتنہ و فساد کا مرکز بنے تو حالات کی اصلاح کے لئے علماء و مشائخ کی نظرِ انتخاب ان پر ہی پڑی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی انقلابی تحریک میں ان سے دست راست کا کام لیا۔ حضرت خواجہ باقی اللہ نے نقشبندیہ سلسلہ کی ترویج میں ان کی ہمدردیوں سے فائدہ اٹھایا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے احیاء سنت و شریعت کے لئے ان ہی کی حمیت دینی کو متحرک کیا۔"

مشائخ کی نظر میں شیخ فرید کی جو قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ خواجہ محمد باقی باللہ کے مکتوبات سے ہو سکتا ہے۔ حضرت خواجہ ان کو "قبلہ گاہی سلامت" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ایک بار اپنی مجلس میں فرمانے لگے:

"شیخ را بر ماحقہا است و بہ وسیلۂ وجود ایشاں دریں راہ کشایشہا دیدہ ایم"

یعنی ہم پر شیخ (فرید) کے بہت حق ہیں اور ان کے وجود کی برکت سے ہم نے بڑی فتوحات اور کشائش دیکھی ہیں۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ عدیم النظیر فیاضی اور خدمات ملکی کے علاوہ شیخ فرید کا بڑا کام طریقۂ نقشبندیہ کی حمایت اور سرپرستی ہے۔ ہندوستان میں اس سلسلے کا صحیح آغاز

حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد حضرت خواجہ محمد باقی اللہ نے کیا۔ جوانی وفات سے چار پانچ سال پہلے اس کام پر مامور ہوئے۔ اس قلیل مدت میں ان کا سلسلہ بڑا وسیع نہ ہوتا لیکن شیخ فرید نے ان کی اور ان کے سلسلے والوں کی کمال خدمت کی۔ خانقاہ کے سارے اخراجات اپنے ذمے لئے اور درویشوں اور دوسرے متعلقین کے لئے معقول وظیفے مقرر کر دیئے تاکہ وہ بے فکری سے اللہ اللہ کریں اور ارشاد و ہدایت میں مشغول رہیں۔ شیخ فرید اور خواجہ کے تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ حضرت خواجہ کی زندگی میں ہی نکتہ چین کہتے تھے کہ حضرت خواجہ کی کامیابی شیخ فرید کی وجہ سے ہے۔ یہ اعتراض کسی نے حضرت خواجہ تک بھی پہنچایا، لیکن آپ شیخ فرید کی عظمت وفضیلت سے واقف تھے۔ آپ نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا۔ بلکہ شیخ فرید کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا۔ آپ کے ملفوظات میں لکھا ہے:

ایک عزیز نے حضور کی خدمتِ اقدس میں بیان کیا کہ بعض کوتاہ بین و کور باطن لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور کی مشیخت کا مدار نواب قدس القاب شیخ فرید سلمہ اللہ تعالیٰ کی دوستی پر ہے اور ہمیشہ رقعات میں جو شیخ کی طرف لکھے جاتے ہیں ان کا سرنامہ 'قبلہ گاہی سلامت باشد' تحریر فرماتے ہیں۔ فقراء سے اس قسم کی خوشامد اچھی نہیں۔ حضور نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم پر شیخ کے بہت حق ہیں اور ان کے وجود کی برکت سے ہم نے بڑی فتوحات اور کشائش دیکھی ہیں۔ اب ہمیں کوئی ایسی وجہ شرعی معلوم نہیں ہوتی جس کے باعث شیخ موصوف سے دوستی کا تعلق قطع کرلیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی اپنی کتاب ''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی'' میں شیخ فرید کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اس قسم کی باتوں کا اعادہ ہی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''مجدد صاحب ایک مکتوب میں ان کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر لکھتے ہیں۔

گر بر تنِ من زباں شود ہر موئے
یک شکر تو از ہزار نتواں کرد''

حضرت مجدد الف ثانی نے متعدد مکتوبات شیخ فرید کے نام تحریر کئے۔ حضرت مجدد کے مکتوبات کا مجموعہ انتخاب ''امام ربانی، دُرِ لاثانی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یہ حضرت مجدد کے مکتوبات کا خلاصہ ہے اور اردو زبان میں ہے۔ اس میں مکتوب نمبر ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶،

۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۶۳، ۶۴، ۱۰۳، ۱۵۲، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۹۳، ۲۱۳، ۲۲۳ وغیرہ نواب مرتضی خان شیخ فرید کے نام ہیں۔ ان میں چند ایک مکتوبات کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

مکتوب نمبر ۵۳ میں حضرت مجدد لکھتے ہیں ... ''بادشاہ سلامت نے حکم دیا ہے کہ آپ چار حق پسند عالم ملازم رکھیں جو احکام شریعت بیان کرتے رہیں تاکہ شریعت کے خلاف کوئی کام نہ ہو۔ آپ دیندار عالم تلاش کر رکھیں، ورنہ اکثر عالم دنیادار معاملات شریعت کو اپنی جاہ وحشمت کی طلب کی وجہ سے امت میں اختلاف پیدا کر دیتے ہیں۔ اس میں بہت احتیاط چاہئے جس طرح علماء کے وجود سے خلاصی مخلوقات ہے اسی طرح خسارہ بھی ان ہی پر منحصر ہے۔ علماء ہی تمام جہان کی نسلوں میں بہتر ہیں اور علماء میں بدتر عالم تمام جہان کے انسانوں میں بدتر ہے کیونکہ تمام جہان کی گمراہی انہیں پر موقوف ہے۔''

مکتوب ۱۶۳ سے ایک مختصر اقتباس ... ''کفر اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں، رسوم کفر کو برتا جائے تو اسلام کی توہین ہے اور احکام اسلام کو برتا جائے تو کفر کی بیخ کنی ہے۔ جہاں تک کہ ہو سکے احکام اسلام کو جاری کیا جائے خدا جزاء دے گا۔ اور مقصود اجرائے شریعت ہے...''

حضرت مجدد کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ فرید کے ہاں ان کی آمد و رفت بھی تھی اور وہ شیخ فرید کے ہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ مکتوب نمبر ۲۲۳ کے اس اقتباس سے ظاہر ہے:

''ارادہ تھا کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے عرس سے فارغ ہو کر دہلی سے آپ کے پاس پہنچوں۔ اس اثنا میں لشکر کے کوچ کی خبر مل گئی۔ اس واسطے نہیں آ سکا۔''

خلیق احمد نظامی ''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی'' میں رقمطراز ہیں:

شیخ فرید کے شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ شیخ محدث خود ان کا بڑا ادب واحترام کرتے تھے۔ کتاب المکاتب الرسائل میں سات خطوط شیخ فرید کے نام ہیں:

۱۔ تحصیل المطلوب بانتظار المحبوب ورعایۃ الاعتدال فی العلم والحال
۲۔ تقسیم الانام علی اربعۃ اقسام

۳۔ تنبیہ الغافلین بغناء الدنیا وار بابہا و اغترار الجاہلین بزخارفہا و اسبابہا

۴۔ تجدید الذکر فی بیان حقیقۃ الشکر

۵۔ تسبیب الخیر لدفع الغیر و دوام الجاء بالخوف والرجاء

۶۔ کشف استار الظلم عن لسان الحال والقال والقلم

۷۔ التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ

ان مکتوبات کا ایک ایک لفظ پُرمعنی ہے۔ شیخ محدث اور شیخ فرید کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور اس زمانے کے مذہبی اور سماجی حالات پر بڑی مفید اور دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ اگر ان خطوط کے مطالعے کے وقت یہ بات بھی ذہن میں رکھی جائے کہ یہ زیادہ تر عہدِ اکبری میں لکھے گئے ہیں تو ان کا صحیح مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔

پہلے خط میں شیخ محدث تین ہدائتیں کرتے ہیں:

۱۔ طلبِ صادق پیدا کرو

۲۔ پاداشِ عمل کا خیال رکھو

۳۔ ظاہر و باطن میں کامل امتزاج پیدا کرو

طلبِ صادق کی وضاحت کرنے کے بعد شیخ محدث فرماتے ہیں کہ بیکار بیٹھنے کی گنجائش نہیں۔ جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔ یہ خیال نہ کرو یہ چھوٹا سا کام ہے، اللہ نے ہر کام کا اجر مقرر کیا ہے۔ ''فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ'' پھر ظاہر و باطن کے امتزاج پر نہایت ہی پُرتاثیر گفتگو کرتے ہوئے یہ شعر پڑھتے ہیں

ہر کفے جامِ شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

ایک خط میں ارشاد ہوتا ہے کہ دین کے دو بازو ہیں۔ التعظیم لامر اللہ اور الشفقۃ علی خلق اللہ۔ شیخ محدث امراء سے دین کے جس بازو کو قوی کرنے کی اُمید رکھتے تھے اس کو نہایت عمدگی اور صفائی سے اپنے خطوط میں بیان کر دیا ہے۔ وہ امراء کو اعلاء کلمۂ حق کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے۔

شیخ محدث اپنے ایک خط میں شیخ فرید کے متعلق فرماتے ہیں۔

''حق نعمتے از آنحضرت بر دمہ فقیر ہمہ وقت ثابت شدہ است''

آگے ارشاد ہوتا ہے:

''گاہے گاہے ایں خس ریزہ را کہ آنرا قلم نامند بر دست ایں حقیر جریاں می دہند وانچہ لائق روزگار اصحاب وموافق حال ایں فقیر بود حرفے سر می زند''

اس کے بعد خاموشی سے لکھتے ہیں:

''اگر دراثنائے آں حرف آشنا سرزدزہے سعادت وقبول امابشرط ستر وکتمان تاسخن در پردہ بماند وقدم از جادۂ ادب بیروں نیفتد''

شیخ محدث کا یہ جملہ حقیقت میں ان کے خطوط کا مفہوم سمجھنے کے لئے کلید کا کام دیتا ہے۔ وہ ''ستر وکتمان'' کے قائل تھے۔ درپردہ بات کرتے تھے۔ غیر ضروری ہنگامہ آرائی انہیں پسند نہ تھی۔ جو مقصد پیش نظر تھا وہ خاموشی اور احتیاط کے ساتھ بھی حاصل ہو سکتا تھا۔

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مجھے خط لکھتے ہوئے بڑی سراسیمگی اور پریشانی ہوتی ہے۔ وجہ یہ بتاتے ''املاء انشائے مکاتیب خصوصاً وقتے کہ مکتوب الیہ در غایت عزت ورفعت درجہ وکاتب در نہایت ناکسی وخواری افتد ایں جا قلم زن سراسیمہ وحیران بود وقلم ازوے سراسیمہ تر وحیران تر''

پھر فرماتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ جناب والا میں مدح وستائش کی تمنا بالکل نہیں ہے۔ برصغیر کی دو بزرگ ترین معاصر شخصیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانی کے نواب مرتضیٰ خان شیخ فرید کے نام مکتوبات کے طویل سلسلے کو یہاں ختم کر کے اب ہم شیخ فرید کی ذاتی زندگی اور ان کی امتیازی خصوصیات پر نگاہ ڈالتے ہیں جن کے باعث ان کی شخصیت آج بھی زندہ تابندہ ہے۔

صمصام الدولہ شاہ نواز خان نے بڑے بڑے امراء دیکھے اور اس نے ''ماثر الامراء'' میں مغلیہ عہد کے چھوٹے بڑے تمام امراء، حکام، سپہ سالار، قاضیوں اور علماء کے احوال بیان کئے ہیں وہ خود بھی ایک نامور، اہل علم اور صاحب قلم امیر تھا۔ پہلے نظام الملک آصف جاہ کے زمانے میں برار کا دیوان رہا۔ پھر نواب ناصر جنگ کا وزیر بنا۔ غرض یہ کہ مغل امراء اور سادات بارہہ کی فیاضیوں سے خوب واقف تھا۔ لیکن نواب شاہنواز افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ شیخ فرید ایسا بلند مرتبت انسان اس زمانے میں نہیں ملتا۔ ''نواب شیخ فرید فوت ہوئے تو ان کی تاریخ ہوئی داد۔ خورد۔ برد'' یعنی اس نے لوگوں میں اپنا مال و

زر تقسیم کر دیا۔ خود خرچ کیا اور دارین کی سعادتیں ساتھ لے گیا۔ اور اتنے بڑے امیر کبیر اور نواب نے ورثے میں صرف ایک ہزار اشرفیوں کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑا۔ نہ محل، نہ مکان، نہ حویلی اور نہ اراضی۔

شیخ محمد اکرام نے ''ماثر الامراء'' کے حوالے سے شیخ فرید کی دادو دہش کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے۔ جسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شائد اسلامی ہندوستان کی ساری تاریخ میں اس پایہ کا سخی اور عالی حوصلہ امیر کوئی نہیں ہوا۔ حضرت مجدد کی سوانح عمری ''حضرت القدس'' میں شیخ فرید کا ذکر ''حاتمِ وقت'' کہہ کر کیا گیا ہے۔

نواب صمصام الدولہ شاہ نواز نے ان کی مدح وتوصیف ان الفاظ میں کی ہے۔ ''شیخ ظاہر و باطن آراستہ داشت، شجاعت را با سخاوت جمع نمودہ بخشش عام او در فیض بروے خلق باز کردہ۔ ہر کہ باو رسیدے، چہرۂ ناکامی در آئینہ خیال ندیدے۔''

ان کی فیاضی کے بارے میں نواب شاہ نواز نے لکھا ہے کہ ''وہ دربار پہنچنے تک قبا اور کمبل اور چادر اور جوتے درویشوں میں تقسیم کرتے، اشرفیوں اور روپوں کی ریزگاری اپنے ہاتھ سے خیرات کرتے ایک درویش نے سات مرتبہ آن کر خیرات لی۔ آٹھویں بار پھر آیا۔ تو شیخ نے اس کے کان میں کہا کہ سات دفعہ جو کچھ لے گئے ہو اسے محفوظ کر لو کہیں دوسرے درویش تم سے چھین نہ لیں۔ شیخ نے بیواؤں اور اہلِ خانقاہ اور اربابِ توکل و احتیاج کا سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا، جو خواہ وہ حاضر ہوں یا غیر حاضر، انہیں باقاعدہ پہنچتا تھا۔ جو لوگ ان کی ملازمت میں وفات پا گئے تھے، ان کے بچوں کے لئے شیخ نے مناسب ماہانہ مقرر کر رکھا تھا اور استاد مقرر کر کے ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا تھا۔ یہ بچے شیخ کی گود میں اس طرح کھیلتے کہ گویا ان کے اپنے بچے ہیں۔ گجرات میں انہوں نے سادات کی فہرست بنوا کر ان کے بچوں کے لئے شادی کے اخراجات اپنی سرکار سے مقرر کئے تھے۔ لیکن شیخ کا اصول تھا کہ وہ بھاٹوں اور میراثیوں کو جو امراء کی تعریف میں گیت پڑھ کر ان سے روپیہ بٹورتے تھے، انہیں کچھ نہ دیتے۔ انہوں نے کئی مسافر خانے اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ احمد آباد میں ایک محلّہ تعمیر کیا جو ان کے نام پر بخاری محلّہ کہلاتا ہے۔ نامور عالم الدین شاہ وجیہہ الدین احمد آبادی کا روضہ اور اس کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کروائی۔ دہلی کے قریب فرید آباد اور اس کی عمارتیں اور تالاب بھی شیخ کی یادگار ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ کے مزار پر انہوں نے صندل کا چھپر کھٹ بنوایا تھا اور

اس پر سیپ کی چتر کاری کرائی تھی۔ لاہور میں بھی انہوں نے ایک محلّہ بنوایا۔ لیکن اپنے لئے کبھی کوئی مکان یا حویلی تعمیر نہیں کرائی۔ ہمیشہ اس طرح قیام کرتے کہ گویا کوچ پر ہیں۔ سپاہ کی تنخواہ اپنے روبرو تقسیم کرواتے۔ ہر روز ایک ہزار آدمی کو ان کی سرکار سے کھانا ملتا۔ پانچ سو کا کھانا تو ان کے گھر بھجوا دیا جاتا اور پانچ سو کے ساتھ شیخ خود بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ لوگ کتنا بھی شور مچاتے لیکن شیخ کی پیشانی پر شکن نہ آتا۔''

شیخ محمد اکرام نواب مرتضیٰ خان شیخ فرید کی وفات اور مدفن کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شیخ فرید کے حسن عقیدت اور دست کرم نے بہت سے مزارات کی شان وشوکت بڑھائی لیکن ان کا اپنا مزار کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ دہلی سے قطب کو جو راستہ جاتا ہے، اس پر ایک سڑک حضرت چراغ دہلی کو مڑتی ہے۔ اس سڑک پر ایک سرخ گنبد کے سامنے ایک قبرستان میں شکستہ چار دیواری کے اندر بہت سی قبریں ہیں۔ ان کے درمیان لو ہے کے ایک مختصر کٹہرے کے اندر سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی قبر ہے۔ سرہانے قد آدم کتبہ سنگ مرمر کا لگا ہوا ہے۔ اس کی عبارت یوں ہے۔

سبحان الملک الحی یا اللہ الذی لایموت و لایفوت

در زمان دولت حضرت عرش آشیانی جلال الدین اکبر بادشاہ غازی شیخ فرید الدین سید احمد بخاری بہ عنایات آں حضرت ممتاز بود و در عہد عدالت نور الدین جہانگیر بادشاہ ابن اکبر بادشاہ بہ خطاب مرتضیٰ خان سرفراز گردید۔ بتاریخ ۹ جلوس مطابق ۱۰۲۵ھ رحمت الٰہی پیوست۔

مرتضیٰ خان چو بحق واصل شد
گشت اقلیم بقا مفتوحش
بہر تاریخ ملائک گفتند
باد پر نور الٰہی روحش

فخر روزگار حاتم دوراں، صاحب سیف و قلم، مرد مجاہد، فاضل اجل، عارف کامل نواب مرتضیٰ خان شیخ سید فرید الدین بخاری نے ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی اور اپنے مولد و مسکن دہلی میں دفن ہوئے۔

محمد بن فضل اللہ

شیخ محمد بن فضل اللہ برصغیر پاکستان و ہند کے ممتاز علماء، وفقہاء اور مشہور اہلِ اللہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ۹۵۲ھ میں احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ محمد غوثی شطاری مندوی نے اپنی تالیف ''گلزار ابرار'' میں شیخ محمد بن فضل اللہ کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آپ کی زاد بوم گجرات ہے، نشوونما دارالاماں احمد آباد میں پایا ہے۔ تسلیم، توکل، تقویٰ اور ظاہری و معنوی علوم کی فضیلتوں سے مالا مال ہیں۔ رسمی علوم میں وجیہہ اللہ احمد آبادی کے شاگرد تھے اور طریقت میں شیخ ماہ بیر پوری کے مرید اور خلیفہ ہیں۔''

شیخ محمد اکرام کی تحقیق کے مطابق شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری شاہ وجیہہ الدین کے ایک نامور شاگرد ہیں، جن کا شہرہ دور دور تک پہنچا اور وہ اس عہد کے بڑے علمی مرکز برہان پور کے نمائندہ سمجھے جاتے تھے۔ ان کے والد شاہ فضل اللہ برہانپوری اپنے زمانے کے مشہور صوفی اور عالم تھے بلکہ ''نائب رسول اللہ'' کہلاتے تھے۔ مغل فرمانروا شاہجہان کہا کرتا تھا کہ اگرچہ کئی بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں لیکن کامل شیخ صرف دو دیکھے ہیں۔ میاں میر لاہوری اور شیخ المشائخ فضل اللہ۔ شاہ فضل اللہ کا اصل وطن جونپور تھا لیکن وہاں سے نقل مکانی کر کے برہانپور میں مقیم ہو گئے تھے۔ جہاں آپ فقط تفسیر اور حدیث کا درس دیتے تھے اور صوفیانہ ارشاد و ہدایت سے باطنی راہنمائی اور تزکیہ نفس کا اہتمام کرتے تھے۔

شیخ محمد بن فضل اللہ کے سلسلۂ بیعت کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ شیخ وجیہہ الدین احمد آبادی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ) کے مرید تھے اور شیخ محمد بن خیر الدین حسنی المعروف بہ غوث مصنف جواہر خمسہ کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر زبید احمد نے بھی اُن کے

بارے میں یہی لکھا ہے کہ وہ ایک صوفی اور عالم وجیہہ الدین گجراتی کے مرید تھے۔

شیخ محمد اکرام ''رود کوثر'' میں رقمطراز ہیں کہ ''شیخ محمد بن فضل اللہ احمد آباد میں ۱۵۴۵ء کے قریب پیدا ہوئے۔ پھر حجاز چلے گئے۔ شیخ علی متقی کی صحبت پائی۔ پھر احمد آباد واپس آئے۔ شاہ وجیہہ الدین سے تکمیل تعلیم کی۔ پھر شیخ ابو احمد جعفر کے پاس جو آپ کے والد کے مرید تھے مالوہ کے شہر اسیر میں پہنچے اور بالآخر برہانپور میں توطن اختیار کر کے مدرسہ اور مسند ارشاد و ہدایت کو زینت دی۔ سچے عاشق رسولؐ تھے۔ بالآخر آپ نے درس و تدریس چھوڑ کر یاد خدا اور خلق خدا کی روحانی رہنمائی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا، لیکن تصنیف و تالیف کی دنیا میں بھی آپ کا نام بلند ہے۔ آپ کا اصل شاہکار التحفۃ المرسلہ الی النبیؐ'' ہے۔ لیکن اور کتابیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً التحفۃ المرسلہ کی شرح آپ نے ''الحقیقت الموافق الشریعت'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کی ایک نقل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے۔''

شیخ محمد بن فضل اللہ کی شاہکار تصنیف ''التحفۃ المرسلہ الی النبیؐ'' کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' (The contribution of India & Pakistan to Arabic Literature) میں لکھتے ہیں:

> ''اس کا تعلق مسئلہ وحدت الوجود سے ہے۔ مصنف کا یہ نظریہ ہے کہ صرف خدا ہی ایک وجود ہے اور یہ وجود اگرچہ واحد ہے، مگر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وجود تمام موجودات کی اصل و حقیقت ہے اور اس اعتبار سے یہ وجود نہ تو کسی پر منکشف کیا جا سکتا ہے اور نہ ذہن اس کا احاطہ کر سکتا ہے۔''

☆ پہلا درجہ وجود مطلق یعنی وجود بے قید و صفات کا ہے۔ یہ درجہ، درجہ احدیت کہلاتا ہے اور حقیقت حقہ ہے۔

☆ دوسرا درجہ پہلی تقید کا ہے۔ جس کا مقصد و مفہوم اس وجود کی ذات اور اس کی صفات اور مستقبل کی تمام مخلوقات کا اجمالی عرفان ہے۔ یہ درجہ الوحدت کہلاتا ہے اور یہ حقیقت محمدی ہے۔

☆ تیسرا درجہ دوسری تقید کا ہے جس کا مقصد و مفہوم اس وجود کی ذات اور اس کی صفات اور کائنات کا مفصل علم ہے۔ یہ درجہ واحدیت کہلاتا ہے اور یہ حقیقت انسانی

ہے اور یہ تینوں درجات ابدی قرار دیئے گئے ہیں۔

☆ چوتھا درجہ ارواح کا ہے۔ یعنی مجرّد اور مفرد اشیاء۔

☆ پانچواں درجہ عالم المثال ہے یعنی مرکب اشیاء مگر اتنی لطیف کہ تقسیم نہیں کی جا سکتیں۔

☆ چھٹا درجہ عالم الامثال ہے یعنی مرکب اشیاء جو مادی ہیں اس لئے قابلِ تقسیم ہیں۔

☆ ساتواں درجہ مذکورہ بالا تمام مدارج کا خلاصہ ہے، یہ آخری تقسیم ہے اور اس کو انسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں وجود کے ان سات مدارج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

پہلے تین مدارج کے نام یعنی درجہ احدیت، درجہ الوحدت اور درجہ الواحدیت، ایک ہی مصدر احد کے مشتقات ہیں۔ جس کے معنی ہیں، ایک۔ چنانچہ لسانی اعتبار سے ان تینوں لفظوں کے معنی میں فرق نہیں مگر مصنف نے اپنا مطلب بیان کرنے کے لئے ان کو اس طرح استعمال کیا ہے گویا ان کے معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد کا یہ اعتراض بلا جواز اور گمراہ کن ہے۔ اس لئے کہ یہاں یہ الفاظ محض اپنے لغوی معنوں میں نہیں بلکہ صوفیانہ اصطلاحات (terms) کے طور پر استعمال ہوئے ہر علم (subject) یا مضمون (discipline) کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ علم طب، فلسفہ، طبعیات، کیمیا، جغرافیہ، فلکیات وغیرہ جتنے بھی علوم ہیں ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی اصطلاحات ہیں۔ جن کے معانی و مفاہیم اُن کے اپنے مضمون تک مختص ہیں۔ حتیٰ کہ خالص دینی علوم اور موضوعات میں بھی بعض الفاظ کے لغوی معنوں سے قطع نظر ان کے اصطلاحی معنی مراد لئے جاتے ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ہم کسی ایسے علم، موضوع یا مضمون (Subject) کا تصوّر ہی نہیں کر سکتے جس میں اصطلاحات نہ ہوں اور الفاظ کی تراکیب کو اصطلاحی معنوں میں استعمال نہ کیا جاتا ہو۔ اِسی طرح علمِ حدیث اور علمِ فقہ اور علمِ تفسیر میں بھی بعض الفاظ اور تراکیبِ الفاظ اصطلاحات کے طور پر مستعمل ہیں۔ جن سے ہر صاحبِ علم بخوبی آشنا ہے۔ مگر جب یہ اصطلاحی معنوں میں استعمال ہونے والے الفاظ عام لوگوں کے سامنے بولے جاتے ہیں تو ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔

علمِ حدیث کی اپنی بے شمار اصطلاحات ہیں جن کا جاننا علماء، محدثین، ائمہ، فقہاء اور

صوفیہ کرام کے لئے از حد ضروری ہے۔ خود لفظ حدیث اور سنت بھی شرعی اصطلاحات (terms) ہیں، اور ان کی تعریفات (definitions) ہیں۔ پھر حدیث اور سنت کا فرق، حفاظت حدیث، حدیث وسنت کی یگانگت اور خبر و اثر اور حدیث قدسی، روایت حدیث، سماع، قرأت، اجازہ، مناولہ، مکاتبہ، اعلام، وصیت، وجادہ اور روایت و درایت کے اعتبار سے علم جرح و تعدیل، علم رجال الحدیث، علم مختلف الحدیث، علل الحدیث، غریب الحدیث، ناسخ ومنسوخ، رواۃ کے شرائط، محدثین کا مقیاس و معیار، ضبط و عدالت، یہ سب علم حدیث کی اصطلاحات ہیں۔

احادیث کی مختلف اقسام کے لئے جو الفاظ وتراکیب استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً حدیث متواتر، متواتر لفظی، متواتر معنوی، خبر احاد، خبر واحد موجب علم یقین، غریب، حدیث مشہور، پھر حدیث حسن اور اس کی اقسام، حسن لذاتہ اور حسن بغیرہ وغیرہ، اسی طرح حدیث اور حدیث ضعیف کی اقسام، مرسل، حدیث مرسل کی عدم حجیت، منقطع، مُعضل، مُدلس، تدلیس، اور مرسل خفی، مضطرب، مقلوب، شاذ، منکر، متروک، موقوف، مقطوع اور پھر احادیث کی مشترک اقسام مرفوع، مسند، متصل یا موصول، حدیث معنعن، حدیث مؤنن، حدیث معلق، فرد، غریب، عزیز، مشہور، مستفیض، حدیث مشہور صحیح، حدیث مشہور ضعیف، حدیث مشہور باطل، سند عالی، سند نازل، موافقہ، بدل، مساواۃ، مصافحہ، متابع، مدرج، مسلسل۔ ان سب الفاظ وتراکیب کو بطور اصطلاحات استعمال کیا جاتا ہے۔

کتبِ احادیث کے نام یعنی صحاح جو جمع صحیح کی ہے۔ الجوامع جو جمع جامع کی ہے، المسانید جو جمع مسند کی ہے، معاجم جو جمع معجم کی ہے، متدرکات جو جمع متدرک کی ہے، مستخرجات جو جمع مستخرج کی ہے اور الاجزاء جو جمع جزء کی ہے یہ سب احادیث کے مجموعات کے نام ہیں، لیکن یہ الفاظ اپنے اصطلاحی معنی رکھتے ہیں۔ اب صحاح کو صحاح اس لئے نہیں کہا جاتا کہ کتب صحاح کی تمام احادیث صحیح ہیں اور احادیث کے دوسرے مجموعات کی احادیث صحیح نہیں ہیں بلکہ احادیث کے دوسرے مجموعوں میں بھی صحیح احادیث موجود ہیں جب کہ صحاح کی بعض احادیث یقیناً صحیح نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ان کتبِ احادیث کے لئے یہ اصطلاحات وضع ہوگئیں جو آج بھی مروّج ہیں۔ مُسند، محدّث اور حافظ کے مراتب میں فرق ہے۔ مگر فرق سے قطع نظر برصغیر میں عوام و خواص کے نزدیک حافظ سے مراد حافظِ قرآن لیا جاتا ہے۔ مگر علمِ حدیث میں اس کے برعکس حافظ

سے مراد حافظِ حدیث ہوتا ہے جو اپنے مرتبہ و مقام میں مُسند اور محدّث سے مرتبہ و مقام میں بلند ہوتا ہے اور بعض دیگر ضروری اوصاف کا حامل بھی۔

اب یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اصطلاحاتِ حدیث کوئی آسان اور محدود موضوع نہیں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صبحی صالح اپنی مشہور کتاب ''علوم الحدیث'' میں لکھتے ہیں کہ ''فن حدیث کی اصطلاحات ایک ایسے دقیق فلسفہ پر مبنی ہیں جس میں جوہر عرض سے، معنی لفظ سے، متن سند سے اور عقل و حس نقل و تقلید سے مقدم ہے۔ ظاہر ہے کہ علمی مباحث کے ضمن میں اس پیچیدہ مسئلہ کی توضیح ہمارے لئے چنداں آسان نہ تھی۔ اس لئے کہ قاری جب تک اس کے شواہد و امثلہ بذاتِ خود مشاہدہ نہ کرے وہ اس سے کلیتہً آگاہ نہیں ہو سکتا۔''

ڈاکٹر صبحی صالح نے حدیث کی اصطلاحات کے بارے میں یہ لکھنے کے بعد اپنی کتاب ''علوم الحدیث'' کے ایک پورے باب میں ان اصطلاحات کی وضاحت اور ان کی مشکلات بیان کی ہیں اور ''التدریب'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں کچھ تو خالص صحیح، حسن یا ضعیف ہیں اور بعض صحیح و حسن مشترک ہیں اور بعض وہ ہیں جو مساوی طور پر تینوں میں مشترک ہیں۔ پھر حدیث کی ان خالص یا مشترک اقسام کے لئے بھی بہت سی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ ان جداگانہ اصطلاحات کو علوم بھی کہتے ہیں اور انواع بھی۔ علمائے حدیث اس امر پر متفق ہیں کہ یہ اقسام خارج از حصر و عدد ہیں۔

حافظِ حدیث اور ماہرِ انساب امام ابوبکر محمد بن موسیٰ بن حازم ہمدانی (متوفی ۵۸۴ھ) علمِ حدیث کی ان جداگانہ اصطلاحات جن کو علوم بھی کہا جاتا ہے اور انواع بھی، کے بارے میں ''التدریب'' میں فرماتے ہیں: ''علمِ حدیث کی اقسام ایک سو تک پہنچتی ہیں، ہر نوع ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر طالب علم اپنی پوری عمر بھی اس نوع میں کھپاوے تو اس کی انتہا کو نہیں پا سکتا۔''

محدث ابن الصلاح نے اپنی کتاب ''علوم الحدیث'' میں علمِ حدیث کی پینسٹھ اقسام کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ آخری حد نہیں ہے بلکہ اس کی لاتعداد قسمیں ہو سکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راویانِ حدیث اور مرویات کے احوال اور صفات کا کچھ ٹھکانہ نہیں۔

اصطلاحاتِ حدیث کے بارے میں ڈاکٹر صبحی صالح نے اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے

لکھا ہے: کہ ہمارے خیال میں علامہ جمال الدین قاسمی (متوفی ۱۳۳۲ھ) نے ''قواعد التحدیث'' میں احادیث کی جو تقسیم کی ہے، وہ عقل و منطق سے قریب تر ہے۔ علامہ مذکور نے حدیث کے ایسے القاب کا ذکر کیا ہے جس میں صحیح حسن سب شامل ہیں۔ حدیث کی بعض قسمیں وہ ہیں جن میں صحیح حسن اور ضعیف سب شریک ہیں، بعض قسمیں ضعیف کے ساتھ خاص ہیں۔ چونکہ یہ تقسیم ہمیں پسند ہے، اس لئے ہماری یہ تصنیف بڑی حد تک ''قواعد التحدیث'' سے متاثر نظر آتی ہے مگر قاری کو اس حقیقت سے باخبر رہنا چاہئے کہ ہم نے اپنی اصطلاحات و تقسیمات میں ہر جگہ علامۂ شام جمال الدین قاسمی کے ساتھ اتفاق ہی نہیں بلکہ اختلاف بھی کیا ہے اور متقدمین تو کہہ چکے ہیں کہ ''لا مشاحة في الاصلاح'' ''نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔''

گویا کہ علم حدیث کی بے شمار اصطلاحات ہیں بلکہ ان کے بارے میں محدثین کے مابین اختلاف بھی ہیں۔ علم حدیث کی طرح علم فقہ و تفسیر کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ حتی کہ تاریخ و سوانح اور سیرت کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ شیخ کی جمع شیخین ہے مگر علم فقہ یا تاریخ میں شیخین سے مراد صرف خلیفہ الرسول سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ اور امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ لئے جائیں گے۔ عبادلہ جمع عبداللہ کی ہے لیکن عبادلہ سے مراد صرف چار صحابہ کرام یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمرو العاص لئے جاتے ہیں۔ اسی طرح حلف الفضول میں لفظ فضول جمع فضل کی ہے تو ان سے فضل نامی وہ اشخاص مراد ہیں جن کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔ حلف الفضول وہ عہد ہے جس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے شرکت کی تھی اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں شریک ہونے والے زیادہ تر افراد فضل نامی تھے۔ اسی طرح حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کے لئے ''امین الامت''، حضرت خالد بن ولید کے لئے ''سیف اللہ'' اور حضرت عبداللہ بن عباس کے لئے ''ترجمان القرآن'' کے القاب مختص ہو گئے ہیں اور تابعین میں ''امام اعظم'' حضرت نعمان بن ثابت ابو حنیفہ کے لئے اور ''صاحبین'' امام اعظم کے دو شاگردوں یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد کے لئے ہی استعمال ہوتے ہیں اور ''صحیحین'' سے ہمیشہ بخاری اور مسلم کی کتب احادیث ہی مراد لی جاتی ہیں۔ یہ سب اصطلاحی الفاظ و القاب ہیں جن کا مفہوم و مقصود متعین ہو چکا ہے۔

قرآن حکیم میں بھی اصطلاحات یعنی آیات مبارکہ میں ایک لفظ ایک مقام پر اپنے لغوی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، تو اسی لفظ سے دوسری جگہ اصطلاحی معنی مراد لئے گئے ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ہم صرف قرآنِ حکیم کی اصطلاح ''تنزیل'' کو لیتے ہیں۔ وگرنہ قرآن حکیم میں امر، حکم، مولد، قضا، قسط اور میزان ایسے الفاظ بھی متعدد مقامات پر اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور یہ قرآن کی مستقل اصطلاحات ہیں مگر یہاں ہم لفظ تنزیل ہی کو لیتے ہیں جو صرف اُس وحی کے لئے مخصوص ہے جسے وحی ملفوظ، وحی جلی یا وحی متلو کہا جاتا ہے۔ جبکہ انزال و تنزیل اور اس کے مشتقات قرآنِ کریم ہی میں ماء (پانی) سکینہ (اطمینان) آمنہ (سکون) سلطان (سند) مائدہ (خوان) نور (روشنی) ملک (فرشتہ) کنز (خزانہ) جنود (لشکر) انعام (چوپائے) خیر (دولت یا نیکی) من وسلویٰ اور حدید وغیرہ سب کے لئے آئے ہیں۔

علامہ راغب اصفہانی کی مفردات القرآن سے اس ضمن میں راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے النزول کے لغوی معنی بیان کرنے کے علاوہ یہ بھی بتلایا ہے کہ قرآن میں یہ لفظ کہاں کہاں استعمال ہوا ہے۔ اور کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ نزل بکذا او انزلہ کے ایک ہی معنی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر عذاب یا نعمتوں کے نازل کرنے سے ان کا موضوع یا عطا کرنا مراد ہوتا ہے۔ پھر علامہ راغب لکھتے ہیں کہ عذاب کے متعلق انزال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن اور فرشتوں کے نازل کرنے کے متعلق انزال اور تنزیل دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں معنوی فرق یہ ہے کہ تنزیل کے معنی ایک چیز کو مرۃ بعد اخریٰ اور متفرق طور پر نازل کرنے کے ہوتے ہیں اور انزال کا لفظ عام ہے جو ایک ہی دفعہ مکمل طور پر کسی چیز کو نازل کرنے پر بوالا جاتا ہے۔ علامہ راغب کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے لئے تنزیل ہی کا لفظ یا اصطلاح مخصوص ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے نزلنٰہ تنزیلاً (۱۷:۳۱) اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا۔

مولانا جعفر شاہ پھلواری اپنی مختصر مگر جامع کتاب ''مقام سنت'' میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''تنزیل کی اصطلاح کچھ ہمارا اپنا ایجاد نہیں بلکہ قرآن کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مخصوص طور پر اُس وحی کے لئے ہے جسے ملفوظ یا جلی یا متلو وغیرہ کہا جاتا ہے... قریبا ڈیڑھ سو مقامات پر قرآن پاک میں یہ

لفظ فرقان، قرآن، کتاب، تورات، انجیل، سورہ، آیت وغیرہ کے لئے آیا ہے اور ہر جگہ اس سے وحی مکتوب و ملفوظ ہی مراد ہے۔"

اس مفید و معلوماتی اور ضروری بحث کے بعد اب ہم ڈاکٹر زبید احمد کے اس جملہ معترضہ کی طرف واپس آتے ہیں جو انہوں نے شیخ محمد بن فضل اللہ کی شاہکار تصنیف "التحفۃ المرسلۃ الی النبیؐ" کے مشمولہ سات مدارج کے بارے میں اپنے اس تحقیقی مقالے یعنی "عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ" بزبان انگریزی تحریر کیا تھا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور ڈاکٹر کا سابقہ ان کے نام کے ساتھ لگا۔ چنانچہ ڈاکٹر زبید احمد کا وہ جملہ جس پر ہم نے اس قدر بحث کی وہ یہ ہے کہ پہلے تین مدارج کے نام ایک ہی مصدر احد کے مشتقات ہیں جس کے معنی ہیں ایک۔ لسانی اعتبار سے ان تینوں لفظوں کے معنی میں فرق نہیں مگر مصنف نے اپنا مطلب بیان کرنے کے لئے ان کو اس طرح استعمال کیا ہے گویا ان کے معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ہے یا، ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں "یہ صورت پانچویں اور چھٹے مدارج یعنی عالم المثال اور عالم الامثال کے معنوں کی ہے۔"

مختلف علوم بالخصوص علمِ حدیث کی اصطلاحات کے حوالے سے جو بحث ہم نے کی ہے بلکہ قرآن حکیم میں اصطلاحی معنوں میں استعمال ہونے والے الفاظ کا ذکر بھی کیا ہے جس کے بعد اس امر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ڈاکٹر زبید احمد کے اس بے معنی اور گمراہ کن جملے کو برداشت کیا جا سکے۔ ڈاکٹر زبید احمد ایسے فاضل دانشور کو اتنا تو ضرور معلوم ہوگا کہ جلسہ، جلوس، جلوسی، جلس، اجلاس اور مجلس سب عربی زبان کے الفاظ اور اسم مذکر ہیں اور سب ایک ہی مصدر کے مشتقات ہیں۔ مگر یہی الفاظ اپنے لغوی معنی بھی رکھتے ہیں اور اصطلاحی معنوں میں بھی مستعمل ہیں۔

☆ اجلاس کے لغوی معنی بیٹھنا اور اصطلاحی معنی کچہری لگانا یا دربار لگانا کے ہیں۔
☆ جلوس کے معنی نشست اور بیٹھک کے علاوہ تخت نشینی، شاہانہ حشم، کرّ و فر، تجمّل، شان و شوکت اور امراء و سلاطین کی سواری کے بھی ہیں۔
☆ جلوسی، صفت منسوب ہے جلوس سے۔ یعنی تخت نشینی سے منسوب جیسے سنِ جلوسی وغیرہ۔ سامان جلوس اور شاہی جلوس کے ملازمین کو بھی جلوسی کہتے ہیں۔
☆ جلیس، ہم نشین کے علاوہ مصاحب، ساتھی، رفیق اور ندیم کو بھی کہتے ہیں۔ جلسہ سے نشست اور بیٹھک کے علاوہ محفل، مجمع، جمگھٹا، ضیافت، دعوت بھی مراد ہے۔

اور جلسہ محفلِ رقص و سرود اور صرف رقص و سرود اور ناچ رنگ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ نماز میں سجدہ کر کے اول مرتبہ بیٹھنے کو بھی جلسہ کہتے ہیں۔

☆ مجلس کے لغوی معنی انجمن، کونسل، نشست گاہ اور وہ مقام جہاں لوگ کثیر تعداد میں جمع ہوں، کے ہیں۔ جبکہ مجلس کا لفظ معاشرے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور پھر کون نہیں جانتا کہ مجلس کا لفظ انجمن عزائے حضرت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کے ماتم اور فاتحہ کے مجمع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ موقع ومحل کی مناسبت سے ایک ہی لفظ سے مختلف معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ آپ ڈاک خانے میں جا کر ٹکٹ طلب کرتے ہیں تو آپ کو ڈاک کا ٹکٹ (postage stamp) یا محصول ٹکٹ ملے گا۔ ڈسٹرکٹ کورٹ، کچہری یا ہائی کورٹ میں جائیں تو ٹکٹ کے نام پر عدالتی سٹام یا اسٹامپ (judicial stamp) یا non judicial stamp وغیرہ ملیں گے اور اگر ریلوے سٹیشن پر جا کر ٹکٹ مانگیں گے اور کہیں کہ کراچی کا ٹکٹ دیں تو کراچی کے کرائے کا ٹکٹ ملے گا اور اگر دوسرے کاؤنٹر پر جا کر ٹکٹ طلب کریں تو آپ کو پلیٹ فارم کا ٹکٹ ملے گا۔ پھر ٹکٹ اُس اجازت نامے کو بھی کہتے ہیں جس کی رُو سے قیدیوں کو بوجۂ نیک چلنی باہر جا کر کام کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسی طرح سینما گھروں میں شائقین جا کر ٹکٹ ہی خریدتے ہیں جو سینما گھر میں داخلے کا اجازت نامہ (permit) ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے اپنے خطوط میں بھی ٹکٹ (ticket) کو اجازت نامے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ''شہر دہلی میں داخلہ کے لیے ٹکٹ ملتا ہے۔'' ڈاکٹر زبید احمد کے اعتراض کو رفع کرنے کے لیے لفظ ٹکٹ کے مختلف معانی و مفاہیم میں استعمال کی مثالیں ہی کافی تھیں مگر ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد'' کے مصداق ہم نے علم حدیث کی اصطلاحات کی بحث کچھ معلومات میں اضافے اور کچھ علم حدیث میں لوگوں کی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کی ہے، کہ شاید اسی بہانے لوگوں میں دینی علوم کی رغبت پیدا ہو جائے۔

اور پھر ڈاکٹر زبید احمد اپنے نام کے لاحقے ہی کو دیکھ لیں۔ کیا ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہیں کہ یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے اور وہ پی ایچ ڈی ہیں اور انہوں نے عربی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کر کے یہ ڈگری حاصل کی ہے؟ میڈیکل سائنس کے سند یافتہ ایم بی بی ایس یا ایم ڈی کو بھی ڈاکٹر کہتے ہیں۔ ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری حاصل کرنے والا بھی

ڈاکٹر ہی کہلاتا ہے اور ہومیو پیتھی طریق علاج کا ماہر بھی ڈاکٹر ہی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ طب کی کوئی سند نہ رکھنے والے عطائی حکیم کو بھی عوام ڈاکٹر صاحب ہی کہتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب اپنا یہ تحقیقی مقالہ مرتب کر رہے تھے اس وقت ابھی انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی نہیں تھی، ڈاکٹر کا لاحقہ ان کے نام کا حصہ نہیں بنا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر زبید احمد کو یہ معلوم ہونا چاہئے تھا کہ جس طرح اور علوم وفنون کی اصطلاحات ہوتی ہیں اس طرح تصوّف کی بھی اصطلاحات ہوتی ہیں۔ نیز یہ کہ ایک ہی مصدر کے متعدد مشتقات مختلف معانی و مفاہیم میں استعمال ہوتے ہیں، بلکہ موقع ومحل اور مقامات کی مناسبت سے ایک ہی لفظ سے مختلف معانی مراد لیے جاتے ہیں۔

☆ تصوف میں احد اور واحد کے الفاظ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور احد اسمِ ذات ہے۔ باعتبار نفی تعداد، صفات و اسماء کے اور نسبت و تعینات اس میں نہیں ہے۔ اسی طرح صوفیہ کرام ''احدیت'' ذات پاک کے اُس مرتبہ کو کہتے ہیں جس میں کسی وہم و خیال، کسی لفظ کی گنجائش نہیں۔ جس کی تعبیر سے زبان قاصر، جس کے ادراک سے عقل عاجز ہے۔ اسی لئے اس مرتبہ کے واسطے ایسی تراکیب اور اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ مرتبہ لاتعین۔ مرتبہ مالا بشرط شئی، ذات بحت، وجود المطلق، بے چون و بے چگون۔

شیخ محمد بن فضل اللہ نے تصوّف کی ان ہی اصطلاحات کے پیش نظر باری تعالیٰ کے لئے وجود مطلق کی اصطلاح استعمال کی اور اسے لوگوں کو سمجھانے کے لئے وجودِ بے قید و بے صفات کا نام دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ درجۂ احدیت ہے اور حقیقتِ حقّہ ہے۔

☆ وحدت بھی ایک صوفیانہ اصطلاح ہے جس سے مراد تعین اوّل یعنی حقیقتِ محمدیہ ہے۔ اسے علم اجمالی، حب ذاتی، برزخ کبریٰ بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ شیخ محمد بن فضل اللہ نے تصوّف کی اس اصطلاح یعنی ''وحدت: تعین اول'' کو استعمال کرتے ہوئے لکھا۔

> ''دوسرا درجہ پہلی تقیید (یعنی تعین اوّل) کا ہے جس کا مقصد و مفہوم اس وجود کی ذات اور اس کی صفات اور مستقبل کی تمام مخلوقات کا اجمالی عرفان ہے۔ یہ درجہ الوحدت کہا جاتا ہے اور یہ حقیقتِ محمدیؐ ہے۔

☆ وحدت: تعین اوّل یعنی حقیقتِ محمدیؐ کے بعد ''واحدیت'' کی اصطلاح آتی ہے

جس سے مراد ذات کا تفصیلی علم ہے۔ اس مرتبہ واحدیت میں اسماء وصفات وحقائق الٰہیہ وکیانیہ متعین ہوتی ہیں۔ اس طرح احدیت اور وحدت کے بعد وجود کا تیسرا مرتبہ واحدیت ہے۔ چنانچہ شیخ محمد بن فضل اللہ اس مرتبۂ واحدیت کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

''تیسرا درجہ دوسری تقیید کا ہے جس کا مقصد ومفہوم اس وجود کی ذات اور اس کی صفات اور کائنات کا مفصل ہے۔ یہ درجہ واحدیت کہا جاتا ہے اور یہ حقیقتِ انسانی ہے اور یہ تینوں درجات ابدی قرار دیئے گئے ہیں۔

☆ عالم عالم ارواح، عالم مثال، عالم معنی، عالم صغیر، عالم کبیر، عالم خلق، عالم ملک، عالم شہادت، وغیرہ سب تصوّف کی اصطلاحات ہیں۔ اگر صرف عالم کہا جائے تو ذات بحت کے جملہ مراتب ظہور کا نام عالم ہے۔ یعنی احدیت، حقیقتِ محمدیہ مرتبہ وحدت سے اجسام تک یہ سب عالم کہلاتے ہیں اور عالمِ مثال سے مراد وہ عالم ہے جو برزج ہے عالم ارواح اور عالم اجسام کے درمیان۔ عالمِ مثال کو عالمِ برزخ کے علاوہ عالمِ جاری بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک لطیف جسم ہے۔ قابل طیر وسیر ہے، خواب میں نظر آتا ہے۔ اس کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اسے نہ تو ہاتھ سے چھوا جا سکتا ہے اور نہ آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور عالم ہے جسے عالمِ اجسام کہتے ہیں، اس عالم کو عالمِ شہادت بھی کہتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عالم قابلِ لمس ہے اسے ظاہری آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ عالمِ ذات کا انتہاء ظہور ہے۔ یہ تینوں عالم یعنی عالم ارواح، عالم مثال اور عالم اجسام، ذات کے مراتب خارجی کہلاتے ہیں۔ ذات کے یہ چھ مراتب ہیں ان کو تنزلاتِ ستہ کہتے ہیں اور یہ سب عین ذات ہیں، غیریت محض اعتباری ہے اور وہ ذاتِ مطلق باوجود ان تعینات اور تنزلات کے ویسی ہی بے چون و بے چگون ہے۔ اس معمہ کا کھل جانا توحید ذوقی ہے۔

اور اب ہمارے پیش نظر شیخ محمد بن فضلؒ کی ذاتِ گرامی ہے، جو ایک بلند پایہ محدث، ممتاز فقیہ، علوم عربیہ کے نامور فاضل و ماہر اور جلیل القدر مفسرِ قرآن بھی تھے اور بہت بڑے وحدت الوجودی بھی۔ چنانچہ سلسلۂ کلام کو ایک مرتبہ پھر وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں اسے چھوڑا تھا۔ ان کی کتاب کی تبویبی تقسیم کے تین مدارج کی

وضاحت تو ہم کر چکے ہیں اب باقی ماندہ چار مدارج میں عالم المثال اور عالم الامثال بھی تصوف کی اصطلاحات ہیں۔ ان کو شیخ محمد بن فضل اللہ استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "چوتھا درجہ ارواح کا ہے یعنی مجرّد اور مفرد اشیا۔" اور پانچواں درجہ عالم المثال ہے، یعنی مرکب اشیا، مگر اتنی لطیف کہ تقسیم نہیں کی جا سکتیں۔"

اسی طرح انہوں نے چھٹے اور ساتویں درجے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"چھٹا درجہ عالم الامثال ہے یعنی مرکب اشیا۔ جو مادی ہیں اس لئے قابل تقسیم ہیں۔"

"ساتواں درجہ مذکورہ بالا تمام مدارج کا خلاصہ ہے۔ یہ آخری تقسیم ہے اور اس کو انسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"

شیخ محمد بن فضل اللہ کی گرانقدر تصنیف "التحفة المرسلہ الی النبیؐ" کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں:

"مصنف نے لکھا ہے کہ وجود یعنی خالق نہ مخلوقات سے متصل ہے نہ منفصل ہے، نہ ان میں شامل ہے، ورنہ اس کا نتیجہ کثرت وجود ہوگا۔ مزید کہ کائنات اور اس میں جو کچھ بھی ہے عرض ہے اور جوہر صرف وجود (خالق) ہے۔ یہ نظریہ کہ خدا جوہر ہے اشعریوں کے اُس عام نظریہ کے خلاف ہے کہ خدا نہ جوہر ہے نہ عرض ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ان لوگوں کے تین طبقے قرار دیئے ہیں جو نظریہ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو یہ یقین رکھتا ہے کہ خالق تمام مخلوقات کی حقیقت ہے مگر مخلوقات میں خالق کو نہیں دیکھتا۔ اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو مخلوقات میں خالق کو دیکھتا ہے مگر خالق میں مخلوقات کو نہیں دیکھتا۔ اور تیسرا طبقہ وہ ہے جو خالق میں مخلوقات کو اور مخلوقات میں خالق کو دیکھتا ہے۔ اس تیسرے طبقے میں مصنف نے انبیا، اور اقطاب کو شامل کیا ہے۔"

برصغیر پاکستان وہند کے اکابر مشائخ اور جلیل القدر علمائے دین جن میں تفسیر رحمانی کے نامور شیخ علی بن احمد مہائمی الشافعی (متوفی ۸۳۵ھ)، شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۴ھ)، شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی (متوفی ۹۴۹ھ)، شیخ امان پانی پتی (متوفی ۹۵۷ھ)، تفسیر قرآن "شئون المنزلات" کے مشہور مصنف اور جلیل القدر عالم دین شیخ علی متقی (متوفی ۹۷۵ھ)، شیخ عبدالعزیز دہلوی (متوفی ۹۴۹)، تفسیر محمدی کے مصنف شیخ محمد بن احمد میانجی (متوفی ۹۸۲ھ)، حضرت سلطان باہو، شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی، شاہ عنایت

قادری اور سید بلھے شاہ کے علاوہ شیخ محبّ اللہ الہ آبادی، علامہ محمد اقبال اور میرزا غالب کے استادِ معنوی اور مرشدِ کامل میرزا عبدالقادر بیدل خاص طور پر قابل ذکر ہیں... یہ سب حضرات وحدت الوجودی ہیں اور شیخ محی الدین ابن عربی کے معتقدین میں سے ہیں۔ ان حضرات نے نظریۂ وحدت الوجود کو اپنا موضوع بحث و گفتگو بنایا اور اس موضوع پر مستقل اہمیت کے حامل گرانقدر کتب و رسائل بھی قلمبند کئے ہیں اور مزید برآں اس موضوع کے بارے میں اپنے ہم عصر علماء اور اپنے معتقدین کے نام مکتوبات بھی تحریر کئے اور انہوں نے نظریہ وحدت الوجود کو بیان کرنے میں جزوی طور پر ایک دوسرے سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ان حضرات کے علاوہ شیخ محمد بن فضل سے پہلے منظر عام پر آنے والے سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ قادریہ کے اکابر مشائخ جن میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور ان کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء بھی شامل ہیں، ان میں اکثر و بیشتر نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ شیخ اکبر کی کتابیں اُس زمانے میں برصغیر میں پہنچ چکی تھیں اور ان بزرگوں کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ وحدت الوجود کے قائل جن اکابر مشائخ اور مشاہیر کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ مولانا عبدالحئی حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کا تذکرہ ''اربابِ وجودی'' کے عنوان کے تحت کیا ہے اور اس فہرست میں شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری (متوفی ۱۰۲۹ھ) اور ان کے بعد آنے والے حضرات میں سے شیخ محبّ اللہ الہ آبادی (متوفی ۱۰۵۸ھ) اور شیخ محمد حسین الہ آبادی (متوفی ۱۳۲۲ھ) کو بھی شامل کیا ہے اور ان حضرات کی خدمت میں یوں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''ان میں ہر فرد یگانۂ روزگار تھا۔''

بتلانا یہ مقصود تھا کہ نظریہ وحدت الوجود کے قائل اکابر مشائخ نے بھی بعض امور میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔ مثال کے طور پر شیخ امان پانی پتی اور شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی ہم عصر بزرگ تھے اور دونوں وحدت الوجودی تھے۔ اور دونوں نے وحدت الوجود کے قائل ہوتے ہوئے اس نظریے کو علمی اور عرفانی سطح پر اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پیش اور بیان کیا۔

شیخ محمد بن فضل اللہ نے اپنی کتاب کے آخری حصے میں نظریہ وحدت الوجود کی تائید میں قرآن و حدیث سے جو حوالے دیئے ہیں ان میں سے چند ایک ڈاکٹر زبید احمد نے نقل کئے ہیں۔ وہ حوالے مندرجہ ذیل ہیں۔

قرآنی آیات

۱۔ للہ المشرق و المغرب

ترجمہ: مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں۔

۲۔ فاینما تولوا فثم وجهه الله

ترجمہ: پس تم جدھر رخ کرو گے وہیں اللہ کی ذات ہوگی۔

۳۔ نحن اقرب اليه من حبل الوريد

ترجمہ: ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

۴۔ وهو معكم اينما كنتم

ترجمہ: تم جہاں بھی ہو گے وہ تمہارے ساتھ ہی ہوگا۔

۵۔ هو الاول و الاخر و الظاهر و الباطن

ترجمہ: وہ اول بھی ہے آخر بھی، ظاہر بھی اور باطن بھی۔

احادیث نبویؐ

☆ تم میں سے کوئی آدمی جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے کیونکہ اس کا رب اس کے اور اس کے دل کے درمیان ہوتا ہے۔

☆ میرا بندہ نوافل کے ذریعے برابر میرا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تا آنکہ میں اسے پسند کرنے لگتا ہوں اور میں اسے پسند کر لیتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔

ان آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ کے حوالے نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے:

> ''ایسے مستند حوالوں کی بناء پر یہ نظریہ مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے کہ وحدت الوجود کا تصوّر اسلام میں بیرونی اثرات کے تحت داخل ہوا اور بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر اسلام پر بیرونی اثرات کے دروازے بالکل بند کر دیئے جاتے تب بھی اسلام میں وحدت الوجود کا نظریہ اخذ کر لیا جاتا۔''

گویا کہ وحدت الوجود کے اساسی نظریات آیات قرآنی اور ارشاداتِ نبویؐ میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالہ میں بروکلمین کی ''تاریخ عربی ادبیات'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''شیخ محمد بن فضل اللہ کی اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس پر کم از کم تین شرحیں لکھی گئی ہیں۔''

شیخ محمد اکرام ''رود کوثر'' میں شیخ محمد بن فضل اللہ کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غوثی جس نے گلزار ابرار اس زمانے میں تصنیف کی، جب آپ ابھی حیات تھے، لکھتا ہے کہ آپ خاندیش کے بادشاہ محمد شاہ بن مبارک شاہ فاروقی کے عہدِ حکومت میں گجرات سے خاندیش تشریف لائے۔ برہانپور میں مسجد اور خانقاہ تعمیر کی۔ حدیث، تفسیر اور دوسرے دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ اہل دل تھے، لیکن سماع اور سرود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سچے عاشق رسولؐ تھے۔ ہر سال جہاز کے موسم میں دیوانہ وار وطن سے نکلتے اور سمندر کے کنارے پر پہنچ جاتے۔ اگر قسمت یاوری کرتی تو جہاز پر سوار ہو کر حرمین شریفین میں پہنچتے اور روضہ نبویؐ کی زیارت سے دل کو تسکین دیتے۔ اس طرح آپ نے حجاز کے کئی سفر کئے۔ وطن میں بھی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مست رہتے۔ سال بھر میں اگر کوئی کوڑی پیسہ بچاتے تو اس لئے کہ سفر حجاز کا سامان ہو جائے۔ یا ربیع الاول میں مجلسِ میلاد پورے اہتمام سے ہو۔ ربیع الاول کے پہلے بارہ (۱۲) روز مجلسِ میلاد قائم ہوتی۔ ہر رات ذاکرین احادیث نبویؐ اور نعتیں پُر سوز آواز سے پڑھتے اور آپ اپنا سارا اندوختہ مجلس میں تبرکات، حلوے اور عطریات تقسیم کرنے اور ذاکرین کی خدمت میں صرف کر دیتے۔ اگر کچھ زیادہ ہوتا تو حرمین کے فقراء میں تقسیم کرنے کے لئے بھیج دیتے۔ بارگاہِ الٰہی میں آپ کی محبت نبویؐ مقبول ہوئی اور آپ کی ''التحفۃ المرسلہ الی النبیؐ'' نے بڑی شہرت پائی۔ اس کی کم از کم تین شرحیں لکھی گئی ہیں اور انڈونیشیا میں اس کا بہت چرچا تھا۔ ملایائی زبان کے ایک اہل قلم نور الدین رانیری نے اس کا ترجمہ ملایائی میں کیا۔ رانیری ہندی النسل تھا۔ لیکن جزائر شرقی میں بس گیا تھا اور اس نے کثرت سے ملایائی زبان میں کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابوں کا زمانہ تصنیف ۱۶۲۸ء سے شروع ہوتا تھا۔

شیخ محمد بن فضل اللہ نے درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور ذکر و فکر الٰہی کے علاوہ زندگی بھر تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ عاشق رسولؐ، عارف باللہ، مفسر قرآن اور یگانہ روزگار عالم دین شیخ محمد بن فضل اللہ نے ۱۰۲۹ھ میں وفات پائی۔ شیخ محمد اکرام نے ان کا سن وفات ۱۶۲۰ء لکھا ہے۔ اس کے مطابق بھی ۱۰۲۹ھ ہی بنتا ہے۔ خواجہ محمد ہاشم

مصنف ''زبدۃ المقامات'' نے شیخ محمد بن فضل اللہ کی تاریخ وفات لکھی ہے ۔

مظہر اسمائے سمی مصطفےٰ
آنکہ از نامش زباں چوں گل شگفت
سینہ اش شق آمد آخر از جہاں
بس کہ راز عشق دروے می نہفت
ابن فضل اللہ بود و ہاتفے
سال فوتش ابن فضل اللہ گفت

عیسیٰ جنداللہ

مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے ممتاز علماء اور اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ درس و تدریس اور لوگوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح وتربیت کے باب میں شان دار اور قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اُن کا نام ونسب یوں ہے:

اسم گرامی عیسیٰ ہے۔ مسیح الاولیاء اور جنداللہ اُن کے القاب ہیں۔ والد ماجد کا نام قاسم بن یوسف بن رکن الدین بن معروف بن شہاب الدین المعروف الشہابی الجندی السندھی الہندی۔

شیخ عیسیٰ جنداللہ کے آباء و اجداد ''پات'' کے رہنے والے تھے جو تعلقہ سیہون میں ایک مشہور قصبہ ہے جسے شیخ عیسیٰ کے آباء و اجداد نے آباد کیا تھا۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ''تذکرہ صوفیائے سندھ'' میں شیخ عیسیٰ کے احوال و آثار بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''شیخ عیسیٰ ان اولیائے کرام میں سے تھے جو سندھ سے ہجرت کر کے برہان پور آباد ہو گئے تھے۔''

سید محمد مطیع اللہ راشد نے اپنی تالیف ''سندھی اولیاء'' مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ میں بھی شیخ عیسیٰ اور اُن کی سندھ سے ہجرت کا ذکر کیا ہے۔ ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' چوتھی جلد (فارسی ادب: دوم) کے مقالہ نگار حامد خان حامد نے شیخ عیسیٰ کے احوال و آثار بیان کیے ہیں۔

مغل بادشاہ نصیرالدین ہمایوں اور اُس کے ساتھیوں کی سندھ میں آمد کے باعث یہاں شورش و بدامنی پھیلی تو سندھ کے بہت سے علماء اور صوفیہ کرام اپنے وطن کو چھوڑنے

پر مجبور ہو گئے اور نقل مکانی کر کے ملک کے مختلف علاقوں میں چلے گئے، جن میں شیخ عیسیٰ جنداللہ کے والد ماجد شیخ قاسم بن شیخ یوسف بھی تھے۔ شیخ قاسم اپنے بھائی شیخ طاہر محمد محدث کے ہمراہ پہلے احمد آباد پہنچے جہاں وہ حضرت محمد غوث گوالیاری کے بیعت ہوئے بعد ازاں اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق برار جا کر آباد ہو گئے۔ حاکم برار ان کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اہل و عیال سمیت ایلچ پور میں سکونت اختیار کر لی جہاں وہ ایک عرصے تک درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں مصروف رہے۔

شیخ عیسیٰ ۵ ذی الحجہ ۹۶۲ھ کو ایلچ پور میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی سے حصول علم کا بہت شوق رکھتے تھے۔ ۹ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد مروجہ علوم کی طرف توجہ کی۔ اپنے چچا بزرگوار شیخ محمد طاہر محدث جو اپنے زمانے میں علوم کے بہت بڑے فاضل تھے، سے فقہ، حدیث، تجوید کے علاوہ دوسرے علوم میں مہارت پیدا کی۔ ابھی عنفوان شباب تھا کہ والد ماجد شیخ قاسم اللہ کو پیارے ہو گئے اور اگلے برس ۹۸۲ھ میں حاکم برار تفاول خان کا بھی انتقال ہو گیا۔ جس سے اس علاقے کا نظم ونسق اور امن امان درہم برہم ہو گیا اور حاکم برہان پور محمد شاہ فاروق بصد اصرار شیخ محمد طاہر محدث اور اُن کے متعلقین کو ایلچ پور سے برہان پور میں لے آیا اور اُن کی بہت قدر و منزلت کی۔

شیخ محمد طاہر محدث اور اُن کے برادر زادے شیخ عیسیٰ کی برہان پور میں آمد کے بعد سندھ کے وہ خاندان جو مغل بادشاہ ہمایوں کی عہد میں بدامنی اور انتشار کے باعث نقل مکانی کر کے برصغیر کے مختلف علاقوں میں چلے گئے تھے برہان پور میں آ کر آباد ہو گئے۔ اس طرح برہان پور اہل سندھ کا ایک قابل ذکر مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ شیخ محمد طاہر محدث اور شیخ عیسیٰ جنداللہ کے مکانات کے قریب سندھیوں کی آبادی نے ایک مستقل بستی کی صورت اختیار کر لی اور یہ بستی سندھی پورہ کہلانے لگی اور آج بھی اسی نام سے موسوم ہے۔

شیخ عیسیٰ جنداللہ نے اپنے عم بزرگوار شیخ محمد طاہر محدث سے اکتساب علم کرنے کے علاوہ اپنے زمانے کے جن معروف وممتاز علماء و اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا اُن میں شیخ یوسف، قاضی جلال الدین اور حکیم عثمان پولکانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ظاہری علوم سے فارغ ہونے کے بعد شیخ عیسیٰ جنداللہ باطنی علوم کی طرف متوجہ ہوئے

اور شیخ لشکر محمد عارف کے دست حق پرست پر بیعت کر کے اُن کے طریقے کے مطابق عبادت و ریاضت اور مجاہدات میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔

خدائے بزرگ و برتر نے شیخ عیسیٰ جنداللہ کو غیر معمولی ذہنی و فکری صلاحیتوں اور قابل قدر عملی قوتوں سے نوازا تھا۔ وہ سخت مجاہدات کرتے تھے اور توکل و استغناء کے قائل تھے۔ مال و دولت اور جاہ و منصب کی مطلق پروا نہ کرتے تھے اور نہ کسی بڑے سے بڑے حاکم سے مرعوب ہوتے تھے۔ جب کوئی شخص اُن کے پاس مُرید ہونے آتا، اگر اس میں صلاحیت پاتے تو مُرید کر لیتے وگرنہ انکار کر دیتے یا کہتے کہ فلاں صاحب سے رجوع کرو۔ جس کو مُرید بناتے اُس کو ہدایت فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اُن سے بچو۔ پانچوں وقت کی نماز وقت پر ادا کرو۔ رمضان کے پورے روزے رکھو۔ اتنا مال ہے کہ زکوٰۃ دے سکتے ہو تو دو۔ اگر حج کی استطاعت رکھتے ہو تو حج بھی کرو۔ مرید کو ہدایات دیتے اور اُس سے گفتگو فرماتے وقت مرید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھتے۔ اگر کوئی عورت مرید بننا چاہتی تو درمیان میں پردہ ہوتا اور دوپٹہ کا ایک پلّا آپ کے ہاتھ میں دوسرا عورت کے ہاتھ میں ہوتا۔ اس کو بھی اسی قسم کی ہدایات دیتے۔ مریدین کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ نصائح کو تمثیلات کے رنگ میں اس طرح پیش کرتے کہ سامعین کے آئینۂ قلب پر منقش ہو جاتی تھیں۔

شیخ عیسیٰ جنداللہ کے طرز تبلیغ اور انداز درس و تدریس میں بڑی انفرادیت و جاذبیت تھی۔ طلباء کے علاوہ اہل ذوق بھی اُن کے حلقۂ درس میں بکثرت شریک ہوتے تھے۔ اُن کے حلقۂ درس میں شامل ہونے والوں میں وہ اربابِ علم و دانش بھی دور دراز کا سفر طے کر کے حاضر ہوا کرتے تھے جن کے اپنے حلقہ ہائے درس تھے جس سے شیخ عیسیٰ جنداللہ کے وعظ و ارشاد اور اُن کی تاثیر کلام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شیخ عیسیٰ کے درس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ مسائل کے مفاہیم و معانی اور غوامض کو اس طرح کھول کھول کر بیان کرتے تھے کہ سامعین نہ صرف ایک خاص لطف محسوس کرتے بلکہ اُن پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

شیخ عیسیٰ جنداللہ نے وعظ و ارشاد اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف تالیف کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا۔ چنانچہ انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں اور کئی

کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ اُن کی تصنیفات میں: ۱: روضۃ الحسنی، ۲: عین المعانی، ۳: انوار اسرار تفسیر، ۴: رسالہ حواس پنج گانہ، ۵: حاشیہ بر اشارہ غریبیہ، شرح کتاب انسان کامل مصنفہ شیخ عبدالکریم جیلی، ۶: شرح قصیدہ بُردہ، ۷: رسالہ قبلۃ المذاہب اربعہ مع اشارات اہل تصوف، ۸: حاشیہ بر شرح ضیائیہ، ۹: فتح محمدی در علوم ما یتعلق بہ التفسیر، ۱۰: تمیم شرح مائۃ عامل، ۱۱: رسالہ عقود، ۱۲: دو رباعیوں کی دو شرحیں، ۱۳: ترجمہ اسرار الوحی، ۱۴: رسالہ وحدت الوجود، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ شیخ عیسیٰ کے بعض اور رسائل بھی ہیں۔

شیخ عیسیٰ جنداللہ کا تعلق سلسلہ عالیہ قادریہ شطاریہ سے تھا۔ وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس اہم موضوع پر انہوں نے قلم بھی اٹھایا جیسا کہ اُن کی تصانیف کی فہرست سے ظاہر ہے۔ شیخ عیسیٰ کے ہزاروں مریدین کے علاوہ اُن کے بہت سے خلفاء اور شاگرد بھی تھے جن سے سلسلہ قادریہ و شطاریہ کا فیض نہ صرف خاندیش اور برار میں عام ہوا بلکہ دور دراز کے علاقوں میں بھی پھیلا۔

مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جنداللہ قادری شطاری نے ۱۴ شوال ۱۰۳۱ء کو برہان پور میں وفات پائی اور اپنے حجرۂ عبادت میں مدفون ہوئے۔ عبدالرحیم خان خاناں نے اُن کے مزار پر گنبد تعمیر کرایا۔

چاند بن فتح محمد

شیخ چاند صاحب کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے بنگالی مشاہیر میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بنگالی زبان میں اسلامی موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں جو اپنی جگہ ایک عظیم کارنامہ ہے کیوں کہ اس زمانے میں بنگالی سمیت مقامی زبانوں میں مذہبی موضوعات پر تصنیف و تالیف کو گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ بنگالی کے عظیم اور انتہائی ذہین شاعر تھے۔

یوں تو مبلغین اسلام پہلی صدی ہجری ہی کے دوران میں برصغیر کے دور دراز علاقوں تک پہنچ گئے تھے اور مسلمان تاجروں نے ساحلی علاقوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔ جیسا کہ ساحل گجرات کی بندرگاہوں پر مسلمان تاجروں کے آباد ہونے اور اُن کی نوآبادیاں قائم ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ ساحل گجرات کی جن بندرگاہوں پر مسلمانوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کیں وہ بندرگاہیں جرات کے اُن ہندو راجاؤں کے ماتحت تھیں جن کی راجدھانی وبھی پور موجود جام نگر تھے۔ بعدازاں اس شہر کو نہروالہ کہا جانے لگا۔ یہ ہندو راجا مسلمان تاجروں سے عمدہ سلوک کرتے تھے اور ان سے عدل و انصاف سے پیش آتے تھے، جس کا ذکر مؤرخ مسعودی اور سیاح سلیمان نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے اور جس میں ۸۴۹ء تک کے حالات درج ہیں۔

اسی طرح علاقہ خاندیش میں واقع ایک مشہور شہر ندرباد کا ذکر شیخ محمد اکرام نے اپنی تالیف ''آب کوثر'' میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ شہر خاندیش اور گجرات کی سرحد پر واقع ہے اور قدیم زمانے سے تجارتی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر میں ایک سید بزرگ علاء الدین ندرباری نے جام شہادت نوش کیا اور اس نسبت سے یہ شہر نندربار کی بجائے

نذر بار کہلانے لگا اور اسے مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ سید علاء الدین نذر باری میر سید حسین جنگ سوار کے برادر حقیقی تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر کے بیان کے مطابق حسین خنگ سوار کو سلطان شہاب الدین غوری یا قطب الدین ایبک نے اجمیر کی تولیت پر مامور کیا تھا اور تا زیست وہ اس منصب پر فائز رہے۔ اُن کا سن وفات ۷۲۵ھ ہے۔ شہرۂ آفاق سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں دہلی سے مالابار اور چین جاتے ہوئے جن شہروں کا ذکر کیا ہے اس میں نذر بار کے احوال بھی شامل ہیں۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق وہاں کے باشندے اکثر مرہٹے تھے، دست کاری، طب اور نجوم کے ماہرین وہاں موجود تھے۔ وہاں کے مسلمان شراب نوشی سے نفرت کرتے تھے اور شراب پینے والے کے لیے اسی درّوں کی سزا مقرر تھی۔

مسعودی ۳۰۴ھ میں گجرات کے شہر چول میں وارد ہوا اور وہ لکھتا ہے کہ شہر میں دس ہزار مسلمانوں کی بستی ہے جو بیاسرہ قوم نیز سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور بہت سے دوسرے ملکوں سے آنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان میں خاصی تعداد ممتاز تاجروں کی تھی جن میں موسیٰ بن اسحاق سنداپوری کا نام قابل ذکر ہے۔ مسعودی نے گجرات کے شہر چول کے علاوہ اور بہت سے شہروں میں بھی مسلمانوں کی مستقل بستیوں کا ذکر کیا ہے۔

اسی طرح دوسرے مسلمان مؤرخین نے بھی برصغیر کے دور دراز علاقوں بالخصوص ساحلی علاقوں میں مسلمان تاجروں کی قدیم بستیوں کے احوال قلم بند کیے ہیں جن میں سلیمان، ابوزید سیرافی، اصطخری، ابودلف، مقدسی، بزرگ بن شہریارؒ اور البیرونی جیسے اولوالعزم اور صاحب علم وفضل مؤرخین شامل ہیں جو برصغیر میں آئے اور یہاں کے چشم دید واقعات رقم کیے جو آج ہماری معلومات کے انمول خزانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بنگال میں وارد ہونے والے صوفیہ کرام میں ہمیں ایک عظیم روحانی شخصیت شیخ جلال الدین تبریزی (متوفی ۶۲۳ھ) کا اسم گرامی ملتا ہے جو شیخ المشائخ حضرت شہاب الدین ابوحفص سہروردی بانی سلسلۂ عالیہ سہروردیہ کے اکابر خلفاء میں سے تھے۔ شیخ جلال الدین تبریزی اپنے پیر بھائی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے ساتھ برصغیر میں تشریف لائے تھے۔ کچھ عرصہ دہلی میں قیام کیا اور پھر تبلیغ اسلام کی غرض سے بنگال چلے گئے۔ شیخ جلال الدین تبریزی کے احوال اور کارنامے ''اخبارالاخیار'' مؤلفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے علاوہ دیگر کتب تاریخ وتذکرہ میں بھی ملتے ہیں۔

''بنگال میں اشاعت اسلام'' کے زیرِ عنوان شیخ محمد اکرام ''آبِ کوثر'' میں لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے جو بزرگ شمالی ہندوستان کے راستے بنگال تشریف لے گئے شیخ جلال الدین تبریزی تھے۔ مولانا جمالی اپنی تالیف ''سیر العارفین'' میں لکھتے ہیں کہ جب ''شیخ جلال الدین تبریزی بنگالہ پہنچے تو وہاں مخلوق خدا جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مرید ہوئی، حضرت نے جس جگہ پر خانقاہ تعمیر کی اور کئی باغ اور بہت سی زمین خرید کر لنگر کے لیے وقف کی اُس جگہ کو بندر دیوہ محل کہتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا تالاب تھا جس کے قریب ایک ہندو راجے نے بے حد روپیہ خرچ کر کے ایک بت خانہ تعمیر کیا تھا۔ حضرت نے اُس جگہ بہت سے غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا اور بت خانے کو اپنی جائے قیام بنایا۔ اب آپ کا مزار اسی جگہ ہے اور اس مندر کی نصف آمدنی آپ کے لنگر کے لیے وقف ہے۔''

سرزمین بنگال میں اشاعت اسلام کے حوالے سے شیخ جلال الدین تبریزی کے بعد دو بڑے نام حضرت نور قطب عالم اور شیخ جلال مجرد سلہٹی کے ملتے ہیں۔ شیخ جلال الدین مجرد ترکستان سے نقل مکانی کر کے برصغیر میں وارد ہوئے تھے۔ سلطان سید احمد کے خلیفہ تھے۔ شیخ جلال مجرد سلہٹی کے مریدین کو **Saint Soldiers** کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا ایک تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تین سو تیرہ درویش ساتھیوں کی معیت میں گوڑ گوبند کے ظالم ہندو حکمران کی ایک لاکھ پیدل سپاہ اور کئی ہزار سوار فوجیوں کو شکست فاش دی۔

اور اس حقیقت سے تو تاریخ کا ہر طالب علم آگاہ ہے کہ فاتح ہند سلطان شہاب الدین غوری شہید کے ایک نوجوان سپہ سالار بختیار خلجی نے صرف اٹھارہ سپاہیوں کے ساتھ بنگال کے ہندو راجا کے محل پر شب خون مار کر پورے علاقے کو اپنے زیرنگین کر لیا تھا۔ بہرکیف مسلمانوں کے ہاتھوں بنگال کی فتح اور بنگال میں صوفیہ کرام کی آمد اور ان کی تبلیغی و اصلاحی خدمات کے اثرات کا برآمد ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اُس زمانے میں مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ عام بول چال کی زبان بھی اس زمانے میں زیادہ تر فارسی تھی جس کو سلاطین دہلی پسند کرتے تھے۔ چنانچہ عہد وسطیٰ میں بنگلا ادب جس طرح فارسی اور عربی ادبیات کی تخلیقات سے متاثر ہوا اُسی طرح اسلامی فلسفۂ حیات نے بھی بنگلا ذہن اور بنگلا ادب کو بڑی حد تک متاثر کیا۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کی گیارھویں جلد (بنگالی ادب) کے فاضل مقالہ نگار یونس احمر لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے ہاتھوں فتح بنگال کے ساتھ ہی ساتھ جہاں زندگی کے دوسرے طبقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان دور دراز ممالک سے بنگال آئے، وہیں علماء مشائخ، صوفیہ کرام اور درویش بھی تشریف لائے۔ اس عہد میں ہندو وشنو کے پجاری تھے۔ ان کے بہت سے دیوتا اور دیویاں تھیں۔ وہ ان ہی کی پرستش میں اپنی نجات سمجھتے اور ان ہی کی طفیل اپنی عاقبت سنوارتے تھے لیکن مسلمان صرف خدائے واحد کی عبادت کرتے تھے۔ اس سے اپنی مرادیں مانگتے اور اسی کو تمام قوتوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ معاشرتی زندگی میں محبت اور اخوت کا جذبہ بھی بیدار کیا۔ صوفیہ کرام کی عابدانہ زندگی اور اُن کے زہد وتقویٰ سے جہاں ہر طبقۂ خیال کے لوگ متاثر ہوئے وہاں شاعروں کو بھی اُن کی زندگی قابل رشک معلوم ہوئی۔ انہوں نے مذہبی موضوعات پر گیت لکھے اور نظمیں کہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے فارسی اور عربی کتابوں کے بنگلا میں تراجم بھی شروع کیے۔ بنگلا میں مذہبی کتابوں کے تراجم اس لیے کیے گئے تاکہ لوگ اپنی ہی زبان میں مذہبی تعلیمات سے استفادہ کر سکیں۔ انہوں نے ان اندیشوں کو دور کیا کہ بنگلا میں مذہبی و دینی کتابیں تحریر کرنا گناہ کے مترادف ہے۔''

شاہ محمد صغیر نے جو غیاث الدین اعظم شاہ کے دورِ حکومت میں زندہ تھے اپنی کتاب ''لیلیٰ مجنوں'' میں لکھا ہے:

> ''کافی غور وخوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ اندیشہ قطعی بے بنیاد ہے کہ بنگلا میں مذہبی موضوعات پر کچھ لکھنا کارِ عصیاں ہے، بلکہ میں اس کام کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہوں کیونکہ اس طرح عوام کو اپنے ماضی کے عظیم ورثہ سے آگاہی ہوگی۔''

پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں منظر عام پر آنے والے عظیم اور ذہین بنگالی شاعر مزمل نے بھی اس موضوع پر اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے بنگلا میں مذہبی کتابیں اس لیے تحریر کی ہیں تاکہ لوگ اسلامی اُصول کی روشنی میں اپنی زندگی کو منظم کریں۔''

اس قدر طویل مگر ضروری تمہید کے بعد اب ہم سرزمین بنگال کی ایک اہم دینی و روحانی شخصیت شیخ چاند کے احوال اور علمی کارنامے بیان کرتے ہیں جو ایک صاحب تصانیف بزرگ ہونے کے علاوہ بنگالی زبان کے ممتاز شاعر بھی تھے۔

شیخ چاند کے والد ماجد کا نام شیخ فتح محمد اور اُن کے مرشد طریقت کا نام "شاہ دولہ" تھا۔ شیخ چاند اپنے مرشد کا ذکر اپنے اشعار میں بڑی عقیدت سے کرتے ہیں۔

"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" گیارھویں جلد (بنگالی ادب اول) کے فاضل مقالہ نگاروں ڈاکٹر علی اشرف و یونس احمر لکھتے ہیں:

> "شیخ چاند کی ولادت اور وفات کے بارے میں ہمارے نقاد متفق نہیں ہیں اور نہ تلاش و تحقیق کے باوجود صحیح تاریخ دریافت ہو سکی ہے۔ بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ ٹپرا کے ممتاز شعراء میں شیخ چاند کا بھی شمار ہوتا ہے۔ یہ صرف اپنی شاعرانہ عظمت ہی کی وجہ سے مشہور نہیں ہوئے۔ اس سے قطع نظر اُن کو فلسفۂ تصوف میں بھی خاصہ دخل تھا اوران کی بزرگی میں کسی کو کلام نہ تھا۔ کچھ لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شیخ چاند سلہٹ کے رہنے والے تھے۔ اس سلسلہ میں بنگلا کے مشہور ادیب سید مرتضٰی علی پیش پیش ہیں۔ شیخ چاند کے تذکرہ میں ڈاکٹر انعام الحق بیان کرتے ہیں کہ "شیخ چاند کی نصف سے زیادہ زندگی خصوصاً ان کی ساری ادبی زندگی ٹپرا ہی میں گزری۔ اس سلسلے میں کوئی مختلف الرائے نہیں۔ اس کے علاوہ ان کے سارے مخطوطات ٹپرا ہی سے دستیاب ہوئے ہیں اور اُن کا انتقال بھی ٹپرا ہی میں ہوا۔"

شیخ چاند نے دینی و تاریخی اور صوفیانہ موضوعات پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظمیں جو اب تک دریافت ہوئی ہیں اُن میں پہلی "رسول وجے" ہے جو ۱۱۶ ابواب پر مشتمل ہے۔ دوسری "شاہ دولہ" ہے جو فلسفۂ خودی اور مابعدالطبیعیاتی موضوع پر ایک طویل نظم ہے۔ تیسری "قیامت نامہ"، چوتھی "طالب نامہ" اور پانچویں "ہرگوری سنگباد" ہے جو ایک مختصر کتابچہ ہے۔

شیخ چاند نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ خلوت نشینی میں عبادت و ریاضت اور

شعر گوئی میں گزارا بلکہ اُن کے دو تذکرہ نگاروں یعنی ڈاکٹر علی اشرف اور یونس احمر نے لکھا ہے کہ شیخ چاند تارک الدنیا ہو گئے تھے۔ اُن کا بیشتر وقت خدا کی عبادت، ریاضت اور شعر گوئی میں گزرتا تھا۔ انہوں نے اپنے بارے میں صاف صاف کہہ دیا ہے:

دنیار جنجال تیجی مرشد آر پیر بھجی
سرشتی کوری رسول چرن

ترجمہ: دنیا کے جنجال کو تیاگ کر، مرشد اور پیر کی خدمت کرتا ہوں اور رسول کے خصائل حسنہ تصنیف کرتا ہوں۔

تارک الدنیا ہو کر اور اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر رہ کر... ''رسول وجے'' کی تصنیف و تالیف میں مستغرق ہو کر شیخ چاند نے جو ریاضتیں کیں اُس کا پھل انہیں ''رسول وجے'' کی صورت میں مل گیا۔

ایک جگہ شیخ چاند اپنے مرشد شاہ دولہ کا ذکر یوں کرتے ہیں:

پرگنے کدبا نام ہوڑ دیا کراے گھر تالوک بھومی الپوتان ششا بو ہوتر

ترجمہ: کدبا پرگنہ میں موضع ہوڑ دیا کے رہنے والے ہیں۔ نہ جائداد ہے نہ زمین، البتہ شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔

۱۔ رسول وجے

شیخ چاند نے اپنی شاہکار نظم ''رسول وجے'' بارہ برس کی شب و روز محنت و جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ لکھی۔ اس ضمن میں وہ خود کہتے ہیں:

''بارہ سال کے بعد میرے علم میں اضافہ ہوا
اور مرشد کے قدموں میں میرے ایمان کو پختگی نصیب ہوئی۔''

''رسول وجے'' کے بارے میں سب متفق ہیں کہ یہ شیخ چاند کا سب سے عظیم علمی کارنامہ ہے جسے انہوں نے اپنے مرشد شاہ دولہ کی ہدایت پر نظم کیا۔ اس بارے میں شیخ چاند خود لکھتے ہیں:

''اپنے مرشد کی ہدایت پر میں نے یہ پانچالی ترتیب دی ہے
''قصص الانبیاء'' نامی ایک کتاب سے سن کر
اس کتاب کا مواد تیار کیا ہے۔''

''رسول وجے'' ۱۱۶ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ''شب معراج'' سے

متعلق ہے۔ اس میں رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بہشت و دوزخ کے سفر کے احوال بھی آ گئے ہیں۔ اس طویل بیانیہ نظم میں اور بہت سے عنوانات ہیں جن میں سے خجالت ابلیس، قتل طالب، مبارز کی بیوی کی سزا، گوالے کا قبول اسلام، جوگی نامہ اور مرید کی باتیں جیسے عنوانات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۲۔ شاہ دولہ: شیخ چاند کی دوسری نظم کا نام ''شاہ دولہ'' ہے جو اُن کے مرشد کے نام نامی سے منسوب ہے۔ یہ ایک طویل بیانیہ نظم ہے جس میں فلسفۂ خودی اور بعض دوسرے مابعدالطبیعیاتی موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ فلسفی شاعر شیخ چاند نے اپنے مرشد سے کچھ سوالات کیے ہیں اور انہوں نے اپنے مرید خاص اور فلسفی شاعر کو جو جوابات دیے اور ان جوابات سے شاعر پر تصوف کے جو اسرار و رموز منکشف ہوئے اُن کو ''شاہ دولہ'' کے عنوان سے منظوم کر دیا گیا ہے۔

شیخ چاند اپنے مرشد کا تعارف یوں کراتے ہیں:

☆ شاہ دولہ اللہ کے منتخب بندوں میں سے ہیں؛
☆ فقر کے ذریعے انہوں نے اپنے اندر نور کی صفت پیدا کر لی؛
☆ چودہ پشت سے اُن کے خاندان میں مشیخیت کا سلسلہ جاری ہے؛
☆ شریعت پر اُن کا مکمل ایمان ہے؛
☆ شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت... ان چاروں منازل سے گزر کروہ عبادت کرتے ہیں؛
☆ کدبا پرگنے میں موضع ھوڑدیا کے رہنے والے ہیں؛
☆ اُن کے پاس نہ جائیداد ہے، نہ زمین، البتہ شاگردوں کی تعداد کثیر ہے؛
☆ تمام شاگردوں میں ایک شاگرد حقیر فقیر بھی ہے... جس کا نام چاند بن فتح محمد ہے؛
☆ مرشد کی خدمت کر کے مجھے بصیرت بھی ملی، بصارت بھی؛
☆ چراغ علم روشن کر کے عقل و دانش کے گوہر نایاب حاصل کیے؛

۳۔ قیامت نامہ

شیخ چاند کی تیسری نظم کا نام ''قیامت نامہ'' ہے۔ اس نظم کے کئی نسخے پروفیسر علی احمد نے دریافت کیے ہیں جن میں نظم لکھنے کی دو مختلف تاریخیں درج ہیں۔

۴۔ طالب نامہ
شیخ چاند کی چوتھی نظم "طالب نامہ" ہے جس میں انہوں نے فلسفۂ معرفت پر بڑی تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ نظم "شاہ دولہ" سے بڑی مشابہت رکھتی ہے۔ یہ نظم کئی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ پھر اس نظم کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے، اس لیے کہ بنگلا زبان میں تصوف کے موضوع پر نثر کے بہت ہی ابتدائی اور قدیم نمونے اس نظم میں ملتے ہیں۔ مثلاً "طالب نامہ" میں ہمیں ایک یہ مکالمہ ملتا ہے:

☆ تم آئے ہو کہاں سے؟ — اپنے مکان سے
☆ مکان میں کس کو رکھ کر آئے ہو؟ — امید پہرے دار کو
☆ امید پہرے دار کون ہے؟ — جو دنیا کا محافظ ہے
☆ دنیا کے مکان میں کہاں سے آئے ہو؟ — توجی پور سے
☆ جہاں رہتے ہو اُس کا نام کیا ہے؟ — نعمت پور
☆ جاؤ گے کہاں؟ — سانجھ گربھ پور
☆ کیا تم طالب نہیں ہوئے؟ — ہاں طالب ہو گیا
☆ کس کے طالب؟ — مرشد کے طالب
☆ طلب کس کی ہے؟ — مرشد کی
☆ مرشد کون ہے؟ — عزرائیل
☆ اُس کا مرشد کون ہے؟ — اسرافیل
☆ اُس کا مرشد کون ہے؟ — جبرائیل
☆ اُس کا مرشد کون ہے؟ — میکائیل
☆ اس کا مرشد کون ہے؟ — ہمیشہ رہنے والا خدا
☆ ہمیشہ رہنے والا خدا کون ہے؟ — جس نے دنیا کو پیدا کیا

۵۔ ہرگوری سنگباد
شیخ چاند کی اب تک دریافت ہونے والی تخلیقات میں سے ان کی پانچویں تصنیف "ہرگوری سنگباد" ہے۔ یہ ایک مختصر سا کتابچہ ہے۔ یوگیوں کے آسنوں کے بارے

میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

شیخ چاند نے بنگلا زبان کی نشوونما کے علاوہ بنگلا زبان میں اسلامی موضوعات پر نظم و نثر دونوں اصناف ادب میں بہت کچھ لکھا تاکہ جو اہل بنگال عربی اور فارسی زبانوں سے آشنا نہیں تھے وہ اسلامی موضوعات اور قرآنی احکامات سے ضروری اور مطلوبہ معلومات اپنی مقامی زبان میں حاصل کر سکیں۔

شیخ چاند بن فتح محمد کے بارے میں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کی گیارھویں جلد (بنگالی ادب اول) کے دو فاضل مقالہ نگاروں ڈاکٹر علی اشرف اور یونس احمر نے لکھا ہے کہ ''شیخ چاند کی ولادت اور وفات کے بارے میں ہمارے نقاد متفق نہیں ہیں۔'' لیکن ان ہی مقالہ نگاروں نے شیخ چاند کا سن ولادت ۱۵۶۰ء اور سن وفات ۱۶۲۵ء تحریر کیا ہے۔ گویا کہ بنگال کے فلسفی شاعر شیخ چاند بن فتح محمد ۹۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۱۰۳۵ھ میں وفات پائی۔

محمد خان نیازی

امیر محمد خان نیازی کا شمار مغلیہ عہد کے اکابر امراء اور ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔ وہ صاحبِ علم و فضل اور بہادر شجاع ہونے کے علاوہ انتہائی متقی و پرہیزگار انسان تھے۔ انہوں نے اکبری دور اور جہانگیری دور میں ایک امیر دربار اور اعلیٰ منصب دار کی حیثیت سے قابلِ ذکر اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ کئی اہم جنگوں میں حصہ لیا اور شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھائے۔ وہ اپنی غیر معمولی فہم و فراست اور جنگی تدابیر کے لئے بہت مشہور تھے۔ حنفی المذہب ہونے کے علاوہ روشن ضمیر صوفی تھے۔

امیر محمد خان مغلیہ عہد کے تین امراء میں ایک ہیں جنہوں نے مغل شہنشاہ سے خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

محمد خان نیازی کی لیاقت و قابلیت ان کے عزم و استقامت، جرات و بہادری اور جنگی منصوبہ بندی کی اہمیت و افادیت اور ان کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ خانخاناں، شہباز خان کنبوہ اور شہزادہ شاہجہان ایسے نامور سپہ سالار اور اکبر و جہانگیر ایسے پُر جلال و باعظمت مغل شہنشاہ ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے علم و تقویٰ اور صدق و صفا اور ایسی امتیازی خصوصیات کے پیشِ نظر ان پر کلی اعتماد کرتے تھے اور اہم سے اہم مہم ان کے سپرد کی جاتی تھی۔ منصب دار محمد خان ہر مہم کو سر کرتے تھے اور میدانِ جنگ میں اپنی ماتحت فوج کے ساتھ آڑے وقت میں آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کرتے تھے۔

صمصام الدولہ شاہنواز خان نے "مآثر الامراء" کی جلد سوم میں اس درویش منش صوفی جرنیل کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد خان نیازی اکبری دور کے امراء

میں سے ہیں۔ وہ خاندانِ تیموریہ کی خدمت کی قدامت کی وجہ سے افغان امراء میں امتیاز و اعتبار رکھتے تھے۔ ''طبقاتِ اکبری'' کے مؤلف خواجہ نظام الدین ہروی نے لکھا ہے کہ محمد خان نیازی کا منصب دو ہزاری تھا جبکہ شیخ ابوالفضل نے چالیسویں سالِ جلوس اکبری تک پانچ سو سے زیادہ نہیں لکھا ہے۔ البتہ جہانگیری عہد میں وہ عمدہ عہدہ و منصب پر سرفراز ہوئے اور ان کی شان و شوکت اور شہرت میں معتد بہ اضافہ ہوا۔

امیر محمد خان نیازی نے شروع میں شہباز خان کنبوہ کی ہمراہی میں بنگالہ میں جرات مندانہ کارنامے انجام دیئے۔ بالخصوص برہم پتر کی جنگ میں انہوں نے خوب دادِ شجاعت دی اور زبردست بہادری کا مظاہرہ کیا جس سے شہباز خان کنبوہ ایسا نامور امیر اور کامیاب سپہ سالار بہت متأثر ہوا اور محمد خان نیازی کی اسی رفاقت اور جرات و بہادری کے کارناموں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے وہ اپنی جیبِ خاص سے ہر سال ان کو ایک لاکھ روپے بھیجا کرتا تھا۔

امیر محمد خان نیازی ٹھٹھہ کی مہم میں خان خاناں کے فوجی مددگار تھے۔ ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱ء میں سندھ کا حاکم مرزا جانی بیگ قلعے سے باہر نکل کر سیوستان کی جانب بڑھا تاکہ فتح مند شاہی افواج کی کشتیوں پر قبضہ کرے یا دست درازی کر کے انہیں نقصان پہنچائے۔ خانخاناں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر محمد خان نیازی کو ان کی ماتحت فوج کے ساتھ حاکم سندھ کے لشکر کے ساتھ مقابلے کے لئے روانہ کیا اور خود بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔ محمد خان نیازی اور ان کی ماتحت سپاہ جب کشتیوں کے قریب پہنچی تو بعض فوجی سرداروں نے مشورہ دیا کہ لکھی (درہ) کو مضبوط کر کے کمک کا انتظار کیا جائے جبکہ بعض سرداروں نے یہ تجویز پیش کی کہ آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ بہرحال محمد خان نیازی جرأت و بہادری کا بے نظیر مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی سپاہ کے ساتھ لکھی سے گزر کر دشمن سے جا ٹکرائے۔ اس وقت وہ شاہی فوج کی کمان کر رہے تھے اور فوج کے قلب میں تھے۔ دشمن نے شاہی فوج کے دائیں اور بائیں حصے اور ہراول دستے کے قدم اکھاڑ دیئے اب دشمن یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے میدان مار لیا ہے اور یہ جنگ جیت لی ہے کہ محمد خان نیازی قلب کی فوج کے ساتھ دشمن پر یکایک حملہ آور ہوئے اور سخت مقابلے کے بعد دشمن کو شکست دے کر راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت دشمن کی فوج پانچ ہزار سے زائد تھی۔ جبکہ محمد خان نیازی کے زیرِ کمان بادشاہی سپاہ ایک ہزار دو سو سے زیادہ نہ تھی۔ اس شاندار

جنگی کامیابی کے حاصل کرنے سے خان خاناں کو محمد خان کی جنگی صلاحیتوں اور سرداری پر مکمل اعتماد آ گیا۔

محمد خان نیازی نے جہانگیری عہد میں کھرکی کی جنگ جو دکن کی مشہور جنگوں میں سے ہے، انتہائی نمایاں اور شاندار کردار ادا کیا۔ اس جنگ میں خانِ خاناں نے اپنے بیٹے شاہ نواز خان کی زمام اختیار محمد خان نیازی اور یعقوب خان بدخشی کے ہاتھ میں دے دی۔ یہ دونوں اپنے زمانے کے تجربہ کار سپاہی اور نامور سپہ سالار تھے۔ اس دن محمد خان نے ایک زبردست اور عجیب جنگی تدبیر سے کام لیا۔ انہوں نے پانی کے اس نالے کو جو درمیان میں واقع تھا، اس کے تمام راستے بند کر دیئے اور نالے کے سرے پر خود ڈٹ گئے۔ اس طرح انہوں نے ایک طرف شاہنواز خان کو بھی پیش قدمی کرنے اور میدانِ جنگ میں آنے کا موقع نہیں دیا اور دوسری طرف ملک عنبر جس کے پاس ہر قسم کا جنگی سازوسامان وافر مقدار میں تھا اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود نالہ عبور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ جب بھی اپنے لشکر کے ساتھ نالے کو عبور کرنے کے لئے آگے بڑھتا اس پر محمد خان کے سپاہی تیروں اور گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔ اس طرح ملک عنبر اپنے بہت سے سپاہیوں کو مروانے کے بعد راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ محمد خان کے سپاہیوں نے اس کا تعاقب کیا جس کی وجہ سے ملک عنبر درمیان میں کہیں نہ ٹھہر سکا اور اس نے اپنے ٹھکانے پر جا کر ہی دم لیا۔

اسی طرح شہزادہ شاہجہان جب دکن کی مہم پر روانہ ہوا تو محمد خان نیازی نے سعی و کوشش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اپنی تمام تر صلاحیت اور جنگی مہارت کو بروئے کار لا کر داد و تحسین حاصل کی۔ غرض یہ کہ محمد خان نے ہر دور اور ہر زمانے میں اپنے فرائض کی بجا آوری میں کبھی غفلت و کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ وہ ایک انتہائی با اصول اور قاعدے قانون کے مطابق چلنے والے ذمہ دار منصب دار تھے اس لئے بعض مؤرخین نے انہیں ایک سخت مزاج امیر قرار دیا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ امیر محمد خان احکامِ شریعت سے واقف و آگاہ ہی نہیں بلکہ ان کے ماہر تھے اور ہمیشہ احکامِ شریعت کی پابندی کیا کرتے تھے۔

امیر محمد خان نیازی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے معمولات پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ انہوں نے دن رات کے اوقات کی جو تقسیم کر لی تھی پچاسی سال تک

انہوں نے خود کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کی۔ لیکن سواری اور یلغار کے موقع پر البتہ ان کے معمولات میں فرق آ جاتا تھا۔ مگر یہ ایک ایسا امر تھا جوان کے بس سے باہر تھا۔

امیر محمد خان نیازی کا یہ معمول تھا کہ وہ ایک پہر رات سے اشراق تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے تھے۔ اور دوپہر تک تفسیر و سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ افغانوں کے نسب سے انہیں خوب واقفیت تھی مطالعہ کتب سے فارغ ہونے کے بعد کھانا کھاتے اور پھر کچھ آرام کرتے۔ دن کے پچھلے پہر میں دوسرے معاملات و مہمات میں مصروف ہوتے۔ رات کا آغاز ہوتا تو سپاہیوں کے علاوہ علماء وفقراء سے ملاقات کرتے اور اس کے بعد محل سرا میں چلے جاتے تھے۔

امیر محمد خان نیازی کھانے میں بھی تکلف سے کام لیتے تھے۔ کھانے کے وقت پہرہ مقرر کر رکھا تھا۔ اکثر فوج ان کی اپنی قوم یعنی نیازیوں پر مشتمل تھی۔ اگر ان میں سے کسی کی موت واقع ہو جاتی تو اس کی پوری تنخواہ اس کے بیٹے یا بیٹیوں کے لئے مقرر ہو جاتی تھی۔ اگر وہ لاولد ہوتا تو نصف تنخواہ اس کے وارثوں کو ملتی تھی۔ وہ نہایت صاف گو، راست کردار، متقی اور دین دار تھے۔ ہر وقت باوضو رہتے تھے۔ ان کے زہد و تقویٰ، دینداری اور عبادت و ریاضت میں مشغولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ انہیں ولی اللہ سمجھتے تھے اور ان سے کرامات منسوب کرتے تھے۔

امیر محمد خان نیازی نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ دکن میں گزارا۔ دریائے وردہ کے پار پرگنہ اشتی برار ان کی جاگیر میں تھا۔ اسی قصبہ کو انہوں نے اپنا وطن قرار دے کر اس کی تعمیر اور آبادکاری میں اس قدر جدوجہد کی کہ اس قصبے کو ایک بڑا اور بارونق شہر بنا دیا۔ محمد خان نیازی اسی قصبہ اشتی برار جس کو انہوں نے ایک شہر کی صورت دے دی تھی میں فوت ہوئے اور وہیں ان کو دفن کیا گیا۔ ان کے ایک لائق بیٹے احمد خان نیازی نے ان کا شاندار مقبرہ تعمیر کرانے کے علاوہ مقبرے کے ساتھ ایک مسجد اور باغ بنوا دیا۔ محمد خان نیازی کا مقبرہ ایک عرصے تک زیارت گاہِ عوام و خواص رہا۔

انعام اور خطاب دو ایسی چیزیں ہیں جن کے حصول کی خاطر ہر ملک وقوم کے عوام و خواص ہر دور اور ہر زمانے میں آرزومند رہے ہیں۔ ان کے حصول کی خاطر اکثر لوگ بڑی دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ خوشامد اور چاپلوسی سے بھی آگے گزر جاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں تو عزت و آبرو کی بھی پروا نہیں کرتے اور ہر قیمت پر خطاب حاصل کرتے

ہیں۔ فرنگیوں کے دورِ حکومت میں تو برصغیر پاکستان و ہند کے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں غرض کہ ہر مذہب و ملت کے اکثر لوگوں نے ملک کی آزادی قربان کر کے خطابات حاصل کئے۔ ان میں برصغیر کی پانچ سو سے زائد ریاستوں کے راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کے علاوہ بڑے بڑے زمیندار بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے ملک وقوم اور وطن سے غداری کر کے فرنگی حکمرانوں کا ساتھ دیا اور ان سے بڑی بڑی جاگیریں اور خطابات حاصل کئے اور ان پر فخر و ناز کیا۔ سب سے زیادہ اور سب سے بڑے خطابات ریاستی حکمرانوں کو ملے۔ چنانچہ فرنگی عہد کا سب سے بڑا خطاب جو ریاستی حکمرانوں کو ملا، وہ ''فرزندِ دولتِ انگلشیہ'' تھا اور اسے حاصل کرنے والے برصغیر کی سب سے وسیع وعریض اور عظیم الشان ریاست کے حکم ران نظام دکن تھے۔ اسی طرح ریاست پٹیالہ کے سکھ حکمران مہاراجہ بھوپندر سنگھ مہندر، نواب بہاول پور، نواب بھوپال وغیرہ کو بھی بڑے بڑے اعزازات و خطابات دیے گئے۔

مغل حکمرانوں کے عہد میں بھی خطابات کا رواج عام تھا۔ ہر بڑے عہدیدار اور صاحبِ منصب کو اس کی خدمات کے صلے میں اور اس کے مرتبہ و مقام اور شخصی خصوصیات کی مناسبت سے امانت خان، دیانت خان، اعتماد الدولہ، خانِ خاناں، خان اعظم وغیرہ خطابات دیئے جاتے تھے بلکہ خطاب دے کر عہدہ و منصب دیا جاتا تھا یا خطاب دے کر عہدہ و منصب میں اضافہ کیا جاتا تھا، اور ہر عہدے دار اور صاحبِ منصب کی دلی خواہش ہوتی تھی کہ وہ کسی بڑے خطاب سے نوازا جائے۔ اس کے لئے بادشاہ کی خدمت میں قیمتی تحائف اور اشرفیاں بھی نذر کے طور پر پیش کی جاتی تھیں۔ سندھ کے ایک جاگیردار میر خان نے بادشاہ کی خدمت میں ایک لاکھ روپے کی نذر پیش کی تاکہ اس کے نام کے ساتھ ایک حرف ''الف'' کا اضافہ کر کے اسے ''میر خان'' سے ''امیر خان'' بنا دیا جائے۔

امیر محمد خان نیازی سمیت پورے عہد مغلیہ میں تین اکابر امراء ایسے ہیں جنہوں نے خطاب لینے سے انکار کیا۔ ''مآثر الامرا'' کا مؤلف نواب شاہنواز خان جو خود بھی امیر تھا اور صمصام الدولہ اور خان کے خطاب رکھتا تھا، لکھتا ہے:

''جہانگیر بادشاہ کے حضور سے تین امراء کو خطاب ملا اور انہوں نے قبول نہ کیا: (۱) مرزا رستم صفوی (۲) خواجہ ابوالحسن تربتی (۳) محمد خان نیازی۔ محمد خان نیازی نے کہا کہ میرا نام ''محمد'' ہے اس سے بڑھ کر کون سا نام ہے کہ جس کو میں اپنے نام کے ساتھ اختیار

کروں۔"

درویش منش امیر محمد خان نیازی نے ۱۰۳۷ھ۔ ۱۶۲۷ء میں وفات پائی۔ "بمرد اولیا محمد خان" ان کی تاریخ وفات ہے۔

ملا عبدالسلام لاہوری

ملا عبدالسلام لاہوری کا شمار دسویں اور گیارھویں صدی ہجری کے معروف و ممتاز علمائے دین اور مفتیان شرع متین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے حدیث، فقہ، اصول فقہ، تفسیر منطق، علم الکلام، نحو لغت اور ادبیات کی تعلیم حاصل کی۔

ملا عبدالسلام ۹۴۷ھ میں علوم و فنون کے مرکز لاہور کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد سوم، باب پنجم کی فصل دوم کے فاضل مقالہ نگار مولانا عبدالقدوس کی تحقیق کے مطابق ملا عبدالسلام لاہور کے مفتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور شیخ بہاء الدین زکریا کی اولاد میں سے تھے۔ مولانا موصوف نے مزید لکھا ہے:

''مفتی عبدالسلام علوم عقلیہ میں میر فتح اللہ شیرازی کے تلمیذ خاص تھے۔''

مولانا عبدالقدوس کے اس بیان سے کہ وہ لاہور کے مفتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مفتی اس لئے کہا گیا کہ وہ مفتیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے یا پھر یہ کہ وہ مفتی کے عہدے پر فائز تھے۔ دوسرے تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے ان کو ملا اور کسی نے مولانا لکھا ہے۔

مفتی عبدالسلام لاہوری کے احوال و آثار کہیں یک جا نہیں ملتے بلکہ دو دو یا تین تین جملوں کی صورت میں مختلف کتب تاریخ و تذکرہ میں بکھرے ہوئے۔ کچھ کتابوں سے اقتباسات اور حوالے تو ہم نے یہاں پیش کر دیئے ہیں۔ کچھ اسی طرح کے احوال ''ماثر الکرام''، ''طبقات اکبری'' اور ''بادشاہ نامہ'' میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

مفتی عبدالسلام کے والد کا نام مفتی عبدالعزیز لاہوری تھا۔ جو ایک صاحب علم و

فضل انسان تھے اور اپنے تقویٰ و توکل کے لئے مشہور تھے۔ مفتی عبدالعزیز نے اپنے بیٹے مفتی عبدالسلام کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے عمدہ ماحول اور معروف اساتذہ و علماء کا اہتمام کیا۔ چنانچہ مفتی عبدالسلام کے اساتذہ میں میر فتح اللہ شیرازی کے علاوہ قاضی صدر الدین جالندھری، شیخ سعد اللہ لاہوری، اور شیخ اسحاق بن کا کو ایسے صاحب کمال علماء فضلاء اور حکماء شامل ہیں۔

مفتی عبدالسلام تیز طبع تھے اور ذہن رسا کے علاوہ مضبوط قوت حافظہ کے مالک تھے۔ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کا ذوق و شوق بھی وافر تھا۔ چنانچہ جلد ہی اپنے لائق و فائق اساتذہ کی راہنمائی میں علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل دسترس حاصل کر لی اور کم عمری ہی میں ایک عالم کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ چنانچہ غوثی مندوی نے ''گلزارِ ابرار'' میں لکھا ہے:

''ہند کے علماء میں مولانا عبدالسلام سر برآوردۂ وقت ہیں۔''

مفتی عبدالسلام لاہوری حنفی المذہب تھے چنانچہ مولوی فقیر محمد اپنی یادگار تالیف ''حدائق الحنفیہ'' میں ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ملا عبدالسلام لاہوری عالم اجل، فاضل اکمل، فقیہ جید اور مفسر متقن تھے۔''

صمصام الدولہ مؤلف ''مآثر الامراء'' نے مفتی عبدالسلام کو مستند فاضل اور بلند مرتبہ فقیہ قرار دیا ہے اور ''مراۃ العالم'' کے مؤلف بختاور خان نے ان کو متبحر فاضل لکھا ہے۔

علم و فضل میں درجہ کمال حاصل کرنے کے بعد مفتی عبدالسلام نے شہر لاہور میں درس و تدریس کا اور وعظ و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ اور خود کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دینی علوم و فنون کے وسعت و فروغ کے لئے وقف کر دیا۔ ان کی امانت و دیانت، زہد و عبادت اور علم و فضل کی بناء پر انہیں اعلیٰ عہدوں کی پیش کش کی گئی لیکن انہوں نے سرکاری ملازمت کرنے یا دربار شاہی میں جانے کی بجائے صبر و قناعت، توکل اور درویشی کے عالم میں اپنے مدرسہ میں طلباء کو درس دینے کو ترجیح دی۔

مفتی عبدالسلام کی دینی درس گاہ کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی اور مفتی صاحب کے علمی کمالات کا چرچا بھی عام ہو گیا چنانچہ تشنگان علم اور طالبان حق دور و نزدیک سے جوق در جوق آ آ کر ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے لگے۔ ان سے تحصیل علم کرنے والوں اور سند فراغت پانے والوں میں برعظیم کے کم و بیش ہر علاقے اور شہر، اندرون

ملک اور بیرون ملک کے لوگ شامل ہیں۔ پھر قابل ذکر امر یہ ہے کہ ان کے تلامذہ میں ایسے لوگ بھی کثیر تعداد میں ملتے ہیں جنہوں نے ان کے مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت ترقی کی اور اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہوئے۔ مثلاً ان کے ایک شاگرد سعد اللہ خان مغلیہ سلطنت کا وزیر اعظم بنا اور علامہ بھی مدار المہام اور ملک الملک ایسے القاب سے ملقب ہوا۔ اسی طرح ان کے تبحر علمی کی شہرت سن کر جو لوگ بیرون ملک سے آئے ان میں ایک میرک شاہ تھا جو خراسان سے تحصیل علم کی خاطر لاہور آیا تھا اور مفتی عبدالسلام سے سند فراغت حاصل کر کے سلطنت کے متعدد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ میرک شاہ ہروی کے علاوہ ان کا ایک شاگرد محمد میر سالمیں سیوستانی بھی تھا۔ پھر ان کے تلامذہ میں شیخ محب اللہ بہاری، مولانا عبدالسلام دیوی اور شیخ محمد سعید عمری جیسی نامور ہستیاں اور صوفیہ کرام بھی شامل ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت میاں میر صاحب بھی اس مدرسہ میں شامل درس رہے۔

غالباً علامہ سعد اللہ وزیر اعظم سلطنت مغلیہ کے اصرار پر مولانا صاحب نے شاہی لشکر کا مفتی بننا قبول کر لیا۔ لیکن درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ چنانچہ محمد صالح کمبوہ نے اپنی مشہور زمانہ تالیف ''شاہجہاں نامہ'' جلد سوم میں لکھا ہے:

> ''فاضل باکمال مولانا عبدالسلام خداداد کمالات اور فطری استعداد سے بہرہ مند تھے۔ عربی کے تمام علوم میں انتہائی فضیلت حاصل کر لی تھی۔ پھر لاہور میں علوم معقول و منقول کے ماہر مولانا عبدالسلام لاہوری، جو فقہ اور تفسیر میں بے نظیر تھے، کی خدمت میں رہ کر بہت سی معتبر کتابوں کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد شاہجہانی ملازموں میں شامل ہوئے۔ لشکر شاہی میں فتویٰ دینے کی خدمت پر سرفرازی پائی۔ جب تک موقع ملا درس و تدریس کا شغل جاری رکھا۔ وقت موعود پر جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو روانہ ہوئے۔''

یہ عبارت ''شاہجہان نامہ'' جسے ''عمل صالح'' بھی کہا جاتا ہے، کے اردو ترجمے میں جوں کی توں موجود ہے۔ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی اس کے مترجم ہیں اور اسے مرکزی اردو بورڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کا نسخہ اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے اس لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر مؤلف کتاب محمد صالح کمبوہ، مترجم ڈاکٹر ناظر حسن زیدی اور

تا پسند میں سے کسی نے بھی غلطی نہیں کی تھی تو ''فاضل باکمال مولانا عبدالسلام'' اور ''علوم معقول و منقول کے ماہر مولانا عبدالسلام لاہوری'' دو شخص ہیں جو ایک دوسرے کے استاد اور شاگرد ہیں۔ ہم نے ملا عبدالسلام کے شاگردوں میں مولانا عبدالسلام دیوی کا بھی ذکر کیا ہے۔ محمد صالح کنبوہ نے اپنی تالیف ''شاہجہاں نامہ'' کی جلد سوم میں دو جگہ عبدالسلام نام کی شخصیات کے بارے میں لکھا ہے۔ ایک تو مولانا عبدالسلام جس کا بیان گزر چکا ہے۔ دوسرے شیخ عبدالسلام تھانے دار کا جو جنگ کے دوران بنگال میں گرفتار ہوا۔

مفتی عبدالسلام کی عمر کا زیادہ تر حصہ تعلیم و تدریس میں گزرا۔ بنا بریں وہ زیادہ کتابیں تصنیف نہ کر سکے۔ بہر حال انہوںؒ نے تفسیر بیضاوی کے نہایت برجستہ حواشی لکھے اور ان کی ایک کتاب فقہ پر ہے جس کا نام ''نافع المسلمین'' ہے۔ ان کے حواشی تفسیر بیضاوی مسمی بہ تفسیر زہراوین کا قلمی نسخہ رامپور میں محفوظ ہے۔

عبدالسلام لاہوری نے ۱۰۳۷ھ میں وفات پائی۔ ''مشہور تکوین'' تاریخ وفات ہے۔

مرزا غیاث بیگ

مرزا غیاث بیگ طہرانی مغلیہ عہد کے امرائے سلطنت میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ان کا شمار اکابر علماء اور ممتاز اساتذہ میں کیا جاتا تھا۔ علوم متداولہ اور ریاضی و انشاء پردازی کے ماہر تھے۔ مرزا غیاث بیگ کے علمی مرتبہ و مقام کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب "جہانگیرنامہ" کی پہلی دو جلدیں مرتب ہوئیں تو ان کے ملاحظے کے بعد ایک پہلی جلد مرزا غیاث بیگ کو پیش کی گئی۔ صاحبِ علم و فضل ہونے کے علاوہ بڑے خوش اخلاق اور پسندیدہ اطوار کے مالک تھے۔ اپنی خوش گفتاری، نرم مزاجی، نرم روی اور نیک نفسی کے لیے بہت مشہور تھے۔ مغل فرمانروا اکبر اور اُس کی وفات کے بعد شہنشاہ جہانگیر کے دورِ حکومت میں اہم اور اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوئے اور اپنے فرائض منصبی کو بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے انجام دیا۔ علاوہ ازیں اپنے بیٹے آصف خان کی جو شاہجہان کا وزیر اعظم بنا اور اپنی بیٹی مہرالنساء جو نور جہاں کے نام سے جہانگیر کی ملکہ بنی، کمال محنت اور توجہ سے پرورش اور تعلیم و تربیت کی۔

مرزا غیاث بیگ ایرانی نژاد تھے اور شیعی مسلک رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام خواجہ محمد شریف تھا جو ہجری تخلص کرتے تھے اور ایران کے حکمران شاہ طہماسپ صفوی کے وزیر تھے۔ انہوں نے ۹۸۴ھ۔۱۵۷۶ء میں وفات پائی اور دو بیٹے یعنی آقا محمد طاہر جو وصلی تخلص کرتے تھے اور مرزا غیاث الدین محمد جو غیاث بیگ کے نام سے مشہور تھے اور مرزا علاء الدولہ آقا ملاّ کی بیٹی سے منسوب تھے، اپنی نشانی چھوڑے۔ غیاث بیگ اپنے والد کی رحلت کے بعد گردشِ زمانہ کا شکار ہو کر نقل وطن پر مجبور ہوئے اور بڑے مشکل حالات میں مغل فرمانروا اکبر کے عہد میں برصغیر میں وارد ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے

دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ راستے میں تمام سامان لٹ گیا اور یہ حالت ہوئی کہ صرف دو سواریاں رہ گئیں جن پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ جب قندھار پہنچے تو دوسری بیٹی مہرالنساء پیدا ہوئی۔ یہ مہرالنساء وہی ہے جو بڑی ہو کر پہلے شیر افگن کی بیوی بنی اور شیر افگن کی افسوس ناک موت کے بعد شہنشاہ جہانگیر کے نکاح میں آ کر اس کی چہیتی بیوی بنی اور نور جہاں کے نام سے ملکہ ہندوستان کہلائی۔ اور اس نے آہستہ آہستہ شہنشاہ جہانگیر کا اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ سلطنتِ ہند کے سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔

قریب العہد مؤرخ صمصام الدولہ شاہنواز خان نے ''ماثر الامراء'' میں مرزا غیاث بیگ کے احوال بیان کیے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ غیاث بیگ نے اپنے حالات ملک مسعود تاجر قافلہ باشی سے بیان کیے تو اس نے نہ صرف غیاث بیگ سے عمدہ سلوک کیا بلکہ فتح پور جا کر غیاث بیگ کا تعارف شہنشاہ اکبر سے کرا دیا اور اسے شاہی ملازمت دلوا دی۔ مرزا غیاث الدین بیگ اپنی فرض شناسی، حسنِ خدمت اور نیکی کی وجہ سے پہلے تین صدی کے منصب پر پہنچے اور چالیسویں سال جلوس اکبری میں ان کو کابل کا دیوان مقرر کیا گیا اور اس طرح ان کی ترقی کا سلسلہ شروع ہوا۔

شہنشاہ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد مرزا غیاث بیگ کی قسمت کا ستارہ چمکنے لگا اور جہانگیر کے جلوسِ سلطنت کے آغاز ہی میں ان کو اعتمادالدولہ کے خطاب سے نوازا گیا اور مرزا جان بیگ وزیرالملک کے ساتھ دیوانی سرکار میں شریک کر دیا گیا۔ ۱۰۱۶ھ۔۱۶۰۷ء میں ان کے بیٹے محمد شریف نے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر سلطان خسرو کو قید سے آزاد کرانے کا منصوبہ بنایا جو ناکام ہو گیا۔ جہانگیر نے محمد شریف اور اس کے تمام ساتھیوں کو سزائے موت دی اور مرزا غیاث بیگ کو دیانت خان کے مکان میں محبوس کر دیا۔ مرزا غیاث بیگ نے دو لاکھ روپے دے کر رہائی حاصل کی۔

مرزا غیاث بیگ کا تعارف کراتے ہوئے نواب صمصام الدولہ نے لکھا ہے کہ ''اعتمادالدولہ مرزا غیاث بیگ اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے لیکن متقدمین شعراء کی تقلید خوب کرتے تھے اور فن انشاء میں بہت مہارت رکھتے تھے، خطِ شکستہ سنبھال کر بہت خوبصورت لکھتے تھے۔ وہ عمدہ گفتگو کرنے اور دلچسپ صحبت رکھنے والے ہنس مکھ اور خوش مزاج شخص تھے۔ ان کے بارے میں جہانگیر بادشاہ کہا کرتا تھا کہ 'اعتمادالدولہ کی صحبت ہزار مفرح یاقوتی سے بہتر ہے۔'''

''اقبال نامہ جہانگیری'' کے مؤلف نے مرزا غیاث بیگ کا تذکرہ عہد جہانگیری کے اکابر علماء اور ممتاز اساتذہ کے ساتھ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''جہانگیر کے زمانے میں بڑے بڑے علماء درس و تدریس کے کام میں مصروف تھے۔ ان میں مرزا غیاث بیگ ریاضی اور انشاء پردازی کے ماہر تھے اور ان کے علاوہ مُلّا روزبھان شیرازی، مُلّا شکر اللہ شیرازی، مُلّا تقی شوستری، میر ابوالقاسم گیلانی، مُلّا باقر کشمیری، مُلّا مقصود علی، قاضی نوراللہ شوستری، مُلّا فاضل کابلی، مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی، مُطلب سلطان پوری، رحمان بھورا گجراتی، حسن فرانی گجراتی۔ خواجہ عثمان حصاری، مُلّا محمد جونپوری اور بہت سے دوسرے صاحب کمال علماء واساتذہ موجود تھے۔''

مرزا غیاث بیگ تحریر وتقریر کے علاوہ معاملات کو سمجھنے اور بات کی تہہ تک پہنچنے اور امور و مسائل کو حل کرنے میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ نواب صمصام الدولہ لکھتے ہیں کہ مرزا بہت سمجھ دار، کارگزار، خوش معاملہ اور پسندیدہ اطوار کے حامل تھے اور آنے والے حالات و معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انتہائی نیک نفس تھے، دشمن سے بھی عداوت نہیں کرتے تھے۔ اُن کے مزاج میں غصہ بالکل نہ تھا۔ مزید برآں اُن کے یہاں نظر بندی، زنجیر، کوڑا، دشنام کا کوئی کام نہ تھا۔ اگر سب واجب القتل ہوتے اور اُن سے التجا کرتے یا ایک دو ہفتے ان کی خدمت میں حاضری دیتے اور سلام کرتے تو وہ رہائی پاتے اور اپنی مراد کو پہنچتے۔

مرزا غیاث بیگ انتہائی محنتی، فرض شناس اور مستعد شخص تھے۔ اپنے فرائض منصبی کی بجاآوری میں کسی قسم کی غفلت و کوتاہی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اُن کا تمام دن کفایت اندیشی اور لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا۔ کام کے نمٹانے میں کسی قسم کی تاخیر نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی دیوانی کے زمانے میں بادشاہی عمّال کے حساب فہمی کے معاملات جو مدتوں سے ملتوی پڑے تھے اُن کی توجہ اور کوشش سے اختتام کو پہنچے۔

مرزا غیاث بیگ نے اپنی بیٹی مہرالنساء، جس نے ملکہ نورجہاں کے نام سے شہرتِ دوام پائی کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ کی تھی اور نورجہاں کو عمدہ اخلاق و آداب اور پسندیدہ اطوار سے آراستہ کر دیا تھا۔ چنانچہ نواب صمصام الدولہ نے ''مآثر الامراء'' میں لکھا

ہے کہ
نور جہاں بیگم، حسن صورت کے ساتھ ساتھ، باطنی خوبیاں بھی رکھتی تھی۔ طبیعت کی رسائی، سلیقے کی درستگی، شعور کی پختگی اور اصابت فکر میں بے مثال تھی۔ جہانگیر بادشاہ کہا کرتا تھا کہ:

''جب تک وہ میرے گھر میں نہیں آئی تھی میں گھر کی زینت اور شادی کے مفہوم کو نہیں سمجھتا تھا۔''

نور جہاں کی لیاقت، قابلیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہ کئی زیورات اور بہت سے سامانِ آرائش وزیبائش کی موجد و مخترع ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے زیور، لباس، آرائش وزیبائش کے سامان جن کا آج برصغیر پاکستان و ہند میں رواج ہے، نور جہاں کے اختراع اور ایجاد کئے ہوئے ہیں۔ مثلاً پشواز کے لئے دو دامنی اور اوڑھنی کے لئے پنج تولیہ، کناری، عطر گلاب جو عطر جہانگیری کے نام سے مشہور ہے، فرش چاندنی، یہ سب اس کے ایجاد کئے ہوئے ہیں۔

اور یہ بھی نور جہاں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ اس کی ذہانت و فراست کا کرشمہ تھا کہ اس نے جہانگیر ایسے زبردست مغل فرمانروا کو اپنا شیفتہ و مطیع بنالیا تھا اور جہانگیر صرف نام کا بادشاہ تھا۔ حکومت نور جہاں کرتی تھی۔ جہانگیر اکثر کہا کرتا تھا کہ ''میں نے سلطنت نور جہاں کو نذر کر دی۔ ایک سیر شراب اور آدھ سیر گوشت کے سوا مجھے کسی دوسری چیز کی خواہش نہیں ہے۔'' خطبہ کے علاوہ بادشاہی کے تمام لوازم نور جہاں عمل میں لاتی تھی، یہاں تک کہ جھروکے میں بیٹھ کر امراء کا مجرئی لیتی تھی۔ اس کے نام کا سکہ جاری تھا جس پر یہ شعر کندہ تھا۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

شاہی فرامین کا سرنامہ خطِ پیچیدہ میں اس عبارت میں لکھا جاتا تھا: ''حکم علیہ عالیہ مہد علیا نور جہاں بیگم بادشاہ۔''

نور جہاں انعام و بخشش بھی خوب کرتی تھی۔ جس روز حمام میں جاتی تھی تو تین ہزار روپے خرچ ہوتے تھے۔ ملکہ نور جہاں کی یہ خوبیاں گنوانے کے بعد نواب صمصام الدولہ لکھتے ہیں کہ ''اگرچہ عورتیں بہتر صفات کی مالک ہوتی ہیں لیکن فطرتاً وہ ناقص العقل ہوتی

ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اُس کی وجہ سے ہندوستان میں شورش اور بغاوت پھیلی۔ وہ لڑکی جو شیر افگن کے صلب سے تھی، اس کو نور جہاں نے جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار سے بیاہ دیا تھا اور اس کے مرتبہ و مقام میں اضافے کی فکر میں لگ گئی۔ اس نے جہانگیر کو وارث مملکت شاہجہان سے بدظن کر دیا۔ بات یہاں تک بڑھی کہ فوج کشی اور جدال و قتال تک نوبت پہنچ گئی اور ایک بڑی تعداد موت کے گھاٹ اتر گئی۔ مگر نور جہاں اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو سکی اور جہانگیر کی موت کے بعد نور جہاں کے بھائی اور اعتمادالدولہ مرزا غیاث بیگ کے بیٹے نواب آصف خان کی مدد سے شاہجہان ہی ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ شاہجہان نے نور جہاں کا دو لاکھ روپے وظیفہ مقرر کر دیا۔ جہانگیر کی موت کے بعد نور جہاں نے سفید لباس کے سوا کوئی دوسرا لباس نہ پہنا اور نہ خوشی کی کسی مجلس میں شریک ہوئی۔ حتیٰ کہ جہانگیر کی موت کے انیس سال بعد ۱۰۵۵۔ ۱۶۴۵ء میں بہتر (۷۲) سال کی عمر میں وفات پائی اور لاہور میں جہانگیر کے روضے کے قریب اُس مقبرے میں دفن ہوئی جو اس نے خود اپنے لئے بنوایا تھا۔

مرزا غیاث بیگ کو جہانگیر بادشاہ کے دور حکومت میں بہت عروج حاصل ہوا۔ اس ضمن میں صمصام الدولہ نواب شاہنواز خان نے ''مآثر الامراء'' میں لکھا ہے کہ دسویں سال جلوس جہانگیری ۱۰۲۴ھ۔ ۱۶۱۵ء میں بادشاہ کی خاص عنایت سے اعتمادالدولہ مرزا غیاث بیگ کو تمام امراء میں یہ امتیاز حاصل ہوا کہ وہ بادشاہ کے حضور میں نقارہ بجائے۔ سولھویں سال جلوس جہانگیری میں جہانگیر دوبارہ کشمیر کی سیر کے واسطے گیا۔ جب سبھا کے حدود میں شاہی قیام ہوا تو بادشاہ اکیلا قلعہ کانگڑہ کی سیر کے لیے گیا، جس کا احوال آگے آئے گا۔

مرزا غیاث بیگ نے چشمہ نور کے مقام پر قیمتی اشیاء اور تحائف جہانگیر بادشاہ کی نذر کئے۔ جیسا کہ جہانگیر نے خود اپنی ''توزک'' میں لکھا ہے: ''جمعرات ۶ فروردین کو اعتمادالدولہ نے اپنا پیشکش چشمہ نور کے مقام پر نظر سے گزرانا۔ میں نے اس کی پیشکش کو دلی مسرت کے ساتھ ملاحظہ کیا۔ اس میں سے جواہرات، مرصع آلات، اونی اور ریشمی کپڑے سے پسند کئے، باقی اسی کو بخش دیئے۔''

''توزک جہانگیری'' میں بادشاہ نے لکھا ہے کہ ''جہانگیر نامہ کی دو جلدیں مرتب کی گئیں۔ ان دونوں جلدوں کو ملاحظہ کرنے کے بعد ایک جلد مدار الملک اعتمادالدولہ کو اور

دوسری جلد آصف خان کے فرزند کو مرحمت کی۔''

اعتمادالدولہ مرزا غیاث بیگ مغلیہ عہد کے ان معدودے چند امراء میں سے تھے جن کے مکان پر ملاقات کے لئے مغل بادشاہ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ''تزک جہانگیری'' ہی میں جہانگیر نے لکھا ہے کہ ''۲۱ ماہ بہمن کو شکار سے واپسی پر اعتمادالدولہ کی قیام گاہ پر خواجہ خضر کے جشن میں جسے ''خضری'' کہتے ہیں شرکت کی۔ رات کے ایک پہر تک وہاں قیام کیا اور رات کا کھانا کھا کر واپس اپنی اقامت گاہ پر آ گیا۔ اسی دن اعتمادالدولہ کو شرف محرمیت بخشتے ہوئے شاہی مستورات کو حکم دیا کہ وہ ان سے پردہ نہ کیا کریں۔''

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ سولھویں سال جلوس جہانگیری ۱۰۳۱ھ۔۱۶۲۲ء بادشاہ دوبارہ کشمیر کی سیر کے واسطے گیا۔ بادشاہ قلعہ کانگڑہ دیکھنے گیا ہوا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ اعتمادالدولہ کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور ملکہ نور جہاں بہت مضطرب ہے۔ چنانچہ جہانگیر نے واپسی کا حکم دیا اور اعتمادالدولہ کی قیام گاہ پر پہنچا۔ اس وقت اعتمادالدولہ پر عالم نزع طاری تھا۔ کبھی بے ہوش ہو جاتے اور کبھی حالت سنبھل جاتی تھی۔ ملکہ نور جہاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جہانگیر نے اعتمادالدولہ کو مخاطب ہو کر کہا کہ اس کو پہچانتے ہو؟ اعتمادالدولہ نے ایسے وقت میں بھی انوری کا یہ شعر پڑھا۔

آنکہ نابینائے مادر زاد اگر حاضر شود
در جبیں عالم آرائش بہ بیند مہتری

دو گھنٹے بعد اعتمادالدولہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کے اکتالیس بیٹوں اور عزیزوں کو بادشاہ کے حضور سے خلعتِ ماتمی عنایت ہوئے۔ مدارالملک اعتمادالدولہ مرزا غیاث بیگ کا مقبرہ آگرہ میں ملکہ نور جہاں نے تعمیر کرایا جو ۱۰۳۸ھ ۔ ۱۶۲۸ء میں مکمل ہوا۔

حضرت میاں میر لاہوریؒ

حضرت میاں میر صاحب برصغیر پاکستان و ہند کے ممتاز علماء اور اکابر مشائخ میں سے ہیں۔ معقولات اور منقولات کے ماہر اور عارفِ کامل تھے۔ غیر معمولی قوتِ حافظہ اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک اور وسیع المطالعہ عارف باللہ بزرگ ہونے کی بناء پر اپنے زمانے کے علماء وصلحا پر فضیلت رکھتے تھے۔ وحدت الوجود کے قائل اور ''ستر احوال'' کے اصول پر کاربند تھے۔ سلسلہء عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے اور شیخ خضر سینائی قادری کے مرید وخلیفہ تھے۔

حضرت کا نامِ نامی اسم گرامی محمد میر جب کہ بعض مؤرخین نے میر محمد اور عرف ''میاں میر'' اور ''شاہ میر'' لکھا ہے۔ لوگ احتراماً ''میاں جیو'' اور ''بالا پیر'' کہا کرتے تھے۔ ''میاں'' کا لفظ ''صاحب'' اور ''جیو'' عزت وتعظیم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۹۵۷ھ ۔ ۱۵۵۰ء میں ٹھٹہ کے تاریخی شہر کے قریب واقع قصبہ ''سیوستان'' جسے بعض مؤرخین نے ''سہوان'' بھی لکھا ہے، میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد کا نام قاضی سائیں دتہ تھا جو قاضی قلندر فاروقی کے بیٹے تھے۔ اور والدہ کا نام بی بی فاطمہ تھا جو قاضی قادن کی بیٹی تھیں۔ اس طرح حضرت میاں میر سندھ کے ایک معروف قاضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے لئے مشہور تھا۔ ان کا سلسلہء نسب حضرت سیدنا فاروقِ اعظمؓ سے جا ملتا ہے۔

''سکینۃ الاولیا'' کے مطابق حضرت میاں میر صاحب کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بھائیوں کے نام قاضی بولن، قاضی عثمان، قاضی طاہر اور بہنوں کے نام بی بی جمال خاتون اور بی بی جمال بادی تھے۔ اُن کا خاندان منصبِ قضاۃ پر فائز رہا اور علمی میراث کا

حامل تھا۔

حضرت میاں میر سات سال کی عمر کو پہنچے تو شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ مگر چونکہ بچپن ہی سے حصولِ علم کا فطری شوق رکھتے تھے اس لئے پورے جذبہ و جوش، ہمت و حوصلہ اور قوتِ ارادی کے ساتھ مروّجہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل میں لگ گئے اور عبادت وریاضت اور ذکر وفکر الٰہی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ چنانچہ جلد ہی علوم متداولہ میں مہارت پیدا کر لی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد معرفتِ الٰہی کے اوّلین مراحل اپنی والدہ ماجدہ ہی کے زیر تربیت طے کئے جو عارفہ باللہ تھیں۔ پھر سندھ کے ایک نامور قاری بزرگ شیخ خضر سیستانی (متوفی ۹۹۴ھ - ۱۵۸۵ء) کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور خرقۂ خلافت او وعظ وارشاد کی اجازت لے کر لاہور پہنچے۔

حضرت میاں میر کی عبادت وریاضت کا یہ عالم تھا کہ رات کو کبھی سوتے نہ تھے اور حبسِ دم کی یہ حالت تھی کہ ایک دم میں تمام رات گزر جاتی تھی اور ایک ہفتہ کے بعد روزہ افطار ہوتا تھا اور کبھی بحالتِ جذب واستغراق ایک ایک ماہ تک طعام کھانے کی نوبت نہ پہنچتی تھی۔ حضرت میاں میر کی حیات وتعلیمات کے علاوہ ان کے خوارق وکرامات کو شہزادہ داراشکوہ نے اپنی کتاب ''سکینۃ الاولیاء'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور شہنشاہ جہانگیر نے دو خط جو حضرت میاں میر کے نام لکھے تھے، نقل کئے ہیں۔

حضرت میاں میر صاحب بڑے عالی مرتبت اور صاحبِ کشف وکرامات بزرگ تھے۔ ان کی بہت سے کرامات مشہور ہیں۔ شہزادہ داراشکوہ کا بیان ہے کہ ''بیس سال کی عمر میں مَیں اس طرح بیمار ہوا کہ اطباء میرے علاج سے عاجز آ گئے۔ بادشاہ مجھے لے کر حضرت کے مکان پر گیا اور کہا کہ یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ معالج اس کا علاج نہیں کر سکے۔ آپ ہی اس پر توجہ کیجئے۔ حضرت نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اور اس پر دم کر کے مجھے پینے کے لئے دیا۔ ایک ہفتے میں میری بیماری جاتی رہی اور مکمل طور سے صحت یاب ہو گیا۔''

مُعاصر مؤرخ محمد صالح کنبوہ نے ''شاہ جہان نامہ'' میں ''محرم اسرارِ فنا و بقاء شیخِ کامل حضرت میاں میر'' کے عنوان سے ان کے احوال اور علمی وروحانی کمالات قلمبند کئے ہیں۔ جو انتہائی مف معلومات افزاء ہونے کے علاوہ مستند بھی ہیں۔ محمد صالح کنبوہ لکھتے ہیں:

''یہ عارفِ کامل جو اہلِ معرفت کے پیشوا ہیں، فقر وتصوّف کے

مرحلے طے کرنے کے بعد اللہ اور ''الا موجود الا اللہ'' کی منزل تک پہنچے۔ پھر ترکِ دنیا و مافیہا کر کے خواہشات نفسانی سے بلند ہو کر واصل باللہ ہو گئے۔ علوم معقول و منقول میں تبحر کا درجہ حاصل کیا تھا اور تمام متداولہ علوم ازبر تھے۔ اس زمانے کے اکثر دانشور مسائل حل کرنے کے لئے ان سے رجوع کرتے تھے۔ تصوّف کے حقائق و معارف نیز اصطلاحات کے سمجھنے سمجھانے میں بحر ذخار تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تصنیف ''فتوحاتِ مکیہ'' کی عبارتیں جا بجا سے یاد تھیں اور مولانا جامی نے شیخ اکبر کی ''فصوص الحکم'' پر جو شرح لکھی ہے، وہ تمام و کمال ازبر تھی۔''

محمد صالح کنبوہ مزید لکھتے ہیں کہ ''حضرت میاں میر ابتدائے شباب میں وطن سے لاہور آ گئے تھے۔ انہوں نے سلسلۂ قادریہ میں داخل ہو کر طریقت و معرفت کی منزلیں طے کیں۔ چونکہ باکمال عارف اور صوفی نام و نمود کو پسند نہیں کرتے اور گمنامی و گوشہ نشینی کی زندگی کو عزیز رکھتے ہیں اس لئے حضرت میاں میر بھی ایک مدت تک اسی اصول کے تحت زاویہ نشین رہے اور چالیس سال کی عمر تک یوں زندگی بسر کی کہ کسی کو اُن کے روحانی دنیا میں مدارج عالیہ کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ راز پروردگار کی طرح مخفی رہے۔ یہ کیفیت رہی کہ 'میری قبا میں کتنے ہی اولیاء پوشیدہ ہیں جنہیں میرے سوا کوئی نہیں جانتا'۔ تاہم عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ چنانچہ اربابِ صدق و صفا نے اس گل گلزار معرفت کی خوشبو کو سونگھ لیا اور خزانہ توحید و تصوّف کے اس خزانہ دار کی خدمت میں اُن کے زاویے (خانقاہ) تک جا پہنچے۔'' ان متلاشیانِ حق میں اربابِ فقر و تصوّف کے علاوہ امراء و سلاطین اور خواص و عوام بھی شامل تھے۔ چنانچہ مغل فرمانروا جہانگیر، شاہجہان و شہزادہ دارا شکوہ، اورنگ زیب اور جہاں آرا بیگم نہ صرف ان کے معتقدین میں سے تھے بلکہ انہوں نے ان کی خانقاہ میں جا کر باقاعدہ حاضری دی اور فیوض و برکات حاصل کئے۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی تزک میں حضرت میاں میر کی روحانی عظمت و بزرگی کو تسلیم کیا ہے۔

سید محمد لطیف ''تاریخ لاہور'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ محمد میرؒ المعروف میر صاحب لاہور کے صوفی بزرگ تھے۔ ان کے روحانی تقدس اور علم و فضل کی وجہ سے شہنشاہ جہانگیر

ان سے ملاقات کرنے کا بہت خواہشمند تھا اور اس وقت خود لاہور نہ جاسکنے کی بناء پر اس نے انہیں اپنی حکومت کے چودھویں سال دارالسلطنت آگرہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ درویش بزرگ نے دعوت قبول کر لی۔ بادشاہ اس ملاقات کے نتیجے سے بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنی سرگزشت میں ان صوفی بزرگ کی روحانی حالت اور علم و فضل کا ذکر بڑے واشگاف انداز میں کیا ہے، شہنشاہ جہانگیر لکھتا ہے: "حقیقی طور پر خدا کے محبوب ہیں۔ تقدس اور روح کی بالیدگی کے معاملہ میں اس وقت کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ یہ ادنیٰ خادم (یعنی شہنشاہ) ان درویش بزرگ کے پاس جایا کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے علم الکلام کے بہت سے نکات بڑی تفصیل سے سمجھائے۔ میری یہ خواہش تھی کہ میں انہیں کچھ روپیہ پیسہ پیش کروں۔ لیکن چونکہ وہ بزرگ دنیاداری کی چیزوں سے بالاتر ہیں اس لئے میں اس پیشکش کی جرأت نہ کر سکا اور ان کے جائے نماز کے لئے ایک ہرن کی کھال پیش کر کے اطمینان حاصل کر لیا۔ پھر وہ فوراً لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔"

تزک جہانگیری کے اس اقتباس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر حضرت میاں میر سے دلی عقیدت رکھتا تھا وہاں اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لاہور میں ان کی خانقاہ میں جا کر حاضری بھی دیا کرتا تھا۔ نیز جہانگیر نے حضرت میاں میر کے ساتھ خط و کتابت جاری رکھی۔ اس کے حضرت شیخ کے نام دو خط "سکینۃ الاولیا" میں نقل ہوئے ہیں۔ جہانگیر کی طرح اس کا جانشین شاہجہان بھی کبھی تنہا اور کبھی اپنے چاروں بیٹوں سمیت حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ جہانگیر کی طرح شاہجہان بھی دینی اور روحانی راہنمائی حاصل کرنے کے لئے حضرت میاں میر صاحب کو خطوط لکھا کرتا تھا جن میں ملاقات کی درخواست بھی شامل ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک بار شاہجہان نے خط کے ذریعے اشتیاقِ ملاقات اس طرح ظاہر کیا:

قالبم ایں جا و جان در کوئے دوست
خلق را وہمی کہ جان در قالب است

حضرت میاں میر صاحب کی خانقاہ میں شاہجہان کی حاضری کا ذکر کرتے ہوئے محمد صالح کنبوہ "شاہجہان نامہ" میں لکھتا ہے

"دلی اشتیاق کی تحریک سے شہنشاہ شاہجہان ۲۸ دسمبر ۱۶۳۴ء حضرت میاں میر صاحب عزلت نشین درویش کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ چونکہ بادشاہ جانتا تھا کہ میاں میر صاحب دنیا داروں سے ملنا پسند نہیں فرماتے لہذا سلام کے بعد فوراً واپسی کی اجازت طلب کی۔ اس عارف خدا آگاہ کو ہر شخص کے دل کا حال معلوم رہتا ہے۔ سمجھ گئے کہ بادشاہ پاس بیٹھ کر میری صحبت سے استفادہ کرنے کا آرزومند ہے۔ لہذا بادشاہ کو کچھ دیر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ بادشاہ نے کمال خوشی سے بیٹھ کر اس زبدۂ عارفان کی صحبت سے اپنے دل کو روشن کیا اور طرح طرح کے خلائق و معارف سماعت کئے اور وجدان و معرفت کی خوشبو سونگھی۔ یہ بڑی مبارک مجلس تھی جس میں ایک طرف ہفت اقلیم کا بادشاہ اور دوسری جانب ملک طریقت و معرفت کا تاج دار مصروف گفتگو رہے۔ حاضرین نے بھی یہ گفت و شنید سن کر فقر و معرفت کے نکات سیکھے۔ عالم ظاہر اور ملک باطن کے ان دونوں فرمانرواؤں کی باتیں یقین و معرفت اور تحقیق و سلوک کا سرچشمہ تھیں جنہیں سماعت کر کے اہل مجلس نے عرفان و توحید کی دو آتشہ شراب کا سرور حاصل کیا اور حاضرین محفل کو بادۂ معرفت کا ایسا ذوق ملا کہ علم و تحقیق کے مدارج طے کرتے ہوئے علم الیقین کی منزل سے حق الیقین کی بارگاہ تک جا پہنچے... درویشوں اور اللہ والوں کا فرض ہے کہ بادشاہوں کو اچھے کاموں کی نصیحت کرتے رہیں۔ لہذا زبدۂ عارفین قدوۃ الواصلین حضرت میاں میر نے یہ فریضہ ادا کیا۔ بہت سودمند نصیحتیں کیں... شیخ میاں میر کبھی کسی کا تحفہ یا پیشکش قبول نہیں کرتے، لہذا بادشاہ سلامت نے نقد و جنس کا کوئی نذرانہ پیش نہ کیا۔ فقط ایک تسبیح اور ایک سفید پگڑی اس عارف حق آگاہ کی خدمت میں نذر کی اور

التماس کیا کہ یہ ہدیہ قبول فرمائیے۔ جب انہوں نے اسے منظور کر
لیا تو چلتے وقت کمال مسرت و انبساط کے عالم میں بادشاہ نے بڑی
ملائمت سے گزارش کی کہ خانقاہ کے مجاوروں اور اپنے خادموں کے
خرچ کے لئے ایک حقیر سی رقم اور قبول فرمالیجئے۔ حضرت میاں میر
نے جواب دیا کہ "فقیروں کو دولت دنیا قبول کرنا جائز نہیں ہے۔"
المختصر جب یہ صحبت اول سے آخر تک نہایت خوشی وخرمی سے انجام
کو پہنچی تو بادشاہ سلامت دولت و اقبال کو ہمرکاب لئے قلعے میں
واپس آئے۔"

شاہجہان کی حضرت میاں میر صاحب کی خدمت میں حاضری کے یہ احوال محمد صالح کنبوہ نے شاہجہان نامہ کی جلد دوم کے آغاز میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اسی کتاب کی جلد سوم میں حضرت شیخ میاں میر صاحب کے حالات بیان کرتے ہوئے محمد صالح کنبوہ رقم طراز ہیں کہ "بادشاہ سلامت جب کشمیر سے واپس آئے تو دو مرتبہ شیخ کی خانقاہ میں جلوہ افروز ہوئے۔ اگرچہ میاں میر صاحب کو دنیا والوں کی ملاقات سے نہایت نفرت و وحشت تھی اور ہمیشہ اس کام سے بچتے تھے، لیکن حضرت شاہجہان سے بڑی کشادہ پیشانی سے ملے... وہ صحبت بہت ہی دلفریب و دلآویز تھی۔ اہل مجلس نے روحانی فیض خوب حاصل کیا۔ بادشاہ کو بھی اس پیشوائے اہل طریقت سے مل کر اتنی عقیدت ہوئی کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ بارہا حضرت شیخ کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے عارفوں اور درویشوں میں میاں میر صاحب کو کامل پایا۔ بادشاہ زادگی کے زمانے میں شاہجہان کی ملاقات شیخ المشائخ شیخ فضل اللہ سے برہان پور میں ہوئی تھی، وہ بھی واصلین میں سے تھے لیکن حضرت میاں میر کو ان سے بھی زیادہ فنافی اللہ پایا۔ وفات سے ایک روز قبل حاکم لاہور وزیر خان ایک حکیم حاذق لے کر عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ مگر آپ نے علاج معالجہ کرانے کی بجائے ارشاد فرمایا: 'دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست۔' اس طرح فنا فی اللہ ہونے کے باوجود آپ سے جب جہانگیر نے التماس کی کہ تاج و تخت ترک کر کے عبادت الٰہی میں مصروف رہنے کو جی چاہتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ 'پہلے اپنے جیسا کوئی عادل اور منصف مزاج حکمران تلاش کرو پھر ترک علائق کا نام لینا۔ مخلوقِ خدا کو تمہاری ضرورت ہے۔'"

شیخ محمد اکرام نے ''رود کوثر'' میں جہانگیری اور شاہجہانی عہود کے مذہبی اور سیاسی پس منظر میں حضرت شیخ میاں میرؒ کے احوال بیان کئے ہیں اور ان زمانوں کے حوالے سے قادری اور نقشبندی سلاسل کا موازنہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں

''حضرت شیخ عبدالحق محدث نے ابتدائے سلوک میں اُچ کے ایک قادری بزرگ سے فیض حاصل کیا تھا۔ لیکن تقویٰ و پرہیزگاری اور شریعت کی کشش نے انہیں آہستہ آہستہ ایسے سلسلے کی طرف کھینچ لیا جس میں اتباع شریعت پر قادریہ سلسلے سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ وہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے عزیز دوستوں میں سے تھے اور ''طبقات شاہجہانی'' کا مصنف لکھتا ہے کہ انہوں نے خواب میں خود حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اشارہ پا کر حضرت خواجہ باقی باللہ سے نقشبندیہ سلسلے میں بیعت کی تھی... جس عمل سے شیخ عبدالحق متاثر ہوئے، اس کا اثر عہدِ جہانگیری میں دور دور پہنچا اور حضرت مجدد الف ثانی کی عالمگیر شخصیت نے اس زمانے میں نقشبندیہ سلسلے کو بے حد مقبول بنا دیا۔ لیکن ان کی زندگی میں ہی لاہور کے قرب میں ایک ایسا شیخ سلوک کی منزلیں طے کر رہا تھا، جس کے اثر سے پھر ایک بار قادریہ سلسلہ چمک اٹھا۔ یہ بزرگ شیخ میاں میرؒ تھے، جنہوں نے قادریہ سلسلے کے ہندوستانی مرکز اُچ سے نہیں بلکہ اس طریقے کی ایک اور شاخ سے فیض حاصل کیا اور جن کو نہ صرف عوام الناس میں بلکہ علمی اور درباری حلقوں میں اس قدر مقبولیت ہوئی کہ ان کے سامنے دوسروں کے چراغ مدھم پڑ گئے۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم کے ہم عصر تھے، عہدِ شاہجہانی کی عام ملکی تاریخیں دیکھیں تو حضرت میاں میر کے متعلق طویل اندراجات ملیں گے اور خواجہ محمد معصوم کی نسبت کہیں ایک آدھ سطر، بلکہ اس زمانے کی بعض مشہور تاریخیں مثلاً عمل صالح (شاہجہان نامہ)، بادشاہ نامہ، منتخب اللّباب وغیرہ تو خواجہ صاحب کے ذکر سے یکسر عاری ہیں اور اس کی وجہ یہی خیال میں آتی ہے کہ خاص خاص حلقوں سے قطع نظر جو رنگ عہد شاہجہانی میں مقبول تھا، وہ قادری تھا۔ نقشبندی نہ تھا اور اس زمانے کے سب سے بااثر شیخ حضرت میاں میر ہی تھے... آپ عبادتِ الٰہی میں اس قدر منہمک رہتے تھے کہ زاویہ خمول سے باہر نہ نکلتے اور چالیس سال اہل لاہور کو پتا بھی نہ ہوا کہ اس پائے کا ایک بزرگ ان کے درمیان موجود ہے۔ آپ کو وحدت الوجودی فلسفے سے خاص محبت تھی۔''

حضرت میاں میر کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت اپنے مریدوں سے فرمایا

کرتے تھے کہ چونکہ دل ایک ہے اور ایک چیز میں صرف ایک چیز ہی سما سکتی ہے اس لیے مجرد ہونا چاہیے۔ جب کوئی طالب ترک و تجرید کا مصمم ارادہ کر لیتا تو آپ اُسے ریاضتِ شاقہ یعنی کم خوری، کم خوابی اور کم گوئی کی تلقین فرماتے تھے۔ تجرید و تفرید کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ وہی طالب کمال پاتا ہے جو طریقت کے اس اصول پر عمل کرے۔ اکابر مشائخ نے اسے ''کندن و پیوستن'' کہا ہے۔ اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ اگر کسی کے سر کا ایک بال ناپاک ہو اور جسم کے باقی اعضاء دھو دیے جائیں تو ناپاکی باقی رہتی ہے۔ اسی طرح ترک علائق کے ساتھ اگر دنیاوی اندیشہ دل میں رہے تو اسے تعلقات سے بری اور مجرد نہیں کیا جا سکتا اور اس کی باطنی ناپاکی باقی رہتی ہے۔ جادۂ طریقت میں مکمل تجرید کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ بایں ہمہ حضرت میاں میر کی شخصیت جمالی تھی جو مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لیے بھی ایک خاص کشش رکھتی تھی اور ہر طبقے کے لوگ اُن کا حد درجہ ادب و احترام کرتے تھے۔

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' جلد چہارم، (فارسی ادب) کے فاضل مقالہ نگار حامد خان حامد کی تحقیق کے مطابق ''حضرت میاں میر کی کوئی تصنیفات نہیں ہیں۔ علماء و فضلاء آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ کی زبان مبارک سے آیات و احادیث اور اقوالِ بزرگان اور اشعارِ اساتذہ کے عجیب عجیب معانی سن کر حیران رہ جاتے تھے۔ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی (متوفی ۱۶۵۶ء) بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ آپ نیک اعمال اور خیرات پر زور دیا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے: **لاصلٰوۃ الا بحضور القلب**۔ حضرت یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

شرطِ اول در طریقِ عاشقی دانی کہ چیست
ترک کردن ہر دو عالم را و پشتِ پا زدن

اسی لئے ''بودن'' کی بجائے ''نہ بودن'' آپ کی طبیعت کو مرغوب تھا۔ اپنے خلیفہ مجاز میاں نتھا کو ''نہ تھا'' (نہ بود) کہہ کر پکارتے تھے۔

حضرت میاں میر نے برصغیر بالخصوص پنجاب اور سندھ کے علاقوں میں اسلامی تعلیمات کو پھیلانے میں قابلِ قدر سرگرمی عمل کا مظاہرہ کیا اور بھگتی تحریک کے منفی اثرات کو زائل کرنے کے لیے ایک خاص حکمت عملی وضع کی۔ چنانچہ حضرت میاں میر اور ان کے اکابر خلفاء نے بھگتی تحریک کے خفیہ مقاصد اور درپردہ عزائم کو ناکام بنانے کے لیے

اپنے انداز میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں تبلیغی کام کیا اور انہیں بڑے مؤثر، حکمت آموز اور حکمت آمیز طریقوں سے خدا کے آخری اور پسندیدہ دین اسلام کے حیات بخش، روح پرور اور ایمان افروز اصولوں سے روشناس کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام کے علاوہ غیر مسلم آبادی کا معتد بہ حصہ حضرت میاں میر کا عقیدت مند تھا۔

حضرت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ رزقِ حلال پر بہت زور دیتے تھے۔ تمام عمر پارسائی و تجرّد میں گزار دی۔ فقر و فنا اور بے نیازی اور استغناء کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ البتہ کبھی کبھی جب بشریت کے تقاضے سے بھوک ستاتی تھی تو انتہائی ضرورت کے عالم میں صرف اپنے مریدوں سے ان کی حلال کی کمائی میں سے نانِ خشک لے لیا کرتے تھے اور معمولی لباس پہنتے تھے۔ دنیا والے ان کے پاس آتے تو انہیں بھی یہی تلقین کرتے تھے۔ مریدوں کو معرفت و سلوک کی منزل تک پہنچانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ان کا جو بھی مرید طریقت کی منزل میں قدم رکھتا بہت جلد اعلیٰ روحانی مدارج پر پہنچ جاتا۔"

عارفِ کامل، فاضلِ اجل اور عالمِ بے بدل حضرت شیخ میاں میر صاحب نے ۱۰۴۴ھ۔ ۱۶۳۴ء میں وفات پائی۔ مرقدِ منور غیاث پور میں ہے۔ جو نلہ منڈی عالم گنج لاہور چھاؤنی کے قریب واقع ہے۔ یہ علاقہ اب حضرت شیخ کے مزار پُر انوار کی نسبت سے "میاں میر" کہلاتا ہے۔ دارا شکوہ نے ان کا مزار تعمیر کرانے کے لئے مسالہ وغیرہ جمع کیا تھا لیکن قضاء قدر نے اسے اس کی مہلت نہ دی۔ چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر نے حضرت میر صاحب کا مزار تعمیر کرایا۔ مزار کے قریب ایک بارہ دری میں دارا شکوہ کی رفیقۂ حیات نادرہ بیگم کی قبر ہے۔ حضرت میاں میر کا مزار آج بھی مرجع عوام و خواص ہے اور باقاعدہ سالانہ عرس ہوتا ہے۔

شکر اللہ شیرازیؒ

ملا شکر اللہ شیرازی مغلیہ عہد کی معروف شخصیات میں سے تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر اور فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کے ساتھ دولت و امارت بھی عطا فرمائی تھی۔ دینی علوم میں کامل دستگاہ اور علمِ فلکیات، ہندسہ اور ریاضی میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ بہادر و شجاع سپاہی، کامیاب سپہ سالار، لائق و فائق منتظم، مدبر سیاستدان اور فرض شناس منصب دار تھے۔ زمانے کے نشیب و فراز دیکھے، محلاتی سازشوں کا شاہی ایوانوں کے علاوہ جنگ کے میدانوں میں مقابلہ کیا مگر ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ کئی اہم مہمات کی قیادت کی اور بڑے سے بڑا خطاب، لقب اور منصب حاصل کیا۔

ملا شکر اللہ ایران کے مشہور اور خوب صورت شہر شیراز میں پیدا ہوئے اور وہیں انہوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور پھر اپنی قسمت آزمانے کے لئے وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ جہانگیر بادشاہ کے عہد میں سمندری راستے سے سورت کی بندرگاہ پہنچے اور وہاں سے برہانپور میں آکر سکونت اختیار کر لی۔ چونکہ صاحب فضل و کمال اور ذہانت و فراست و دیانت میں یکتا تھے اور بڑی بڑی مہمات سر کی تھیں، برصغیر کے دو بڑے بادشاہوں یعنی نور الدین محمد جہانگیر اور شہاب الدین محمد شاہجہان کے دورِ حکومت میں اعلیٰ ترین مناصب پر فائز رہے تھے اس لئے معاصر مؤرخین یعنی محمد صالح کنبوہ نے ''شاہجہان نامہ'' میں اور نواب صمصام الدولہ شاہنواز خان نے ''مآثر الامراء'' میں ان کے حالاتِ زندگی کے علاوہ ان کے علمی کمالات، شخصی خصوصیات اور کارناموں کو قدرے تفصیل سے

بیان کیا ہے۔

''مآثر الامراء'' میں ان کے احوال ''افضل خان علامی ملا شکر اللہ شیرازی'' کے زیر عنوان بیان ہوئے ہیں۔ افضل خان ان کا خطاب تھا۔ علامی یعنی علامہ ان کا لقب تھا۔ مؤلف ''مآثر الامراء'' کا بیان ہے کہ ملا شکر اللہ دارالعلم شیراز میں تحصیل علم کے بعد مدتوں علوم رسمیہ کی درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ہندوستان پہنچے تو خان خاناں نے اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ بعد ازاں شہزادہ خرم یعنی شاہ جہان سے تعلق ہو گیا اور وہ اس کے لشکر کے میر عدل مقرر ہوئے۔ رانا کی مہم میں وہ شاہجہان کے مشیر، منشی اور مصاحب تھے۔ ملا شکر اللہ نے شہزادہ شاہجہان کی مرضی کے مطابق رانا سے مصالحت کرا دی جس کے نتیجے میں ان کا اعتبار بہت بڑھ گیا اور شہزادے کی سرکار کا دیوانی کا عہدہ انہیں ملا اور شہزادے کی درخواست پر شہنشاہ جہانگیر نے ان کو افضل خان کا خطاب عطا کیا۔

''شاہجہان نامہ'' میں محمد صالح کنبوہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ نویں سال جلوس جہانگیری میں ۹ صفر ۱۰۲۳ھ۔ ۲۱ مارچ ۱۶۱۴ء کو بادشاہ نے جشنِ نوروز منایا اور حکیم شکر اللہ شیرازی کو جو دانش و حکمت اور عقلی و نقلی فنون میں ہم چشموں سے ممتاز تھے، شہزادہ خرم کا دیوان مقرر کیا اور انہیں ''افضل خان'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ''مآثر الامراء'' اور ''شاہجہان نامہ'' کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب سیف و قلم ملا شکر اللہ شیرازی کو عہدِ جہانگیری اور عہدِ شاہجہانی کے دوران قابلِ قدر اہمیت و عظمت حاصل ہوئی۔ عہدِ شاہجہانی میں تو ان کی قسمت کا ستارہ چمکا۔

شاہجہان اپنے دورِ شہزادگی ہی سے علامی افضل خان شکر اللہ کی صلاحیتوں کا قائل تھا اور ان پر مکمل اعتماد کرتا تھا۔ ذمہ داری کا ہر کام انہیں سونپتا تھا اور ہر اہم مہم پر انہیں روانہ کرتا تھا۔ اس کی تفصیلات ''شاہجہان نامہ'' اور ''مآثر الامراء'' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ شاہجہان نے جو کام یا مہم علامی شکر اللہ شیرازی کو سونپی اس میں وہ ہمیشہ کامیاب و کامران لوٹے۔ لیکن جب شہنشاہ جہانگیر نے اپنی چہیتی ملکہ نور جہاں کے زیرِ اثر شہزادہ شہریار کی سرپرستی شروع کی اور شہزادہ شاہجہان کی جگہ اسے ولی عہد بنانے کے منصوبے تیار ہونے لگے اور اس ضمن میں جہانگیر نے بعض غلط اقدامات کئے تو شاہجہان نے شہنشاہ کو اصل حالات سے آگاہ کرنے کے لئے افضل خان علامی شکر اللہ شیرازی کو شاہی دربار میں بھیجا۔ جہانگیر چونکہ دل و جان سے نور جہاں پر فریفتہ تھا اور کوئی کام اس کی مرضی کے

خلاف نہیں کرتا تھا، ان حالات میں اسے حقیقت سے آگاہ کر کے راہِ راست پر لانا ایک ٹیڑھی کھیر تھی۔ محمد صالح کنبوہ نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

جہانگیر دمہ کا مریض تھا۔ نور جہاں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ تخت و تاج چھوڑ دے گا اور شاہجہان بادشاہ بنے گا۔ اس طرح نور جہاں کو دربار میں اپنا اثر و رسوخ اور اقتدار ختم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ اگر حکومت جہانگیر کے چوتھے بیٹے شہریار کو مل جائے تو اس کے اقتدار و اختیار میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کی بیٹی، جو شیر افگن کے صلب سے تھی، شہریار کی بیوی تھی۔ اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہونے کے لئے نور جہاں نے جہانگیر کو شاہجہان سے بدظن کرنے کے لئے اس کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ شاہجہان بغاوت پر آمادہ ہے۔ چنانچہ شاہجہان کی قوت اور شہرت کو خراب کرنے کے لئے نور جہاں نے قندھار کی مہم شہریار کے نام کرا دی۔ نور جہاں کا باپ اعتماد الدولہ بہت دولت چھوڑ کر مرا تھا اور نور جہاں نے وہ سب دولت شہریار کے حوالے کر دی تاکہ وہ اپنی فوج میں اضافہ کرے۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے معتمد خاص مرزا رستم صفوی کو شہریار کا اتالیق مقرر کرا دیا اور شاہجہان کی جاگیریں بھی شہریار کے نام کرا دیں۔ یہاں تک کہ شاہجہان کے وکیل میر عبدالسلام کو جہانگیر نے نور جہاں کی ایماء پر نہ صرف شاہی دربار میں آنے سے روک دیا بلکہ اسے شاہجہان کے پاس واپس بھجوا دیا۔ اس کے ساتھ ہی جہانگیر نے اپنے امراء کو روانہ کیا تاکہ وہ ان سرداروں اور صوبہ داروں کو اپنے ساتھ واپس لے کر آئیں جو شاہجہان کے ماتحت یا اس کے پاس تھے۔

شاہجہان یہ صورتِ حال کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے علامی افضل خان کو حکم دیا کہ وہ دھاوا مارتا ہوا شاہی دربار میں پہنچے اور ہر قیمت پر بادشاہ کو حقائق سے آگاہ کرے اور مناسب الفاظ میں بادشاہ کے گوش گزار یہ بات بھی کرے کہ آپ کا یہ فرزند دل و جان سے آپ کا وفادار ہے اور اس سے کوئی خطا اور قصور بھی سرزد نہیں ہوا ہے تو پھر اس کی جاگیریں ضبط کر کے نالائق شہریار کو کیوں دی گئی ہیں۔ شاہجہان کی ہدایات کے مطابق علامی افضل خان نے یہ تمام باتیں بادشاہ کے گوش گزار کر دیں لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوا۔

علامی افضل خان کی اس ناکامی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے نواب شاہنواز خان

نے ''ماثر الامراء'' میں لکھا ہے کہ خود غرض سازشیوں اور مفاد پرستوں نے اختلافات کے اسباب اس طرح مرتب نہیں کئے تھے کہ افضل خان کی اصلاحی کوششوں سے کوئی نتیجہ برآمد ہو جاتا۔ اگرچہ افضل خان ایسے بااعتماد اور مخلص خیر خواہ امیر کی باتوں سے متاثر ہو کر جہانگیر نے نور جہاں کو سمجھایا لیکن اس کی دشمنی و عداوت میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا اور افضل خان کو ناکام واپس آنا پڑا۔

شہزادہ شاہجہان کو یقین ہو گیا کہ معاملہ نامہ و پیام اور افہام و تفہیم سے طے نہیں ہو سکتا۔ اس کے پاس کافی فوج تھی مگر وہ براہِ راست شاہی افواج سے جنگ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ شہنشاہ جہانگیر بذاتِ خود شاہی لشکر میں موجود تھا۔ اس لئے وہ جمنا کے کنارے کوچ کرتا چلا گیا۔ ادھر جہانگیر بھی اپنے لشکر کو دریا کے ساتھ بڑھاتا چلا گیا۔ شاہجہان نے علامی افضل خان کو بنگالہ روانہ کیا اور خود خانِ خاناں کو ساتھ لے کر اپنے لشکر سے ایک طرف ہٹ گیا۔ البتہ داراب خان پسر خانِ خاناں، راجا بکر ماجیت، اور دوسرے سردار مثلاً راجا بھیم، رستم خان اور بیرام بیگ وغیرہ کو پانچ افواج کی صورت میں شاہی لشکر کے مقابلہ میں کھڑا کئے رکھا۔ بظاہر داراب خان فوج کی کمان کر رہا تھا مگر درپردہ شاہجہان ہی اپنی افواج کا سالار تھا۔

جمادی الاول ۱۰۳۲ھ اپریل ۱۶۲۳ء میں بدھ کے دن باپ بیٹے کی افواج کے مابین جنگ ہوئی اور باپ بیٹا ایک دوسرے کے خلاف میدانِ جنگ میں اترے۔ دونوں طرف کے توپ خانوں نے بار بار آگ اگل کر جنگ کا آغاز کیا۔ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہ جنگی معرکہ بلوچ پور اور قبول پور کے مابین ہوا اور اہم بات یہ ہے کہ اس جنگ سے ایک سال قبل شاہجہاں نے اپنے بھائی سلطان خسرو کو ہلاک کر دیا تھا جس کی تفصیل یوں ہے۔

۲۰ ربیع الثانی ۱۰۳۱ھ مارچ ۱۶۲۲ء کو منگل کی رات شاہجہان نے تخت دہلی کو اپنے لئے محفوظ کرنے کے لئے ایک سفاکانہ اقدام یہ کیا کہ اس نے اپنے بھائی سلطان خسرو کو جو اس کی قید میں تھا اپنے قید خانہ میں ہی گلہ گھونٹ کر مار دیا۔ سلطان خسرو پہلے اپنے باپ جہانگیر کی قید میں تھا مگر جہانگیر نے ایک روز شراب کی مدہوشی میں اسے شاہجہان کے حوالے کر کے ایک احمقانہ کام کیا تھا۔ خسرو کی ہلاکت کا مطلب یہ تھا کہ تخت دہلی کے ایک دعویدار اور شاہجہان کے ایک حریف کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطان خسرو کو عوام و خواص

دونوں بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ چال یہ چلی گئی کہ اگلے روز اس کی نعش کو بڑی تعظیم و توقیر کے ساتھ ارکانِ سلطنت جنازے کی صورت میں کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے شہر برہانپور سے باہر نکلے اور رات کو اسے عالم گنج میں دفن کر دیا۔ اس دردناک واقعہ سے لوگوں کے دل پگھل گئے اور شہر کے مرد اور عورتیں بازاروں میں نکل آئیں اور سب اس مظلوم کی بے کسی پر زار زار روئے۔ اس جانکاہ حادثے کی خبر نے لوگوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔ دور و نزدیک کے باشندے مدتوں غم زدہ اور مضطرب و بے قرار رہے۔ جب تک خسرو کی نعش برہانپور میں دفن رہی لوگ کثیر تعداد میں جمعہ کی شب کو اس کی قبر کی زیارت کے لئے آتے رہے۔ پھر جب نعش یہاں سے نکال کر الہ آباد لائی جا رہی تھی تو راستے میں ہر شہر اور ہر بستی کے لوگوں نے اس کا مزار تیار کیا۔ ان مزارات پر ہر جمعرات کو آس پاس کے لوگ آ آ کر افسوس کرتے اور ساری ساری رات وہاں گزار دیتے۔

محمد صالح کنبوہ نے شہزادہ کے ہاتھوں سلطان خسرو کی ہلاکت کا سبب شاہجہان کا یہ خدشہ بیان کیا ہے کہ نور جہاں کی ترغیب پر جہانگیر کہیں خسرو کو اپنا جانشین اور ولی عہد نامزد نہ کر دے۔ شہزادہ پرویز اور شہریار کو شاہجہان اس وقت تک اپنا اصل حریف نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ سلطان خسرو کا کانٹا نکال کر آگرہ کی جانب پیش قدمی کرنے سے پہلے شاہجہان نے اپنے بڑے حریف کی زندگی کا چراغ گل کر کے برہانپور کے قصرِ شاہی میں جشنِ نوروز اور محفل فتح وظفر آراستہ کی جس میں زر و جواہر کو اس طرح لٹایا گیا کہ زمین کی چمک دمک آسمان سے بھی بڑھ گئی۔ اس کے ایک سال بعد ۱۰۳۲ھ۔ ۱۶۲۳ء میں جب نور جہاں نے جہانگیر کو مجبور کر دیا کہ وہ شہریار کو ولی عہد مقرر کرے تو شاہجہان نے شاہی لشکر سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں وہ جنگ ہوئی جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس جنگ میں شاہجہان کی شکست و ناکامی یقینی تھی۔

شہنشاہ جہانگیر کی شاہی افواج میں موجودگی میں شاہجہان یا کسی اور شہزادے بلکہ برصغیر کی کسی بھی طاقت کا شاہی افواج پر غالب آنا ممکن نہیں تھا۔ خود جہانگیر نے جب شہنشاہ اکبر کے خلاف بغاوت کی اور جہانگیر کی سپاہ افواجِ شاہی کے مقابلے پر آئی تھی تو جہانگیر کو بری طرح ناکامی و نامرادی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ اب تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ شاہجہان کی افواج پر شہنشاہ دہلی کی ہیبت طاری تھی اس کے اکثر امراء اور ملازمین اس کا ساتھ چھوڑ کر شاہی لشکر میں شامل ہو گئے۔ حتیٰ کہ علامی افضل

خان ایسے وفادار امیر کا بیٹا مرزا محمد بھی اپنے اہل و عیال اور والدہ سمیت بے وفائی کر کے داغ جدائی دے گیا۔ شاہجہان نے سید جعفر بارہہ اور خان قلی اوزبک کو بعض دوسرے سرداروں اور سپاہیوں کے ساتھ اس کے پیچھے روانہ کیا اور یہ حکم دیا کہ اسے پہلے نرمی سے سمجھائیں اور اسے زندہ واپس لائیں۔ لیکن اگر وہ واپس آنے سے انکار کر دے تو پھر اس کا سر لائیں۔ ان امراء نے اسے نرمی سے سمجھانے کی بہت سعی و کوشش کی لیکن وہ کسی طور واپس آنے پر آمادہ نہ ہوا تو مقابلہ ہوا۔ مرزا محمد پسر افضل خاں نے علی قلی سمیت متعدد سپاہیوں کو قتل کر دیا اور سید جعفر بارہہ اور اس کے کئی ساتھیوں کو زخمی کر دیا۔ بالآخر مرزا محمد اپنے ساتھیوں سمیت ہلاک ہوا اور اس کا سر کاٹ کر شاہجہان کے سامنے لایا گیا۔

جب مرزا محمد اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا اس وقت علامی افضل خان بیجاپور کی سفارت پر گئے ہوئے تھے۔ تاکہ شاہجہان کے لئے سلطان عادل خان والیِ بیجاپور کی ہمدردیاں حاصل کی جاسکیں۔ چنانچہ افضل خاں کو اپنے بیٹے کی ہلاکت اور اپنے خاندان کی ذلت کی اطلاع بیجاپور میں ہی ملی اور وہ غم زدہ ہو کر وہیں رک گئے اور شاہی لشکر کے سپہ سالار مہابت خان نے اس افسوس نام واقعہ کے بارے میں انہیں ایک خط لکھا جس میں ان کی دلجوئی کی گئی تھی اور انہیں مزید گفتگو کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ مہابت خان کے اس خط کے وصول ہونے پر علامی افضل خان مہابت خان کے پاس شاہی لشکر میں پہنچ گئے۔ نواب شاہنواز خان کا اس ضمن میں بیان قدرے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاہجہان نے علامی افضل کی رضا جوئی چاہی اور بنگالہ سے واپسی پر بیسویں سال جلوسِ جہانگیری ۱۰۳۵ھ۔ ۱۶۲۶ء میں انہیں تحائف کے ساتھ دربار شاہی میں بھیجا۔ جہانگیر نے غصے کے عالم میں افضل خان کو دربار میں روک لیا اور انہیں اپنا خانساماں بنا دیا۔ دو برس بعد ۱۰۳۷ھ میں جہانگیر کشمیر کی سیر کے لئے روانہ ہوا تو افضل خان بھی اس کے ساتھ تھے لیکن وہ لاہور میں رک گئے۔

افضل خان کے لاہور میں قیام کے دوران عجیب و غریب حالات واقع ہوئے۔ شہریار نے اپنی جانشینی کا اعلان کیا اور افضل خان کو اپنا وکیل اور مہمات کا مختار بنایا۔ جب کہ افضل خان دلی طور پر شاہجہان کے خیر خواہ تھے۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ محلاتی سازشیں اپنے نقطۂ عروج پر تھیں۔ جہانگیر کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی اس نے کشمیر سے واپسی کا فیصلہ کیا لیکن راستے ہی میں ۲۷ صفر ۱۰۳۷ھ۔ ۲۷ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو

راہیِ ملک عدم ہوا۔ اس وقت آصف خان پنجاب کا صوبہ دار تھا۔ وہ نور جہاں کا بھائی اور شاہجہان کا سسر یعنی ارجمند بانو کا باپ تھا۔ ظاہر ہے کہ آصف خان کی ہمدردیاں اس کے اپنے داماد شاہجہان کے ساتھ تھیں نہ کہ اپنی بہن نور جہاں کے داماد شہریار کے ساتھ۔ چنانچہ جب شہریار نے لاہور میں اپنی جانشینی کا اعلان کیا تو آصف خان نے انتہائی چالاکی اور عیاری سے کام لیتے ہوئے سلطان خسرو کے بیٹے داور بخش کو قید خانہ سے نکال کر سلطنت کے لئے نامزد کر دیا۔ شہریار کی فوج کو آصف خان نے آسانی سے شکست دے کر شہریار کو داور بخش کے سامنے پیش کیا اور اسے قید کرنے کے دو تین دن بعد اندھا کر دیا۔ سلطنت کے لئے داور بخش کی نامزدگی دراصل آصف خان کی ایک چال تھی اور شاہجہان کی بادشاہت کی تمہید بھی۔ سب جانتے تھے کہ داور بخش محض قربانی کا بکرا ہے۔

شاہجہان کو احمد آباد گجرات میں ہندو ساہوکاروں کی تحریر کے ذریعے لاہور میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی برابر اطلاعات مل رہی تھیں۔ آصف خان نے بناری نامی ایک ہندو جو مشرف فیل خانہ تھا اور تیز دوڑنے میں بے مثال تھا، کے ذریعے زبانی پیغام دے کر شاہجہان کے پاس بھیج دیا۔ چنانچہ حالات سے پوری طرح آگاہ ہونے کے بعد شاہجہان نے خود اپنے قلم سے حکم نامہ لکھ کر آصف خان کو بھجوایا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ داور بخش اور دوسرے تمام مغل شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اس حکم نامے کی تعمیل کرتے ہوئے آصف خان نے ۲۲ ربیع الآخر ۱۰۳۷ھ بروز پیر داور بخش پسر سلطان خسرو کو قید کر کے لاہور میں شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھا اور ۲۶ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ کو داور بخش اور اس کے بھائی گرشاسپ اور سلطان شہریار پسر جہانگیر اور سلطان دانیال کے دو بیٹوں طہمورث اور ہوشنگ کو تہ تیغ کر دیا۔ جب جہانگیر کے بیٹوں اور پوتوں کو محض اس خدشہ کے تحت قتل کیا جا رہا تھا کہ وہ آئندہ کسی موقع پر تخت دہلی کے دعویدار بن کر شاہجہان کے سامنے کھڑے نہ ہو جائیں اس وقت جہانگیر کے بیٹوں میں سے زندہ رہنے والا واحد بیٹا یعنی خود شاہجہان احمد آباد گجرات میں تھا اور شاہجہان کی اپنی نرینہ اولاد میں سے جہانگیر کے تین پوتے یعنی شہزادہ دارا شکوہ، شہزادہ شجاع اور شہزادہ اورنگ زیب شہر لاہور میں اپنے چچا اور چچازادوں کے مقتل کے قریب موجود تھے۔ گویا کہ شاہجہان نے تخت نشین ہونے سے پہلے اپنے باپ شہنشاہ جہانگیر کے تمام بیٹوں اور پوتوں یعنی اپنے تمام بھائیوں اور بھتیجوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایسا سفاکانہ کام ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں

میں سے کسی بادشاہ نہیں کیا۔ سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر شاہجہان کے اپنے جانشین اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے جانشینوں میں سے کوئی ایک بادشاہ بھی اپنے بیٹوں کے سوا اپنے باپ کی تمام نرینہ اولاد کو تہہ تیغ کروا کے شاہجہان کی طرح دہلی کے تخت پر نہیں بیٹھا۔

۷ جمادی الآخر ۱۰۳۷ھ۔ ۱۳ فروری ۱۶۲۸ء کو شاہجہان ابوالمظفر ب الدین محمد شاہجہان کے القاب کے ساتھ تخت نشین ہوا تو داراشکوہ، شجاع اور اورنگ زیب، اپنے نانا آصف خان کے ہمراہ لاہور سے آگرہ پہنچے۔ اسی سال شاہجہان نے آصف خان کو یمین الدولہ آصف خان کا خطاب عطا کیا اور وکالت کے عہدے کے علاوہ مہر اوزک اس کی تحویل میں دی اور اس کو آٹھ ہزاری ذات اور آٹھ ہزار سوار دواسپہ دسراسپہ کا منصب ملا۔ اس رتبہ پر آصف خان سے پہلے اور کوئی امیر نہ پہنچا تھا۔

۲۶ جمادی الآخر ۱۰۳۷ھ کو افضل خان لاہور سے دارالسلطنت پہنچے تو شاہجہان نے انہیں چار ہزار ذات اور دو ہزار سوار کا منصب دیا اور حسب سابق میر سامانی کے عہدے پر برقرار رکھا۔ بعد ازاں ۲۴ رجب ۱۰۳۸ھ۔ ۱۹ مارچ ۱۶۲۹ء کو علامی افضل خان کو دیوانی کل یعنی وزیر مال بنا دیا گیا اور ان کے منصب میں بھی اضافہ ہو گیا۔ کسی شاعر نے اس تقرری کی تاریخ نکالی۔ مصرع تاریخ ''شد فلاطون وزیر سکندر'' ۱۰۳۸ھ ہے۔

علامی افضل خان کے احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے دامن کو ہر نوع کی سازشوں سے پاک رکھا۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک شاہجہان کے دربار سے وابستہ رہے۔ ان کی وفاداری ہر قسم کے حالات میں غیر متزلزل رہی۔ اُن کے بیٹے مرزا محمد کو شاہجہان کے حکم پر قتل کیا گیا اور ان کی اہلیہ سمیت اُن کے اہلِ خانہ کی توہین کی گئی، مگر شاہجہان سے اُن کے تعلقِ خاطر اور وفاداری میں کوئی فرق نہ آیا۔ غرض یہ کہ علامی افضل خان کا شمار مغل عہد کے ان چند امرائے سلطنت میں ہوتا ہے جن کے مکان پر مغل بادشاہ جایا کرتے تھے۔ ۱۰۴۲ھ میں شاہجہان بادشاہ ان کی رہائش گاہ ''منزل افضل'' میں آیا۔ پھر جب وہ بیمار ہوئے تو شاہجہان ان کی عیادت کے لئے آیا۔ افضل خان کے علم و فضل و اخلاق و آداب اور شائستگی و وقار کا اندازہ شہنشاہِ ہند شاہجہان کے اس قول سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ شاہجہان بار بار کہا کرتا تھا کہ ''اٹھائیس سالہ ملازمت کے دوران افضل خان سے کسی کے متعلق کوئی بری بات نہیں سنی۔'' فصاحت میں وہ اپنے وقت کے

حسانؒ تھے۔

افضل خان علامی ملا شکراللہ شیرازی نے ۱۲ رمضان ۱۰۴۸ھ ۔ ۷ جنوری ۱۶۳۹ء کو وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات ''زخوبی برد گوئے نیک نامی'' سے نکالی گئی ہے۔ مقبرہ آگرہ میں ہے اور چینی روضہ کے نام سے مشہور ہے۔

مُلاّ محمد ٹھٹوی

مُلاّ محمد ٹھٹوی مغلیہ عہد کے اکابر امراء اور ممتاز علماء میں سے تھے۔ مُلاّ محمد ظاہری و باطنی علوم کے جامع تھے۔ انہوں نے مروّجہ علوم وفنون کی با قاعدہ تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ حدیث، فقہ، تفسیر، علم الکلام، منطق اور علوم عربیہ پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ اعلیٰ اخلاق و آداب اور پسندیدہ اطوار کے حامل متقی پرہیز گار و درویش منش انسان تھے۔ اپنے علم و فضل اور شخصی کمالات کی بناء پر سلطنتِ مغلیہ میں اعلیٰ ترین عدالتی عہدوں پر فائز ہوئے۔

مُلاّ محمد ایک صوفی مشرب دینی علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد مُلاّ محمد یوسف بھی درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنے زہد وتقویٰ اور صدق و صفا کے لئے مشہور تھے۔ انہوں نے اپنے فرزندِ ارجمند مُلاّ محمد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی اور انہیں اسلامی علوم وفنون سے آراستہ کر دیا۔ صمصام الدولہ شاہنواز خان نے ''مآثر الامراء'' کی جلد سوم میں مُلاّ محمد یوسف کے اقوال اور مُلاّ محمد کی تعلیم و تربیت کے بارے میں لکھا ہے کہ مُلاّ محمد ٹھٹوی کے والد محمد یوسف درویشانہ اور فقیرانہ زندگی گزارتے تھے، روحانی کمال کے مالک اور مردِ حق آگاہ تھے۔ ان کے لائق فرزند مُلاّ محمد نے آغازِ جوانی میں علومِ دینیہ کو عقلی ونقلی دلائل کے ساتھ حاصل کیا اور پھر وہ معقولات کی تحصیلِ علم میں مصروف ہوئے اور جلد ہی ہر فن میں مہارت حاصل کر لی اور جامعیتِ علوم میں مشہور ہو گئے۔

مُلاّ محمد ٹھٹوی کے شخصی کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ''مآثر الامراء'' کے مؤلف نے لکھا ہے کہ ''رسمی فضیلت کے باوجود وہ ثقہ، دیندار، متقی اور پرہیز گار تھے۔''

مُلاّ محمد ٹھٹوی فارغ التحصیل ہوئے تو اپنا حلقۂ درس قائم کر کے طلبہ کی تعلیم و تدریس

میں مشغول ہو گئے۔ وہ ایک کامیاب معلم ثابت ہوئے، ان کے فضل و کمال کی شہرت جلد ہی دور و نزدیک کے علاقوں میں پھیل گئی اور طالبانِ علم کثیر تعداد میں ان کے حلقۂ درس شامل ہو کر مستفید ہونے لگے۔ ان کے شاگردوں میں بعض نامور علماء اور امراء بھی شامل تھے۔ نواب یمین الدولہ آصف خان بھی اُن کے شاگردوں میں سے تھے۔ یہ وہی آصف خان ہیں جو مرزا غیاث بیگ کے فرزند، نور جہاں کے بڑے بھائی، ممتاز محل کے والد اور شاہجہان بادشاہ کے سسر تھے۔ یمین الدولہ کو شہنشاہ جہانگیر اور اس کی وفات کے بعد شاہجہان کے عہد حکومت میں جو عروج و کمال حاصل ہوا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس ضمن میں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ آصف خان کو ایسے اعلیٰ عہدوں اور بلند مناصب پر فائز کیا گیا جو ان سے پہلے مغلیہ سلطنت کے کسی بڑے سے بڑے امیر کو نصیب نہیں ہوئے تھے اور انہیں ایسے شاندار القاب و خطابات سے نواز گیا جو ان سے پہلے مغل دربار کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو نہیں ملے تھے۔ حتیٰ کہ شاہجہان نے تخت نشین ہونے کے بعد جو پہلا فرمان جاری کیا، وہ آصف خان ہی کے بارے میں تھا۔ جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

> ''سلطنتِ عظمیٰ کے محرمِ راز، خلافت کبریٰ کے واقفِ اَسرار، وفاداروں کے سرخیل، صاحبِ سیف و قلم، صاحبِ تدبیر، امراء و خوانین میں منتخب عموئے مکرم، یمین الدولہ آصف خان پروردگار کی امان میں رہیں۔ واضح ہو کہ ۲۵ بہمن ۸ جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ کی چوتھی گھڑی میں پیر کے روز مبارک ساعت میں مابدولت نے دارالخلافہ اکبر آباد میں تختِ سلطنت پر جلوس فرمایا۔ جیسا کہ آپ نے تجویز کیا تھا، شہاب الدین لقب اختیار کیا ہے۔ چنانچہ آج کے خطبے میں ہمارا نام شہاب الدین صاحبِ قران ثانی شاہجہان بادشاہ غازی لیا گیا اور یہی نام جا بجا درج ہوا۔ سکے پر بھی یہی نام اور لقب ضرب کیا گیا۔ امید ہے کہ پروردگارِ عالم کل ہندوستان کی بادشاہت کو جو اس نے محض اپنے کرم سے ہمیں عنایت فرمائی ہے، آپ کے بادشاہ اور آپ کے حق میں مبارک کرے اور اس بادشاہت کے شریکِ غالب آپ ہی ہیں۔ ہر روز خدا کی نصرت

اور تازہ فتوحات ہمیں نصیب ہوتی ہیں اور آپ عمر طبعی تک پہنچ کر
ہماری سلطنت سے فیض عظیم حاصل کریں۔''

یہ شاہجہان کے پہلے فرمان کا اولین حصہ ہے جو اس نے شہنشاہ ہند بننے پر جاری کیا تھا۔ جو محمد صالح کنبوہ کی تالیف ''شاہجہان نامہ'' سے لیا گیا ہے۔ اس کے آگے بھی ایک پورا صفحہ ہے جس میں بادشاہ نے آصف خان کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں اور اس کے آخر میں لکھا ہے۔ ''سردارانِ ذی جاہ کا پیشوا، مبارز الملت یمین الدولہ آصف خان'' چنانچہ ایک ایسے شخص کا استاد ہونا جس کی شان میں شاہجہان ایسا جلیل القدر اور عظیم المرتبت مغل فرمانروا قصیدہ خوانی کر رہا ہو، اور جس کو وہ اپنی بادشاہت میں شریکِ غالب کی حیثیت دے رہا ہو بڑے نصیب کی بات ہے اور یہ خوش نصیب مُلّا محمد ہے۔

مُلّا محمد کی ایک معلم اور استاد ہونے کی حیثیت سے شہرت وعظمت کو ''مآثر الامراء'' کے مؤلف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''چونکہ انسان کی قدر علم سے ہے اور علم کی قدر مال سے ہے۔ چونکہ یمین الدولہ آصف جاہی مُلّا محمد کے شاگردِ رشید تھے، اس بلند مرتبہ سردار کی استادی کی وجہ سے مُلّا محمد تمام دنیا میں مشہور ہو گئے اور ان کو قابل قدر حیثیت اور دولت حاصل ہوئی۔''

''مآثر الامراء'' کے مؤلف مزید لکھتے ہیں کہ ''چونکہ یمین الدولہ آصف جاہی کے خاندان کو جہانگیر بادشاہ کے دورِ حکومت میں جتنا قرب و امتیاز حاصل ہو سکتا تھا، ہوا چنانچہ نہ صرف اس خاندان نے خوب ترقیاں کیں بلکہ اس خاندان کے متعلقین و منتسبین نے بھی خوب کامیابیاں حاصل کیں اور اس خاندان کے غلاموں اور ملازمین نے خان اور ترخان کے خطاب پائے۔ چونکہ آصف خان نے ظاہری علوم کی تحصیل مُلّا محمد ٹھٹوی سے کی تھی لہٰذا وہ اپنے اقبال کی بلندی اور زمانے کی موافقت کو بھی مُلّا محمد ہی کی دعاؤں کی برکت سمجھتا تھا۔ اور ان کے احترام و اکرام میں بہت کوشش کرتا تھا۔ آصف خان نے مُلّا محمد کو ہندوستان کی صدارت پر متمکن کرا دیا۔ اس کی قسمت کا ستارہ چمکا نیک بختی کا دور آیا اور بلند اقبالی نے مُلّا محمد کو خوش آمدید کہا۔''

مُلّا محمد کے عروج و اقبال کے احوال بیان کرنے کے بعد صمصام الدولہ ''مآثر الامراء'' میں، ان کے زوال اور افسوس ناک انجام کے اسباب و محرکات کو بیان

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مُلاّ محمد کے اقتدار کی وجہ سے قضاۃ، افتاء اور احتساب کے شرعی مناصب ان کے بھائیوں کو مل گئے اور وہ مُلاّ محمد کے اقتدار و اعتبار کے باعث حکام کے مرتبہ و مقام کو خاطر میں نہیں لاتے تھے بلکہ خود حکمرانی کرتے تھے اور جو کچھ چاہتے تھے اس پر بلاروک ٹوک عمل کرتے تھے۔ مُلاّ محمد کے بھائی ٹھٹہ کے ارغونوں اور ترخانوں جو وہاں کے حاکم تھے، کی ساری جائیداد، باغات اور تمام مکانات و محلات کو مختلف حیلوں، بہانوں اور حربوں کے ذریعے بادشاہی سرکار سے بیع یا ہبہ کی صورت میں لے کر خود مالک و متصرف ہو گئے۔ چنانچہ شاہ بیگ خان ٹھٹہ کا گورنر مقرر ہوا تو آصف خان کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوا۔ آصف خان نے شاہ بیگ سے مُلاّ محمد کے بھائیوں کی سفارش کی۔ شاہ بیگ پہلے ہی مُلاّ محمد کے بھائیوں کے حالات سے آگاہ ہو چکا تھا کہ انہوں نے مُلاّ محمد کے اقتدار کی وجہ سے اودھم مچا رکھا تھا اور وہ کسی حاکم کی پروا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ بیگ نے آصف خان کو صورتِ حال سے مطلع کرنے کے بعد کہا کہ اگر مُلاّ محمد کے بھائی اپنی حیثیت کے مطابق رہیں گے تو عزت سے رہیں گے ورنہ ان کی کھال کھینچ لوں گا۔ شاہ بیگ خان کی یہ بات آصف خان کو ناگوار گزری اور شاہ بیگ کے معاملات خراب ہو گئے۔ اسے منصب اور جاگیر سے معزول کر دیا گیا۔''

آصف خان نے اپنے داماد شاہجہان کو بادشاہ بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا اور شاہجہان کے حکم کے مطابق جہانگیر اور اکبر کی اولاد سے ان تمام افراد کو یعنی سلطان دانیال کے دو بیٹوں طہمورث اور ہوشنگ، جہانگیر کے چھوٹے بیٹے سلطان شہریار اور شہریار کے بڑے بھائی خسرو، جس کو شاہجہان پہلے قتل کر چکا تھا، کے دو بیٹوں داور بخش اور گرشاسپ کو موت کے گھاٹ اتار کر شاہجہان کی بادشاہت کی راہ ہموار کی تھی، اس لئے شاہجہان اس کا بہت ادب و احترام کرتا تھا۔ سلطنت میں اسے شریکِ غالب کہتا تھا اور ''عموئے مکرم یمین الدولہ'' کا منفرد و ممتاز خطاب عطا کیا تھا۔ لیکن شاہجہان کی تخت نشینی کے چند برس بعد بادشاہ نے آصف خان کو عادل شاہ کی تادیب کے لئے بیجاپور روانہ کیا۔ اس مہم کے دوران آصف خان کی مجلسِ خلوت میں اعظم خان نے کہا کہ ''اب بادشاہ ہمارا اور تمہارا محتاج نہیں ہے۔'' آصف خان نے کہا کہ ہمارے تمہارے بغیر اب بھی ملک کا کام انجام کو نہ پہنچے گا۔ یہ بات بادشاہ تک پہنچ گئی اور اس کو ناگوار ہوئی۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ آصف خان کا مجھ پر احسان ضرور ہے لیکن آئندہ سلطنت کے کاموں میں اس کو

تکلیف نہیں دینی چاہئے۔ اس مرحلے پر مہابت خان کے اقتدار کا زمانہ شروع ہوا اور آٹھویں سال جلوس شاہجہان میں آصف خان کو خانخانی اور سپہ سالاری کے منصب ملے۔

صمصام الدولہ نے مزید لکھا ہے کہ ''جس زمانے میں مہابت خان کا غلبہ ہوا، اس زمانے میں مُلّا محمد اگر نکلنا چاہتے تو کوئی شخص ان کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے ظاہری اور باطنی تعلقات کی بناء پر قاضی اور میر عدل کا وسیلہ ڈھونڈا اور ان کو ساتھ لے کر مہابت خان کے پاس چلے گئے۔ ہر چند کہ میر عدل نے مُلّا محمد کے فضائل و مناقب اور ان کی بزرگی و فضیلت اور زہد و تقویٰ کے احوال بیان کئے مگر مہابت خان نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ وہ اس سے پہلے شیخ چاند منجم کے نواسے عبدالصمد اور خواجہ شمس الدین محمد خوافی کے بھتیجے مرزا عبدالخالق کو آصف خان کی مصاحبت اور تعلق کے جرم میں قتل کرا چکا تھا۔ اب مہابت خان کو مُلّا محمد پر بھی ہاتھ ڈالنے کا موقع مل گیا اور اس نے فوراً الزام لگا دیا کہ عبدالصمد اور مرزا خالق کے ساتھ مُلّا محمد بھی فساد پھیلانے کے اصل ذمہ دار اور محرک ہیں۔ چنانچہ اس نے مُلّا محمد کو اس غلط اور بے بنیاد الزام پر راجپوتوں کے سپرد کر کے کچھ دنوں تک مقید رکھا۔''

صمصام الدولہ مؤلف ''مآثر الامراء'' نے واشگاف الفاظ میں لکھا ہے کہ ہر چند کہ مُلّا محمد کا اس فساد کے ساتھ کوئی تعلق اور نہ ان جھگڑوں میں ان کا کوئی عمل دخل تھا، انہیں بلا وجہ اور بے قصور ملوث کیا گیا۔ جن دنوں میں مُلّا محمد قید میں تھے اور جب ان کے پاؤں میں زنجیر ڈالتے تھے۔ وہ ڈھیلی ہو جاتی اور پاؤں سے نکل پڑتی تھی۔ پھر زیادہ مضبوطی سے زنجیر ڈالتے تھے تو وہ بھی معمولی سی حرکت سے ڈھیلی ہو کر پاؤں سے نکل جاتی تھی۔ اس بات کو جادو اور منتر پر محمول کیا گیا۔

مُلّا محمد نے عمر کے آخری حصہ میں قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ اور وہ ہر وقت تلاوت قرآن میں مشغول رہتے تھے اور ان کے ہونٹ ہلتے رہتے تھے۔ ہونٹوں کی اس حرکت سے مہابت خان کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ اس کے لئے بددعا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے اس بدگمانی کی وجہ سے انہیں جلد ہلاک کرنے کا حکم دے دیا اور ایسے عزیز الوجود شخص کی قدر نہ پہچانی اور انہیں مروا ڈالا۔ مُلّا محمد کی شہادت کے یہ واقعات صمصام الدولہ نے ''مآثر الامراء'' میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ محمد صالح کنبوہ کے ''شاہجہان نامہ'' میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ مہابت خان نے مُلّا محمد، عبدالصمد اور عبدالخالق تین

ایسے افراد کو محض اس لئے تہ تیغ کرادیا کیونکہ وہ یمین الدولہ آصف خان کے انتہائی قریبی اور عزیز ترین مصاحب تھے، وہ دراصل آصف خان سے پرخاش رکھتا تھا اور انہیں ذہنی و روحانی اذیت پہنچانا چاہتا تھا۔ ۱۰۳۵ھ۔۱۶۲۶ء میں ملکہ نور جہاں کے ساتھ اقتدار و اختیار کی سیاسی کشمکش میں مہابت خان نے جہانگیر بادشادہ کو دریائے جہلم کے کنارے نظر بند کردیا تھا۔ اس زمانے میں آصف خان پنجاب کا گورنر تھا اور مہابت خان آصف خان کی غفلت اور چشم پوشی سے بادشاہ کو نظر بند کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ پھر آصف خان نے بادشاہ کو رہائی دلانے کی کوشش کی تو مہابت خان نے آصف خان اور اس کے بیٹے ابو طالب اور داماد خلیل اللہ خان کو قلعہ اٹک میں قید کردیا تھا، جہاں بادشاہ نظر بند تھا۔ بعد ازاں مہابت خان حالات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے دو ہزار وفادار راجپوت سپاہی احدیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اور مہابت خان خود کو بے بس پاکر سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گیا اور گجرات میں جاکر شاہجہان کے پاس پناہ لے لی۔

مناسب ہوگا کہ اس مرحلہ پر اس امر کی وضاحت کردی جائے کہ مہابت خان کے ہاتھوں شہنشاہ جہانگیر کی اسیری یا نظر بندی کا حضرت مجدد الف ثانیؒ کی گرفتاری یا اُن کی مغل فرماں روا سے ناراضگی کا قطعی طور پر کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہے۔ اکثر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں، بالخصوص عام مضمون نگار حضرت شیخ احمد سرہندی سے عقیدت کی بناء پر تحقیق کیے بغیر یہ لکھ دیتے ہیں کہ مہابت خان حضرت شیخ کا معتقد تھا۔ اُسے جب یہ معلوم ہوا کہ شہنشاہ جہانگیر نے حضرت شیخ کو گرفتار کرکے زندان میں ڈال دیا ہے تو اُس نے طیش میں آکر شہنشاہ جہانگیر کو یرغمال بنالیا یا اپنا اسیر کرلیا تاکہ وہ حضرت شیخ کو جہانگیر کی جگہ دہلی کے تخت پر متمکن کرسکے۔ یہ سب قصہ کہانی ہے۔ اس میں قطعی طور پر حقیقت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ ذرا تفصیل طلب معاملہ ہے اس لیے جہانگیر کی اسیری کے اصل تاریخی واقعات اور مہابت خان کی نمک حرامی اور اُس کے جہانگیر بادشاہ کو اپنا اسیر بنانے کی اغراض و مقاصد کی وضاحت کو ہم کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ مہابت خان نہ تو حضرت مجدد کے زمرہ معتقدین میں شامل تھا اور نہ اس نے حضرت مجدد کی گرفتاری کی جوابی کارروائی کے طور پر بادشاہ کے خلاف یہ مجرمانہ اقدام کیا تھا۔ فی الحقیقت اس نے اپنے خالصتاً ذاتی اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر لاہور میں اپنے دو ہزار ہندو راجپوت سپاہیوں کی مدد سے جہانگیر

بادشاہ کو اپنی تحویل میں لیا جس کے نتیجے میں دریائے راوی کے کنارے مہابت خان اور ملکہ نور جہاں کے مابین ایک خوں ریز معرکہ بھی ہوا۔ اس وقت حضرت شیخ احمد سرہندی وفات پا چکے تھے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ہماری زیر طبع کتاب ''زندہ تابندہ'' مشاہیر اسلام سیریز۔

صمصام الدولہ نے لکھا ہے کہ ''ملّا محمد بے جرم تیغ ستم کے شہید ہوئے۔ ان کے قتل کا بڑا سبب آصف خان کا استاد ہونا ہے۔'' آصف خان کو اپنے ان تینوں بے نظیر مصاحبوں کی موت کا ایسا شدید رنج وغم ہو کہ وہ اکثر راتوں کو پُر درد آواز میں ان کو یاد کرتا تھا اور کہتا تھا، 'افسوس اے محمد (ملّا محمد ٹھٹوی)، افسوس اے خالق! (عبدالخالق)، افسوس اے عبدالصمد۔

آصف جاہی

یمین الدولہ آصف خان مشہور بہ آصف جاہی کا شمار مغلیہ عہد کے اکابر امرائے سلطنت اور ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔ آصف خان مروّجہ علوم وفنون کے ماہر، بہادر وشجاع سپاہی، لائق وفائق منتظم، کامیاب سپہ سالار اور مدبر سیاستدان تھے۔ انتہائی ذہین وزیرک اور فطین انسان تھے۔ محلاتی سازشوں کو ناکام بنا کر شہزادہ شہریار کی جگہ شاہجہان کو تخت نشین کرنا آصف خان کا عظیم کارنامہ ہے جو اُن کی فہم وفراست، عزم واستقلال، مضبوط قوتِ ارادی اور بے مثال بہادری وشجاعت کا بین ثبوت ہے۔ انہوں نے ''مغل فرمانرواؤں جہانگیر اور شاہجہان کے دورِ حکومت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے۔

ان کی کنیت ابوالحسن، عرف آصف جاہی اور مبارز الملت، عضد الملت اور یمین الدولہ خطابات ہیں۔ ایرانی نژاد اور مسلکاً شیعہ تھے۔ اپنے والد مرزا غیاث بیگ کے ساتھ انتہائی ناسازگار حالات میں ایران سے ہجرت کر کے برصغیر میں آئے۔ ان کے والد نے مغل حکمران اکبر اور جہانگیر کے عہد میں اہم اور قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ متعدد بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے اور مدارالملک اور اعتمادالدولہ کے خطابات سے نوازے گئے۔ ملکہ نورجہاں ان کی چھوٹی بہن تھی جو ان کی ایران سے ہندوستان کی جانب ہجرت کے دوران قندھار کے مقام پر پیدا ہوئی اور اس کا نام مہرالنساء رکھا گیا۔ پھر جب اس کی شادی جہانگیر سے ہوئی تو مرزا ابوالحسن کو اعتقاد خان کا خطاب اور خانسامانی کا عہدہ ملا جو ان کی کامیابی اور ترقی کا اوّلین زینہ تھا۔

شہنشاہ جہانگیر کی تخت نشینی کے ساتویں سال ۱۰۲۰ھ۔۱۶۱۱ء میں آصف خان کی بیٹی

ارجمند بانو بیگم جو ممتاز محل کے نام سے موسوم تھی اور اعتمادالدولہ مرزا غیاث بیگ کی نواسی تھی، شہزادہ سلطان خرم مخاطب بہ شاہجہان کے نکاح میں آئی تو ایران کے اس خاندان کے جہاں شاہی خاندان کے ساتھ مراسم انتہائی مضبوط اور پختہ ہو گئے وہاں مرزا ابوالحسن آصف خان کی ترقی کی راہیں کشادہ ہو گئیں۔ چنانچہ دو برس بعد یعنی نویں سال جلوس جہانگیری میں انہیں آصف خان کا خطاب ملا اور پھر پے در پے منصب میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ چھ ہزار ذات اور چھ ہزار سوار کے منصب پر سرفراز ہوئے۔

شاہجہان نے اپنے اوّلین فرمان میں آصف خان کا تعارف سلطنت عظمیٰ کے محرم راز خلافت کبریٰ کے واقفِ اسرار، صاحبِ سیف و قلم، حامل کمالاتِ صوری و معنوی، صاحبِ اخلاق پسندیدہ، انجمن آرائے محفلِ انس، صدر نشین مجلس قدس ایسے اور اس قسم کے دوسرے شاندار الفاظ و القاب کے ذریعے کرایا ہے اور انہیں حکمائے یونان کی آبرو قرار دیا ہے۔ یہ ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قرانِ ثانی بادشاہ غازی کے عطا کردہ القاب و خطابات ہیں جن سے آصف خان کے فضل و کمال، تبحرِ علمی اور مرتبہ و مقام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جہانگیر کے دورِ حکومت میں آصف خان مکمل طور پر اس کا وفادار تھا۔ لیکن جن دنوں میں جہانگیر اور شہزادہ شاہجہان میں رنجش اور کشیدگی پیدا ہو چکی تھی، بعض خودغرض اور مفاد پرست امراء نے آصف خان پر شاہجہان کی طرف داری کا الزام لگا کر ملکہ نور جہاں کو اس کے خلاف ورغلایا۔ نور جہاں کے کچھ اپنے خدشات بھی تھے۔ جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار کی شادی نور جہاں کی اُس بیٹی سے ہوئی تھی جو اس کے پہلے شوہر شیر افگن کے صُلب سے تھی۔ ملکہ نور جہاں شہنشاہ جہانگیر کی مزاج دان ہی نہیں بلکہ اپنے حسن و جمال اور اپنی ہمہ جہت غیر معمولی امتیازی خصوصیات سے اسے متاثر و مسحور کر کے اپنا مطیع بنا چکی تھی۔ افیون اور شراب نوشی کی کثرت بھی جہانگیر کے ہوش و حواس اور اعصاب پر بری طرح اثر انداز ہوئی تھی۔ وہ دمہ کا دائمی مریض تھا۔ چنانچہ نور جہاں ملکۂ ہندوستان کی حیثیت سے شہنشاہ جہانگیر کے مزاج و کردار میں ضرورت سے زیادہ دخیل اور اس کے اقتدار و اختیار میں بڑی حد تک شریک و سہیم ہو چکی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جہانگیر زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا، اور اگر وہ زندہ رہا بھی تو فالج جیسی مہلک امراض میں مبتلا ہو جائے گا۔ ہر چند کہ جہانگیری عہد کے آخری برسوں میں نور جہاں ہی سلطنت کے

سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ مگر اس صورت حال کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے جہانگیر کا صحت مند رہنا ضروری تھا۔ جبکہ اس کی صحت بڑی تیزی سے گر رہی تھی۔ اس لئے نور جہاں کی خواہش تھی کہ پیشتر اس کے کہ بادشاہ پر کسی مہلک مرض کا حملہ ہو وہ اس سے شہریار کو اپنا ولی عہد اور جانشین نامزد کرا لے اور اس طرح شاہجہان کو اقتدار سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دے۔ یہی وہ واحد راستہ تھا جس پر چل کر وہ اپنے داماد شہریار کے پردے میں اپنے اس اقتدار و اختیار کو برقرار رکھ سکتی جو اسے جہانگیری عہد کے آخری زمانے میں حاصل ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اپنے بڑے بھائی آصف خان سے اس لئے خائف تھی کہ شاہجہان اس کا داماد تھا۔ اُسے خدشہ تھا کہ جس طرح وہ اپنے داماد شہریار کو بادشاہ بنانا چاہتی ہے، اس کا بھائی آصف خان اپنے داماد شاہجہان کو بادشاہ بنوانی کی کوشش کرے گا۔

نواب شاہنواز خان نے ''مآثر الامراء'' میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ آصف خان جو حکومت کے لئے ایک ستون کی مانند تھے، نور جہاں نے اُسے اپنے مقصد کے حصول کی راہ میں حائل دیوار سمجھتے ہوئے آگرہ کے خزانوں کو لانے کی تقریب سے بادشاہ کے سامنے سے ہٹا دیا۔ آصف خان کی شہزادہ شاہجہان سے فتح پور میں ملاقات ہو گئی۔ لہٰذا قلعہ مبارک آگرہ سے اس وقت خزانے کا لانا اس نے مناسب نہ سمجھا اور وہ بادشاہ کی خدمت میں واپس چلا گیا۔ شاہجہان کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ اس موقع پر آصف خان ایسے سردار کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے لیکن شاہجہان اپنے باپ سے مکمل رضا جوئی کا خواہشمند تھا، اس لئے وہ طرح دے گیا اور بادشاہ کے مقابلے سے ہٹ کر مالوہ کی طرف چلا گیا۔ اٹھارھویں سال جلوس جہانگیری میں آصف خان بنگالہ کے صوبہ دار مقرر ہوئے، جہاں شاہجہان اُن سے ملا۔ نور جہاں نے انہیں دارالسلطنت میں واپس بلا لیا۔

اکیسویں سال جلوس جہانگیری ۱۰۳۵ھ۔ ۱۶۲۶ء میں دریائے جہلم کے کنارے پر آصف خان کی سستی اور چشم پوشی سے مہابت خان نے جہانگیر کو نظر بند کر دیا۔ آصف خان کو اپنی اس غلطی کے مضمرات کا پوری طرح احساس ہوا تو وہ اٹک کے قلعہ میں چلے گئے جو ان کی جاگیر میں تھا۔ مہابت خان کے بیٹے مرزا بہرہ ور نے فوراً قلعہ اٹک کا محاصرہ کر لیا۔ بعد میں مہابت خان نے وہاں جا کر آصف خان سے عہد و پیمان کئے اور

آصف خان کو ان کے بیٹے ابو طالب اور داماد خلیل اللہ خان کے ساتھ نظر بند کر کے خود خوف کے مارے دربار شاہی سے بھاگ گیا اور آصف خان بمشکل قلعہ اٹک سے رہائی حاصل کر کے دربار شاہی کے لئے روانہ ہوئے۔ اسی زمانے میں آصف خان پنجاب کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور ان کو وکالت کا عہدہ ملا۔

۱۰۳۷ء بائیسویں سال جلوس جہانگیر میں جہانگیر نے کشمیر سے واپس ہوتے ہوئے ۲۷ ماہ صفر کو سفر آخرت اختیار کیا اور شاہی لشکر میں شورش برپا ہو گئی۔ آصف خان نے سلطان خسرو کے بیٹے داور بخش کو قید سے نکال کر سلطنت موہوم کے لئے نامزد کیا تو اسے اس بات کا یقین نہیں آتا تھا۔ بڑی بڑی قسمیں کھا کر اس کو مطمئن کیا گیا اور اگلی منزل کو روانہ ہوئے۔ نور جہاں جو شہریار کو بادشاہ بنانے کی خواہشمند تھی، آصف خان اور اعظم خان میر بخشی کو اپنے مقصد میں رکاوٹ خیال کرتی تھی اور دونوں کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ اس نے آصف خان کو بلا بھیجا، آصف خان نے عذر کر دیا اور اس کے پاس نہیں گئے۔ نور جہاں اپنے بھائی آصف خان سے بددل ہو کر جہانگیر کی نعش کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ اس دوران آصف خان نے انتہائی رازداری سے کام لیتے ہوئے شاہجہان کو بادشاہ کے انتقال کی اطلاع پہنچا دی۔ جہانگیر کی نعش کو پہلے ہی لاہور بھیج دیا گیا تھا تاکہ تجہیز و تکفین کے بعد اس باغ میں دفن کر دیا جائے جسے نور جہاں نے دریائے راوی کے کنارے بنوایا تھا۔

آصف خان اس وقت پنجاب کے صوبہ دار تھے اور تمام امراء اور ملازمین ان کے فرماں بردار تھے۔ لیکن آصف خان اپنی بہن نور جہاں سے مطمئن نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے لوگوں کو نور جہاں کے پاس آنے جانے سے منع کر دیا اور اسے اپنے پاس لا کر جگہ دی۔ جب لاہور تین کوس رہ گیا تو سلطان شہریار کہ جس کے داڑھی اور مونچھ کے بال، بال خورے کے مرض سے ختم ہو گئے تھے، آتشک کی گرمی سے آبلے پڑ گئے تھے، پہلے سے لاہور پہنچ چکا تھا۔ اس نے سلطنت کا دعویٰ کر دیا اور ایک ہفتے میں ستر لاکھ روپیہ خرچ کر کے ایک لشکر جمع کر لیا۔ اس لشکر کو سلطان دانیال کے بیٹے مرزا بالیسنغر کی قیادت میں دریا کے پار بھیجا اور خود دو تین ہزار سواروں کے ساتھ لاہور میں ٹھہر کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ آصف خان نے سلطان شہریار کے لشکر کو تتر بتر کر دیا۔ شہریار اس وحشت اثر خبر سے اس قدر بدحواس ہوا کہ وہ اپنی حفاظت کے متعلق بھی نہ سوچ سکا اور

قلعہ میں چلا گیا۔ امراء نے داور بخش کو تخت پر بٹھا دیا اور شہریار کو قلعہ سے باہر نکال کر اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر داور بخش کے سامنے پیش کر دیا۔ آداب و تسلیمات بجا لانے کے بعد اسے پہلے قید اور پھر دو تین دن کے بعد اندھا کر دیا گیا۔

شاہجہان اس وقت احمد آباد گجرات میں تھا مگر اسے لاہور میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی اطلاعات برابر مختلف ذرائع سے پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ اس نے خدمت پرست خان رضا بہادر کو احمد آباد سے لاہور بھیجا اور خود اپنے ہاتھ سے لکھا کہ اس موقع پر جبکہ آسمان مصیبت اور زمین فتنہ اٹھا رہے ہیں بہتر یہ ہے کہ داور بخش اور دوسرے تمام شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ آصف خان نے شاہجہان کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے ۲۶ جمادی الاوّل ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۸ء کو داور بخش، اس کے بھائی گرشاسپ پسران سلطان خسرو اور سلطان دانیال کے دو بیٹوں طہمورث اور ہوشنگ اور سلطان شہریار کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔

شاہجہان احمد آباد سے آگرہ پہنچ کر ہندوستان کے تخت سلطنت پر بیٹھا تو آصف خان اس کے تین بیٹوں جو اس کے نواسے تھے یعنی دارا شکوہ، شجاع اور اورنگ زیب کو دوسرے امراء سمیت لاہور سے آگرہ پہنچے اور ۲ رجب ۱۰۳۷ھ کو بادشاہ کے حضور پیش ہوئے تو یمین الدولہ کے خطاب سے نوازے اور ''عمو'' کے خطاب سے پکارے گئے۔ وکالت کا عہدہ ملا۔ آٹھ ہزاری ذات اور آٹھ ہزار سوار دواسپہ سہ اسپہ کا منصب ملا۔ اس مرتبے پر اس وقت تک کوئی اور امیر نہ پہنچا تھا۔ مہابت خان کے مرنے کے بعد آصف خان کو خان خانانی اور سپہ سالاری کے منصب بھی ملے۔

یمین الدولہ آصف خان بہت خوش خوراک اور بسیار خور تھے۔ ان کی ایک دن کی خوراک ایک شاہجہانی من کے برابر ہوتی تھی۔ استسقا کے دیرینہ مریض تھے۔ جب مرض کا غلبہ ہوا تو خوراک میں اس قدر کمی واقع ہوئی کہ صرف چنوں کے پانی کے ایک پیالے پر اکتفا کرتے تھے۔ شاہجہان ان کی مزاج پرسی کے لئے گیا تو لاہور کی حویلی کے علاوہ، جو چوبیس لاکھ روپے میں تیار ہوئی تھی دہلی، آگرہ اور کشمیر کی دوسری عمارات، باغات اور جواہرات، نقد، سونا، چاندی اور دوسری بیش قیمت اشیاء جن کی مالیت دو کروڑ پچاس لاکھ روپے تھی، ان سب کی فہرست بادشاہ کو پیش کی گئی تاکہ انہیں ضبطِ سرکار کر لیا جائے۔ بادشاہ نے آصف خان کے تین بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کو بیس لاکھ روپے اور دارا شکوہ کو

لاہور کی حویلی عطا کر کے باقی سب کچھ ضبط کر لیا۔ اپنے ملازمین اور دوسرے امراء کی تنقیح حساب آصف خان خود کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کسی کی مدد کے محتاج نہ تھے۔ ان کی سرکار میں جو اخراجات اور مصارف ہوتے تھے وہ عقل میں نہیں آتے تھے۔ خصوصاً ان کے قریبی رشتہ دار بادشاہ، شہزادوں اور بیگمات کی تشریف آوری پر جو ضیافتیں اکثر ہوتی تھیں، ان میں پیشکش اور نذرانوں کے علاوہ آرائش و زیبائش پر جو اخراجات ہوتے تھے ان کا شمار مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے ملازمین کی بھی بہت خبر گیری کرتے تھے اور اپنے والد اعتمادالدولہ مرزا غیاث بیگ کی طرح نرم طبیعت اور منکسر المزاج تھے۔

آصف خان صاحب علم و فضل تھے۔ ہر علم میں واقفیت رکھتے تھے۔ اور معقولات میں تو انہیں بہت دسترس حاصل تھی۔ اسی بناء پر دفاتر شاہی میں ان کے لئے جو القاب لکھے جاتے تھے ان میں یہ فقرہ داخل تھا ''شعلہ افروز فطرتِ اشراقیاں، دانش آموز طبیعت مشائیاں'' وہ خوش نویس، درست محاورہ، سیاق دان اور معاملہ فہم تھے۔

یمین الدولہ آصف خان نے ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی۔ شاہ درہ لاہور میں شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کے جوار میں دفن ہوئے۔

محمد اسلم ہروی

قاضی محمد اسلم ہروی لاہوری کا شمار مغلیہ عہد کی معروف وممتاز دینی وعلمی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے دو مغل بادشاہوں یعنی نورالدین جہانگیر اور شاہجہان کے عہد حکومت میں بحیثیت قاضی لشکر اور قاضی کابل قابل قدر خدمات انجام دیں ہر دو بادشاہ اراکین سلطنت اور عوام وخواص قاضی اسلم کو ان کے فضل وکمال، امانت ودیانت اور تقویٰ وفرض شناسی کی بدولت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

قاضی محمد اسلم کا تعلق ہرات کے ایک باا ثر علمی خاندان سے تھا۔ وہ مولانا خواجہ کوہی کی اولاد میں سے تھے۔ خواجہ کوہی کے نواسے مولانا میر کلاں اپنے زمانے کے بلند پایہ عالم دین تھے اور میر کلاں محدث کے نام سے مشہور تھے۔

مغل شہنشاہ اکبر میر کلاں محدث کا معتقد تھا اکبر نے ان کو جہانگیر کا استاد مقرر کیا تھا۔ جہانگیر کو تعلیم دینے کے علاوہ میر کلاں محدث نے اور بے شمار لوگوں کو دینی علوم بالخصوص علم حدیث کی تعلیم دی۔ آگرہ میں ان کا انتقال ہوا اور وہ آگرہ ہی میں مدفون ہوئے۔

قاضی محمد اسلم ہرات میں پیدا ہوئے جو ان کا آبائی وطن تھا۔ ابتدائی تعلیم ہرات ہی میں حاصل کی پھر نقل مکانی کر کے کابل میں سکونت اختیار کر لی۔ کابل سے تحصیل علم کی غرض سے لاہور میں وارد ہوئے جو اس وقت علوم وفنون کا بہت بڑا مرکز تھا۔ لاہور میں انہوں نے ممتاز علماء اور مشائخ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کر کے علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت تامہ حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں شیخ بہلول لاہوری اور مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری ایسے جلیل القدر علماء ومشائخ شامل ہیں۔

قاضی محمد اسلم حنفی المذہب تھے اور اپنے مذہب و مسلک پر سختی سے کاربند تھے۔ کسی قسم کے بدعات کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ مولوی فقیر محمد نے ''حدائق الحنفیہ'' میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

''قاضی محمد اسلم والد میر زاہد، عالم اجل، فقیہ اکمل، جمع علوم عقلیہ ونقلیہ ہرات میں پیدا ہوئے اور طلب علم کی غرض سے لاہور میں تشریف لائے اور شیخ بہلول سے جو علمائے کبار میں سے تھے علوم حاصل کئے۔''

قاضی محمد اسلم تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور سے اپنے بزرگ اور قرابت دار مولانا میر کلاں محدث کے پاس آگرہ پہنچے جو مغل بادشاہ جہانگیر کے استاد تھے۔ چنانچہ ان کے ذریعے قاضی محمد اسلم کی دربار شاہی میں رسائی ہوئی اور شاہی عنایات سے سرفراز ہوئے بادشاہ نے کابل کا منصب قضاۃ ان کے سپرد کر دیا۔ قاضی محمد اسلم نے اپنے فرائض منصبی انتہائی کامیابی اور کمال حسن وخوبی سے انجام دیئے اور وہ عرصہ دراز تک کابل کے قاضی رہے۔ صمصام الدولہ شاہنواز خان نے ''ماثر الامراء'' میں لکھا ہے:

> ''چونکہ قاضی محمد اسلم مدتوں مقررہ خدمت (یعنی کابل کا عہدہ قضاۃ) پر مامور رہے۔ ایمان داری اور پرہیزگاری میں مشہور ہوئے جہانگیر نے ان کو اپنے حضور میں طلب کیا اور لشکر کا قاضی مقرر کر دیا، شاہجہان بادشاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد اس عظیم القدر کام (یعنی لشکر کے عہدہ قضاۃ) پر بحال رکھا اور اپنی عنایت سے ایک ہزاری منصب مرحمت فرمایا۔''

قاضی محمد اسلم کی شخصی خصوصیات ان کے دینی وعلمی کمالات اور بحیثیت قاضی ان کی جلالت وعظمت کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ جہانگیر کے بعد شاہجہان نے بھی انہیں منصب قضاۃ پر قائم و برقرار رکھا اور اپنے باپ اور پیش رَو بادشاہ کی طرح ان کا ادب واحترام کیا۔ جس سے ایک طرف قاضی صاحب کی عظمت وشان اور دوسری طرف شہنشاہ شاہجہان کی مردم شناسی، علم دوستی اور علماء کی قدردانی کا وافر ثبوت ملتا ہے۔ شاہجہان نے ان پر انعام واکرام کی بارش کر دی حتیٰ کہ انہیں سونے میں تلوایا۔ جیسا کہ ''ماثر الامراء'' میں مرقوم ہے کہ سولہویں سال جلوس شاہجہانی میں ان کو سونے میں تول کر چھ ہزار پانچ سو روپے انعام دیے گئے۔

محمد صالح کنبوہ اپنی تالیف ''شاہجہان نامہ'' میں رقم طراز ہیں:

''۶ ربیع الثانی ۱۰۶۰ھ (۸ اپریل ۱۶۱۵ء) کو قاضی محمد اسلم زخمی ہو گئے تھے۔ تفصیل یہ ہے کہ بادشاہ گھوڑوں کا معائنہ فرما رہے تھے۔ ایک چابک سوار گھوڑے کو کاوا دیتے ہوئے بڑھا۔ قاضی اسلم سلام کے لیے آ رہے تھے۔ گھوڑے کو تیز رفتاری سے آتے ہوئے دیکھا تو پاؤں کو لغزش ہوئی اور توازن برقرار نہ رکھ سکے اور گر پڑے۔ سخت چوٹ آئی۔ چار ماہ تک بستر پر پڑے رہے۔ صحت یاب ہوئے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ زیارت حرمین شریفین کے لیے روانہ ہو جاؤ اور احمد آباد سے سامان وغیرہ لے کر جاؤ۔ لیکن قاضی صاحب نہ یہ خدمت قبول نہ کی اور بادشاہ سے کہا کہ انہیں کابل بھیج دیا جائے۔ بادشاہ نے قاضی اسلم کو کابل بھیج دیا اور وہاں کی جاگیر بحال رکھی جس کا مالیہ دس ہزار روپے تھا۔''

قاضی محمد اسلم مسلسل تیس سال تک قاضی کے منصب جلیلہ پر فائز رہے اور انہوں نے کبھی اپنے فرائض کی بجا آوری میں کسی قسم کی غفلت و کوتاہی نہیں کی۔ قاضی محمد اسلم کے فرزند ارشد میر محمد زاہد نے اپنے علم و فضل کی بدولت بڑا نام پیدا کیا۔ وہ اکثر علوم بالخصوص کلام و حکمت میں اپنے معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے اور اپنے عہد کے علماء و فضلاء میں منفرد و ممتاز مقام حاصل کیا۔ انہوں نے معقولات کی تین اہم کتابوں پر حواشی لکھ کر شہرت دوام حاصل کی۔ ان کی کتب حواشی ''زواہد ثلاثہ'' کے نام سے مشہور ہیں اور برعظیم کے مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل رہی ہیں۔ میر زاہد بھی شاہجہان اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں منصب قضاۃ کے علاوہ متعدد اہم عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے ممتاز اساتذہ کے علاوہ ان کے والد قاضی محمد اسلم کا بھی حصہ ہے۔ اس لئے کہ قاضی میر زاہد نے علوم عقلیہ و نقلیہ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی تھی۔

قاضی محمد اسلم کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُن کے فرزند ارجمند اور شاگرد قاضی میر زاہد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد ماجد اور اُن کے استاد اور مرشد طریقت حضرت شاہ عبدالرحیم قادری دہلوی کے استاد اور شیخ ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے

اپنی کتاب ''انفاس العارفین'' میں اپنے والد اور مرشد طریقت شیخ عبدالرحیم دہلوی کے احوال بڑے تفصیل سے بیان کیے ہیں اور انہی احوال میں شاہ عبدالرحیم کے استاد قاضی میر زاہد ہروی کا بھی متعدد بار ذکر آیا ہے۔

قاضی محمد اسلم اپنے عقاید پر سختی سے کاربند تھے اور کسی غلط روایت پر زور عایت نہ کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ انہوں نے کابل میں کلینی کی کتاب کو جو امامیہ مذہب کی حدیث کی چار کتابوں میں سے ایک ہے آگ میں ڈلوادیا تھا۔

کلینی کی کتاب کا نام ''الکافی فی علم الدین'' اور اس کا اپنا نام ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی ہے۔

قاضی محمد اسلم کے ہم عصر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب مستجاب الدعوات بزرگوں میں سے تھے۔ چنانچہ محمد صالح کنبوہ ''شاہجہان نامہ'' کی جلد دوم میں لکھتا ہے:

> ''موسم برسات خالی گزر جانے کی وجہ سے غلہ بہت گراں ہو گیا تھا۔ ڈر تھا کہ قحط نہ پڑ جائے۔ خاص و عام سب پر خوف چھا رہا تھا —— چنانچہ عالموں، فاضلوں، عابدوں، زاہدوں نیز عالی نسب سید جلال جو حضرت علی مرتضیٰ کی نسل پاک سے ہیں اور قاضی محمد اسلم، ملا محمد اسلام، مفتی شیخ مجیب اللہ سرہندی اور صاحب کرامات شیخ ناظر، بادشاہ (شاہجہاں) کے ایماء سے نماز استسقاء کے لیے جنگل میں گئے —— حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے عالموں اور فاضلوں کی دُعا قبول ہوئی اور چند روز بعد خوب بارش ہوئی۔ اور خدا کی عنایت کے سبب قحط کا خوف رفع ہوا اور لوگوں کو اچھی فصل کی امید بندھی۔''

قاضی محمد اسلم ہروی لاہوری نے ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی اور لاہور میں مدفون ہوئے۔

ملاّ محمود جونپوری

ملاّ محمود جونپوری برِعظیم پاکستان و ہند کے علمائے کبار اور فقہائے نامدار میں سے فاضل اجل، عالم اکمل اور ادیب بے بدل تھے۔

ملاّ محمود جونپوری کا پورا نام محمود بن شیخ محمد بن شاہ محمد جونپوری تھا۔ ان کا نسب سیدنا حضرت عمر فاروقؓ پر جا کر منتہی ہوتا ہے، اس نسبت سے فاروقی بھی کہلاتے ہیں۔ ملاّ محمود حنفی المذہب تھے۔ شمس بازغہ سمیت متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ مگر شمس بازغہ کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے باعث ''صاحبِ شمس بازغہ'' کہلاتے ہیں۔

ملاّ محمود جونپوری کی ولادت ۹۹۳ھ میں ولید پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ خدائے بزرگ و برتر نے انہیں غیر معمولی ذہانت و فطانت، مضبوط قوتِ حافظہ، ذہن رسا اور خرد حکیمانہ عطا کی تھی۔ بچپن ہی سے ان کی پیشانی آفتاب و مہتاب کی طرح روشن تھی اور ان کا چہرہ فضیلت و دانائی اور نورِ باطن سے مزین تھا۔ ان کے جد امجد ملا شاہ محمد فاروقی اور استاد الملک مخدوم ملا محمد افضل جونپوری کی تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ملاّ محمود جونپوری صرف سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ التحصیل ہو کر مسند تدریس و افادہ پر متمکن ہو گئے۔ ملاّ محمود صاحب نے اس کم عمری میں درس دینا شروع کیا کہ جب طلباء درس لے کر گھروں کو چلے جاتے تھے تو ملاّ محمود صاحب مدرسہ کے دروازے کی کنڈی نہیں لگا سکتے تھے، چونکہ ان کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچتا تھا۔

صمصام الدولہ مؤلف ''مآثر الکرام'' لکھتے ہیں کہ ملاّ محمود جونپوری کا ذہن رسا، حافظہ درست اور جسم قوی اور محنت کش تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے زمانے کے تمام طلباء سے سبقت لے گئے اور سترہ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون میں کمال حاصل کر کے مشہور

زمانہ ہوئے۔ع

کسب کمال کن کہ عزیز ی جہاں شوی

ملاّ محمود جونپوری کے حلقہ درس میں عوام و خواص جوق در جوق آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے تشنگان علم کثیر تعداد میں ان کے گرد جمع ہوگئے۔ اس طرح ان کے علم و فضل اور عمدہ و موثر طریق تعلیم کا چرچا عام ہوگیا۔ حتیٰ کہ ان کے تبحر علمی اور فضل و کمال کی شہرت شہنشاہ ہند شاہجہاں تک پہنچی تو اس نے باصرار و کمال آرزومندی ملاّ محمود کو جونپور سے دارالسلطنت دہلی آنے کی دعوت دی۔ ملاّ محمود نے شاہجہان کے اصرار کے علاوہ اس کی علم دوستی، علم پروری اور علماء شناسی کے پیش نظر اس کی دعوت کو قبول کرلیا۔ شاہجہان علم دوست اور علماء و فضلاء کا قدردان اور بزرگان دین کا معتقد ہونے کے علاوہ خود بھی صاحب علم و فضل فرمانروا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا اپنا شمار بلند پایہ علماء و فقہاء اور محدثین میں ہوتا تھا۔ چنانچہ اس صاحبِ سیف و قلم مغل حکمران کی دعوت پر ملاّ محمود جب جونپور سے روانہ ہوکر دہلی کے قریب پہنچے تو شاہجہان نے اپنے وزیر اعظم سعد اللہ خان کو ان کے استقبال کے لئے بھیجا۔ جب ملاّ محمود شاہی دربار میں پہنچے تو مغل شہنشاہ نے ان کو اپنے پہلو میں بٹھانے کے لئے ایک خاص نشست کا اہتمام کیا اور ملاّ محمود جونپوری کو اپنے زمرۂ امراء میں داخل کرلیا بعد ازاں شہزادہ شجاع کو ان کی شاگردی میں دے دیا۔

ملاّ محمود جونپوری نے مغل فرمانروا شاہجہان کو اس امر پر آمادہ کرلیا تھا کہ جس طرح پہلے سلاطین نے اپنے اپنے ملکوں میں رصدگاہیں تعمیر کرائیں اسی طرح وہ بھی ہندوستان میں ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کرائے۔ شاہجہان نے ملاّ محمود کی تجویز منظور کرکے رصدگاہ تعمیر کرنے کی باقاعدہ اجازت دے دی تھی۔ ملاّ محمود نے اس رصدگاہ کی تعمیر کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب بھی کرلیا تھا چنانچہ ''ماثر الامراء'' میں مرقوم ہے کہ:

> ''جو زمین رصدگاہ کے لئے تجویز کی گئی تھی کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اسی جگہ کو پہلے بھی حکماء یعنی ماہرین فلکیات نے رصدگاہ کے لئے پسند کیا تھا۔''

رصدگاہ کی تعمیر کا منصوبہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا کہ شاہجہان کو بلخ کی مہم پیش آگئی اور وزیر نے ایسے حالات میں رصدگاہ کے مصارف کو غیر ضروری قرار دے کر اس کی تعمیر کے منصوبے کو وقتی طور پر ملتوی کردیا۔ چنانچہ ملاّ محمود مایوس ہوکر دہلی کو خیر باد کہہ

کر جونپور واپس آ گئے اور یہاں پر درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ اس اثنا میں بنگال کے گورنر شہزادہ شاہ شجاع نے ملاّ محمود کو بنگال آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور بنگال تشریف لے گئے جہاں شاہ شجاع کے علاوہ بہت سے علماء اور امراء نے اُن سے اکتسابِ فیض کیا۔ شاہ شجاع نے ان سے حکمت کی کتابیں پڑھیں۔ اور نواب شائستہ خاں، ابو طالب بن ابی الحسن نے ''فوائد محمودیہ'' اور شیخ نورالدین جعفر جونپوری اور عبدالباقی بن غوث الاسلام صدیقی نے بھی ملاّ محمود سے علمی استفادہ کیا۔

بنگال ہی میں ملاّ محمود کی شیخ نعمت اللہ بن عطاء اللہ فیروز پوری سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے شیخ نعمت اللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے ان سے تصوف و طریقت کی تعلیم و تربیت حاصل کی اور معرفت الٰہی کے اسرار و رموز سیکھے۔ ملاّ محمود نے اپنے مرشد شیخ نعمت اللہ صاحب سے اذکار سے متعلق ایک رسالہ بھی لیا تھا جسے محمد یحیٰی عباسی نے ''وفیات الاعلام'' میں نقل کیا ہے۔

شاہجہانی دربار میں یگانہ روزگار امراء علماء فقہاء اور ادباء و شعراء کا بے مثال اجتماع تھا جن میں ہر امیر، وزیر، عالم، فقیہ، ادیب اور شاعر اپنی اپنی جگہ اور اپنے علوم و فنون میں صاحبِ کمال اور یکتا تھا۔ لیکن ملاّ محمود جونپوری علم و فضل اور ذہانت میں شاہجہانی دربار کے تمام اربابِ علم و دانش سے اسی طرح گوئے سبقت لے گئے جس طرح وہ اپنے ہم مکتب، ہم درس اور ہم زمانہ طلباء سے سبقت لے گئے تھے۔ ملاّ جب تک دہلی میں مقیم رہے اس دوران شاہی دربار میں اور شاہی دربار سے باہر کوئی عالم ایسا نہیں تھا جو اُن کی برابری و ہم سری کا دعویٰ کر سکتا۔ بلکہ ہر شخص ان کے علم و فضل اور حکمت و دانش کا معترف و مداح تھا۔

ایک مرتبہ مغل شہنشاہ شاہجہان ملاّ محمود اور ملاّ عبدالحکیم سیالکوٹی کو ساتھ لے کر حضرت میاں میر صاحب قادری لاہوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مگر حضرت میاں میر متوجہ نہ ہوئے۔ شاہجہان، حضرت کے اس طرزِ عمل اور بے رخی بہت رنجیدہ ہوا اور ہر دو علماء نے بصد ادب و احترام حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کی جانب سے علماء کی طرف توجہ نہ دینے کے کیا معنی ہیں؟ اس پر حضرت میاں میر صاحب اٹھے اور انہوں نے اپنے کندھوں سے کمبل اتارا اور اسے بچھا کر ان دونوں علماء کو اس پر بٹھلایا اور خود ادب کے ساتھ ان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور ان سے یوں گویا ہوئے: ''میں

ایک جاہل شخص ہوں مجھے اس شعر کا مطلب سمجھا دیجئے۔

مبادا دل آں فرو مایہ شاد　　که از بہر دنیا دہد دیں بباد

ترجمہ: ایسا نہ ہو کہ دل فرومایہ خوش ہو جائے جو دنیا کی خاطر اپنا دین بادشاہ کی نذر کر چکا ہے۔

یہ شعر سن کر ملا عبدالحکیم تو اسی وقت زمین پر لوٹنے لگے اور انہوں نے اپنا گریبان چاک کر دیا۔ ملا محمود جونپوری بھی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور شاہی ملازمت ترک کر کے اپنے وطن واپس آ گئے اور زندگی کے آخری لمحات تک عبادت و ریاضت، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ اس طرح ایک صاحب کرامت بزرگ نے دو اکابر علمائے دین کو جو فلسفہ و حکمت کے فاضل اجل تھے، اپنے مخصوص طرز عمل اور صرف ایک شعر سے روحانیت کی طرف مائل کر کے صراطِ مستقیم پر گامزن کر دیا۔ قبل ازیں ملا محمود دہلی آتے جاتے رہتے تھے لیکن اب کے ۱۰۴۲ھ میں ملازمت چھوڑ کر آئے تو پھر جونپور سے کہیں نہ گئے۔

ملا محمود کے جد بزرگوار شاہ محمد (متوفی ۱۰۳۲ھ) کا مدرسہ جونپور کے محلّہ سپاہ میں تھا۔ ملا صاحب نے جونپور میں ایک عالیشان مسجد اور مدرسہ تعمیر کرایا جو مدرسہ محمودیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مسجد سے متصل ایک خانقاہ محلّہ شیخ حامد میں بنوائی۔ یہ مسجد شاہجہانی دور میں تعمیر ہوئی تھی اور اپنی خوبصورتی، دلکشی اور طرز تعمیر کے لحاظ سے ایک یادگار مسجد ہے۔ اسی مسجد سے ملحقہ مدرسہ میں ملا صاحب عمر بھر درس دیتے رہے اور ہزاروں تشنگانِ علم کو سیراب کیا۔

ملا محمود کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ان کی کتاب ''شمس بازغہ'' ہے جو اُن کی تصنیفات میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔ یہ وہ کتاب ہے جس کے بارے میں اکثر علماء و فضلا یہ کہتے ہیں کہ علم حکمت میں ایسی اور کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی اور یہی وہ کتاب ہے جس کے پڑھنے سے طالب علم کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی جاتی ہے۔ اس کے مصنف یعنی ملا محمود نے پہلے اس کا متن لکھا اور پھر خود ہی اس کی شرح تحریر کی ہے۔ اس کے بعد بڑے بڑے علماء فضلاء نے اس کتاب پر حواشی لکھے۔ ''شمس بازغہ'' پر حواشی لکھنے والوں میں نظام الملت وَالدّین ملا محمد حسن، مولانا محمد یوسف اور مولانا محمد عبدالحلیم ایسے جید علماء شامل ہیں۔ ''شمس بازغہ'' درس نظامی میں اعلیٰ تعلیم کے لئے

پڑھائی جاتی ہے اور داخلِ نصاب ہے۔
ملاّ محمود جونپوری نے ''شمس بازغہ'' ایسی اہم کتاب تصنیف کرنے کے علاوہ کئی اور اہم اور قابلِ قدر کتابیں بھی لکھیں جن میں ''کتاب الفرائد شرح الفوائد''، ''مطنون متین''، ''وحدت الوجود''، ''جبر و اختیار''، ''اقسام نسواں''، ''رسالہ فی تحقیق ارتفاع النقیضین'' اور ''رسالہ فی تحقیق الکلی الجزئی الطبعی'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ محمود جونپوری نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں ''الحکمۃ البالغہ'' اور اُس کی شرح ''الشمس البازغۃ'' اور ''الروحہ'' بہت مشہور ہیں ــــ ''الروحۃ المیادہ فی حدیقۃ الصورہ و المادہ'' میں ملاّ محمود جونپوری نے صورت اور مادہ پر بحث کی ہے۔ اس میں ملاّ محمود نے یہ وضاحت کی ہے کہ تمام مفکر اس پر متفق ہیں کہ ایک مادی جسم میں کوئی ایسی شے ہوتی ہے جو تبدیلیاں قبول کرتی ہے۔ وہ کیا شے ہے؟ اس پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اشراقی حکماء کا یہ نظریہ ہے کہ یہ شے نفس الجسم ہے۔ علمائے متکلمین کی یہ رائے ہے کہ یہ شے جسم کا جز لا تجزیٰ ہے۔ اور مشائی حکماء نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہر مادی جسم دو اشیاء سے بنتا ہے جو لازمی ہیں اور جنہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک شے ہیولیٰ ہے اور دوسری صورت۔ نہ تو بغیر ہیولیٰ کے صورت ہو سکتی ہے اور نہ بغیر صورت کے ہیولیٰ ہو سکتا ہے۔ ملاّ محمود نے بھی اس مؤخرالذکر نظریہ کی تائید کی ہے۔
''الحکمۃ البالغۃ'' تصنیف کرتے وقت ملاّ محمود جونپوری کی خواہش تھی کہ وہ اس میں فلسفہ کے تمام شعبوں، منطق، طبیعیات، اور مابعدالطبیعیات، سب موضوعات پر بحث کریں گے لیکن اپنی طویل علالت کے باعث وہ اپنی اس خواہش کو پورا نہ کر سکے۔ وہ اپنی اس کتاب میں طبیعیات کے صرف دو ہی شعبے مکمل کر سکے اور فلسفہ کی دوسری شاخوں، منطق اور مابعدالطبیعیات پر وہ کچھ بھی نہ لکھ سکے۔ البتہ انہوں نے اپنی اس کتاب کی ایک شرح ''الشمس البالغۃ'' کے نام سے لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس شرح کا انداز بیان یہ ہے کہ ملاّ محمود پہلے ''قلتو'' لکھ کر اپنی کتاب سے ایک عبارت درج کرتے ہیں اور ''اقوا'' (یعنی اب میں کہتا ہوں) لکھ کر اس عبارت کی تشریح کرتے ہیں۔ اس کتاب یعنی ''الشمس البالغہ'' کے دو متن اور شرح پر ممتاز علماء یعنی ملاّ حمداللہ اور دوسرے ملاّ نظام الدین سہالوی نے حواشی لکھے ہیں۔ ملاّ نظام الدین علمائے

فرنگی محل کے جد امجد ہیں، اُن کے لکھے ہوئے حواشی بہت مشہور و مقبول ہوئے ہیں۔

ملاّ محمود جونپوری ایسا جلیل القدر عالم دین اور فلسفہ و حکمت اور علم الکلام کا ماہر پورے برعظیم میں اور کوئی نہ تھا چنانچہ اکثر علماء بالخصوص ملاّ محمود کے شیخ استاد الملک ملا محمد افضل جونپوری فرمایا کرتے تھے:

> ''علامہ تفتازانی اور امام جرجانی ایسے اجلہ علماء کا ایک دور میں اجتماع ہوا تھا۔ فی زمانہ ان کی مانند ملاّ محمود اور مخدوم عبدالرشید معاصرین ہونے کے علاوہ ایک ہی شہر میں موجود ہیں۔''

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ''سبحۃ المرجان'' میں لکھتے ہیں:

> ''ملاّ محمود قابل فخر استاد ہی نہ تھے بلکہ باعث تفاخر و مباہات دانایان سبق بھی تھے۔ علم حکمت میں نقارہ لمن الملکی بجا اور فن فلسفہ میں غلغلہ لیس کمثلہ تھا۔ ہندوستان میں تو کوئی ان کی نظیر ہی نہ تھا بلکہ ہفت اقلیم میں ان جیسا صاحب علم اور کوئی نہ تھا۔''

مولانا محمد یحیٰی بن محمد امین عباسی الہ آبادی نے ''وفیات الاعلام'' میں اور سید مولانا غلام علی آزاد حسینی بلگرامی نے ''سبحۃ المرجان'' میں لکھا ہے کہ ''گیارھویں صدی کی ابتداء میں ہندوستان میں دو ہی مجدد ہوئے ہیں، ایک شیخ احمد سرہندی علم حقائق میں اور دوسرے ملاّ محمود جونپوری علم حکمیہ و ادبیہ میں۔''

ملاّ محمود جونپوری سے تمام عمر میں کوئی ایسا قول صادر نہیں ہوا جس سے انہوں نے رجوع کیا ہو۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی ان سے کچھ پوچھتا، اگر ان کی طبیعت حاضر ہوتی تو اس کا جواب دے دیتے تھے ورنہ کہہ دیتے تھے کہ اس وقت میری طبیعت حاضر نہیں ہے۔

ملاّ محمود جونپوری شعر و سخن سے نہ صرف گہرا شغف رکھتے تھے بلکہ خود بھی شعر کہتے تھے۔

فلسفی عالم، عارف باللہ ملاّ محمود جونپوری نے ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ کو وفات پائی اور محلہ بلوچ ٹولہ جونپور میں سپرد خاک کئے گئے۔ ان کے استاد مخدوم ملا محمد افضل استاد الملک ان سے کس قدر محبت کرتے تھے اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے محبوب شاگرد کی وفات کے بعد کبھی مسکرائے تک نہیں اور اسی صدمہ میں بالآخر چالیس دن بعد خود بھی انتقال کر گئے۔

دانش مند خان

دانش مند خان کا شمار عہدِ مغلیہ کے اکابر امراء اور مشہور علماء و فضلاء میں ہوتا ہے۔
مولانا دانش مند ظاہری و باطنی علوم کے جامع تھے۔ وہ علوم متداولہ بالخصوص حدیث، فقہ اور تفسیر کے علاوہ فلکیات اور ہندسہ اور منطق و کلام کے ماہر اور بلند پایہ مناظر، انتہائی نیک نیت، نیک خصلت، مخلص و متدین اور درویش منش انسان تھے۔ ان کے علم و فضل کے علاوہ ان کے اعلیٰ اخلاق و اطوار اور پسندیدہ عادات و اوصاف کو ان کے معاصرین نے تسلیم کیا ہے اور مؤرخین نے شاندار الفاظ میں ان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

دانش مند خان کا نام ملاّ شفیعائی یزدی تھا۔ وہ ایران کے رہنے والے تھے اور روزگار کی تلاش میں برصغیر میں آئے تھے کہ ان کے علم و فضل اور اعلیٰ خصوصیات کی شہرت مغل فرماں روا شاہ جہاں تک پہنچی جو خود بھی عالم و فاضل اور علم دوست حکمران ہونے کے علاوہ علماء کا قدر دان بھی تھا۔ چنانچہ شاہ جہاں نے انہیں اپنے پاس بلوا کر شاہی دربار سے منسلک کر لیا۔ بالفاظ دیگر ان کی لیاقت و قابلیت کا چرچا ہی ان کی شاہی دربار میں پذیرائی کا سبب بنا جس سے ان کے تبحرِ علمی اور شخصی کمالات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

معاصر مؤرخ محمد ساقی مستعد خان جسے برسوں علامہ دانش مند خان کے ساتھ مغل دربار میں رہنے کا موقع ملا، اپنی کتاب ''مآثر عالمگیری'' میں ان کی وفات کے موقع پر لکھتا ہے:

> ''دانش مند خان میر بخشی، ناظم و قلعہ دار اکبر آباد، نامی امیر اپنے زمانے کے فاضل اور علامۂ دہر تھے۔ انہوں نے زندگی انتہائی تقویٰ و عبادت کے ساتھ بسر کی۔''

معاصر مؤرخ محمد صالح کنبوہ نے ''شاہجہان نامہ'' (جسے ''عملِ صالح'' کے نام سے

بھی موسوم کیا جاتا ہے) میں مولانا دانش مند خان کے احوال بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

''مولانا شفیعائے یزدی دانش مند خان نے اپنے وطن ایران میں مدت تک علوم متداولہ کی تحصیل کر کے مناسب استعداد بہم پہنچائی، پھر روزی کی خاطر چند تاجروں سے کچھ رقم لے کر ہندوستان جنت نشان کی طرف آ گئے۔ جس کی وسعت اور تموّل شہرۂ آفاق ہے۔ یہاں آ کر لشکر شاہی کے بازار میں خرید و فروخت کرتے رہے۔ نفع کما کر ایران جانے کے لیے بندرگاہ سورت میں پہنچے تھے کہ نصیب نے زور کیا۔ بعض مقرّب امراء نے ان کی لیاقت اور ہنر مندی کا حال حضرت شاہ جہاں کے گوش گزار کیا۔ غرض دربار سے طلبی کا فرمان صادر ہوا۔''

نامور اور قریب العہد مؤرّخ صمصام الدولہ شاہنواز خان نے ''مآثر الامراء'' کی جلد دوم میں علامہ دانش مند خان کے احوال بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

''ملا شفیعائی یزدی عرصہ دراز تک ایران میں علم حاصل کرتے رہے۔ مروّجہ علومِ عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کے بعد حلال روزی حاصل کرنے کے لیے کچھ روپیہ ایران کے تاجروں سے لے کر منافع میں حصہ دینے کا وعدہ کر کے ہندوستان آ گئے جو رونق کا مقام اور اہلِ ہمت اور اربابِ امن کے لیے نفع حاصل کرنے کی جگہ ہے۔ کچھ مدت بادشاہی لشکر میں گزاری اور مستقر الخلافہ اکبر آباد سے دارالسلطنت لاہور اور وہاں سے کابل فوج کے ہمراہ رہے۔ شاہی سواروں کی واپسی کے بعد دانش مند خان وطن واپس جانے کے ارادے سے سورت کی بندرگاہ پر پہنچے۔ چونکہ ان کی تقدیر یاور اور نصیبہ بیدار تھا، ان کے علم و فضل کا ذکر شاہجہان بادشاہ کے حضور میں ہوا۔ شاہی دربار سے بندرگاہ سورت کے منتظمین کے نام فرمان صادر ہوا کہ ان کو ہمارے دربار میں بھیج دیں۔ وہ اقبال مندی کی رہنمائی اور سعادت کی رہبری کی بدولت سورت سے شاہی درِ دولت کا قصد کر کے چوبیسویں سال جلوس شاہجہانی میں

نویں ذی الحجہ کو آستانِ شاہی پر حاضر ہوئے۔ جب اس الطاف شاہی کے مستحق کی استعداد و قابلیت کے مدارج دربارِ شاہجہاں کے روبرو ظاہر کیے گئے تو اس فضیلت پرور اور دانا نواز بادشاہ نے اپنی نظر کرم سے ہزاری ذات اور سو سوار کے منصب پر سرفراز فرمایا اور حکم ہوا کہ اتوار کے دن کی پیشکش ایک سال تک ان کو انعام میں دی جائے۔"

محمد صالح کنبوہ نے شاہجہان نامہ کی جلد چہارم میں لکھا ہے: "۲۴ ربیع الاوّل ۱۰۶۶ھ بمطابق ۲۱ جنوری ۱۶۵۶ء پیر کے روز اعلیٰ حضرت کی عمر مبارک کے ۶۵ ویں شمسی سال شروع ہونے کا جشن تلادان منعقد ہوا، اہلِ عالم کو خیرات اور عطیات کے معاملے میں بڑی بڑی رقمیں عطا ہوئیں۔ شہزادہ داراشکوہ کو زردوزی خلعت خاصہ، نیمۂ آستیں، موتیوں اور زمرد کی مالا اور مرصع پیٹی عطا ہوئی ... دانش مند خان بخشی دوم اور چند دیگر امراء کو خلعتِ خاصہ ملے"... محمد صالح کنبوہ نے "سن ۳۱ جلوس" کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ یکم جمادی الثانی ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۷ مارچ ۱۶۵۷ء صاحب قرانِ ثانی کی بادشاہت کا اکتیسواں سال بخیر و خوبی شروع ہوا۔ جشنِ نو روزی کے اہتمام سے دولت خانہ شاہی کی ایسی آرائش ہوئی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اعتقاد خان کی جگہ بخشی گری کی خدمت دانش مند خان کے سپرد ہوئی۔ خلعتِ خاصہ اور تین ہزاری ذات، آٹھ سو سوار کا منصب عنایت ہوا۔" ۱۰۶۸ھ کے احوال بیان کرتے ہوئے محمد صالح کنبوہ نے دانش مند خان کے استعفیٰ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

"۲۹ محرم ۱۰۶۸ مطابق ۶ نومبر ۱۶۵۷ء کو شاہی سواری متھرا میں پہنچی۔ دانش مند خان میر بخشی اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے تھے۔ یہاں یہ خدمت محمد امین خان کے سپرد فرمائی۔"

شاہنواز خان مصنف "مآثر الامراء" نے بھی علامہ دانش مند خان کے شاہجہانی عہد میں امارت کے کم و بیش یہی احوال لکھے ہیں:

"انتیسویں سال جلوس شاہجہانی میں لشکر خان کی جگہ وہ بخشی دوم کے منصب پر مامور ہوئے۔ دانش مند خان کا خطاب ملا... اکتیسویں سال جلوس شاہجہانی میں اعتقاد خان کی بجائے وہ میر بخشی کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی سال اس عہدے سے استعفا دے کر دارالخلافہ شاہجہاں آباد میں گوشہ نشین ہو گئے۔"

علامہ دانش مند خان اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے مابین شاہجہانی عہد میں ایک علمی مباحثہ ہوا جس کی روئیداد ''ماثر الامراء'' میں یوں بیان کی گئی ہے:

''کہتے ہیں کہ جب شاہی ملازمت میں داخل ہوئے تو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے بادشاہ شاہجہان کے ایما پر مباحثہ و مناظرہ ہوا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی جو علم و دانش میں اساتذہ قدیم سے فاضل تر تھے اور ان سے بہتر کوئی دوسرا شخص ہندوستان میں نہ تھا اور تمام معتبر کتابوں کے ان کے لکھے ہوئے حواشی ان کی قابلیت کی دلیل ہیں۔ دونوں فاضلوں کے درمیان ''و'' عطف پر جو'' ایاک نعبد و ایاک نستعین'' میں ہے طولانی گفتگو ہوئی اور بہت عرصے تک بحث ہوتی رہی۔ علامہ سعد اللہ خان جو علم میں ''اعلم'' مشہور تھے، ثالث مقرر ہوئے۔ لیکن آخر میں دونوں برابر رہے۔ اس روز سے دانش مند خان بادشاہ شاہجہان کا منظورِ نظر اور امارت کے درجے پر فائز ہوا۔''

علامہ دانش مند خان اورنگ زیب عالمگیر کے تخت نشین ہونے کے دوسرے سال از سرنو عنایاتِ شاہانہ سے سرفراز ہوئے۔ ظاہر ہے اورنگ زیب عالمگیر ایسا متدین اور پابند شریعت حکمران علامہ دانش مند ایسے جوہر قابل کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ چنانچہ عہد عالمگیری میں علامہ دانش مند خان کو پہلے چار ہزاری ذات اور دو ہزار سوار کا منصب ملا اور ساتویں سال جلوس عالمگیری کے شروع میں پنج ہزاری کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے اور اگلے برس قلعہ شاہجہان آباد کی نگرانی اور صوبہ داری پر مامور ہوئے اور دسویں سال جلوس عالمگیری میں اورنگ زیب عالمگیر کی سواری مستقر الخلافہ (آگرہ) کی جانب روانہ ہوئی تو دارالخلافہ دہلی کا انتظام میر بخشی دانش مند خان کے فرائض میں شامل کر دیا گیا۔

محمد صالح کنبوہ نے شاہ جہان نامہ میں مغل فرمانرواء شاہجہان تک کے حالات لکھے ہیں۔ عہد شاہجہانی کے بعد کے حالات شاہجہان نامہ میں شامل نہیں ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ اس کتاب کو ضبطِ تحریر میں لانے کے کام کا آغاز کب ہوا؟ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ۱۰۷۰ھ میں مکمل ہوئی۔ مؤرخ نے خود اس کی تاریخ ''لطیفہ فیضِ الٰہی'' سے تاریخ تصنیف نکالی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا

مؤرخ بعد میں بھی اس میں ترمیم و اضافہ کرتا رہا ہے۔ چنانچہ بہت سے واقعات مثلاً شاہجہان کی وفات ۱۰۷۶ھ، ملا حسین فروغی کی وفات ۱۰۷۷ھ اور علامہ دانش مند خان کی وفات ۱۰۸۰ھ لکھنے سے یہ امر ظاہر و ثابت ہے کہ مؤرخ نے یہ اضافے اس کی ۱۰۷۰ھ میں تکمیل کے بعد کیے۔

محمد صالح کنبوہ نے مولانا دانش مند خان کے حالات بھی شاملِ کتاب کیے ہیں لیکن صرف عہد شاہجہانی تک کے۔ انہوں نے عہد عالمگیری میں جو خدمات انجام دیں ان کا ذکر شاہجہان نامہ میں نہیں ملتا۔ چنانچہ محمد صالح کنبوہ نے مولانا دانش مند خان کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔ ''چونکہ علوم متداولہ پر خوب نظر تھی اور ہیئت و ہندسہ پر بھی پوری مہارت رکھتے تھے اس لیے اربابِ سخن ان کی بات کو سند سمجھتے تھے اور ہیئت دانی میں بھی بے نظیر قرار دیتے تھے۔ ذکی، تیز ذہن فراخ دل، فیاض اور خوش فکر تھے۔ حضرت شاہجہان کی قدردانی سے اتنی ترقی پائی کہ تمام ہم چشموں سے سبقت لے گئے۔'' جب کہ قریب العہد مؤرخ صمصام الدولہ شاہنواز خان نے علامہ دانش مند نے عہد عالمگیری میں جو قابل قدر خدمات انجام دیں ان کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ محمد صالح کنبوہ تو صرف عہد شاہجہانی میں دانش مند خان کے میر بخشی کے عہدہ سے استعفیٰ اور ان کی جگہ محمد امین خان کی تقرری پر دانش مند خان کی حد تک اپنے قلم کو روک لیتا ہے۔ لیکن مؤرخ شاہنواز خان نہ صرف یہ لکھتا ہے کہ مستعفی ہونے کے بعد دانش مند خان شاہجہان آباد میں گوشہ نشین ہو گئے بلکہ عہد عالمگیری میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر تقرری کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم ''مآثر الامراء'' کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں کہ محمد امین خان کی بجائے اورنگ زیب نے دانش مند خان کو میر بخشی مقرر کیا نیز یہ کہ مرصع قلمدان عنایت ہوا۔ صمصام الدولہ شاہنواز خان میر بخشی دانش مند خان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے، چنانچہ لکھتا ہے: ''وہ نیک خصلت امیر اپنے زمانے کے اکابر فضلاء میں سے تھے اور نیک نفسی اور نیک اندیشی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے بعد ان جیسا بلند امیر ایسا نہیں ہوا کہ جو امارت کے ساتھ فضیلت کا بھی مالک ہو۔''

فخر روزگار علامۂ دوراں دانش مند خان نے ۱۰ ربیع الاوّل ۱۰۸۱ھ مطابق ۱۸ جولائی ۱۶۷۰ کو وفات پائی۔

امانت خان میرک

امانت خان میرک جیو مغلیہ عہد کی معروف و ممتاز علماء و امرا میں سے صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ بے شمار ذہنی و فکری صلاحیتوں اور قابلِ قدر عملی قوتوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے صدق وصفا امانت و دیانت، راست بازی اور جود وسخا کے لیے مشہور تھے۔ امانت خان عالی فطرت، صاحبِ فتوت اور صوفی منش تھے۔ ان کا تعلق خراسان کے ایک معروف مذہبی و علمی خاندان سے تھا۔ صمصام الدولہ نواب شاہنواز خان مؤلف ''مآثرالامراء کے جد اعلیٰ تھے۔

امانت خان کا پورا نام میرک معین الدین احمد امانت خان خوافی ہے۔ ان کے اعلیٰ اخلاق و آداب، پسندیدہ عادات، خدمتِ خلق اور رفاہِ عامہ کے کاموں کی وجہ سے ''میرک جیو'' کے نام (عرف) سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد میرک حسین نے جہانگیر کے عہد میں بہت عزت و امتیاز حاصل کیا۔ انہیں ان کی اعلیٰ کارکردگی اور معاملہ فہمی کے پیشِ نظر کوھل میر کا بخشی اور واقعہ نویس مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں صوبہ دکن کا بخشی بنایا گیا۔ پھر جب شاہجہان تخت نشین ہوا تو اس نے انہیں صوبہ دکن کا دیوان مقرر کیا۔ چنانچہ صوبہ دکن کی دیوانی کا عہدہ ایک عرصے تک ان کے خاندان میں موروثی رہا۔ میرک حسین کو شاہجہان نے بلخ کی سفارت پر بھی بھیجا۔

میرک حسین کے بیٹے میرک معین الدین احمد کی تعلیم و تربیت اور ملازمت کے بارے میں صمصام الدولہ نواب شاہنواز خان ''مآثرالامراء'' میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''مروّجہ علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد وہ شاہی ملازمت پر فائز ہوئے۔ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں انہیں صوبہ کی بخشی گری اور

واقعہ نویسی ملی اور وہ اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہوئے۔ بعد ازاں انہیں دکن میں ذمہ داری سونپی گئی۔''

مؤرخ معروف بھکری نے اپنے تذکرہ ''ذخیرۃ الخوانین'' میں جو ۱۰۶۰ھ میں تالیف ہوا، لکھا ہے:

''میرک معین الدین پسر میرک حسین خوافی کہ جس کے باپ اور دادا کی حقیقت بزرگی اور کنبہ داری میں آفتاب سے بھی بزرگ تر ہے۔ اس علاقے میں فہم و فراست، حکمت و دانش اور خوش خطی میں بڑا ملکہ رکھتے ہیں اور دکن میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔''

شاہجہان کی تخت نشینی کے اٹھائیسویں سال میں میرک معین الدین دارا شکوہ کے ہمراہ قندھار کی مہم پر گئے اور اس مہم سے واپس آنے کے بعد اُسی سال یعنی ۱۰۶۴ھ... ۱۶۵۴ء میں شاہجہان نے انہیں ملتان کی دیوانی، بخشی گری اور واقعہ نویسی کے عہدوں پر مامور کیا۔ میرک معین الدین احمد ایک عرصے تک ملتان میں رہے۔ ملتان میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے اپنی کارگزاری، فرض شناسی اور خدمتِ خلق کی بدولت بہت شہرت اور عزت حاصل کی۔ چنانچہ مآثر الامراء میں نواب شاہنواز خان نے لکھا ہے:

''وہاں کا ہر عامی، شریف، چھوٹا، بڑا، ان کی سچائی، نیکی بزرگی اور پرہیزگاری کے باعث ان کا غلام بن گیا تھا۔ لوگ ان کے ساتھ مریدوں کی حیثیت سے سلوک کرتے تھے اور اپنے بزرگ سمجھ کر ان کا ادب و احترام کرتے تھے۔ وہ اس علاقے میں آج تک ''میرک جیو'' کے نام سے مشہور ہیں۔ شہر سے دو کوس پر انہوں نے ایک باغ اور حویلی بنوائی جو کوٹلہ میرک جیو کے نام سے مشہور ہے۔ معین الدین احمد خطِ شکستہ اور نستعلیق دونوں میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام بھی کیا۔ ان کی تالیفات میں سے ترجمہ ''شرعۃ الاسلام'' ہے جو آدابِ شریعت پر ایک جامع کتاب ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں میرک معین الدین احمد صوبہ کابل کے دیوان مقرر ہوئے اور انہیں امانت خان کا خطاب ملا جس پر نواب شاہنواز خان نے مآثر الامراء میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے کہ اگرچہ قدرتی طور پر اسماء کی مسمیٰ کے ساتھ نسبت ہوتی ہے اور مسمیٰ کو بھی اسم کے ساتھ بجا طور پر مطابقت ہوتی ہے لیکن یہاں ہم یہی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ اسم بالکل مسمیٰ ہے بلکہ اس اسم کو مسمیٰ سے ہزاروں گنا شرف و مرتبہ حاصل ہے۔ اور

عالم ایجاد و تکوین میں امانت و دیانت کے برابر کوئی صفت عزیز و کم یاب نہیں ہے۔ امانت و دیانت جہاں بھی پھول بکھیرتی ہیں وہاں بہار کی برکات ظاہر ہوتی ہیں۔ امانت و دیانت زندگی کی نعمتوں میں اضافے اور زیادتی کا سرچشمہ ہیں۔ زمانے میں دیانت ہی کے ذریعے فائدے حاصل ہوتے ہیں اور زندگی میں امانت کے ذریعے ہی سے ثمرات مقصود ملتے ہیں۔''

''ارباب دیانت، ریا و غرض کی آلودگی سے پاک ہوتے ہیں اور حق کے اظہار اور اپنے مالک کی بہبود میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ معترضین کے الزامات سے نہیں ڈرتے۔ محل کی بیگمات اور بادشاہ تک رسائی رکھنے والے معتبر خواجہ سراؤں نے امانت خان کے پاس نامناسب سفارشیں کیں۔ لیکن یہاں سفارش کی کوئی قیمت نہ تھی۔ امانت خان تمام ناجائز سفارشوں کو بہ جنبشِ یک قلم مسترد کرتے رہے اور وہی کرتے رہے جو سلطنت کے بہترین مفاد اور مخلوقِ خدا کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہوتا تھا۔ امانت خان آئے دن کی ان نت نئی سفارشوں کی وجہ سے ہمیشہ دل گرفتہ رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی سبب ہاتھ آئے اور وہ استعفیٰ دے دیں۔ چنانچہ انہوں نے عبدالحکیم پیش دست کی تقریر کو دستاویز بنا لیا اور اٹھارہویں سال جلوس میں حسن ابدال کے مقام پر مستعفی ہو گئے۔ ہر چند بادشاہ نے کہا کہ پیش دست کی تقریر استعفیٰ کا سبب نہیں بن سکتی۔''

شہنشاہ اورنگ زیب ان کی امانت و دیانت اور عمدہ کارگزاری سے بہت متأثر تھا۔ اس نے امانت خان کو فوری طور پر دار السلطنت لاہور کا انتظام اور قلعہ داری سونپ دی اور دہلی رخصت ہوتے وقت صوبے کی دیوانی بھی دے دی۔ ہر چند انہوں نے روپے پیسے کے کام کو قبول کرنے سے انکار کیا مگر بادشاہ نے فرمایا کہ ان کا بڑا بیٹا عبدالقادر اس کام کو انجام دینے میں ان کی مدد کرے گا۔ لاہور میں بھی صوبہ دار امانت خان نے بعض عمارات بنوائیں جن میں خوافی پورہ کی حویلی کے علاوہ حوض کلاں کے قریب ایک حویلی اور حمام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صمصام الدولہ نے ''مآثر الامراء'' میں لکھا ہے کہ یہ حویلی اور حمام دنیا میں مشہور ہیں۔

جب شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر اجمیر گیا تو صوبہ جات دکن کی دیوانی امانت خان کے سپرد ہوئی اس کے بعد عرصہ دراز تک یہ دیوانی ان کے خاندان میں رہی۔ پچیسویں سال جلوس عالمگیری میں بادشاہ اورنگ آباد گیا تو نظام شاہ کی حویلی جو سبز بنگلہ کے نام

سے مشہور ہے اور جہاں اورنگ آباد کا حاکم رہتا تھا، امانت خان کو رہنے کے لیے ملی۔
ستائیسویں سال جلوس عالمگیری کے شروع میں جب بادشاہ احمد نگر پہنچا اور وہ بیجا پور اور حیدر آباد فتح کرنا چاہتا تھا نواب شاہنواز خان کے بیان کے مطابق، امانت خان مسلمانوں کی آپس کی جنگ سے احتراز ضروری سمجھتا تھا اس لیے اس نے استعفیٰ کا کاغذ جو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا، پیش کر دیا۔ بادشاہ قدر شناس نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا اور انہیں اپنے ساتھ لے جانے کی بجائے اورنگ آباد کی حفاظت پر مامور کر دیا۔

امانت خان خوف خدا رکھنے والے ایک رعایا پرور، عوام دوست، اصول پسند اور غریبوں کے ہمدرد و غمگسار حاکم تھے۔ وہ جس منصب اور جس عہدے پر بھی رہے پوری ذمہ داری، فرض شناسی اور تندہی سے لوگوں کی خدمت کرتے رہے اور ہر ممکن طریقے سے ان کی امداد و اعانت کرتے رہے۔ جن دنوں میں لاہور کے صوبہ دار تھے تو انہیں معلوم ہوا کہ مطالبہ دار عمال اور غریب و مفلوک الحال زمیندار قید خانے میں ہلاکت کے قریب پہنچ جاتے تھے اور اس سے سرکار کو بدنامی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوتا تھا۔ امانت خان نے ہر قیدی کی حیثیت سے کچھ کم، وعدہ اور قسط کے طور پر مقرر کر کے ان سب کو رہا کر دیا۔ چنانچہ ایک سال اخبار نویسوں کی تحریر سے بادشاہ کو معلوم ہوا کہ امانت خان کے اس اقدام سے دو لاکھ روپے کا نقصان ہوا ہے۔ بادشاہ کو یہ بات ناگوار ہوئی مگر جب بادشاہ کو کیفیتِ حال کی اطلاع ہوئی تو اس نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

اسی طرح دکن میں بھی بارہ لاکھ روپے گزشتہ سالوں کا بقایا مفلوک الحال رعایا کے ذمہ واجب الادا تھا۔ حالانکہ ہر سال پیادے اور منصب دار مقرر ہوتے تھے مگر ایک پیسہ بھی وصول نہیں کرتے تھے اور موقوف شدہ رقم خود لے کر چلے آتے تھے اور اس کی کوئی تحریر یا رسید وغیرہ نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح کی ایک بڑی رقم جو غریب و مفلس زمینداروں کے ذمے پیشکش کے سلسلے میں واجب تھی، امانت خان نے یک قلم موقوف کر دی۔ اتفاقاً ایک روز بادشاہ اورنگ زیب، امانت خان کی دیانت کی تعریف کر رہا تھا۔ امانت خان نے مؤدبانہ عرض کیا کہ حضور مجھ جیسا تو کوئی اور خائن نہ ہو گا، ہر سال میں بادشاہ کا مال باقی داروں پر معاف کر دیتا ہوں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ''ہم جانتے ہیں کہ تم آخرت کے خزانے کو بھرتے ہو۔ اس سے زیادہ ہماری خیر خواہی اور کیا ہو سکتی ہے؟''

عہدہ و منصب اور مال و دولت کے وسائل ہونے کے باوجود امانت خان نہایت

سادہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ''مآثر الامراء'' کے مؤلف نے لکھا ہے کہ امانت خان، امیروں کی طرح نہیں رہتے تھے وہ دنیا داروں کے تکلفات سے بھی واقف نہ تھے اور ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارتے تھے۔

صاحبِ ''لبِ لباب'' خوافی خان امانت خان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔ ''کہ ایسا دیانت دار جو حقیقت میں اپنی ترقی کا خیال نہ رکھے اور سرکار کے فائدے سے زیادہ مخلوق کے آرام کا خیال رکھے اور اس کی حکومت میں کسی کو مالی اور جانی نقصان نہ پہنچے، ہم نے امانت خان کے سوا بہت کم دیکھا اور سنا ہے۔''

خافی خان نے مخلص خان بخشی کے حوالے سے لکھا ہے کہ امانت خان نے عالمگیر بادشاہ کے مزاج میں ایک عجیب مقام حاصل کر لیا تھا۔ صمصام الدولہ نے ''مآثر الامراء'' میں لکھا ہے ''بزرگوار (امانت خان) کا منصبِ قلیل کے باوجود کہ دو ہزاری سے زیادہ نہ تھا، ان کی خدمت کا نقش بادشاہ کے دل پر عجیب انداز سے بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے بہت سے کارنامے تو جرات و بہادری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ چونکہ انتہائی خدا ترس اور رحم دل تھے اس لیے بعض غربا و مساکین اور مظلومین کی امداد و اعانت اور ان کی فوز و فلاح کے لیے قواعد وضوابط کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ اس لیے ملازمت کا استعفیٰ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ لیکن حق آگاہ و مردم شناس اور قدر دان بادشاہ اورنگ زیب ان کے مزاج اور نیت کو سمجھتے ہوئے چشم پوشی سے کام لیتا تھا اس لیے کہ حکومت کا تو کام ہی عوام کی فلاح و بہبود ہے۔''

امانت خان کثیر الاولاد تھے۔ ان کے سات بیٹے اور آٹھ بیٹیاں تھیں۔ ان کا ایک بیٹا وزارت خان مشہور ہوا جو شاعر تھا اور گرامی تخلص کرتا تھا۔ ان کے ایک بیٹے کاظم خان ''مآثر الامراء'' کے مؤلف صمصام الدولہ نواب شاہنواز خان کے دادا تھے۔ نواب شاہنواز خان نے اپنے جدِ اعلیٰ امانت خان کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ''یہ بزرگوار امانت خان کی حسنِ نیت ہے کہ اس انقلاب آفریں زمانے میں کہ پلک مارتے ہی عظیم الشان خاندان ذلت وخواری میں مبتلا ہو گئے ہیں اور آنکھ جھپکتے ہی صاحبِ عزت ذلیل و خوار ہو گئے ہیں، مگر ان کی اولاد کی چار پشتیں تحریر کے وقت ۱۱۵۹ھ... ۱۷۴۶ء تک عزت و آبرو کے ساتھ دکن کی دیوانی اور دوسرے عمدہ عہدوں پر سرفراز ہیں۔''

امانت خان معین الدین احمد معروف بہ میرک جیو نے ۱۰۹۵ھ-۱۶۸۴ء میں اورنگ آباد میں وفات پائی اور شاہ نور حسامی کی درگاہ کے متصل دفن ہوئے۔ ان کی تاریخ وفات ''سید بہشتی شد'' ہے۔

میرزاہد ہروی

قاضی میر زاہد ہروی کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے نامور علماء فقہاء اور صاحب قلم شخصیات میں ہوتا ہے وہ مغل فرمانروا شاہجہان کے عہد کے ایک معزز منصب دار، بلند پایہ وقائع نویس اور قاضی ہونے کے علاوہ متعدد مفید و قابل قدر دینی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ میر محمد زاہد بن قاضی محمد اسلم ہروی کابلی لاہوری کو کتب تاریخ و تذکرہ میں مرزا محمد زاہد بھی لکھا جاتا ہے۔

میر زاہد ہروی ہندوستان کے رہنے والے تھے اور یہیں ایک بااثر علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ان کے والد قاضی محمد اسلم مولانا خواجہ کوہی کی اولاد میں سے تھے۔ مولانا خواجہ کوہی خراسان کے مشہور بزرگ اور شیخ طریقت تھے اور اپنے زہد و ورع علم و فضل اور کشف و کرامات کی وجہ سے دور و نزدیک مشہور و مقبول تھے مولانا خواجہ کوہی کے حلقۂ ارادت میں عوام و خواص یکساں طور پر کثیر تعداد میں شامل تھے اور ان کے شاگرد، عقیدت مند اور مریدین خراسان کے علاوہ افغانستان، ماوراء النہر اور برعظیم پاکستان و ہند میں بھی موجود تھے۔ ان کے صاحب زادے میر محمد اسلم شہر ہرات میں پیدا ہوئے۔ پھر نقل مکانی کر کے انہوں نے دارالحکومت کابل میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ کابل میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قاضی محمد اسلم اعلیٰ تعلیم کے حصول کے خاطر لاہور میں آ کر مشہور عالم دین استاد شیخ بہلول کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے دینی علوم کی تحصیل و تکمیل کے بعد آگرہ پہنچے اور مغل شہنشاہ جہانگیر کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور پھر ترقی کر کے کابل کے منصب قضاء پر فائز ہو گئے بعد ازں جہانگیر نے ان کو دارالسلطنت میں طلب کر کے شاہی لشکر کا قاضی بنادیا اس دوران ملازمت میں قاضی محمد

اسلم جب ہندوستان میں مقیم تھے میر زاہد کی ولادت ہوئی اور اپنے آبائی وطن ہرات کی نسبت سے وہ میر زاہد ہروی کہلائے۔ میر زاہد ہروی دو مغل بادشاہوں یعنی شاہ جہان اور اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''انفاس العارفین'' میں ان کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرزا محمد زاہد ہروی، قاضی محمد اسلم کے فرزند تھے جو جہانگیر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے اور بادشاہ نے انہیں قاضی القضاۃ بنا دیا۔ وہ ملا محمد فاضل کے شاگرد تھے جن کا وطن مالوف بدخشاں تھا۔ آغازِ جوانی میں سب سے پہلے کابل میں ملا صادق حلوائی کی شاگردی اختیار کی پھر توران میں جاکر مشہور علمی مشکلات کے حل کرنے والے اور معقولات کے گرہ کشا ملا میرزا جان شیرازی کی صحبت اختیار کی۔ نیز میرزا جان شیرازی کے تلمیذِ ارشد اور اپنے زمانے کے استاذ العلماء ملا یوسف سے فنونِ حکمت کا اکتساب کرکے لاہور میں آ کر قیام پذیر ہوئے اور لاہور ہی میں علم تفسیر و اصول ملا جمال لاہوری سے حاصل کیا جو ادب عربی میں یگانہ روزگار تھے اس طرح مرزا زاہد ہروی تیرہ سال کی عمر میں معقول و منقول سے فارغ ہوگئے تھے وہ جودت طبع اور فہم رسا کے لحاظ سے اپنے زمانے میں بے نظیر مانے جاتے تھے۔''

میر زاہد کا خاندان علم و فضل اور تقویٰ میں ممتاز تھا۔ وہ حنفی المذہب تھے چنانچہ مولوی فقیر محمد اپنی یادگار تالیف ''حدائق الحنفیہ'' میں ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میر زاہد بن قاضی محمد اسلم ہروی کابلی، فاضل اجل، عالم تبحر، منطقی، صاحبِ ذہنِ ثاقب، فکر صائب رکھتے تھے اور علم کی جستجو اور تحقیق و تدقیق میں سابقین سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔ میر زاہد پیدائشی طور پر متجسس ذہن رکھنے کے علاوہ ایک ماہر معقولات کی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ علوم اپنے والد اور دیگر فضلائے ہند سے حاصل کیے۔''

قاضی محمد زاہد اپنے والد کی زندگی میں ہی اپنے فضل و کمال اور تبحر علمی کی بناء پر

مشہور ہو چکے تھے۔ ۱۰۶۴ھ میں کابل کی وقائع نویسی پر مامور ہوئے چنانچہ عہد شاجہانی میں وہ اسی عہدے پر خدمات انجام دیتے رہے۔ شاجہان کے دور حکومت کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کا دور حکومت شروع ہوا تو اورنگ زیب نے میر زاہد کو پہلے لشکر کا محتسب مقرر کیا بعد ازاں کابل کی صدارت ان کے سپرد کردی۔ میر محمد زاہد ۱۰۷۷ھ میں لشکر کے محتسب بنے انہوں نے اپنے فرائض منصبی کو انجام دینے میں کمال حسن و خوبی، امانت و دیانت اور فرض شناسی کا مظاہرہ کیا اور اس دوران تصنیف و تالیف اور علمی تحقیق کے کام کو بھی جاری رکھا۔

اُس زمانے میں محتسب لشکر شاہی میر محمد زاہد کا قیام اکبر آباد میں رہا۔ اس دوران انہوں نے اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ چنانچہ اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم دہلوی بانی مدرسہ رحیمیہ اور بانی خانقاہ رحیمیہ دہلی نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ شاہ عبدالرحیم نے ان سے فلسفہ و منطق کی تمام کتابیں پڑھیں۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ ''والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ جن دنوں اورنگ زیب اکبر آباد میں تھے میں مرزا زاہد ہروی محتسب لشکر سے اسباق پڑھتا تھا۔''

میر محمد زاہد ہروی کے بارے میں شاہ ولی اللہ مزید فرماتے ہیں ''مرزا از مشرب صافی صوفیہ نیز بہرہ تمام داشتہ وصحبت یکے از اکابرین طریقہ دریافتہ''

میر زاہد، صاحب فضل و کمال ہونے کے ساتھ ساتھ عارف باللہ بھی تھے۔ کتب تاریخ و تذکرہ میں ان کے کشف و کرامات کے واقعات بھی ملتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم صاحب آگرہ میں قاضی صاحب کی خدمت یں حاضر تھے اور شیخ سعدی شیرازی کے یہ دوشعر پڑھنا چاہتے تھے۔

جز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است

جز سِرّ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

سعدی بشوی لوح دل از نقشِ غیر حق

علمی کہ رہ حق ننماید جہالت است

انہیں چوتھا مصرعہ یاد نہیں آرہا تھا جس کے باعث بہت تنگ ہورہے تھے کہ یکا یک ایک شخص کمبل اوڑھے ظاہر ہوا جب وہ تیسرا مصرعہ پڑھ چکے تو اس شخص نے برابر

سے نکل کر چوتھا مصرعہ پڑھ دیا۔ شاہ صاحب سنتے ہی اس کے پیچھے بھاگے اور جا کر پوچھا آپ کا اسم شریف کیا ہے؟ کہا ''فقیر مصلح الدین شیرازی می گویند'' یعنی عالم یقظ میں شیخ سعدی کی روح نے متمثل ہو کر مصرعہ بتا دیا۔

پھر جب وہ کابل کے صدر مقرر ہوئے تو انہوں نے کابل میں بھی اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وعظ و ارشاد اور تلقین و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور بیشمار تشنگان علم ان سے سیراب ہوئے اور لاتعداد طالبان حق نے ان سے فیض حاصل کیا اور ان کے علم و فضل اور فیض رسانی کی شہرت عام ہوگئی۔

چنانچہ بحیثیت مفکر، محقق، عالم دین، معلم اور مصنف میر محمد زاہد نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اسی طرح ان کے شاگردوں میں سے بھی کئی حضرات بھی صاحب فضل و کمال ہوئے اور انہوں نے میر محمد زاہد سے کسب فیض کر کے اسلامی علوم و فنون کے وسعت و فروغ اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں قابل قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں جیسا کہ ان کے تلمیذ ارشد حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے دہلی میں نہ صرف مدرسہ رحیمیہ قائم کیا بلکہ اپنے شاگردوں کی اخلاقی روحانی تعلیم و تربیت کے لئے ایک عظیم خانقاہ کی بنیاد بھی رکھی۔ دارالسلطنت دہلی کے ان دو اہم دینی اداروں انے اسلامیاں برعظیم کی ذہنی وفکری راہنمائی اور ان کے مزاج و کردار کی تعمیر و تشکیل میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ شاہ ولی اللہ کی مفکرانہ نگارشات میں جو معقولات کی گہری چھاپ ہے وہ میر محمد زاہد ہروی ہی کے فکر و نظر کا عکس ہے۔

میر محمد زاہد ہروی کے احوال بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ خود فرماتے ہیں:

''میرزا صاحب منصب احتساب سے استعفاء کے بعد کابل میں جا کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ میرزا زاہد صوفیائے صافیہ کے مشرب سے بھی حصہ وافر رکھتے تھے اور انہوں نے مشائخ عظام کی صحبت میں رہ کر طریق تصوف میں کمال حاصل کیا تھا ان کی تصانیف تصوف میں سے دو تین نکات تو فقیر کے دل میں پیوست ہو کر رہ گئے مثلاً وحدت الوجود کی بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ لفظ ''وجود'' مصدری معنی کے لحاظ سے ایک ایسا امر ہے جو قابل اعتبار اور حقیقت نفس الامری میں ثابت ہے اور حقیقی (وضعی) معنوں کے اعتبار سے وجود کا اطلاق ہر اس چیز پر کیا جائے گا جو موجود بنفسہٖ ہو بلکہ جس کا

وجود اپنی ذات کے لئے واجب اور ضروری ہو اور یہ اس لئے کہ کسی چیز کے قابل اعتبار (اعتباری) اور نفس الامر میں ثابت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس وجود کا موصوف اس حیثیت میں ہو کہ اس پر سلب وجود کا اطلاق بھی صحیح ہو سکے۔ کسی بھی شے کے سلب وجود کے سلسلے میں تین امور کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

''امر اول یہ کہ وجود سے جس چیز کا سلب کیا جا رہا ہے کیا وہ ماہیت وجود ہے؟ (جس حیثیت میں بھی ہو)، دوسرا یہ کہ کیا سلب کردہ چیز وجود کا مصدری معنی ہے؟ تحقیق و تدقیق سے جب ان دونوں امور کا جواب نفی میں ملا تو تیسرا امر خود بخود ثابت ہوا کہ منشاء انتزاع وجود کا ما بہ الموجودی معنی ہے اور وہ یہ ہے کہ وجود اپنی قوت و حیثیت میں قائم اور اپنی ذات کے لئے واجب ہے اس لئے کہ محض انضمام کی وجہ سے وجود کو قائم بالماہیۃ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کہا جائے تو اس کا اپنے موصوف سے مؤخر ہونا لازم آتا ہے جو بدیہی طور پر غلط ہے اور نہ ہی وجود سے ماہیت کے انتزاع کی وجہ سے اسے قائم بالماہیۃ کہا جا سکتا ہے اگر ایسا کیا جائے تو وجود مصدری سے انتزاع کے وقت دوسرا انتزاع لازم آ سکتا ہے اور اس طرح انتزاعات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل سکتا ہے۔''

شاہ ولی اللہ کے مزید لکھتے ہیں کہ علم واجب الوجود کی بحث میں ایک نفیس نکتہ بیان کرتے ہوئے میرزا زاہد فرماتے ہیں:

''جاننا چاہئے کہ ذات واجب الوجود تعالی شانہ کے لئے علم اجمالی بھی ہے اور علم تفصیلی بھی۔ علم اجمالی سو علم تفصیلی کے لئے مبداء و ماخذ اور صورت ذہنیہ و خارجیہ کے لئے خلاق ہے۔ یہی علم حقیقی ہے اور یہی صفتِ کمال اور عین ذات ہے۔ اس مسئلہ کی جو تحقیق مجھے میرے پروردگار نے اپنے فضل و کرم سے الہام فرمائی ہے سو یہ ہے کہ ممکن کے لئے دو جہت ہیں۔ ایک وجود اور فعلیت کی جہت دوسری عدم وجود اور لافعلیت کی جہت۔ اور ممکن جہت ثانی سے متعلق ہونے کی صورت میں یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ علم اس سے متعلق ہو۔ اس لئے کہ وہ جہت ثانی سے متعلق ہونے کی بناء پر معدوم محض ہے۔ پس جس جہت کے ساتھ علم متعلق ہو سکتا ہے وہ جہت اولیٰ ہے اور اسی جہت اولیٰ کا مرجع علم ہے کہ وجود ممکن بعینہٖ وجود واجب ہے۔ جیسا کہ اہل تحقیق کا مسلک ہے۔ لہٰذا اللہ تعالی کا علم بالممکنات اس کے علم بذاتہ میں سمویا ہوا ہے اس حیثیت سے کہ اس سے ممکنات اور ذات کی کوئی چیز خارج قرار نہیں پائے گی۔ موصوفات کے ساتھ اوصاف

انتزاعی کے احوال سے بھی آپ کو اس سلسلے میں مدد ملے گی۔ اوصاف انتزاعی بھی وجود رکھتی ہیں جو آثار کے مرتب ہونے پر وجود خارجی کے مقابل پایا جاتا ہے اور یہی منشاء اتصاف ہوتا ہے اور اسی کی بناء پر موصوف اور صفات میں امتیاز قائم کیا جاتا ہے اور علم تفصیلی سو موجودات خارجی اور علوی و سفلی مراتب میں صور ذہنی کے علم حضوری کو کہتے ہیں پس غور و فکر کرو شاید کہ یہ اہم مسئلہ خالی الذہن ہو کر باریک بینی سے اور زیادہ واضح ہو۔ ہم نے اس کی کچھ مزید تفصیل تعلیقات شرح تجرید میں بیان کر دی ہے۔

قاضی میر محمد زاہد نے کئی اہم مفید اور قابل قدر کتابیں تصنیف کیں جن میں 'حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ رسالہ قطبیہ، اور حاشیہ شرح وتہذیب جلالی۔ ان کی یادگار اور مشہور و مقبول کتابیں ہیں اور ان تینوں کو ملا کر ''زواہد ثلاثہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔

''رسالہ قطبیہ'' مصنفہ قطب الدین رازی''شرح تہذیب'' مصنفہ جلال الدین دوانی اور ''شرح مواقف'' مصنفہ سید شریف جرجانی علم منطق کی نہایت جامع، مستند اور مشہور و مقبول کتابیں ہیں۔ علماء وفقہاء کی ایک بڑی جماعت نے ان کتابوں کے شروح و حواشی لکھے ہیں لیکن ان میں میرزاہد کے حواشی کو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے باعث سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ میرزاہد عقلی اور نقلی دونوں علوم کے زبردست ماہر اور فاضل کامل تھے۔ انہوں نے اپنے والد قاضی محمد اسلم کے علاوہ برعظیم کے اکابر علماء و مشائخ سے استفادہ کیا تھا اور خدائے بزرگ و برتر نے انہیں ذہن رسا اور خرد حکیمانہ عطا کی تھی پھر وہ اپنے طلباء بلکہ علماء تک کو زیادہ تر معقولات ہی کا درس دیا کرتے تھے جس کے باعث علم کے اس میدان میں انہیں کامل قدرت حاصل ہوگئی تھی چنانچہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو دیگر علماء و فضلاء اور شارحین کی نسبت زیادہ مہارت اور قدرت و جامعیت کے ساتھ اپنے پر مغز اور فکر انگیز حواشی کو پیش اور بیان کیا۔

میرزاہد کی امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے حواشی میں کتاب کے مشکل مقامات کے حل اور توضیحات کے ساتھ ساتھ نئے نئے نکات بھی پیدا کرتے ہیں اور کہیں کہیں مصنف پر بڑے معقول اعتراضات بھی کرتے ہیں جن میں سے بعض اعتراضات کے جواب خود دیتے ہیں اور بعض کو اپنے قارئین کی فہم و فراست پر چھوڑ دیتے ہیں۔ میرزاہد کے یہ تینوں حواشی عرصہ دراز تک برعظیم کے مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل رہے

ہیں اور ہمیشہ منتہی طلبہ ہی میر زاہد کے ''زواہد ثلاثہ'' کے دقیق فوائد اور باریک نکات سے مستفید ہوسکتے ہیں ''زواہد ثلاثہ'' اب بھی بعض مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔

میرزا محمد زاہد ہروی کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد حنیف گنگوہی لکھتے ہیں کہ ''جس زمانے میں شاہ عبدالرحیم صاحب شرح مواقف پڑھتے تھے مرزا محمد زاہد نے شرح مواقف کا مشہور حاشیہ تحریر فرمایا۔ ''شرح تہذیب'' علامہ دوانی اور رسالہ ''تصور و تصدیق'' ملا قطب الدین رازی کے حواشی و شرح آپ کی مشہور تصانیف ہیں جو ہندوستان، بخارا، اور کابل وغیرہ کے عربی مدارس میں داخل درس ہیں۔ اور ایک عرصہ تک ان کتابوں کو زبردست اہمیت حاصل رہی ہے... مشہور ہے کہ مولانا محمد حسن کانپوری۔ میر زاہد کے تمیں تمیں حاشیوں کو سامنے رکھ کر پڑھایا کرتے تھے۔ کتب مذکورہ کے علاوہ شرح تجرید پر بھی مرزا صاحب کے حواشی ہیں۔''

مولانا میر محمد زاہد ہروی اپنے والد ماجد قاضی محمد اسلم اور بالخصوص اپنے جد امجد مولانا خواجہ کوہی کی طرح ظاہری و باطنی علوم کے جامع تھے اور انتہائی متقی۔ متدین اور پرہیزگار انسان تھے۔ اپنی علمی و فقہی خصوصیات کے علاوہ اپنی امانت و دیانت اور صداقت و عدالت کی وجہ سے بھی مشہور تھے۔ اہل علم نے ان کی بعض کرامتیں بھی بیان کی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی زبانی مولانا محمد حنیف گنگوہی نے میر زاہد ہروی کا ایک واقعہ شاہ عبدالرحمٰن دہلوی کے حوالے سے نقل کیا ہے جس سے میر صاحب کی دیانت داری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ مرزا صاحب نے رمضان شریف میں اپنے شاگرد رشید شاہ عبدالرحیم صاحب کی دعوت کی۔ شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں کہ میں مرزا صاحب کے مکان پر پہنچا۔ افطار کا وقت قریب تھا، ایک کباب فروش حاضر ہوا اور اس نے کباب کا پورا خوان مرزا صاحب کے سامنے رکھ کر عرض کیا: یہ حضور کی نیاز ہے۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ عزیز من میں تمہارا پیر نہیں، استاد نہیں، پھر نیاز کیسی؟ بظاہر کوئی اور غرض ہے تو اس کو بیان کرو۔ کباب فروش نے پہلے تو یہی کہا کہ کوئی غرض نہیں مگر جب زیادہ اصرار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دکان لب سڑک ہے اور قاضی صاحب کے پیادے اس کو وہاں سے اٹھوانا چاہتے ہیں۔ بہرحال مرزا صاحب نے اس کی تسلی فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ کل کسی متدین پیادے کو بھیجوں گا جو تحقیق کر کے صحیح فیصلہ کردے گا۔ اب آپ جائیے کباب فروش نے عرض کیا حضور افطار کا وقت قریب آ گیا ہے اب

میں یہ کباب کہاں لے جاؤں۔ فروخت کا وقت بھی نہیں رہا۔ میں نے تو یہ آپ ہی کے لئے بنائے تھے، آپ ہی منظور فرمائیں۔ مرزا صاحب نے اپنے بچوں کے معلم سے فرمایا۔ ان کبابوں کی قیمت ادا کر کے مکان میں بھجوا دو۔ معلم نے کباب فروش کو علیحدہ لے جا کر قیمت دریافت کی۔ کباب والے نے آٹھ آنے مانگے۔ معلم نے آٹھ آنے اس کے حوالے کئے۔ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ میں نے معلم سے کہا کہ یہ مال بہت زیادہ کا ہے، آٹھ آنے میں بھی اس نے خوشامد میں دیا ہے، رشوت سے تو اب بھی خالی نہیں۔ ہماری یہ گفتگو مرزا صاحب نے سن لی۔ فوراً کباب فروش کو بلوا کر دریافت فرمایا۔ ان کبابوں پر کیا صرف ہوا ہے اور تمہاری محنت کتنی ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ بہرکیف حساب کیا گیا تو ان کبابوں کی قیمت ساڑھے تین روپے ہوتی تھی۔ مرزا صاحب نے اس کو یہی قیمت دلوائی اور معلم کو بہت ڈانٹا اور فرمایا، تم چاہتے ہو کہ اپنا روزہ حرام مال سے افطار کریں، یہ کون سی عقل مندی ہے اور کیا خیر خواہی ہے۔" شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے یہ واقعہ اپنی کتاب "انفاس العارفین" میں بھی بیان کیا ہے۔

میر زاہد ہروی کی تینوں معرکۃ الآراء کتب "زواہد ثلاثہ" منطق، فلسفہ اور علم الکلام میں میر زاہد کی کامل مہارت کا زندہ و تابندہ ثبوت ہیں۔

قاضی میر محمد زاہد ہروی نے ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ "فاضلِ بے مقابلہ" تاریخ وفات ہے۔

قاضی شیخ الاسلام

قاضی شیخ الا سلام عالمگیری عہد کے ممتاز قضاۃ میں سے تھے۔ اسلامی علوم بالخصوص حدیث و فقہ کے فاضل اجل اور امانت و دیانت، شرافت و فرض شناسی ایسی خصوصیات کے لئے بھی بہت مشہور تھے۔ انتہائی متقی و پرہیزگار اور متوکل بزرگ تھے۔ رزقِ حلال پر بہت زور دیتے تھے۔ حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔

قاضی شیخ الاسلام کے مرتبہ ومقام کی عظمت و فضیلت کو ثابت کرنے کے لیے درویش منش شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کا یہ ایک جملہ ہی کافی ہے جو مغل شہنشاہ نے قاضی شیخ الاسلام کی وفات کے موقع پر کہا تھا ''مغل سلطنت کے اس دو سو سالہ دور میں دیانت اور خداترسی میں اُن جیسا کوئی اور قاضی نہ ہوا۔''

قاضی شیخ الاسلام پٹن گجرات کے ایک معروف اور باا ثر علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اقضی القضاۃ قاضی عبدالوہاب کے بیٹے تھے۔ قاضی شیخ الاسلام اور ان کے آباؤ اجداد کے احوال کتبِ تاریخ و تذکرہ میں ملتے ہیں۔ چنانچہ معاصر مؤرخ نواب صمصام الدولہ شاہنواز خان نے ان کے والد قاضی عبدالوہاب اور ان کے جد امجد کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارنامے بیان کرتے ہیں اور لکھا ہے:

''اقضی القضاۃ قاضی عبدالوہاب، شیخ محمد طاہر بوہرہ کے پوتے ہیں جو پٹن گجرات میں رہتے تھے۔ محمد طاہر پٹنی فضل و کمالات سے آراستہ ہو کر حرمین شریفین گئے اور شیخ علی متقی حنفی قادری شاذلی سے تعلق پیدا کیا اور ان کے مرید ہو گئے۔ زہد، پرہیزگاری اور فنِ حدیث میں بے نظیرِ زمانہ ہوئے۔ شیخ محمد بن طاہر نے حجاز سے وطن واپس آ کر فتنۂ مہدویت کو فرو کرنے اور ان بدعات کے خاتمے کا بیڑا اٹھایا یا جو ان کی قوم میں اعتقاداً یا

عملاً جاری تھیں۔

''شیخ محمد طاہر پٹنی کے بیٹے عبد الوہاب علم فقہ اور اصول میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ شاہجہان کے عہد میں ایک مدت تک پٹن کے مفتی رہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے تخت نشین ہونے پر لشکر کے عہدۂ قضاۃ پر مامور ہوئے۔ قاضی عبد الوہاب نے اورنگ زیب عالمگیر کی ہدایات کے مطابق احکام شرع کو نافذ کیا اور نہایت اعتبار و اقتدار کے ساتھ اپنے عہدے پر فائز ہوئے۔ اورنگ زیب عالمگیر کو اسور دینیہ کا ایسا خیال تھا کہ اتنی وسیع مملکت کے نظم و نسق میں شرعی سزا اور سیاست پر عمل کیا جاتا تھا۔ وگرنہ اس سے پہلے شہروں اور قصبوں کے قاضی، حکام اور عہدے دار اکثر و بیشتر بدعنوان اور رشوت خور تھے۔ لیکن پھر قاضی عبد الوہاب نے بھی پر پرزے نکالے اور اس نے بھی روپے لینے اور کھینچنے میں مہارت پیدا کر لی اور بہت مال و دولت جمع کر لیا۔ مہابت خان لہراسپ کہ جو اپنی جرات و بے باکی اور شوخی، ظرافتِ طبع کے لئے مشہور تھا جب دکن کی مہم کے لئے روانہ ہوا تو اسے پتا چلا کہ قاضی عبد الوہاب تین چار لاکھ روپے کی اشیاء کشمیر اور آگرے سے خرید کر تاجروں کے مال کے ساتھ احمد آباد بھیج رہے ہیں۔ وہ قاضی سے ناراض تھا، اس نے فوراً سب سامان منگوا کر اپنی فوج میں تقسیم کر دیا۔ بادشاہ کے حضور شکایت پہنچی تو مہابت خان نے کہہ دیا کہ مجھے فوج کے اخراجات کے لئے روپے کی سخت ضرورت تھی۔ سوداگروں سے قرض لیا ہے۔ منافع کے ساتھ واپس کر دوں گا۔ اب قاضی اس امر کا اظہار نہ کر سکتا تھا کہ اتنا مال و متاع سب میرا ہے۔ چنانچہ لہو کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔''

قاضی شیخ الاسلام اس قاضی عبد الوہاب کے بیٹے تھے جن کے بارے میں نواب شاہنواز خان نے لکھا ہے۔

''او بخلافِ پدر دیانت واقعی داشت وورع وصلاح او منسوب بر ریا نہ بود''

قاضی شیخ الاسلام کا نام تاریکیوں میں چراغ کی طرح روشن ہے۔ شیخ الاسلام دارالسلطنت کے قاضی تھے۔ بادشاہ کے حسب طلب دربار میں حاضر ہوئے اور اپنے مرحوم باپ کی جگہ لشکر کے عہدۂ قضاۃ پر مقرر ہوئے۔ وہ اپنے باپ کے برعکس انتہائی دیانت دار صاحبِ ایمان تھے۔ ان کے تقویٰ اور نیکی میں ریاء کی بو نہ تھی۔ باپ کے ترکہ سے ایک لاکھ اشرفی، پانچ لاکھ روپے نقد اور بہت جواہرات و اسباب میں سے ایک

پیسہ بھی نہ لیا جو ان کی نیکی، پارسائی اور پرہیزگاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

قاضی شیخ الاسلام مقدمات کا فیصلہ کرنے میں اپنا ایک خاص انداز اور طریق کار رکھتے تھے۔ ان کا اصول تھا کہ چونکہ گواہ بالعموم جھوٹ بولتے ہیں اس لئے ان کے جھوٹے بیانات پر فیصلہ نہیں دینا چاہئے بلکہ مدعی اور مدعا علیہ کو موقع فراہم کیا جانا چاہئے کہ وہ آپس میں فیصلہ کرلیں۔ وہ مقدمات کے فیصلے ملکی قوانین اور اپنے طے شدہ عدالتی طریق کار کے مطابق کرتے تھے اور مقدمات میں ملوث لوگوں سے انصاف کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے تھے۔ اپنے عدالتی فرائض میں کسی قسم کی مداخلت یا دباؤ برداشت نہیں کرتے تھے۔ عدل گستری کے معاملہ میں احکام شریعت کا خیال رکھتے تھے اور جرات و بے باکی سے دوٹوک اور بے لاگ فیصلے صادر کرتے تھے۔ روایت ہے کہ بیجا پور اور حیدر آباد کی مہم کے متعلق بادشاہ نے ان سے مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف جواب دیا، ان کا اپنا بیٹا سراج الدین برار کا دیوان تھا۔ اس نے پہلے شاہی رقوم کو غبن کر کے دنیا کے دکھاوے کے لئے خرقۂ درویشی پہن لیا تا کہ کوئی باز پرس نہ ہو۔

مغلیہ عہد کے بدعنوان موروثی قاضیوں کے مزاج و کردار، اعمال و افعال اور ان کے طور طریقوں کے بارے میں نواب شاہنواز خان نے لکھا ہے:

> ''ان لوگوں نے اس جلیل القدر امر یعنی عہدۂ قضاۃ کو بہت آسان سمجھا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کے لئے دین کو بیچ ڈالتے ہیں اور عہدۂ قضاۃ حاصل کرنے کے لئے رشوت دیتے ہیں۔ پھر قاضی بن کر لوگوں کے حقوق کو پامال کر کے گناہ گار بنتے ہیں۔ نکاح اور مہر کی فیس کو ماں کے دودھ سے زیادہ حلال سمجھتے ہیں۔ قصبات کے موروثی قاضیوں کے متعلق کیا کہا جائے کہ نصیبِ دشمناں علم سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ دیس پانڈیہ یعنی پٹواری کا رجسٹر اور زمینداروں کے قول ان کے لئے کتاب (قرآن عظیم) اور شرع کے حکم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ صاحب علم و عمل قاضیوں کے متعلق ایک حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ تین قاضیوں میں سے ایک جنتی ہے اور خواجہ محمد پارساؒ ''فصل الخطاب'' میں فرماتے

ہیں کہ وہ جنتی قاضی بھی جنت کا قاضی ہوتا ہے۔ دنیا کا قاضی نہیں
ہوتا ہے۔ اس قوم کی گمراہی اور بے راہ روی کا اندازہ کون کر سکتا
ہے کہ جو جاہلوں سے بھی بدتر ہوتی ہے۔"

جاہل اور بے علم موروثی مفتی و قاضی ہی رشوت ستانی اور بدعنوانی کا موجب نہیں تھے بلکہ بعض بڑے بڑے صاحب علم و فضل اور بلند مرتبہ و مقام کے مالک بھی اس مرض میں مبتلا تھے اور عوام و خواص کے لئے پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ مثلاً شیخ الاسلام مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبد النبی صدر الصدور اکبر کے ابتدائی دورِ حکومت میں سب سے زیادہ اثر و رسوخ اور اقتدار و اختیار کے مالک تھے۔ اسلامی علوم بالخصوص حدیث و فقہ کے بڑے عالم فاضل اور ماہر تھے۔ شیخ عبداللہ کو ہمایوں نے مخدوم الملک اور شیر شاہ سوری نے شیخ الاسلام کا خطاب عطا کیا۔ مولوی رحمٰن علی نے تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے کہ علمیت میں یگانۂ دوراں تھے۔ ترویج شریعت کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں ہوسِ زر کا شکار ہو کر دولت کے غلام بن گئے تھے۔

شیخ محمد اکرام نے "رودِ کوثر" میں مستند تاریخی حوالوں کے ساتھ ان کے بارے میں لکھا ہے اور بہت صحیح لکھا ہے کہ "مخدوم الملک نے اپنا اختیار و اقتدار دو کاموں کے لئے استعمال کیا۔ ایک تو کسبِ زر کے لئے اور دوسرے فسادِ مملکت کا خطرہ دکھا کر ہر اس عالم اور درویش کو اذیت پہنچانے کے لئے جو اُن سے کسی مسئلہ میں اختلاف رکھتا تھا۔ جمعِ اموال کا یہ عالم تھا کہ جب وہ مرے تو تین کروڑ روپے نقد ان کے گھر سے نکلے۔ ان کے گور خانے میں سے چند صندوق ملے (جن میں سونے کی اینٹیں چنی ہوئی تھیں) جو مُردوں کے بہانے سے دفن کئے ہوئے تھے۔ ان کی طبیعت کا رنگ بالکل ظاہر پرستی کا تھا اور اگر وہ شرعی حیلوں سے شارع کا اصل مقصد ضائع کر دیتے تو انہیں ذرا تأمل نہ ہوتا۔"

چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے غوثی مندوی نے "گلزارِ ابرار" میں لکھا ہے کہ زکوٰۃ اور حج جیسے اہم ارکانِ مذہبی کی نسبت ان کا عمل یہ تھا کہ سال کے آخر میں تمام مال اپنی بیوی کو ہبہ کر دیتے اور وہ نیک بخت سال کے اندر پھر انہیں واپس کر دیتی تاکہ اس حیلہ سے زکوٰۃ سے بچ جائیں۔ اسی طرح لوگ حج کے بارے میں پوچھتے کہ کیا آپ پر حج

فرض نہیں ہے۔ جواب دیتے کہ ''نہیں۔'' وجہ یہ بتاتے کہ خشکی کے راستے جائیں تو رافضیوں کے ملک سے گزرنا پڑتا ہے۔ سمندر کے راستے جائیں تو فرنگیوں سے عہد و پیمان کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی ذلت ہے۔ پس دونوں طرح ناجائز ہے۔ انہوں نے اپنے اس موقف کی تائید میں سو سے زیادہ روایات نکال رکھی تھیں۔ بدقسمتی سے گزشتہ نصف صدی کے دوران میں پاکستان کی چھوٹی بڑی بلکہ اعلیٰ ترین عدالتوں کے جج صاحبان کی بڑی اور واضح اکثریت قاضی عبدالوہاب اور مخدوم الملک کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جمع اموال، حاصل جائداد یا پھر اپنے اختیارات کے غلط استعمال میں مصروف رہی۔ پاکستانی ججوں نے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انتہائی غیر منصفانہ اور غیر آئینی فیصلے صادر کیے جن سے ملک وقوم پر انتہائی بُرے اثرات مرتب ہوئے۔

پاکستانی قضاۃ اور قاضی القضاۃ میں سے ہر دوسرا قاضی، شیخ الاسلام، مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور اقضی القضاۃ قاضی عبدالوہاب سے دو ہاتھ آگے ہی رہا ہے۔ عدالتِ عالیہ، نظریہ ضرورت کے تحت جو فیصلے صادر کرتی رہی ہے وہ ہمیشہ حکمرانوں ہی کے غیر آئینی دورِ حکومت کو طول دینے کے لیے ہوتے تھے یا پھر جج صاحبان کی اپنی ملازمت و عہدہ کو قائم و برقرار رکھنے اور حکمرانوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات استوار کرنے کے لیے ہوتے تھے۔ نظریۂ ضرورت کو آج تک ''نظریہ پاکستان'' کے نفاذ یا پاکستانی عوام کے سیاسی و معاشی حقوق مہیا کرنے یا ان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ غرض ''نظریہ ضرورت'' قائداعظم کے ''نظریہ پاکستان'' کے نفاذ کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔

قاضی شیخ الاسلام بحیثیتِ قاضیِ لشکر اپنے فرائض منصبی کمال حسن و خوبی، جرأت و بے باکی اور عزم و استقلال کے ساتھ ادا کر رہے تھے کہ ستائیسویں سالِ جلوس عالمگیری میں اللہ تعالیٰ کی فطری توفیق سے ان پر جذبہ غالب ہوا اور انہوں نے عہدۂ قضاۃ سے مستعفی ہو کر درویشی اختیار کر لی۔ گو وہ طبعاً شروع ہی سے تصوف و طریقت کی طرف مائل تھے۔ بادشاہ کی مہربانیوں اور عہدۂ قضاۃ کے ترک نہ کرنے کی ترغیب کے باوجود وہ پوری یک سُوئی کے ساتھ جادۂ طریقت پر گام زن رہے۔ بادشاہ نے ان کی تجویز پر لشکر کا عہدۂ قضاۃ سید ابو سعید کو سونپ دیا جو قاضی شیخ الاسلام کے بہنوئی تھے اور دہلی میں رہتے تھے۔

اٹھائیسویں سالِ جلوسِ عالمگیری میں قاضی شیخ الاسلام کو سفرِ حجاز کی رُخصت ملی۔

واپس آنے کے بعد شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بندر سورت میں بڑے اعزاز کے ساتھ انہیں طلب فرمایا اور ان پر اپنی عنایات کی بارش کی۔ دو مرتبہ اپنے ہاتھ سے شہنشاہ نے ان کے کپڑوں پر عطر ملا اور عہدۂ قضاۃ وصدارت کی بات بھی ہوئی۔ مگر قاضی شیخ الاسلام نے درخواست کی کہ کچھ دنوں کے لئے وطن جانے کی اجازت دی جائے تاکہ اپنے بزرگوں کے مقابر کی زیارت اور اہل وعیال سے ملاقات کے بعد پھر حاضرِ خدمت ہوں۔ اجازت ملنے پر وطن روانہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا کرتے تھے کہ دوبارہ اس منصب پر مامور نہ ہوں۔ شہنشاہ نے بھی انہیں عبادت و ریاضت اور ذکر و فکرِ الٰہی کا پورا پورا موقع فراہم کیا۔ لیکن بیالیسویں سال جلوس عالمگیری میں ان کے بھائی نورالحق کے پاس شہنشاہ کا فرمان پہنچا کہ اگر قاضی شیخ الاسلام دربار شاہی میں آئیں اور عہدۂ صدارت قبول کریں تو وہ ان کو سپرد کیا جائے۔ قاضی شیخ الاسلام بادلِ نہ خواستہ احمد آباد سے سفر کے لئے تیار ہوئے۔ وہ ہمیشہ بارگاہِ الٰہی میں یہی دُعا مانگتے تھے کہ یاالٰہی اب میں کسی شاہی عہدے کے جھنجھٹ میں نہ پڑوں بلکہ جتنی جلدی ہو سکے تیرے حضور میں پہنچوں۔ چنانچہ ان کی دعائیں قبول ہوئیں اور وہ کسی شاہی عہدے پر سرفراز ہونے کی بجائے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

قاضی شیخ الاسلام نے ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۸ء میں وفات پائی۔

ملا جیون جونپوری

مخدوم ملا جیون کا شمار برعظیم پاکستان و ہند کے معروف وممتاز علماء وفضلاء میں ہوتا ہے۔ ان کا نام احمد بن ابی سعید بن عبیداللہ ہے۔ ان کا سلسلہ نسب سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ اس نسب سے صدیقی کہلاتے ہیں۔ ان کا عرف ''جیون'' ہے چنانچہ اپنی عرفیت ہی سے مشہور ومعروف ہوئے۔

مخدوم ملا احمد صدیقی حنفی جونپوری المعروف بہ ملا جیون ۱۰۴۷ھ میں شہر امیٹھی میں پیدا ہوئے جو مضافاتِ لکھنؤ میں واقع ہے۔ سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ پھر اطراف واکناف کے علماء وفضلاء کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا۔ خدائے بزرگ و برتر نے ملا جیون کو غیر معمولی ذہنی وفکری صلاحیتوں اور قابل قدر عملی قوتوں سے نوازا تھا اور ذہانت وفطانت کے علاوہ مضبوط قوتِ حافظہ اور جرأت واستقامت کا بھی بہرہ وافر عطا کیا تھا۔ ان کی قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ کتابوں کی عبارت کے اوراق کے اوراق یاد کر لیتے تھے۔ ملا جیون کے فضل وکمال کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ وہ اورنگ زیب عالم گیر کے استاد تھے اور عالم گیر ان کے تبحرِ علمی کے بہت قائل تھے۔

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہتہ الخواطر'' اور مولوی رحمان علی نے ''تذکرہ علمائے ہند'' میں لکھا ہے کہ ملا جیون بڑے ذہین اور قوی الحافظہ تھے، سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا اور بائیس سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہوگئے۔ درسی کتب کی عبارت بغیر کتاب دیکھے پڑھ دیتے تھے۔ جب کہ ''حدائق الحنفیہ'' میں لکھا ہے:

> ''اخیر کو لطف اللہ جہان آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سولہ سال کی عمر میں علوم دینیہ اور فنون شرعیہ کی تحصیل وتکمیل سے

فراغت پائی۔"

ملا جیون کے اساتذہ میں ملا لطف اللہ جہان آبادی کے علاوہ شیخ محمد صادق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تاریخ "شیراز ہند جونپور" میں مرقوم ہے:

"حضرت ملا جیون تمام علوم ظاہری و باطنی سے سیراب تھے۔ زہد و تقویٰ اور پابندئ شریعت میں بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ نمود و نمائش سے پرہیز کرتے تھے اور توکل ان کا شیوہ تھا۔ درس و تدریس اور ذکرِ الٰہی... بس دنیا میں یہی دو اُن کے کام تھے۔"

مولوی فقیر محمد نے اُن کا تعارف ان شاندار الفاظ میں کرایا ہے:

"شیخ احمد المعروف بہ ملا جیونؒ صدیقی امیٹھوی، فقیہ، محدث، اصولی، جامع معقول و منقول، علامۂ وقت، فہامۂ دہر، اورنگ زیب عالمگیر کے استاد اور صاحبِ فتویٰ تھے۔"

ملا جیون کے اورنگ زیب کا بحثیت استاد تقرری کا واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ "تاریخ شیرازِ ہند جونپور" میں یوں مذکور ہے: "مغل فرماں روا شاہجہان کو شہزادہ اورنگ زیب کی تعلیم تربیت کے لئے ایسے ماہر استاد کی ضرورت ہوئی جو ظاہری علوم سکھانے کے علاوہ اخلاق و آداب کی تعلیم آدابِ نبوی کے طریقے پر کر سکے، تاکہ شہزادے کو اسلامی تعلیمات کے ایمان افروز سانچے میں ڈھال سکے۔ مگر دارالسلطنت دہلی میں ایسا کوئی استاد نہ مل سکا۔ چنانچہ شاہجہان نے شیراز ہند جونپور کے حاکم کو طلب کر کے اپنی خواہش کا اظہار کیا، اس لئے کہ دہلی کے بعد جونپور ہی برعظیم کا دوسرا بڑا علمی مرکز تھا۔ جہاں علماء و فضلاء کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ اور صوفیہ کرام بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ جونپور کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر شاہجہان نے اس شہر کو "شیراز ہند" کا نام دیا تھا۔

تین دنوں میں حاکم جونپور کو اورنگ زیب کے لئے استاد یا اتالیق تلاش کرنے کا حکم ملا ان دنوں میں ملا جیون جونپور میں تدریس و تعلیم میں مشغول تھے اور حاکم جونپور ان کا عقیدت مند تھا۔ چنانچہ اس نے جونپور واپس آ کر ملا جیون کی خدمت میں حاضر ہو کر مغل فرماں روا کا منشا بیان کیا مگر ملا جیون نے دہلی جانے سے انکار کر دیا۔ قصہ مختصر حاکم جونپور بڑی منت سماجت کر کے ملا صاحب کو اپنے ساتھ لے کر دہلی پہنچا اور شاہی دربار میں ان کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کے مختصر حالات بیان کئے۔ اس تعارف کے

بعد ملا صاحب کو لا کر شہنشاہ ہند کے روبرو کھڑا کر دیا۔ ملا جیون سید ھے ساد ھے، حلیم الطبع، سلیم الفطرت، سنجیدہ مزاج، سادگی پسند اور درویش منش انسان تھے۔ گاڑھے کے موٹے کپڑوں کا لباس پہن رکھا تھا مگر چہرے سے فطانت اور شرافت عیاں تھی۔ چنانچہ شہنشاہ پہلی نظر ہی میں ان کا گرویدہ ہوگیا۔

اورنگ زیب کو بلوا کر ان کی خدمت میں حاضر کیا۔ اورنگ زیب بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر محل میں چلا گیا۔ شاہجہان نے ملا جیون کو اورنگ زیب کا اتالیق مقرر کیا۔ شاہجہان کی خواہش کے مطابق ملا جیون نے اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش نظر رکھ کر کی اور اس کو اپنی طرح احکام شریعت کا پابند بنادیا۔

ملا جیون کے اخلاقِ حمیدہ اور ان کے علمی کمالات سے تمام اراکینِ سلطنت متاثر ہوئے اور عوام و خواص ان کے عقیدت مند ہوگئے۔ مغل شہزادے کی اتالیقی اور عوام و خواص میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت ملا جیون کی طرزِ زندگی اور ان کی سادگی میں ذرّہ برابر فرق نہ لاسکی۔ وہ نہ تو شاہی دربار کی شان و شوکت سے متاثر ہوئے اور نہ مغل شہنشاہ کا دبدبہ و جلال ان کو مرعوب کرسکا۔ البتہ ان کے علم و فضل، ذہانت و فطانت اور سادگی سے سبھی متاثر و مرعوب ہوئے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے ایک روز ملا جیون کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور جب تک کمرے میں ہلکی روشنی نہ ہو اندھیرے میں نیند نہیں آتی، قبر کی تاریکی میں کیا حالت ہوگی؟ ملا جیون نے فرمایا کہ جب تو قبر میں جائے گا تو تجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوگی کہ جب سے آفتابِ رسالت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم زیرِ زمین جلوہ گر ہوئے ہیں زمین کے تمام طبقات روشن اور درخشاں ہوگئے ہیں۔ تمہیں حبیبِ کبریا رحمۃ اللعالمین کے صدقے انوارِ رحمت میں سکھ چین کی نیند سے سونا نصیب ہوگا۔

ملا جیون نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی برابر جاری رکھا انہوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں :

۱۔ التفسیرات الاحمدیہ فی بیان الآیات الشرعیۃ معروف بہ تفسیر احمدی جو آیاتِ احکام کی تشریح ہے۔ اس کو ملا جیون نے سولہ سال کی عمر میں طالب علمی کے زمانہ میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۲۷ سال کی عمر میں ۱۰۷۵ھ میں مکمل کیا۔ اس کتاب سے

فقہی مسائل اور شرعی احکام مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔

۲۔ ان کی دوسری مشہور کتاب اصول فقہ پر ہے جس کا نام ''نورالانوار فی شرح المنار'' ہے جو انہوں نے مدینہ منورہ میں اپنے دو ماہ کے قیام کے دوران بغیر کسی کتاب کی مدد کے ۱۱۰۵ھ میں لکھی۔ اس شرح پر متعدد حواشی اور کئی شرحیں لکھی جاچکی ہیں۔ حاجی خلیفہ کی ''کشف الظنون'' کے مطابق ملا جیون کی ''نورالانوار'' امام ابوالبرکات حافظ الدین عبداللہ بن احمد نسفی (متوفی ۷۱۰ھ) کی ''منارالانوار'' کی شرح ہے جو حنفی اصول فقہ پر ایک انتہائی اہم مستند، مختصر اور جامع کتاب ہے۔ امام نسفی کی اس کتاب کی سینکڑوں شروح و حواشی لکھے گئے ہیں۔ برصغیر پاکستان و ہند میں غالباً شیخ سعدالدین دہلوی (متوفی ۸۹۱ھ) کی ''افاضۃ الانوار'' اس کی پہلی شرح ہے جب کہ ملا جیون کی ''نورالانوار فی شرح المنار'' کو علماء و فقہاء میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ شرح آج تک مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں شامل ہے۔ یہ کتاب ملا جیون نے مدینہ منورہ میں اپنے بعض تلامذہ کی فرمائش پر تحریر کی۔

۳۔ ان کی تیسری اہم کتاب ''السوانح'' ہے جو انہوں نے مولانا عبدالرحمٰن جامی کی کتاب ''اللوائح'' کی طرز پر اپنے دوسرے سفرِ حرمین کے دوران ۱۱۱۲ھ میں لکھی۔

۴۔ ان کی چوتھی کتاب ''آداب احمدی'' ہے یہ کتاب انہوں نے سیرت و سلوک کے موضوعات پر تصنیف کی۔

۵۔ ان کی پانچویں کتاب ''مناقب اولیاء'' ہے۔ یہ کتاب انہوں نے عمر کے آخری حصہ میں لکھی اور اس میں اپنے احوال بھی رقم کر دیئے۔

۶۔ ان کی چھٹی کتاب ''انوار القرآن و ازھار القرآن'' ہے۔

ملا جیون کی ''شرح منارالانوار'' کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ ابوالبرکات النسفی کی مشہور تصنیف ''منارالانوار'' کی شرح ملا جیون نے لکھی ہے۔ اپنی اس شرح کے دیباچے میں ملا جیون لکھتے ہیں کہ ''منارالانوار'' کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ یہ شرحیں یا تو بہت طویل اور اکتا دینے والی ہیں یا بہت ہی مختصر اور مبہم ہیں۔

شرح ''منارالانوار'' کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ملا جیون جب مدینہ منورہ گئے اور اس کتاب کے موضوع پر تقریریں کیں تو علماء نے اُن کو بہت داد دی

اور یہ اصرار کیا کہ وہ ان تقریروں کو زیادہ مفصل اور مرتب شکل دے کر ''منارالانوار'' کی مکمل شرح قلم بند کریں۔ چنانچہ مدینہ میں اپنے قیام کے دوران ہی میں ملاجیون نے یہ شرح مکمل کر لی۔ ہندوستان میں اس شرح کی بھی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

ملاجیون کی تصنیفات بالخصوص ان کی ''تفسیر احمدی'' خصوصی توجہ کی مستحق ہے، اس لئے کہ یہ کتاب قرآن حکیم کی ان آیات کی تفسیر ہے جن سے فقہی مسائل اور شرعی احکام کا استنباط ممکن ہے۔ تفسیر احمدی کے بارے میں ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کے مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے لکھا ہے کہ ''ملاجیون کی یہ کتاب ابوبکر ابن العربی اندلسی کی ''احکام القرآن''، امام ابوبکر جصاص کی ''احکام القرآن'' اور امام غزالی اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام وغیرہ کی تصانیف کی یاد کو تازہ کرتی ہے۔ ملاجیون کی یہ کتاب اس لحاظ سے ابن العربی کی ''احکام القرآن'' سے مماثلت رکھتی ہے کہ انہوں نے ایک تو آیات سے فقہی مسائل اور شرعی احکام کے استنباط پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آیات کا پس منظر اور ان کی لفظی تشریح بھی پیش کی ہے۔''

ملاجیون کی تفسیر احمدی کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد اپنے تحقیقاتی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب پورے قرآن کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس میں صرف ان آیات کی تفسیر بیان کی گئی ہے جو اوامر ونواہی سے متعلق ہیں۔ اس کے دیباچے میں ملاجیون نے لکھا ہے کہ ''اب تک کسی شخص نے ایسی آیات جمع کرنے اور اُن کی تفسیر لکھنے کی کوشش نہیں کی ہے جن سے احکام اخذ کیے جاتے ہیں۔'' انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''لڑکپن میں یہ سُن رکھا تھا کہ امام غزالی نے اس قسم کی پانچ سو آیات جمع کی ہیں مگر جب اُن کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ بیان درست نہیں۔'' چنانچہ خود انہوں نے اس کام کا آغاز کیا تو اُن کی عمر سولہ برس تھی۔ جب یہ مکمل ہوا تو وہ اکیس برس کے تھے اور اس کے چھ سال بعد انہوں نے اس پر نظرِ ثانی کی۔

ملاجیون نے اپنی کتاب ''تفسیر احمدی'' کے آغاز میں اُن تمام آیات کی فہرست دی ہے جن سے احکام اخذ کیے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ایک دوسری فہرست دی ہے جس میں اُن احکام کی نوعیت بھی واضح کی ہے۔ قرآن حکیم کی جن سورتوں میں احکام نہیں ہیں اُن کو ''خالیة عن الاحکام'' شمار کیا گیا ہے۔

ملا جیون نے تفسیر احمدی کا آغاز سورۃ بقرۃ کی ستائیسویں آیت مبارکہ سے اس طرح کیا ہے:

"هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً"

ترجمہ: وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ جو روئے زمین پر ہے، پیدا کیا۔

اس آیت مبارکہ سے استنباط کیا گیا ہے کہ "ان الاباحة اصل فی الاشیاء" یعنی اشیاء میں اباحت اصل ہے۔ آخری جزء میں سورۃ اعلیٰ سے لے کر آخر تک تمام سورتیں احکام سے خالی ہیں۔ سوائے سورۃ الکوثر کے جس کی تفسیر کرتے ہوئے ملا جیون نے حوض کوثر کے وجود کو بھی ثابت کیا ہے۔

سلطنت مغلیہ کے تاج دار شاہجہان اور اورنگ زیب عالمگیر اور ان کا بیٹا شاہ عالم ملا جیون کا حد درجہ ادب و احترام کرتے تھے۔ وزراء، امراء اور تمام اراکین سلطنت ان کے عقیدت مند تھے لیکن ملا صاحب نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار نہیں کی اور نہ انہوں نے اپنے آبائی قصبہ اور مولد امیٹھی ضلع لکھنو اور اپنے مسکن جونپور کی سکونت کو ترک کیا بلکہ ان دونوں بستیوں سے اُسی طرح رغبت اور لگاؤ رکھا جس طرح اورنگ زیب عالمگیر کا اتالیق بننے سے پہلے انہیں یہ بستیاں عزیز تھیں۔ ان کا زیادہ تر قیام ان دو بستیوں یعنی قصبہ امیٹھی اور جونپور ہی میں رہا۔ دہلی میں حاکم جونپور کے اصرار پر اورنگ زیب عالمگیر کی تعلیم کے سلسلے میں مقیم رہے۔ دوبار زیارت حرمین اور حج کے لئے سرزمین حجاز میں گئے۔ علاوہ ازیں اجمیر اور لاہور کا سفر اختیار کیا۔

علامہ مخدوم احمد ملا جیون نے ۱۱۳۰ھ میں دہلی میں وفات پائی اور اپنے اسلاف امیٹھی کے ساتھ مدفون ہوئے۔

شاہ عنایت سندھی

شاہ عنایت اللہ سندھ کے اکابر مشائخ اور جید علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ شاہ عنایت سندھی شاہ عنایت قادری لاہوری کی طرح علومِ ظاہری و باطنی کے ماہر اور شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ انتہائی نیک و پارسا، زاہد و عابد اور صاحب علم وفضل تھے۔ وہ ایک مردِ مجاہد تھے۔ حق گوئی و بے باکی اور بہادری و شجاعت میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے میں قابلِ قدر شہرت وعظمت حاصل کی۔ ان کے حلقۂ ارادت میں ہزاروں جاں نثار شامل تھے۔ ان کے علم وفضل اور روحانی کمالات کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تشنگانِ علم اور طالبانِ حق جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور علمی و روحانی طور پر سیراب وفیض یاب ہوکر جاتے تھے۔

ان کا نام ونسب یوں ہے:

صوفی شاہ عنایت اللہ بن مخدوم فضل اللہ بن مُلّا یوسف بن مُلّا شہاب الدین بن مُلّا رجب بن مخدوم صدو لنگاہ۔ ان کے مورثِ اعلیٰ مخدوم صدو لنگاہ اپنے زمانے کے نامور بزرگ تھے۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ''تاریخ سندھ'' کی جلد دوم میں ان کے احوال بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ صوفی شاہ عنایت اللہ نہایت جلیل القدر درویش تھے۔ حق کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ دکن پہنچ کر شاہ عبدالملک کے مرید ہوئے اور طریقت کی تمام منازل طے کیں۔ علوم ظاہری کی تکمیل شاہ غلام محمد سے شاہجہان آباد میں جا کر کی۔ شاہ غلام محمد علوم ظاہری میں ان کے استاد تھے مگر شاہ غلام محمد نے سلوک کی تعلیم شاہ عنایت اللہ سے حاصل کی اور ان کی زیرِ نگرانی سلوک کی منزلیں طے کیں اور جب شاہ

عنایت اللہ وطن واپس آئے تو شاہ غلام محمد بھی ان کے ساتھ ٹھٹہ آ گئے۔ شاہ غلام محمد نے شیخ کی ارادت میں بعض ایسے طریقے اختیار کئے جو بعض علماء کے نزدیک احکام شریعت کے مطابق جائز نہیں تھے۔ مثلاً وہ اپنے شیخ کو سجدۂ تحیت کرتے تھے۔ لوگوں نے انہیں اس پر ٹوکا تو شاہ عنایت نے انہیں واپس شاہجہان آباد جانے کا حکم دیا اور خود پرگنہ بنورہ میں موضع جھوک عرف میراں پور میں اپنے مریدین و معتقدین سمیت آ کر مقیم ہو گئے۔ جہاں ان کا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔

شاہ عنایت اللہ کی پُرکشش روحانی شخصیت، ان کے زہد و تقویٰ اور ان کی تاثیرِ کلام کی بدولت ان کا حلقۂ ارادت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اردگرد کے علاقوں کے دو حلقوں میں جذبۂ رقابت پیدا ہو گیا۔ ایک حلقہ زمینداروں کا تھا اور دوسرا قریبی موضع بلوی کے سادات کا تھا جن کے مرید کثیر تعداد میں شاہ عنایت اللہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ یہ حضرات شاہ عنایت اللہ کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے ناظم ٹھٹہ کے پاس جا کر شکایات کیں۔

میر علی شیر قانع نے ''تحفۃ الکرام'' میں ان افراد کے نام دیئے ہیں جنہوں نے شاہ عنایت اللہ کے خلاف ناظم ٹھٹہ کے پاس شکایات کی تھیں۔ زمیندار شکایت کنندگان سے قطع نظر سادات بلوی مخالفت میں بہت زیادہ سخت تھے۔ اس زمانے میں لطف علی خان ٹھٹہ کا ناظم تھا اور سادات بلوی کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے تحقیقات کئے بغیر حکم صادر کر دیا کہ سادات بلوی خود ہی شاہ عنایت اللہ سے نمٹ لیں۔ ناظم کا اشارہ پا کر وہ سادات بے لگام ہو گئے اور انہوں نے شاہ عنایت کی خانقاہ پر حملہ کر کے بہت سے بے گناہ درویشوں کو شہید کر دیا۔ ان کے وارثوں نے جب استغاثہ کیا تو حکومت کے فیصلے کے مطابق قاتلوں کی اراضی مقتولوں کے وارثوں کو مل گئی۔

لطف علی خان کی جگہ ۱۱۲۸ھ ۱۷۱۶ء میں نواب اعظم خان ٹھٹہ کا ناظم مقرر ہوا تو شاہ عنایت کے مخالفین کی باتوں سے متاثر ہو کر ان کی امداد کے لئے تیار ہو گیا اور اس نے شاہ عنایت کی خانقاہ سے متصل ان زمینوں پر محصول لگا دیا جن کا محصول معاف ہو چکا تھا۔ شاہ عنایت نے نئے ناظم سے جا کر کہا کہ جب یہ محصول بادشاہ کی جانب سے معاف ہو چکے ہیں تو ان کی وصولی کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ ناظم برہم ہو گیا اور اس نے مرکز میں لکھ بھیجا کہ شاہ عنایت اور ان کے مرید سرکاری محصول ادا نہیں کر رہے ہیں اور وہ

آمادۂ بغاوت دکھائی دے رہے ہیں۔ وہاں سے حکم ملا کہ اس فتنے کو فرو کیا جائے۔ جیسے ہی یہ حکم اعظم خان کو ملا اس نے شاہ عنایت کی خانقاہ کو محاصرے میں لے لیا جو چار ماہ کے طویل عرصے تک جاری رہا۔ شاہ عنایت کے پاس محاصرین سے مقابلے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ ان کے وفادار جاں نثار مریدرات کو نکلتے اور شب خون مار کر محاصرے کو توڑنے کی کوشش کرتے، اس طرح اعظم کی فوج کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ تصادم کی یہ صورت کافی عرصے تک جاری رہی۔ درویشوں کی شکست کے باوجود جنگ باقاعدہ طور پر ختم نہیں ہوئی اور درویش وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتے رہے۔

جنگ کی اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے اعظم خان نے ایک چال چلی۔ اس نے ۹ صفر ۱۱۲۰ھ کو شاہ عنایت کے سامنے صلح کی پیشکش کی جسے شاہ صاحب نے منظور کر لیا۔ چنانچہ روٗسائے سندھ کی موجودگی میں صلح کا معاہدہ ہوا کہ درویشوں کے جان و مال کو نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔ اس صلح کے بعد شاہ صاحب کا ایک روز اعظم خان کے پاس جانا ہوا تو اس نے شاہ صاحب کو گرفتار کر لیا، جس پر معلوم ہوا کہ صلح نامہ محض ایک دھوکا تھا۔ اعظم خان نے شاہ صاحب سے سوال کیا کہ بتاؤ تم نے حکومت کے خلاف بغاوت کیوں کی تھی؟ شاہ صاحب نے جواب میں قطعہ پڑھا۔

آں روز کہ توسنِ فلک زیں کردند
آرائش مشتری ز پرویں کردند
ایں بود نصیبِ ما زدیوانِ قضا
ما را چہ گنہ قسمتِ ما ایں کردند

شاہ صاحب کے اس قطعہ کے جواب میں اعظم خان کی طرف سے اس کے ایک مصاحب محمد رضا نے یہ شعر پڑھا۔

دوست بیدار بشو عالم خواب است ایں جا
حرفِ بیہودہ مگو پائے حساب است ایں جا

شاہ صاحب نے جواب میں بلا توقف یہ شعر پڑھا

در کوئے نیک نامی ما را گزر ندا دند
گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

شاہ صاحب کی اس غیر معمولی جرات اور بے مثال فہم و فراست کو دیکھ کر اعظم خان

بہت حیران ہوا اور اس نے شاہ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ اب تم اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جس کے جواب میں شاہ جواب نے فرمایا:

محبِ حق کے لئے سزا وہی حیثیت رکھتی ہے جو سونے کے لئے آگ!

اعظم خان نے ندامت و شرمساری کے عالم میں کہا کہ تم نے بدنامی کیوں مول لی اور مصیبت کے تیر کا نشانہ بننے پر کیوں آمادہ ہوئے؟ اعظم خان کی عیاری و مکاری کی ان باتوں کے جواب میں یہ شعر پڑھا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اعظم خان نے سوال کیا کہ تم نے بادشاہ کی اطاعت سے باہر قدم کیوں رکھا حالانکہ ''اولوالامر'' کی اطاعت کا حکم قرآنِ کریم میں موجود ہے۔

شاہ عنایت نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

ما مریداں رو بسوئے کعبہ چوں آریم چوں
رو بسوے خانۂ خمار دارد پیرِ ما

اعظم خان نے کہا اب آرزوؤں میں ناکام ہونے پر افسوس کرنے کا کیا فائدہ؟

شاہ عنایت نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

من از آں دم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق
چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

نواب اعظم خان نے شاہ عنایت کو زنداں میں ڈال دینے کا حکم دیا۔ جس پر شاہ عنایت نے بے اختیار یہ شعر پڑھا۔

ساقیا برخیز و در دہ جام را
خاک بر سر کن غم ایام را

صوفی شاہ عنایت اللہ کو کچھ عرصہ زنداں میں رکھنے کے بعد ۱۵ صفر ۱۱۳۰ھ۔ ۷ جنوری ۱۷۱۸ء کو شہید کر دیا گیا۔ آخری وقت میں ان کی زبان پر یہ شعر تھا:

رہانیدی مرا از قیدِ ہستی
جزاک اللہ فی الدارین خیرا

جلاد نے تلوار گردن پر ماری تو شاہ عنایت اللہ چار تکبیریں کہہ کر واصلِ حق ہوئے۔

سرزمین سندھ کے اس منفرد و ممتاز روحانی بزرگ کے حالاتِ زندگی اور ان کی شہادت کے دردناک واقعہ کی تفصیلات میر علی شیر قانع ٹھٹوی کی تالیف ''تحفۃ الکرام'' اور ''مقالات الشعراء'' میں ملتی ہیں۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ''تاریخ سندھ'' کی جلد دوم میں شاہ عنایت کی شہادت کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ نواب اعظم خان پہلے ہی ملک میں غلہ گراں ہونے کی وجہ سے بدنام تھا۔ شاہ عنایت کی شہادت نے اسے اَور ملک میں اور زیادہ بدنام اور رُوسیاہ کر دیا جس کی وجہ سے وہ ۱۱۳۱ھ... ۱۹۔۱۷۱۸ء میں ٹھٹہ کی حکومت سے معزول ہوا۔ نواب اعظم خان بن صالح بن فدائی خان جہان بہادر عرف میر بابا کوکلتاش کا پوتا جو کہ خاندان سادات میں سے تھا، ۱۱۲۸ھ۔۱۷۱۶ء پانچویں سال جلوس فرخ سیری میں میر لطف علی خان کے موقوف ہونے پر ٹھٹہ کا حاکم بن کر آیا تھا۔ وہ اپنے چار سالہ دور میں سادات بلوی جو شاہ عنایت اور ان کے مریدوں کے جانی دشمن تھے، کی بے جا حمایت کرتا رہا اور ان کو خوش کرنے کے لئے تین ساڑھے تین سال تک مسلسل و متواتر شاہ عنایت اور ان کے درویشوں پر ظلم و تشدد کرتا رہا اور بالآخر اپنے برے انجام کو پہنچا۔

فاضلِ اجل، مجاہدِ سندھ، عارف باللہ صوفی شاہ عنایت اللہ نے ۱۱۳۰ھ ۔۱۷۱۸ء میں جامِ شہادت نوش کیا۔

عبدالقادر بیدل

ابوالمعانی میرزا بیدل کا شمار برصغیر کی مشہور و معروف دینی و علمی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ایک عارف کامل اور فارسی کے شاعر بے بدل ہونے کی بناء پر میرزا بیدل کو پورے عالم اسلام بالخصوص ایران، افغانستان، ترکی اور وسط ایشیا کے متعدد مسلم ملکوں میں گزشتہ دو صدیوں کے دوران میں قابل قدر شہرت و مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس لیے کہ دو سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد ان کی شاعری آج بھی زندہ و پائندہ ہے اور اُن کے حیات بخش اور رُوح پرور افکار اپنی طاقت و توانائی، کشش و جاذبیت اور ایمان افروز پیغام کے باعث دنیا بھر کے مسلمانوں کی ذہنی وفکری راہنمائی کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال اور مرزا غالب جیسے عظیم المرتبت شاعروں نے میرزا بیدل سے نہ صرف راہنمائی حاصل کی ہے بلکہ دنیائے شعروسخن اور عالم فکروفن کے یہ دونوں آفتاب و ماہتاب میرزا عبدالقادر بیدل کو اپنا مرشد کامل تسلیم کرتے ہیں۔ پھر بیدل صرف شاعر ہی نہیں بلکہ حکمائے اسلام میں اُن کا مقام اتنا بلند ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ برگساں جیسے فلسفی کے افکار بھی بیدل کے کلام میں ہیں۔ غالب نے انہیں ''قلزم فیض'' اور ''محیط بے ساحل'' قرار دیا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی اُن کا جہاں بھی ذکر کرتے ہیں انہیں استادالکل حضرت بیدلؒ لکھتے ہیں۔

غرض کہ ارباب علم و دانش، مؤرخین، تذکرہ نویس اور صاحبان کمال شعراء میرزا عبدالقادر بیدل کے تبحر علمی اور اُن کے روحانی مرتبہ و مقام کے قائل ہیں اور اُن کے شاعرانہ کمالات، قدرت اظہار و بیان، کثرتِ کلام اور اُن کے پیش کردہ افکار ونظریات کی گہرائی و گیرائی کے باعث ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ

حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی ''خزانہ عامرہ'' میں لکھتے ہیں کہ ''شاعرانہ تخیل'' کے لحاظ سے میرزا عبدالقادر عظیم آبادی مے کدہ سخن دانی کے پیر مغاں ہیں اور ''حکیمانہ تفکر'' کے حوالے سے انہیں وہی رتبہ حاصل ہے جو افلاطون کو حکمائے یونان میں حاصل ہے... کس میں یہ طاقت ہے کہ اُس طرز کو جو اُن کی اپنی ہے، پہنچ سکے اور کس میں یہ قوت ہے کہ وہ کمان جو بیدل ہی کا زورِ بازو کھینچ سکتا ہے کوئی اور کھینچ سکے۔ چنانچہ اس دعویٰ کا اعلان بابانگ دہل بیدل خود کرتے ہیں کہ:

'اے مدعی! طرزِ بیدل کا دعویٰ نہ کر، بھلا جادو بھی معجزہ کی کیفیت پیدا کر سکتا ہے؟''

مؤلف ''خزانہ عامرہ'' کے اس بیان میں پیش کردہ بیدل کے اس دعویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ عباداللہ اختر نے میرزا عبدالقادر بیدل پر اپنی کتاب ''بیدل'' میں لکھا ہے کہ اگرچہ بیدل نے اس تعلّی سے کام نہیں لیا جو شعراء کا عموماً خاصہ ہے مگر کبھی انہیں خود بھی اپنی بلند خیالی کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ اپنے اس بیان کی تائید میں خواجہ صاحب نے بیدل کی غزل کا یہ شعر پیش کیا ہے:

سر بے نیازی فکر را، بہ بلندی نرسانده ام
کہ بجز تتبع نظم من، احدے خیال زمیں کند

میر غلام علی آزاد نے بیدل کے متذکرہ دعویٰ کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

رساند پایہ معنی بہ آسماں نہم
بلندطبع شناسد کلام بیدل را

نیز یہ کہ بیدل کے دماغ میں فقر کا نشہ اس حد تک تھا کہ ان کے دماغ کا جزو بن گیا تھا اور اُن کی روشن دلی اُن کے چراغِ جان کے نور سے جلوہ فروز تھی۔

خواجہ عباداللہ اختر نے مرزا عبدالقادر بیدل کی کتاب ''چہار عنصر'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ میر آزاد نے جو کچھ بیدل کی نسبت لکھا ہے اُس کی تصدیق واقعات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ آغاز شباب میں میرزا صاحب نے اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے شہزادہ محمد اعظم کے ہاں ملازمت کی۔ شہزادے نے جب قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تو میرزا صاحب نے قصیدہ لکھنے کی جگہ اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور ملازمت ترک کر دی۔ میرزا صاحب اہل دولت و ثروت سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ حق تعالیٰ امرائے عصر کو اُن کے آستانہ پر لایا۔ چنانچہ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کے اواخر اور محمد شاہ رنگیلے کے جلوس کے اوائل

تک کے مغل بادشاہوں کے ارکان سلطنت اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ہدیۂ نیاز پیش کرتے رہے۔ جب نواب آصف جاہ جو میرزا صاحب کے شاگردوں میں سے تھا دکن کا حکمران بنا تو اُس نے میرزا صاحب کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ یہاں میرے پاس تشریف لے آئیں تو میرزا صاحب نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا:

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

یعنی اگر مجھے دنیا کا مال و دولت اس غرض سے دیا جائے کہ میں اپنے گوشۂ فقر و قناعت کو چھوڑ کر کسی صاحبِ جاہ کے درِ دولت پر حاضری دوں تو یہ امر ممکن نہیں ہے اس لیے کہ میں نے اپنے پاؤں کو قناعت کی مہندی سے باندھ رکھا ہے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد چہارم (فارسی ادب دوم) کی مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی کی تحقیق کے مطابق میرزا عبدالقادر بیدل صوبہ بہار (بھارت) کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ قوم کے مغل ارلاس تھے۔ (شاہ محمد شفیع نگینوی نے بنگال کے اکبر نگر عرف راج محل کو میرزا بیدل کا مولد قرار دیا ہے۔) میرزا بیدل کے والد قادری المشرب صوفی تھے، بیدل کی صغر سنی میں ہی وفات پا گئے۔ والدہ نے مسجد میں تعلیم شروع کرائی ہی تھی کہ وہ بھی وفات پا گئیں۔ پھر اُن کی کفالت اُن کے چچا میرزا قلندر (متوفی ۱۰۷۵ھ) کے سپرد ہوئی۔ بیدل مکتب میں ''کافیہ'' ختم کر کے ''شرح ملا'' کے اسباق پڑھ رہے تھے کہ اُن کے دو اساتذہ کو بحث و تکرار میں بھڑتے اور آپے سے باہر ہوتے دیکھ کر چچا نے تعلیم ترک کرا دی اور گھر پر اپنی نگرانی میں اساتذۂ فارسی کی نظم و نثر کی تصنیفات کا مطالعہ شروع کرا دیا۔ میرزا قلندر کو فقراء سے بڑی عقیدت تھی۔ اُن کی ملاقات کے لیے جہاں جاتے بیدل کو بھی ساتھ لے جاتے۔ شاہ کمال الدین قادری سے تو خاندان بھر کو شروع ہی سے عقیدت تھی۔ ان کے علاوہ بیدل کو شاہ فاضل، شاہ یکہ آزاد اور شاہ ملوک ایسے کاملین کی صحبت سے مستفیض ہونے کے مواقع ملے۔ چنانچہ اُن کے علم و فضل، اخلاق حسنہ اور باطنی کمالات نے بیدل کی طبیعت پر بہت خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ غرض ماموں میرزا ظریف سے حدیث و تفسیر کی تعلیم حاصل کی اور جوان ہو کر سپہ گری میں شجاعت اور شاعری و تصوف میں کمال پیدا کیا۔

اسلامی علوم میں بیدل کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ڈاکٹر عبدالغنی مزید لکھتے ہیں

کہ بیدل کے ماموں میرزا ظریف تفسیر و حدیث کے ماہر تھے۔ بسلسلۂ تجارت اڑیسہ گئے تو بیدل کو بھی ساتھ لے گئے اور تفسیر و حدیث کا درس دیتے رہے۔ کٹک میں ایک ولی اللہ شاہ قاسم ھواللہی سے ملاقات ہوئی جن کی صحبت میں بیدل کے سوزِ دل میں اور بھی اضافہ ہوا اور عجیب و غریب مکاشفات ہوئے۔ بہار میں قیام کے دوران میں کم سنی کے باوجود بیدل شہزادہ شجاع کے لشکر سے وابستہ ہو گئے اور جب جنوری ۱۶۵۹ء میں الہ آباد کے قریب شاہ شجاع کو اورنگ زیب نے شکست دی تو دوسرے فوجیوں کے ساتھ بیدل بھی کئی روز تک جنگلوں میں پھرتے رہے۔

میرزا عبدالقادر بیدل کو بچپن ہی سے حصول علم سے گہرا شغف تھا۔ ۱۰۷۵ھ مطابق ۱۶۶۴ء تک میرزا اڑیسہ میں مقیم رہے۔ پھر اکبر آباد اور دہلی میں وارد ہوئے مگر اکیس بائیس سال تک کہیں مستقل سکونت اختیار نہیں کی۔ اسی دوران شادی کر کے شہزادہ اعظم شاہ کے ملازم ہو گئے۔ پانصدی کا منصب ملا۔ لیکن جب قصیدہ لکھنے کی فرمائش ہوئی تو مستعفی ہو گئے اور پھر عمر بھر فقر و تصوف اور جذبۂ دل کے اظہار کے لیے شاعری سے سروکار رکھا۔ کتب بینی کا شوق تھا۔ چنانچہ متقدمین و متاخرین و اساتذہ کے کلام کو دقتِ نظر سے پڑھنے کے علاوہ شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ الرئیس بوعلی سینا کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور طب، فلکیات اور نجوم ایسے علوم میں بھی دسترس حاصل کی۔

دہلی کے ایک صاحب کشف و کرامات بزرگ شاہ کابلی کے روحانی تصرفات نے میرزا بیدل کو بڑا متاثر کیا۔ جہاں تک اُن کے دوست احباب کا تعلق ہے شروع ہی میں نواب عاقل خان رازی اور اُن کے داماد نواب شکراللہ خان اور ان دونوں حضرات کے بیٹوں سے ان کے مخلصانہ روابط پیدا ہو گئے جو عمر بھر قائم رہے۔ ان روابط کی بنیاد امیال و عواطف اور اخلاق و کردار میں مماثلت اور موافقت پر رکھی گئی تھی۔ نواب عاقل خان رازی اور نواب شکراللہ خان دونوں تصوف میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ میرزا بیدل پر ان کی صحبت میں تصوف کے اسرار و رموز منکشف ہوئے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے تحقیقی مقالے جو "اقبال اور بیدل" کے عنوان سے "ماہِ نو" کے استقلال نمبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا، میں لکھا ہے کہ بیدل ایک صوفی مشرب مفکر تھے۔ اُن کے خاندان کے شیخ طریقت مولانا شیخ کمال الدین قادری تھے۔ بیدل کے چچا میرزا قلندر بھی شیخ کمال قادری کے مرید تھے۔ چنانچہ انھیں کے ساتھ

بیدل شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ بیدل نے اُس زمانے کے حالات ''چہار عنصر'' میں بیان کیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیدل اُسی زمانے سے سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک اور بزرگ شاہ ملوک اور اُن کی کرامتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ملوک وحدت الوجود کے قائل تھے اور انہوں نے ایک موقع پر مثنوی مولانا روم کے یہ اشعار بیدل کو سنائے تھے:

ایں توئی ظاہر کہ پنداری توئی ہست اندر توئی تو از بے توئی
توئی تو در دیگرے آید دفیں من غلام مرد خود بیں چنیں

شاہ ملوک کے ذکر میں بیدل نے فقر کی تعریف اور فقر کی شان میں یہ شعر لکھے ہیں:

اے بسا روشن دلے کز بے نیاز یہائے شوق
چوں فروغ مہر بر خاک سیاہ افتادہ است
اے بسا آئینہ کز کسوت زنگاریش
یوسفتانے بخلوت گا جاہ افتادہ است
معنیٔ اقبال فکر از غافلاں پوشیدہ اند
ورنہ در ہر خاک چندیں دست گاہ افتادہ است
ہر کجا گرد شکستے سرمہ آراید بچشم
بے تامل نگزری آنجا کلاہ افتادہ است
عالمے محمل بدوش وھم جولاں می کند
کیست تا فہمد کہ منزل ھم براہ افتادہ است

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں صاحب نظر فقیر، قلندر یا مردِ مومن کی جو تشریح کی ہے وہ بیدل کے ان ہی اشعار کی تشریح ہے۔

تیسرے بزرگ شاہ فاضل ہیں جن کا ذکر بیدل بڑی عقیدت اور جذبہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ سترہ برس کی عمر میں بیدل کو شاہ ابوالقاسم ترمذی کا فیضِ صحبت نصیب ہوا۔ اُن کے متعلق بیدل لکھتے ہیں:

''بودیم آنچہ بودیم، او وانمود مارا''

دہلی میں شاہ کابلی سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے کشف و کرامات کے بہت سے

واقعات بیدل نے بیان کیے ہیں۔ غرض بیدل کی تربیت اور سارا ذہنی نشو ونما انہیں بزرگوں اور صوفیوں کی صحبت کا مرہونِ منت ہے۔ اور ان کا تصوف محض رسمی، تقلیدی یا کتابی نہیں ہے بلکہ رائج اور رسمی تصوف کے بارے میں اُن کا ردعمل اس شعر سے واضح ہو جاتا ہے:

در مزاج خلق بے کاری ہوس می پرورد
غافلاں نام فضولی را تصوف کردہ اند

یعنی ایسا تصوف جو مزاج خلق میں ہوس کی پرورش کرے جو قویٰ کے اضمحلال کا باعث ہو، جس سے زندگی میں افسردگی یا پامالی کو فروغ ہو اور جو انسان کو زندگی کے مشاغل اور گہما گہمی سے دور لے جائے ایک فضول مسلک ہے جسے غافلوں نے تصوف کا خوبصورت نام دے رکھا ہے۔ بیدل کا یہی رجحان ہے جس نے انہیں متاخرین ہندی صوفیا سے ممتاز کیا ہے اور جس نے اقبال کو ان کا گرویدہ بنایا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مزید لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر بیدل بھی صوفیا کے ایک طبقہ کی طرح وحدت وجود کے قائل ہیں۔ مختلف تصانیف میں بے شمار اشعار اس مسلک کی تائید میں ملتے ہیں:

عالم ہمہ یک جلوۂ ذات احد است
ایں جا نہ ہیولیٰ نہ صورت نہ جسد است
کثرت آثار چشم وا کردن است
ایں صفر چوں محو شد، ہماں یک عدد است

تخلیق کائنات میں ''عدد'' کی اہمیت کو سب سے پہلے چھٹی صدی قبل مسیح کے یونانی حکیم فیثا غورث نے واضح کیا تھا لیکن اُس کے یہاں مکمل ترین عدد ''چار'' ہے اور وہ کائنات میں ''دوئی'' کا قائل ہے۔ اُس کے نزدیک حیات حیوانی کے علاوہ کائنات میں مختلف صورتوں اور شکلوں میں حیات پائی جاتی ہے اور یہ حیات اپنے مکمل یا نامکمل ہونے کے اعتبار سے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ بہرحال بیدل کی اس رباعی میں وحدت وجود کے مسئلہ کو ایک لطیف پیرایہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اصل حقیقت ایک ''اکائی'' ہے۔ ''واحد'' ہے۔ ہیولیٰ، صورت اور جسد دراصل صرف ''عکس'' یا ''جلوہ'' کا نام ہے۔ پھر سوال ہوگا کہ یہ کثرت کیوں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ

''صفر'' کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ لیکن ''اکائی'' پر اسی صفر کا اضافہ ہو تو ''دس'' کا عدد بن جائے گا۔ پھر اسی طرح صفر بڑھاتے چلے جاؤ۔ سو، ہزار، دس ہزار، لاکھ، دس لاکھ، کروڑ۔ غرض جہاں تک چاہو بڑھاتے جاؤ۔ پھر صفر نکالنا شروع کرو۔ آخر میں اکائی رہ جائے گی۔ جب ہم آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہیں تو آنکھ جو ''صفر'' کی صورت ہے وحدت میں کثرت کے جلوہ کا باعث بن جاتی ہے۔ اگر آنکھ بند کرلیں تو یہ ''صفر'' محو ہو جائے گا اور پھر ایک اکائی باقی رہ جائے گی —— بیدل نے وحدت اور کثرت کے اس تعلق کو بار بار اسی طرح سلجھایا ہے:

بہ شوخی بر نمی آید دماغ ناز یکتائی
من از حیرت فزودم صفر بر اعداد نیرنگش

یا پھر:

وا کردن چشم این قدرم دہ دلہ دارد
بیدل بہ ہمیں صفر فزودست حسابم

میرزا بیدل نے اپنی مثنوی ''محیط اعظم'' میں اس مسئلہ کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ دراصل یہ وہی فکر اور خیال ہے جو اردو میں صوفی شعراء مدت تک پیش کرتے رہے ہیں۔ میر کے اشعار ملاحظہ ہوں:

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس کا ہی ذرہ ظہور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

……☆……

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھا میں کہ اس پردہ میں تو تھا

اس مسلک کی وضاحت کے لیے میرزا بیدل کے دیوان سے کچھ اور اشعار اور اُن کے ساتھ ساتھ اردو شعراء کے ہم معنی اشعار پیش کیے جائے ہیں:

شش جہت آئینہ دار شوخیٔ اظہار اوست
نیست جز مژگاں حجابے را کہ بر داریم ما

حسن مطلق داشتم خودبینم آئینہ کرد
ایں قدر باہم اثر بیہودہ است اوہام را

مرزا غالب نے بیدل کے اسی خیال کو یوں پیش کیا ہے:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

میرزا بیدل فرماتے ہیں:

اے غفلت آبروئے طلب بیش ازین مریز
عالم تمام اوست کرا جستجو کنند
دریاست قطرۂ کہ بہ دریا رسیدہ است
جز ما کس دگر نتواند ہما رسید!
محیط است چوں محو گردد حباب
زخود گم شدن جزد را کل کند

میرزا بیدل کے ان اشعار کے مضامین کو غالب نے یوں باندھا ہے:

''عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا''

نیز دیکھیے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

......☆......

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

غرض میرزا غالب کی طرح اردو کے اور بڑے بڑے شاعروں نے میرزا بیدل سے افکار مستعار لیے ہیں اور بیدل کی آواز اُن بے شمار صوفیہ کرام کے ساتھ مل جاتی ہے جنھوں نے نظریۂ وحدت وجود کے لازمی نتیجے کے طور پر نقشِ جہاں کو طلسم خیالی سمجھا تھا۔ یہ وہ فلسفہ ہے جو بقول اقبال ''بود را نابود گفت'' کی تفسیر ہے۔ اس لیے شاید پہلی نظر میں یہ تعجب ہو کہ اس مسلک کے باوجود میرزا بیدل کیونکر اقبال کے مرشد کامل ہو

سکتے ہیں۔ لیکن ایسے بعض لمحات اقبال پر بھی گزرے ہیں جن کو صوفیانہ تجربات (mystic experiences) سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایسے عالم میں اقبال کو بھی یہ سارا عالم محض ایک طلسم و مجاز، آسمان محض ایک ردائے نیلگوں اور یہ دنیا محض جہان آب و گل نظر آتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقبال نے بیدل کے فلسفہ اور حرکت سے جو اثر قبول کیا ہے وہ اس مسلک میں نہیں بلکہ بیدل کے یہاں انسان کی عظمت، رہبانیت کے خلاف ردعمل، علم کی حقیقت، اصل معرفت، عقل اور جنون، خودداری، خود نگری اور خود شناسی اور سب سے بڑھ کر جدو جہد اور تب و تاب کے جو گوہر ہائے نایاب ہیں اقبال انھیں کے خریدار ہوئے ہیں اور اسی متاع بے بہا سے انہوں نے اپنی دکان سجائی ہے۔

میرزا عبدالقادر بیدل نے قرآنی تعلیمات کے مطابق جہاں حیات انسانی کے کم و بیش تمام شعبوں اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہاں کائنات کے اسرار و رموز کو بھی سمجھنے اور سمجھانے کی قابل قدر علمی و تحقیقی کوششیں کی ہیں۔ چنانچہ خواجہ عباداللہ اختر اپنی کتاب ''بیدل'' میں میرزا بیدل ہی کی تصنیف ''چہار عنصر'' کے حوالوں کے ساتھ لکھتے ہیں: ''ہر ایک شخص کی فطرت میں خاص خاص قابلیت فیضِ ازلی ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے آنحضرتؐ کے دعویٰ رسالت کی فوراً تصدیق کی لیکن عمر بن ہشام قریشی اور مکی ہونے کے باوجود منکر ہی رہا، اس لیے ابوجہل کہلایا۔ جیسا کہ حافظ شیرازی کے اس شعر سے ظاہر ہے:

حسن زبصرہ، بلال از حبش صہیب از شام
زخاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجیست

میرزا بیدل جو واقعہ بیان کرتے ہیں اس سے نتائج اخذ کرنے کے علاوہ حکیمانہ بحث بھی کرتے ہیں۔ اکثر لوگ وظائف و اوراد اور تعویذ وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے۔ لیکن بیدل نے اپنے اشعار میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ''سخن کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ مگر سخن گو' کی فطری قابلیت اس میں کارفرما ہوتی ہے۔ یہ موضوع نفسیات کا ہے۔ انسان کو حیوان ناطق اسی لیے کہتے ہیں کہ دیگر طبقات پر اُس کو ''سخن'' کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔ لیکن انسانوں میں بھی تاثیر سخن کے مختلف مدارج ہیں۔ گفتگو تو سبھی کرتے ہیں لیکن ہر شخص کی باتوں میں تاثیر نہیں ہوتی جب کہ بعض اشخاص کی تقریر و تحریر سے ہزاروں

لاکھوں افراد متاثر ہو کر انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔ بیدل نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کا تعلق علم نفسیات و ارتقاء وغیرہ سے ہے۔ یہ بحث دقیق ہے اور بیدل نے جن الفاظ میں بحث کی ہے وہ ادق ہے۔ چنانچہ میرزا عبدالقادر بیدل کے نظریہ حکمت کو خواجہ عباداللہ اختر نے عام فہم اور آسان زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

میرزا بیدل لکھتے ہیں کہ کل کائنات "کلمات" ہے۔ ارشاد خداوندی ہے

"قل لو کان البحر مداداالکلمت ربی لأیة"

بہر رنگ آیات حرف است و بس
نفس در عبارات حرف است و بس
حقیقت کہ آں سوئے مادمن ست
چو بے پردہ شد حرف پیراہن ست
چہ مقدار بے تاب اظہار شد
کہ آخر در انساں نمودار شد

تمام کائنات ایک کتاب ہے۔ حروف ہیں یا کلمات ہیں۔ اشیائے کائنات یا اُن کے تصورات جو ہمارے قلب میں ہیں اور جن کو ہم خیالات سے موسوم کرتے ہیں۔ فی الحقیقت حروف ہیں جن کے ذریعے اشیائے کائنات ہم سے ہم کلام ہو کر اپنا مافی الضمیر واضح کرتی ہیں۔ کتابِ کائنات مصور ہے اور یہ تصویری حروف یعنی اشیاء کی صورتیں ہم دیکھتے اور سنتے ہیں۔ "یہ کائنات عالم غیب و شہادت ہے۔ عالم غیب میں یہی سخن حقیقت ہے اور شہادت میں مجاز سے موسوم ہے۔"... اسی سے جہان زندہ ہے اور یہی روح کائنات ہے۔ یہ اور اس نوع کے بعض مسائل اقبال کے فکری نظام سے ہم آہنگ نہیں ہیں لیکن ان مسائل سے قطع نظر اقبال اور بیدل کے افکار میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً بیدل آپ کو شرع کی حدود اور پابندیوں سے آزاد نہیں سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جو قدرت عمل اور طاقت رکھنے کے باوجود تن آسانی، کاہلی اور آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں یا دکھاوے کے لیے دیوانے اور مجذوب بنتے ہیں کہ احکام شرعیہ کی پابندی سے معذور سمجھے جائیں، اس ضمن میں بیدل اپنے مرشد طریقت مولانا شیخ کمال الدین قادری کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں:

تانہ گردند خاک جادۂ شرع   گر ہمہ منزل اند گمراہ اند

گویا کہ بیدل کا صوفیانہ مسلک دین اسلام سے کوئی مختلف چیز نہیں اور نہ شریعت و طریقت کوئی ایسے دو راستے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ الگ ہوں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنے مقالے ''اقبال اور بیدل'' کے آغاز میں لکھتے ہیں:

اقبال کے ذہنی اور فکری ماخذات کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے... جن راہبروں نے اقبال کی راہنمائی کی ہے اُن میں ایک میرزا عبدالقادر بیدل بھی ہیں۔ اقبال نے مولانا روم کو جا بجا اپنا مرشد اور ہادی و راہنما بتایا ہے۔ پیر رومی کے علاوہ کم ہی لوگ ایسے ہیں جنہیں اقبال نے اس اعزاز کا مستحق سمجھا ہے۔ اور ان میں ایک میرزا بیدل بھی ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا ہے مگر فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا ہے مرشد کامل نے راز فاش
با ہر کمال اند کے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ، بے جنوں مباش

آخری شعر میرزا بیدل کا ہے۔ علامہ اقبال کے ان اشعار کو نقل کرنے کے بعد ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ ''اس سے ظاہر ہے کہ اقبال صرف بیدل کی شاعری، اُن کے مخصوص انداز بیاں یا طرز ادا سے ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ اُن کی فلسفۂ حیات کے بھی قائل ہیں۔''

علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں بیدل کو نہ صرف مرشد کامل کہا ہے بلکہ اپنے اشعار کے آخر میں اُن کا ایک ایسا شعر بھی منتخب کر کے لکھ دیا ہے جس میں زندگی کا ایک

بہت بڑا اصول بیان کیا گیا ہے۔ پھر علامہ اقبال نے اپنے مرشد کامل میرزا بیدل کے اس شعر میں پیش کردہ اصولِ زندگی کو نہ صرف ایک راز کہا ہے بلکہ علامہ نے اس شعر کے مفاہیم کو اردو میں یوں نظم بھی کر دیا ہے:

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

میرزا بیدل احترام آدمیت ہی کے نہیں بلکہ عظمت آدم کے قائل ہیں۔ اس کا اندازہ اُن کے ان اشعار سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

انسان کہ فلک ہاست سرافگندۂ او
در حیرت او گم است دانندۂ او
دارد خاصیتے کہ در خارج و ذہن
ہر چیز کہ آفریدہ شد بندۂ اوست

یعنی ہر چیز جو پیدا کی گئی انسان کی غلام ہے۔ عظمتِ آدم اور منصب آدم کا یہ وہی نغمہ ہے جس کی بازگشت ہمیں ''اسرار و رموز'' اور اقبال کے سارے کلام میں ملتی ہے۔ میرزا بیدل کے کلام کے بہت سے عناصر میں اقبال سے فکری ہم آہنگی ملتی ہے۔ مثلاً معرفت خودی۔ ''بانگ درا'' کا وہ بند ملاحظہ کیجیے جو اس مصرع سے شروع ہوتا ہے:

''آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا''

اس بند کے مطالعہ کے بعد بیدل کی اُس غزل کو پڑھیے جس کا مطلع یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

اسی طرح فقر کی عظمت، علم ظاہر اور علم باطن کی حقیقت، طلب اور سوال کی مذمت، استغناء و بے نیازی، عزت نفس و خودداری، احترام آدمیت، آزادی اور خود اعتمادی ایسے بہت سے مضامین ہیں جو اقبال اور بیدل کے یہاں مشترک نظر آتے ہیں۔

میرزا عبدالقادر بیدل پر خواجہ عباداللہ اختر کی کتاب ''بیدل'' ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ خواجہ صاحب نے اپنی اس تحقیقی کتاب کا ''عرضِ حال'' کے عنوان سے

دیباچہ لکھا ہے۔ چنانچہ اس دیباچے کا آغاز انہوں نے ان کلمات سے کیا ہے:

''ابوالمعانی میرزا عبدالقادر بیدل کا کلام میرے زیرِ مطالعہ گزشتہ زائد از چالیس سے رہا ہے۔ اگرچہ ان کے افکار کی بلندی تک میری رسائی نہیں لیکن جو کچھ اور جہاں تک میرے فہم میں آیا پیش کر رہا ہوں۔ یہ وہ بلند پایہ شخصیت ہے جسے میرزا اسداللہ خان غالب ایسے ''بحرِ بیکراں'' اور ''محیط بے ساحل'' اور ہمارے علامہ اقبال ''مرشد کامل'' کہتے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے بھی دادِ سخن دی ہے۔ ان کا نظیر متقدمین میں چند ہستیاں ہیں۔ متاخرین میں اُن کا مثل بمشکل پیدا ہوگا۔''

خواجہ صاحب نے ''عرضِ حال'' ہی کے تحت میرزا بیدل کی شخصیت، اُن کی عہد آفرین شاعری اور حیات بخش افکار کے بارے میں حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی رائے بھی پیش کر دی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''ایک دوست نے مجھے بتایا کہ علامہ اقبال کی صحبت میں سنا کہ فرمایا 'بیدل اپنی طرز کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔' جو جدت اور ایجادیں اُن کے کلام میں ہیں وہ اُن کے ہم عصر شعراء میں نہیں۔ اُن کے سامنے متقدمین کا کلام بھی ایک نمونہ تھا اور اُسی کا اتباع اُن کا نصب العین تھا اس لیے ''خارج از آہنگ'' کہتے۔ میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ یہ ان حضرات کا صریح ظلم ہے۔ بات یہ ہے کہ بیدل نے متقدمین کی پرانی لکیر جو متاخرین عرصہ سے پیٹتے چلے آ رہے تھے چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی۔ جس سے ہم عصر شعراء ناواقف تھے۔ انہیں نئی نئی ترکیبیں بھی اختراع کرنا پڑیں جس نے زبان میں اور وسعت پیدا کی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ خیالات کے اظہار کا آلہ زبان ہی ہوتی ہے۔ جب اس کا دامن تنگ ہوا تو وسعتِ خیال کے لیے اسے پھیلانا پڑتا ہے۔ بیدل کو مشکل پسند سمجھنے کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔ لیکن قصور فہم کا ہے۔ اس لیے کہ جب تک طبائع اُن کے کلام سے مانوس نہ ہوں بیدل کا

سمجھنا بھی مشکل ہے ... ایک دفعہ لاہور کے کالجوں کے طلباء نے ''یوم غالب'' منایا۔ علامہ اقبال زندہ تھے۔ ایک وفد باریاب ہوا اور شمولیت کی دعوت دی۔ فرمایا 'مناسب تھا کہ تم یوم بیدل مناتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ غالب کا کلام غلام آباد ہندوستان میں مقبول ہے اور بیدل کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ لیکن بیدل کا کلام آزاد ممالک، جن میں افغانستان بھی شامل ہے، میں تلاوت ہو رہا ہے اور غالب کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔' پھر فرمایا 'غالب کا تصوف افسردگی پیدا کرتا ہے اور بیدل کا تصوف حیات بخش تروتازگی کے ساتھ ابھارتا ہے۔''

''بیدل کے تعارف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ علامہ اقبال اُن کی مداح ہیں۔''

یہ بیان ہو چکا ہے کہ خواجہ عباداللہ کی تحقیقی کتاب ''بیدل'' ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی مثالیں دے کر یہ امر ثابت کیا گیا ہے کہ علامہ اقبال اور میرزا غالب نے نہ صرف بیدل کے کلام سے بھرپور استفادہ کیا ہے بلکہ اردو کے ان دو عظیم ترین شاعروں نے بیدل کے فارسی اشعار کے معانی و مفاہیم کو اپنی اپنی جگہ، اپنے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق اپنے اشعار میں پیش و بیان بھی کیا ہے اور مشرق کے ان دونوں صاحب کمال دانش وروں اور اپنے اپنے عہد کے نمائندہ مفکروں نے افکار بیدل ہی سے اپنے اپنے فکری نظام کو طاقت و توانائی اور تازگی و شگفتگی بہم پہنچانے کے علاوہ اپنے کلام کو اعلیٰ و ارفع احساسات و جذبات، نو بہ نو ترکیبات و اختراعات، شعری محاسن اور فنی کمالات سے آراستہ کیا ہے۔

خواجہ عباداللہ اختر کی تحقیق سے متاثر ہو کر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنا مقالہ ''اقبال اور بیدل'' قلم بند کیا جو ۱۹۵۴ میں ''ماہ نو'' کے استقلال نمبر میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے فکری نظام پر میرزا بیدل کے کلام اور افکار کے اثرات تک محدود ہے۔ بیدل کے افکار اور فنی کمالات نے اقبال کے علاوہ اردو کے جن دوسرے عظیم المرتبت شاعروں کے فکر و فن پر جو اثرات مرتب کیے ہیں صدیقی صاحب نے اُن کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میر و سودا اور غالب و مومن سبھی

میرزا بیدل کے خوشہ چین ہیں جیسا کہ عباداللہ اختر نے لکھا ہے کہ "اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ تمام شعراء بطور پیر و مرشد اور استادِ فن بیدل کا اتباع کرتے رہے ہیں۔" اور ایک زمانے تک شعراء بیدل کے مزار پر تقریب عرس پر جمع ہوتے اور اپنا منتخب کلام سناتے تھے جس سے شعراء کی بیدل سے دلی عقیدت اور میرزا بیدل کے بلند مرتبہ و مقام کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے مقالے میں زیادہ تر انحصار خواجہ عباداللہ اختر کی کتاب پر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق نہیں کی بلکہ انہوں نے خواجہ صاحب کی کتاب جو ہمارے پیش نظر ہے، سے بھی پوری طرح استفادہ نہیں کیا۔ علامہ اقبال اور بیدل کے بارے میں خواجہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اور ان دو بڑی علمی شخصیات اور مذہبی مفکرین کے اشعار کے حوالے دیے ہیں ان ہی کی بناء پر اپنا مقالہ قلم بند کیا ہے۔ اس لیے اس کے مطالعہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بالخصوص جہاں صدیقی صاحب نے بیدل کے افکار کی امتیازی خصوصیات گنوا کر لکھا ہے کہ "... خودداری، خودنگری اور خودشناسی اور سب سے بڑھ کر جدوجہد اور تب و تاب کے جو گوہر ہائے نایاب ہیں اقبال انھیں کے خریدار ہوئے ہیں اور اسی متاع بے بہا سے انہوں نے اپنی دکان سجائی ہے۔" یہی وہ مقام ہے جہاں غالب کا ذکر ضرور آنا چاہیے تھا اس لیے کہ اقبال نے کلام بیدل سے بھرپور استفادہ کرنے اور انہیں "مرشد کامل" تسلیم کر لینے کے باوجود کہیں کہیں افکار بیدل سے اختلاف بھی کیا ہے جس کی نشاندہی صدیقی صاحب نے اپنے مقالے میں کی ہے۔ لیکن اس کے برعکس میرزا غالب نہ صرف میرزا بیدل کو "مرشد کامل" قرار دیتے ہیں بلکہ وہ کہیں بھی افکار بیدل سے انکار کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے بیدل کے متعدد اشعار کا فارسی سے اردو میں منظوم ترجمہ کر دیا ہے۔ غالب و اقبال اور ان دونوں کے "مرشد کامل" بیدل کے اشعار کا جو موازنہ و مطالعہ خواجہ عباداللہ نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے اُس سے یہ حقیقت واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ اُردو کے یہ دو عظیم ترین شاعر بیدل کی شخصی خصوصیات، اُن کی فکری عظمتوں، شعری محاسن اور فنی کمالات کے یکساں طور پر قائل ہیں، دونوں بیدل کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں اور دونوں ہی نے بیدل کے کلام اور افکار سے بھرپور استفادہ بھی کیا ہے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے جس کی طرف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اشارہ کیا ہے

کہ اقبال نے بیدل کے افکار، جو متاع بے بہا کی حیثیت رکھتے ہیں، سے اپنے فکر وفن کی دکان سجائی ہے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ شہنشاہ غزل میرزا غالب کے شعروسخن کی دکان کے حسن و بانکپن، خوبصورتی و رعنائی، کشش و جاذبیت اور اس دکان کی تمام تر سجاوٹ افکار بیدل ہی کی رہین منت ہے۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غالب نہ صرف یہ کہ بیدل کو اپنا مرشد، امام اورفن شاعری میں سند مانتے تھے بلکہ اُن کی زندگی بھر یہی کوشش رہی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اردو اور فارسی کی شاعری میں بیدل کا انداز پیدا کرسکیں لیکن انہوں نے خود اس امر کا بصد حسرت اعتراف کیا ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

غالب حقائق نگاری میں زبردست مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حالات و واقعات اور قلبی واردات کو منظوم کرنے میں انہیں کمال حاصل ہے لیکن ان کے کلام میں ہمیں ذہنی وفکری راہنمائی نہیں ملتی۔ وہ احساسات و جذبات کی ترجمانی خوب کرتے ہیں لیکن منزل اور جادۂ منزل کا تعین کرنا شاید ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جب کہ بیدل نہ صرف احساسات و جذبات کی ترجمانی اور حالات و واقعات کو اپنے اشعار کے قالب میں ڈھالنے کا زبردست ملکہ رکھتے ہیں بلکہ وہ منزل کی واضح نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ بیدل کے تذکرہ نویس اور ان کے کلام کے تجزیہ نگار خواجہ عباداللہ اختر بیدل اور غالب کے اشعار کی متعدد مثالیں دے کر لکھتے ہیں:

> ''غالب نے صرف اتنی بات بیان کی ہے کہ سلوک میں جو بھی پیش آئے اس سے گزر جانا چاہیے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیوں گزرنا چاہیے اور یہ کہ منزل بھی کوئی ہے کہ نہیں؟ یہ بات بیدل نے بتائی ہے۔''

خواجہ عباداللہ اختر نے بیدل اور غالب کے اشعار پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی کی بھی خوب خبر لی ہے۔ مولانا شبلی اور ان کے شاگردوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں اپنی پسند کی مذہبی وعلمی شخصیات کی خصوصیات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور جو شخصیات اُن کے مسلک سے تعلق نہیں رکھتیں انہیں اور ان کے مرتبہ و مقام کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں، جو اہل علم کے لیے کسی طور قابل قبول امر نہیں ہے۔ چنانچہ غالب تو بیدل کو ''قلزم فیض'' اور ''محیط بے ساحل'' قرار دیتے ہیں لیکن

مولانا شبلی حسب عادت غالب کو بیدل سے بڑا شاعر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا شبلی کے اس غیر معقول اور غیر حقیقت پسندانہ اندازِ فکر پر اظہار رائے کرتے ہوئے خواجہ عباداللہ اختر لکھتے ہیں:

''شبلی نعمانی مرحوم ہندی ''شعرالعجم'' میں جہاں کہیں بیدل کا ذکر کرتا ہے تو ایسے لفظوں میں کہ قابل ذکر ہی نہیں سمجھتا...''

آگے چل کر خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''یہ عجیب بات ہے کہ شبلی کا ممدوح غالب، بیدل کی تعریف میں تو رطب اللسان ہے اور آپ (شبلی) بیدل کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی شاعری بیدل جیسے شعراء نے بگاڑ رکھی تھی۔ غالب نے نہ صرف اس کی اصلاح کی بلکہ شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتداء میں بیدل کی پیروی کی وجہ سے وہ بھی غلط راستہ پر پڑ گیا تھا... مولانا بالفضل اولنا نے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ ابتداء سے آپ کی کیا مراد ہے اور یہ کہ کس وقت اس کا احساس ہوا کہ وہ غلط راستہ پر چل رہا ہے ... غالب فارسی اور اردو کلام دونوں میں بیدل کا مداح ہے۔ اردو میں اس کا یہ شعر ہے:

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا   اسداللہ خاں قیامت ہے

اس کے بعد خواجہ عباداللہ نے غالب اور فارسی کے نامور ہندو شاعر قتیل کے شاگردوں کے مابین ہونے والی چپقلش کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ غالب نے کہہ دیا کہ قتیل ایک ہندو تھا اسے فارسی سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے جس پر قتیل کے شاگرد بھڑک اٹھے۔ چنانچہ غالب اُن سے مخاطب ہو کر لکھتا ہے:

فیضے از صحبتِ قتیلم نیست   رشک بر شہرتِ قتیلم نیست

یعنی میں قتیل کی صحبت کا فیض یافتہ نہیں ہوں اور نہ مجھے قتیل کی شہرت پر رشک آتا ہے۔ اس کے بعد غالب اپنی نسبت لکھتا ہے کہ میں علی حزیں اور جلال اسیر کو چھوڑ کر قتیل کا اتباع کیوں کروں؟

دامن از کف کنم چگونہ را   طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح رواں معنی را   آں ظہوری جہان معنی را

یعنی میں طالب آملی اور عرفی اور نظیری کا دامن کیسے چھوڑ دوں، بالخصوص ظہوری جو روح

رواں اور جہان معنی ہے۔ اس کے بعد ظہوری کی تعریف میں چند ابیات ہیں جس کی نسبت مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ صائب جیسا شاعر ظہوری اور جلال اسیر کی تعریف عام خوش اعتقادی یا شہرتِ عام پر کرتا ہے۔ جب مولانا (شبلی) کا ممدوح غالب ان حضرات کا مداح ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا ان شعراء کو ان کے اصلی مرتبہ سے گرانے کی کیوں کوشش کرتے ہیں؟

صائب نے سچ کہا ہے:

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را　　تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

صائب کے اس شعر کا حوالہ دے کر خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ "غالب بیدل، ظہوری اور جلال اسیر کی تعریف کرتا ہے۔ وہ سخن شناس ہی نہیں سخن گو بھی ہے اور مولانا (شبلی) اُن کی مذمت کرتے ہیں ــــ اسی مثنوی میں غالب، قتیل کے شاگردوں کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے کہ تم نے جو میرے کلام پر اعتراض کیا ہے کہ میں نے "زدہ" کو غیر محاورہ باندھا ہے۔ مے زدہ، غم زدہ، شراب زدہ، کونسی ترکیب ہے۔ غالب کہتا ہے کہ "تقلیب" ہے:

هم چناں آں محیط بے ساحل　　قلزم فیض میرزا بیدل
از محبت حکایتے دارد　　که بدیساں ہدایتے دارد
"عاشقے بید لے جنوں زدہٗ"　　طعنه بر بحرِ بیکراں زدہٗ
گرچه بیدل زاہل ایراں نیست　　لیک ہم چوں قتیل ناداں نیست
صاحب جاه و دستگاہے بود　　مرد را زیں نمد کلاہے بود

اسی طرح میرزا بیدل جو "محیط بے ساحل" اور "قلزم فیض" ہے، نے "زدہ" اپنی مثنوی میں باندھا ہے۔ یہ بیت "داستان محبت" کے شروع میں لکھا ہے:

عاشقے بید لے جنوں زدہٗ　　قدح آرزو بخوں زدہٗ

میں نے بھی اُسی (بیدل) کا اتباع کیا ہے۔ تم نے مجھ پر نہیں بلکہ "بحرِ بیکراں" پر اعتراض کیا ہے۔ اگر چہ بیدل ایرانی نہیں ہے لیکن قتیل کی طرح نادان بھی نہیں۔ یعنی فارسی سے خوب واقف ہے۔ زبان پر اُس کو پوری قدرت حاصل ہے۔ جسے غالب "محیط بے ساحل" اور قلزم فیض" اور "بحرِ بیکراں" کہے، ایسے شخص (مولانا شبلی) کا کیا حق ہے کہ بیدل کے کلام پر حرف لائے۔ جب کہ وہ خود غالب کی تعریف میں زمین و آسمان

کے قلابے ملا رہا ہے۔''

مولانا شبلی کی خبر لینے کے ساتھ ہی خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی کہ غالب کے بہترین اشعار فارسی اور اردو میں وہ ہیں جن کا تخیل بیدل کے کلام سے لیا گیا ہے۔''

علمائے اسلام میں سے غالباً سب سے پہلے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اصطلاح تجدد امثال قرآن کی بعض آیات سے اخذ کی (و اذا شئنا بدلنا امثالھم تبدیلا ٥ ۲۹:۲۰) نیز (افعیینا بالخلق الاول بل ھم فی لبس من خلق جدید ٥ ۱۵:۲۶)۔ چنانچہ اپنی کتاب ''فصوص الحکم'' میں تجلیات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ میں نے کشف میں اکابر صوفیہ جنید بغدادی وغیرھم کو دیکھا کہ وہ ترقی کر رہے ہیں۔ مگر اُن کو اس کا شعور نہ تھا، میں نے آیۃ (اوتوا بہ متشابھا) کی تفسیر کرتے ہوئے انہیں قانون تجدد امثال سے آگاہ کیا۔ شیخ اکبر یہ کہتے ہیں کہ نہ صرف اس دنیوی زندگی میں بلکہ بعد ممات بھی زیر اثر تجدد امثال ارتقاء جاری ہے۔ اس مسئلہ کے نتائج اہم ہیں۔

۱۔ جہان کبھی کہنہ وفرسودہ نہیں ہوتا، ہر آن اس کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں:

نوی بیدل از ساز امکاں نرفت　　نشد کہنہ تجدید ایجاد ہا

درکارگہ تجدید یکست چمن سازیست　　تقویم بہار ایں جا پارینہ نمی باشد

تجدید کے کارخانہ میں جو کچھ بھی بنتا ہے نیا ہی بنتا ہے۔ اس چمن پر ہمیشہ بہار کی رونق رہتی ہے۔

۲۔ چونکہ عالم کی امثال بدلتی رہتی ہیں اس لیے ہر آن فنا ہوتا اور ہر آن اُس کا مثل ظہور میں آتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ہر آن خالق اور مبدی اور بدیع اور مصور وغیرھم ہے (کل یوم ھو فی شان)

۳۔ تجدد میں ارتقاء لامحدود ہے۔ (اجر غیر ممنون)

زکارگاہ تجدد عیاں نہ شد بیدل　　جز ایں قدر کہ کسے ایں جا بانتہا نرسید

یعنی اے بیدل کارگۂ تجدد سے اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ اس جگہ کوئی شخص انتہا کو نہ پہنچا۔

۴۔ ارتقاء کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر ایک شے کا آخر اول سے بہتر ہے (الاخرۃ خیر و ابقیٰ)

۵۔ تجدد میں رجعت یعنی ہستی میں تکرار نہیں۔

تکرار مبندید بر اوراق تجدد   تقویم نفس را خط پارینہ نباشد

جس طرح ہر ایک سانس نیا ہے اور جو گزر گیا وہ دوبارہ نہیں آتا۔ اُسی سے رشتہ زندگی وابستہ ہے۔ اُسی طرح دفتر ہستی کا جو ورق اُلٹ گیا وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ وہ کبھی گردش کرتا ہوا دوبارہ رُونما نہ ہوگا۔

نامور فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں (Henry Bergson) نے فلسفہ تغیر زماں پیش کیا ہے۔ اس کے نزدیک ''تغیر زمانہ ہے اور زمانہ تغیر۔'' برگساں کے تصورِ زماں کے مطابق زمانہ دو طرح کا ہے، زمانِ مکانی اور زمانِ حقیقی (خالص) انائے فعال کا تعلق زمان مکانی سے ہے اور یہ روز و شب اور ماہ و سال میں منقسم ہے۔ انائے بصیر کا تعلق زمان خالص سے ہے اور یہ ایک آن واحد ہے جس کا مشاہدہ وجدان کے ذریعے ممکن ہے۔ برگساں کے نزدیک ''وجدان فکر ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔'' چنانچہ شیخ اکبر کے قانون تجدد امثال کی وضاحت میں بیدل کے اشعار پیش کرنے کے بعد خواجہ عباداللہ اختر لکھتے ہیں کہ برگساں کے پیش کردہ فلسفہ زمان کے مطابق ہم ''بلا توقف متغیر ہو رہے ہیں۔'' خواہ یہ اشیاء خارجی کے تصورات ہوں یا ہمارے قویٰ باطنی یا خواہشات یا جذبات یا ارادہ وغیرہ ہو اور جسے حال سے موسوم کیا جاتا ہے وہ صرف تغیرات کا دوسرا نام ہے۔ احساس ہو یا خیال یا ارادہ وغیرہ مسلسل معرض تغیر میں ہے۔ ایک حالت سے گزر کر دوسری حالت میں آنا یا ایک ہی حالت میں مسلسل رہنا ایک ہی بات ہے۔ دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ شیخ اکبر نے واضح کیا ہے کہ ''ہمیں تغیرات کا فوری احساس اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ نہایت لطیف اور ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم باوجود ان تغیرات کے یقین کرتے ہیں کہ ہم عمر کے ہر ایک دور میں ایک ہی ہیں۔''

ڈاکٹر عبدالغنی میرزا بیدل اور اُن کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بیدل کا قول ہے 'شاعری عبارت از معنیٰ تازہ یابیست۔' معانی کے ساتھ اُن کی وابستگی عہد طفلی میں پیدا ہوگئی تھی اور اسی لیے

ابتداء میں اُن کا تخلص رمزی تھا۔ گویا اُن کا ہر شعر اسرار و رموز سے پُر ہوتا تھا۔ اُن کی کنیت ابوالمعانی بھی اسی وجہ سے پڑی۔ معنی آفرینی اور معنی پروری پر انہیں ناز تھا۔ کہتے ہیں:

بیدل از فطرتِ ما قصرِ معانیست بلند
پایہ دارد سخن از کرسیٔ اندیشۂ ما

بیدل کے یہاں ہمیں فلسفیانہ موضوعات بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ ماہیتِ اشیاء کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ کائنات اور انسان کا تعلق اس شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

چہ فلک چہ ذرّۂ ناتواں بہ ہوائے شوق تو پرفشاں
تو بہار و عالمِ رنگ و بو ہمہ آشیانِ ظہورِ تو

بیدل فطری شاعر تھے۔ فقر و تصوف نے اُن کے افکار کو جذبہ کی آنچ عطا کی اور نئے نئے معانی کی آرزو نے اُن کی فلسفیانہ صلاحیتوں کو معارفِ تازہ سے آشنا کیا۔ ان کے دل میں ہمیشہ نئے مطالب بیان کرنے کے لیے جدید تراکیب اختراع کرنے کی آرزو رہی اور اس طرح انہوں نے زبان کو گراں قدر ذخیرۂ الفاظ عطا کیا۔ اظہار کثرت کے لیے ''یک'' اور ''صد'' کے سابقوں سے جس طرح انہوں نے خوبصورت مرکبات وضع کیے ہیں، انہی کا حصہ ہے:

بیدل از مشتِ غبار حسرت آلودم مپرس — یک بیاباں خار خارم یک نیستان نالہ ام
صد سنگ شد آئینہ و صد قطرہ گہریست — افسوس ہمان خانہ خراب است دل ما

بیدل اپنے عہد کے علمی، تمدنی، معاشرتی اقدار و روایات کے وارث اور برصغیر میں اسلامی تہذیب کے صورت گر تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

''بیدل جب پیدا ہوئے، شہنشاہ شاہجہان کے عروج کا زمانہ تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ برصغیر میں مسلمانوں کے علوم و فنون کے عروج کا زمانہ بھی یہی ہے۔ عرب، ایران اور وسط ایشیا سے مسلمان کچھ مخصوص تہذیبی روایات اپنے ساتھ لائے تھے، وہ اس جدید جغرافیائی ماحول اور تہذیب و تمدن کے گہوارۂ قدیم میں نئی آب و تاب دکھا رہی تھیں۔ صوفیائے کرام کی پاکیزگیٔ سیرت اگر محوِ حیرت کرتی تھی تو علماء و فضلاء کا تبحرِ علمی انگشت

بنداں کر دیتا تھا۔ ہر جگہ مکتب اور مدرسے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، فلسفہ، منطق اور دیگر علوم کی ترویج میں مصروف تھے۔ معاشرے میں اسلامی اقدار پوری طرح سرایت کر چکی تھیں۔ ادب و شعر کے میدان میں امیر خسرو، فیضی، عرفی، نظیری ایسے کاملینِ فن کے بعد قدسی، کلیم اور صائب ایسے شعراء پیدا ہوئے تھے اور پھر اسی زمانے میں جامع مسجد دہلی، موتی مسجد، تاج محل اور مقبرۂ جہانگیر ایسے شاہکار تخلیق ہوئے۔ بیدل ان تمام علمی، تمدنی، معاشرتی اور فنی روایات کے وارث بنے۔ اُن کے قلب میں بے پناہ وسعت تھی اور فکر ہمہ گیر تھا۔ اس لیے اُن کی نظم و نثر میں وہ تمام افکار و خیالات جمع ہو گئے جن سے مسلمانانِ پاک و ہند کی تہذیب کی تشکیل ہوئی تھی۔ اُن کی مثنوی ''عرفان'' میں ابن سینا کا فلسفہ بھی ہے اور ابن عربی، رومی اور عطار کا متصوفانہ فکر بھی۔ زمان و مکان کے متعلق گہرے مسائل بھی ملتے ہیں اور معاشرے کو صحت مند طور پر چلانے کے اصول بھی۔ اس میں بیدل کی انسان دوستی بھی اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ زراعت پیشہ لوگوں کے متعلق ایک حکایت بیان کر کے کہتے ہیں:

تا بجائے رسید سعی غرور　　کز مزارع نماند جز مزدور

مزارعان کے ساتھ ہمدردی اس اسلامی تہذیب کی وجہ سے تھی جو انسان دوستی اور احترام آدمی کو بنیادی حیثیت دیتی ہے۔ ورنہ برصغیر میں ہندو تہذیب نے ہمیشہ سے نچلے طبقہ مثلاً اچھوت اقوام کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ ہر ایک پر واضح ہے۔

بیدل کی غزلیات بھی مسلمانوں کے تہذیبی افکار سے لبریز ہیں اور ان کے احساسِ حسن کی نزہت و لطافت بھی اسی تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے جس نے یہاں فنِ تعمیر کے نادر نمونے پیش کیے تھے۔ اس شعر کو لیجیے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ای درِ دل کشا بچمن درآ

یہ شعر اُسی تہذیب کا ترجمان ہو سکتا ہے جس نے ہمیشہ شخصیت کی متوازن تعمیر اور حسنِ اخلاق پر زور دیا ہو۔ علاوہ بریں محمود غزنوی سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک اسلامی ہند کے بادشاہوں نے اپنے تہذیبی اثرات کی بناء پر رعیت نوازی، معدلت گستری، معارف پروری اور اپنے جاہ وجلال سے بادشاہت کا ایک شاندار تصور قائم کیا تھا۔ صدیوں کے اسی تصور کا نتیجہ تھا کہ جب جہاندار شاہ (۱۲ے۱اء۔۱۳ے۱اء) نے اپنی بے

مغزی کی بناء پر ان روایات سے ہٹ کر بڑی گھناونی حرکات کا مظاہرہ کیا تو بیدل نے بڑی نفرت وحقارت کے ساتھ کہا:

زبے مغزی شکوہِ سلطنت شد لنگِ کناسی
بجائے استخواں گہ خوردہ می گردد ہما اینجا

شکوہ سلطنت کی ترکیب برصغیر میں اسلامی تہذیب کے درخشاں تصور حکومت کی تمام تر روایات کی آئینہ داری کرتی ہے۔ الغرض شعری اور ادبی لحاظ ہی سے نہیں جس پہلو سے دیکھا جائے بیدل اپنی تہذیب کے کامل نمائندہ ہیں۔''

ڈاکٹر عبدالغنی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ بیدل نے اپنی زندگی میں شاہ جہاں سے لے کر محمد شاہ رنگیلے تک آٹھ بادشاہوں کو تختِ طاؤس پر جلوہ افروز دیکھا۔ حاصل تخت کے لیے چار جنگیں اُن کے سامنے لڑی گئیں۔ اگرچہ دربارداری اور مدح گوئی سے وہ نفور تھے پھر بھی کسی نہ کسی طرح مغل شہنشاہوں اور اُن کے حالات کا تذکرہ وہ اپنی نظم ونثر میں کر گئے ہیں۔ مغل امراء میں سے سادات خواف، نواب ذوالفقار خان، نظام الملک آصف جاہ، امیر الامراء حسین علی خان وغیرہ کے متعلق انہوں نے قطعات لکھے۔ اورنگ زیب کے قیام دکن کے باعث شمالی ہند میں جاٹوں نے جو خلفشار پیدا کیا بیدل نے ''چہار عنصر'' اور دو ایک قطعات میں اُس کا بھی ذکر کیا ہے۔ دکن میں اورنگ زیب کو جو فتوحات حاصل ہوئیں اُن کے متعلق تاریخیں بھی کہیں۔ ایک تاریخ یہ ہے:

• ''با زن وفرزند سنبھا شد اسیر'' = ۱۱۰۰ھ

قبل ازیں اورنگ زیب نے جب ۱۰۹۷ھ میں بیجا پور اور دوسرے سال میں گولکنڈہ فتح کیا تو میرزا بیدل نے نواب شکراللہ خان جو سپہ سالار بھی تھے اور دانش ور ادیب بھی، کی معرفت ایک قطعہ تہنیت پیش کیا۔ لیکن اس کا مقصد کوئی صلہ حاصل کرنا نہیں تھا۔ اپنی بے نیازی کا اظہار بڑی جرأت سے ان الفاظ میں کیا ہے:

''للہ الحمد اندیشۂ دعاگو بہانہ جوئے تقریبے است کہ بآں وسیلہ تحفۂ فقراء پیش گزارد یا مصرعے در آنجناب معروض دارد وگرنہ چہ نواب کدام مستطاب بلکہ چہ عالمگیر و کدام بدر منیر بطریق شوق بے پروا نگاشتی دارد و آہنگ ساز بے نیازی سراز پردہ برمی آرد''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدل اورنگ زیب کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ ہی نہیں بلکہ عقیدت رکھتے تھے۔ مگر چونکہ صوفی منش اور قادری المشرب تھے لہٰذا امراء اور سلاطین

کا قصیدہ نہیں لکھتے تھے۔ اس لیے شوقیہ قطعہ تاریخ کہہ دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے استغنا۔ کا اظہار کر دیا کہ یہ قطعہ کسی صلہ کی اُمید پر نہیں لکھا گیا۔ قطعہ یوں ہے:

شاہ عالمگیر یعنی حضرت اورنگ زیب آنکہ دارد تکیہ بر شمشیر او فتح و ظفر
عزمش از اقلیم دہلی کرد آہنگ خروج تا کند بنیاد شاہاں دکن زیر و زبر
اولیں سالے کہ فتح ملک بیجاپور بود درغل و زنجیر رفت اسکندر از طوق و کمر
تا دمت بر گلکنڈہ رایات ظفر سال دوم ہم چناں در قلب قطب الملک طوفاں داد سر
گشت از روئی جمل در دیدۂ اہل حساب سال فتح اولیں ''جمشید نصرت'' جلوہ گر
۱۰۹۷

خواستم روشن شود آئینہ فتح دوم دار شوخی ہائے ادراکم دریں مصرع خبر
ہست یک معنی کہ تعبیر از دو تاریخش کند اعظم مطلوب ''فتح بادشاہ'' نامور
۱۰۹۸ھ ۱۰۹۸ھ

اورنگ زیب عالم گیر بلند مرتبت فقیہ و محدث اور صاحب علم و فضل ہونے کے علاوہ عدل گستر، رعایا پرور اور روشن ضمیر حکم ران تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک مرد شمشیر زن تھا۔ دورِ عالم گیری میں جن انتہا پسند فرقہ پرست قوتوں نے سر اٹھایا اور جن متشدد و متعصب طاقتوں نے پر پُرزے نکالے اورنگ زیب کے بازوئے صف شکن نے انہیں کچل کر رکھ دیا۔ لیکن اورنگ زیب کے اس دارِ فانی سے رخصت ہونے کے بعد یکے بعد دیگرے فتنے سر اٹھانے لگے۔ معاشرتی برائیاں کھل کر سامنے آنے لگیں اور منفی طاقتیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔ امرائے سلطنت ہوس اقتدار میں اندھے ہوئے۔ مرہٹوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ پنجاب میں سکھوں نے لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دی۔ روہیلوں اور جاٹوں نے بھی سرکشی اختیار کر کے ملک کو شورشوں اور ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنا دیا۔ اور تو اور سادات بارہہ جن پر مغل فرمانروا صدیوں سے انعام و اکرام کی بارش کرتے چلے آئے تھے، نمک حرامی پر اُتر آئے۔ سادات میں سے دو بھائیوں نے جو تاریخ میں سید برادران کے نام سے مشہور ہیں اس قدر طاقت حاصل کر لی کہ وہ مغل سلطنت میں سیاہ سفید کے مالک بن گئے۔ ایک بھائی وزیرِاعظم تھا اور دوسرا سالارِ اعظم۔ یہ دونوں جس بادشاہ کو چاہتے تخت سے اتار دیتے اور جس کو چاہتے تخت پر بٹھا دیتے تھے اور جس کو چاہتے تھے اندھا کر کے زندان میں ڈال دیتے تھے۔ چنانچہ جب سلطنت مغلیہ کے ان

غداروں نے ۱۱۳۱ھ میں فرخ سیر کو قتل کر دیا تو میرزا بیدل نے سادات بارہہ کے طرز عمل پر تنقید کرتے ہوئے تاریخ کہی:

''سادات بوئے نمک حرامی کردند''

اورنگ زیب کی وفات کے بعد کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے میرزا بیدل کے مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد وہ تیرہ سال زندہ رہے اور ان سالوں میں انہوں نے کیا کچھ نہ دیکھا۔ کم از کم راقم سطور کی نگاہوں کے سامنے کوئی ایسا شاعر نہیں جس نے اس قدر بے باکی، اس قدر شدومد اور اتنے تواتر سے اپنے زمانے کے لوگوں کی بداخلاقی اور بدکرداری کا تذکرہ کیا ہو۔ حاکم طبقہ کی نخوت پسندی، اقتدار پرستی، زر دوستی، خفت عقل، خست طبع، ہوس کاری، تن آسانی، سنگ دلی اور بے دینی کا ذکر جس شدتِ احساس کے ساتھ کرتے ہیں اُس کا اندازہ اس ایک شعر سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے:

بیدل امروز در مسلماناں ہمہ چیز است لیک ایمان نیست

بیدل کے اس قسم کے اشعار سے اُس زمانے کے معاشرتی حالات کا پتا چلتا ہے کہ وہ ان صفات سے عاری ہو چکا تھا جو اقوام و ملل کو توانائی اور زندگی عطا کرتی ہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس معاشرے کو حرکت اور فتوت سے آشنا کرنے کے لیے اب نئی تدابیر کی ضرورت تھی جو اورنگ زیب کے جانشینوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

بیدل کے کلام میں ہندو دھرم، ہندوؤں کے مقدس مقامات مثلاً متھرا، دریائے گنگا، کرشن مہاراج، اواگون کا تصور وغیرہ کے بارے میں بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کے متعلق بہت سی حکایات بھی نظم کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں اور اُن کے مذہب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک برہمن کے مقابلے میں مسلمانوں کے تصورِ زمان کی فوقیت ثابت کی ہے جس سے جہاں بیدل کے تبحر علمی ار فلسفیانہ مسائل میں اُن کی مہارت کا ثبوت ملتا ہے وہاں اس امر کی بھی نشان دہی ہوتی ہے کہ وہ علمی سطح پر بھی اسلامی علوم اور مسلمانوں کی تہذیب کی فضیلت و برتری کے قائل تھے۔ غرض یہ کہ بیدل کے کلام سے اُن کی اپنی شخصیت کے علاوہ ان کے عہد کے مکمل ماحول، معاشرت، اخلاق و کردار، سیاسی و معاشی امور و مسائل کے علاوہ اس دور کی ہندو مسلم کشمکش کا نقشہ واضح طور پر نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی نے مرزا عبدالقادر بیدل کے حضور شان دار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے اور اپنے تحقیقی مقالے کے اختتام میں یہ جملہ لکھا ہے کہ بیدل اپنے زمانے سے بلند تر ذہن کے مالک ہونے کی وجہ سے مستقبل کے شاعر ہیں جن کا پیغام آہستہ آہستہ منکشف ہو رہا ہے۔ فی الواقعہ وہ ایک عظیم انسان، عظیم صوفی اور عظیم شاعر تھے۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ بھی میرزا بیدل کے مدح خوانوں میں سے ہیں۔ چنانچہ ''متعلقات خطبات اقبال'' میں لکھتے ہیں:

> ''بیدل بلند حوصلہ، مستغنی اور درویش منش انسان تھے۔ اُن کی نظم و نثر میں دل پذیر حکیمانہ انداز ملتا ہے۔ انہوں نے ابن عربی کے فلسفہ تنزلات کو بڑی فکری گہرائی اور زورِ بیان سے پیش کیا۔ بیدل کے کلام میں انسان کی عظمت کے بے پایاں امکانات اور اس کے جمال و جلال کو ثابت کرنے کے لیے حکیمانہ رجحان ملتا ہے۔ وہ ذاتِ الٰہی سے ازحد محبت کرتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک یہی جذبۂ محبت انسان کی ارتقائے ذات کا اہم ذریعہ ہے۔ فلسفیانہ اندازِ تفکر کی وجہ سے بیدل کی غزلیات میں دقیق المعانی اشعار بھی ہیں۔''

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی ڈاکٹر عبدالغنی اور دیگر تذکرہ نویسوں کی طرح بیدل کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ اُن کے محاسنِ شعری اور افکارِ عالیہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مرزا بیدل کے کلام میں افسردگی اور فشار کی جگہ جس ہمت، اولوالعزمی، بلند فطرتی، حرکت اور عمل پیہم کا پیغام ملتا ہے اُس کا ایک سبب تو اُن کی افتادِ طبع ہے کہ ہر جگہ بلندی کی طرف مائل ہے۔ اُن کا تخیل نہ صرف بلند پرواز ہے بلکہ کسی حد تک بے باک ہے۔ ان کے تخیل کی بلند پروازی محض واہمہ نہیں ہے۔ اُس میں مغز ہے۔ وزن ہے اور وقار ہے گراں مائیگی ہے۔ حکمت و فلسفہ کی گہرائی و گیرائی ہے۔ وہ شاعر سے زیادہ حکیم ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی شاعرانہ زبان اور اسلوب بیان کا جامہ اُن کے خیالات پر تنگ ہو جاتا ہے اور یہی حال اُن کے فرزندِ معنوی میرزا اسداللہ خان غالب کا ہے۔

بیدل بڑے پُر گو شاعر تھے۔ انہوں نے بارہ سو اشعار پر مشتمل مثنوی ''طورِ

معرفت'' صرف دو روز میں لکھی۔ دس سال کے تھے کہ شعر کہنا شروع کیا اور جب ۷۶ سال کی عمر میں فوت ہوئے تو اُن کے تکیے کے نیچے سے اُن کی آخری غزل اور رباعی ملی جو مرض الموت میں کہی گئی تھی۔ اُن کی قوتِ تخلیق زندگی کے آخری لمحات تک بڑی توانائی کے ساتھ بروئے کار رہی۔ ایک لاکھ کے لگ بھگ شعر کہے ہیں۔ اُن کی کلیات اور دیوان مطبع نولکشور کے علاوہ متعدد مطابع میں چھپتے رہے۔

۱۸۸۲ء میں بمبئی کے مطبع صفدری نے بیدل کا جو کلیات چھاپا وہ اپنے اشعار کی تعداد اور صحت و خوبیٔ طباعت کے اعتبار سے ایک نادر چیز ہے۔

۱۹۶۷ء میں افغانستان کے دارالحکومت کابل سے بیدل کا کم و بیش تمام شعری اور نثری سرمایہ بڑے اہتمام کے ساتھ چار ضخیم جلدوں میں طبع ہوا ہے جو فی الحقیقت طباعت کی دنیا میں ایک یادگار واقعہ ہے جس سے میرزا بیدل اور اُن کے کلام اور افکار کی عظمت اور شہرت و مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

غزلیات کے علاوہ اُن کی مثنویاں بھی بہت مشہور ہوئیں جن میں 'محیط اعظم'، 'طلسم حیرت'، 'طور معرفت'، 'عرفان' اور 'تنبیہہ المہوسین' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اُن کی مثنوی 'گل زرد' نایاب ہے۔ انہوں نے شمشیر، اسپ اور فیل کے متعلق بھی ایک مثنوی لکھی ہے۔ مثنویات کے کل اشعار اٹھارہ ہزار ہیں۔ 'عرفان' طویل ترین مثنوی ہے اس کے گیارہ ہزار ابیات ہیں۔ قصائد و قطعات ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ بیدل مخمسات لکھنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے جس کے بارہ سو ابیات ہیں۔ ایک ترکیب بند اور ایک ترجیع بند بھی لکھا ہے اور ان کی رباعیات ۳۶۰۰ سے زائد ہیں۔ ''چہار عنصر'' اور ''رقعات'' اُن کی نثری تصنیفات ہیں۔ ان میں بھی اشعار موجود ہیں۔ 'چہار عنصر' سے فکر انگیز اور معنی خیز جملے منتخب کر کے انہوں نے 'نکات' مرتب کیے اور ہر ایک نکتے کے ساتھ علیحدہ علیحدہ غزلیات، مخمسات اور رباعیات شامل کر دیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنی مثنویات میں سے ان ''نکات'' سے متعلق ابیات اور منظوم حکایات کا انتخاب کر کے ان کا نام 'اشارات و حکایات' رکھا۔ علاوہ ازیں بیدل کی بیاض کے دو نسخے برٹش میوزیم لنڈن میں محفوظ ہیں جن میں چیدہ چیدہ معاصر اور قدیم شعراء کا منتخب کلام جمع کیا گیا ہے اور جس کا ذکر ڈاکٹر ریو کی مرتب کردہ برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات فارسی (انگریزی)۔ برگ ۷۳۷ (الف) ۸۳۸ (ب) میں ملتا ہے۔

میرزا بیدل ڈاکٹر عبدالغنی کی تحقیق کے مطابق ایک عارف کامل اور شاعر بے بدل تھے اور اس لحاظ سے لوگ اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ۵ دسمبر ۱۷۲۰ء کو ۷۶ سال کی عمر میں شاہجہان آباد میں فوت ہوئے اور اپنے گھر میں مدفون ہوئے۔ عرصۂ دراز تک اُن کے مزار پر ہر سال دھوم دھام سے عرس منایا جاتا تھا اور دہلی بھر کے شعراء اور عقیدت مند اکٹھے ہوتے تھے۔ مشاعرہ ہوتا اور عوام میں کھانا تقسیم کیا جاتا۔

میرزا عبدالقادر بیدل کی ولادت، وفات اور مرقد کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے تذکرہ نگار خواجہ عباداللہ اختر لکھتے ہیں کہ بیدل کی ولادت ۱۰۵۴ھ میں ہوئی۔ تاریخ خود ہی ''انتخاب'' سے نکالی، پیدا عظیم آباد پٹنہ میں ہوئے اور فوت دہلی میں جہاں مستقل رہائش رکھی تھی۔ وفات ۱۱۳۳ھ میں واقع ہوئی۔ بیدل محض شاعر نہ تھے۔ سنائی اور عطار اور رومی اور سعدی وغیرھم کی طرح صاحب حال بھی تھے۔ معاصرین اولیاء اللہ میں شمار کرتے۔ چنانچہ ایک رباعی میں اشارہ کرتے ہیں:

بیدل بدو روزہ عمر مغرور مشو　　بنیاد تو نیستی ست معمور مشو

ہر چند ابدل وقطب وغوث خوانند　　ای خاک بایں غبار مسرور مشو

یعنی یہ عمر دو روزہ ہے اس پر اترانا نہیں چاہیے۔ جس ہستی کی بنیاد ہی نیستی ہو وہ آباد ہونے سے رہی۔ کوئی ابدال یا قطب یا غوث بھی ہو اور لوگ یہ سمجھ کر اُس کا احترام بھی کریں تو فوق البشر تو نہیں ہو سکتا۔ اس آدمِ خاکی سے یہ غبار شہرت کشف و کرامات اڑ کر پھیلے تو اس پر خوش نہ ہونا چاہیے۔

میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ شاہجہان آباد دہلی کے شعراء ہر سال میرزا کے مرقد پر بتقریب عرس جمع ہوتے اور ''کلیات میرزا'' حسب معمول نکال کر مجلس میں لاتے۔ میر عبدالولی عزلت سوری کا بیان ہے کہ میں اس نیت سے آیا کہ میری یہاں آمد کی میرزا کو بھی کچھ خبر ہے؟ چنانچہ کلیات کھولی تو پہلا شعر یہ تھا:

چہ مقدار خون در عدم خوردہ باشم　　کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم

تم میرے مزار پر آئے اور میں مردہ ہوں۔ تمہیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں عدم میں کس قدر پیچ و تاب کھا رہا ہوں۔ حاضرین مجلس نے بھی میرزا کا یہ شعر پڑھا اور میر عبدالولی کی نیت سے واقف ہوئے تو میرزا عبدالقادر بیدل کی کرامت کے بھی قائل ہو گئے۔

شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی

حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کا شمار برصغیر پاکستان و ہند کے نامور علماء اور اکابر صوفیہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت میں شاندار اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔

شاہ کلیم اللہ ۲۴ جمادی الاول ۱۰۵۰ کو دہلی کے ایک معروف خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ نسباً صدیقی ہیں۔ اُن کے دادا احمد معمار نے شہنشاہ شاہجہان کے دور میں کئی مشہور تاریخی عمارتیں تعمیر کیں۔

سلطان احمد فاروقی نے ''تذکرہ اولیائے چشت'' میں حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے احوال بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ''شاہ کلیم اللہ کو حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اولاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے دادا احمد معمار عہد شاہجہانی کے مشہور ماہرین فن تعمیر میں سے تھے۔ انہیں شاہان مغلیہ کی طرف سے ''نادر العصر'' کا خطاب ملا تھا۔ آپ اقلیدس، ہیئت، نجوم، ریاضی وغیرہ علوم پر کامل عبور رکھتے تھے۔ تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ کو ان ہی نے تعمیر کیا تھا۔ ان احمد معمار کے سب سے چھوٹے صاحب زادے نور اللہ جو شاہ کلیم اللہ کے والد ماجد تھے، بھی ایک صاحب کمال شخص تھے۔ فن تعمیر کے علاوہ خطاطی کے بھی ماہر کامل تھے۔ جامع مسجد دہلی کی پیشانی پر جو کتبے تحریر ہیں وہ شاہ کلیم اللہ کے والد ماجد استاد نور اللہ کی باکمال انگلیوں کا کرشمہ ہیں۔''

اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ ''کلیم اللہ شاہجہان آبادی کے آباؤ اجداد جو پیشے کے لحاظ سے معمار تھے اصلاً خجند کے باشندے تھے۔ اُن کے باپ اور دادا دونوں نے لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی کی تعمیر میں نمایاں کردار انجام دیا۔ آیات قرآنی

اور اسماء حسنیٰ سے متعلق بہت سے کتبات جن سے جامع مسجد کی زینت و آرائش ہوئی اُن کے والد استاد نوراللہ کے لکھے ہوئے ہیں۔''

''تاریخ چشت'' کے مولف پروفیسر خلیق احمد نظامی رفیق ندوۃ المصنفین لکھتے ہیں کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں جبکہ مسلمانانِ ہند کا سیاسی نظام نہایت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہا تھا اور ہر طرف اخلاقی ابتری اور زبوں حالی پھیلی، چشتیہ سلسلہ کا دور تجدید و احیاء شروع ہوا۔ اس نشاۃ ثانیہ کا سہرا تمام تر حضرت شاہ کلیم الدین دہلوی کے سر ہے۔ تقریباً دو سو سال سے چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام پر جمود کا عالم طاری تھا۔ روحانی اصلاح و تربیت کا کام سست پڑ گیا تھا اور مشائخِ متقدمین کی روایات بالکل بھلائی جا چکی تھیں۔ شاہ صاحب نے اپنی پُر خلوص جدوجہد سے سلسلے کے عروقِ مردہ میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی اور اصلاح و تربیت کا ایسا نظام قائم کیا کہ دورِ اوّل کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ خود شاہ صاحب دہلی میں رہتے تھے لیکن ان کا اصلاحی ہاتھ دکن تک کام کرتا تھا۔ وہ اپنے مریدوں کی زندگی کے ہر ہر گوشے پر نظر رکھتے تھے اور بات بات پر ان کو ہدایتیں دیتے تھے۔ ان کے خلیفہ شاہ نظام الدین اورنگ آبادی نے دکن میں سلسلہ کی نشر و اشاعت میں بے پناہ جدوجہد کی، ان کی خانقاہ میں ہزاروں گم گشتگان راہِ طریقت جمع ہوتے تھے اور اپنی روحانی پیاس بجھا کر نکلتے تھے۔

خلیق احمد نظامی کے علاوہ دیگر مؤرخین، تذکرہ نگاروں اور اہلِ علم نے شاہ کلیم اللہ کی دینی، علمی، تحقیقی، فقہی اور تبلیغی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ مولوی فقیر محمد ''حدائق الحنفیہ'' میں ان کا تعارف ان شاندار الفاظ میں کراتے ہیں۔ ''شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی اعاظم علماء اور مشائخِ کبار میں سے تھے''۔

''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' پانچویں جلد، (فارسی ادب: سوم) کے چھٹے باب کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''صاحبِ تصانیف اکابر صوفیہ میں سے شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔''

مولوی فقیر محمد کی تحقیق کے مطابق شاہ کلیم اللہ ۱۰۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے معروف و ممتاز علماء و فضلا سے علومِ ظاہری اور فنونِ رسمی حاصل کر کے فضیلت و کمالیت کی دستار باندھی۔ پھر حرمین شریفین کی زیارت اور اعلیٰ تعلیم کی غرض سے حجاز کا سفر اختیار کیا۔

مدینہ منورہ میں حضرت شیخ یحیٰ مدنی کی خدمت میں مدت تک حاضر رہے اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر ظاہری و باطنی فیوض حاصل کئے۔ اُن سے خرقۂ خلافت لے کر شاہجہان آباد میں وارد ہوئے اور شاہی قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان تدریس و تلقینِ خلائق میں مصروف ہو گئے۔ درس و تدریس اور تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور علوم و حقائق معارف میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔

اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے لکھا ہے: ''شاہ کلیم اللہ نے سلسلہ چشتیہ میں شیخ یحیٰ بن محمود گجراتی (متوفی ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء) کے ہاتھ پر بیعت کی جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور میر محترم اور شیخ محمد غیاچ کے ذریعے نقش بندی اور قادری سلسلوں میں بھی نسبت حاصل کی۔''

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' میں ان کے مکتوبات کے علاوہ دس کتابوں کے نام گنوائے ہیں۔ جو یہ ہیں (۱) قرآن القرآن (عربی) (۲) عشرۂ کاملہ (۳) سواء السبیل (۴) کشکول کلیمی (۵) مرقع (۶) تسنیم (۷) رسالہ تشریح ااافلاک کی شرح فارسی میں (۸) الہاماتِ کلیمی (۹) شرح القانون (۱۰) رسالہ علم منطق۔ مناقب فریدی میں شاہ صاحب کی تصانیف کی تعداد ۲۲ بتائی گئی ہے۔

شاہ کلیم اللہ کی تصنیفات اور مکتوبات میں اسلامی تعلیمات کی بالعموم اور سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے اشغال و عقائد کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے۔ ان کے افکار و عقائد کو ان کے مکتوبات میں واضح اور نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''دنیا کو دینی اور دنیاوی فیض پہنچانا چاہئے اور اپنے آرام و آرائش کو بندگانِ خدا پر قربان کر دینا چاہئے۔''

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:

''اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کرنا چاہئے اور اس کام میں اپنا مال اور جان قربان کر دینی چاہئے۔''

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

''یہ دنیا نفس پروری اور تن آسانی کی جگہ نہیں ہے۔''

ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"جو اوقات کی پابندی نہیں کرتا وہ دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان میں رہتا ہے۔"

شاہ کلیم کی نگارشات میں خوشگوار اور باسعادت زندگی کے اصول ملتے ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ ایصال خیر کو اپنا مقصود قرار دیا جائے۔ ایصال خیر میں اخلاص اور نیک نیتی سے کام لیا جائے اور ان میں ایک نہایت ہی قیمتی مشورہ یہ ہے کہ وحدت الوجود کے مسئلہ کو ہر کس و ناکس کے سامنے نہ چھیڑا جائے۔

چشتی مسلک میں وسعتِ مشرب کی اہمیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ شاہ کلیم اللہ کا قول ہے کہ غیر مسلموں سے عمدہ تعلقات رکھنے چاہئیں تاکہ انہیں اسلامی تعلیمات سے متاثر کیا جا سکے۔ ویسے بھی مشائخِ چشت ہدایت فرماتے تھے کہ اگر کوئی غیر مسلم تمہاری صحبت سے گرویدگی یا عقیدت کی بنا پر تمہارے پاس آنے جانے لگے اور تم سے ذکر وغیرہ کے متعلق پوچھے تو فوراً بتا دو، اس فکر میں نہ رہو کہ وہ باقاعدہ مسلمان ہو جائے تب اسے روحانی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ شاہ کلیم اللہ فرماتے ہیں "صلح با ہندو و مسلمان سازند و ہر کہ ازیں دو فرقہ کہ اعتقاد بشما داشتہ باشند، ذکر و فکر مراقبہ و تعلیم او بگویند کہ ذکر بخاصیت خود او را بر بقۂ اسلام خواہد کشید"۔

شیخ نظام الدین اولیاء کا ارشاد ہے کہ اگر بیعت کے شرائط و قواعد کو وہ پہلے ہی سے بیان کر دیں تو بہت سے لوگ محروم رہ جائیں۔ دینی معاملات میں سہولت پیدا کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکامات کا بوجھ ایک ہی دفعہ اُن پر ڈال دینا نفسیاتی مصلحتوں کے خلاف ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن روانہ کرتے وقت یہ ہدایت فرمائی تھی "تم اہل کتاب کے پاس جاتے ہو، پہلے اُن کو کلمہ توحید کی دعوت دو۔ اگر وہ اس کو قبول کر لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے رات اور دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے تم پر صدقہ فرض کیا، جو اُن کے اُمراء سے لے کر اُن کے غرباء میں تقسیم کرایا جائے گا۔ اگر وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو ان کے بہترین مال سے احتراز کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ اس میں اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے"۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی "حجۃ اللہ البالغہ" میں مذہبی آسانیوں پر مفصل گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ لوگوں کی طبیعت کی رغبتوں کو سامنے رکھ کر مذہبی اصولوں کے اتباع کی دعوت دینی چاہئے۔ یہی وجہ

تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو تبلیغی کام کے لئے یمن روانہ کیا تو ہدایت فرمائی:

"یسرا و لا تعسرا و بشرا و لا تنفرا و تطاوعا و لا تختلفا"

''یعنی (دین کو) آسان کر کے پیش کرنا، سخت بنا کر نہیں۔ لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا اور باہم ہمیشہ موافق رہنا، اختلاف نہ کرنا''۔

مشائخ چشت، اشاعتِ دین کے اسی اصول پر عامل تھے اور اسی کو زیادہ مؤثر خیال کرتے تھے۔ شاہ کلیم اللہ مریدوں میں ادب و احترام کا جذبہ پیدا کرنے پر بڑا اصرار کرتے تھے۔ وہ مبلغین کو اس امر کی ہدایت کیا کرتے تھے کہ تبلیغ کی زبان وہ ہونی چاہئے جو مخاطبوں کی زبان ہو۔ ان کی تصانیف میں نظام خلافت، طریقۂ بیعت اور اتباع شریعت کی تلقین جیسے مضامین کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

آنچہ در شریعت راسخ نیست، ناقص است ... مرد آن ست کہ جامع باشد میان شریعت و طریقت و حقیقت''۔

''شریعت معیار است، عیار فقر بر شریعت روشن می گردد''۔

بے شریعت صوفیوں کو انہوں نے ملحد کہا ہے۔ دنیا داری کے وہ مخالف نہ تھے۔ لیکن دنیا طلبی اور حبِ جاہ کے وہ سخت خلاف تھے اور امراء و سلاطین کے ہاں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے:

''ملاقات سلاطین کہ بر در درویش آیند، روا باشد، اما بر در آنہا نباید رَفت''

یہ بھی ان کا ہی کا قول ہے: ''اختلاط ملوک رونق ایمان می برد''

شاہ کلیم اللہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ زندگی بھر احیائے سنت اور ردِ بدعات کے لئے سرگرم عمل رہے۔

اکابر مشائخ چشت یعنی شیخ الشیوخ فرید الدین مسعود گنج شکر اور خواجہ نظام الدین اولیاء کی طرح شاہ کلیم اللہ بھی حنفی المذہب تھے۔ شاہ کلیم اللہ کی تصنیف کردہ تفسیر قرآن، القرآن بالبیان ۱۲۹۰ھ میں شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر شائع ہو چکی ہے۔ اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق ''شاہ کلیم اللہ وحدت الوجود جیسے پیچیدہ مسئلے پر اندھا دھند بحث مباحثے کے سخت خلاف تھے۔ زندگی بھر وہ اعلائے کلمۃ الحق اور اسلام کی حقیقی اشاعت کے لیے جدو جہد کرتے رہے۔ اُن کی اس جدو جہد کا یہ نتیجہ نکلا کہ

دکن میں اسلام کی بڑی جامع تبلیغ ہوئی اور بالخصوص پنجاب، بہاول پور اور سرحد میں اُن کے سلسلہ کے بعد میں آنے والے بزرگوں، خواجہ نور محمد مہاروی، قاضی محمد عاقل، خواجہ محمد سلیمان تونسوی، خواجہ شمس الدین سیالوی، خواجہ غلام حیدر شاہ جلال پوری اور پیر مہر علی شاہ گولڑوی کی مساعی کی بدولت اسلام کو نئی زندگی نصیب ہوئی۔''

حضرت شاہ کلیم اللہ کے خلفاء میں شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ، شاہ فخر الدین دہلویؒ، خواجہ نور محمد مہاروی، حضرت مولانا محمد ہاشم، شاہ جمال الدین جے پوری، حضرت شاہ نانو جن، حضرت مولانا عبدالمجید اور شاہ نیاز احمد بریلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مبلغ اسلام، مفسر قرآن شاہ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ نے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۰ھ کو وفات پائی۔ اُن کا مزار دہلی میں مرجع خلائق ہے۔ ''فاضل ہادیٔ دہر'' تاریخ وفات ہے۔

سلطان احمد فاروقی نے اپنی تالیف ''تذکرہ اولائے چشت'' میں حضرت کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی کا سن ولادت ۱۰۵۰ھ (۲۴ جمادی الاول) اور تاریخ و سن وفات ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ بیان کرنے کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کو آپ کے مکان مسکونہ میں دفن کیا گیا۔ جب کہ اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادی لمبی عمر پا کر دہلی میں ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۷۲۹ کو فوت ہوئے اور اپنی خانقاہ کے صحن میں دفن ہوئے جہاں آپ کے سکونتی مکانات بھی تھے۔

شاہ عنایت قادری

حضرت حافظ شاہ محمد عنایت لاہوری کا شمار برصغیر کے مشاہیر اسلام میں ہوتا ہے۔ انہوں نے خطۂ پنجاب اور اس کے گرد و نواح میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت میں قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ وہ ظاہری و باطنی علوم کے جامع اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔

حافظ شاہ محمد عنایت اللہ قادری، اُن کی کنیت ابو المعارف اور والد کا نام پیر محمد تھا۔ لاہور میں مستقل سکونت رکھنے کی بناء پر لاہوری کہلائے۔ اصلاً قصور کے رہنے والے تھے۔ اس لئے قصوری ثم لاہوری کے لاحقے سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ شاہ محمد عنایت لاہوری سلسلۂ قادریہ شطاریہ سے روحانی نسبت رکھتے تھے اور حنفی المذہب تھے۔ وہ کئی اہم کتابوں کے مصنف اور شارح بھی ہیں۔ ان کے غیر معمولی علم و فضل اور دینی و علمی اور تبلیغی خدمات کے پیشِ نظر مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے۔

مولوی فقیر محمد ''حدائق الحنفیہ' میں لکھتے ہیں کہ محمد عنایت اللہ قادری قصوری لاہوری الشطاری جامع علوم ظاہری و باطنی، فقیہِ فاضل اور صوفی کامل تھے۔''

مفتی غلام سرور لاہوری ''حدیقۃ الاولیا'' میں شاہ عنایت لاہوری کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ حضرت شاہ رضا قادری لاہوری کے خلفاء میں سے مراتب عظیم، جامع علوم ظاہری و باطنی اور مظہرِ انوارِ صوری و معنوی تھے۔

''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کی دوسری جلدی (عربی ادب) کے مقالہ نگار ظہور احمد اظہر ''نزہتہ الخواطر'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مردم خیز خطہ لاہور نے عربی و

اسلامی علوم کے جن نامور نا قابل فراموش فضلا کو جنم دیا ان میں شیخ ابو المعارف عنایت اللہ لاہوری بھی ہیں جو اپنے عہد میں نہ صرف لاہور بلکہ اطراف و اکناف میں بھی ایک فقیہ اور ممتاز عالم دین کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے تھے۔''

حضرت شاہ محمد عنایت قادری نے اسلامی علوم وفنون بالخصوص، فقہ، حدیث، تفسیر اور علم الکلام کی باقاعدہ تعلیم اپنے عہد کے نامور اساتذہ وعلماء سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے ظاہری علوم کی تحصیل مولانا سید ابوالنصر عرف سید الیاس اور مولوی عبدالہادی لاہوری سے کی اور پھر حضرت شاہ علی رضا فاروقی نبیرہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ محمد سلطان بخاری سے باطنی فیض حاصل کیا۔ ظاہری و باطنی علوم سے باقاعدہ آراستہ ہوئے تو شاہ محمد عنایت اللہ ۱۱۱۱ھ کے بعد حضرت شاہ محمد رضا قادری شطاری لاہوری کے حلقہ بیعت سے منسلک ہو گئے۔ جو صاحب علم وعمل اور جامع شریعت وطریقت تھے۔ شاہ محمد رضا قادری شیخ محمد فاضلؒ لاہوری کے مرید اور خلیفہ مجاز تھے۔

شاہ محمد عنایت قادری حضرت شاہ محمد غوث گیلانی قادریؒ لاہوری متوفی ۱۱۵۲ھ اور شیخ میر محمد یعقوب لاہوری قدس سرہٗ، کے ہم عصر تھے۔ ان کے تذکرہ نگار مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ ''حضرت شاہ محمد عنایت قادری لاہور میں آ کر قیام پذیر ہوئے تو ہزاروں طالبانِ حق، حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر مراتب تکمیل کو پہنچے اور ان کا ہنگامہ مشیخت ان کی زندگی کے آخری ایام تک گرم رہا۔'' حضرت شاہ عنایت کے تلامذہ اور خلفاء میں بڑے بڑے علماء وفضلاء شامل ہیں۔ اور طالبان علم دور و نزدیک سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اکتساب علم کرتے تھے۔

حضرت شاہ محمد عنایت اللہ قادری کے علمی مرتبہ و مقام اور ان کے روحانی کمالات کا اندازہ کرنے کے لئے صرف یہ بات ہی کافی ہے کہ سید بلھے شاہ ایسا صاحب علم وفضل اور باکمال صوفی شاعر ان کے زمرۂ خلفاء میں شامل ہے۔ سید بلھے شاہ نے حضرت شاہ محمد عنایت کی خدمت میں حاضر رہ کر علم وفضل کے علاوہ باطنی فیوض و برکات بھی حاصل کئے۔ سید بلھے شاہ نے پنجابی زبان میں ہزاروں کی تعداد میں ابیات اور کافیاں لکھیں۔ جو آج بھی خطہ پنجاب کے گوشے گوشے میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ سید بلھے شاہ اپنے اشعار میں زیادہ تر توحید کے مضامین کو پیش اور بیان کرتے تھے جو صوفیہ کرام کا خاص موضوع ہے۔ اس توحید خاص کی تعلیم سید بلھے شاہ نے اپنے مرشد حضرت شاہ محمد عنایت

اللہ قادری ہی سے حاصل کی تھی۔ لفظ بلھے شاہ کے تلفظ کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔ مولانا غلام سرور لاہوری نے ''حدیقۃ الاولیا'' میں ان کا نام سید بہلی شاہ لکھا ہے۔ جبکہ مولوی محمد شفیع نے ''اولیائے قصور'' میں لکھا ہے کہ اس لفظ کا تلفظ ''بلھے' یا ''بلھا'' ہے۔ اس لئے کہ ان کی مہر ''بلھا شاہ قادری'' ۱۱۸۱ھ سے بھی اس تلفظ یعنی بلھا کی تائید ہوتی ہے۔ اُن کا تفصیلی ذکر بھی کیا جائے گا۔

حضرت شاہ محمد عنایت قادری نے درس و تدریس اور اپنے مریدین کی اخلاقی و روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مولوی فقیر محمد نے شاہ عنایت کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے شرح وقایہ کے حواشی مسمٰی بہ غایت الحواشی دو جلدوں میں تصنیف کئے جن میں فروعِ کثیرہ داخل کئے اور کنزالدقائق کی شرح ملتقط الدقائق کے نام سے تصنیف کی۔ شرح الوقایۃ پر ان کا شاندار حاشیہ جو غایۃ الحواشی کے نام سے موسوم ہے بڑے اہم اور مشکل فقہی مسائل اور فروعات سے بحث کرتا ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی لکھنوی نے ''عمدۃ الرّعایۃ'' کے مقدمے میں اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے صراحت سے لکھا ہے کہ میں نے شاہ عنایت قادری کی اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ''کنزالدقائق'' پر بھی ملتقط الحقائق کے نام سے حاشیہ لکھا ہے جس میں انہوں نے باب تشہد میں سبابہ کے ساتھ اشارہ کی سنت کو ترجیح دی ہے اور دو رسالے ''ہبۃ الطاعات'' اور ''تنقیح المرام'' تحریر کئے ہیں۔

ڈاکٹر زبید احمد نے ''عربی ادبیات میں پاکستان و ہند کا حصہ'' کی فصل سوم میں ''علوم فقہ'' کے زیر عنوان جن ۸۰ صاحبِ تصنیف ائمہ فقہاء کا تذکرہ کیا ہے ان میں ابوالمعارف عنایت اللہ قادری لاہوری بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر زبید احمد نے شاہ عنایت قادری کی علم فقہ پر دو کتابوں ''ملتقط الحقائق فی شرح کنزالدقائق'' اور ''غایۃ الحواشی علیٰ شرح الفوائد'' کا حوالہ بھی دیا ہے۔

محمد اقبال مجددی اپنی کتاب ''حیات شاہ عنایت قادری'' میں لکھتے ہیں کہ شاہ عنایت کی اب تک سولہ تصانیف کا سراغ مل چکا ہے جو عربی اور فارسی میں ہیں۔ ان سولہ کتابوں میں شاہ عنایت کی غایت الحواشی ضخیم ترین کتاب ہے۔ مولانا غلام سرور لاہوری نے شاہ عنایت کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند

کی تیرھویں جلد جو پاکستان کے علاقائی ادبیات پر مشتمل ہے کے مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی نے لکھا ہے کہ شاہ عنایت مفسر قرآن تھے۔ تصوف کے متعلق کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

شاہ عنایت قادری توحید اور رزقِ حلال پر بہت زور دیتے تھے۔ چنانچہ محنت مزدوری کر کے اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔ مولانا غلام سرور لاہوری نے لکھا ہے کہ حضرت قوم کے باغبان تھے۔ یہاں ان کی مراد ہے کہ باغبانی ان کا پیشہ تھا اور قوم کے ارائیں تھے۔ جیسا کہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند'' کے مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی نے لکھا ہے کہ شاہ عنایت قوم کے ارائیں تھے۔ دوسرے لوگ بالعموم، اور نسب پر فخر کرنے والے سید بلھے شاہ کے رشتہ دار بالخصوص طعنہ زنی کیا کرتے تھے کہ انہوں نے سید ہونے کے باوجود ایک ارائیں کی بیعت قبول کر لی ہے۔ مگر وہ فرطِ عقیدت سے کہا کرتے۔ ''بلھے کو سید مت کہو وہ بھی ارائیں ہے، گویا کہ بلھے شاہ نے اپنے قول وفعل سے اس حقیقت کو ثابت کیا کہ نام ونسب رنگ ونسل اور ذات برادری پر فخر و ناز کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف اُمر ہے جس سے احترام آدمیت کے قرآنی اُصول کی نفی ہوتی ہے۔

شاہ عنایت قادری احکام شریعت کی ہر طرح پابندی کر کے طریقت کی طرف جانا پسند کرتے تھے جو اکثر و بیشتر صوفیہ کا دستور العمل ہے۔ ادھر بعض اوقات جذب وسُکر کے عالم میں بلھے شاہ کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے تھے جو بظاہر احکام شرع سے مطابقت نہیں رکھتے تھے مگر شاہ عنایت قادری اپنے مرید کے اس عمل پر نہ صرف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے تھے بلکہ اُن سے ناراض ہو جاتے تھے جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ عنایت قادری احکام شریعت کی پابندی کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران اور پھر بیسویں صدی کے آغاز میں تحریک خلافت کے دوران بہت سے علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ لیکن شاہ عنایت قادری وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے ہندو اکثریت والے صوبوں کو دارالحرب قرار دے کر مسلم انڈیا اور غیر مسلم انڈیا کی تخصیص کر دی۔ اور اس طرح برصغیر میں تین ملکوں کی واضح طور پر نشان دہی کر دی۔

حضرت شاہ عنایت قادری کی شہر قصور سے نقل مکانی کر کے لاہور میں سکونت اختیار کرنے کی وجہ حاکمِ قصور حسین خان سے تعلقات میں کشیدگی تھی۔ حاکمِ قصور سے کبیدہ خاطر ہو کر انہوں نے قصور کو خیر باد کہہ کر لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا۔ جہاں وہ اپنی عمر کے

آخری ایام تک قابل قدر دینی، علمی، فقہی، تبلیغی اور اصلاحی خدمات انجام دیتے رہے۔

حضرت شاہ محمد عنایت قادری لاہوری کے سنِ وفات میں اختلاف رائے ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری، مولوی فقیر محمد اور ڈاکٹر زبید احمد تینوں نے لکھا ہے کہ انہوں نے ۱۱۴۱ھ میں وفات پائی۔ جب کہ پروفیسر ظہور احمد نے ان کا سنِ وفات ۱۱۳۱ھ تحقیق کیا ہے۔ مگر شاہ محمد عنایت کے تذکرہ نگار محمد اقبال مجددی ''حیات شاہ عنایت قادری'' میں لکھتے ہیں کہ شاہ عنایت کا سال وفات کسی معاصر تذکرہ نویس نے نہیں لکھا۔ پہلی مرتبہ مفتی صاحب نے ہی ۱۱۴۱ھ بغیر کسی سند کے لکھ دیا جسے بعد کے مورخ نقل کرتے رہے لیکن یہ سنِ وفات اس لئے غلط ہے کہ شاہ عنایت کے ایک معاصر عالم حاجی محمد شریف قصوری متوفی ۱۱۵۳ھ، جن کے شاہ عنایت سے گہرے روابط تھے، نے اپنے ایک مکتوب بنام شاہ عنایت میں شاہ عنایت کی ایک تصنیف سے اقتباس لیا ہے اور شاہ صاحب کے نام کے ساتھ سلمۂ اللہ تعالیٰ لکھا ہے اور اپنی مہر العبدالفقیر محمد شریف ۱۱۴۸ھ ثبت کی ہے جس سے ظاہر ہے کہ شاہ عنایت ۱۱۴۸ھ تک بقیدِ حیات تھے، محمد اقبال مجددی کی تحقیق کے مطابق فقیہ دوراں مفسر قرآن مفتی ہند ابوالمعارف شاہ محمد عنایت اللہ حنفی قادری لاہور نے ۱۱۵۰ھ کے قریب وفات پائی۔

شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی

شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی کا شمار برصغیر پاکستان و ہند کے اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔علم و فضل میں یکتا، صدق و صفا میں فرد اور وعظ و ارشاد میں یگانۂ روزگار تھے۔ ظاہری و باطنی علوم کے جامع اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ انہوں نے بارھویں صدی ہجری کے نصف اوّل کے دوران میں مسلمانانِ برصغیر کی اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت اور دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے باب میں شان دار اور نا قابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ حنفی المذہب تھے۔

شیخ فاضل الدین بٹالوی کا اسم گرامی محمد، لقب فاضل الدین، عرف ''قطب معظم'' اور کنیت ابوالفرح ہے۔ وہ ضلع سیال کوٹ کی تحصیل شکرگڑھ کے موضع نور پور چک قاضی میں ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد کا نام سید عنایت اللہ تھا جو ایک صاحبِ ثروت اور بڑے زمین دار ہونے کے علاوہ سلطنت مغلیہ کے خطاب یافتہ بھی تھے۔ اُن کے جد امجد شیخ ابوالحسن علی بغدادی معروف بہ سید بدیع الدین آغا مغل فرمانروا نصیرالدین ہمایوں کے عہد حکومت میں برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے اور تحصیل شکرگڑھ میں اقامت اختیار کی۔ اس طرح شیخ محمد فاضل الدین سادات کے ایک معروف خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی غوث الاعظمؒ سے جاملتا ہے۔

شیخ محمد فاضل الدین نے سیال کوٹ، لاہور اور دہلی ایسے اسلامی علوم و فنون کے اہم مراکز میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ سیال کوٹ میں انہوں نے برصغیر کی نام وَر دینی و علمی شخصیت مولوی عبدالحکیم سیال کوٹی کی قائم کردہ تعلیمی درس گاہ میں عربی اور فارسی کی

ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ سیال کوٹ کی اس اہم دینی درس گاہ میں انہوں نے اس زمانے کے معروف عالم دین اور مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کے نواسے مولانا ابوالحسن فتح محمد سیالکوٹی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ انہوں نے عربی اور فارسی زبانوں کے علاوہ دینی علوم کی تحصیل میاں محمد غوث لاہوری سے کی اور پھر مزید تعلیم کی غرض سے دہلی چلے گئے اور دارالسلطنت دہلی کے ممتاز اساتذہ سے اکتساب علم کیا۔

شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی نے اپنا حلقۂ وعظ و درس قائم کیا تو ان کے فضل و کمال کا چرچا عام ہوگیا اور طالبانِ حق دور و نزدیک سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ چنانچہ ان کی دینی و تعلیمی خدمات اور تبلیغی کارناموں کے پیشِ نظر مؤرخین اور تذکرہ نویس ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں اور ان کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہیں۔

مولوی فقیر محمد ''حدائق الحنفیہ'' میں ان کے احوال و آثار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شیخ محمد فاضل قادری مجددی بٹالوی علمائے اجلہ اور فضلائے کبریٰ میں سے شریعت و طریقت میں ایسا راسخ قدم رکھتے تھے کہ علماء اور مشائخ میں سے کوئی بھی آپ کے قول و فعل پر حرف گیری نہیں کر سکتا تھا۔ تمام عمر تشنگانِ علم اور طالبان حق کی تعلیم و تدریس میں بسر کی اور بے شمار شاگرد اور ہزاروں سالکانِ طریقت آپ کے وسیلہ سے کمالاتِ ظاہری و باطنی کو پہنچے۔''

گویا کہ آپ ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے علوم کا درس دیتے تھے اور ظاہری و باطنی دونوں علوم میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ مؤرخ لاہور محمد دین کلیم نے ''تذکرہ مشائخ قادریہ'' میں شیخ محمد فاضل الدین کے فضائل و محاسن بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

''بارھویں صدی ہجری میں بٹالہ میں مشائخ کا ایک خاندان آباد ہوا جس کے جد اعلیٰ ابوالحسن علی بغدادی معروف بہ بدیع الدین شہید حسن الجیلانی ہیں۔ آپ عراق سے ہندوستان آئے تھا۔ آپ کی اولاد میں سے حضرت فاضل الدین نے علم و فضل کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ بیس سال کی عمر میں گھر سے نکلے اور مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کے بعد بٹالہ شریف پہنچے جہاں آپ نے لنگر جاری کیا جس میں صبح و شام

سیکڑوں افراد کھانا کھاتے تھے۔ آپ نے اپنی خانقاہ میں مسجد، مدرسہ اور مہمان خانے بھی تعمیر کرائے۔

مولوی فقیر محمد نے لکھا ہے: "جب آپ خانقاہ کی عمارت بنوا رہے تھا تو آپ کے پاس کچھ نقد موجود نہ تھا۔ پس آپ معماروں اور مزدوروں کو اجرت ہر روز خزانۂ غیب سے دیتے تھے۔"

مفتی غلام سرور لاہوری "حدیقۃ الاولیاء" میں شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی کے احوال و آثار بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "یہ حضرت اجلہ علماء و کبریٰ فضلاء و عظماء فقرائے پنجاب میں سے تھے۔ تمام عمر تدریس و تعلیم میں گزاری اور ہزاروں لوگ ان کے ذریعے سے تکمیل ظاہری و باطنی کو پہنچے۔ شجرہ ان کا اس طرح پر حضرت شیخ محمد طاہر (بندگی) لاہوری کے ساتھ پہنچتا ہے کہ حضرت شیخ محمد فاضل مرید و خلیفہ شیخ محمد افضل کلانوری اور وہ مرید شیخ ابو محمد لاہوری اور وہ مرید شیخ محمد طاہر لاہوری تھے۔"

"اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" میں شیخ فاضل الدین قادری کا تعارف ان شان دار الفاظ میں کرایا گیا ہے:

> "سید ابوالفرح محمد المعروف بہ قطب معظم پنجاب میں سلسلۂ قادریہ فاضلیہ کے بانی ... گیلانی سادات میں سے تھے۔ انہوں نے بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں بٹالہ، ضلع گورداس پور (بھارت) میں روحانیت کی شمع روشن کی اور سلسلہ قادریہ کی اشاعت کابل و بخارا کے علاوہ برصغیر پاک و ہند کے اطراف و اکناف تک کی۔ جلیل القدر شیوخ و اولیاء اللہ نے انہیں فوادالعارفین اور افتخارالاولیاء اللہ کے القاب سے پکارا اور علمائے کبار نے جامع منقول و معقول کا لقب اُن کے لیے استعمال کیا۔ اُن کے اجداد کئی پشت سے برصغیر کی اسلامی حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔ املاک اور جاگیروں کی وجہ سے ان کے بزرگ دُنیوی لحاظ سے بھی بڑے نام وَر اور صاحب حیثیت تھے،

مگر جب انہیں حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ نے القاء کے ذریعے ارشاد فرمایا کہ ''سلسلۂ قادریہ کا تبلیغی جھنڈا'' نصب کرو تو انہوں نے فقر اور خدمت اسلام کو زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ بٹالہ میں انہوں نے علوم دینی کے لیے ایک وسیع مدرسہ قائم کیا جہاں سے بڑے بڑے عالم ربانی فارغ التحصیل ہوئے اور متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ کثیر التعداد لوگوں نے ان کے ہاتھ پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی۔ اُن کے سیکڑوں خلفائے طریقت نے ملک کے گوشے گوشے میں سلسلۂ قادریہ کی تبلیغ کی۔ انہیں حضرت غوث اعظم سے عشق صادق تھا۔ روایت ہے کہ ان کی یہ دعا تھی کہ وقتِ وفات ان کی زبان پر کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ یا شیخ عبدالقادر شیئاً لِلّٰہ کا وِرد جاری ہو اور ایسا ہی ہوا۔''

''شیخ فاضل الدین نے جو روایات اپنے سلسلے کے لیے قائم کیں ان میں ایک یہ ہے کہ اُن کی نسل سے خاندان کی بڑی شاخ کا فرزند اکبر سجادہ نشین ہو۔ دینی علوم کی اشاعت کا اہتمام ہو اور طریقتِ قادریہ فاضلیہ کا اجتماع حضرت غوث اعظم کے عرس کی صورت میں قائم رہے۔ چنانچہ ایک طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود آج تک یہ روایات قائم ہیں۔''

شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی نے ایک روحانی اشارے کے مطابق شیخ محمد افضل قادری کلانوری کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی جو حضرت شیخ طاہر بندگی کے خلیفہ مجاز حضرت شیخ ابو محمد قادری کے مرید خاص اور خلیفہ مجاز تھے اور آگے چل کر شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی، حضرت شیخ محمد افضل قادری کے مرید خاص اور بالآخر خلیفہ اعظم بنے۔ شیخ محمد افضل قادری کے خلفائے مجاز میں شیخ محمد نور قادری نے بھی قابل قدر شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ''قرطاس التعارف'' مطبوعہ دربار قادریہ فاضلیہ میں مرقوم ہے کہ ''حضرت شیخ ابو محمد لاہوری نے جو حضرت شیخ محمد طاہر بندگی لاہوری کے مسند نشین تھے ایک شب خواب میں شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی کو حضرت شیخ محمد افضل کلانوری کی طرف رجوع

کرنے کا اشارہ فرمایا۔ روایت ہے کہ شیخ ابو محمد لاہوری کا یہ اشارہ حضرت غوث الاعظم کے حکم کے ساتھ مربوط تھا اور شیخ محمد افضل قادری کو بھی اس کا علم ہو چکا تھا۔ چنانچہ شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی نے حضرت شیخ محمد افضل قادری کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے شرف بیعت حاصل کیا۔

مولوی فقیر محمد نے ''حدائق الحنفیہ'' میں شیخ محمد فاضل الدین کے تذکرے کے آغاز میں ان کا نام شیخ محمد فاضل قادری مجددی بٹالوی لکھا ہے۔ لیکن کسی اور مؤرخ یا تذکرہ نویس نے انہیں مجددی نہیں لکھا ہے۔ البتہ ''قرطاس التعارف'' میں مذکور ہے کہ شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی کو اپنے مرشد طریقت شیخ محمد افضل کے واسطے سے اور شیخ محمد افضل کو ان کے مرشد شیخ ابو محمد لاہوری کے واسطے سے اور شیخ ابو محمد لاہوری کو اُن کے مرشد طریقت حضرت شیخ محمد طاہر بندگی کی وساطت سے نسبت قادریہ عنایت ہوئی تھی۔ جب طریقت قادریہ شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی کی عظمت چاردانگ عالم میں پھیل گئی تو اُن کے مرشد شیخ محمد افضل کلانوری نے ان سے فرمایا کہ ''انوارِ قادریہ تو آپ تک پہنچ گئے اگر نقش بندی نسبت آپ پسند کریں تو وہ بھی آپ کو عنایت ہو سکتی ہے۔'' جس کے جواب میں شیخ محمد فاضل الدین نے عرض کیا کہ ''مجھے فیضانِ قادریہ سے اس قدر عشق عالیہ ہے کہ میرے قلب و روح کی تمام وسعتوں میں فیضانِ قادریہ بھر گیا ہوا ہے۔ اور اس فیضان کی موجودگی میں کسی دوسری نسبت کی طرف میرے قلب و روح متوجہ نہیں ہو سکتے۔ مجھے حضرت غوث اعظمؒ کی غلامی کافی ہے۔'' حضرت شیخ محمد افضل کلانوری نے فرمایا کہ ''واقعی آپ نے درست کہا ہے کیونکہ حضرت غوث اعظم نے بدستِ خود آپ کے خاندان میں یہ (قادریہ) جھنڈا لگایا ہے۔''

روایت ہے کہ شیخ فاضل الدین نے کسی اعلیٰ منصب کے لیے دارالسلطنت دہلی جانے کا قصد کیا تو ان ہی دنوں میں حضرت سیدنا غوث اعظمؒ نے بصورت القاء آپ کو ارشاد فرمایا کہ حقیقت محمدیہ کے فیضان کی تبلیغ و اشاعت کے لیے آپ اپنی زندگی مختص کر دیں اور فقیری کی عزت کو ہر چیز پر ترجیح دیں۔ یہ القاء اُس وقت ہوا جب شیخ محمد فاضل الدین قرآن حکیم کی صورت آل عمران حفظ کرنے میں مصروف تھے۔ اور جب آپ آیت

قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع

الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء
بیدک الخیر انک علیٰ کل شئی قدیر
یعنی اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے ملک عطا فرماتا ہے،
جسے چاہے ملک عنایت نہیں کرتا اور جسے چاہے عزت دیتا ہے،
جسے چاہے عزت سے محروم رکھتا ہے۔ تیرے ہاتھ میں ہر قسم کی خیر
ہے اور تو ہر حقیقت پر نہایت قدرت رکھنے والا ہے۔

کی تلاوت کر رہے تھے تو اس آیت کریمہ کا آپ کی زبان پر تکرار جاری ہو گیا اور آپ کو حضرت غوث اعظم کی زیارت نصیب ہوئی اور یہ رویت عینی تھی اور مذکورہ ارشاد کا صدمہ ہوا تو اُس وقت انوارِ قادریہ مجملاً آپ کی روح پر مفتوح ہو گئے اور آپ کی زبان پر ''یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کا وِرد جاری ہو گیا۔ اس آیت مبارکہ پر مفسرین قرآن حکیم نے جو افادات تحریر کیے ہیں ان افادات سے استنباط ہوتا ہے کہ آیت کریمہ میں جو لفظ ''ملک'' ہے اُس سے روحانی اقتدار کے استیلا اور ترفع کا مطلب بھی لیا جا سکتا ہے۔ ملک سے مراد مقدس ملک ہے جو ہر قسم کے اقتدار کو حاوی ہے۔ فقر بھی اس ہی جنس کی نوع ہے۔

''قرطاس التعارف'' میں لکھا ہے کہ حضرت غوث اعظمؓ نے جب شیخ محمد فاضل الدین کو طریقتِ قادریہ کی اشاعت کا کام سونپا تو اُن کی زبان پر ''یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کا وِرد جاری ہو گیا۔ اور یہ واقعہ بھی کتبِ تاریخ و تذکرہ میں درج ہے کہ حضرت شیخ محمد فاضل الدین نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کی تھی کہ اُن کی وفات کے وقت بھی اُن کی زبان پر ''یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ'' جاری ہو۔ چنانچہ جب اُن کی وفات ہوئی تو ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اُن کی زبان پر جاری ہوا اور اس کے بعد ''یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ'' وِردِ زبان ہو گیا۔ حتیٰ کہ اُن کا وصال ہو گیا۔

شیخ محمد فاضل الدین کو جو جذبۂ عشق حضرت غوث اعظم کے حضور سے ملا تھا اُس سے ہمیشہ اُن کا دل منور و معطر رہا۔ اس ضمن میں ایک لطیف نکتہ لائقِ ذکر ہے جس کا صریحی تعلق متذکرہ آیت کریمہ کے معارف سے ہے۔ سید الطائفہ حضرت شیخ جنید بغدادی جو اربابِ توحید اور مشائخ کرام کے استاد اور امام ہیں، تصوف کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''تصوف ایک سعیٔ مسلسل ہے جس میں سالک ہمہ وقت مستغرق رہتا ہے

اور اصل اور جوہر کے لحاظ سے یہ صفت اللہ کی ہے اور انعکاس کی حالت میں یہ صفت انسان کی ہو جاتی ہے۔اس سعیٔ پیہم کا ثمرہ توحید خاص ہے۔ اس کی وضاحت میں شیخ بغداد حضرت جنید فرماتے ہیں کہ توحید خاص یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کے احساس سے یک سر عاری ہو کر ایک خیالی صورت میں حق تعالیٰ کے سامنے اس طرح حاضر ہو جائے کہ دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہے۔حتیٰ کہ توحید ذات حق کے بحر ذخار میں پوری طرح اُس شخص کو غرق کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کا خیالی وجود بھی فنا ہو جاتا ہے اور اسے حق تعالیٰ کی وحدانیت کا کامل ادراک اُس کے قرب کی وجہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔

حضرت شیخ محمد فاضل الدین قادری نے اسلامی علوم وفنون کی وسعت وفروغ کے لیے ''مدرسہ قادریہ فاضلیہ'' کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی تو اُن کے فضل وکمال کی شہرت عام ہو گئی اور تشنگانِ علم اور طالبان حق ملک کے گوشے گوشے سے جوق در جوق بٹالہ میں واقع اس عظیم علمی درس گاہ میں آنے لگے۔ چنانچہ شیخ محمد فاضل الدین کے دامن علم وفضل سے وابستہ ہو کر بے شمار تشنگانِ علم سیراب اور لاتعداد طالبان حق فیض یاب ہو کر دینی و دنیوی ہر لحاظ سے سربلند وسرفراز ہوئے۔ پھر سیکڑوں علماء اور شیوخ اس عظیم مثالی درس گاہ سے تربیت حاصل کر کے نکلے اور انہوں نے برصغیر کے مختلف مقامات اور شہروں میں لاتعداد خانقاہیں اور دینی مدارس قائم کیے جہاں طلباء کو دینی علوم کی تعلیم دینے کے علاوہ ان کی اخلاقی و روحانی تربیت بھی کی جاتی تھی۔ مرشد طریقت اور سرپرست مدرسہ قادریہ فاضلیہ شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی کی یہ ہدایت تھی کہ اُن کے سجادہ نشینوں کے لیے درس وتدریس کا سلسلہ اور مدرسہ کا وجود ضروری ہے۔

ابوالفرح شیخ محمد فاضل الدین نے وعظ وارشاد اور درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ مؤرخین اور تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ مؤرخ لاہور محمد دین کلیم قادری ''تذکرہ مشائخ قادریہ'' میں شیخ محمد فاضل الدین کے سوانح اور دینی وعلمی کارنامے بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ'' آپ نے عربی اور فارسی زبان میں تقریباً ایک سو کتب تحریر کی ہیں۔ ان میں سے قصیدہ غوثیہ حضرت غوث اعظم پر آپ کی عربی اور فارسی شروح اور ترجمہ ''مواعظ الرحمٰن'' کے نام سے سننے میں آتے ہیں۔''

شیخ محمد فاضل الدین معقولات ومنقولات کے ماہر تھے۔ فقہ وحدیث اور تفسیر کے

علاوہ تصوف اور ادبیات میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہیں عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات دونوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ ''قرطاس التعارف'' کے مطابق ''آپ کے آثارِ قلم یعنی تصنیفات بزبان عربی و فارسی ایک سو تک پہنچ چکی تھیں۔'' تصوف ان کا خاص میدان ہے۔ چنانچہ ان کی زیادہ تر تصنیفات علم تصوف پر مبنی ہیں جو اُن کے علمی و روحانی کمالات کی مظہر ہونے کے علاوہ علم وحکمت اور اسرار و رموز کا بڑا خزانہ بھی ہیں، جن کی اہمیت و افادیت کی وجہ سے ان کو قدوۃ کا رتبہ حاصل ہے۔

''بیان الاسرار'' شیخ فاضل الدین قادری کی علم تصوف میں ایک شاہکار تصنیف ہے جسے ارباب فکر ونظر بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ''بیان الاسرار'' حضرت غوث اعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کے شہرہ آفاق ''قصیدہ غوثیہ'' کی ایک شاندار اور بے مثال شرح ہے جو فصاحت و بلاغت، تفکر و تعقل، تحقیق و تعمق اور دلائل و براہین کے علاوہ اپنی ضخامت کے اعتبار سے بھی ایک لاجواب کتاب ہے۔ ''قرطاس التعارف'' کے مطابق ''بیان الاسرار'' قصیدہ غوثیہ کی ایک عدیم المثال شرح ہے جس میں شیخ محمد فاضل الدین نے تصوف کے امور و مسائل کو بڑی محنت، مہارت اور دِقتِ نظری سے بیان کیا ہے۔ اس میں بعض ایسی وضع کردہ باتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے تصوف کے بارے میں بہت سے شکوک رفع ہو جاتے ہیں اور تصوف کی اصل حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی وحدت الوجود کے قائل ہیں اور انہوں نے اپنے زمانے میں شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریۂ توحید کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے اور اپنی مفکرانہ نگارشات میں وجودی اور شہودی نظریات کی مفاہمت و مطابقت کی بھی سعیٔ بلیغ کی ہے اور فی الحقیقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جو خود بھی حنفی المذہب اور صوفی المشرب بزرگ تھے، کی طرح شیخ اکبر کے نظریہ وحدت الوجود کی تائید کی ہے اور وحدت الوجود کے مقابلے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پیش کردہ نظریہ وحدت الشہود کو ایک ''نزاع لفظی'' قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا تو یہ دعویٰ بھی اُن کی مفکرانہ نگارشات میں موجود ہے کہ ''اگر میں مسئلہ وحدت الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قرآن وسنت کے تمام نصوص و ظاہر سے اس کا اثبات کرسکتا ہوں۔'' اور شاہ ولی اللہ وہ

پہلے بزرگ نہیں ہیں جنہوں نے اس قسم کا دعویٰ کیا ہے۔ اُن سے پہلے آنے والے صوفیہ کرام میں سے بہت سے مشائخ نے نظریہ وحدت الوجود کو قرآن حکیم سے ثابت کرنے کا نہ صرف دعویٰ کیا ہے بلکہ اپنے اس دعویٰ کو عملی جامہ پہنانے کی قابل قدر اور مؤثر کوششیں بھی کی ہیں جن میں برصغیر کے صوفیہ کرام میں مفسر قرآن شیخ علی بن احمد مہائمی اور شیخ امان پانی پتی، شیخ عبدالرزاق جھنجانوی اور محمد بن فضل اللہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیخ محمد فاضل الدین نے اپنی کتاب ''بیان الاسرار'' میں بہ صراحت سے لکھا ہے کہ قصیدہ غوثیہ حضرت غوث اعظم کا کلام صحو ہے اور اس میں سُکر کا شائبہ تک نہیں ہے۔ انہوں نے اس کو انضباطِ فکر اور ہمہ گیر تعمق وجدان پر قائم کردہ استدلال سے ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ اُن کی اس بحثِ انیق کے مطالعے سے وہ حجابات جو سُکر کے مکتبِ فکر نے قصیدہ غوثیہ کے متعلق حائل کر رکھے ہیں ... سب دور ہو جاتے ہیں۔ بعض صوفیہ کا خیال ہے کہ قصیدہ غوثیہ حضرت غوث اعظم کا کلام سُکر ہے۔ مگر شیخ محمد فاضل الدین کا شمار اُن بزرگانِ دین میں ہوتا ہے جو قصیدہ غوثیہ کو کلام صحو قرار دیتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت غوث اعظم جیسی عظیم روحانی شخصیت سُکر کے کلام سے منزہ ہے جیسا کہ حضرت جنید بغدادی نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ عارف کی زندگی کا ایجابی پہلو یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے لیے روحانی رُشد و تربیت کا سرچشمہ ہوتا ہے اور اوج کمالات یہ ہے کہ عارف کو حب الٰہی کے کمالات میں استغراق عنایت ہو اور اس کے باوجود وہ صحو کی دولت و کیفیت سے مالا مال رہے۔ مگر یہ امتیاز نہایت نادرالوقوع ہے اور صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو مسلسل اللہ تعالیٰ کی نوازشِ بے پایاں سے شادکام ہوتے رہے ہیں۔

شیخ محمد فاضل الدین نے حضرت غوث اعظم کے قصیدۂ غوثیہ کو وحی حق قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ''ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ'' کا ظل ہے کیونکہ شیخ بغداد حضرت غوث اعظم ختمی مرتبت، خیرالبشر، رحمۃ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب حقیقی ہیں اور وہ اس پیغمبرانہ نیابت پر مامور تھے۔

شیخ محمد فاضل الدین نے اذکار و افکار اور مشاہدات و مکاشفات کے متعلق بھی کتب و رسائل تصنیف فرمائے جو ان کے روحانی جانشینوں کے پاس محفوظ ہیں اور سلسلہ عالیہ قادریہ فاضلیہ کے لیے ایک مخزن کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سلسلہ عالیہ کے

بزرگوں اور سالکوں کے لیے ضابطۂ عمل تصور ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے حضرت غوث اعظم کی منقبت اور عشق میں فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی نظمیں کہی ہیں جو ان کے مجموعۂ کلام ''جواہر تصوف'' میں درج ہیں۔

شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے اور انہوں نے شاعری کے ذریعے بھی اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت کا فریضہ ادا کیا۔ وہ پنجاب میں اردو شاعری کی تحریک کے روح رواں تھے جو اُن کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ شیخ محمد فاضل الدین اور اُن کے مرشد شیخ محمد افضل کلانوری دونوں حضرات نے ادبیات پنجاب پر گہرے اور دوررَس اثرات مرتب کیے۔ چنانچہ تحقیقی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں لکھا ہے کہ ''شیخ محمد افضل کلانوری کی شخصیت نے ادبیات پنجاب پر خاصا اثر ڈالا ہے۔ وہ خود شاعر تھے اور شیخ فاضل الدین بٹالوی اور ان کے متبعین جو اس تحریک کے روح رواں تھے شاعری میں اپنے مرشد کی سنت کی پیروی کر رہے ہیں۔''

حضرت شیخ محمد فاضل الدین کے دست حق پرست پر بے شمار لوگ بیعت کر کے اپنے گناہوں سے تائب ہوئے۔ ہزاروں لوگ اُن کی تبلیغی کوششوں سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ان کے شاگردوں کی طرح ان کے مریدوں اور خلفائے مجاز کا بھی حلقہ بہت وسیع ہے۔ اُن کے روحانی جانشینوں اور ان جانشینوں کے آگے جانشینوں کا سلسلہ بھی بہت وسیع ہے اور ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ شیخ محمد فاضل الدین کے ایک مرید اور خلیفہ شیخ نصیرالحق قادری عالی مرتبت شیخ ہونے کے علاوہ باکمال شاعر تھے۔ فارسی، اُردو، پنجابی اور ہندی میں شعر کہتے تھے۔ اردو اور فارسی میں ''نصیر'' اور پنجابی و ہندی میں ''نصیرا'' تخلص کرتے تھے۔

سید غلام قادر قادری فاضلی شیخ محمد فاضل الدین کے فرزند اکبر، مرید، خلیفہ اور روحانی جانشین تھے۔ بٹالہ میں مدرسہ قادریہ فاضلیہ سے اکتساب علم کیا۔ والد بزرگوار کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ اپنے والد بزرگوار کی طرح صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ علم و فضل، زہد و تقویٰ، ریاضت و مجاہدات اور حال و قال میں اپنی مثال آپ تھے۔ لقب ''اہل اللہ'' تھا۔ اُن کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا بڑا وسیع حلقہ تھا۔ لاہور کا گورنر بھی اُن کے عقیدت مندوں میں شامل تھا۔ انہوں نے تصوف پر

متعدد قابل قدر کتب تصنیف کیں۔ علم تصوف پر آپ کی ایک کتاب کا نام "صفاء المرات" ہے۔

شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین کے فرزند اکبر و خلیفہ و جانشین سید غلام قادر قادری فاضلی کے خلیفہ میاں غلام احمد خان قادری بلند روحانی مقام پر فائز اور جالندھر کی بستی غزاں کے بڑے زمین دار اور صاحبِ ثروت بزرگ تھے۔ میاں غلام احمد خان قادری کے خلفائے عظام اور روحانی جانشینوں میں حضرت حافظ دانا صاحب اور صوفی سیف الرحمن قادری خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کا تعلق لودھیانہ سے تھا۔ لودھیانہ متحدہ ہندوستان میں اور بعد از تقسیم ہند بھی پنجاب کے اہم ترین صنعتی اور تجارتی شہروں میں شمار ہوتا ہے نیز سیاسی طور پر اس کی اہمیت ہمیشہ مسلّم رہی ہے۔ حافظ دانا صاحب علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں یکتا ہونے کے علاوہ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے مرید اور خلیفۂ اعظم صوفی سیف الرحمٰن قادری لدھیانوی کی خانقاہ میں خلوت گزین تھے۔ دونوں عظیم المرتبت بزرگ اپنے زمانے میں وحدت الوجود کے بڑے ترجمان و علم بردار سمجھے جاتے تھے اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے شارح کی حیثیت سے مشہور تھے۔

شیخ محمد فاضل الدینؒ بٹالوی کے فرزندِ اکبر اور خلیفۂ مجاز سید غلام قادرؒ قادری فاضلی نے "صفاء المرات" کے علاوہ ادبِ عالیہ کی قابلِ قدر کتاب "مثنوی رمز العشق" لکھی۔ اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دین دُنی کا پشت پناہ — والی میرا فاضل شاہ
قطب حقیقت شمس یقین — نائب سید محی الدین
عارف کامل دِل آگاہ — نور محمد سرّ اللہ
اول آخر ظاہر باطن — ہاتھ ہمارے اس کا دامن
ناہیں اُس بن میرا کویو — اُس کا ہوں میں اُس کا چیرا
اپنے شہ کا لے کر نام — کیا رمز العشق تمام

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ شیخ محمد فاضل الدین کے علمی کمالات اور اُن کے روحانی فیوض و برکات کا دائرہ اُن کے اولاد و احفاد اور اُن کے خلفاء کی وساطت سے دور

تک پھیلا ہوا ہے۔ اُن کے روحانی جانشینوں میں صوفی سیف الرحمٰن قادری فاضلی جامع علوم ظاہری و باطنی اور مظہر انوارِ معنوی و صوری تھے۔ اُن کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔ وہ اپنے والد ماجد شیخ محمد کریم بخش اور اہل خانہ کے ہمراہ انیسویں صدی کے وسط میں سکھوں کے مظالم سے تنگ آ کر ہوشیار پور سے ہجرت کر کے لودھیانہ میں وارد ہوئے اور جو راس پونجی تھی اُس سے معمولی کاروبار شروع کیا مگر جلد ہی دن رات کی محنت اور امانت و دیانت کے اصولوں پر چل کر شہر کے سب سے بڑے تجارتی مرکز چوڑا بازار میں ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر کاروبار کو مزید وسعت دے کر ۱۸۹۱ء میں ''صوفی سیف الرحمٰن اینڈ سنز'' کے نام پر ایک بڑی فرم قائم کی جو پورے برصغیر کے سول محکموں کے علاوہ بری، بحری اور فضائی افواج کی یونیفارم اور اُس سے متعلقہ سامان مہیا کرتی تھی اور سینکڑوں خاندانوں کو روزگار بھی فراہم کرتی تھی۔ اس طرح صوفی سیف الرحمٰن صاحب کا شمار روسائے شہر میں ہونے لگا اور شیخ محمد فاضل الدین کی طرح حضرت صوفی سیف الرحمٰن قادری بھی روحانی اقتدار کے استیلا اور ترفع کے علاوہ دنیاوی نعمتوں سے بھی بہرہ وَر ہو گئے۔

حضرت صوفی سیف الرحمٰن سال میں دو ماہ تبلیغ کے لیے مختلف علاقوں میں تشریف لے جاتے تھے۔ اُن کی تبلیغ کا ایک منفرد انداز تھا۔ وہ عام لوگوں میں تبلیغ کرنے کی بجائے چوروں، ڈاکوؤں اور لٹیروں، بلکہ ان جرائم پیشہ افراد کے سرغنوں کو تبلیغ و تلقین اور اپنی تاثیر کلام کے ذریعے مطیع و منقاد بنا کر اُن کے دل و دماغ اور اُن کی طاقت و توانائی کا رُخ احکام الٰہی اور نیک کاموں کی طرف موڑ دیتے تھے اور وہ اپنی گناہ آلودہ زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر عبادت و ریاضت، مخلوقِ خدا کی خدمت و تواضع اور غرباء و مساکین اور مظلومین و محرومین کی امداد و اعانت کی طرف پوری یک سوئی اور تن دہی کے ساتھ متوجہ ہو جاتے اور اس طرح نہ صرف اہل اللہ بن جاتے بلکہ معاشرے کے مفید و مددگار رکن اور اسلام کے سرگرم و فعال مبلغ بن جاتے۔

شیخ محمد فاضل الدین کے سلسلۂ خلفاء اور اُن کے روحانی جانشینوں، بالخصوص حافظ دانا صاحب اور صوفی سیف الرحمٰن قادری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ نذرانے وغیرہ قبول نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنی جائز آمدنی سے نوع انسانی کی بالعموم اور اپنے مریدین اور تلامذہ کی بالخصوص امداد و اعانت کرتے تھے۔ گیارھویں شریف کا ختم

بڑے اہتمام اور باقاعدگی کے ساتھ منعقد کراتے اور صدقات و خیرات کا جو سلسلہ حضرت صوفی سیف الرحمٰن نے ڈیڑھ سو برس قبل شروع کیا تھا وہ اُن کے خانوادے میں اب تک اُسی تواتر و تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔

صوفی سیف الرحمٰن قادری کے والد بزرگوار شیخ محمد کریم بخش جب اپنے اہل و عیال سمیت لودھیانہ میں آئے تھے تو انہوں نے محلہ موچ پورہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وہاں بازار میں ایک خوب صورت مسجد تعمیر کرائی۔ جب کہ صوفی صاحب نے خود اپنے چاروں بیٹوں کے لیے چار بڑی حویلیوں کے علاوہ شہر سے باہر ایک بڑی خانقاہ اور اُس کے ساتھ مسجد، مہمان خانہ اور لنگر خانہ بھی بنوایا اور اس کے اردگرد اپنے ہاتھوں سے زمین ہموار کر کے ایک باغ لگایا۔ اس خانقاہ میں حضرت دانا واعظ و تلقین اور اپنے مریدانِ خاص کی روحانی اصلاح و تربیت کا دینی فریضہ ادا کرتے تھے۔ ان کے وصال کے بعد صوفی سیف الرحمٰن قادری اُن کی مسندِ وعظ و ارشاد پر رونق افروز ہوئے اور زندگی کے آخری حصے میں اپنی خانقاہ میں خلوت گزیں ہو گئے اور اُن کے فرزند صوفی چراغ دین قادری نے زمام کار سنبھالی اور وہ ''میسرز صوفی سیف الرحمٰن اینڈ سن'' کے پروپرائیٹر بنے۔ یہ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴/ ۱۹۸۱ء) کے دوران کی بات ہے۔

صوفی چراغ دین قادری اپنے والد بزرگوار کے علاوہ حافظ دانا صاحب کے تربیت یافتہ تھے۔ ظاہری علوم انہوں نے گھر پر معروف اساتذہ و علماء سے حاصل کیے تھے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی پر بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح عبور رکھتے تھے۔ اُن کے زمانے میں کاروبار نے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کی۔ ہر طرف دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ انہوں نے آج سے ایک سو سال پیشتر لاکھوں کمائے اور لاکھوں صرف کیے۔ اپنی رہائش کے لیے مغل طرز تعمیر پر چونے اور رگڑائی کی اینٹوں (Chiselled bricks) کا ایک عالی شان محل تعمیر کرایا جو بعد ازاں سبحانی بلڈنگ (Subhani Building) کے نام سے مشہور ہوا۔

سبحانی بلڈنگ کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ اس کا تذکرہ ''ہز امپیریل میجسٹی کنگ جارج پنجم اینڈ پرنسز آف انڈیا اینڈ انڈین ایمپائر'' (H.I.M. King Georrge V And Princes of India And Indian Empire) میں کیا گیا ہے۔ یہ بڑی تقطیع کی ایک بڑی ضخیم اور یادگار کتاب

ہے اور جس میں برصغیر پاکستان و ہند کی نام ور و ممتاز اور اہم ترین شخصیات کے حالات و سوانح درج ہیں۔ اس تاریخی کتاب کو "دی امپیریل پبلشنگ کمپنی" (The Imperial Publishing Co. Lahore) نے ۱۹۳۷ء میں لاہور سے شائع کیا۔ اس اہم کتاب کے مرتب کے۔ آر۔ کھوسلہ (K.R.Khosla) اور اس کے ایڈیٹر مسٹر آر۔ پی۔ چیٹر جی (R.P.ChatterJee) ہیں۔ اس نادر و یادگار کتاب میں حضرت صوفی سیف الرحمٰن قادری اور اُن کے خانوادے کے احوال و آثار میں صوفی چراغ دین قادری کا تذکرہ بدیں الفاظ ملتا ہے:

"Sufi Charagh Din, Rais and Government Contractor Ludhiana, was born in 1881. His father Sufi Saifur Rahman was a well known Pir. He has a gifted brain over his shoulders and is the owner of a large property. He has recently built a magnificient residential building at a very large cost and named it after his own name "Charagh Din Mansions" which stands as a stricking monument to show his place and position in life and adds distinctivity to the grandeur of the town..."

صوفی چراغ دین قادری نے جس مغل طرزِ تعمیر پر اپنا رہائشی محل بنوایا اُسی طرز تعمیر کے مطابق چونے اور (Chiselled bricks) سے ایک عظیم الشان مسجد بھی کلیتاً اپنے ذاتی وسائل سے اپنے والد بزرگ وار کی خانقاہ کے سامنے تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا باغ لگوایا جس میں برصغیر کے مختلف علاقوں سے آم، سنگترہ، امرود اور مالٹا وغیرہ کے قیمتی درخت منگوا کر لگوائے۔ زرِ کثیر اور بڑی محنت و مہارت اور کمال ہنرمندی سے تعمیر ہونے والی یہ تاریخی عمارت بعدازاں صوفی چراغ دین قادری کے صاحب زادے صوفی غلام محبوب سبحانی کی نسبت سے سبحانی بلڈنگ کے نام سے مشہور ہو گئی اور اس کو ماہرین تعمیرات اور مؤرخین نے لودھیانہ شہر کا ایک بیش قیمت زیور قرار دیا ہے جس سے شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا۔

سبحانی بلڈنگ کا ایک اہم اور ناقابل فراموش حوالہ اس کی وہ عملی افادیت اور

استعمال ہے جو تقسیم برصغیر کے موقع پر دیکھنے میں آیا۔ وہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ شاہ جہانی طرز تعمیر پر بنی ہوئی یہ دل کش و خوب صورت مگر قلعہ کی طرح مضبوط و مستحکم عمارت جو جلال و جمال کا حسین امتزاج ہے اور اس کی عظمت و بلندی اور سرخ رنگ کے باعث اس کا اپنا ایک خاص دبدبہ و جلال ہے، ۱۴ اگست سے لے کر ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء تک مسلسل بیس روز تک بے خانماں و برباد حال مسلمانوں کی پناہ گاہ بنی رہی اور شہر کی جنوبی سمت میں اس بلند و بالا قلعہ نما عمارت نے ناقابل تسخیر فصیل اور حصار کا کام کیا۔ ان قیامت خیز دنوں کے دل خراش حالات خواجہ فیض محمد فیض لودھیانوی نے ''ایام مصیبت کی دردناک داستان'' موسوم بہ ''لودھیانہ کی ڈائری'' میں تاریخ وار بیان کیے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ''غلامی کا آخری دن'' کے زیر عنوان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتباس پیش خدمت ہے:

''شہر بھر میں چرچا ہے کہ آج رات کو بارہ بجے ملک آزاد ہو جائے گا۔ ہر جگہ یہی موضوع زیر بحث ہے کہ اب کیا ہوگا؟ مسلم لیگ بالکل خاموش ہے۔ مولوی عبدالغنی کی کانگرس پارٹی زیادہ سرگرمی دکھا رہی ہے۔ ہندوؤں کی اکثر عمارتوں پر بادامی رنگ کے مہا سبھائی جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ کانگرس کے ترنگے جھنڈوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہندو لیڈروں کے نام سے گیٹ تیار کیے گئے ہیں، مثلاً گاندھی گیٹ، نہرو گیٹ وغیرہ۔ مسلمانوں کا بازار موچ پورہ سجاوٹ میں تمام بازاروں سے بازی لے گیا ہے۔ یہاں مولوی حبیب الرحمٰن اور مفتی محمد نعیم کی مساعی سے ہر بیس قدم پر ابوالکلام آزاد گیٹ، اور حسین احمد مدنی وغیرہ کے نام سے گیٹ لگائے گئے ہیں۔ لودھیانہ کا یہی ایک بازار ایسا ہے جہاں مسلمان آزادی کا استقبال کر رہے ہیں ورنہ مسلمان عموماً ہراساں ہیں، ہندو راج کا خوف بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔''

۱۸ اگست کو عید تھی، چنانچہ خواجہ فیض محمد فیض ''محرم نما عید'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

''ایسی محرم نما عید اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ لودھیانہ کی سب سے بڑی عیدگاہ شہزادہ والا گوہر کی عید گاہ میں بلامبالغہ ایک لاکھ سے زاید شہری اور دیہاتی عید پڑھا کرتے تھے لیکن آج اس عیدگاہ میں بمشکل چار پانچ ہزار نفوس موجود تھے۔ شہر کی تمام دکانیں بند تھیں۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ پُررونق تجارتی مرکز چوڑا بازار بھی سنسان تھا۔ عید کا میلہ جو عہد قدیم سے ہر سال پرانے مشن سکول کے چوک میں لگتا چلا آیا تھا آج

نہیں لگا۔ البتہ سبحانی بلڈنگ کے سامنے چوک میں آج میلے کی سی چہل پہل نظر آئی۔''

۲۰ اگست کی روئیداد ''بم باری کے مظاہرے'' کے زیر عنوان خواجہ صاحب نے یوں بیان کی ہے:

''آج پرانے بازار میں بم پھٹنے سے علاقے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ پولیس جائے واردات پر پہنچی اور چند غریب مسلمانوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔ چاقو گھونپنے کی دو چار وارداتوں کا سرسری حال معلوم ہوا۔ تفصیلات جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ احراری راہنما ماسٹر تاج دین انصاری اور کانگرسی دوستوں کی مدد سے اتحاد برقرار رکھنے کی کوششیں ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔ نام نہاد امن کمیٹی اپنی موت آپ مر چکی ہے۔''

۲۲ اگست اور بعد کے مسائل کو خواجہ فیض نے ''لیڈر شپ کا فقدان'' کے زیر عنوان لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مسافروں کے قتل عام نے شہر میں زبردست ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ مسلمانان لودھیانہ کے نمائندہ سردار شوکت حیات جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے آج کل لاہور میں ہیں۔ انہیں وہاں وزارت کا کوئی قلم دان مل گیا ہے۔ وہ بہ زمانۂ امن اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکے تھے جو کمیٹی باغ میں انہیں مبارک باد دینے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ مسلم لیگی ورکر مظہر جمیل برسر اقتدار لیڈروں کو لودھیانہ کے ناگفتہ بہ حالات سے آگاہ کرنے کے لیے لاہور گئے تھے، آج تک واپس نہیں آ سکے۔ مقامی احراری لیڈر اپنی بساط کے مطابق تگ و دَو کر رہے ہیں لیکن فضا دم بہ دم مکدر ہوتی جا رہی ہے۔ گزشتہ روز شرپسندوں نے مالی گنج میں ایک مسلمان کی دکان کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ پولیس موقع پر پہنچی اور الٹا چند مسلمانوں کو گرفتار کر کے لے آئی۔ مالی گنج وہ محلہ ہے جہاں پنجاب کے سابق وزیر میاں عبدالحئی کی کوٹھی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں مسلمانوں کا بڑا دبدبہ تھا لیکن آج بے بسی قابل رحم ہے ـــــ میں نے نماز جمعہ اپنے محلّہ کی مسجد مرزا میں پڑھی۔ نمازیوں کا بڑا ہجوم تھا۔ خطبہ سے پہلے مولوی عبدالمجید نے ایک درد بھری تقریر کی۔ لودھیانہ کی مشہور مولوی فیملی میں یہی ایک عالم ایسے ہیں جنھوں نے کھلم کھلا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ مولوی حبیب الرحمٰن مفتی محمد نعیم اور دوسرے نیشنلسٹ مسلمان لیڈروں کو اِس وقت اپنا سیاسی اثر و رسوخ بروئے کار لانا چاہیے۔ یہ لوگ کانگرس گورنمنٹ کو اپنی قربانیوں کا حوالہ دے کر ہماری حفاظت کا کوئی معقول انتظام

کر سکتے ہیں۔

''۲۳ اور ۲۴ اگست کی درمیانی شب کو محلہ ملاشکور میں ماسٹر محمد رمضان میونسپل کمشنر کے گھر بم گرا ہے۔ اُن کے بڑے بھائی میاں روشن دین بھی میونسپل کمشنر ہیں جو اسی محلہ میں قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ اپنے لواحقین سمیت فوراً جائے حادثہ پر پہنچے اور محلے کے ہردلعزیز اور اسان دوست ڈاکٹر گوجرمل کو بلوایا گیا۔ غیر متعصب ڈاکٹر نے آ کر مسلمان زخمی کی چارہ سازی کی۔ آج صبح کرفیو ہٹا تو ماسٹر صاحب پر بم گرنے کی خبر تمام شہر میں پھیل گئی۔ دوپہر کو ماسٹر صاحب کو سول ہسپتال پہنچایا گیا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ آج دن کو ایک بجے ہی کرفیو آرڈر کا نفاذ ہو گیا اور شرپسندوں نے چیدہ چیدہ مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے فہرست بنا رکھی ہے جس پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔

''۲۵ اگست: آج شہر میں بساطی بازار کو لوٹا جا رہا ہے۔ آج بھی دوپہر کے فوراً بعد کرفیو آرڈر لگ گیا۔ ماسٹر محمد رمضان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی لاش ایمبولینس میں لائی گئی تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔ ان کے بھائی میاں روشن دین رو رو کر کہہ رہتے تھے کہ 'مجھے پاکستان کے خشک ٹکڑے منظور ہیں اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔' ماسٹر صاحب کے معزز ہندو دوستوں کا ایک گروپ (غالباً پولیس کی اجازت سے) ایک کار میں بیٹھ کر تعزیت کے لیے میاں روشن دین کے پاس آیا۔''

۲۶ اور ۲۷ اگست کے احوال میں فیض محمد فیض نے لکھا ہے:

''سکھ جا بجا نظر آتے ہیں۔ اب قتل و غارت کا بازار شہر میں گرم ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کی دکانوں کو اجتماعی طور پر لوٹا جا رہا ہے۔ گل چمن کلی، حضوری سڑک، گنجی چھپڑی، ویٹ گنج، محلہ لال مسجد اور محلہ سیداں کے مسلمان خوف زدہ ہو کر ان محلوں میں پناہ لے رہے ہیں جو نسبتاً کچھ محفوظ ہیں۔ ہمارے کشادہ اور محفوظ مکان میں بھی چار پانچ گھرانے مصیبت کا وقت پورا کرنے کے لیے پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔ آج سبحانی بلڈنگ کی تلاشی لینے کے لیے پولیس نے اچانک چھاپہ مارا لیکن وہاں سے کوئی ہتھیار یا قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔''

خواجہ فیض محمد کے بیان کے مطابق ۱۶ اگست کو شہر میں کرفیو شروع ہوا تھا اور چند روز پہلے باغ خزانچیاں لودھیانہ میں ماسٹر تارا سنگھ نے مسلمانوں کے خلاف ایک اشتعال انگیز تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ دھرم یدھ کا زمانہ آ گیا ہے۔ اس زمانے میں

گردونواح کے دیہات سے بے شمار مسلمان اپنے شہری رشتہ داروں کے ہاں پناہ لینے لگے تھے۔ اس لیے کہ اقلیت والے علاقوں میں مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا تھا۔ ۲۱ اگست کو میلر گنج کے سکھوں نے انجن شیڈ کے سامنے اسلام گنج اور عبداللہ پور کی نئی بستیوں کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر انہیں نقل مکانی پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ سینکڑوں خاندانوں نے سجانی بلڈنگ میں آ کر پناہ لی اور صوفی چراغ دین صاحب اپنے اہل خانہ سمیت اپنے چھوٹے بھائی صوفی محمد شفیع والی اپنی آبائی حویلی میں منتقل ہو گئے جو موچ پورہ میں واقع تھی۔ موچ پورہ والی اُن کی اپنی حویلی کرائے پر تھی۔

سجانی بلڈنگ پر پہلے بھی ہندو فوج کی مدد سے سکھوں نے متعدد حملے کیے تھے لیکن بلڈنگ کے مضبوط ہونے کے باعث وہ اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ جب شہر کے مختلف علاقوں بالخصوص اسلام گنج، عبداللہ پور اور ویکفیلڈ گنج کے مسلمان سجانی بلڈنگ میں آ کر پناہ گزین ہو گئے تو سکھوں نے روزانہ حملے شروع کر دیے۔ مگر مسلمان کچھ اپنے جذبہ ایمانی سے اور کچھ تھوڑے بہت اسلحہ سے سکھوں کے حملوں کو پسپا کر دیتے تھے۔ پندرہ روز کے دوران میں سکھ درندے بار بار حملہ آور ہوتے رہے۔ انہوں نے سجانی بلڈنگ کو آگ لگانے کی بھی کوشش کی مگر اس میں بھی ناکام رہے۔ اس دوران مسٹر جی ایم سجانی، سابق صدر بلدیہ ہمہ وقت اپنی بلڈنگ میں موجود رہے۔ چنانچہ سجانی بلڈنگ کی پہلی تلاشی ۲۵ اگست، دوسری ۲۷ اگست اور تیسری اور آخری تلاشی ۲ ستمبر کو لی گئی۔ ہندو کانگری انتظامیہ کسی نہ کسی بہانے مسٹر غلام محبوب سجانی کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے وقت بے وقت سجانی بلڈنگ کی سجانی صاحب کی موجودگی میں تین بار تلاشی لی گئی۔ مگر چونکہ سجانی بلڈنگ میں کچھ اس طرح کے خفیہ تہ خانے بنے ہوئے تھے جنہیں پولیس کوشش کے باوجود دریافت نہ کر سکی تھی چنانچہ وہاں اسلحہ وغیرہ چھپا دیا جاتا تھا، اس لیے پولیس کو وہاں سے کچھ نہیں ملتا تھا، جس پر ہندو پولیس ہی نہیں بلکہ پورا شہر حیران تھا۔ آخری بار جو تلاشی لی گئی تو اس کی نگرانی لودھیانہ کا ہندو ڈپٹی کمشنر خود کر رہا تھا۔ اس طرح پندرہ روز تک سجانی بلڈنگ نہ صرف ڈیڑھ دو ہزار مسلمانوں کی پناہ گاہ بنی رہی بلکہ اس سمت سے مسلمان محلوں پر ہونے والے سکھوں کے حملوں کا ناقابل تسخیر حصار بھی ثابت ہوئی۔ اگر سجانی بلڈنگ میں پناہ لینے والے ڈیڑھ دو ہزار مسلمان سجانی صاحب کی سرکردگی میں مسلح سکھوں کے حملوں کو نہ روکتے تو محلہ موچ پورہ اور اس کے اردگرد کے

نصف درجن مسلمان محلے ان سکھ درندوں کی زد میں آ جاتے اور ان محلوں کا جہاں شہر بھر کے لوگ اپنی عزت و آبرو کو بچانے کے لیے جمع ہو گئے تھے، وہ حشر ہوتا جس کے تصور سے روح کانپ جاتی ہے۔ سبحانی چوک میں دو فوجی بھی متعین کر دیے گئے تھے جو حملہ آور سکھوں کے لیے بہت بڑی رکاوٹ بنے رہے۔ پھر سبحانی بلڈنگ میں سال بھر کے لیے غلے کے جو ذخائر تھے وہ مسلمان پناہ گزیوں کے کام آئے۔ علاوہ ازیں صوفی سیف الرحمٰن اینڈ سن کا ہزاروں لاکھوں روپے کا سامان جس میں سلی ہوئی وردیاں، اونی اور سوتی کپڑوں کے ہزاروں تھان اور مختلف النوع اشیاء تھیں، جو سب کی سب مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں۔

خواجہ فیض محمد فیض کی ڈائری کی طرف دوبارہ آتے ہیں۔ چنانچہ ۳۱ اگست کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گزشتہ رات تڑاق پڑاق کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ فوجی نوجوان جو ٹرکوں میں پاکستان سے آئے ہیں سبحانی بلڈنگ پر بیٹھے گولیاں چلاتے رہے۔ غالباً ان کا مقصد بلوائیوں کو خبردار کرنا ہوگا۔''

یکم ستمبر ۱۹۴۷ء کے حالات بیان کرتے ہوئے خواجہ فیض لکھتے ہیں:

''کل نیا محلہ پر جو شدید حملہ ہوا تھا اُس کے پیش نظر رات بڑی بے چینی سے گزری۔ محلہ ڈھولیوال میں مولانا حبیب الرحمٰن سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا نقل مکانی کرنی چاہیے یا نہیں؟ فرمانے لگے جیسا تمہارا دل چاہے کرلو — چند منٹوں بعد ہم ''احد منزل'' پہنچے جس کے بڑے دروازے پر ''ہندو مسلم کیمپ'' کے نمایاں الفاظ درج تھے۔ یہ وہ تاریخی مقام ہے جہاں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ظفر علی خان اور دیگر سیاسی راہنما بارہا تشریف لا چکے ہیں۔ دراصل یہ کشمیری خاندان ابتداء ہی سے ہندو مسلم اتحاد کا سرگرم حامی رہا ہے۔ اس کے اثر و رسوخ کا اندازہ اس امر سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے کہ سالہا سال خواجہ محمد یوسف، خواجہ محمد اعظم، خواجہ محمد اسلم اور خواجہ محمد اکرم چاروں بھائی میونسپل کمیٹی لودھیانہ کے ممبر منتخب ہوتے رہے۔ بلکہ صدارت بھی کافی عرصے تک اس گھر کی باندی رہی۔ ان کے سربراہ خواجہ احد شاہ نے مسلمانوں کا سب سے پہلا انگریزی اخبار ''آبزرور'' لاہور سے جاری کیا تھا جس میں سر عبدالقادر جیسے نام وَر ادیب ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔

آج سارا دن بہت کم فائرنگ ہوئی۔ اس خاموشی کی اصل وجہ سردار عبدالرب نشتر اور سردار بلدیو سنگھ کی تشریف آوری تھی۔ بہت سے ہندو مسلم اور سکھ اکابر اُن سے ملے۔ میٹنگ میں مقامی افسروں نے بھی شرکت کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن، مفتی محمد نعیم، ماسٹر تاج دین انصاری، جی ایم سبحانی، کپتان محمد اکرم، سید بلال احمد، میاں محمود علی عارف اور کچھ میونسپل کمشنروں نے مسلمانوں کی نمائندگی فرمائی۔ یہ حضرات ڈپٹی کمشنر کی لاری میں پولیس کی زیر نگرانی سول لائن پہنچے اور بہت سے گلے شکوے کیے۔ انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں کے مختلف محلوں پر سکھ بلوائی کئی بار حملے کر چکے ہیں۔ اب تک متعدد عمارتوں کو نذر آتش کیا جا چکا ہے لیکن حکام نے کوئی ایکشن نہیں لیا۔ پولیس کی موجودگی میں مسلمانوں کی دکانوں کو لوٹا گیا۔ ان حقائق سے متاثر ہو کر سردار عبدالرب نشتر نے فرمایا کہ بہت جلد لودھیانہ میں ملٹری فورس بڑھا دی جائے گی۔ ان وزیروں نے انکشاف کیا کہ معاہدہ انبالہ کی رُو سے پناہ گزینوں کی ٹرینیں اب روزانہ چلا کریں گی جو بھارت سے مسلمانوں کو لے جائیں گی اور پاکستان سے ہندوؤں اور سکھوں کو لائیں گی۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے پوچھا کہ ''میرے جیسے لوگ جو مسلم لیگ کے نظریہ سے متفق نہیں تھے اور اب پاکستان جانا نہیں چاہتے اُن کا کیا حشر ہو گا؟ سردار نشتر نے جواب دیا ''ہم انہیں مجبور نہیں کرتے کہ وہ ضرور پاکستان جائیں۔ اگر وہ پسند کریں تو ہم شہر کے دو محلے اُن کے لیے وقف کر سکتے ہیں۔''

مسٹر جی ایم سبحانی سابق صدر بلدیہ نے مجھے بتایا کہ سول لائن سے واپسی پر سکھ ڈرائیور بدنیت ہو گیا اور لاری کو شہر سے باہر باغ سیتا رام کی طرف لے گیا۔ مولوی حبیب الرحمٰن معاملے کو تاڑ گئے۔ انہوں نے سپاہیوں سے کہا، ''ہم موت سے نہیں ڈرتے لیکن یاد رکھو اگر ہم جیسے نیشنلسٹ مسلمانوں کو تم نے قتل کیا تو کانگریس گورنمنٹ بہت زیادہ بدنام ہو جائے گی۔'' تب ڈرائیور نے لاری کا رُخ شہر کی طرف کر لیا اور وفد کے تمام ارکان بخیریت واپس آ گئے۔

ان دل خراش و جگر پاش حالات میں مسلمان پانچ ستمبر ۱۹۴۷ء تک مشکل حالات کا بڑی ہمت اور حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے حتیٰ کہ ۵ ستمبر کو ڈپٹی کمشنر لودھیانہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے اعلان کر دیا گیا کہ وہ شہر کو خالی کر دیں۔ اس طرح لودھیانہ شہر کے مسلمانوں نے اپنے وطن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا اور سبحانی

بلڈنگ لودھیانہ میں وہ آخری پناہ گاہ تھی جسے مسلمانوں نے ۵ ستمبر کو خالی کیا۔
صوفی چراغ دین صاحب اور اُن کے خانوادے کو لودھیانہ سے ہجرت کیے نصف صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے لیکن سجانی بلڈنگ آج بھی پوری آب و تاب اور جلال و کمال کے ساتھ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہے اور جس چوک میں یہ واقع ہے اُس کو آج بھی سجانی چوک ہی کہا جاتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ حضرت غوث الاعظم کا ایک لقب ''محبوب سجانی'' بھی ہے، چنانچہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عطا اور حضرت غوث الاعظم کے فیض ہی کی بدولت ہے کہ اس خوب صورت بلڈنگ کی صورت میں حضرت غوث الاعظم کا جھنڈا آج بھی لودھیانہ شہر کے وسط میں نصب ہے، جو اپنی جگہ مسلمانوں کی شان و شوکت اور اسلام کی عظمت و سربلندی کا نشان بھی ہے۔
اب ہم سلسلہ عالیہ قادریہ فاضلیہ کے ایک رکنِ رکین صوفی غلام محبوب سجانی بی اے (علیگ) ایل ایل بی۔ ایم سی، پریذیڈنٹ لودھیانہ میونسپل کمیٹی کی طرف آتے ہیں جن کے بارے میں لودھیانہ کی ایک معروف ساجی شخصیت خان صاحب محمد حسین خان انجینئر کے یہ الفاظ ۱۹۴۰ء میں ایک مقامی اخبار ''خادم'' کے کالموں کی زینت بنے:

> ''آپ صوفی چراغ دین صاحب کے اوصاف و اخلاق سے واقف ہوں گے جو ایک فارغ البال مسلمان ہونے کے باوجود انتہائی امن پسند، روادار، صلح کل اور خلیق انسان واقع ہوئے ہیں۔ جنہوں نے اس قدر صاحب ثروت ہونے کے باوصف کثرت مال و دولت کے منفی اثرات سے خود کو محفوظ رکھا ہے اور وہ ہمیشہ امن و آشتی اور ہدایت کی بات کرتے ہیں۔ تفرقہ اور عناد و فساد کے اسباب و محرکات کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صوفی غلام محبوب سجانی صاحب بھی اسی طرح الولد سرّ لابیہ اعلیٰ تعلیم یافتہ قانون دان ہونے کے ساتھ سنجیدہ مزاج، سراپا خیر، سرگرم و فعال مگر خاموش کارکن ہیں۔ اُن کے دل میں خاص قومی درد اور رفاہِ عامہ کا جذبہ موجزن ہے۔ سیاسی مقابلے میں جس طرح رقابت اور حسد وغیرہ کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جو اچھے سے اچھے انسان کو بھی راہِ اعتدال سے منحرف ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر

سبحانی صاحب کی متانت میں کبھی فرق نہیں دیکھا گیا۔میونسپل کمشنر کی حیثیت سے انہوں نے جو خدمات انتہائی خلوص سے سرانجام دی ہیں وہ اہل شہر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔"

ارباب عرفان و آگہی کے فیوض و برکات کا ایمان افروز اور تاریخ ساز سلسلہ کس طرح نسل درنسل چلتا ہے اس کی ایک نمایاں مثال حضرت شیخ فاضل الدین کے روحانی جانشینوں میں حضرت صوفی سیف الرحمٰن قادری اور ان کے خانوادہ کی شان دار و قابل قدر دینی و تبلیغی، علمی و سماجی اور سیاسی و رفاہی خدمات ہیں اور جب یہ خدمات نیک نیتی اور خلوص و ایثار کے جذبات پر مبنی ہوں اور بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و نسل کی جائیں تو اپنے پرائے اور دوست دشمن سبھی ان خدمات کا دلی طور پر اعتراف کرتے ہیں اور اس قسم کی خدمات کرنے والوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نیز یہ کہ صوفیانہ پس منظر رکھنے والے مردان حق آگاہ جس میدان میں بھی قدم رکھتے ہیں اُن کا جذبۂ ایمانی رنگ دکھاتا ہے۔

صوفی غلام محبوب سبحانی ۱۹۴۰ء میں لودھیانہ میونسپلٹی کے صدر منتخب ہوئے تو ایگزیکٹو افسر (Executive Officer) کا عہدہ بھی انہیں سونپ دیا گیا۔سبحانی صاحب نے دونوں عہدوں کے فرائض کو کمال حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ سرانجام دے کر اہل شہر سے داد و تحسین وصول کی۔ چنانچہ شہر کے تمام اخبارات و رسائل میں تعریفی اداریے لکھے گئے۔ یہاں ہندو روزنامہ "سندیش" کے ہندو ایڈیٹر بابو رام شرما کے ایڈیٹوریل کے آخری دو جملے نقل کیے جاتے ہیں:

> "اہالیان شہر کی یہ خوش قسمتی ہے کہ آج کل ایک ایسے صاحب کمیٹی کی صدارت پر فائز ہیں جو کمیٹی کے کام کو بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں اور اُن کی قابلیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ صدارت کے علاوہ ایگزیکٹو آفیسر کی ڈیوٹی کے فرائض بھی وہی اس وقت بجالا رہے ہیں۔ تاوقتیکہ کوئی شخص خاص قابلیت کا مالک نہ ہو، ذمہ داری کے دو بڑے عہدوں کو اس طرح نہیں سنبھال سکتا۔"

وارڈ نمبر ۱۱ میونسپل کمشنری کے انتخابات سے پہلے جناب سبحانی صاحب کے بارے

میں ایک ہندو جوتشی نے مقامی اخبار میں ان کی کنڈلی (زائچہ نجوم) کے حوالے سے یہ پیش گوئی کی تھی: ''صوفی جی۔ایم سبحانی صاحب، ہمارے حساب سے آپ کے رشی برچھک اور دھن ہیں۔ آپ کی قسمت میں مال و دولت کی بہت فراوانی ہے۔ آپ خیرات بہت کریں گے۔ غرباء کو آپ سے بہت فائدہ ہوگا۔ عوام کی خدمت سے ان کے دلوں میں آپ کی محبت اور بڑھ جائے گی، مخالفین نقصان پہنچانے کی کوشش میں ذلیل ہوں گے۔ آپ کا ستارہ بہت بلندی پر پہنچے گا۔ کمیٹی میں تمام ممبران سے اونچی جگہ پر بیٹھیں گے، آپ کا رعب و دبدبہ ہوگا۔ عام لوگوں کو آپ سے بہت فائدہ پہنچے گا۔''

۱۹۴۱ء مردم شماری (census) کا سال تھا۔ اور جناب سبحانی صاحب اس کے بھی انچارج تھے۔ چنانچہ مردم شماری میں اپنے فرائض منصبی کو کمال حسن و خوبی اور غیر جانبداری سے انجام دینے پر سبحانی صاحب کو گورنر پنجاب کی جانب سے حسنِ کارکردگی کی سپیشل سند ملی اور اخبارات نے تعریفی اداریے بھی تحریر کیے۔ یہاں روزنامہ ''خادم'' لودھیانہ، ۷ اپریل ۱۹۴۱ کے ایک طویل ایڈیٹوریل بعنوان ''مردم شماری اور مسٹر جی۔ایم سبحانی ایگزیکٹو آفیسر بلدیہ'' سے ایک مختصر اقتباس پیش کیا جا رہا ہے: ''...ہر قوم دیکھ رہی تھی کہ کوئی شخص اندراج سے رہ نہ جائے ...ایک ایسی مرکزی شخصیت تھی جو اس پُر ہنگامہ فضاء میں اپنی جگہ استقلال، سکون اور مستعدی سے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے ادا کر رہی تھی، وہ شخصیت —— مردم شماری کے سپرنٹنڈنٹ ہمارے بلدیہ کے صدر اور ایگزیکٹو آفیسر مسٹر غلام محبوب سبحانی کی تھی —— وہ مسلسل تین دن اور تین رات اپنے دفتر میں رات کے دو دو بجے تک بیٹھے رہے۔ اعتراضات کی بوچھاڑ، شکایات کا طومار، ہر قوم کی دوسری قوم پر بداعتمادی اس قدر شدید تھی کہ ہر طرف گھبراہٹ پھیلی ہوئی تھی —— مردم شماری کے موقع پر صوفی صاحب نے جس اخلاق، مستعدی اور حسن انتظام کا ثبوت دیا اُس کا اعتراف آج شہر کی ہر مجلس میں بلا امتیاز مذہب و ملت کیا جا رہا ہے۔''

قبل ازیں جب کوئٹہ تباہ کن زلزلے کا شکار ہوا تو جناب سبحانی صاحب نے آفت زدگان کی دل جوئی میں غیر معمولی سرگرئ عمل کا مظاہرہ کیا اور اُن کی امداد و اعانت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس ضمن میں ایک اخباری رپورٹ سے ایک مختصر اقتباس پیشِ خدمت ہے:

''کوئٹہ کے زلزلہ کے وقت آپ (غلام محبوب سبحانی) نے متاثرین کی امداد و اعانت کا جو ثبوت دیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آپ نے ریلوے سٹیشن پر اپنی گرہ سے کثیر رقم خرچ کر کے ایک سٹال بنوایا۔ اور موقع پر موجودہ رہ کر خدمتِ خلق میں عملی حصہ لیتے رہے۔ جن لوگوں نے سبحانی صاحب کو اُن دنوں وہاں کام کرتے دیکھا ہے وہ ہمیشہ کے لیے آپ کے مداح ہو گئے۔ آپ کا یہ ہمدردانہ کارنامہ آپ کی زندگی کی کتاب میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔''

غلام محبوب سبحانی صاحب کی عوامی خدمات کا سلسلہ بہت دراز ہے۔ صوفیہ کرام کے مسلک پر چلتے ہوئے انہوں نے اپنی زندگی اسلام کی عظمت و سربلندی اور خدمت خلق کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان کے دینی و علمی اور سیاسی و سماجی اور رفاہی کارناموں کو بیان کرنے کے لیے دفتر درکار ہیں۔ اُن کے والد صوفی چراغ دین قادری نے اپنے تمام ذرائع و وسائل ان کے قبضہ و تصرف میں دے رکھے تھے جنہیں وہ رفاہی کاموں پر خرچ کرتے تھے اور دن رات خدمتِ خلق میں مصروف رہتے تھے اور اس قدر صاحب ثروت ہونے کے باوجود خود کو ملک و قوم کا خادم تصور کرتے تھے۔ آغا شیر احمد خاموش ایڈووکیٹ اس حوالے سے بیان دیتے ہوئے صوفی غلام محبوب سبحانی کے اپنے الفاظ درج کرتے ہیں ''میں تو شہر کا خادم ہوں، ایک ادنیٰ سپاہی اور مزدور ہوں۔ میں نے اس کرسیٔ صدارت کو ذاتی جائیداد نہیں سمجھا ہوا۔ یہ پبلک کا ایک اعتماد ہے۔ جب تک مجھ میں ہمت ہے اس فرض کو دیانت داری سے ادا کروں گا اور جب مجھ میں اس فریضہ کو ادا کرنے کی صلاحیت نہ رہے گی یہ جگہ اپنے سے بہتر شخص کے لیے چھوڑ دوں گا۔'' ایک نمائندہ وفد کے اراکین سے ملاقات کے دوران سبحانی صاحب نے کہا: ''میں ملک کا خادم ہوں، ہر غریب کا ادنیٰ دوست ہوں، ہر جائز امداد کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں مگر کسی ناجائز کام کے لیے معذور ہوں۔'' اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو نیک اعمال اور خدمت خلق کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ لودھیانہ شہر میں صوفی چراغ دین قادری اور ان کے فرزند ارجمند صوفی غلام محبوب سبحانی نیک اعمال اور خدمت خلق میں اپنی مثال آپ تھے اور سیاسی کارکنوں، سیاست دانوں اور مذہبی راہنماؤں کے لیے ایک قابل تقلید مثالی

نمونہ بھی۔

غلام محبوب سبحانی سر فضل حسین میموریل لائبریری فنڈ کے خزانچی بھی تھے اور انہوں نے نہ صرف ایک معقول رقم جمع کر کے حکومت پنجاب کو بھجوائی بلکہ اپنی جیب خاص سے بھی عطیہ دیا جس کا وزیراعظم سر سکندر حیات خان نے بطور خاص شکریہ ادا کیا۔

سبحانی صاحب قابل ذکر سپورٹس مین (sportsman) ہونے کے علاوہ کھیلوں میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے لودھیانہ میں فٹ بال ایسوی ایشن کی بنیاد رکھی۔ وہ لودھیانہ کرکٹ کلب کے اعزازی سیکرٹری جنرل تھے جس کا صدر ڈپٹی کمشنر ہوا کرتا تھا۔ سبحانی صاحب نے اپنی زیر سرپرستی فٹ بال، کرکٹ اور دوسری کھیلوں کے ٹورنامنٹ کرائے اور ان کھیلوں کی متعدد ٹیمیں تیار کیں جو بعد ازاں لودھیانہ اور اس کے گردونواح کے حلقہ ہائے نیابت میں تحریک پاکستان کا ہراول دستہ ثابت ہوئیں۔

لودھیانہ کی ایک بااثر شخصیت ہونے کی حیثیت سے غلام محبوب سبحانی صاحب نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور قیام پاکستان کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مشتے از خروارے کے طور پر ہم نے ان کی عوامی خدمات کے چند ایک واقعات بیان کیے ہیں، اب اختصار کے پیش نظر ایک دو اہم واقعات کا ذکر کرتے ہیں جو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔

پہلا واقعہ حضرت قائداعظم علیہ الرحمۃ کی تصویر کا لودھیانہ ٹاؤن ہال میں آویزاں کرانا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اخباری رپورٹ میں کہا گیا ہے:

> "آج میونسپل کمیٹی کا ہنگامہ خیز اجلاس ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا۔ مسٹر غلام محبوب سبحانی صدر میونسپل کمیٹی کرسیٔ صدارت پر تھے ... میاں محمود علی عارف (ایڈووکیٹ) نے تجویز پیش کی کہ ٹاؤن ہال میں قائداعظم محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی فوٹو تیار کر کے آویزاں کی جائے اور اس غرض کے لیے مبلغ ۹۰ روپے منظور کیے جائیں ... کانگریسی ممبران نے ابھی بحث شروع ہی کی تھی کہ کانگریس پارٹی کے لیڈر لالہ بلونت رائے نے انہیں منع کر دیا اور خود اٹھ کر صاحب صدر کو صرف اتنا کہا کہ 'ہم کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں۔' اور ریزولیشن کثرت رائے سے پاس

ہو گیا۔''

روپے کی قدر و قیمت کا یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب کے وزیر ترقیات سردار دسوندھا سنگھ اور گورنر پنجاب کو ایڈریس پیش کرنے کے لیے لودھیانہ میونسپلٹی نے بالترتیب پچاس اور ایک سو روپے کی منظوری دی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی قابل قدر کتاب ''تصوف کا فلسفہ اور تاریخ'' میں روحانی سلاسل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''سلسلہ عالیہ قادریہ کا فیض جاری رہتا ہے۔ یہ روحانی سلسلہ ایک دریا کی مانند ہے جو سطح زمین پر بہتا ہے مگر کبھی کبھی زیرِ زمین بھی چلا جاتا ہے۔ مگر آگے جا کر پھر سطح زمین پر آ جاتا ہے۔'' چنانچہ سلسلۂ قادریہ کا یہ فیض اور حضرت شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی کی برکات حضرت صوفی سیف الرحمٰن قادری فاضلی کے بیٹے اور خلیفہ حضرت صوفی چراغ دین قادری اور ان کے فرزند جلیل اور راقم السطور خاکسار غلام حبیب سبحانی کے والد گرامی حضرت صوفی غلام محبوب سبحانی کی بدولت منصۂ شہود پر یوں نمودار ہوئیں کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی کامیابی اور مملکت خداداد پاکستان کی تشکیل و تعمیر میں قابل قدر اور نمایاں کردار ادا کیا۔

۱۹۴۶ء میں جناب غلام محبوب سبحانی کی شہرت و مقبولیت اور سیاسی اثر و رسوخ کا نقطۂ عروج تھا۔ اسی سال برصغیر میں صوبائی اسمبلیوں کے وہ فیصلہ کن انتخابات ہوئے جن کے نتائج پر تحریک پاکستان کی کامیابی کا دارومدار تھا۔ اس وقت تک سبحانی صاحب برسوں سے میونسپل کمشنر چلے آ رہے تھے اور متعدد بار بلدیہ کے صدر منتخب ہو چکے تھے۔ اور کئی سال تک بلا تنخواہ ایگزیکٹو آفیسر رہ چکے تھے۔ اور اب وہ صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ اُن کی خدمات اور خاندانی وسائل و ذرائع، ذاتی اثر و رسوخ اور غیر معمولی مقبولیت کی بناء پر ان کی کامیابی سو فی صد یقینی تھی۔ مگر جب مسلم لیگ نے سردار شوکت حیات خان کو اُن کے آبائی شہر اٹک کی بجائے لودھیانہ سے الیکشن لڑنے کا ٹکٹ دے دیا تو سبحانی صاحب قائداعظم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے نہ صرف امیدواری سے دست بردار ہو گئے بلکہ مسلم لیگ کے نامزد امیدوار کی کامیابی کے لیے تن من دھن کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے اور سردار شوکت حیات کو انتخابات میں کامیاب کرا کے دم لیا۔ ان انتخابات کے چشم دید احوال مشہور صحافی میاں محمد شفیع نے جناب صوفی غلام محبوب سبحانی کی وفات کے موقع پر اپنے کالم ''م ش کی ڈائری'' مطبوعہ روزنامہ

''نوائے وقت'' لاہور ۴ دسمبر ۱۹۸۴ء میں ''خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را'' کے زیر عنوان بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

''جناب غلام محبوب سبحانی جن کا لاہور میں ۸۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا ایک قابلِ فخر مسلم لیگی کارکن تھے۔ انہوں نے لودھیانہ میں جہاں وہ میونسپل کمیٹی کے پریذیڈنٹ تھے۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدوار سردار شوکت حیات خان کی انتخابی مہم میں جس والہانہ اور مخلصانہ انداز میں دامے، درمے، قدمے، قلمے، اور سخنے حصہ لیا اُس کا ایک غیر فانی نقش میرے سینے میں محفوظ ہے۔ لودھیانہ احرار کا گڑھ شمار ہوتا تھا۔ احرار کا کانگرس سے گٹھ جوڑ تھا۔ یونی نسٹ پارٹی، احرار اور کانگرس تینوں مسلم لیگ کے خلاف ڈٹی ہوئی تھیں۔ اس حلقہ سے ماسٹر تاج دین انصاری جیسے ایک منجھے ہوئے احراری قائد، مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلہ پر میدان میں موجود تھے۔ لودھیانہ کے خواجگان کرام، چودھری مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے خاندان کے تمام بااثر افراد کانگرس کے ایک ستون مولوی عبدالغنی رکن پارلیمنٹ اپنے لاؤلشکر کے ساتھ ماسٹر تاج الدین انصاری کی حمایت میں لگے تھے۔ کانگرس کا رویہ، احراری کارکنوں کی جان فروشانہ سرگرمیاں، احراری قائدین کرام کی گھن گرج دار تقاریر اور خود ماسٹر تاج دین کی اپنی ذاتی مقناطیسی شخصیت... ان سب امور کے پیش نظر سردار شوکت حیات کی اٹک کی بجائے، جس سے سردار صاحب کا آبائی تعلق تھا لودھیانہ سے امیدواری مسلم لیگ کے لیے ٹیڑھی کھیر کا درجہ رکھتی تھی۔ لیکن جناب غلام محبوب سبحانی نے اپنا سارا زور اور اپنی ساری طاقت، اپنے تمام ذرائع مسلم لیگ کے پلڑے میں ڈال رکھی تھی۔۔ انہوں نے مسلم لیگ کی مخالف طاقتوں کو شکست دینے کے لیے اپنی ذات اور اپنے منصب کے تمام ذرائع اور وسیلے جھونک دیے۔ لودھیانہ کے غیور مسلمانوں کو بھی جب اس انتخابی مہم کے مضمرات کا احساس

ہوا تو انہوں نے جناب غلام محبوب سبحانی کی زیرِ قیادت مسلم لیگ
کا جھنڈا مضبوطی سے تھام لیا اور اپنے بے پناہ جوش وخروش سے
احراری امیدوار کو شکست فاش سے آشنا کیا۔"

میاں محمد شفیع (م ش) جو قیام پاکستان کے بعد ایم ایل اے اور پھر مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر اور غالباً ایکٹنگ لیڈر بھی ہو گئے تھے۔ مسلم لیگی زعماء اور اکابرین کو ساتھ لے کر جناب سبحانی صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور ان کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ میاں محمد شفیع نے اپنی ڈائری کے اختتامی کلمات میں یہ بھی لکھا ہے:

"غلام محبوب سبحانی جو حضرت غوث الاعظمؒ سے روحانی نسبت رکھتے تھے خود بھی ایک روحانی شخصیت کے حامل تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد ۳۷ سالوں میں کبھی ایک بار بھی بھولے سے اپنی خدمات کا ذکر کر کے اس کا معاوضہ طلب کرنے کا نہیں سوچا تھا... انہوں نے اپنی خودداری پر کبھی آنچ نہ آنے دی..."

صوفی غلام محبوب سبحانی کو ان کے آبائی قبرستان جو گوجرانوالہ میں موضع ابدال کے قریب واقع ہے دفن کیا گیا۔ آپ کے والد گرامی صوفی چراغ دین قادری اور صوفی محمد شفیع قادری فاضلی خلفاء اور سجادہ نشین حضرت صوفی سیف الرحمٰن قادری بھی وہیں آسودۂ لحد ہیں۔ جب کہ حضرت حافظ دانا صاحب اور اُن کے خلیفۂ اعظم حضرت صوفی سیف الرحمٰن قادری فاضلی کے مزارات بابرکات صوفی چراغ دین باغ روڈ لودھیانہ، مشرقی پنجاب (بھارت) میں مرجع خلائق ہیں۔

مشرقی پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش کے تمام شہروں اور بستیوں کی طرح لودھیانہ کے چھوٹے بڑے تمام قبرستانوں کو صاف کر کے وہاں تجارتی، صنعتی اور رہائشی عمارتیں تعمیر کر لی ہیں لیکن حضرت حافظ دانا صاحب اور حضرت صوفی سیف الرحمٰن قادری اور اُن کے اولاد و احفاد کے مزارات آج بھی جوں کے توں موجود ہیں اور ان مزارات پر لوگ آج بھی دیا بتی جلاتے اور عقیدتوں کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد　　　چراغ عاشقاں ہرگز نمیرد

سلسلۂ عالیہ قادریہ کی ایک اہم اور بڑی شاخ سلسلۂ قادریہ فاضلیہ کے بانی مبانی حضرت ابوالفرح محمد فاضل الدین کے خانوادے کے افراد اور بزرگوں نے قیام پاکستان کے بعد پہلے جیل روڈ لاہور پر سکونت اختیار کی۔ پھر فیروز پور روڈ پر ایک بڑے قطعہ اراضی پر اپنی رہائش کے لیے فاضلیہ کالونی تعمیر کی۔ ایک بڑا لنگر خانہ اور مسجد بھی بنوائی۔ فاضلہ کالونی میں ہر سال حضرت سیدنا غوث الاعظم کا سالانہ عرس بڑے اہتمام اور احترام و عقیدت کے ساتھ منایا جاتا ہے جس میں ہزاروں مریدین و معتقدین شریک ہو کر فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الطاف محی الدین قادری فاضلی آج کل سجادہ نشین ہیں۔ انتہائی مخلص و ملنسار اور منکسرالمزاج اور درویش صفت بزرگ ہیں۔ ون یونٹ کی اسمبلی کے رکن بھی رہے ہیں۔ آج کل صاحب فراش ہیں۔

گیلانی سادات کے اس معزز خاندان کے بیسیوں تعلیم یافتہ افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور ملک وقوم کے لیے بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حضرت شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی نے ۷ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۸۳ء کو ۲۷ سال کی عمر میں بٹالہ میں وفات پائی اور وہ بٹالہ ضلع گورداس پور (بھارت) ہی میں مدفون ہیں۔ ''غم عام'' آپ کی تاریخ وفات ہے۔

قاضی مبارک گوپاموی

قاضی محمد مبارک گوپاموی کا شمار مغلیہ عہد کے مشاہیر اذکیا اور بلند مرتبت صاحبانِ تصانیف علماء و فضلا میں ہوتا ہے۔ قاضی محمد مبارک زاہد و عابد اور متقی و پرہیز گار ہونے کے ساتھ ساتھ جامع العلوم بزرگ تھے۔ علم حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، منطق، علم الکلام اور صرف و نحو غرض یہ کہ تمام علوم متداولہ پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ تاریخ و تذکرہ کی کتب معتمدہ میں قاضی صاحب کا تعارف شان دار الفاظ میں کرایا گیا ہے جس سے ان کے علمی کمالات اور دینی و تعلیمی اور تبلیغی خدمات پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی تحقیق نگارشات کی اہمیت و افادیت واضح ہوتی ہے۔

مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر المسامع النواظر'' میں انہیں '' الشیخ العالم الفقیہ'' لکھا ہے اور تفصیلی تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے'' کان من مشاہیر الاذکیاء لہ شہرۃ مغنیۃ عن الاطناب فی وصفہ'' یعنی آپ مشہور ترین ذہین و ذکی لوگوں میں سے تھے اور آپ کو ایسی شہرت حاصل تھی کہ تعریف و توصیف کی زیادتی سے آپ بے نیاز تھے۔ علماء اور مؤرخین قاضی مبارک کا شمار عہدِ مغلیہ کے نامور منطق دانوں میں کرتے ہیں اور ان کا ذکر مولوی حمداللہ، مولوی احمد، مولانا محمد مبین اور ملا حسن بحرالعلوم کے ساتھ کیا ہے۔

مولانا فضل امام خیر آبادی نے ''آمدنامہ'' میں لکھا ہے'' قاضی مبارک ذہن رسا و طبیعت عالی داشت، و در امور عامہ دانی مشہور بود، اول کسی کہ حاشیہ بر میر زاہد نوشت و مسلم راشرح کرد، او بود تتبع طرز میر باقر در عبارت شرح مسلم پیروی میر اختیار کردہ۔''

قاضی صاحب کا پورا نام محمد مبارک بن محمد دائم بن عبدالحیٔ بن عبدالحلیم بن المبارک

ناصحی گوپاموی ہے اور ان کا سلسلہ نسب سیدنا حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے۔ اس نسبت سے قاضی محمد مبارک فاروقی بھی کہلاتے ہیں جب کہ اسی نسبی نسبت سے ان کے بعض تذکرہ نگاروں نے ''عمری'' بھی لکھا ہے۔ چنانچہ صاحب نزہۃ الخواطر نے قاضی مصطفیٰ علی خان کی کتاب ''تذکرۃ الانساب'' کے حوالے سے قاضی محمد مبارک گوپاموی کا سلسلہ نسب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''الشیخ العالم الفقیہ قاضی مباک ابن شہاب الدین بن العلاء عمری گوپاموی، شیخ مبارک الاولیاء ناصحی بلخی کی اولاد میں سے تھے۔''

مولانا محمد حنیف گنگوہی نے حالات مصنفین درس نظامی، معہ قرۃ العیون فی تذکرۃ الفنون میں قاضی مبارک کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سلطان ابراہیم بن ادھم کی اولاد سے ہیں سلسلہ نسب یوں ہے: قاضی مبارک بن دائم علی بن عبدالحیٔ بن عبدالحلیم بن المبارک ادھمی ناصحی گوپاموی۔''

قاضی محمد مبارک کی ولادت گوپامؤ میں ہوئی اور انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا محمد دائم علی ادھمی اور اپنے زمانے کے نامور عالم دین قاضی شہاب الدین گوپاموی سے حاصل کی۔ اپنے آبائی شہر گوپامؤ میں قاضی مبارک نے قاضی قطب الدین سے بھی استفادہ کیا اور ان مختلف علوم کی کتابیں ان سے پڑھیں۔ پھر خیرآباد جاکر محدث دوراں حاجی محمد صفت اللہ حسینی فیروز آبادی سے سماعت حدیث کے بعد سند فراغت حاصل کی۔ قاضی مبارک نے معقولات کی تعلیم اکبر آباد میں مفتی میر زاہد بن محمد اسلم ہروی سے حاصل کی اور اس میں مہارت تامہ حاصل کی۔ غرض یہ کہ قاضی مبارک گوپاموی نے اپنے عہد کے نامور علماء وفضلاء اور اکابر مشائخ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرکے اسلامی علوم و فنون میں کامل دست گاہ حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کی تحصیل وتکمیل کی غرض کے تحت سفر اختیار کیا اور ملک کے مختلف علمی مراکز میں قیام کرکے علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اخذ واستفادہ کیا۔

قاضی محمد مبارک کے اساتذہ میں شیخ نظام الدین امیٹھوی اور شیخ صبغۃ اللہ حسینی خیرآبادی محدث بھی شامل ہیں۔ شیخ نظام الدین امیٹھوی بڑے صاحب کمال اور مرتاض بزرگ تھے۔ ان کا شمار اکابر مشائخ میں ہوتا تھا۔ زندگی بھر عبادت و ریاضت علوم وفنون کی تدریس وتعلیم اور اخلاق وآداب کی تلقین میں مصروف رہے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ

بہت وسیع تھا۔ ان سے مستفید و مستفیض ہونے والوں کی تعداد حد و شمار سے باہر ہے۔ لیکن قاضی مبارک ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے جس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ شیخ نظام الدین جو اپنی عبادت و ریاضت اور درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کی وجہ سے سفر نہیں کرتے تھے لیکن قاضی محمد مبارک انہیں اس قدر عزیز تھے کہ وہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر ان کی ملاقات کی غرض سے گوپامؤ تشریف لے جاتے تھے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" اور مولانا عبدالحیٔ حسنی نے "نزہتہ الخواطر" میں شیخ نظام الدین امیٹھوی کے احوال بیان کئے ہیں اور انہیں الشیخ، العالم الفقیہ الزاہد نظام الدین یکے از مشائخ کبار چشتیہ اور شیخ سری سقطی کی اولاد میں سے لکھا ہے۔

قاضی مبارک نے شیخ نظام الدین ایسے صاحب کمال عالم دین اور بلند مرتبہ فقیہہ سے حدیث، تفسیر، فقہ اور اصول فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ مغلیہ عہد کے نامور محدث شیخ صبغۃ اللہ حسینی خیرآبادی سے بھی سماعت حدیث کی اور ان سے علم حدیث میں سند فراغت بھی حاصل کی۔

علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کے بعد قاضی محمد مبارک گوپاموی دارالسلطنت دہلی میں وارد ہوئے اور وہاں اپنا حلقہ درس قائم کیا۔ دہلی میں وہ ایک طویل مدت تک تدریس و تلقین کے علاوہ تصنیف و تحقیق کے کام میں مشغول رہے۔ بحیثیت معلم و مدرس اور محقق ان کے مرتبہ و مقام کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ ان کے دہلی میں قیام ہی کے دوران انہیں ان کے درس و تدریس اور علمی و تحقیقی کارناموں کی بدولت قابل قدر شہرت و مقبولیت حاصل ہوگئی۔

قاضی محمد مبارک گوپاموی کے معاصرین میں بے شمار ارباب علم و دانش کا ذکر کتب تاریخ و تذکرہ میں ملتا ہے۔ لیکن ہم یہاں شیخ نظام الدین حسینی خیرآبادی اور شیخ عبدالغنی بن حسام الدین فتح پوری کے علاوہ حمداللہ سندیلوی اور قاضی احمد علی سندیلوی کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مؤخرالذکر یعنی قاضی احمد علی سندیلوی کے ساتھ ان کا علمی مباحثہ بھی ہوا تھا جس کی تفصیل مولوی عبدالرحمٰن نے "تذکرہ علمائے ہند" میں بیان کی ہے۔ جبکہ مولانا محمد حنیف گنگوہی نے صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ "مولوی حمداللہ سندیلوی اور قاضی احمد علی سندیلوی کے ہم عصر تھے اور ان دونوں حضرات سے علمی مباحثہ و مناظرہ بھی رکھتے تھے۔"

قاضی مبارک کے تحقیقی کارناموں میں ان کی تصانیف کے علاوہ ''شرح التہذیب'' اور ''شرح المواقف'' پر ان کے حواشی بھی شامل ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا علمی اور تحقیقی کارنامہ جس کی بدولت انہیں شہرت دوام ملی وہ ''سلم العلوم'' کی شرح ہے۔ ''سلم العلوم'' علم منطق پر قاضی محبّ اللہ بہاری کی ایک نفیس اور بیش قیمت کتاب ہے جس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ اس پر عربی، فارسی اور اردو میں بے شمار حواشی اور شروح لکھی گئی ہیں۔

قاضی محبّ اللہ بہاری کا شمار برصغیر پاکستان و ہند کی ممتاز دینی اور علمی و ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تین انتہائی اہم کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ایک کتاب علم فقہ پر ''مسلم الثبوت'' ہے۔ ان کی دوسری تصنیف ''الجواہر الفرد'' ہے جس میں فلسفیانہ مسائل پر بحث کی گئی ہے، جب کہ ان کی تیسری تصنیف کا نام ''سلم العلوم'' ہے۔ مؤخر الذکر کتاب کا موضوع منطق ہے۔ قاضی محبّ اللہ بہاری کی یہ تینوں کتابیں برصغیر پاکستان و ہند میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور قاضی محبّ اللہ کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کا سبب بھی ہیں۔

قاضی محبّ اللہ کی ''سلم العلوم'' کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد اپنے تحقیقی مقالے ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''سلم العلوم' کو ایک مدت سے مستند اور معیاری تصنیف تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کی کم از کم نصف درجن شرحیں ممتاز علماء نے لکھی ہیں۔''

قاضی محبّ اللہ بہاری کی ''سلم العلوم'' کی متعدد شروح میں سے عربی زبان کی دو شرحوں کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جن میں سے ایک قاضی محمد مبارک گوپاموی کی شرح اور دوسری اُن کے ہم عصر اور ہم چشم مولوی حمد اللہ سندیلوی کی شرح ہے۔ اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ دونوں کتابیں اپنے مصنفوں کے نام سے موسوم ہوئیں۔ چنانچہ مولوی حمد اللہ سندیلوی کی شرح ''سلم العلوم'' مولوی حمد اللہ کے نام سے اور قاضی مبارک گوپاموی کی شرح ''قاضی مبارک'' کے نام سے مشہور و متداول ہوئی۔ ان کتابوں کے بارے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ ''سلم العلوم'' کی یہ دونوں شرحیں یکساں طور پر مشہور و مقبول ہیں اور کسی ایک کو دوسری پر فضیلت و برتری دینا ایک مشکل امر ہے۔

قاضی مبارک کی شرح ۱۱۴۳ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچی تھی۔ ڈاکٹر زبید احمد نے اس شرح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس شرح میں 'تصور' کے موضوع کی وضاحت قابلِ ذکر ہے۔"

قاضی محمد مبارک نے شریف جرجانی کی "شرح المواقف" پر جو حواشی قلمبند کئے تھے انہیں بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میر زاہد بن محمد اسلم ہروی نے شریف جرجانی کی "شرح المواقف" کے حصہ "الامور العامۃ" پر حواشی لکھ کر اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں پیش کئے تھے جن کی بہت پذیرائی ہوئی تھی۔ قاضی مبارک نے میر محمد زاہد کے ان حواشی پر اپنے حواشی چڑھائے جو "الحاشیہ علیٰ حاشیہ میر زاہد علی الامور العامۃ" کے نام سے شائع ہوئے اور آج بھی دستیاب ہیں۔ یہ اپنی جگہ قاضی محمد مبارک کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔

قاضی محمد مبارک گوپاموی کا اصل میدان تو تعلیم و تدریس اور وعظ و ارشاد تھا لیکن انہوں نے تصنیف و تحقیق میں بھی قابلِ قدر علمی خدمات انجام دے کر غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔

جہاں تک ان کے حلقہ درس کا تعلق ہے تو ان کے اصحاب اور تلامذہ کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ اُن کے شاگردوں میں ملا نور محمد معروف بہ نور بابا پتلو کاشمیری، شیخ عبدالوہاب بن ابوالفتح اکبر آبادی اور شیخ محی الدین حسینی کے علاوہ بے شمار قابلِ ذکر علماء شامل ہیں۔

قاضی محمد مبارک کو ان کے علمی کمالات اور ان کی شخصی خصوصیات کے پیش نظر گوپامو کے منصب قضاۃ پر مامور کیا گیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ فی الحقیقت قاضی محمد مبارک کا شمار ان یگانۂ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے جن کو منصبِ قضاۃ سے عزت نہیں ملتی بلکہ یہ ہستیاں منصبِ قضاۃ کو قبول کر کے اس منصب کی عزت و وقار اور اس کی عظمت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔

قاضی محمد مبارک گوپاموی نے ۱۱۶۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے دارالسلطنت دہلی میں انتقال کیا تھا لیکن ان کا جنازہ دہلی سے گوپامؤ لایا گیا اور انہیں ان کے جد امجد کے تعمیر کردہ مدرسہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ مادۂ تاریخ "حسن خاتمہ" ہے۔

محمد حیات سندھی

حضرت مولانا محمد حیات سندھی مدنیؒ بھکر کے قریب قصبہ عادل پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات کا کتب، تاریخ و تذکرہ میں ذکر نہیں ملتا سوائے اس کے کہ سندھ کے مشہور قبیلہ چاچڑ سے ان کا نسبی تعلق تھا۔

شیخ محمد اکرام نے ''رودِ کوثر'' میں شیخ محمد حیات سندھی کے انتہائی مختصر حالات بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ''عربی زبان میں تصنیف و تالیف میں جو شہرت علامہ زبیدی نے حاصل کی وہ غالباً کسی دوسرے ہندوستانی کو زمانۂ حال میں نصیب نہیں ہوئی لیکن ایسے ہندوستانی علماء کی تعداد بہت ہے جنہوں نے مدینہ منورہ یا عرب کے دوسرے شہروں میں درس و تدریس کی محفلیں جمائیں اور ایک عالم کو سیراب کیا۔ افسوس کہ ایسے علماء کا جداگانہ تذکرہ مرتب نہیں ہوا ورنہ ان علمی اثرات کا پورا اندازہ ہوتا جو ہندوستانی علماء نے عرب اور دوسرے اسلامی ممالک پر ڈالے لیکن اس فہرست میں بڑے بڑے برگزیدہ نام شامل ہیں اور خوش قسمتی سے ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔''

ان تمہیدی کلمات کے بعد شیخ محمد اکرام نے شیخ علی متقی اور شیخ عبدالوہاب کے علاوہ خواجہ باقی باللہ کے خلیفہ شیخ تاج الدین سنبھلی اور شیخ صبغت اللہ بروجی کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ''ان حضرات نے حجاز کو اور حجاز کے راستے باقی عالم کو نقشبندی اور شطاری سلسلوں سے روشناس کیا۔ اس وقت بھی یہ سلسلہ جاری تھا جو علماء تکمیلِ تعلیم کے بعد حجاز میں مقیم ہو گئے تھے اور اپنی قابلیت اور شغفِ علمی کی بدولت وہاں مرجع خاص و عام بن گئے تھے ان میں سندھ کے کئی فاضل تھے جن میں مولانا محمد حیات سندھی مدنی سب سے ممتاز تھے۔ وہ عادل پور (سندھ) کے قریب پیدا ہوئے۔ عنفوانِ شباب ہی میں حج کے

لیے گئے اور حج کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی مقیم مدینہ اور مولانا عبداللہ بن سالم بصری سے تکمیلِ تعلیم کی اور اپنے آپ کو درسِ حدیث کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے سب سے نام ور محدثوں میں ہوتا تھا۔ آپ مسجد نبوی میں صبح کی نماز سے قبل وعظ کہتے اور ایک جمِ غفیر آپ کے ارشادات سننے کے لیے حاضر ہوتا۔ آپ کے شاگردوں میں میر غلام علی آزاد بلگرامی، مولانا فاخر الہ آبادی بلکہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے نام لیے جاتے ہیں۔ آپ کی وفات ۱۷۵۰ء میں ہوئی۔''

یہ وہ سب کچھ ہے جو شیخ محمد اکرام ایسے فاضل مؤرخ اور محقق نے مولانا محمد حیات سندھی مدنی کے بارے میں لکھا جو ہم نے سب کا سب ان کی کتاب ''رودِکوثر'' سے یہاں نقل کر دیا ہے۔

مولانا محمد حیات سندھی کے دوسرے تذکرہ نویس ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' دوسری جلد (عربی ادب) کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر ہیں جنھوں نے مولوی رحمٰن علی کے ''تذکرہ علمائے ہند'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''مولانا محمد حیات بن ملا ابراہیم فلاریہ سندھی ثم مدنی قبیلہ چاچڑ سے تعلق رکھتے تھے جو عادل پور میں آباد تھا۔ اس زمانے میں ٹھٹہ سندھ کا ثقافتی مرکز تھا۔ چنانچہ مولانا محمد حیات بھی وہیں پہنچے اور شیخ محمد معین سندھی سے درس لیا۔ پھر عنفوانِ شباب میں حرمین کی زیارت کے لیے گئے اور مدینہ منورہ میں شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی نزیل مدینہ منورہ سے حدیث میں سند لی اور وہیں مقیم ہو گئے۔''

شیخ محمد حیات سن شعور کو پہنچے تو علم حاصل کرنے کے لئے سندھ کے مشہور شہر ٹھٹہ پہنچے، اس زمانے میں ٹھٹہ صدیوں سے اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا گہوارہ چلا آ رہا تھا۔ ٹھٹہ میں شیخ محمد حیات علامہ محمد معین بن محمد امین کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ علامہ محمد معین بن امین کا شمار حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاص شاگردوں میں ہوتا تھا۔

علامہ محمد معینؒ سے سند فراغت پا کر مولانا محمد حیات نے حجاز کا سفر اختیار کیا اور حج بیت اللہ ادا کر کے وہ مدینہ منورہ پہنچے۔ جہاں انہوں نے علمائے حرمین سے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ مولانا محمد حیات نے بالخصوص علم حدیث میں مہارت تامہ حاصل

کی۔ علم حدیث میں مولانا محمد حیات نے جن ائمہ اور شیوخ سے اکتساب علم کیا ان میں شیخ عبداللہ بن سالم بصریؒ، شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکروی، شیخ حسن علی اور مولانا شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی مدنی شامل ہیں۔

سید سلیمان ندوی ''مآثر الکرام'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> ''شیخ محمد حیات کا وطن سندھ میں عادل پور اور کوٹ سید موسیٰ قادری کے اطراف میں ہے۔ چاچڑ قبیلہ کا نام ہے۔ شباب کا آغاز تھا کہ جاذبہ شوق نے دامن دل کھینچا، حرمین کی راہ لی۔ بالآخر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں شادی بھی کرلی۔ زیادہ تر شیخ ابوالحسن سندھی مدنی سے اور کسی قدر عبداللہ بن سالم مصری مکی سے علم حدیث کی تحصیل وتکمیل کی اور تمام عمر اس فن شریف کی خدمت میں صرف کردی، مصر، روم و شام و ہند ہر جگہ ان کے فضل و کمال کا غلغلہ بلند ہوا۔ اور ہر طرف سے طالب و مشتاق کا ہجوم ہوا۔''

حصول علم کے بعد مولانا محمد حیات نے مدینہ منور میں مستقل رہائش اختیار کرلی۔ اور وہیں شادی کرکے درس وارشاد کا سلسلہ جاری کیا پھر وہ اپنے استاد محترم شیخ ابوالحسن کے جانشین مقرر ہوئے اور ان کی مسند تدریس پر ۲۴ برس تک حدیث شریف کا درس دیتے رہے، وہ ایک ممتاز محدث بلند پایہ محقق اور قابل قدر مبلغ تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں گزار دی۔ ان کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا اور ان کے شاگرد ارض حجاز کے علاوہ مصر، شام اور ہندوستان تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے شاگردوں میں مولانا آزاد بلگرامی، مولانا ابوالحسن محمد صادق سندھی اور مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے ''مآثر الکرام'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی گو ہندوستان میں اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی کے واسطہ سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سلسلہ میں داخل ہوکر حدیث کی بعض کتابیں پڑھ چکے تھے مگر حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور صحیح بخاری سبقاً سبقاً پڑھی۔ صحیح بخاری اس اہتمام سے پڑھی کہ روزانہ جس قدر بخاری پڑھتے تھے اسی قدر قسطلانی شرح بخاری کی تلخیص کرتے جاتے تھے۔ اسی طرح شاہ محمد فاخرالہ آبادی نے

بھی سرزمین حجاز میں جا کر شیخ محمد حیات سے حدیث کا درس لیا۔

مولانا محمد حیات سندھی کے تذکرہ نگار ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند" دوسری جلد (عربی ادب) میں مولانا محمد حیات سندھی کے رسالے "الایقاف" کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ رسالہ ناپید ہے۔" مولانا محمد حیات کا یہ ایک مختصر سا رسالہ عربی زبان میں ہے۔ اس کا پورا عنوان "الایقاف علیٰ سبب الاختلاف" ہے۔ یہ رسالہ مع اردو ترجمہ کے ہماری ذاتی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا حافظ ابو سعید محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ) نے مع متن کے شائع کیا ہے اور رسالے کے آغاز میں "سبحۃ المرجان"، "مآثرالکرام"، "سلک فی اعیان القرن الثانی عشر"، "اتحاف النبلاء"، "ابجد العلوم" اور "نزہۃ الخواطر" وغیرہ کتب تاریخ و تذکرہ کے حوالوں سے مولانا محمد حیات سندھی کے احوال و آثار بیان کیے ہیں جس سے اس رسالے کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا محمد حیات سندھی نے تصنیف و تالیف کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے کئی کتابیں، رسالے اور شروح تصنیف کیں جن میں (۱) شرح ترغیب و ترہیب للمنذری، دو جلدوں میں، (۲) شرح اربعین نووی، (۳) مختصر الزواجر عن اقتراف الکبائر، (۴) شرح الحکم العطائیہ، (۵) الحکم الحدادیہ، (۶) تحفۃ الانام فی العمل بحدیث النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام، (۷) فتح الغفور فی وضع الایدی فی الصلوٰۃ علی الصدور، (۸) رسالۃ فی النہی عن عشق صور المرد والنسوان، (۹) رسالہ فی رد بدعۃ التعزیہ شامل ہیں۔

مولانا محمد حیات علم و فضل کے بلند مرتبہ پر فائز ہونے کے علاوہ انتہائی متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔

مولانا محمد حیات نے ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور وہیں جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

عبدالحکیم نانا صاحب

حضرت میاں عبدالحکیم نانا صاحب اپنے زمانے کے نامور محدث، بلند پایہ فقیہ اور عارف باللہ تھے۔ انہوں نے بلوچستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ افغانستان میں بھی اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت کے باب میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ان کا تعلق صوبہ بلوچستان سے تھا۔ وہ ۱۰۹۰ھ میں بلوچستان کے خانوزئی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سکندر شاہ تھا۔ آپ ڈیوڈزئی شموزئی سنٹیا کاکڑ تھے۔ نانا ان کا احترامی لقب ہے جو اردو کے ''بابا'' کا مترادف ہے۔ مگر کثرتِ استعمال سے ان کے نام کا جزو ہی بن گیا۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے ''تذکرہ صوفیائے بلوچستان'' میں حضرت میاں عبدالحکیم نانا صاحب کے حالاتِ زندگی اور ان کی دینی و تبلیغی خدمات بیان کی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب حضرت میاں عبدالحکیم کے والد کے بارے میں ایک روایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میاں صاحب کے والد سکندر شاہ خود بھی صاحبِ بصیرت اور اہلِ کشف و کرامات میں سے تھے۔انہوں نے ادھیڑ عمر میں شادی کی۔ میاں صاحب کی والدہ نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ان کے جسم سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں جنہیں وہ اپنے کپڑوں میں چھپا رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے والد صاحب سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے اس کی تعبیر بتائی کہ خدا آپ کو ایک ایسا نیک بخت فرزند عطا کرے گا جس کے باطنی علوم و انوار سے دنیا منور ہو

جائے گی۔ میاں صاحب اسی تعبیر کی مادی صورت تھے جن کے
ظاہری اور باطنی علوم و کمالات سے قندھار، پشین اور لورالائی کا
سارا علاقہ فیض یاب ہوا۔"

میاں صاحب کے تذکرہ نگاروں نے انہیں عالمِ اجل، فاضلِ اکمل، شیخِ شریعت و طریقت، غوث زماں حضرت میاں عبدالحکیم کاکڑ افغان قدس سرۂ العظیم لکھا ہے۔

میاں صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ اور شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان کے علاوہ مشروط الصلوٰۃ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں میاں صاحب نے پشین کے گرد و نواح کی مختلف بستیوں میں جا کر تعلیم حاصل کی۔ جہاں کسی لائق استاد یا فاضل بزرگ کا پتہ چلتا اُس کی خدمت میں حاضر ہو کر اکتسابِ علم کرتے۔ اس طرح گاؤں گاؤں جا کر میاں صاحب نے صرف ونحو کے علاوہ بعض فارسی کتب کا درس لیا۔ پھر وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے قندھار چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ایک عرصے تک قیام کر کے اسلامی علوم وفنون بالخصوص حدیث اور فقہ میں مہارت پیدا کی۔

میاں عبدالحکیم ناناصاحب کے تذکرہ نگار ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے لکھا ہے کہ قندھار میں انہوں نے بہت جلد منطق، بدیع، معانی، بیان، اصول، حدیث اور تفسیر کی مکمل تعلیم کی تحصیل کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے تصوّف وطریقت کی راہ اختیار کی۔ پہلے وہ میاں سید لعل جیونکر باریؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے مگر ان کے اشتیاقِ باطنی اور روحانی صلاحیتوں کا اندازہ کرنے کے بعد انہوں نے میاں صاحب کو اپنے استاد شیخ عبدالغفور نقشبندی کے پاس پشاور بھیج دیا۔ انہوں نے بھی حسب مقدور ان کی روحانی تشنگی بجھانے کی کوشش کی مگر بالآخر انہوں نے بھی میاں صاحب کو اپنے استادِ مکرم میاں اللہ یار صاحب کے پاس لاہور بھیج دیا، جہاں ان کی روحانی شخصیت کی تکمیل ہوئی اور مرشدانِ طریقت نے انہیں خلافت کے خرقے عطا کئے۔

میاں عبدالحکیم ناناصاحب کو سلسلۂ عالیہ قادریہ اور سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ دونوں بڑے روحانی سلاسل میں خلافت و اجازۃ حاصل تھی۔ چنانچہ میاں صاحب نے قندھار جا کر مسندِ ارشاد قائم کی اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح ان کے وعظ وارشاد اور ان کے علم وفضل کی شہرت جلد ہی دور ونزدیک پھیل گئی اور طالبانِ حق جوق در جوق قندھار پہنچ کر ان کے حلقۂ درس میں شامل ہونے لگے۔ ان کے تذکرہ نگار ڈاکٹر انعام

الحق کوثر یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ بدکار و بدکردار لوگ بھی ان کی ایک نظر سے تائب ہوکر صراط مستقیم اختیار کر لیتے۔ انہوں نے کئی لوگوں کو روحانی مراتب پر فائز کیا۔

میاں صاحب کے علم وفضل، ان کی پرکشش روحانی شخصیت اور ان کے پُرتاثیر کلام کی بدولت ان کے شاگردوں اور مریدوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ حاسدوں اور کینہ پرور لوگوں نے بادشاہ وقت شاہ حسین ھوتک کو میاں صاحب کے لوگوں میں بے پناہ اثر و رسوخ اور ان کی روز افزوں شہرت و مقبولیت سے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ حسین ھوتک نے میاں صاحب کو قندھار چھوڑ دینے کا حکم صادر کر دیا۔

میاں صاحب نے ربع صدی تک قندھار میں قیام کر کے اپنی مشیخیت کا ہنگامہ گرم رکھا اور اس طرح انہوں نے بے شمار لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے آراستہ کیا اور ہزاروں گنہگار ان کے وعظ وارشاد سے متاثر ہو کر تائب ہوئے اور راہِ راست پر آ گئے۔ میاں صاحب ۱۱۲۱ھ سے لے کر ۱۱۴۹ھ تک مسلسل قندھار میں مقیم رہے۔ اس دوران پرویس خان، عبداللہ خان، شاہ محمود خان اور شاہ اشرف خان یکے بعد دیگرے قندھار کے حکمران رہے۔ یہ تمام حکمران میاں صاحب کا ادب واحترام کرتے رہے مگر شاہ حسین ھوتک نے کچھ اپنے دربار کے خوشامدی امراء کی سعی و سازش اور کچھ میاں صاحب کے مریدین و معتقدین کی کثرت سے خوف زدہ ہو کر ان کو شہر بدر کرنے کا حکم دے دیا۔ جس کا فی الحقیقت قطعی کوئی جواز نہ تھا۔ اس لئے کہ میاں صاحب ایک صوفی منش مرتاض بزرگ تھے۔ نیز یہ کہ وہ کوئی سیاسی عزائم نہیں رکھتے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ حسین ھوتک سے پہلے یکے بعد دیگرے قندھار پر حکومت کرنے والے چار حکمرانوں، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، کے میاں صاحب سے تعلقات خوشگوار رہے تھے اور انہیں بھی میاں صاحب کے بے شمار مریدین ومعتقدین سے کسی قسم کا خوف یا خدشہ محسوس نہیں ہوا تھا۔

میاں صاحب قندھار سے روانہ ہوئے تو ان کے ہزاروں مریدین و معتقدین ان کے ساتھ تھے۔ شہر سے باہر نکل کر میاں صاحب نے انہیں نصیحت کی اور کہا کہ وہ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ مگر اکثر عقیدت مندوں نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ کوژک پہاڑ سے ہوتے ہوئے اپنے آبائی گاؤں خانوزئی پہنچے۔ جہاں انہوں نے اپنے والد مرحوم کا مزار تعمیر کرایا اور ایک مسجد بھی بنوائی۔ اور اس کے ساتھ ایک باغ لگایا۔

شاہ حسین ھوتک کے خوف سے میاں صاحب کے عزیز و اقارب نے انہیں اراضی میں ان کا حصہ بھی نہ دیا۔ چنانچہ ایک سال اپنے آبائی گاؤں میں قیام کرنے کے بعد وہاں سے اپنے مریدوں سمیت ڈکی چلے گئے۔ راستے میں یوسف، کچھ، کواس، بغاو، سمالن، بوری اور تل سے گزرے مگر ان مقامات پر آباد اُن کے قبیلے کاکڑ کے لوگوں نے بھی انہیں ٹھہرنے کے لئے جگہ نہ دی۔ بالآخر چوٹیالی تھل کی ایک قوم ترین کے لوگوں نے انہیں رہائش کے لئے زمین دی۔

حضرت میاں عبدالحکیم سے کئی کشف و کرامات بھی منسوب ہیں۔ ان کے تذکرہ نگار ڈاکٹر انعام الحق کوثر ایک روایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میاں صاحب اپنے مریدوں سمیت ایک دن قندھار کے ایک بازار سے گزر رہے تھے کہ ان کی نگاہ ایک بچے پر پڑی۔ انہوں نے اسے پاس بلایا، اسے دُعا دی اور رخصت کر دیا۔ مریدوں میں سے کسی کے استفسار پر میاں صاحب نے فرمایا کہ یہ بڑا نیک بخت بچہ ہے۔ اس کی پیشانی پر بادشاہت تحریر ہے۔ یہ وہی بچہ تھا جو میاں صاحب کی وفات کے سات سال بعد بادشاہ بنا اور جو تاریخ میں احمد شاہ ابدالی کے نام سے مشہور ہے۔

میاں صاحب زندگی بھر مجرّد رہے۔ اپنی ساری زندگی حصولِ علم، عبادت، ریاضت اور لوگوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت کے لئے وقف کر دی۔ انہوں نے درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ چنانچہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو زیادہ تر فارسی میں ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے لکھا ہے کہ ان کی چار کتابیں یعنی مجموعہِ رسائل، مقاماتِ توحید، رسائلِ حکمیہ اور حصن الایمان ہیں۔ ''مجموعہِ رسائل' میں چھ باب ہیں جن میں تنزیہ' فیوض، حقیقتِ صلوٰۃ و فقر، حقیقتِ محمدی اور بحث نفی و اثبات پر بہت عالمانہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ تذکرہ علوم و معارف بھی ان کی تصنیف ہے۔ ان کی کتاب ''حصن الایمان'' میں عقائد پر بحث کی گئی ہے۔ اسلوبِ بیان آسان اور دلنشین ہے۔ سوال جواب کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اہلِ سنت والجماعت کے عقائد پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ دلائل دے کر وضاحت کی گئی ہے۔ آیات واحادیث کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ اس کے کل آٹھ باب ہیں۔

(۱) صفات اللہ (۲) عصمت الانبیاء (۳) احکام الایمان (۴) افعال العباد (۵) احکام الآخر (۶) عمل القلب (۷) الابتلا (۸) متفرقات۔ ڈاکٹر انعام الحق نے

میاں صاحب کے دو مخطوطات کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں میاں صاحب کے روحانی اکتسابات کا ذکر ہے جو انہیں وقتاً فوقتاً اپنے مرشدوں سے پیش آئے اور انہوں نے آگے اپنے ارادت مندوں کو بیان کئے۔ سلوک و معرفت سے متعلق مسائل کے بارے میں اُن کے خیالات معلوم کرنے کے لئے ان رسائل کا مطالعہ ضروری ہے۔

حضرت میاں عبدالحکیم نانا صاحب کی تاریخ وفات تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔

بلھے شاہ قادری

سید بلھے شاہ کا شمار سرزمین پنجاب کے اُن صاحبانِ علم وفضل اور بلند مرتبہ صوفیہ کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور عوامی احساسات و جذبات کی ترجمانی کے لیے شعروشاعری کو ذریعہ بنایا اور اسلام کے عالم گیر آفاقی اور انقلاب آفرین پیغام کو عوام وخواص، بالخصوص کم تعلیم یافتہ طبقوں تک پہنچانے میں شاندار اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ قرآنی احکام وتعلیمات کو سمجھنا اور پھر اسے سلیس اور قابلِ فہم زبان اور دل نشیں انداز میں لوگوں تک پہنچانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

حضرت بلھے شاہ کا یہ دینی وعلمی کارنامہ کوئی کم قابل تعریف نہیں ہے کہ انہوں نے پنجابی زبان کو ذریعۂ اظہار بنا کر یہ ثابت کر دیا کہ اس زبان میں بھی قرآنی حقائق و افکار اور اسلامی نظریات کمال حسن و خوبی آسانی و سہولت اور عمدگی سے بیان کیے جا سکتے ہیں۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر وہ فردِ فرید ہیں جنہوں نے علاقائی زبان میں صوفیانہ شاعری کی ابتداء کی اور مختلف صوفیہ کرام نے اس کو ترقی دی۔ حتیٰ کہ سید بلھے شاہ نے بزرگان دین کے فیض سے صوفیانہ شاعری کو اس کی انتہا تک پہنچا دیا۔ پھر ایک زمانے نے ان کے دامن کمال سے خوشہ چینی کی۔

سید بلھے شاہ کا سن ولادت ۱۰۹۱ھ ۔ ۱۶۸۰ء بیان کیا جاتا ہے۔ اصل نام عبداللہ تھا جو بگڑ کر ''بلھا'' ہو گیا۔ مولوی محمد شفیع نے ''اولیائے قصور'' میں لکھا ہے کہ اس لفظ کا تلفظ ''بلھے'' یا ''بلھا'' ہے۔ آپ کی مہر ''بلھا شاہ قادری'' ۱۱۸۱ھ سے بھی موجودہ تلفظ بلھا کی تائید ہوتی ہے۔'' بہر حال انہوں نے بلھے شاہ کے نام سے شہرت دوام حاصل کی۔ والد ماجد کا نام سید سخی محمد درویش تھا جو اوچ سے نقل مکانی کر کے پہلے ضلع ساہیوال کے موضع

ملک وال میں آ کر آباد ہوئے، پھر قصور میں سکونت اختیار کی۔ سید سخی محمد درویش اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے باعث بہت مشہور تھے۔ چنانچہ موضع پانڈو علاقہ قصور کے زمیندار بڑے ذوق و شوق کے ساتھ انہیں اپنے شہر میں لے آئے اور انہیں اپنی مسجد کا امام بنایا۔ سید بلھے شاہ ایک معروف گیلانی سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کا سلسلۂ نسب چودہ واسطوں سے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے۔ بلھے شاہ حضرت سید مخدوم محمد غوث گیلانی اوچی حلبی کی اولاد سے ہیں اور اوچ شریف ہی میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔

سید بلھے شاہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سید سخی محمد درویش سے حاصل کی اور پھر مسجد کوٹ قصور میں انہوں نے مولانا غلام مرتضیٰ قصوری اور مولانا غلام محی الدین قصوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ ان دو علماء کے علاوہ بلھے شاہ کے اساتذہ میں سے کسی کا ذکر نہیں ملتا البتہ خود بلھے شاہ کی شاعری سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے صاحب علم و فضل شخص تھے جنہوں نے حدیث و فقہ، تفسیر، منطق، علم الکلام وغیرہ کا بغور مطالعہ کیا ہوا تھا۔ جیسا کہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' کی تیرھویں جلد (علاقائی ادب) کے باب چہارم کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی نے لکھا ہے:

> ''آپ کے ابیات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے قرآن مجید ناظرہ طور پر پڑھنے کے علاوہ ''گلستان'' اور ''بوستان'' پڑھی اور منطق، نحو، معنی، کنز قدوری، ''شرح وقایہ'' پڑھتے رہے۔ آپ کے ایک مصرعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ''امرت کنڈ'' کا ترجمہ بحرالحیو'' بھی پڑھا تھا جو شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری نے کیا ہے۔''

''امرت کنڈ کے اس ترجمے کے متعلق کہا گیا ہے کہ کتاب کے مفہومات کا زنار توڑ کر توحید اور اسلام کی تسبیح ان کی گردن میں ڈالی گئی ہے''۔ میرزا مظہر جان جاناں نے بھی اپنے خطوط میں ہندو یوگیوں کی توحید پرستی کا ذکر کیا ہے۔ ''امرت کنڈ'' کا مطالعہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ بلھے شاہ ''امرت کنڈ'' کے مندرجات سے متاثر بھی تھے۔ فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی ''تصوف اور صوفی شعراء'' کے عنوان کے تحت رقم

طراز ہیں:

''حقیقت کو پہچاننے کے دو طریقے ہیں، ایک کسبی اور دوسرا وہبی۔ کسبی طریقہ قوتِ مدرکہ یعنی عقل و علم کا راستہ اختیار کرتا ہے اور وہبی ذریعہ حقیقت تک انسان کو براہِ راست لے جاتا ہے۔ مگر ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ عقل میں استدلال کارفرما ہے اور شک و شبہہ کی گنجایش باقی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ عقل اصل حقیقت تک پہنچنے سے قاصر ہوتی ہے۔ مگر عشق وہ وہبی جذبہ ہے جو تمام حدود کو پھاند کر محض تعلقِ قلب اور ارتقاء نفس کے ذریعے حقیقت الحقائق تک پہنچ جاتا ہے۔ عالم لوگ عقل و علم کو مشعل راہ بناتے ہیں مگر صوفی عشق حقیقی کے طالب ہونے کی وجہ سے ظواہر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ عقل شواہد سے بحث کرتی ہے اور عشق ماورائی کیفیت کو احاطہ کرنے کی لگن میں مصروف رہتا ہے۔ یہی کشمکش شریعت اور طریقت کو دوراہا بنا دیتی ہے۔ اگرچہ دونوں ایک ہی ذات کی طلب کے دو رُخ ہیں۔ صوفی شعراء عشق الٰہی کو اپنی زندگی کا مقصد و منتہا مانتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کو اپنی عبادت کا ماحصل تصور کرتے ہیں۔''

مؤرخین اور تذکرہ نویس بلھے شاہ کے شخصی کمالات اُن کے فن شاعری اور روحانی مرتبہ و مقام کے قائل ہیں اور ان کی تبلیغی و اصلاحی خدمات، اُن کے صوفیانہ مشرب اور اُن کے اعلیٰ و ارفع نصب العین کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے اپنی تالیف ''حدیقۃ الاولیاء'' میں ''سید بھلی شاہ قادری شطاری'' کے نام سے بلھے شاہ کے احوال و آثار بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

''یہ بزرگ حضرت شاہ عنایت قادری شطاری قدس سرّہٗ کے خلیفہ تھے۔ قصبہ قصور میں سکونت رکھتے تھے۔ سماع و وجد کا شغل دن رات مدِ نظر تھا۔ اکثر اوقات خوارق و کرامت بے اختیار ان سے سرزد ہوئی۔ طبیعت بھی ان کی موزوں تھی۔ پنجابی زبان میں ابیات و کافی ہزاروں ان کی تصنیف کی ہیں۔''

مؤرخ لاہور محمد دین کلیم قادری نے ''تذکرہ مشائخ قادریہ'' میں ''بلھے شاہ قادری شطاری'' کے عنوان کے تحت سید بلھے شاہ کے حالات زندگی اور اُن کے روحانی کمالات اور شعری کارنامے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ مؤرخ لاہور لکھتے ہیں:

''آپ حضرت شاہ عنایت قادری لاہوری کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں۔ سلسلۂ ارادت اس طرح ہے۔سید بلھے شاہ قادری مرید شاہ عنایت قادری مرید شاہ محمد رضا قادری مرید شیخ محمد فاضل قادری لاہوری مرید شیخ الہ داد قادری اکبرآبادی مرید شیخ محمد جلال مرید سید نور زین العابدین مرید شیخ عبدالغفور مرید شیخ وجیہہ الدین گجراتی مرید شاہ محمد غوث گوالیاری۔''

مؤرخ لاہور کی تحقیق کے مطابق سید بلھے شاہ نے لاہور میں بھاٹی دروازہ کے اندرون واقع اونچی مسجد میں حضرت شاہ عنایت قادری سے بیعت کی جو اُن کے خاندان کی تولیت میں تھی۔ بلھے شاہ ۱۶۷۰ء میں پیدا ہوئے۔نہایت عابد و زاہد بزرگ تھے اور اکثر آپ پر جذب وسُکر کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ جب آپ ذرا بڑے ہوئے تو اُن کے والد ماجد نے گھریلو مجبوریوں کی بناء پر گاؤں چھوڑنے کا ارادہ کرلیا اور ساہیوال کے ایک گاؤں ملک وال آگئے۔ پھر وہاں سے پانڈو بھٹی چلے گئے اور انہوں نے یہاں آکر چوہدری پانڈو بھٹی کی درخواست پر گاؤں کی مسجد کی امامت اور درس کی ذمہ داری قبول کر لی اور بلھے شاہ کو قصور میں خواجہ غلام مرتضٰی قصوری کے پاس تعلیم کی غرض سے بھیج دیا۔

مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ سید بلھے شاہ نے مسجد کوٹ قصور میں تعلیم حاصل کی جہاں خواجہ غلام مرتضٰی قصوری درس دیا کرتے تھے اور سید وارث شاہ بھی خواجہ صاحب کے شاگردوں میں تھے۔ چنانچہ خواجہ غلام مرتضٰی قصوری اکثر کہا کرتے تھے کہ ''مجھے دو عجیب شاگرد ملے ہیں ایک بلھے شاہ جس نے علم حاصل کر کے سارنگی پکڑ لی اور دوسرے سید وارث شاہ جس نے عالم ہوکر ''ہیر رانجھا'' کے گیت لکھنے اور گانے شروع کر دیے۔''

یہ افراتفری، بدامنی اور انتشار و خلفشار کا زمانہ تھا۔ پنجاب کے وسیع وعریض علاقوں پر سکھ قوم کے ہزاروں افراد درندوں کی طرح مسلمانوں کی جان ومال اور عزت و آبرو سے کھیل رہے تھے۔ جرائم پیشہ سکھوں کے مختلف گروہوں نے ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ سکھوں کے یہ گروہ جو فی الحقیقت ڈاکوؤں، لٹیروں،

چوروں، اور فسادیوں کے بڑے بڑے جتھے تھے، پنجاب کے مختلف علاقوں میں ان کی بارہ مسلیں تھیں جن میں شامل سکھ ملک کے طول و عرض میں لوٹ مار، ظلم و تشدد اور نہتے مسلمانوں کی آبرو ریزی کرتے تھے اور ان کا بے دریغ قتل عام کرتے تھے۔ قصور میں سکھوں کی دو مسلیں بھنگیوں کی مسل اور کنہیوں کی مسل نے لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ اسی لیے سید بلھے شاہ نے قصور کو اپنی تبلیغی و اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔

مؤرخ لاہور محمد دین کلیم نے سید بلھے شاہ کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کنہیوں کی مسل کا بانی جے سنگھ موضع کاہنہ ضلع لاہور کا رہنے والا تھا، یہ قصبہ قصور کے قریب واقع ہے۔ قصور اور اس کے مضافات میں اس مسل کے ظالموں نے کیا کیا ظلم و ستم ڈھائے ہوں گے اور ان تباہ کاریوں سے بلھے شاہ نے کیا تاثر لیا ہوگا، آپ کی شاعری سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے کلام میں بڑی سادگی ہے۔ آپ کا کلام پنجاب کی روح کی آواز ہے۔ ذات الٰہی سے آپ کو عشق تھا اور اس عشق سے سرشار ہو کر آپ نے اپنے کلام میں خدا سے باتیں کی ہیں۔ آپ کا کلام ادبی اور معنوی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ اشعار میں سکھ عہد کی لاقانونیت اور مظالم کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

در کھلا حشر عذاب دا　بُرا حال ہویا پنجاب دا
وِچ ہاویہ دوزخ ماریا　سانوں آمل یار پیاریا

سید بلھے شاہ کی ولادت عہد عالم گیری میں ہوئی۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے وفات پائی تو اس وقت بلھے شاہ کی عمر ۲۷ سال تھی۔ گویا کہ بلھے شاہ کی شخصیت کی تعمیر اور نشو و نما عہد عالمگیری میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس طرح انہوں نے ایک درجن سے زائد مغل شہزادے ایسے دیکھے جو تخت کے دعوے دار بنے اور کم و بیش ایک درجن مغل بادشاہوں کو تخت نشین ہوتے اور تخت سے اترتے ہوئے دیکھا۔ کسی کی آنکھوں میں سلائی پھیروا کر اندھا کر دیا گیا اور کسی کا سر قلم کر دیا گیا۔ مغل سلطنت، سادات بارہہ کی جاگیر بن چکی تھی اور بارہہ کے سید برادران ''بادشاہ گر'' تھے۔ جس کو چاہتے تخت پر بٹھا کر ہندوستان کا بادشاہ بنا دیتے اور جس کو چاہتے تخت سے اتار کر اندھا کروا دیتے یا زندان میں قید کر دیتے اور جسے چاہتے تہ تیغ کر کے لقمۂ اجل بنا دیتے۔ مسلمانوں کی باہمی آویزش اور اقتدار کی کشمکش کے باعث مغل سلطنت بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی اور

برصغیر کا امن و امان تہ و بالا اور مغلوں کی مرکزی قوت درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ پنجاب میں سکھا شاہی نے تباہی مچائی۔ غرض یہ کہ عوام و خواص بالخصوص دیہی علاقوں کے متوسط درجے اور غریب غرباء کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ عجب اتفاق ہے کہ افراتفری اور بدنظمی کا یہ دور پنجابی شاعری کا زریں دور ثابت ہوا اور پنجابی ادب بھی اپنی شاعری کی بدولت ادب کہلانے کا مستحق ہو سکا۔

احمد شاہ ابدالی نے مسلمانان برصغیر کو اسلام دشمن طاقتوں کے چنگل سے نجات و رہائی دلانے کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ سکھا شاہی کی طاقت توڑنے کے لیے ابدالی متعدد بار پنجاب میں آیا مگر اُس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی سکھ تتر بتر ہو کر پہاڑوں پر چڑھ جاتے تھے۔ بہر حال ۱۷۶۱ء میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور بعض دوسرے زعمائے ملت اور امراء سلطنت کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی اُس وقت دارالسلطنت دہلی پر حملہ آور ہوا جب مرہٹے دہلی پر قابض ہو چکے تھے اور لال قلعہ دہلی میں اُن کا ڈنکا بج رہا تھا اور وہ جامع مسجد کو رام مندر میں تبدیل کر کے ہندو پد بادشاہی قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی بہت بڑی فوج کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کر کے اس حد تک ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا کہ اس سرزمین پر مرہٹے کبھی حکومت نہیں کریں گے۔ دہلی ''ہندو پد بادشاہی'' کا دارالحکومت نہیں بنے گا۔ جامع مسجد دہلی کو رام مندر میں تبدیل نہیں کیا جائے گا اور دہلی کے لال قلعہ پر مرہٹوں کا بھگوا جھنڈا کبھی نہیں لہرائے گا۔ احمد شاہ ابدالی اور پانی پت کی تیسری جنگ کی تفصیلات کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی دینی و علمی اور تبلیغی و سیاسی خدمات کے لیے ملاحظہ ہمارا تحقیقی مضمون ''احمد شاہ ابدالی'' جو بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والی کتاب ''نقوش عظمت'' میں چھپا۔ ''نقوش عظمت'' ہی میں ہمارے دوسرے مضامین کے علاوہ ہمارا تحقیقی مضمون ''شاہ ولی اللہ اور ان کا اقتصادی پروگرام'' بھی شامل اشاعت ہے جس پر شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ کے تحت منعقد ہونے والے مضمون نویسی کے مقابلے میں اول انعام ملا تھا اور اسے شاہ ولی اللہ اکیڈمی نے سب سے پہلے اپنے ماہوار رسالے ''الرحیم'' حیدرآباد میں شائع کیا تھا۔

ایک بڑے شاعر اور ادیب ہونے کے حوالے سے بلھے شاہ میں تنقید کا عنصر نمایاں

ہے۔ ان کے ایک تذکرہ نویس نے ان کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ ''انہوں نے اپنے معاشرے پر اس لحاظ سے تنقید کی ہے کہ علم اور عبادت کا مقصد غالب اکثریت کے نزدیک تہذیب نفس اور اصلاح حال نہیں بلکہ حصول زر و مال ہے۔'' چنانچہ بلھے شاہ نے ظاہری عبادت کو اصل مذہب سمجھ لینے والوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ سید بلھے شاہ کے یہ ابیات ملاحظہ ہوں:

پڑھ پڑھ مسئلے روز سناویں کھانا شک شبہے دا کھاویں
دسیں ہور تے ہور کہاویں اندر کھوٹ تے باہر سچیار
علموں بس کریں او یار

پڑھ پڑھ نفل نماز گزاریں اُچیاں بانگاں چانگاں ماریں
منبر چڑھ کے وعظ پکاریں تینوں کیتا حرص خوار
علموں بس کریں او یار

ترجمہ: یعنی تم علم پڑھ پڑھ کر روز مسئلے سناتے ہو اور شک و شبہہ کا کھانا کھاتے ہو، بتاتے کچھ اور ہو۔ اندر تو کھوٹ ہے اور باہر سے سچے بنتے ہو۔

اہل ظواہر اپنی عبادت و ریاضت پر بہت فخر و ناز کرتے ہیں چنانچہ ظاہر پرستوں اور ظاہر بینوں کے زعم باطل اور ظن و گمان پر یوں ضرب لگاتے ہیں:

بلھے نوں لوک متیں دیندے بلھا توں جا بہہ مسیتی
وِچ مسیتاں دے کی ہوندا جو دلوں نماز نہ نیتی

باہروں پاک کیتے کی ہوندا جو اندروں گئی نہ پلیتی
بن مرشد کامل بلھیا تیری اینویں گئی عبادت کیتی

ترجمہ: بلھے کو لوگ نصیحت کرتے ہیں کہ بلھے تو مسجد میں جا بیٹھ، مسجدوں میں جانے سے کیا ہوتا ہے، اگر دل سے نماز ادا نہ کی جائے، باہر سے پاک ہونے سے کیا بنتا ہے، اگر اندر سے پلیدی نہ جائے۔ اے بلھے مرشد کامل کے بغیر تیری عبادت یوں ہی گئی۔

''تاریخ ادبیات پاکستان و ہند'' تیرھویں جلد (علاقائی ادب) کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی نے سید بلھے شاہ کے نظریہ فقر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''آپ شریعت کو دایہ قرار دیتے ہیں اور طریقت کو ماں۔ ظاہری

اور باطنی تربیت کے لیے دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کا کئی بار اظہار کیا ہے کہ کلمۂ طیبہ اور شریعت پر گرفت مضبوط رہی تو رسول مقبولؐ کے فیضِ روحانی اور آپؐ کی شفاعت پر یقین کامل رکھو۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ اذان رسولی سے میرا دل پھول کی طرح کھل پڑا ہے اور ہم نے ان کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ زہد و عبادت آپ کا زندگی بھر شعار رہا۔ لیکن اس زہد و عبادت میں انہوں نے عشق کی گرمی پیدا کی۔ عشق حقیقی سے پہلے وہ عشق مجازی کو ضروری گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ راہِ مجاز اختیار کر کے ذاتِ حقہ سے پیوند قائم کرنا آسان ہے۔ صوفیہ اسلام میں سے حضرت بایزید بسطامی (متوفی ۸۷۵ء) نے عشق حقیقی میں اشغال کی جو کیفیت پیدا کی تھی اس کی بناء پر وہ شطاری فرقہ کے بانی بنے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی (متوفی ۱۱۶۶ء) نے بعد میں سلسلہ قادریہ شروع کیا اور انہوں نے ولولۂ عشق تیز تر کر دیا۔ حضرت بلھے شاہ کے مرشد قادری شطاری تھے اس لیے انہیں جذبہ عشق دو آتشہ ہو کر ورثے میں ملا۔“

سید بلھے شاہ کی شاعری میں پھر وہ مقام بھی آ گیا جس کا ذکر تمام صوفیہ کرام کرتے ہیں۔ اذاتم الفقراء فھو اللہ ۔ اور مولانا روم فرماتے ہے،”اولیاء اللہ، اللہ اولیاء،“ چنانچہ سید بلھے شاہ نے بھی اس منزل پر پہنچ کر یہ کہنا شروع کر دیا: پیاّ پیاّ کہتے ہمیں پیاّ ہوئے۔ اب پیاّ کس کو کہیئے۔“ اس قسم کے لطیف و بلیغ اشارے بلھے شاہ کی شاعری میں مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں کہ پنجاب کے متقدم صوفی شاعر یعنی شاہ حسین اور حضرت سلطان باہو بھی اس منزل کا ذکر کرتے ہیں لیکن شاہ حسین صرف نام لے کر خاموش ہو جاتے ہیں اور سلطان صاحب اس کا ذکر اجمال سے کرتے ہیں اور اشاروں میں کام لیتے ہیں۔ حضرت بلھے شاہ کے ہاں یہ اجمال تفصیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں جب وصال ہوتا ہے تو فرق باقی نہیں رہ جاتا ـــــ حقیقتِ مطلقہ کے ساتھ اس طرح وصال حاصل کرنے کے باوجود حضرت بلھے شاہ کا یہ وصف ہے کہ وہ اپنے قدم

زمین پر مضبوطی سے جمائے رکھتے ہیں اور عوام کے درمیان نظر آتے ہیں۔ جب کہ حضرت سلطان باہو صاحب اس منزل پر پہنچ کر ذاتِ حقہ کی شان مطلقیت کا مظہر بن جاتے ہیں، خواہ اجمالی طور پر سہی۔ ویسے فکر اور جذبہ کے اعتبار سے پنجاب کے یہ دونوں بزرگ اس بلند مرتبہ و مقام کے حامل ہیں کہ پنجابی زبان ان پر بجا طور پر ناز کر سکتی ہے کہ اپنشدوں کی اس سرزمین میں اس کے یہ دونوں صوفی شاعر عرفان کی اس منزل کی نشاندہی کرتے ہیں جو دنیائے فقر میں لاریب قابل رشک ہے۔

حضرت بلھے شاہ کی شاعری کا تعلق تصوف سے ہے جو بنیادی طور پر تزکیہ باطن کرتا ہے اور ذاتِ الٰہی سے انسان کا گہرا رابطہ قائم کرتا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے تصوف میں جذبات کی گہرائی کے ساتھ فلسفیانہ افکار کی چاشنی اور رچاؤ بھی ہے اور شیخ اکبر بھی قادری بزرگ ہیں۔ چنانچہ ان کے بعد آنے والے صوفیہ کرام بالخصوص قادری اور چشتی صوفیہ نے ان کے نظریات کو قبول کیا۔ اسلامی تصوف دیگر تمام مذاہب کے عارفانہ افکار (mystical thoughts) بلکہ پورے عارفانہ نظام (mysticism) یا (mystical system) سے مختلف روحانی نظام (spirtual system) ہے جس کی تخصیص میں بعض ارباب فکر و نظر اسلامی تصوف کو تصوف یا Sufi-ism کا نام دیتے ہیں اور mysticism کے لیے ''سریت'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تاکہ اُن میں تخصیص ہو سکے۔

اسلامی تصوف میں مابعدالطبیعیاتی مسائل پائے جاتے ہیں اور تصوف کا تعلق انسان کے باطن سے ہے۔ مابعدالطبیعیاتی افکار بھی جذبات کا قالب ڈھال لیتے ہیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صوفی شاعروں کی شاعری میں یہ جذبات حیرت انگیز طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ سید بلھے شاہ کی شاعری مؤثر و دل نشین ہونے کے ساتھ ساتھ مابعدالطبیعیاتی افکار سے بھی معمور ہے۔ تخلیق کائنات کے بارے میں ملاحظہ ہو ان کا یہ بند:

کن کہیا فیکون کہایا   بے چونی سے چوں بنایا
احد دے وچ میم رلایا   تاں کیتا ایڈ پسار
ہن میں لکھیا سوہنا یار
جس دے حسن دا گرم بازار

سید بلھے شاہ کے تذکرہ نگار ڈاکٹر عبدالغنی اس بند کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں
اس بند میں عربی کے مشکل الفاظ کو معروف اور پنجابی میں ان کے آسان معنی کیے گئے ہیں۔ ان کے حقیقی معانی کا علم اس وقت ہوتا ہے جب پتہ چلتا ہے کہ ذاتِ احد چون و بے چگون اور بے شبہہ بے نمون ہے۔ ''تنزلات'' کے ذریعے تخلیق کا موجب بنی اور جس ذات نے حقیقت محمدیہ کو، جسے نظریۂ تنزلات کی رُو سے وحدت کہا جاتا ہے، مادۂ تخلیق قرار دیا۔ یہ بڑے گہرے افکار ہیں اور ابن عربی کی وجہ سے صوفیائے اسلام میں پھیلے جنہیں ہر کہ و مہ سمجھ بھی نہیں سکتا لیکن بلھے شاہ بڑی روانی، بے ساختگی اور جذبات پروری کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

جو لوگ ظواہر ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور باطن کی طرف توجہ نہیں کرتے اور محض ظاہری عبادات پر اکتفاء کرتے ہیں اُن سے مخاطب ہو کر سید بلھے شاہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالٰی سے لو نہیں لگاؤ گے اور جب تک اس خالق و مالک اور معبود حقیقی کی بارگاہ میں پورے خشوع و خضوع کے ساتھ حاضری نہیں دو گے تمہاری عبادتوں کا تمہیں کوئی دنیاوی و اُخروی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

منہ آئی بات نہ رہندی اے

جھوٹھ آکھاں تے کجھ بچدا اے — سچ آکھیاں بھانبڑ مچدا اے

جی دوہاں گلاں توں جچدا اے — جچ جچ کے جیبھا کہندی اے

منہ آئی بات نہ رہندی اے

اک لازم بات ادب دی اے — سانوں بات معلومی سب دی اے

ہر ہر وچ صورت رب دی اے — کیوں ظاہر کیوں چھپندی اے

منہ آئی بات نہ رہندی اے

ترجمہ:

منہ آئی بات رکتی نہیں

جھوٹ کہوں تو کچھ بچتا ہے — سچ کہوں تو آگ بھڑک اٹھتی ہے

جی دونوں باتوں سے ڈرتا ہے — ڈرتے ڈرتے زبان کہتی ہے

منہ آئی بات رکتی نہیں

ادب کی ایک ضروری بات ہے — اور ہمیں سب کی بات معلوم ہے

ہر چیز میں رب کی صورت ہے   یہ کیوں ظاہر ہے اور کیوں چھپتی ہے
منہ آئی بات رکتی نہیں

آگے چل کر سید بلھے شاہ فرماتے ہیں:

جدوں ظاہر ہوئے نور ہورِیں   جل گئے پہاڑ کوہ طور ہورِیں
تدوں دار چڑھے منصور ہورِیں   اوتھے شیخی میںڈھی نہ تیںڈی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

جے ظاہر کراں اسرار تائیں   سب بھل جاون تکرار تائیں
پھر مارن بلھے یار تائیں   ایتھے مخفی گل سوچیندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

اساں پڑھیا علم تحقیقی اے   اوتھے اِکو حرف حقیقی اے
ہور جھگڑا سب ودھیکی اے   اینویں رَولا پا پا بہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

بلھا شوہ اساں تھیں وکھ نہیں   بن شوہ تھیں دوجا ککھ نہیں
پر ویکھن والی اکھ نہیں   تائیں جان پئی دکھ سہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

ترجمہ:

جب نور ظاہر ہوا   تو کوہ طور جل گیا
جہاں منصور دار پر چڑھ گیا   وہاں نہ میری شیخی کام آتی ہے نہ تیری
منہ آئی بات رکتی نہیں

میں اگر اسرار ظاہر کروں   تو سب جھگڑے بحثیں بھول جائیں
پھر وہ بلھے یار کو ماریں   کیونکہ یہاں چھپی ہوئی بات ہی اچھی لگتی ہے
منہ آئی بات رکتی نہیں

اے بلھے! اللہ ہم سے الگ نہیں   اللہ کے بغیر اور کوئی چیز بھی نہیں ہے
پر دیکھنے والی کوئی آنکھ نہیں   اس لیے جان یہ دکھ سہہ رہی ہے
منہ آئی بات رکتی نہیں

سید بلھے شاہ کے ایک تذکرہ نویس پروفیسر محمد سرور اپنی تالیف ''پنجابی ادب'' میں اُن کے احوال و آثار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بلھے شاہ نے تمام عمر شادی نہیں کی اور ساری زندگی ہمہ اوست کے نغمے الاپتے گزار دی۔ اُن کے نزدیک عقیدہ ہمہ اوست یعنی ''سب کچھ ایک ہی ذات کا پرتو ہے،'' محض ایک عقلی اذعان نہ تھا، بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا۔ چنانچہ ان کی کافیاں اس بات پر کھلی شہادت ہیں ـــــ بلھے شاہ نے زیادہ کافیاں نہیں لکھیں لیکن جو بھی لکھی ہیں اُن میں وہ برہنہ تلوار ہیں۔ ہر قسم کے نفاق اور جھوٹ کی گردن پر پڑتی ہیں۔ وہ کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے۔ نہ اپنوں کی اور نہ دوسروں کی، اُن کا کوئی فرقہ نہیں۔ اور نہ کوئی ذات برادری۔ وہ رب کے سچے بندے تھے اور ساری عمر رب کی بات ہی کہتے رہے۔ ایسی بات جو آفاقی اور انسانی ہے اور جس میں عالم گیری اور ہمہ گیری ہے اور ایسے پیرائے میں کہتے رہے جس میں ادب کی چاشنی اور تاثیر کی فراوانی ہے۔ اُس کی ضرب سیدھی دل پر پڑتی ہے اور پھر دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ عظیم ادب کی پہچان یہی ہے۔

سید بلھے شاہ اور سلطان باہو کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں کہ اسلوب کے لحاظ سے سلطان باہو اور بلھے شاہ کی شاعری میں بڑا فرق ہے۔ ایک تو بلھے شاہ کے لہجے میں بڑی بے باکی اور جذبہ بڑا قلندرانہ ہے۔ دوسرے سلطان صاحب اپنے افکار و خیالات کی توضیح کے لیے مسلسل استعارے سے کام لیتے ہیں اور بلھے شاہ تلمیحات استعمال کرتے ہیں اور پھر ان کی تلمیحات میں بڑی وسعت ہے۔ آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ کے علاوہ پیغمبران اسلام، فرشتے، دینی ادب کے معروف نام، ہند اور بیرونِ ہند کے صوفی، ہند اور بیرون ہند کے مسلمان عشاق اور ہندوؤں کے مذہبی رہنما اور اُن سے متعلقہ افراد بلھے شاہ کا تلمیحاتی سرمایہ ہیں۔ وہ تفصیل کے قائل ہیں، اجمال پر اکتفا نہیں کرتے: عجیب اتفاق ہے کہ حضرت بلھے شاہ کے علاوہ دو اور قادری بزرگ بھی اسی زمانے میں پنجابی زبان میں شعر کہہ رہے تھے۔ ایک تو حضرت سلطان باہو (متوفی ۱۶۹۱ء) ہیں اور دوسرے علاقہ دھنی کے ایک بزرگ شاہ مراد (متوفی ۱۷۰۲) ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیک وقت تین قادری بزرگوں نے پنجاب کے عوام کو اُن کی اپنی زبان میں عشق و محبت، تزکیہ نفس اور اصلاح اعمال کا پیغام دیا۔ اپنی زبان تھی، کانوں سے گزرتی ہوئی دل تک پہنچ گئی۔ اس زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں کئی قوموں، متعدد تہذیبوں

اور چند در چند زبانوں نے تنوع پیدا کیا تھا۔ اس لیے مشکل سے مشکل مطالب اس میں آسانی سے بیان ہو جاتے تھے اور اتنی ہی آسانی سے عوام کے اذہان تک رسائی حاصل کر لیتے تھے۔ بنا بریں شاہ حسین کی کافیوں کی طرح سلطان باہو، شاہ مراد اور بلھے شاہ کا کلام آج بھی اصلاح معاشرہ کے لیے اتنا ہی مفید ہے جتنا کہ اُس سے پہلے تھا۔ مثلاً بلھے شاہ کا یہ شعر اصلاح اور تربیتِ نفس کے سلسلہ میں کس قدر پُر تاثیر ہے:

بلھیا من منجولا منج دا کِتے گوشے بہ کے کٹ
ایہہ خزانہ تینوں عرش دا تو سنبھل سنبھل کے لٹ

بلھے شاہ کے عہد میں صوفی شعراء نے مقامی زبانوں میں شعر کہہ کر عوام کو ایک دفعہ پھر تعلیمات اسلامی کی طرف توجہ دلائی۔ توحید، رسالت، جزا، سزا، اتحاد اور یگانگت کے مطالب عام فہم انداز میں از سرِ نو بیان کیے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ امتدادِ زمانہ سے یہ مطالب بھولتے چلے جا رہے ہیں اس لیے اثر انگیز پیرائے میں اُن کا اعادہ ضروری ہے۔ پشتو میں یہ کام عبدالرحمٰن باباؒ نے کیا اور سندھ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی یہ فریضہ انجام دے رہے تھے۔ پنجابی، پشتو اور سندھی کے ان تینوں عظیم المرتبت صوفی شاعروں نے اسلامی موضوعات بالخصوص توحید پر جو ہزاروں اشعار کہے وہ آج بھی پنجاب صوبہ سرحد اور سندھ میں زبان زدِ عام عام و خاص ہیں۔

سلطنت مغلیہ کے زوال و انحطاط کے ساتھ ہی مسلمانوں کی وحدت و یگانگت کا دامن پارہ پارہ ہو رہا تھا اور اسلامی تہذیب و تمدن پر مختلف عناصر و عوامل بری طرح سے اثر انداز ہو رہے تھے اور برصغیر کے مختلف علاقوں میں آباد مختلف زبانیں بولنے والے مسلمان اسلامی تعلیمات سے بتدریج دور ہوتے چلے جا رہے تھے اور اسلام دشمن طاقتیں ہر جگہ اور ہر مقام پر مسلمانوں کو دینی، علمی اور تہذیبی و تمدنی ہر لحاظ سے کمزور بنا کر انہیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے درپے تھیں۔ اس نازک اور مشکل وقت میں بلھے شاہ، سلطان باہو، شاہ مراد، رحمٰن بابا اور شاہ لطیف بھٹائی ایسے عظیم المرتبت صوفیہ منظر عام پر آئے اور انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں آباد مسلمانوں کو ملکی و قومی حالات اور درپیش خطرات و خدشات سے آگاہ کرنے کے لیے مقامی زبانوں کو ذریعہ اظہار بنایا جو اُس زمانے کے حالات کے مطابق بہت ضروری تھا۔ چنانچہ ان جلیل القدر صوفی شاعروں نے اسلامی تعلیمات کو پنجابی، پشتو اور سندھی شاعری کے ذریعے مسلمانوں تک

نہایت وضاحت اور پوری قوت کے ساتھ انتہائی دلکش و مؤثر انداز سے پیش کیا جس سے ان علاقوں کے مسلمانوں میں عزت نفس اور آزادی و بیداری کی ایک نئی لہر پیدا ہو گئی اور ان تین بڑی زبانوں کے پانچ بڑے شاعروں کی پُروقار و پُرتاثیر شاعری کی بدولت ان علاقوں کے مسلمان اخلاقی و روحانی اور تہذیبی و تمدنی لحاظ سے طاقتور و توانا ہو کر اُبھرے اور اُن میں اخوت و مساوات اور وحدت و یگانگت کے اسلامی احساسات و جذبات کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

پنجاب کے صوفی شعراء اور پنجابی شاعری کی بعض امتیازی خصوصیات ہیں جن کو کسی طور نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پنجابی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قصیدہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ پنجابی زبان کی یہ خصوصیت اس کو دنیا کی دیگر تمام زبانوں کی شاعری سے ممتاز و ممیز کرتی ہے۔ اور اس کی واحد وجہ بھی یہی ہے کہ پنجابی کے تمام بڑے شاعر صوفی تھے اور صوفی شاعر، نقاد، مبلغ اور مصلح ہوتے ہیں جو قوموں کی ذہنی و فکری راہنمائی و قیادت کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ ان کے ایمان افروز افکار سے غلامی و محکومی کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ان کی پاکیزہ زندگی سے اعلیٰ اخلاق و آداب اور روحانیت کا درس ملتا ہے اور چونکہ ان سب کا ایک ہی پیغام اسلام ہوتا ہے اس لیے ان کی شاعری بکھرے ہوئے پریشان حال لوگوں کو ایک لڑی میں پرو کر انہیں ایک مضبوط و مستحکم اور متحد و منظم قوم بنانے میں مددگار و معاون ثابت ہوتی ہے۔

سید بلھے شاہ کو پنجابی زبان کے بڑے شاعروں ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے بڑے بڑے شاعروں میں منفرد و ممتاز مقام حاصل ہے اور اُن کا یہ مقام بلند خالصتاً اسلامی تعلیمات کا مرہونِ منت ہے۔ بلھے شاہ دنیا کے عظیم المرتبت شاعروں کی صفِ اول میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں چونکہ وہ صاحب افکار شاعر ہیں۔ وہ اس لیے عظیم المرتبت شاعر ہیں کہ اُن کی شاعری میں نوع انسانی کے لیے ایک پیغام ہے۔ ایک صاف ستھری اور عمدہ و پاکیزہ زندگی گزارنے کا انقلاب آفرین پیغام۔ ایک خوبصورت و خوش نما اور متوازن و معتدل اسلامی معاشرے کو تشکیل دینے کا اسلامی پیغام۔ سید بلھے شاہ نے نہایت سادہ اور عام فہم زبان اور دل نشین اسلوب میں زندگی کی عمیق ترین اور اعلیٰ ترین حقیقتیں کہہ دی ہیں اور چونکہ وہ حقیقتیں صرف قال نہیں بلکہ حال کا درجہ بھی رکھتی ہیں اس لیے ان میں تاثیر بھی ہے اور اظہار و بیان کی خوب صورتی و دل کشی بھی۔

سید بلھے شاہ ایک بہت بڑے صوفی شاعر ہونے کے حوالے سے ایک بہت بڑے انسان بھی تھے۔ ان کے بڑے انسان ہونے کی وجہ بھی دین اسلام کی سادہ و پاکیزہ اور آفاقی و عالم گیر تعلیمات تھیں جن کی بدولت وہ دنیا کے بہت بڑے شاعر بن سکے۔ وہ مظلوم و مفلوک الحال لوگوں کے لیے ہمدردی و دلسوزی کے گہرے جذبات رکھتے تھے۔ دوسروں کے رنج وغم میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ پریشان حال، محتاج اور ضرورت مندوں کی امداد کرتے تھے۔ علم نافع رکھتے تھے، کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ غرض یہ کہ سید بلھے شاہ انسان دوستی، ہمدردی اور رواداری کا مجسمہ اور اسلامی تعلیمات کا پیکر تھے۔ اُن کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں تھا جو ایک مردِ مومن کی خصوصیت بھی ہے اور پہچان بھی۔

سید بلھے شاہ کے مرشد طریقت حضرت شاہ عنایت قادری قوم کے ارائیں تھے۔ چنانچہ دوسرے لوگ یعنی ہمسائے اور محلہ دار وغیرہ بالعموم اور نسب پر فخر کرنے والے سید بلھے شاہ کے اپنے رشتہ دار بالخصوص طعنہ زنی کیا کرتے تھے کہ انہوں نے گیلانی سید ہونے کے باوجود ایک ارائیں کی بیعت قبول کر لی ہے۔ اس سلسلے میں بلھے شاہ فرماتے ہیں:

بلھے نوں سمجھاون آیاں بھیناں تے بھرجائیاں
آل نبی اولاد علی نوں بلھیا توں کی لیکاں لائیاں
من لے بلھیا ساڈا کہنا چھڈ دے پلا ارائیاں

ترجمہ: بلھے کو اس کی بہنیں اور بھاوجیں سمجھانے آئیں (اور کہا) بلھے! تو نبیؐ کی آل اور علیؓ کی اولاد ہے۔ تو نے اپنی عزت کو بٹہ لگا لیا۔ ارے بلھے ہمارا کہا مان لے اور ارائیوں کا دامن چھوڑ دے۔

سید بلھے شاہ اس کا جواب دیتے ہیں:

جیہڑا سانوں سید آکھے دوزخ ملن سزائیاں
جیہڑا سانوں ارائیں آکھے بہشتیں پینگاں پائیاں
جے توں لوڑیں باغ بہاراں بلھیا! طالب ہو ارائیاں

ترجمہ: جو ہمیں سید کہے اُسے دوزخ میں سزائیں ملیں۔ جو ہمیں ارائیں کہے وہ بہشت میں جھولا جھولے۔ اگر تمہیں، باغ و بہار چاہیے تو اے بلھے! ارائیں کا طالب یعنی مرید ہو

جا۔

سید بلھے شاہ سچے مسلمان بلکہ مردِ مومن تھے۔ اسلام کے بنیادی اصول اخوت و مساوات سے آشنا ہی نہیں بلکہ اس پر عمل کرنے والے بھی تھے۔ اس لیے وہ جواباً فرطِ عقیدت سے کہا کرتے تھے: ''بلھے کو سید مت کہو وہ بھی ارائیں ہے۔'' اس طرح اپنے قول و فعل سے ثابت کیا کرتے تھے کہ اسلام میں نام و نسب بے حقیقت ہیں۔ صحیفۂ انقلاب قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''قیامت کے روز تمہارا حسب نسب تمہارے منہ پر مارا جائے گا۔'' اور ارشاد نبویؐ ہے کہ ''کسی گورے کو کالے پر اور کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہیں۔ فضیلت صرف تقویٰ کی وجہ سے ہے۔''

سید بلھے شاہ قادری کے روحانی مرتبہ و مقام کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری کی نسبت سے لاہور کو ''داتا کی نگری'' کہا جاتا ہے۔ اُسی طرح قصور کو ''بلھے شاہ کی نگری'' کہا جاتا ہے۔ ''پنجابی ادب کا زریں دور'' کے زیرِ عنوان پروفیسر محمد سرور نے لکھا ہے کہ ''بلھے شاہ اور وارث شاہ اس دور کی دو ادبی شخصیتیں ہیں جنھوں نے اپنے عہد کو پنجابی ادب کا صحیح معنوں میں عہد زریں بنایا اور پنجابی ادب کو ایک عالمی حیثیت بخشی ... اور بلھے شاہ بلا اختلاف رائے پنجابی کے سب سے بڑے صوفی شاعر ہیں۔''

سید بلھے شاہ پنجابی کے ممتاز ترین صوفی شاعر ہیں۔ پنجاب میں کسی صوفی شاعر کو وہ بلند مرتبہ و مقام، عزت و وقار اور شہرت و احترام نصیب نہیں ہوا جو بلھے شاہ کے حصے میں آیا۔ ان کی کافیاں پنجاب کے خواص و عوام میں بہت ہردلعزیز ہیں اور علمی، ادبی اور مذہبی حلقوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

پنجابی کے عظیم ترین صوفی شاعر حضرت سید بلھے شاہ قادری نے ۱۱۸۱ھ کے بعد کسی سن میں وفات پائی۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے ''حدیقۃ الاولیاء'' میں اُن کا سن وفات ۱۱۷۱ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین شمارہ مئی ۱۹۲۹ء میں اوراد و وظائف کے ایک نسخہ کا ذکر کیا ہے جس پر حضرت بلھے شاہ کی مہر اس طرح ثبت ہے: ''۱۱۸۱ قادرے بلھا شاہ'' اور نام سید عبداللہ عشقی درج ہے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں... اول یہ کہ بلھے شاہ ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں حیات تھے، دوسرے یہ کہ زندگی کے آخری ایام تک عبادت و ریاضت اور اوراد و وظائف

کے پابند رہے۔ اُن کے وظائف کے نسخے میں درود کبریت احمر بھی شامل ہے جو اول تا آخر سرور کائنات، فخر موجودات ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی فصیح و بلیغ مدح پر مشتمل ہے اور حضرت غوث الاعظم سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ حضرت غوث الاعظم کے اس درود یعنی ''کبریت احمر'' کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ قادری چشتی اور نقش بندی وغیرہ سلاسل کے بزرگوں اور سالکوں میں آج تک پڑھا جاتا ہے۔

حضرت سید بلھے شاہ قادری کا مزار گوہر بار قصور میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

آزاد بلگرامی

حسان الہند مولانا آزاد بلگرامی کا شمار برصغیر پاکستان و ہند ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کی منفرد و ممتاز دینی و علمی شخصیات میں ہوتا ہے۔وہ حدیث وفقہ کے فاضل اجل، منطق اور علم الکلام کے عالِم بے بدل اور شعر وسخن کے بے تاج بادشاہ تھے۔شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے نالائق اور خودغرض جانشینوں کی حماقتوں کے باعث سلطنت مغلیہ کی قوت وعظمت زوال پذیر ہونے لگی تو عوام و خواص کے اخلاق و آداب کے متاثر ہونے کے علاوہ ان کی تہذیبی و ثقافتی قدریں بھی پامال ہونے لگیں۔حیرت کی بات ہے کہ زوال و انحطاط اور بدامنی کے دور میں مولانا آزاد بلگرامی، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ غلام علی، عبدالعلی بحر العلوم ایسے ممتاز علماء پیدا ہوئے۔

مولانا بلگرامی آزاد نے حدیث وفقہ، تاریخ وسیر، تصوّف واخلاقیات اور شعر وادب ایسے علوم وفنون میں شان دار اور ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے۔انہوں نے اپنی نگارشات کی صورت میں لازوال اور انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اور اسلامی تہذیب وتمدن، علم وادب اور فکر وفن کو نیا بانکپن عطا کیا ہے۔جس کی بدولت وہ ہمیشہ زندہ تابندہ رہیں گے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی جید عالم اور بے مثال شاعر تھے۔عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں خوبصورت شعر کہتے تھے۔رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اپنے عربی قصائد کی وجہ سے ”حسان الہند“ کے لقب سے ملقب ہوئے۔جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔عربی اور فارسی زبانوں میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔

مولانا آزاد بلگرامی کا نام ونسب یوں ہے:

میر غلام علی آزاد بن سید محمد نوح بن سید فروز الحسینی۔

مولانا آزاد کا شجرۂ نسب امام زیدؓ شہید بانی فرقہ زیدیہ جنھیں امام اعظم ابو حنیفہؒ بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُموی حکم رانوں کے خلاف جن کی امام ابوحنیفہ نے مالی امداد و اعانت کرنے کے علاوہ اُن کے حق میں اور حکومتِ وقت کے خلاف فتویٰ بھی صادر کیا تھا، امام محمد باقرؒ کے بھائی اور امام علی زین العابدینؒ کے فرزند تھے، کے واسطے سے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جاملتا ہے۔

مولوی فقیر محمد کی تالیف "حدائق الحنفیہ" کے مطابق مولانا آزاد یک شنبہ کے روز ۲۵ ماہ صفر ۱۱۱۶ھ۔۱۷۰۴ء میں قصبہ بلگرام علاقہ صوبہ اودھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا آزاد نے سادات کے ایک انتہائی معزز و مقتدر علمی خاندان میں جنم لیا۔

مولانا آزاد اپنی مشہور زمانہ تصنیف "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" میں خود بصراحت لکھتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد کا اصل وطن واسط تھا۔ جہاں سے وہ ہجرت کر کے ہند میں وارد ہوئے اور بلگرام میں مستقل سکونت اختیار کی۔ بلگرام کے اس واسطی خانوادے کے مورث اعلیٰ سید محمد صغریٰ (متوفی ۶۴۵ھ۔۱۲۴۷ء) کو بلگرام کی سرداری عطا ہوئی اور انہوں نے یہاں اکتیس برس حکومت کی۔ لیکن مولانا آزاد بلگرامی کے ایک معاصر شیخ غلام حسین بلگرامی نے مولانا آزاد کی کتاب "مآثر الکرام" کے جواب میں "شرائف عثمانی" کے نام سے مشائخ بلگرام کی تاریخ لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا آزاد کا مولد و منشا بلگرام نہیں بلکہ "سمدن" ہے۔ جہاں آ کر وہ آباد ہو گئے تھے۔ واللہ اعلم۔

اربابِ علم و دانش نے مولانا غلام علی آزاد کی دینی و علمی خدمات کو سراہا ہے اور ان کے احوال و آثار بیان کرنے کے علاوہ ان کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے "عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ" میں لکھا ہے کہ "مولانا آزاد ایک بلند پایہ عالم تھے اور تمام اسلامی علوم پر ان کو بہت عبور حاصل تھا۔ وہ واحد ہندوستانی شاعر ہیں جن کے عربی میں سات دیوان ہیں۔ وہ عربی اور فارسی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔"

"تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند" جلد دوم عربی ادب کے مقالہ نگار ڈاکٹر

ظہور احمد اظہر نے حدائق الحنفیہ، ابجد العلوم، سبحۃ المرجان اور نزہۃ الخواطر وغیرہ کتب تاریخ و تذکرہ کے حوالوں سے مولانا غلام علی آزاد کے احوال بیان کئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد نے کتبِ درسیہ اپنے زمانے کے مشہور فاضل میر طفیل محمد بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ۔۱۷۳۸ء) سے پڑھیں۔ عروض و قوافی اور فنونِ ادب کی کتب اپنے ماموں میر سید محمد (۱۱۸۵ھ۔۱۷۷۱ء) سے پڑھیں۔ اور سولہ برس کی سیر و سیاحت اور ملازمت کے بعد جب ان کے نانا مولانا عبدالجلیل بلگرامی (متوفی ۱۱۳۸ھ۔۱۷۲۵ء) وطن واپس آئے تو اس وقت مولانا آزاد کی عمر سترہ برس تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ان سے حدیث و سیرت نبوی کی سند حاصل کرنے کے علاوہ لغت اور عربی فارسی شاعری میں بھی استفادہ کیا۔ ۱۱۵۱ھ۔۱۷۳۸ء میں جب مولانا زیارت حرمین اور حج سے مشرف ہوئے تو تحصیلِ علم کی خاطر دو برس تک وہاں قیام کیا اور اس دوران مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب بن احمد طنطاوی مصری شافعی (متوفی ۱۱۵۷ھ۔۱۷۴۴ء) سے حدیث کی سند حاصل کرنے کے علاوہ مدینہ منورہ میں نامور محدث شیخ محمد حیات سندھی مدنی (متوفی ۱۱۶۳ھ۔۱۷۵۰ء) سے صحاحِ ستہ کی سند و اجازۃ بھی حاصل کیا۔

''مولانا آزاد بچپن ہی سے دینی علوم سے بہت رغبت اور تصوّف سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ عبادت و ریاضت کے ساتھ اَوراد و وظائف میں بھی مشغول رہتے تھے۔ وہ سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں سید العارفین شیخ لطف اللہ حسینی بلگرامی سے شرفِ بیعت رکھتے تھے۔''

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے مولانا آزاد کی خدمت میں ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

''مولانا آزاد اسم بامسمّیٰ تھے۔ کبھی مدحِ شاہان نہ کی، کسی کی نوکری پسند نہ کی، دنیا ان کے نزدیک ''نہر طالوت'' کی مانند تھی جس میں سے صرف ایک چلو حلال مگر اس سے زیادہ حرام ہے وہ ہمیشہ سیر و سیاحت کے شائق، قناعت پسند اور آزاد روی کے دلدادہ رہے۔

''۱۱۵۰ھ میں وہ فریضہ حج ادا کرنے حجاز چلے گئے۔ وہاں دو برس تک قیام کرنے کے بعد وطن واپس ہوئے تو اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ نواب نظام الملک کے

صاحب زادے نظام الدولہ ناصر جنگ اور ان کے بھائی مولانا آزاد پر بہت مہربان تھے۔ انہوں نے مولانا آزاد کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور چاہتے تھے کہ وہ کوئی عہدہ قبول کر لیں مگر انہوں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ بلکہ اپنا سارا وقت کتب بینی اور تصنیف و تالیف میں گزارا۔

''مولانا آزاد نے اپنی تمام زندگی میں صرف تین سفر کئے۔ ایک سفر دار السلطنت دہلی کا ہے جس میں انہوں نے اپنے نانا مولانا جلیل بلگرامی کے ساتھ قیام اور ان سے اکتساب علم بھی کیا۔ دوسرا سندھ کا سفر ہے۔ جہاں وہ اپنے ماموں میر سید محمد جو وہاں کے میر بخشی اور وقائع نگار تھے، سے ملاقات کے لئے گئے۔ مولانا آزاد ۱۱۴۲ھ۔۱۷۲۹ء میں بلگرام سے سیوستان کے لئے روانہ ہوئے جو سندھ کا صدر مقام تھا۔ چنانچہ دورانِ سفر دہلی، لاہور، ملتان اور اوچ وغیرہ میں قیام کرتے ہوئے اور وہاں کے مشائخ و مشاہیر سے ملاقات کرتے ہوئے سیوستان پہنچے، جہاں چار سال تک مقیم رہے۔ اور کچھ عرصے کے لئے اپنے ماموں کے قائم مقام کی حیثیت سے میر بخشی اور وقائع نگاری کے فرائض بھی انجام دیئے۔ جب واپس ہوئے تو راستے میں بھکر کے مقام پر شیخ علی حزیں سے ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی اپنی غزلیں مولانا آزاد کو تحفہ کے طور پر پیش کیں۔ لاہور پہنچے تو شاہ آفریں لاہوری کی صحبت میں پانچ روز تک رہے۔ شاہ آفریں نے بڑے اصرار سے ''ید بیضا'' کی ایک نقل مولانا آزاد سے حاصل کی۔

''مولانا آزاد کا تیسرا سفر حج اور زیارتِ حرمین کے لئے تھا جو ۳ رجب ۱۱۵۰ھ۔۱۷۳۷ء کو بلگرام سے شروع ہوا اور ۲۹ جمادی الاول ۱۱۵۲ء کو بندرگاہ سورت پر اختتام پذیر ہوا۔ اس سفر کی روانگی کی تاریخ ''سفر خیر'' اور تاریخ معاودت ''سفر بخیر'' ہے۔ اس سفر کے دوران فریضہ حج ادا کرنے کے علاوہ علماء و مشائخ سے ملاقاتیں اور علمِ حدیث کی تحصیل کی جس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ اس سفر کے دوران مشائخ حرمین سے اخذ و استفادہ کے علاوہ طائف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور المخا میں شیخ علی بن عمر شاذلیؒ کے مزارات پر حاضری دی اور جدہ میں شیخ محمد فاخر الہ آبادی سے ملاقات کی۔

''حج سے واپسی پر کچھ عرصہ بندرگاہ سورت میں مقیم رہنے کی بعد اورنگ آباد میں ''تکیہ شاہ مسافر'' میں ٹھہرے۔ پھر دکن کے بعض شہروں کی سیاحت کے بعد اورنگ آباد میں مستقل اقامت اختیار کر لی اور اپنی وفات تک وہیں سکونت پذیر رہے۔ نظام الدولہ

رئیس حیدرآباد مولانا آزاد بلگرامی کے تلامذہ میں سے تھا۔"
کتبِ تاریخ و تذکرہ میں مولانا آزاد کی تصنیفات کی تعداد مختلف بیان کی گئی ہے۔ خود انہوں نے "سبحۃ المرجان" میں اپنی آٹھ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے "ابجد العلوم" میں بارہ اور اپنی دوسری کتاب "اتحاف النبلاء" میں پندرہ کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ مولانا آزاد نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں انتہائی مفید، بیش قیمت اور قابلِ قدر کتابیں تصنیف کیں۔ چنانچہ عربی کتب میں

۱۔ "ضوء الدراری شرح صحیح بخاری" زیارت حرمین کے دوران لکھی گئی۔
۲۔ "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان"
۳۔ "تسلیۃ الفواد"
۴۔ شفاء العلیل (متنبی کی شاعری پر تنقید ہے)
۵۔ "الشجرۃ الطیبۃ" (انساب سادات بلگرام)
۶۔ سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات
۷۔ "مظہر البرکات" (خطی۔ نسخہ بھوپال میں موجود ہے)
۸۔ مرآۃ الجمال (جسم کے ہر عضو پر دو دو اشعار کا انوکھا مجموعہ)
۹۔ السبعۃ السیارۃ
۱۰۔ شمامۃ العنبر

مولانا غلام علی آزاد کی عربی کتابوں کے بعد ان کی فارسی تصنیفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ مآثر الکرام فی تاریخ بلگرام (۱۱۸۰ھ۔۱۷۶۶ء میں مکمل ہوئی۔ اسی (۸۰) صوفیہ کرام اور بہتر (۷۲) علمائے ہند کا تذکرہ۔ ۱۹۱۰ء میں پہلی بار دکن سے شائع ہوئی)
۲۔ خزانہ عامرہ، (فارسی گو ہندی شعراء کا تذکرہ)
۳۔ ید بیضا (فارسی شعراء کا تذکرہ)
۴۔ سروِ آزاد (فارسی اور ہندی شعراء کا تذکرہ)
۵۔ روضۃ الاولیاء
۶۔ غزلان الہند
۷۔ دیوان فارسی (نو ہزار بیت)

۸۔ کشکول

۹۔ شرح قطعہ نعمت خان علی

علاوہ ازیں ''مآثر الامراء'' مؤلفہ صمصام الدولہ شاہنواز خان کے مسودے کی تلاش و دریافت اور اس کی ترتیب و احیاء اور تکمیل میں مولانا آزاد کا بہت عمل دخل ہے۔ اگر مولانا آزاد نے اس اہم کتاب کی طرف توجہ نہ کی ہوتی تو معلومات کا یہ بیش بہا خزانہ ضائع ہو جاتا۔

مولانا غلام علی آزاد کی کتابوں کی اس فہرست کے عنوانات اور مولانا آزاد کی دینی و علمی خدمات کے پیش نظر انہیں بجا طور پر نابغۂ روزگار شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ جامع العلوم ہونے کی حیثیت سے مولانا آزاد علم اللسان کے بھی زبردست ماہر تھے۔ ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے کہ دوسرے علماء کی طرح آزاد نے بھی ایک بدیعیہ لکھی ہے۔ اس کے آغاز سے قبل انہوں نے بطور معذرت یہ کہا ہے کہ ''اب تک صرف ایسے علماء و شعراء نے اس قسم کی نظمیں لکھی ہیں جن کا عربی بولنے والی قوموں سے مستقل رابطہ رہا ہے اور کسی ہندی کے لئے یہ بہت دشوار ہے کہ فنِ بلاغت کے اس میدان میں ان کا مقابلہ کرے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں ایک بدیعیہ لکھنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی شخص اتنا بڑا کام کر جاتا ہے جو بڑے بڑوں کے لئے حیران کن ہوتا ہے۔''

مولانا آزاد کی بدیعیہ کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ ''میری رائے میں یہ بدیعیہ ممتاز مصنفوں کی لکھی ہوئی بدیعیات کی ہم پایہ کہی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی نقاد اس پر آمادہ نہ ہو کہ آزاد کی بدیعیہ کو دوسرے مصنفوں کی لکھی ہوئی بدیعیات پر ترجیح دے تب بھی یہ یقین ہے کہ وہ اس امر کو تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں کرے گا کہ علمی قابلیت کے اس میدان میں آزاد عرب اور دوسرے ممالک کی نامور شخصیات کا مقابلہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور خالص ہندی کا یہ علمی کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔''

سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان:

یہ اہم کتاب ۱۱۷۷ھ۔۱۷۶۳ء میں مکمل ہوئی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہندوستان یعنی برصغیر پاکستان و ہند سے متعلق ہے اور چار مختلف ابواب میں تقسیم ہے۔ پہلے باب میں برصغیر کی مذہبی نقطہ نگاہ سے فضیلت اور تاریخی اہمیت بیان کی گئی ہے اور محدثین و مفسرین کی تحریروں میں اس کے بارے میں جو حوالے ہیں ان کا ذکر کیا گیا

ہے۔ مولانا آزاد نے ان متعدد احادیث کا ان کی تشریحات سمیت حوالہ دیا ہے جو حضرت آدم اور حوا کے جنت سے نکالے جانے سے متعلق ہیں کہ ان کو لنکا میں اس پہاڑ پر اتار دیا گیا تھا جو کوہِ آدم کہلاتا ہے۔

دوسرا باب برصغیر کے مسلمان علماء وفضلا کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۴۳ مشاہیر کے حالات تاریخی ترتیب سے رقم کئے گئے ہیں۔ اس باب کا آغاز امام ابو حفص ربیع بن صبیح کے مختصر تذکرہ سے ہوا ہے جو امام حسن بصری کے شاگرد اور تبع تابعین میں سے تھے لیکن سندھ میں آ گئے تھے۔ ۱۶۰ھ۔۷۷۲ء میں انہوں نے وفات پائی۔ اس باب کا اختتام مولانا آزاد نے خود اپنے حالات پر کیا ہے۔

تیسرا باب فن خطابت کے بارے میں ہے۔ یہ باب ادبی محاسن اور فنِ بلاغت کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ جس میں نظم ونثر کی خوبیاں واضح کی گئی ہیں۔ اس باب میں مولانا آزاد نے جدت پسندی اور جودتِ طبع کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے کہ اس باب میں امیر خسرو کی طرح مولانا آزاد نے بھی فنِ بلاغت میں اپنی جدت پسندی سے بہت کام لیا ہے۔ اسلوب بیان ایجاد کئے اور عربی علم البلاغت میں سنسکرت اور ہندی کے اسلوبِ بیان کو بڑی خوبی کے ساتھ داخل کر لیا۔

چوتھا باب محبت کے بارے میں ہے۔ جس میں ہندی اور عربی تصورِ محبت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سبحۃ المرجان کا پہلا باب فی الحقیقت مولانا آزاد کی ایک الگ تصنیف ہے جس کا نام شمامۃ العنبر ہے۔ مگر مولانا نے اس کو اس تصنیف میں ہی شامل کر لیا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے باب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زبید احمد نے اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے بعنوان ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ'' لکھنے میں اس سے بڑی مدد لی ہے۔ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب نہ صرف میری اس تصنیف کا اہم ترین ماخذ ہے بلکہ آئندہ اس نوعیت کی جتنی بھی کتابیں لکھی جائیں گی ان کا ماخذ بھی یہی کتاب ہوگی۔ علاوہ ازیں نواب صدیق حسن بھوپالی کی ''ابجد العلوم'' اور مولوی رحمٰن علی کی تالیف ''تذکرہ علمائے ہند'' اور اس قسم کی دیگر تمام کتبِ تاریخ وتذکرہ سب کا ماخذ بھی یہی کتاب ہے۔ مولانا آزاد نے اسی قسم کی ایک اور کتاب بھی لکھی ہے جو فارسی میں ہے۔ اس کا نام ''مآثر الکرام'' ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا

اصل مقصد مصنف کے وطن بلگرام کے ممتاز علماء اور اولیاء کے سوانح قلمبند کرنا ہے، تاہم اس میں برعظیم کے دوسرے علاقوں کے پچاس علماء کے حالات بھی شامل ہیں۔

سبحۃ المرجان سے استفادہ کرنے والے ارباب علم و دانش اور محققین میں شیخ محمد اکرام بھی شامل ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب ''رودِ کوثر'' میں سبحۃ المرجان اور ''مآثر الکرام'' کی اہمیت و افادیت اور اس کے طرزِ تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آپ کا طرزِ تحریر سلجھا ہوا، محققانہ اور لفاظی سے پاک ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آپ یہ کتابیں نہ لکھ جاتے تو مؤرخین کو اسلامی ہند کی ذہنی، ادبی اور مذہبی تاریخ مرتب کرنے میں بہت زیادہ دشواریاں ہوتیں۔''

مولانا غلام علی آزاد ایک صاحبِ علم و فضل اور وسیع المطالعہ انسان ہونے کے ساتھ انتہائی ذہین و زیرک، تیز طبع اور صاحبِ بصیرت مردِ حق آگاہ تھے۔ انہیں عصری تقاضوں، ملی مصالح اور قومی ضروریات کا پوراپورا احساس تھا۔ وہ مسلمانوں کے اخلاقی و روحانی امراض کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہم عصر مفکر و مصلح اور کثیر التصانیف صوفی بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح اپنی نگارشات اور تخلیقات کے ذریعے مسلمانوں کے اخلاق و روحانی امراض کے علاج اور ان کی علمی کوتاہیوں کے ازالے کے لئے بھرپور اور مؤثر شعوری کوششیں کیں۔ اس کا ثبوت ان کی تحریروں کے مطالعہ سے بخوبی مل جاتا ہے۔ وہ اپنی تصنیفات کی علمی قدر و قیمت، تاریخی اہمیت اور تحقیقی افادیت سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ ''سبحۃ المرجان'' کے شروع میں مولانا آزاد بلگرامی نے اس امر پر بجا فخر کیا ہے کہ ہندوستان کے علماء و فضلاء کے حالات کو انہوں نے پہلی مرتبہ منضبط کیا۔ ہندوستان میں اولیاء کے تذکرے بہت تھے۔ علماء کا کوئی نہیں تھا۔ ''سبحۃ المرجان'' اور ''مآثر الکرام'' میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش ہوئی ہے۔

اربابِ علم و دانش اور محققین اس امر پر متفق ہیں کہ برصغیر پاکستان و ہند کے عربی شاعروں میں سب سے زیادہ اہم آزاد بلگرامی ہیں۔ جس طرح امیر خسرو برصغیر کے سب سے بڑے فارسی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، اسی طرح آزاد بلگرامی برصغیر کی عربی شاعری میں بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ امیر خسرو کے والد برصغیر میں وارد ہوئے جبکہ آزاد بلگرامی کے آباؤ اجداد کئی پشتوں سے ہندی تھے۔ مولانا آزاد کے شاعرانہ

کمالات اور ان کی امتیازی خصوصیات کا ایک زمانہ قائل ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ علم اللسان پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے کہ پاک و ہند میں جن علماء نے علم بلاغت کی باریکیاں بیان کی ہیں ان میں سب سے زیادہ ممتاز عبدالحکیم سیالکوٹی ہیں اور دوسرے عربی کے ممتاز شاعر غلام علی آزاد ہیں جن کو بجا طور پر ''حسان الہند'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس طرح کہ خاقانی کو ''حسان العجم'' کہا جاتا ہے۔ آزاد نے اپنے عربی کلام کے کئی دیوان چھوڑے ہیں جن کا انتخاب سبعہ سیارہ کے نام سے چھپ چکا ہے اور ان کا ایک مجموعہ ''تسلیتہ الفواد'' کے نام سے مرتب ہوا ہے۔

آزاد کی عربی شاعری کے بیرونی ممالک میں مقبول نہ ہونے کی وجہ اس زمانے کے حالات قرار دیئے جاتے ہیں۔ برصغیر اور مصر یا برصغیر اور عرب ممالک کے درمیان آمد و رفت اور علمی و ادبی تخلیقات کے باہمی تبادلے کی وہ سہولتیں موجود نہ تھیں جو شیخ سعدی، حافظ شیرازی اور امیر خسرو کے عہد میں برصغیر اور ایران کے مابین میسر تھیں۔ ایران کے صفوی حکمرانوں کی متشدد و مستعبد پالیسیاں مذہب و سیاست کے علاوہ شعر و ادب پر بھی بری طرح اثر انداز ہوئی تھیں۔ اہل ایران میں یہ تعصب بھی پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی زبان کے غیر ملکی شعراء کے کلام کو کم تر درجہ دینے لگے تھے۔ سلطان بلبن کے ولی عہد اور ملتان کے گورنر شہزادہ محمد شہید کی دعوت پر شیخ سعدی نے یہ کہہ کر ملتان آنے سے معذرت کر لی تھی کہ شہزادہ کے دربار میں امیر خسرو جیسا عظیم شاعر موجود ہے۔ لیکن اب حالات مختلف ہو چکے تھے اور اہل ایران غیر ایرانی شعراء کے فارسی کلام کی داد میں بخل سے کام لینے لگے تھے۔ لیکن سرزمین حجاز کے حالات مختلف تھے۔ وہاں کے لوگوں میں اس قسم کا فرقہ وارانہ تعصب موجود نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اہلِ عرب شروع ہی سے غیر عربوں کو عجمی یعنی گونگا کہتے چلے آئے تھے اور یہ رجحان کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ اور ہر دور میں موجود رہا ہے۔ بہر حال اس رجحان کے باوجود علمائے مدینہ نے جب مولانا آزاد کی لکھی ہوئی نعتیں سنیں تو وہ جھوم اٹھے اور انہوں نے ان کی بہت تعریف کی اور ان کو حرم شریف میں آویزاں کر دیا۔ مولانا عبدالوہاب طنطاوی مکہ مکرمہ کے نامور عالم تھے اور مولانا آزاد نے ان سے حدیث کا درس لیا تھا۔ انہوں نے جب اپنے شاگردِ رشید کے لکھے ہوئے قصائد سنے تو بہت متاثر ہوئے۔ ان کی بہت تعریف کی اور جب انہیں یہ

معلوم ہوا کہ غلام علی کا تخلص ''آزاد'' ہے، اور آزاد کے معنی کیا ہیں تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے۔ ''سیدی انت من عتقاء الله''۔

ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ آزاد پیدائشی شاعر تھے اور شاعری کا بہت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے فارسی میں بھی شعر کہے ہیں۔ غلام علی آزاد نے فارسی شعراء کے متعلق دو کتابیں بھی فارسی میں لکھی ہیں۔ جو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور اہلِ علم ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ آزاد نے ''مراۃ الجمال'' کے نام سے ۱۰۵ اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم بھی لکھی ہے۔ جس میں سر سے پاؤں تک محبوب کے تمام اعضاء کی تعریف کی گئی ہے۔ ہر عضو کی تعریف میں دو دو شعر ہیں۔

نواب صدیق حسن نے اس نظم کو اپنی تصنیف ''نشوۃ السکران'' میں شامل کیا ہے اور اس کے متعلق یہ لکھا ہے کہ:

> ''عربی میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی نظم ہے۔ محبوب کے مختلف اعضاء کی تعریف میں متفرق اشعار تو کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں پائے جاتے ہیں لیکن آزاد کی ''مراۃ الجمال'' اپنی قسم کی پہلی نظم ہے جس میں تمام اعضاء کی تعریف کی گئی ہے۔''

محبوب کے تمام اعضاء کی تعریف میں ایک طویل نظم لکھنے میں آزاد کو اولیت کا منفرد و ممتاز اعزاز حاصل ہے۔ اس کے متعلق خود آزاد نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک بنیاد رکھ کر اس پر عمارت تعمیر کر دی ہے۔ اور اب آئندہ جو شاعر ہوں گے وہ اس تعمیر میں صرف اضافہ ہی کریں گے۔ مگر بقول نواب صدیق حسن (متوفی ۱۱۸۹ء) کسی شاعر نے اب تک اس تعمیر میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔''

آزاد کے بعض اشعار یہاں نمونے کے طور پر پیش ہیں۔ تا کہ اس نظم ''مراۃ الجمال'' کی نوعیت اور آزاد کے شاعرانہ کمالات کا اندازہ ہو سکے۔

مطلق الحسن

ھی طبیة من البرق الحنان

من مثلھا فی عالم الامکان

شمس تباھی بالسنا امه لھا

و کواکب اخری من الغلمان

میری محبوب ایسی ہرنی ہے جو وادی البرق الحنان کی ہے۔ اور اس عالم امکان میں اس جیسا کون ہے؟ جس سورج کو اپنی چمک پر ناز ہے وہ اس کی کنیز ہے اور دوسرے سیارے اس کے غلمان ہیں۔

الظفیرہ (زلف)

اصفیر تان علیٰ بیاض خدودھا
اوفی کتاب الحسن سلستان
اولیلة العیدین اقبلتا معاً
او من قصائد ھم معلقتان

اس کے گورے گالوں پر دو چوٹیاں ہیں یا حسن کی کتاب کے دو زنجیر نما کالم ہیں۔ یا دو عید راتیں ہیں جو ایک ساتھ آ گئی ہیں یا معلقات سبع کے دو قصیدے ہیں۔

الجبہ (پیشانی)

جبھتھا المضنیة فی الدجیٰ
وھب الا اللہ لہ علوّ مکان
ھی نصف بدر کامل لکنھا
تربو علی القمرین فی اللمعان

اس اندھیرے میں چمکتی ہوئی پیشانی کو اللہ نے بڑا بلند مقام عطا کیا ہے۔ یہ بدر کامل کا ہے تو آدھا حصہ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دو چاندوں (رخساروں) کے اوپر چمک رہا ہے۔

الحاجب (ابرو)

البصر حواجبھا وادرک کنھا
غصنان منحنیان وسط البان
او کافران یشاوران لبوقعا
امالنا فی مواقع الحرمان

اس کے ابروؤں کو دیکھو اور اس کی حقیقت کو سمجھو۔ یہ خوشبودار شجر ''بان'' کے درمیان دو جھکی ہوئی شاخیں ہیں۔ یا دو کافر ہیں جو باہم مشورہ کر رہے ہیں کہ ہماری آرزوؤں کو محرومی کی آماجگاہ میں ڈال دیں۔

العین (آنکھ)

طرفا الحبیبة ماکراده عارضا

و تغافلا عن رویة الجیران

او نرجسان علی غصین واحد

و هما بما عمسکر لضران!

محبوبہ کی نظریں حیلہ جو ہیں جو بتکلف بیمار بنی ہوئی ہیں۔ دراصل پڑوسی کو دیکھنے سے کتراتی ہیں یا دو نرگسیں جو ایک ہی ٹہنی سے لگی ہیں اور نشہ آور پانی سے ہری بھری ہوتی ہیں۔

دو دو اشعار کے پچاس قطعات میں شاعر نے محبوب کے پچاس اعضا کی نہایت خوب صورت الفاظ اور دل کش و دل نشیں انداز میں تعریف کی ہے جو ایک عظیم المرتبت اور قادر الکلام شاعر کا کمالِ فن ہے۔ آزاد نے اپنی شاعرانہ مہارت و انفرادیت کا ذکر بھی ایک شعر میں کیا ہے۔

ما ان سمعنا مثلها عن شاعر

آزاد للطرز المنشط بان

میں نے اس جیسا کوئی شاعر نہیں سنا۔ ایسے شگفتہ طرز کا موجد آزاد ہے۔

آزاد کے بعض دوسرے شعری مجموعوں کے اشعار پر نظر ڈالنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

الا لکل حسین الوجہ الشباہ

ولا نظیر لمن اھواہ الا ھو

ہر حسین چہرے کی مثال موجود ہے لیکن جسے میں چاہتا ہوں اس کی نظیر وہ خود ہی ہے۔

محققین نے لکھا ہے کہ آزاد کی شاعری دورِ جاہلیت اور بعد کے عربی شعراء کے کلام سے کئی لحاظ سے ممتاز ہے، ایک تو یہ کہ آزاد نہ صرف یہ کہ فارسی شعراء کے کلام سے متعارف اور ان کے نازک خیالات سے آگاہ تھے بلکہ وہ خود بھی فارسی زبان کے مستند اور بلند پایہ شاعر تھے۔ اس لئے ان کے عربی اشعار میں بلندیٔ تخیل کے ساتھ معانی کی نزاکت بھی پائی جاتی ہے۔ دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آزاد نے قدیم عربی اور

فارسی بحور و اوزان میں بھی شعر کہے ہیں۔ علاوہ ازیں آزاد نے اپنی شاعری میں جہاں محسناتِ لفظیہ اور صنائع و بدائع پر زور دیا ہے وہاں ہندی اور سنسکرت کے استعارات و تشبیہات کو بھی استعمال کیا ہے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر زبید احمد کے بقول آزاد عربی شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد و ممتاز مقام پر کھڑے ہیں۔ اور وہ بلاشبہ برصغیر کے سب سے بڑے عربی شاعر ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فرد جليل لا يشاهد مثله

من ثمد و يته شفاء الاحول

وہ ایسی عالی شان ہستی ہے جس کی مثال نہیں۔ اسے دیکھ لے تو بھینگا بھی ٹھیک ہو جائے۔

ان تبتغو ماء الحيٰوة فدا لكم

فى الهند لا فى مرضع الظلمات

اگر تم آبِ حیات چاہتے ہو تو وہ تمہیں ہند میں ملے گا۔ بحرِ ظلمات میں نہیں۔

شم الجبال تعلّت عندهٗ سفهاً

وما درت انهٗ اعلىٰ من الفلك

پہاڑ کی چوٹی بے وقوفی سے اس کے سامنے اونچی ہوتی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ آسمان سے بھی اونچی ہستی ہے۔

برق اضاء من الزورا يسجنى

يا ربّ مابالہ يبكى و يبكينى

انى لسان يودى شكر انعمه

بالماء والنار يروبنى و يورنى

ترچھی نگاہ والی حسینہ کی آنکھوں سے ایک بجلی کی سی چمک اٹھی جو مجھے دکھی اور روگی بناتی ہے۔ یا الٰہی! یہ کیسی بجلی ہے جو خود بھی گریہ کناں ہے اور مجھے بھی رلاتی ہے۔ میرے پاس وہ زبان کہاں جو اس بجلی کے احسان کا شکر ادا کر سکے۔ یہ تو مجھے آنسوؤں کے پانی سے سیراب کرتی اور ان کی جلن سے بھڑکاتی ہے۔

مولانا آزاد بلگرامی نے ''سبحۃ المرجان'' میں بجا طور پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ برصغیر پاکستان و ہند میں ان سے پہلے کوئی ایسا شخص نہیں گزرا جس کا عربی میں دیوانِ شعر ہو اور

جس کا کلام اس درجے کا ہو جیسا کہ ان کا ہے۔ انہوں نے اپنے عربی اشعار کی تعداد تین ہزار بتائی ہے جو ان کے دو دوادین میں شامل ہیں۔ جبکہ ''سبحۃ المرجان'' کی تیسری فصل کی تالیف کے دوران بوقتِ ضرورت جو اشعار تخلیق کئے اور انہیں اپنی کتاب میں شامل کر دیا، ان اشعار کی تعداد سات سو ہے۔

مولوی فقیر محمد لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد کا تیسرا سفر حرمین شریفین کا ہے۔ حرمین سے واپسی کے بعد اورنگ آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ نظام الدولہ رئیس حیدر آباد مولانا آزاد کے تلامذہ میں سے تھا۔ جب نظام الدولہ اپنے والد کی وفات کے بعد مسند نشین ہوا تو مولانا آزاد کے احباب نے ان سے کہا کہ اب آپ جو رتبہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ جس کے جواب میں مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں آزاد ہوا ہوں، بندۂ مخلوق نہیں ہو سکتا۔ دنیا ہنر کے ساتھ مکار دکھائی دیتی ہے۔ غرفہ اس سے حلال ہے اور زیادہ حرام اور یہ شعر پڑھا:

دریں دیار کہ شاہی بہرِ گدا بخشند
غنیمت است کہ مارا ہمیں بما بخشند

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ''خزانۂ عامرہ'' میں لکھتے ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی نے ساڑھے تین سو سال پہلے ہی میرے نام اور تخلص کی اپنے اس شعر میں نشاندہی کر دی تھی:

فاش میگویم و از گفتہ خود دل شادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

''بندۂ عشق'' غلام علی کا ترجمہ ہے۔ کیونکہ عشق عبارت حضرت علی مرتضیٰؓ سے ہے۔ جیسا کہ شعراء نے نظم میں باندھا ہے۔

عہدِ مغلیہ کے جو اربابِ علم و دانش بیرون ملک بھی مشہور ہوئے اور جن کی نگارشات کو عربی ممالک کے علاوہ مصر، سوڈان، ترکی اور افغانستان میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اُن میں شیخ احمد سرہندی، عبدالحکیم سیالکوٹی، عبدالحق محدث دہلوی، ملک الشعراء فیضی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، محب اللہ بہاری اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

فخرِ روزگار یگانہ العصر حسان الہند مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی اور اورنگ آباد میں دفن کئے گئے۔ ''شمع لامعہ ایوانِ ہندوستان'' تاریخ وفات ہے۔

صاحبِ کتاب غلام حبیب سبحانی کے بارے میں
صاحبانِ فکر و نظر کے تبصرے اور ربع صدی پیشتر کے
تحریر کردہ غیر مطبوعہ تاثرات

مرتبہ

خانم شائستہ حبیب

پروفیسر ڈاکٹر ملک محمد اسلم

ماہرِ تعلیم، محقق، مؤرخ، مصنف

پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید و رسالت اور احترام آدمیت کا جو انقلاب آفرین درس دیا تھا۔ اس نے چند برسوں میں دُنیا کی کایا پلٹ دی تھی۔ رسالت مآبؐ کے اتباع میں صحابہ کرامؓ اور تابعین کرام نے اسلام کی شمعوں کو روشن رکھا۔ پھر بزرگانِ دین اور مسلمان مفکرین نے اسلام کی روشنی کو چاردانگ عالم میں پھیلانے کے اہم کام کو جاری رکھا۔ ہمارے عہد میں اسی نوعیت کے اہم اور قابل قدر کام میں ''زندہ تابندہ'' کے صاحبِ تصنیف اور فاضل محقق جناب غلام حبیب سبحانی مصروف ہیں جو ادب، تاریخ، مذہب، سیاسیات، اقتصادیات اور عمرانیات کے شناور ہیں۔

نام وَر اسلامی شخصیات اور مسلمان مفکرین کے بارے میں حقائق قلم بند کرنے کا نازک، اہم اور دِقت طلب کام غلام حبیب سبحانی جیسی صاحبِ علم اور بے لوث شخصیت ہی انجام دے سکتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرتِ کاملہ نے اُن میں یہ اہم کام کرنے کی صلاحیت ودیعت کی ہے کہ وہ شخصیات کے سوانح اور اُن کے کارناموں کو امانت و دیانت اور وضاحت کے ساتھ بیان کرسکیں۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ اسلامی شخصیات اور اُن سے متعلقہ موضوعات پر سبحانی صاحب کی کتابیں جو میرے ذاتی علم کے مطابق بیسیوں ہیں عام قارئین اور طالب علموں کے علاوہ تحقیقی مطالعہ کے شائقین کے لیے بھی گراں قدر تحفہ ثابت ہوں گی۔

اسلامی شخصیات کے بارے میں تحقیقی کتابوں کی اشاعت اس لیے بھی ضروری ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کی چکاچوند سے مرعوب ہونے والے لوگوں کو مسلمان علماء و فضلاء اور مفکرین کے دینی و علمی اور سائنسی و تکنیکی کارناموں سے آگاہ کر کے اُن کا اعتماد بحال کیا جائے تاکہ ماضی کی روشنی میں حقیقت پسندانہ اندازِ فکر اور جرأت مندانہ طرزِ عمل اختیار کر کے امتِ مسلمہ کے مستقبل کو روشن و تابندہ بنانے کی راہ ہموار کی جا سکے۔

عظیم اسلامی شخصیات اور نامور مسلمان مفکرین کے حوالے سے جناب حبیب سبحانی نے انتہائی محنت و ذہانت اور عرق ریزی سے لکھی گئی تحریریں ''زندہ تابندہ'' کے عنوان سے کتابی شکل میں مرتب کر کے فی الحقیقت امتِ مسلمہ کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے جس کے لیے وہ ہر لحاظ سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید

ماہرِ تعلیم، اُستاد، شاعر، مصنف

عہدِ حاضر میں علم و تحقیق اور سائنسی ایجادات کے میدانوں میں جس تیزی سے ترقی ہو رہی ہے قدرت کے رازوں کی نقاب کشائی پر کمر بستہ اہل علم و جستجو کی سمندروں سے خلاؤں تک حیرت انگیز پیش رفت نے وہ صورتِ حال پیدا کر دی ہے کہ بقولِ اقبالؒ:

''عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں''

تاہم عالمی سطح پر ہونے والی علمی، فنی اور تحقیقی ترقی نے بعض انسانی معاشروں کو جو غرور بخشا ہے اس نے پسماندہ اقوام کو احساسِ کم تری میں مبتلا کر دیا ہے۔ مسلمانوں کا شان دار ماضی بھی ایک بھولا بسرا خواب بن کر رہ گیا ہے اور نئی نسل اس کے ادراک سے محروم ہے۔ مملکتِ خداداد پاکستان میں گنتی کے عالموں اور محققوں نے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر علمی و تحقیقی کام کی کوشش کی ہے لیکن اس میدان میں کارنامے سرانجام دینا کارِ طفلاں نہیں، ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔

جناب حبیب سبحانی ایڈووکیٹ ہمارے اُن علماء و محققین میں شامل ہیں جنھوں نے قومی اور ملی تشخص کو بنیاد بنا کر ایسے بلند پایہ کام کیے ہیں جو کہ سالہا سال تک ہماری علمی و تحقیقی ضرورتوں کو پورا کرتے رہیں گے۔ انہوں نے تاریخ، تہذیب، تصوف، حدیث و فقہ کے علاوہ سائنسی علوم کے حوالے سے مسلم اکابرین کے کارناموں پر لازوال تحریریں پیش کی ہیں جو ایک عرصے تک اہلِ ذوق کی ذہنی کشادگی اور نئی نسل میں علمی ذوق و شوق کے فروغ کا سبب بنتی رہیں گی۔ ملک و ملت کی خدمت کے جذبہ کے علاوہ غلام حبیب سبحانی کی علمی، ادبی اور تحقیقی جدوجہد طویل عرصہ پر محیط ہے۔ ان کی تحریروں میں سچائی، بے لاگ اظہار، انسانی اور قومی بقاء کا جذبہ اور فکری نمو کی شدت نمایاں ہے۔ ان سطور کی ابتدا میں جس صورتِ حال کا ذکر کیا گیا ہے اس میں سبحانی صاحب کی تحریریں امید و اعتماد کے روشن مینار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان کی علمی تحقیق کا خزانہ کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

سردار محبت علی ڈوگر

ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان وممبر پنجاب بار کونسل

عالمِ دین، حافظ قرآن، سیاست دان، مذہبی راہنما

صاحب کتاب، محترم غلام حبیب سبحانی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و سپریم کورٹ آف پاکستان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ علوم اسلامیہ، قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اور ادبیات پر عمیق ولطیف نگاہ رکھتے ہیں۔ کسی بات کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول نہیں کرتے۔ مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ بیان نہیں کرتے۔ یہ انداز فکر و اظہار ان کی عالمانہ شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے۔

جناب حبیب سبحانی کے ستر کی دہائی میں لکھے ہوئے سیاسی مضامین کا ایک مجموعہ میری نظر سے گزرا تھا۔ ان کی تحریر اس قدر معلومات افزا، عالمانہ، پُر تاثیر اور جذبۂ حب الوطنی سے لبریز تھی کہ میں سارے مضامین ختم کیے بغیر اٹھ نہ سکا۔ ان مضامین میں آنے والے وقت کے بارے میں بھی ایسی معجزانہ پیش گوئیاں تھیں جو بعد میں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں۔ اس سے قبلہ سبحانی صاحب کی مومنانہ فراست، سیاسی بصیرت، قومی درد کے علاوہ ان کی جرأت و بے باکی اور نگاہِ دوررس کا اندازہ ہوتا ہے۔

ائمہ، فقہاء اور محدثین پر زیرِ نظر کتاب میں ان کی متذکرہ خصوصیات کا نمایاں اظہار ہوتا ہے۔ کتاب موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم، معلوماتی اور مفید ہے اس میں سبحانی صاحب نے جن شخصیات کے بارے میں قلم اٹھایا ہے ان کی جیتی جاگتی اور حقیقت پسندانہ تصویر پیش کر دی ہے۔ ماضی کے جھروکوں سے مستقبل کے پیش منظر پر روشنی ڈالنے والی معلومات عہدِ حاضر کو رہنمائی مہیا کر رہی ہیں۔ علوم انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ نئی نئی جہتیں سامنے آتی رہیں گی مگر ایسی کتب کی افادیت کبھی کم نہیں ہوگی جن کے پیچھے ابدی حقیقتیں اور سچی شخصیتیں جلوہ فگن ہوں گی۔

''زندہ تابندہ'' سیریز کے عنوان سے نام وَر مسلم شخصیات کے بارے میں محترم سبحانی صاحب کی نشری تقریروں پر مبنی کتابوں کا سلسلہ اہلِ ذوق اور علمی حلقوں کے اصرار پر بالآخر کتابی صورت میں مرتب ہو کر سامنے آ رہا ہے جو ہمارے علمی و ادبی خزانے میں ایک نادر اضافہ ثابت ہوگا۔

عمر زمان

شاعر، صحافی، نقاد، مصنف

ایک اچھے مؤرخ کے لیے تحقیق و جستجو اور دیانت دارانہ اظہار کی قدرت بنیادی شرط ہے۔ عصرِ حاضر میں تاریخ کا غیر جانب دارانہ جائزہ پیش کرنے کا انتہائی اہم اور مشکل کام ''زندہ تابندہ'' سلسلے کے مصنف غلام حبیب سبحانی صاحب نے خوش اسلوبی اور کامیابی سے انجام دیا ہے۔

عہد حاضر میں مغرب کے زیرِ تسلط ذرائع ابلاغ کا پُر فریب طلسم کوئی بہت ہی مضبوط یقین، توانا ذہن، روشن ضمیر اور وسیع المطالعہ شخص ہی توڑ سکتا ہے۔ غلام حبیب سبحانی صاحب کا شمار گنتی کے اُن اہلِ قلم میں ہوتا ہے جو آزادانہ سوچ اور دیانت دارانہ تحقیق و تجزیہ کی صلاحیت کے ساتھ تخلیقی جرأتِ اظہار کے بھی مالک ہیں۔ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ ایک لفظ بھی فکر و تجزیہ کے بغیر نہیں لکھتے اور مشورہ کرنے میں کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرتے۔ وہ اپنے کام میں اس والہانہ انداز سے مگن ہوتے ہیں کہ ان کے پاؤں کو چیونٹیاں کاٹتی رہیں یا در و دیوار زلزلے سے ہلنے لگیں، انہیں دوسروں سے خبر ملتی ہے۔ مسلسل کام کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھتے ہوئے نیند پوری کر لیتے ہیں۔ خرابیِ صحت کی پروا نہ کرتے ہوئے جس قدر کام سبحانی صاحب نے جن نامساعد حالات میں کیا ہے وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ تحقیق و تخلیق کے لیے جس قسم کے پُرسکون ماحول کی ضرورت ہوتی ہے اگر سبحانی صاحب کو ایسا ماحول میسر آ گیا ہوتا تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اُن کی بیسیوں کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہوتیں۔

سبحانی صاحب نے نہایت اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور تاریخ اسلام کو نئے زاویوں سے پیش کیا ہے، بڑی بڑی غلط فہمیاں دُور کر دی ہیں، بڑے بڑے بت پاش پاش کر دیے ہیں اور بہت سے چہروں سے شکوک و شبہات کی گرد صاف کر دی ہے۔ عظیم مسلم شخصیات کے حوالے سے انہوں نے جیتی جاگتی تصویروں کا حقیقت افروز البم ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سبحانی صاحب کی یہ کتاب عالم اسلام کے خیر خواہوں، بالخصوص نوجوان نسل کو احساسِ کمتری کے اندھیروں سے نکال کر ایقان و اعتماد کے اُجالوں کی جانب سفر کا پیغام دے گی۔

عبدالحمید اعظمی
اسٹیشن ڈائریکٹر پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن۔ لاہور

''حبیبِ لبیب''

حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جب لوگوں کو کسی ایک معاملے میں چند لمحے بھی سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملتا ہے نہ ہی حوصلہ ہے، حبیب سبحانی صاحب اتنا وقت اور صبر کہاں سے لاتے ہیں کہ ہر موضوع پر تحقیق کر ڈالتے ہیں...

اگست ۱۹۸۳ء میں سبحانی صاحب کی اُس وقت تک ریڈیو سے نشر ہونے والی درجن بھر متنوع موضوعات پر بلامبالغہ ہزار ڈیڑھ ہزار تقاریر کی تفصیل پر مشتمل ایک سرٹیفکیٹ جاری کیا تو میں خود بھی حیرت زدہ رہ گیا کہ بچوں سے بزرگوں، طلباء سے دیہاتیوں اور خواتین سے افواجِ پاکستان کے جوانوں تک، سب کے لیے انہوں نے تقریریں نشر کیں ... انہوں نے اپنی تقاریر کے ذریعے ملک و ملت کی کتنی بڑی خدمت سرانجام دی ہے اور یہ حوصلہ انہیں کہاں سے ملا؟

برسوں پہلے جب سبحانی صاحب سے تعارف ہوا تھا، آج تک وہ اُسی کرّوفر سے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ زندگی کا کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں اُن کے نقوشِ قدم نہ ہوں۔ تقریریں مذہبی بھی، سماجی بھی، سیاسی بھی، تبصرے قومی اور بین الاقوامی حالات پر، سکول براڈ کاسٹ میں شامل رہے۔ بچوں کے لیے تاریخی ڈرامے لکھے، فوجی بھائیوں کے لیے ''تاریخ ساز سپہ سالار'' اور ''مسلمان امراء البحر'' اور ''نشانِ حیدر'' جیسے اہم سلسلے لکھے۔ اسلامی تاریخ کی پانچ سو کے قریب شخصیات کی زندگی اور کارناموں کا اس طرح احاطہ کیا کہ واقعی دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ دریا تو دریا ہی ہوتا ہے، کوزہ البتہ کوزہ گر کی ہمت، مہارت اور گلِ کوزہ کی فراہمی پر منحصر ہوتا ہے۔ ریڈیو نے کوزے کا حجم متعین کیا کہ بس تین منٹ میں وہ سب کچھ بیان کر دیا جائے جو بیان کرنے کے قابل ہو۔ سبحانی صاحب نے اس مشکل کام کا سنا تو کہا ''سبحان اللہ! ہم تو خود ہومیو پیتھک کی گولیوں کے قائل ہیں۔ حجم چھوٹا مگر اثر دونا اور اب سننے والوں کو بھی مختصر گوئی کا مزہ چکھائیں گے۔'' تقریریں نشر ہوئیں اور سننے والوں نے نہ صرف کھایا بلکہ ہضم بھی کر لیا اور حجم بڑھانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ لیکن آہستہ آہستہ چٹخارے لے لے کر، قلیل

الکلامی کے عادی ہو گئے۔

ممکن ہے آپ نے یہ محاورہ سنا ہو: ''ہندی کی چندی'' مگر اس کے معنی اور رمز سے آگاہی مطلوب ہو تو سبحانی صاحب سے ملاقات کر لیجیے۔ پتا نہیں تہہ میں ڈوبنے اور موتی نکالنے کا یہ شوق سبحانی صاحب کو کب اور کہاں سے ملا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ حقیقت تک رسائی کے لیے اسی جذبے، دھن اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔

سبحانی صاحب نے تحقیق کے مشغلے کو مزید بامعنی بنانے کے لیے قانون کی ڈگری بھی حاصل کر رکھی ہے۔ وہ ہر وقت منطق کا استغاثہ سنتے رہتے ہیں۔ ہر بات کو دلیل و منطق کی کسوٹی پر گھستے ہیں اور یوں کھرے کو کھوٹا اور کھوٹے کو کھرا ثابت نہیں ہونے دیتے۔

علم کے سمندر میں غوطہ خوری کوئی آسان شغل نہیں۔ اس کے لیے سمندر خود ہی فراہم کرنا پڑتا ہے۔ قطرہ قطرہ سمندر بنتا ہے۔ سبحانی صاحب نے بھی رفتہ رفتہ کتابوں کا عظیم ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ ویسے وہ ذخیرہ اندوزی کے خلاف تقریر کر چکے ہیں، جس میں کتابوں کے اپنے ذخیرے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ غالباً مصلحتاً! ورنہ کثیر الاحباب ہونے کی وجہ سے وہ بہت جلد ''قلیل الکتاب'' ہو جاتے... تحقیق تو یہ ثابت کرنے کے لیے کی تھی کہ سبحانی صاحب ریگ زاروں میں بھی نقشِ قدم چھوڑنے سے باز نہیں آ سکتے۔ اب پھر وہ ہیں اور تحقیق کی گہرائیاں، غوطہ زنی بھی ہے اور غوطہ خوری بھی۔ جانے کیوں کبھی کبھی انہیں دیکھ کر اقبال کا یہ مصرعہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

(۱۹۸۳ء میں لکھے گئے ایک طویل مضمون سے اقتباس)

ظہور عالم شہید

ایڈیٹر ''جمہور''، لاہور۔ سابق مینیجنگ ڈائیریکٹر ''جاوداں''، لاہور۔

سابق چیف نیوز ایڈیٹر روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور۔

مسٹر غلام حبیب سبحانی کو میں گزشتہ دس برسوں سے جانتا ہوں۔ گو وہ پیشۂ وکالت سے وابستہ رہے اور اس سے قبل وہ ایک ممتاز سٹوڈنٹ لیڈر، مقرر اور منتظم تھے لیکن اس سارے عرصہ میں صحافت سے بھی ان کا مستقل اور گہرا تعلق رہا۔ وہ دیگر جرائد کے علاوہ روزنامہ ''جاوداں'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل تھے اور حقیقت یہ ہے کہ سبحانی صاحب کے منفرد اندازِ تحریر، تخلیقی ذہن، وسعتِ نظر، تبحرِ علمی اور وسیع معلومات نے انہیں صحافت کے میدان میں ایک خاص مقام دے دیا۔ وہ اپنی ذہنی وفکری استعداد، صحافتی تجربے اور ملکی و بین الاقوامی سیاسیات کے مطالعہ کی بدولت ایسی حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ملک کے کسی بھی عامل صحافی سے کم نہیں۔ ''جاوداں'' میں شائع ہونے والی ان کی نگارشات نے قارئین کو بے حد متاثر کیا اور ادارہ ''جاوداں'' نے ان کے اشتراک وتعاون کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کی تحریریں جان دار اور معلومات افزاء ہونے کے علاوہ نئی نسل اور جدید ذہن کو مطمئن کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے ان کی خداداد صلاحیتیں ملک وقوم کے بہت کام آ سکتی ہیں۔ میں ان کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

۱۱۔۱۱۔۱۹۷۲

نظر زیدی

معروف شاعر و ادیب

صاحب قرطاسِ وقلم اور دانش وَر ہونا بالیقین اللہ کی بہت بڑی دین ہے۔ یہ اعزاز بہت خوش نصیبوں ہی کو ملتا ہے۔ محترم غلام حبیب سبحانی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے ذہن اور اپنے قلم کو وطن عزیز پاکستان کی ترقی و استحکام اور دین اسلام کے فروغ کے لیے وقف کیا اور دُنیاوی فوائد سے بے نیاز اور سامنے نظر آنے والے خطرات سے بے خوف ہو کر بصیرت افروز مضامین لکھ کر اہل پاکستان کی رہنمائی کی۔

۱۹۷۰ء کے دوران میں شائع ہونے والے جناب سبحانی صاحب کے مضامین کے مطالعے کا شرف حاصل ہوا۔ اس بات نے بے پایاں مسرت بخشی کہ محترم سبحانی صاحب گہرے جذبہ حب الوطنی اور دین اسلام سے محبت کے جذبات سے سرشار ہو کر لکھتے ہیں۔ یہ مضامین اس دور میں زیورطبع سے آراستہ ہوئے تھے جب تنقید کو بغاوت قرار دے کر اختلاف رائے کرنے والوں کو سزا دی جاتی تھی اور خوشامدیوں کو انعامات و اعزازات سے نوازا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں سبحانی صاحب نے قلمی جہاد کیا اور بہت قوت کے ساتھ یہ بتایا کہ سیاسی و سماجی محاذوں پر کیا غلط ہے اور کیا درست ہے؟

سبحانی صاحب کے ان تجزیاتی و تنقیدی مضامین کی افادیت آج ۱۹۹۶ء میں بھی باقی ہے کیونکہ صورت حالات پہلے سے بھی خراب ہے۔ جن مقاصد کے پیش نظر حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ نے پاکستان حاصل کیا تھا وہ کچھ اور فاصلے پر چلے گئے ہیں اور بے شعور، مفاد پرست سیاست دانوں نے وطن عزیز کو خطرات کے اور نزدیک کر دیا ہے۔ ضروری ہے کہ اہل پاکستان ان خطرات سے آگاہ ہوں اور اپنے وطن اور اپنے دین کی حفاظت کی تدابیر کریں۔ سبحانی صاحب کے مضامین ان کی رہنمائی کریں گے۔

دُعا کرتا ہوں کہ اللہ رب العالمین محترم جناب غلام حبیب سبحانی کو ان کی علمی کاوشوں کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

نظر زیدی

۱۷-۹-۱۹۹۶

Phone Office 3354
Res 63479

UNIVERSITY OF THE PUNJAB

Department of Urdu Encyclopedia of Islam

Dr S M Abdullah
M A D litt
(Professor Emeritus)
Chairman

Woolner Hall
University (Old Campus)

Ref No __________ *Lahore* 28 11 1973

I know Mr. Habib Subhani, B A LL B Advocate, High Courts of Pakistan for the last fifteen years. He has devoted himself to the cause of Islam and Pakistan. He has made deep studies in the fields of literature, history and religion, with special reference to social, economic, political, educational and cultural conditions obtaining in the Indo-Pakistan sub-continent. He is well conversant with the objectives and background of the Pakistan Movement and the problems of the Muslim world. He is a prolific writer and an energetic, enthusiastic and indefatigable worker. He always works and writes with an objective and that objective is the welfare of and well being of Pakistan and its people, the renaissance of Islam and the unity and betterment of the Muslim world.

I have been keenly reading his articles on social, economic, cultural, literary, political and religious topics of national importance published in the prominent periodicals and newspapers of Pakistan. I have also read the installments of his book on the Tragedy of East Pakistan which is being serialized in the "Sayyarah Digest", which in my opinion provides a sound analysis on the subject and Mr Subhani has taken much pains in making available all the facts and figures to the readers which resulted in the tragic fall of our East Wing.

His articles usually provide much food for thought and are basically constructive, informative, enlightening and are products of deep thinking.

He is also a good poet and has written quite large number of Ghazels, Naghmas and Taranas, some of which are really inspiring.

I have been closely connected with, and have a knowledge of his activities in the social, cultural and educational organizations like the United National Students Association of Pakistan, Students Welfare Association of Pakistan and Halqa Arbab-e-Fikr of the Punjab University of which associations he was the president.

On umpteen numbers of occasions I had the opportunity to avail myself of the hospitality of these organizations to address my fellow countrymen. I must say that Mr. Habib subhani as the head of these associations did useful work not only in their formation but also in organizing successful and splendid functions on days and occasions of national significance. Through these bodies Mr. Subhani rendered meritorious services in cultural, social, and literary fields. The credit redounds to him for holding remarkably splendid meetings on the Death Anniversaries of the Father of the Nation and the Thinker of Pakistan, Allama Iqbal. He has also been taking great pains in holding meetings on and celebrating the Pakistan Day and the Independence Day, during his four years stay in the Punjab University. These functions were held in the Senate Hall, Maynard Hall and the main Hall of the Punjab University.

Mr. Subhani is a talented young man with redoubtable courage, strong convictions and hope. He possesses sound knowledge, deep understanding and clear thinking. He can lead men in any of the fields in which he may find an opportunity to serve. He can express himself with ease, clarity, profoundness and vision. He is a fluent persuasive and impressive speaker and being basically and

essentially an advocate never misses the legality, elegance and relevance of his points

I am much impressed by his talent, steadfastness of purpose, hard work, brilliant wit and character

I wish him success in life

Sd...
S. M. Abdullah
Stamped

Dated 28-11-1973

Head of the Department,
Urdu Encyclopedia of Islam,
Punjab University, Lahore.

PAKISTAN BROADCASTING CORPORATION
LAHORE

REFERENCE NUMBER

TELEGRAMS & CABLES
BROADCAST

19975

Mr. Habib Subhani, Advocate, is a regular talker of Pakistan Broadcasting Corporation. He has delivered a good number of talks from Lahore Radio Station on various themes and topics, especially on History, Religion, Education, Law & Pakistan Movement. His talks were of a high standard and were much appreciated by the listeners.

Mr. Habib Subhani has also contributed National Songs during 1965 & 1971 wars, which became very popular. His National songs, Features & other Articles are broadcast from the Lahore and other sister stations of Pakistan Broadcasting Corporation.

Sd...
(M. Aslam Chaudhari)
Programme Manager.

THE "PAK JAMHURIAT" WEEKLY
Ministry of Information & National Affairs
DEPARTMENT OF FILMS & PUBLICATIONS
Government of Pakistan
6. Fane Road
LAHORE 28th November, 1973

TELEGRAMS: JAMHURIAT
Telephones: { EDITORIAL: 67423, 68205
Managerial: 67401

During 1965 to 1973 as Chief Editor of the Weekly "Pak Jamhuriat", Lahore, I had many occasions to meet Mr Habib Subhani. I had the pleasure to publish his various articles and poems in the "Pak Jamhuriat".

Mr. Subhani possesses the ability and experience to write on various subjects, i.e. History, Literature, Politics, Economics, Education, Culture and Current Affairs etc. He enjoys the quality of writing on these subjects with the same ease and authority. He has a brilliant pen and elegant mastery over sparkling words and excellent phrases. Mr Subhani is an erudite scholar, a profound thinker and a distinguished writer. He uses his pen both in Urdu and English languages artistically and his selection of words and phrases is superb. His writings are thought provoking, meaningful and constructive. He selects the burning topics of the day for his writings and does full justice to them.

He has the love of Islam and Pakistan at his heart and I found him straightforward, honest and sincere man of convictions. He is a remarkable organizer and a talented leader of men. He is highly dependable, firmly patriotic and deeply loyal to the ideology of Pakistan. His liberal and profound knowledge, deep study of the laws and his experience of the legal systems of over ten years are great assets and can serve him a good stead if he is appointed to any responsible post requiring administration ability, organizational capacity and legal knowledge. I recommend him for any post of authority and responsibility.

Sd...

(Mohammad Hibibullah Auj)

BRODCASTING HOUSE

RADIO PAKISTAN
LAHORE

REFERENCE NUMBER

No RPL-T/-72-

TELEGRAMS & CABLES
BRODCAST

November 11, 1972

Mr. Ghulam Habib Subhani is a regular talker of the Station. He has contributed a number of talks on various subjects, which were of a good standard and were appreciated by the listeners.

Sd...

(Hassan Zaki Kazmi)
Asstt. Regional Director (Prog.)
for Regional Director

....

Nov. 14, 1972.

Mr. Ghulam Habib Subhani is an approved poet of Radio Pakistan Lahore. National Songs written by him are being broadcast from the Station. His poetry has a message and a special appeal for the listeners and is much appreciated by classes and masses.

Sd...

(M. Islam Shah)
Programme Organizer
(Music)

DAILY 'NAWA-E-WAQT' LAHORE

Mr. Ghulam Habib Subhani is known to me for the last ten years. He has been a regular and valued contributor to Daily "Nawa-I-Waqat". I have always found his articles very meaningful and thought provoking. He has a special aptitude, background, vision and lure for writing and at times his pen produces articles of such a rare quality, which a seasoned journalist often dreams.

13. 1.1972

Sd...
Humayun Adeeb
Deputy Editor.
Daily " Nawa-I-Waqat"

زندہ تابندہ سیریز-1

101

عُلمائے پاکستان و ہند

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرنے والے جید علماء کے بارے میں معلومات

تصنیف و تحقیق: غلام حبیب سبحانی

(ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان)